عصری خطبات

جلد اول

ترتیب

مفتی احمد اللہ نثار قاسمی

ناظم دارالعلوم رشیدیہ، حیدرآباد

اجمالی فہرست مضامین

فہرست مضامین

پتنگ بازی kite day

۲۴ جنوری لڑکیوں کا قومی دن

National Girl Child Day

۲۵ جنوری قومی یومِ سیاحت

National tourism day

۲۶ جنوری یوم جمہوریہ Republic Day

۲۷ جنوری مرگِ انبوہ Holocaust day

تقریظ

حضرت مولانا مفتی ابوالقاسم صاحب نعمانی دامت برکاتہم

مہتمم دارالعلوم دیوبند

ابوداؤد شریف میں حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب ہجرت فرما کر مدینہ طیبہ تشریف لائے تو آپ ﷺ نے دیکھا کہ اہل مدینہ سال کے دو دنوں میں کھیل کود کرتے تھے، آپ ﷺ نے پوچھا: "ماھاذان الیومان" یہ دو یوم کیسے ہیں؟ یعنی ان کی خصوصیت کیا ہے؟ اور ان دو دنوں کو تم لوگ بطور تہوار کیوں مناتے ہو؟ اہل مدینہ کا جواب تھا "کنا نلعب فیھما فی الجاھلیة" ہم لوگ زمانہ جاہلیت (قبل از اسلام) میں ان دو دنوں میں تیوہار مناتے تھے، آپ ﷺ ارشاد فرمایا: ان اللہ قد ابدلکم بھما خیر امنھما ،یوم الاضحی ویوم الفطر" اللہ تعالی نے تم کو ان دو دنوں سے بہتر عطا فرمائے ہیں، ایک یوم الاضحی اور ایک یوم الفطر (۱) اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل اسلام کے لیے مذہبی طور پر منانے کے صرف دو یوم ہیں: ایک عید الاضحی کا دن اور ایک عید الفطر کا دن، دوسری بات یہ ہے کہ یہ ایام مسلمانوں کے خود ایجاد کردہ نہیں ہیں، بلکہ عطیہ خداوندی ہیں اور ان دو دنوں کے منانے کا طریقہ بھی شریعت نے متعین کر دیا۔

ان کے علاوہ دنیا میں جو مختلف ایام منائے جاتے ہیں ان میں کچھ ملکی سطح کے ہیں، کچھ عالمی ہیں اور کچھ مغربی اقوام کی ایجاد ہیں، ان ایام کے پس پردہ کیا حقائق ہیں اور ان مواقع پر کیا کچھ کردنی اور نا کردنی کا ظہور ہوتا ہے جناب مفتی احمد اللہ نثار قاسمی صاحب نے اپنی کتاب "عصری خطبات" میں ان سب کا تاریخ اور واقعات کی روشنی میں جائزہ لے کر قوم مسلم کو ان ایام کے سلسلے میں اور خصوصاً مغربی ایام کے سلسلے میں کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا

(۱) ابوداؤد شریف، حدیث: ۱۱۳۴۔

ہے؟ ان سب کی نشاندہی کردی ہے، ماشاء اللہ کتاب دنیوی معلومات افزاء، دینی ہدایات پر مشتمل اور دلچسپ ہے، امید ہے کہ یہ مصنف کی دیگر تصانیف ''رمضان المبارک معروفات ومنکرات، تسہیل اصلاح الرسوم، اصلاحی واقعات، مسلم لڑکیوں کا ارتداد وغیرہ'' کی طرح اہل علم میں مقبول ہوگی، اور لوگ اس سے نفع حاصل کریں گے۔ اللہ تعالی اس خدمت کو قبول فرمائے اور ملت کے لیے نافع بنائے۔

ابوالقاسم نعمانی غفرلہ
مہتمم دارالعلوم دیوبند
۷/۱۱/۱۴۳۹ھ-۲۱/۷/۲۰۱۷ء

تقریظ

حضرت مولانا عبدالقوی صاحب دامت برکاتہم

ناظم مدرسہ اشرف العلوم حیدرآباد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم وبہ نستعین

حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ”خطبات الاحکام“ میں ایک خطبے کی ابتدا اس طرح فرمائی ہے۔ ”الحمد للہ الذی جعل الامر بالمعروف والنھی عن المنکر القطب الاعظم للدین وبعث لہ النبیین اجمعین“ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے جس نے اچھی باتیں پھیلانے اور بری باتوں سے انسانیت کو روکنے کی فکروں کو دین اسلام کا قطب اعظم یعنی مضبوط کھونٹا بنایا اور اس مبارک کام کے واسطے ہی تمام انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو مبعوث فرمایا۔ واقعہ یہی ہے کہ دین اسلام کی زندگی وتابندگی کا اہم سبب یہی امر و نہی کا نظام ہے جہاں یا جب یہ کام رُکا اُمت تباہی و بربادی کے قعر میں پھنسی اور جہاں جہاں یا جب تک یہ مبارک عمل ہوتا رہا اُمت ہزار مصائب کے باوجود تباہی و بربادی سے محفوظ رہی:

؎ گویا دم رُکا سمجھو دم بھر کو بھی جو یہ ساغر رُکا

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک دفعہ اپنے گھر سے بڑی بے چینی کے ساتھ باہر نکلے اور مسجد میں تشریف لا کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو تنبیہ فرمائی: ”لوگو! امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے رہو ورنہ اللہ تعالیٰ اپنا خاص عذاب تمہارے اوپر اُتار دے گا، پھر (غضب الٰہی کا یہ عالم ہوگا کہ) تم دعائیں مانگو تو تمہاری دعائیں تک قبول نہ کی جائیں گی“ یہ فرما کر آپ ممبر سے نیچے اُتر آئے! اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ بھلی باتیں لوگوں کو بتاتے رہنے اور بُری باتوں سے روکتے اور اُن کے انجامِ بد سے خبردار کرتے رہنے کی اسلام میں کس قدر اہمیت ہے؛ اسی وجہ سے علماء کرام ہر

زمانے اور ہر علاقے میں اس فریضے کو پوری ذمہ داری کے ساتھ ادا کرتے رہے، تحریراً بھی تقریراً بھی، بالخصوص خطباتِ جمعہ کے ذریعے! علماء کی یہ مساعیٔ جمیلہ مواعظ، ملفوظات، اور خطبات وغیرہ کے نام سے ہر دور میں محفوظ بھی کی جاتی رہیں تا کہ اگلی نسلوں کے لئے کارآمد ہوں۔ زیرِ نظر کتاب ہمارے عزیز، ذی استعداد و باصلاحیت عالم دین عزیزم مولانا مفتی احمد اللہ نثار قاسمی سلمہ اللہ تعالیٰ وعافاہ کے مرتب کردہ خطبات کا مجموعہ ہے جو نہایت اہم، ضروری اور عصر حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ عنوانات پر مشتمل ہے، نیز خطبات کا مواد بھی معتبر اور محقَّق ہے، جس کی وجہ سے ہر ایک کے لئے نافع اور قابل مطالعہ ہے؛ دعا ہے کہ حق تعالیٰ اُن کی اس سعی کو قبول فرما کر اُمت کے نفع و ہدایت کا سبب بنائے۔ آمین و صلی اللہ علی النبی الکریم۔

محمد عبد القوی غفرلہٗ

ناظم: ادارہ اشرف العلوم حیدرآباد

۹/ ۱۲/ ۱۴۳۹ھ

غبارِ خاطر

۞ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ ہم ۱۴۴۰ ؍سالوں کی اسلامی ثقافت کے علم بردار ہونے اور ہندوستان میں ہزار سال حکمرانی کرنے کے باوجود اسلامی شناخت کا معاشرہ قائم نہیں کرسکے، معاشرے میں ہماری شناخت کا ضامن کون ہے؟ یہ سچ ہے کہ ہمارا سلوک اپنوں کے ساتھ بدتر رہا اور وہی رویہ برادران وطن کے ساتھ پروان چڑھتا گیا، نتیجہ سامنے ہے کہ معاشرہ کی معصوم دوشیزاؤں کی عصمت ریزی وقتل کے واقعات آئے دن بڑھتے ہی جارہے ہیں، ہمارے تئیں نفرت کا ایک لاوا اغیار کے دلوں میں بھڑک رہا ہے، نفرت کی چنگاری کو شعلہ بنانے، اسلامی معاشرہ کی شبیہ مسخ کرنے میں جہاں فرقہ پرست، مذہب وانسانیت دشمن عناصر کی مکاری کا دخل ہے وہیں کچھ ہمارے کردار نے بھی ہوا دی ہے۔

۞ آج جبکہ گھر سے بازار تک، تفریح گاہوں سے تماشا گاہوں تک، دفتروں سے درسگاہوں تک مغربی تہذیب کا طوفان بدتہذیبی اپنے نشب وفراز کے ساتھ عام ہوتا جارہا ہے، پس پردہ کی کربناک حقیقت سے غافل ہوکر پردہ پر ابھرنے والی تصویروں کی نقالی میں فخر محسوس کیا جارہا ہے، ہوس پرستی وآوارہ مزاجی کو فطری مذہب کہہ کر گرل فرینڈ و بوائے فرینڈ بنانے کے لئے کلبوں پارکوں اور کالجوں میں فرینڈ پیالس (frind palace) اور آتش ہوس پر آب پاشی کرنے کے لئے محبت گاہ (lover palace) قائم کرنا، عریانیت کا ناکافی لباس کمر سے نیچے ایک چڈی اور سینہ پر ایک پٹی باندھکر عیب تن کو زیب تن سمجھنا روح کو اندرونی کرب ونفسیاتی الجھن اور جنسیت کی حدوں کو حیوانیت سے ضرور ملا دیتا ہے۔

۞ جب بھی نیا سال شروع ہوتا ہے تو ایک لمحہ کی تبدیلی میں مغربی تہذیب کے مارگزیدہ نر ومادہ حیوان ناطق اپنی حیوانیت کی حدیں پار کرکے انسانیت کی بندیں توڑ دیتا ہے، مال کا ضیاع، وقت کا ضیاع، حیاء سوزی وشراب نوشی اسلامی وغیر اسلامی ممالک میں

ناخواندہ طبقہ میں عموماً اور خواندہ طبقہ میں خصوصاً زینت تہذیب شمار ہوتا ہے۔

؎ بچو تقلیدِ مغرب سے سنو اے ایشیاء والو
کہ مغرب کی طرف جاتے ہی سورج ڈوب جاتا ہے

❁ یاد رہے کہ جب تک مسلمان اپنے اندر انقلاب نہیں پیدا کرے گا تب تک ''انقلاب زندہ باد'' کے نعرے ایک دھوکہ اور سراب ہے، بقول حضرت مولانا امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ: ''اگر مجھے آج کوئی اس بات کا یقین دلائے کہ کل کو ہندوستان کے کسی قصبہ کی گلی میں یا کسی شہر کے کسی کوچہ میں حکومت الٰہیہ کا قیام اور شریعت اسلامیہ کا نفاذ ہونے والا ہے تو رب کعبہ کی قسم میں آج ہی اپنا سب کچھ چھوڑ کر آپ کا ساتھ دینے کے لئے تیار ہوں لیکن یہ بات میری سمجھ سے بالاتر ہے کہ جو لوگ اپنی اڑھائی من کی لاش اور چھ فٹ کے وجود پر اسلامی قوانین نافذ نہیں کر سکتے، جن کا اٹھنا بیٹھنا، جن کا سونا، جن کا جاگنا، جن کی وضع قطع، جن کا رہن سہن، بول چال، زبان و تہذیب، کھانا پینا اور لباس وغیرہ غرض کہ کوئی چیز بھی اسلام کے مطابق نہ ہو وہ دس کروڑ کی انسانی آبادی کے ایک قطعہ زمین پر اسلامی قوانین کس طرح نافذ کر سکتے ہیں؟ یہ ایک فریب ہے اور میں فریب کھانے کے لئے تیار نہیں''۔ (فتنۂ جمہوریت: ۲۷)

؎ نہ دین کے ہوئے محسن ہم اور نہ دنیا کے
بتوں سے ہم نہ ملے اور ہمیں خدا نہ ملا

❁ انگریزی ایام کی تعظیم ان پر مبارکبادی اگر مذہبی نسبت سے ہے تو شریعت میں اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے، مزید برآں اس میں شرکت کرنا، تعاون کرنا، خوشی منانے میں حصہ لینا، مٹھائیاں تقسیم کرنا اور تناول کرنا، ہدیہ اور تحفہ پیش کرنا گناہِ محض ہے۔ ''**ان تعظیم النیروز والمهرجان من اعیاد الکفار منهی عنه، قال ابو حفص الکبیر الحنفی من اهدی فی النیروز بیضته الی المشرک تعظیماللیوم فقد کفربالله تعالی**

واحبط اعماله وبالاهداء التحاب جرياللعادته لم يكن كفرا لكنه مكروه كراهته التشبه بالكفرته فيحترز عنه"(۱)

۞ انگریزی ایام منانے کا مقصد اس دن سے متعلق حقوق کی یاد دہانی ہوتی ہے، مگر اب یہ ایام صرف تذکرہ کی حد تک رہ گیے ہیں، کوئی عملی پہلوان میں اب باقی نہیں ہے وارث انبیاء وعلم دوست احباب کے لیے منائے جانے والے دن کے مالہ وماعلیہ سے واقفیت وقت کی ضرورت ہوتی ہے، صحیح وقت پر صحیح پیغام مخاطب قوم کو دیا جاسکتا ہے، قبل از وقت عنوان پر گہری نظر، پکی فکر متکلم کی بے حد ضرورت ہوتی ہے۔

۞ اسلامی اسکول قائم کرنا زمانہ کے چیلنج کو قبول کرنا ہے، اپنی نسل کو ارتداد سے بچانے کے لیے اپنے اسکول قائم کرنا بے حد ضروری ہے، دس سال غیر اسلامی ماحول میں غیر مسلموں کی صحبت میں اولاد کا اسلامی مزاج بننا ایک محال بات ہے، مسلمان اپنے اسکولوں میں ان ایام کو رسماً منانے کے بجائے ان ایام میں مغربی رنگ کے مضرات اور اسلامی طرز کے منافع ذکر کریں، بچوں کی فکر اسلامی بنانے کی کوشش کریں۔

خواہش سے نہیں گرتے پھول جھولی میں وقت کی شاخ کو میرے دوست ہلانا ہوگا
کچھ نہیں ہوگا اندھیروں کو برا کہنے سے اپنے حصے کا دیا خود ہی جلانا ہوگا

۞ اسلامی مہینوں کی ترتیب پر اہل علم وقلم نے ایک کتب خانہ الحمد للہ تیار کیا ہے، عصری مہینوں کے طرز پر مفصل مواد یکجا دیکھا نہیں گیا ہے، موقع کے لحاظ سے قلم کار احباب نے قوم کی ضرورت پوری کرنے میں جہدِ مقبول وسعیِ مشکور کی ہے، سہل الاستفادہ کے پیش نظر جنوری تا ڈسمبر منائے جانے والے ایام میں اہم ایام پر مواد جمع کرنے کی ادنی سی کوشش کی گئی ہے، یہ کتاب کی پہلی جلد ہے جو ماہ جنوری کے عناوین پر مشتمل ہے "عصری خطبات"، نام تجویز کرنا معنون کی مناسبت سے موزوں لگا، "خطبات" کا لفظ ہونے سے عموما

---

(۱) سنن ابی داؤد، حاشیہ نمبر ۵ صفحہ ۱۶۱۔

کتاب کو قابل حوالہ نہیں سمجھا جاتا ہے، درحقیقت یہ خطبات کسی شخص کے بیانات کا مجموعہ نہیں ہے، بلکہ کتاب میں مذکورہ عناوین پر مواد مستقل بحوالہ لکھا و یکجا کیا گیا ہے۔

❖ سہولت کے پیش نظر کتاب کے بعض حصص کو علیحدہ بھی طباعت کیا گیا ہے، چونکہ طبیعتیں طول مفید سے بھی متوحش ہونے لگی ہیں مختصر و مفید کا مزاجوں پر غلبہ ہے، یکجا مواد مطالعہ میں معاون بھی ہوسکتا ہے اس لیے اس قدر طول گوارہ کرلیا گیا ہے، جو کچھ بھی ہوا اپنی علمی و عملی بے مایہ گی کے ساتھ ہوا، بندہ تعمیری تنقید و اصلاح کا ہر وقت کا محتاج ہے، بے حد ممنون ہے کہ حضرت مہتمم صاحب دامت برکاتہم اور حضرت مولانا عبدالقوی صاحب دامت برکاتہم نے کلمات بابرکت اور دعائیہ کلمات سے نوازا، رب ذوالجلال سے دعا ہے کہ اللہ ان اکابر کا سایہ ہم پر تادیر قائم رکھے، خوب استفادہ کا موقع عنایت کرے، کتاب کو ہم سب کے لیے دنیا میں نافع اور آخرت میں ذریعہ نجات بنائے۔

احمد اللہ نثار قاسمی
خادم تدریس مدرسہ خیر المدارس حیدرآباد
۲۹/۱/۲۰۲۰ء مطابق ۳/جمادی الثانیہ/۱۴۴۱ھ
۹۹۸۹۴۹۷۹۶۹

اک سال گیا اک سال نیا ہے آنے کو
پر وقت کا اب بھی ہوش نہیں دیوانے کو

نیا سال

new year

پچھلی قوموں میں تاریخ کا رواج

پچھلی قوموں میں تاریخ کے جاننے اور معلوم کرنے کے لئے مختلف چیزوں کو مدار بنایا جاتا رہا ہے، امام طبریؒ نے اپنی تاریخ میں امام زہری اور امام شعبیؒ سے روایت نقل کی ہے کہ ان دونوں حضرات نے کہا کہ جب آدم علیہ السلام جنت سے اتارے گئے اور ان کی اولاد ادھر ادھر پھیل گئی تو ان کی اولاد نے ھبوط آدم کے واقعہ سے تاریخ کا شمار کیا، اور یہ تاریخ حضرت نوح علیہ السلام کی بعثت تک جاری رہی، پھر لوگوں نے حضرت نوح علیہ السلام کی بعثت سے غرق کے واقعہ تک تاریخ کی شمار کی، پھر طوفان نوح کے واقعہ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے آگ میں ڈالے جانے تک تاریخ شمار ہوتی تھی، پھر اس واقعہ سے حضرت یوسف علیہ السلام کی بعثت تک اور پھر وہاں سے موسیٰ علیہ السلام کی بعثت تک، پھر وہاں سے حضرت سلیمان علیہ السلام کے دور حکومت تک، اور پھر وہاں سے بعثت عیسیٰ علیہ السلام تک، اور پھر بعثت عیسیٰ علیہ السلام سے بعثت محمد ﷺ تک تاریخ کا سلسلہ چلا ہے، امام طبریؒ کہتے ہیں کہ یہ تاریخ کا جو رواج امام شعبیؒ نے بتایا ہے یہ یہود کے مابین رائج تھی۔(۱)

محدث امام شعبیؒ کا ہی بیان ہے کہ جب دنیا میں حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد میں اضافہ ہوا اور وہ زمین کے مختلف حصوں اور خطوں میں پھیل گئے تو لوگوں نے ھبوطِ آدم (آدم علیہ السلام کے جنت سے زمین پر اتارے جانے) کے وقت سے تاریخ مقرر کی ہے جو کہ طوفانِ نوح تک چلتی رہی، اور ابن کلبی کا بیان ہے کہ قبیلہ حمیر کے لوگ تبابعہ (بادشاہوں) سے تاریخ شمار کرتے تھے، اور قبیلۂ غسان کے لوگ سد (بندھ) کے ٹوٹنے کے واقعہ سے تاریخ لکھتے تھے اور اہل صنعاء کی تاریخ حبشہ والوں کے غلبہ کے واقعہ سے، پھر اہل فارس کے غلبہ کے واقعہ سے چلتی تھی، پھر عرب کے لوگ مشہور دنوں سے تاریخ کا اجراء کرتے تھے،

(۱) تاریخ طبری ۱/ ۱۲۰، المنتظم فی تاریخ الملوک والامم ۷/ ۲۲۲، ۴ دار الفکر

جیسے جنگ بسوس وداحس، غبراء، وغیرہ وغیرہ(۱)

ابن ہشام نے اپنے باپ سے روایت کی ہے کہ اہلِ روم کی تاریخ دارا بن دار کے قتل سے اہل فارس کے ان پر غالب آنے کے واقعہ تک چلتی رہی، اور رہے قبطی تو انہوں نے اپنی تاریخ بخت نصر سے فلابطرہ تک چلائی جو کہ مصر کی ملکہ تھی اور یہود نے بیت المقدس کی ویرانی و بربادی کے واقعہ سے تاریخ چلائی اور عیسائی لوگوں نے عیسیٰ علیہ السلام کے واقعہ سے اپنی تاریخ جاری کی۔(۲)

علامہ ابن کثیرؒ نے نقل کیا ہے کہ:

اہل فارس (یعنی ایرانی) جب کوئی بادشاہ مرجاتا اور دوسرا کوئی بادشاہ تخت نشین ہوتا تو یکے بعد دیگرے اسی سے تاریخ مقرر کرتے تھے اور پچھلی تاریخ کو چھوڑ دیتے تھے۔(۳)

امام طبریؒ کہتے ہیں کہ نصاریٰ یعنی عیسائی لوگ سکندر ذوالقرنین کے عہد سے تاریخ لکھتے ہیں اور میرا خیال ہے کہ وہ لوگ آج بھی اسی پر قائم ہیں، اور فارسی لوگ اپنے بادشاہوں کے عہد سے تاریخ لکھا کرتے تھے اور میرے علم کے مطابق آج وہ لوگ یزدگرد بن شہریار کے عہد سے تاریخ لکھتے ہیں کیونکہ وہ ان کے بادشاہوں میں سے آخری بادشاہ ہے جو بابل و مشرق پر حکمراں تھا۔(۴)

خلیفہ بن خیاط نے اپنی تاریخ میں عبدالعزیز بن عمران کے حوالے سے لکھا ہے کہ ہمیشہ لوگوں کی ایک تاریخ رہی ہے، وہ اول زمانہ میں آدم علیہ السلام کے جنت سے اتارے جانے کے وقت سے تاریخ لکھتے تھے اور یہ سلسلہ برابر جاری رہا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کو مبعوث فرمایا، پھر لوگ حضرت نوح علیہ السلام کے اپنی قوم پر بددعا

---

(۱) عمدۃ القاری باب التاریخ من این أرخوا، دار احیاء التراث العربی ۱۷/۶۶

(۲) عمدۃ القاری باب التاریخ من این أرخوا، دار احیاء التراث العربی ۱۷/۶۶

(۳) البدایہ والنہایۃ باب وقائع السنۃ الاولیٰ من الہجرۃ، ۳/۲۰۶ دالفکر بیروت

(۴) تاریخ طبری ۱:/۱۲۰

کے واقعہ سے تاریخ رکھنے لگے، پھر طوفان کے وقت سے شمار کرنے لگے، اور یہ سلسلہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے آگ میں جلائے جانے تک رہا، پھر لوگ اسی واقعہ سے تاریخ لکھنے لگے، اور بنو اسماعیل نے تعمیر کعبہ سے تاریخ رکھی۔(۱)

نیز خلیفہ بن خیاط نے انہی عبدالعزیز بن عمران سے اور ابن کثیر نے امام شعبیؒ سے نقل کیا ہے کہ بنو اسماعیل تعمیر کعبہ سے تاریخ شمار کرتے تھے، اور یہ بات برابر جاری رہی یہاں تک کہ کعب بن لوی کی وفات ہوگئی، پھر اسی سال سے تاریخ لی جانے لگی، پھر مسلمانوں نے ہجرت کے سال سے تاریخ مانی۔(۲)

ان تفصیلات سے واضح ہوا کہ اکثر اقوام کے پاس اپنی اپنی تاریخ تھی جس سے وہ کام لیا کرتے تھے، اور یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ لوگ بعض اوقات مشہورہ سے تاریخ مقرر کیا کرتے تھے، اور بعض لوگ بادشاہوں کی بادشاہت کے عروج وزوال سے تاریخ مقرر کرتے تھے، یہود نے بیت المقدس کی ویرانی کے واقعہ سے تاریخ مقرر کی اور عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دنیا سے جانے کے بعد سے تاریخ بنائی، اسی طرح عرب کے لوگوں نے واقعۂ فیل سے تاریخ مقرر کی جس کا واقعہ یہ ہے کہ ابرہہ شاہ یمن نے کعبۃ اللہ کو ڈھانے کے لئے کوہ پیکر ہاتھیوں کے ذریعہ کوشش کی تھی، مگر اللہ کی قدرت کہ اس بے ایمانی و کعبے کی گستاخی کے نتیجے میں وہ خود ابابیل نامی پرندوں کے ذریعہ ہلاک کر دیا گیا، عربوں نے اسی واقعہ سے تاریخ مقرر کی تھی۔(۳)

تاریخی نظام کی قسمیں

دنیا میں کئی قسم کے تاریخی نظام چلتے ہیں جن کا دارمدار بنیادی طور پر مندرجہ ذیل

(۱) تاریخ خلیفہ بن خیاط: ۱/ ۱۵

(۲) تاریخ خلیفہ: ۱/ ۴۵، البدایہ والنہایہ باب وقائع السنۃ الاولی من الہجرۃ: ۳/ ۲۰۷۔

(۳) بحوالہ: ماہِ محرم کے فضائل واحکام: ۳۸۔

تین چیزیں ہیں، اسی وجہ سے بنیادی تاریخی نظام تین ہیں :

☆شمسی (سورج والا) ☆قمری (چاندوالا) ☆نجومی (ستارے والا)

پھر شمسی تاریخی نظام کی کئی قسمیں ہیں۔ :ایک تو عیسوی ہے، جس کو انگریزی اور میلادی کہتے ہیں، عیسوی سال کی ابتداء جنوری سے اور اختتام دسمبر پر ہوتا ہے، عیسوی سن حضرت عیسیٰ علیہ الصلوۃ والسلام کی ولادت یا نصاریٰ کے غلط گمان اور خیال کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ الصلاۃ والسلام کو صلیب دیئے جانے سے شروع ہوتا ہے، دوسرا سن والا نظام "بکرمی" ہے اس کو زیادہ تر ہندو استعمال کرتے ہیں، جس کا شروع "چیت" اور ختم "پھاگن" پر ہوتا ہے۔ "بکرمی" کے مہینے بالترتیب یہ ہیں :

چیت، بیساکھ، جیٹھ، اساڑھ، ساون، بھادوں، کنوار (جس کو اسوج اور آسن بھی کہتے ہیں) کاتک، اگھن (جس کو منگسر بھی کہتے ہیں) پوس (جس کو پودہ بھی کہتے ہیں) ماگھ (جس کو ماہ اور ماگھر بھی کہتے ہیں) پھاگن۔

اور تیسرا سن والا نظام "فصلی" ہے فصلوں کے سلسلے میں بعض عام طور پر اسی کو استعمال کیا جاتا ہے، فصلی مہینوں کے نام بالترتیب یہ ہیں : بیساکھ، جیٹھ، اساڑھ، ساون، بھادوں، اسوج، کاتک، مگھر، پوس، ماگھ، پھاگن، چیت۔

ملحوظ رہے کہ پھاگن، چیت، بیساکھ، جیٹھ، یہ چار مہینے گرمی کہلاتے ہیں؛ اور اساڑھ، ساون بھادوں، کنور (جس کو اس وج بھی کہتے ہیں) یہ چار مہینے برسات کے ہیں؛ اور کاتک، اگھن (جس کو منگسر بھی کہتے ہیں) پوس (جس کو پوہ بھی کہتے ہیں) ماگھ (جس کو ماہ بھی کہتے ہیں) یہ چار مہینے جاڑے (یعنی سردی) کے ہیں، اور ان میں جو بارش ہوتی ہے، اس کو مہاوٹ کہتے ہیں؛ اور یاد رکھو کہ تیسرے برس ان مہینوں میں ایک مہینہ دو دفعہ آتا ہے اس کو لوند کا مہینہ کہتے ہیں اور یہ بھی یاد رکھو کہ یہ مہینے چاند رات سے شروع نہیں ہوتے، بلکہ چاند کے پورے ہونے سے یعنی چودھویں رات سے شروع ہوتے ہیں اور جس فصل میں

گیہوں، چنا پیدا ہوتا ہے، وہ ربیع اور ساڑھی کہلاتی ہے، اور جس موسم میں چاول اور ننھا اناج (مکئی، باجرہ، جوار وغیرہ) پیدا ہوتا ہے، وہ خریف اور ساؤنی کہلاتی ہے۔(۱) اور قمری سال کا نظام یکم محرم سے شروع ہوتا ہے اور ذوالحجہ کی آخری تاریخ پر ختم ہوتا ہے قمری سال کے بارہ مہینے بالترتیب اس طرح ہیں:

محرم، صفر، ربیع الاول، ربیع الثانی، جماد الاولیٰ، جماد الاخریٰ، رجب، شعبان، رمضان، شوال ذوالقعدہ، ذوالحجہ اور اسلامی سن کا آغاز نبیوں کے سردار جناب حضرت محمد ﷺ کی ہجرت سے ہوتا ہے۔

ہجری تاریخ کا آغاز

ہجری تاریخ اسلامی تاریخ کہلاتی ہے اور شریعت میں بہت سے احکام کو اسی سے وابستہ کیا گیا ہے، جس طرح عیسائیوں کی ایک تاریخ ہے، ہندو قوم کی اپنی ایک تاریخ ہے، نیز دیگر اقوام کی اپنی اپنی تاریخیں ہیں اسی طرح اہل اسلام کی بھی اپنی ایک تاریخ ہے اور اس سے ان کو دیگر اقوام سے ایک گونہ امتیاز بھی حاصل ہوتا ہے۔

گذشتہ اقوام کی تاریخوں کا جائزہ لینے کے بعد اب آئیے اہل اسلام میں رائج تاریخ کا جائزہ لیں، اسلامی تاریخ جس کو ہجری تاریخ کہا جاتا ہے روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں اس کی بنیاد رکھی گئی اور یہ حضرات صحابہ کرامؓ کے مشورے سے طے کیا گیا تھا۔

اس سلسلہ میں جو روایات آئی ہیں ان پر اولاً نظر ڈالتے چلئے:

(۱) حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نے حضرت عمرؓ کو خط لکھا کہ آپ کی طرف سے ہم کو خطوط موصول ہوتے ہیں، مگر ان پر تاریخ لکھی ہوئی نہیں ہوتی، (یہ پتہ نہیں چلتا کہ یہ خط کب کا لکھا

(۱) ماخوذ از بہشتی زیور، حصہ دہم: ۴۳۔

ہوا ہے) اس پر حضرت عمرؓ نے صحابہ کرامؓ کو جمع کر کے مشورہ کیا، بعض حضرات نے مشورہ دیا کہ نبوت کے سال سے تاریخ لکھی جائے، بعض نے سالِ ہجرت کا اور بعض نے وفات کے سال کا مشورہ دیا، مگر جمہور صحابہؓ نے اس پر اتفاق کیا کہ ہجرت کے سال سے اسلامی تاریخ مانی جائے اور حضرت عمرؓ نے اسی پر فیصلہ کیا۔(۱)

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کی تحریر پر حضرت عمرؓ نے صحابہ سے مشورہ کر کے اسلامی تاریخ کا اجراء ہجرت کے واقعہ سے فرمایا۔

(۲) محمد بن سیرین سے روایت ہے کہ ایک شخص حضرت عمرؓ کے سامنے کھڑا ہوا اور اس نے عرض کیا کہ آپ تاریخ لکھا کریں، حضرت عمرؓ نے پوچھا کہ کیا تاریخ لکھیں؟ اس نے کہا: "شیء تفعله الأعاجم، یکتبون في شهر کذا من سنة کذا" (ایک بات جو عجمی لوگ کرتے ہیں، وہ لوگ لکھا کرتے ہیں کہ فلاں سال کے فلاں مہینے سے) حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ ہاں! یہ تو اچھی چیز ہے، لہٰذا تاریخ لکھا کرو، صحابہ نے کہا کہ کس سنہ سے ہم اس کا آغاز کریں؟ بعض نے کہا کہ رسول اللہ کی بعثت سے، بعض نے کہا کہ وفات سے، پھر ہجرت پر سب نے اتفاق کرلیا۔(۲)

(۴) ایک روایت سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے خود اس کی ضرورت کو محسوس کیا تھا، ابن حجرؒ، عینیؒ اور ابن کثیرؒ نے میمون بن مہرانؒ سے نقل کیا ہے کہ:

حضرت عمرؓ کی خدمت میں ایک دستاویز پیش کی گئی، جسکی میعاد شعبان تھی، آپ نے فرمایا کہ کونسا شعبان مراد ہے، وہ جو گذر گیا یا جو آنے والا ہے؟ پھر آپ نے صحابہ کو جمع کیا اور

---

(۱) تاریخ طبری ذکر الوقت الذی عمل فیه التاریخ ۲/۳۸۹، ثقات ابن حبان ۲/۲۰۶، تاریخ خلیفه، ۱/۱، فتح الباری ۷/۲۶۸۔

(۲) المنتظم فی تاریخ الملوک والامم ۷۲۲/۲ دار الکتب العلمیه بیروت، الکامل فی التاریخ، ذکر الوقت الذی ابتدئ فیه بعمل التاریخ فی الاسلام، ۱۳/۱، دار الکتاب العربی بیروت، البدایه والنهایه، وقائع السنة الاولی من الهجرة ۲۰۶/۲، دار الفکر۔

مشورہ کیا۔(۱)

مذکورہ بالا روایات کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اولاً حضرت عمرؓ کو بھی تاریخ مقرر کرنے کی ضرورت معلوم ومحسوس ہوئی، پھر دوسرے اصحاب کی طرف سے بھی تحریک ہوئی تو حضرت عمرؓ نے مشورہ کے لئے صحابہ کو جمع کر کے ایک فیصلہ کر دیا۔

علامہ سیوطیؒ نے حضرت عمر کی اولیات میں جہاں اور چیزوں کو شمار کیا ہے وہیں یہ بھی لکھا ہے کہ آپ ہی اول شخص ہیں جنہوں نے ہجرت سے تاریخ مقرر کی(۲)

اسی طرح "الوافی فی الوفیات" کے مؤلف نے لکھا ہے کہ "أول من أرخ الكتب من الهجرة عمر بن الخطاب" (سب سے اول جنہوں نے ہجرت سے خطوط میں تاریخ لکھی وہ حضرت عمر بن خطابؓ ہیں)(۳)

لہذا صحیح یہی ہے کہ حضرت عمرؓ نے تاریخ اسلامی کی ابتداء ہجرت کے واقعہ سے مقرر کی ہے، اور آپ ہی اس کے موجد ومدون ہیں اور اس سلسلہ میں جن حضرات صحابہ نے اپنے اپنے مشورے دیئے ان میں حضرت علیؓ اور حضرت عثمانؓ بھی شامل ہیں۔

اس جگہ یہ بھی سن لیجئے کہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم نے تاریخ کی ابتداء جو ہجرت کے واقعہ سے مانی ہے، انہوں نے یہ بات ایک قرآنی اشارے سے اخذ کی ہے۔

علامہ سہیلیؒ نے لکھا ہے کہ صحابہ کرامؓ نے ہجرت سے تاریخ ایک آیت سے لی ہے اور وہ

---

(۱) المنتظم فی تاریخ الملوک والامم ۴/۲۲۷، موقع الدرر السنية على الانترنيت، عمدة القاری۔باب التاریخ من أين ارخوا ۱۷/۶۶، البدایہ والنہایہ باب وقائع السنة الاولی من الهجرة ۳/۲۰۶ دار الفکر، تاریخ طبری ذکر الوقت الذی عمل فیه التاریخ ۲/۳۸۹ دار الفکر، فتح الباری قوله باب التاریخ ۷/۲۶۹، دار المعرفة بیروت۔

(۲) تاریخ الخلفاء۔فصل فی فوائد منثورة ۱/۲۳، مکتبہ نزار مصطفی الباز

(۳) الوافی فی الوفیات ۱/۳۲، دار احیاء التراث بیروت

یہ ہے :"لمسجد اسس علی التقویٰ من اول یوم احق ان تقوم فیہ"(۱)(البتہ وہ مسجد جس کی بنیاد اول روز سے تقویٰ پر رکھی گئی ہے وہ زیادہ حقدار ہے کہ آپ اس میں کھڑے ہو کر نماز پڑھیں) یہ پہلا دن وہ ہے جس میں رسول اللہ ﷺ مدینہ میں وارد ہوئے تھے اور اسلام کو عزت ملی تھی، پس یہاں روز سے مراد تاریخ اسلامی کا پہلا روز ہے اور وہ ہجرت کا دن ہے(۲)

یہ ایک لطیف قرآنی اشارہ ہے جس سے صحابہ کرامؓ نے اسلامی تاریخ کے لئے ماخذ کا پتہ چلایا اور ہجرت سے اس کو جوڑا، اس سے حضرات صحابہ کرامؓ کی دقت نظری و تعمق علمی کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

اسلامی تاریخ کی ابتداء سالِ ہجرت سے کیوں؟

یہاں قابل غور بات یہ ہے کہ حضرات صحابہ کرامؓ نے اسلامی تاریخ کی ابتداء جس واقعہ کی بنیاد پر رکھی وہ ہجرت کا واقعہ ہے، حالانکہ سیرت و تاریخ نبوی میں اور بھی اہم واقعات موجود تھے، جن کو تاریخ اسلامی کی بنیاد بنایا جاسکتا تھا۔

ولادت نبوی کا واقعہ کچھ کم اہم نہ تھا، چنانچہ بعض حضرات صحابہؓ نے اس کا مشورہ بھی دیا تھا، اس طرح نبوت و بعثت کا واقعہ بھی اس کی بنیاد بن سکتا تھا، معراج کے واقعہ کو بھی اس کے لئے معیار بنایا جاسکتا تھا، مگر صحابہ اور خاص طور پر حضرت علی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما نے واقعہ ہجرتِ نبوی کو اس کی اصل اور بنیاد کیوں بنایا۔

اس کی وجہ انہیں حضرات کی زبانی ملاحظہ کریں، کہ: ہجرت نے حق و باطل کے

---

(۱) التوبہ:۱۰۸

(۲) البدایہ والنہایہ باب وقائع السنۃ الاولی من الھجرۃ ۳/۲۰۶ دارالفکر، فتح الباری قولہ باب التاریخ ۷/۲۶۸ دارالمعرفۃ بیروت

درمیان فرق کردیا۔ ”الھجرۃ فرقت بین الحق و الباطل“(۱)

ایک روایت میں حضرت عمرؓ کے یہ الفاظ نقل کئے گئے ہیں: بلکہ ہم ہجرت سے تاریخ مانیں گے کیونکہ ہجرت کا واقعہ حق و باطل میں فرق ہے۔ ”بل نؤرخ من مهاجر رسول الله ﷺ؛ فإن مهاجره فرق بين الحق والباطل“(۲)

ایک روایت میں حضرت سعید ابن المسیبؒ سے مروی ہے کہ حضرت عمرؓ نے لوگوں کو جمع کیا اور ان سے پوچھا کہ ہم کس دن سے تاریخ لکھیں؟ حضرت علیؓ نے کہا کہ : جس دن سے اللہ کے رسول ﷺ نے ہجرت کی اور شرک کی سرزمین کو چھوڑا اس دن سے لکھیں۔ ”من یوم ھاجر رسول اللہ وترک ارض الشرک“(۳)

اس سے معلوم ہوا کہ حضرات صحابہؓ نے تاریخ اسلامی کی ابتداء ہجرت سے اس لئے قرار دی کہ یہ واقعہ حق و باطل میں فرق کرنے والا ہے، اس سے لوگوں کو یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آگئی کہ اسلام حق ہے اور اس کو ختم کرنا ممکن نہیں، اگرچہ اس کے خلاف ہزارہا سازشیں وکوششیں کی جائیں، یہ دین حق ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آیا ہے جو ہر حال میں ابھر کر رہے گا، ہجرت کا واقعہ کتب سیرت سے پڑھ کر دیکھ لیں کہ کس طرح ہجرت سے حق و باطل میں فرق ہوا ہے اور اس واقعہ نے باطل کو سرنگوں کرنے اور حق کو فتح یاب بنانے میں کس طرح اپنا کردار ادا کیا ہے۔

ہجرت سے ملا سبق

سن ہجری کا آغاز مسلمانوں کے لیے دینی، تاریخی اعتبار سے اپنے اندر خاصی اہمیت

---

(۱) فتح الباری لابن حجر۔ قوله باب التاریخ ۲۶۸/۷، دار الکتاب العربی، فیض القدیر۔ حرف الهمزة ۱۰۱/۱ المکتبة التجاریة الکبری

(۲) طبری، ذکر الوقت الذی عمل فیہ التاریخ ۳۸۸/۱ دار التراث البیروت، المنتظم فی تاریخ الملوک والامم ۲۲۷/۴ دار التراث، الکامل فی التاریخ ۱۱۲/۱ دار الکتاب العربی

(۳) طبری، ذکر الوقت الذی عمل فیہ التاریخ ۳۸۸/۲، دار التراث البیروت

رکھتا ہے، وہ اہلِ اسلام کو اس دور کی یاد دلاتا ہے، جب ان کو مکّی دور کے ابتلاء وآزمائش کی تنگ زندگی سے نجات ملی اور مستحکم و پائیدار اور مضبوط مستقر ملا، اسلام اور اہل اسلام کو پھولنے پھلنے کا موقع ہاتھ آیا اور یہیں سے اسلام اور مسلمانوں کو قوت اور شان وشوکت نصیب ہوئی، باطل کو شکست و ہزیمت اور کفر اپنی موت مرنے لگا اور یہیں سے مسلمانوں نے پوری دنیا کو رشد وہدایت اور توحید کا عالم گیر پیغام دیا اور دنیا کے ایک بڑے حصے تک اسلام کی شعائیں پہونچیں۔

ماہِ محرم کو سال کا پہلا مہینہ مانا گیا

غرض جب یہ بات صحابہ نے طے کرلی کہ اسلامی تاریخ کی ابتداء واقعۂ ہجرت سے مانی جائے اور اس پر صحابہ کرام ؓ کا اجماع ہوگیا تو اب مسئلہ یہ تھا کہ سال کی ابتداء کس ماہ سے مانی جائے؟

تاریخ طبری کی روایت کے مطابق جب مشورہ ہو رہا تھا اور سال ہجری سے اسلامی تاریخ کی ابتداء پر صحابہ متفق ہوگئے تو اس بارے میں سوال ہوا کہ کس ماہ سے سال کی ابتداء مانی جائے؟ بعض نے کہا کہ رمضان سے اور بعض نے کہا کہ محرم سے کیونکہ وہ لوگوں کے حج سے واپسی کا مہینہ اور محترم مہینہ ہے، پھر اسی پر ان سب کا اجماع ہوگیا۔(۱)

یہاں ایک اشکال ذہن میں آسکتا ہے، وہ یہ کہ جب صحابۂ کرام ؓ نے ہجرت کے واقعہ کو اصل بنا کر اسلامی تاریخ کی ابتداء کو ہجرت سے وابستہ کیا تو سال کا پہلا مہینہ بھی اسی کو قرار دینا چاہئے تھا، جس میں ہجرت کا واقعہ پیش آیا اور ہجرت کا واقعہ ماہ ربیع الاول میں پیش آیا تھا تو مناسب تھا کہ سال ہجری کا پہلا مہینہ بھی ربیع الاول کو قرار دیا جاتا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ بلاشک ہجرت کا واقعہ ماہِ ربیع الاول میں پیش آیا تھا، مگر نبی

---

(۱) طبری ۳۸۸/۲ ذکر الوقت الذی عمل فیہ التاریخ، المنتظم فی تاریخ الملوک والامم ۲۲۷/۴ دار الکتاب العربی

کریم ﷺ نے ہجرت کر کے مدینہ جانے کا عزم وارادہ "ماہ محرم الحرام" میں ہی کرلیا تھا؛ کیونکہ مدینہ سے حج کو آئے ہوئے مسلمانوں نے ذی الحجہ کے درمیان اللہ کے رسول ﷺ کو مدینہ آجانے کی دعوت دی اور آپ ﷺ نے اس دعوت کو قبول کرلیا، پھر جب محرم کا مہینہ آیا تو آپ ﷺ نے اس کا عزم فرمالیا، اس لحاظ سے محرم ہی ہجرت کا مہینہ ہے، اگرچہ اس پر عمل ربیع الاول میں ہوا۔

ابن حجر عسقلانیؒ نے یہی توجیہ کرنے کے بعد فرمایا کہ یہ سب سے زیادہ قوی وجہ ہے جس کو میں نے محرم سے ابتداء کی مناسبت میں پایا ہے۔ (فتح الباری: ۷ / ۲۶۷)

صحابہ کا طرز عمل ایک پیغام ہے

اس تفصیل وتوضیح کے بعد ہمیں اب اپنا جائزہ لے کر دیکھنا چاہئے کہ حضرات صحابہ کرامؓ کے اس طریقۂ کار سے ہمیں چند باتوں کی طرف اشارہ ملتا ہے اور اس میں دراصل ہمارے لئے ہدایات و پیغامات ہیں، ہمیں ان کی کسوٹی پر اپنے آپ کو جانچنا اور اپنا جائزہ لینا چاہئے۔

(۱) پہلی ہدایت یہ ہے کہ حضرات صحابہؓ نے جب تاریخ مقرر کرنے کی ضرورت محسوس کی تو اسلام کی تاریخ کی ازسرنو بنیاد ڈالی اور اس کو رواج دیا، حالانکہ جیسا کہ اوپر عرض کر چکا ہوں کہ اس دور میں مختلف تواریخ مختلف اقوام میں رائج تھیں۔ عیسائیوں کے پاس عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت شریفہ یا ان کے رفع سے تاریخ موجود اور رائج تھی، اسی طرح یہود کی اپنی ایک تاریخ موجود تھی اور خود مکہ اور اطراف کے لوگوں میں ہاتھی کے اس عظیم واقعہ سے تاریخ چلتی تھی جس کا وقوع نبی کریم ﷺ کی ولادت شریفہ سے صرف ۵۵ دن قبل ہوا تھا، اور اس کو "عام الفیل" کہا جاتا تھا۔

مگر اس کے باوجود حضراتِ صحابہ کرامؓ نے ایسا نہیں کیا کہ ان مروجہ تواریخ میں سے کسی تاریخ کو اپنا لیا ہو اور اس پر اکتفا کرلیا ہو، بلکہ مستقل طور پر مشورہ کر کے ایک اسلامی تاریخ کی بنیاد رکھی اور اس کو رواج دیا۔

اس میں اشارہ اور پیغام ہے کہ اسلام اپنے ہر معاملہ میں ایک تشخص رکھتا ہے، اور اس کا ایک امتیاز اور ایک خصوصیت ہے، وہ ہر جگہ اپنے اس امتیاز و تشخص کو باقی و برقرار رکھنا چاہتا ہے۔

اب حضرات صحابہ کے اس طرزِ عمل کے ساتھ اپنا جائزہ لے کر دیکھ لیجئے کہ ہم اسلامی تشخصات اور امتیازات قائم کرنے کے بجائے اس کو کس حد تک پامال کرتے جا رہے ہیں؟ اور ہر موقعہ پر غیر اقوام کی تقلید اور اتباع کو سرمایہ شرف وعزت خیال کرتے ہیں، اور خود تاریخ ہی کا مسئلہ لے لیجئے، آج ہم اس سے کس قدر غافل ہیں اور اس کے برخلاف غیروں کی بنائی ہوئی تواریخ پر کس قدر فریفتہ ہیں کہ ہمیں اپنی تاریخ تو یاد نہیں، لیکن غیروں کی تاریخ کیا مجال ہے کہ ہم بھول جائیں؟

یاد رکھئے کہ یہاں مسئلہ یہ نہیں ہے کہ دوسری تواریخ سے اعتناء اور اس پر عمل جائز ہے یا ناجائز؟ جائز تو ہے کہ دوسری تاریخ پر بھی عمل کریں، لیکن اسلامی تاریخ سے وابستگی اور اس کا اہتمام دوسری تواریخ سے زیادہ کرنا چاہئے، مگر ہماری حالت اس کے بالکل برعکس ہے پس حضرات صحابہ کرامؓ کا یہ طرزِ عمل اور طریقہ کار ہمیں اسلامی غیرت کا بھرپور سبق اور ہر موقعہ پر اپنے امتیاز اور تشخص کو باقی رکھنے کی پرزور دعوت دیتا ہے۔

(۲) حضرات صحابہ نے اسلامی تاریخ کو ہجرت سے وابستہ کر کے اور اسلامی سال کی ابتداء محرم الحرام سے مان کر اسلام اور مسلمانوں کی سربلندی وعظمت اور باطل کی شکست وریخت کا مظاہرہ کرنا چاہا تھا، گویا محرم الحرام وہ عظیم مہینہ ہے جس میں خدا کی طرف سے کفر کے علم برداروں اور باطل کے پجاریوں کو نامراد کر کے رسوا اور پسپا کر دیا گیا تھا اور اہلِ اسلام کو سربلندی اور عظمت کا تاج پہنا دیا گیا تھا، صحابہ نے چاہا کہ محرم آتے ہی یہ اسلامی تاریخ کا روشن باب مسلمانوں کو یاد آجائے اور وہ اپنی عظمت وسربلندی کا احساس کر کے عزت وعظمت کی زندگی گزاریں، مگر افسوس کہ آج مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ محرم الحرام کو منحوس ونامراد سمجھتا ہے

اور بعض لوگ اس کو اس قابل سمجھتے ہیں کہ اس میں ماتم بپا کیا جائے اور اسی لئے بہت سے مسلمان اس ماہ میں شادی اور دیگر خوشی کی تقریبات سے احتراز و پرہیز کرتے ہیں۔

صحابہ کے نزدیک یہ مہینہ بڑا باعظمت ومقدس تھا اور آج کے مسلمانوں نے اس کو منحوس اعتقاد کرلیا ہے، حالانکہ حدیث میں ارشاد ہے کہ اللہ کے نزدیک رمضان کے روزوں کے بعد سب سے افضل روزہ ''محرم الحرام'' کا روزہ ہے۔(۱)

اس لیے اس ماہ کو شہر اللہ (اللہ کا مہینہ) قرار دیا گیا ہے جس سے اس کی تقدیس و تعظیم معلوم ہوتی ہے، پھر اس کو رمضان کے بعد سب سے افضل فرمایا گیا مگر اس کے خلاف شیعوں کی تحریف اور تلبیس سے مسلمانوں میں اس ماہ کی نحوست کا غلط اور باطل عقیدہ رائج ہوگیا ہے جو قابل اصلاح ہے۔

(۳) پھر صحابہؓ نے ہجرت کے واقعہ سے اسلامی تاریخ کو جوڑ کر ہمیں اس طرف متوجہ کیا ہے کہ اسلام کی ترقی وترویج، اس کی تعظیم وتقدیس اس پر موقوف ہے کہ اہل اسلام ہر زمانہ میں اس کے لیے قربانی دیں، جیسا کہ اللہ کے رسول ﷺ اور صحابہ کرامؓ نے اس کے لیے بے انتہاء قربانیاں پیش کر کے اس کی تقویت و بقاء کا سامان کر دیا۔

اگر صحابہؓ ہجرت نہ کرتے اور اپنے گھربار، بیوی بچوں، قبیلہ وخاندان کو نہ چھوڑتے، اور اپنے راحت وعیش کا سامان کرتے رہتے، کھانے پینے اور دنیوی لذتیں حاصل کرنے میں لگے رہتے تو دین اسلام مٹ جاتا، اور کفار اس کو کبھی پنپنے نہ دیتے، لہذا تاریخ اسلام کو ہجرت سے جوڑ کر صحابہؓ نے چاہا کہ جب بھی تاریخ اسلام سامنے آئے تو مسلمانوں کے اندر بھی قربانی کا وہی جذبہ پیدا ہو جائے اور وہ اسی طرح دین کی خاطر قربانیاں دیں۔

اب غور کیجئے کہ ہم نے اسلام کے لئے کیا قربانی دی ہے؟ اس کی ترقی کے لئے کیا خدمات پیش کی ہیں؟ ملت اسلامیہ کے فروغ کے لئے کیا سامان کیا ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں

---

(۱) صحیح مسلم: ۱/ ۳۶۸۔

کہ شعوری یا غیر شعوری طور پر ہم کفر و باطل کی تقویت کا ذریعہ و سبب بن گئے ہوں اور اسلام کے ضعف و کمزوری کا باعث بن گئے ہوں، یا کم از کم ہمارے اوقات صرف دنیاوی کاموں اور دھندوں کی نذر ہو گئے ہوں؟ ان باتوں پر غور کر کے آئندہ زندگی کو اسلام کی تقویت و تحفظ اور اس کی ترقی و تطویر کے لئے صرف کرنا چاہئے۔

قمری و شمسی نظام میں فرق

☆ موجودہ قمری مہینوں کی ترتیب آسمان و زمین کی پیدائش کے وقت جو تھی، اب وہ اپنی اسی فطری حالت پر ہے۔

جبکہ مروجہ عیسوی نظام کی ترتیب میں اب تک کئی مرتبہ تبدیلیاں کی جاچکی ہیں سنہ ۶۶ ء، سنہ ۱۴۷ء، سنہ ۱۵۸۲ء کی ترمیمیں تو تاریخ سے واضح ہیں اور حقیقت میں کتنی ترمیمیں ہوئیں ان کا تاریخ میں واضح ذکر نہیں ملتا، وہ اللہ ہی جانتا ہے، سال میں کبھی آٹھ دن کم ہوئے، کبھی دس دن، کبھی بیس دن اور کبھی سال چودہ مہینوں کا شمار ہوا، اور کبھی ساڑھے دس مہینوں کا، بلکہ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ مسیحی دنیا برسوں نہیں صدیوں تک اپنے مقدس دنوں عیدوں اور تہواروں وغیرہ کے دن گم کیے رہی اور اپنے اقرار کے مطابق سنہ ۱۵۸۲ء تک صحیح دنوں کی تعیین نہ کر سکی اور اپنی مذہبی عبادات کو اسی غلط حساب سے ادا کرتی چلی آئی ہے۔(۱)

☆ قمری نظام انبیائے کرام علیہم الصلاۃ والسلام کی شریعتوں میں جاری رہا ہے، جبکہ مروجہ عیسوی یا دوسرے مروجہ نظاموں میں سے کوئی ایک بھی ایسا ثابت کیا جانا مشکل ہے، جو کسی نبی کی شریعت میں جاری رہا ہے۔

☆ قمری مہینہ کا آغاز چاند طلوع ہونے سے ہوتا ہے، اور ہر دن کی تاریخ کی ابتداء سورج

---

(۱) ملاحظہ ہو: "تقویم المنهاج القويم" ص ۱۰۰ الیٰ ۱۱۹، التاريخ الميلادي وما جرى له من التعديلات والتصحيحات، تالیف: حسن وفقي بك آل القاضي، المعروف بالخيمي الدمشقي، مطبوعة: المطبعُ السلفية، القاهرة ۱۳۴۵ھ ۱۹۲۷ء "تقویم تاریخ" از عبدالقدوس ہاشمی مطبوعہ ادارہ تحقیقات اسلامی آباد۔

غروب ہونے سے ہوتی ہے، اس لئے اسلامی حوالہ سے غروب کے ہوتے ہی تاریخ بدل جاتی ہے اور پوری رات اگلے دن کے تابع شمار ہوتی ہے۔

☆ قمری مہینے خاص کر اشہر حرام کے نام پر اللہ تعالیٰ نے زمین وآسمان کی پیدائش کے وقت ہی متعین فرمادیئے تھے، جبکہ مروجہ عیسوی وشمسی مہینوں کے نام خود انسانوں کے اپنے بنائے ہوئے ہیں۔

☆ قمری مہینوں کے ناموں میں کسی شرک یا گناہ کی بات کی طرف نسبت نہیں ہے، جبکہ مروجہ عیسوی یا دوسرے مہینوں کے ناموں میں یہ بات نہیں پائی جاتی ہے۔

☆ اسلامی سن کا آغاز نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہجرت سے ہوتا ہے جو کہ ہر قسم کے مفاسد اور شرک ونجوم پرستی جیسے رذائل سے یکسر خالی اور ایک اہم ترین روحانی عبادت ہے۔

اس کے برخلاف دنیا کے ملک اور قوم میں کسی حادثے سے اور کہیں ملکی فتوحات اور زمین اور آسمان کے مختلف تغیرات سے، جو مادی چیزیں ہیں اور ان میں عبادت کا پہلو بھی نہیں۔

☆ قمری نظام میں اسلامی تہوار اور عبادات واحکام (مثلاً عیدین، روزہ، حج وغیرہ) مختلف موسموں میں گھومتے پھرتے رہتے ہیں، اور اس طرح ایک مسلمان کو ہر موقع اور ہر موسم میں اپنی خواہشات کے خلاف چلنے اور مجاہدہ کرنے کا عادی بنایا جاتا ہے اور مروجہ عیسوی نظام میں ایسی صورت حال نہیں ہے۔

☆ بعض لوگ کہتے ہیں کہ قمری حساب یقینی نہیں ہوتا کیونکہ قمری مہینہ کبھی انتیس دن کا ہوتا ہے اور کبھی تیس دن کا، لہٰذا اس سے حساب لگانا دشوار ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بات صحیح ہے کہ پہلے سے چاند کے طلوع ہونے کی تاریخ متعین نہیں کی جاسکتی، لیکن جو مہینہ چل رہا ہے اس کے متعلق یہ شبہ نہیں کیا جاسکتا البتہ آنے والے مہینہ کے بارے میں یہ شبہ صحیح ہے مگر اس کو بھی کسی دوسرے طریقہ سے متعین کیا جاسکتا ہے، مثلاً چاند کی متوقع تاریخ کے بعد دن

متعین کر کے یا دوسرے درجہ میں ضمنی طور پر غیر قمری تایخ کا حوالہ دے کر اور روزمرہ کے استعمال میں تو یہ خدشہ بالکل نہیں چلتا۔

☆ایک شبہ یہ کیا جاتا ہے کہ بعض اوقات ایک ملک کا دوسرا ملک کے اعتبار سے چاند نظر آنے میں فرق ہو جاتا ہے۔لہٰذا ایسی صورت میں سب جگہ کے لئے ایک تاریخ کو کیسے متعین کیا جاسکتا ہے،اس کے جواب میں عرض ہے کہ اگر کبھی ایسا ہو جائے تو اس سلسلے میں ہر ملک کی اپنی تاریخ کا اعتبار رہو گا، جیسا کہ دوسرے احکام مثالاً نمازوں کے اوقات وغیرہ میں اپنی اپنی جگہ کا اعتبار کیا جاتا ہے۔دوسرے اگر کبھی اس کی ضرورت پیش آئے تو اس کے لئے بھی وہ طریقے اختیار کیے جاسکتے ہیں جو پہلے ذکر کیے گئے۔

قمری تاریخ کی شرعی اہمیت

جیسا کہ معلوم ہوا،محرم الحرام اسلامی کیلنڈر کا سب سے پہلا مہینہ ہے جس طرح انگریزی کیلنڈر کا پہلا مہینہ جنوری ہے، مگر ہم میں سے اکثر لوگ انگریزی تاریخ اور اس کی ابتداء وانتہاء سے تو واقف ہوتے ہیں مگر اسلامی تاریخ اور اس کی ابتداء وانتہاء سے جاہل وغافل رہتے ہیں، بسا اوقات محرم الحرام کا مہینہ آتا اور چلا جاتا ہے اور بہت سے مسلمانوں کو اس کی خبر بھی نہیں ہوتی، اس کے برعکس جب جنوری کا مہینہ آتا ہے اور اس کی پہلی تاریخ ہوتی ہے تو سب کو اس کی اطلاع ہوتی ہے اور اس کا چرچا سبھی میں ہوتا ہے، کیا عیسائی، کیا مسلم، کیا ہندو اور کیا مجوسی، سبھی اس میں دلچسپی لیتے ہیں، یہاں غیروں سے بحث نہیں اور نہ ان سے شکایت، شکایت تو اپنوں کی ہے کہ انکو غیروں کی تاریخ سے تو اتنی دلچسپی ہے لیکن اپنی اسلامی تاریخ سے اس قدر غفلت؟ حالانکہ اسلامی تاریخ سے واقفیت ضروری ہے اور شرعاً اس کی بڑی اہمیت ہے۔

قرآن شریف میں ارشاد ہے:{یسئلونک عن الاھلۃ قل ھی مواقیت للناس

والحج}(۱) لوگ آپ سے نئے چاندوں کے بارے میں پوچھتے ہیں، آپ کہہ دیجئے کہ یہ لوگوں کے اوقات معلوم کرنے اور حج کرنے کا ذریعہ ہیں۔

روایات میں آتا ہے کہ صحابہ کرامؓ نے نبی کریم ﷺ سے شروع مہینے کے چاند کے بارے میں سوال کیا کہ یارسول اللہ ﷺ! یہ چاند کا کیا معاملہ ہے کہ ظاہر ہوتا ہے دھاگے کی طرح باریک اور پھر بڑھتا جاتا ہے اور بڑا ہوجاتا اور گول بن جاتا ہے پھر گھٹنا شروع ہوتا ہے اور بالکل باریک ہوجاتا ہے جیسا کہ پہلے تھا۔اس کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی کہ آپ کہہ دیجئے کہ چاند دراصل لوگوں کے معاملات میں بھی اور ان کی عبادات میں بھی اوقات معلوم کرنے کا آلہ اور ذریعہ ہے۔(۲)

چنانچہ جب مہینہ کی ابتداء ہوتی ہے تو وہ اپنی ہلالی شکل سے ابتداء مہینہ کی خبر دیتا ہے، پھر بڑھتا چلا جاتا ہے، اس سے لوگوں کو اپنی دنیوی زندگی میں بھی تقرر اوقات میں مدد ملتی ہے اور مذہبی و دینی معاملات جیسے حج، زکوۃ، روزہ، قربانی، نیز عدت، وغیرہ میں بھی اس سے مدد ملتی ہے، اس آیت میں اگرچہ صرف حج کا ذکر کیا گیا ہے کہ چاند حج کے لئے ذریعۂ وقت شناسی ہے، مگر مراد تمام عبادات ہیں، جو کسی خاص ماہ یا وقت سے متعلق ہیں، جیسے روزہ کہ رمضان میں فرض ہے، لہذا اس فرض کو ادا کرنے کے لئے یہ جاننا ضروری ہوا کہ رمضان کب ہے؟ اور یہ بات موقوف ہے چاند پر، اسی طرح حج، قربانی، زکوۃ وغیرہ کا مسئلہ بھی ہے۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے اپنی تفسیر ''معارف القرآن'' میں لکھا ہے کہ :

''اس آیت سے تو اتنا معلوم ہوا کہ چاند کے ذریعہ تمہیں تاریخوں اور مہینوں کا حساب معلوم ہوجائے گا، جس پر تمہارے معاملات اور عبادات حج وغیرہ کی بنیاد ہے، اس مضمون کو

---

(۱) البقرۃ:۱۸۹۔

(۲) روح المعانی:۲/۱۷۔

سورۂ یونس کی آیت میں اس عنوان سے بیان کیا ہے :**وقدرہ منازل لتعلموا عدد السنین والحساب**"(یونس:۵) جس سے معلوم ہوا کہ چاند کو مختلف منزلوں اور مختلف حالات سے گزارنے کا فائدہ یہ ہے کہ اس کے ذریعہ سال اور مہینوں اور تاریخوں کا حساب معلوم ہوسکے، مگر سورۂ بنی اسرائیل کی آیت میں اس حساب کا تعلق آفتاب سے بھی بتلایا گیا ہے:

{فمحونا آیة اللیل وجعلنا آیة النهار مبصرة لتبتغوا فضلاً من ربکم ولتعلموا عدد السنین والحساب}(۱)(پھر مٹایا رات کا نمونہ اور بنادیا دن کا نمونہ دیکھنے کو تاکہ تلاش کرو فضل اپنے رب کا اور تاکہ معلوم کرو گنتی برسوں کی اور حساب)

اس آیت سے اگرچہ یہ ثابت ہوا کہ سال اور مہینوں وغیرہ کا حساب آفتاب سے بھی لگایا جاسکتا ہے، لیکن چاند کے معاملہ میں جو الفاظ قرآن کریم نے استعمال کئے ہیں اس سے واضح اشارہ اس طرف نکلتا ہے کہ شریعت اسلام میں حساب چاند ہی کا متعین ہے، خصوصاً ان عبادات میں جن کا تعلق کسی خاص مہینے اور اس کی تاریخوں سے ہے، جیسے روزہ، رمضان، حج کے مہینے، حج کے ایام، محرم، شب برأت وغیرہ سے جو احکام متعلق ہیں، وہ سب رویت ہلال سے متعلق کئے گئے ہیں۔(۲) الغرض اس آیت سے عام زندگی کے معاملات اور مذہبی زندگی کے معاملات کا چاند سے متعلق ہونا اور چاند کا ان کے لیے ذریعہ وقت شناسی ہونا معلوم ہوا جس سے قمری تاریخ کی ضرورت واہمیت معلوم ہوئی۔

اسی لئے علماء نے لکھا ہے کہ عبادات میں قمری حساب کا اعتبار فرض وضروری ہے حضرت مولانا مفتی شفیع صاحب علیہ الرحمہ نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے کہ:

"پھر عبادات کے معاملہ میں تو قمری حساب کو بطورِ فرض متعین کردیا اور عام معاملات تجارت وغیرہ میں بھی اس کو پسند کیا، جو عبادات اسلامی کا ذریعہ ہے اور ایک طرح کا اسلامی

(۱) بنی اسرائیل:۱۲۔

(۲) معارف القرآن ۲: /۴۱۱، ۴۱۲۔

شعار ہے، اگرچہ شمسی حساب کو بھی ناجائز قرار نہیں دیا، شرط یہ ہے کہ اس کا رواج اتنا عام نہ ہوجائے کہ لوگ قمری حساب کو بالکل بھلادیں؛ کیونکہ ایسا کرنے میں عبادات روزہ وحج وغیرہ میں خلل لازم آتا ہے، جیسا کہ اس زمانہ میں عام دفتروں اور کاروباری اداروں بلکہ نجی شخصی مکاتبات میں بھی شمسی حساب کا ایسا رواج ہوگیا ہے کہ بہت سے لوگوں کو اسلامی مہینے پورے یاد نہیں رہے، یہ شرعی حیثیت کے علاوہ غیرت قومی اور ملی کا بھی دیوالیہ پن ہے، اگر دفتری معاملات میں جن کا تعلق غیر مسلموں سے بھی ہے ان میں صرف شمسی حساب رکھیں، باقی نجی خط وکتابت اور روزمرہ کی ضروریات میں قمری اور اسلامی تاریخوں کا استعمال کریں تو اس میں فرض کفایہ کی ادائیگی کا ثواب بھی ہوگا اور اپنا قومی شعار بھی محفوظ رہے گا۔(۱)

نیز حضرت تھانوی ؒ لکھتے ہیں: چونکہ احکام شریعت کا مدار حساب قمری پر ہے اس لئے اگر ساری امت دوسروں کی اصلاح کو اپنا معمول بنالے جس سے حساب قمری ضائع ہوجائے تو سب گناہگار ہوجائیں گے اور اگر وہ محفوظ رہے تو دوسرے حساب کا استعمال بھی مباح ہے؛ لیکن سنت سلف کے خلاف ضرور ہے اور حساب قمری کا برتنا بوجہ اس کے فرض کفایہ ہونے کے افضل واحسن ہے(۲)

الغرض ہمیں اپنی تاریخ کا لحاظ کرنا اور اس کا اہتمام کرنا چاہئے، اور اپنے سارے معاملات کو قمری حساب کے مطابق کرنا چاہئے، یہ ہمارا شرعی فریضہ بھی ہے اور ملی غیرت کا تقاضا بھی ہے۔

سالِ نو کا آغاز یکم جنوری سے ہی کیوں؟

دنیا بھر میں سالِ نو کی تقریبات کا اہتمام بہت اچھے انداز میں کیا جاتا ہے اور لوگ نئے سال کا پہلا دن ہلہ گلہ کرکے گذارتے ہیں، لیکن دنیا بھر میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو

---

(۱) معارف القرآن ا: / ۴۶۸۔

(۲) ماخوذ از بیان القرآن: ۵۸، معارف القرآن ج ۴ ص ۶۸ مکتبہ اشرفیہ دیوبند

شاید نہیں جانتے کہ نئے سال کا آغاز جنوری میں ہی کیوں منایا جاتا ہے، بقیہ مہینوں کے مقابلے میں جنوری ہی کو کیوں سال نو کا پہلا مہینہ چنا گیا تقریباً تمام دنیا میں یہ رواج ہے کہ نئے سال کا آغاز یکم جنوری سے کیا جاتا ہے، لیکن کم لوگوں کو معلوم ہے کہ سال کا آغاز اس دن سے ہی کیوں کیا جاتا ہے؟۔

نئے سال کا تہوار منانے والے ایک قدیم تاریخ رکھتے ہیں۔ نئے سال کو خوشی منانا اور سال کے پہلے دن کو اہمیت دینا، اس کو عہد و پیماں کا دن ماننا، تحائف کا تبادلہ ان تمام مراسم کا سلسلہ ۲۰۰۰ء قبل مسیح سے چلتا آرہا ہے۔

اصل رومی کیلنڈر دس ماہ پر مشتمل تھا جس میں 304 دن تھے۔ کچھ مورخین کے نزدیک 713 قبل مسیح میں بادشاہ Numa Pompilius نے دو مہینوں کا اضافہ کیا۔

رومی سلطنت میں ۱۵۳ قبل مسیح سے یہ رواج چلا آرہا تھا، کہ یکم جنوری کو شہروں کے انتظام کے لئے مقرر کئے جانے والے حکومتی افسران مقرر کیے جاتے تھے، اور یہ تقرری حکومتی انتظام کا اہم ترین جزو سمجھی جاتی تھی، اس وقت کی رومی سلطنت میں لوگ مالوں کی پہچان بھی ان میں مقرر کیے گئے اصولوں کے حوالے سے کرتے تھے، تقرر کے لئے اس دن کا انتخاب ہی کیوں کیا جاتا تھا؟

تاریخ دانوں کا کہنا ہے، کہ لفظ ''جنوری'' کا تعلق رومن لفظ ''جینس'' سے ہے، جو رومیوں کے ہاں تبدیلی اور آغاز کا دیوتا کہلاتا تھا، اور یہی وجہ تھی کہ جنوری کے مہینہ کے پہلے دن کو سال کے آغاز کے لئے چنا گیا۔

اگرچہ اس کے بعد بھی کیلنڈر میں تبدیلیاں آئیں لیکن آج تک سالِ نو کا آغاز یکم جنوری سے ہی کیا جاتا ہے، روسی عوام کو سال نو کا جشن منانے کا بہت شوق ہے، دراصل یہ جشن قدیم زمانہ سے مختلف مما لک میں منایا جاتا ہے۔

تاریخ دانوں کا کہنا ہے کہ ۵/ہزار سال پہلے ''میسو پوٹامیہ'' میں سالِ نو کی آمد کے

موقع پر جشن منانے کی روایت شروع ہوئی تھی ۔ یہ جشن کسانوں کے لئے بہت اہمیت کا حامل تھا۔ کیونکہ پرانے زمانے میں لوگوں کا کھیتی باڑی پر انحصار تھا۔

شروع شروع میں سالِ نو کی آمد زراعتی کاموں سے وابستہ تھی،اسلئے یہ تقریب موسم بہار یا موسمِ خزاں میں منائی جاتی تھی ۔لیکن سلطنت روم کے بادشاہ جولیس سیزر نے فیصلہ کیا کہ سالِ نو کا جشن یکم جنوری کو منایا جائے ۔

پہلے روس میں بھی یہ جشن موسم سرما میں نہیں بلکہ موسم بہار میں منایا جاتا تھا ، روسی لوک روایات کی ماہر solove Aanna کا کہنا ہے کہ پرانے زمانے میں روسی عوام سالِ نو کی تقریب یکم مارچ کو مناتے تھے ،جب کسی کھیتی باڑی کا آغاز ہوتا تھا؛ لیکن ۱۴۹۲ء میں بادشاہ "ادان سویم" نے یہ جشن یکم ستمبر کو منانے کا حکم دیا تھا جب فصل کاٹنے کا کام شروع ہوتا ہے۔

اسی روسی بادشاہ کے لئے محصول وصول کئے جاتے تھے ،یہ سلسلہ ۱۷۰۰ء تک جاری رہا۔جب بادشاہ پیٹر اول نے فیصلہ کیا کہ باقی یورپی ممالک کی طرح روس میں بھی نئے سال کا آغاز یکم جنوری کو ہوگا،اسی وقت سالِ نو کے جشن سے متعلق دو روایات وجود میں آئی تھیں ،جو ہم میں آج تک برقرار ہیں ۔

عبدالوارث گل سابق عیسائی لکھتے ہیں: مسیحی اقوام کے باطل عقائد، نظریات اور تہواروں میں ایک تہوار نئے سال کا بھی ہے ،جس کا آغاز اصولاً تو ۲۵/دسمبر سے ہونا چاہیے تھا کیونکہ مسیحیوں کا عقیدہ تو یہ ہے کہ مسیح ۲۵/دسمبر کو پیدا ہوئے اس لئے سال کا آغاز بھی اسی دن سے ہونا لازم تھا مگر ہمارے اس اعتراض پر مسیحی برادری کا جواب ہے کہ مسیحؑ پیدا تو ۲۵/دسمبر کو ہوئے لیکن آپ کے ختنے ساتویں دن کئے گئے اس لئے جس روز مسیح مختون ہوئے اس دن سے ہم اپنے نئے سال کا آغاز کرتے ہیں ،جبکہ ختنوں کی رسم اتنی ہی اہمیت کی حامل ہے کہ مسیحؑ کی پیدائش پر اس کو ترجیح دی جاتی ہے تو مسیحی خود اس رسم پر عمل کیوں

نہیں کرتے؟''

ڈایونس اکسگز نے عیسوی کیلنڈر کی بنیاد حضرت مسیح کے ۵۲۵ سال بعد رکھی جبکہ کچھ ہی سالوں بعد اسکو یہ احساس شرمندگی ستانے لگا کہ مسیح کی تاریخ پیدائش وسال کے تعین میں ہم سے بہت بڑی غلطی کا ارتکاب ہو چکا ہے یہی وجہ ہے کہ سابقہ پوپ بینیڈیکٹ ''جیز ز آف ناز رتھ''، کینن فیرر''دی لائف آف کرائسٹ''اور مائکل ہارٹ''دی ہنڈرڈ'' میں اس بات کا اعتراف کر چکے ہیں کہ ۲۵/دسمبر یا نئے سال کا مسیح یا مسیحی تعلیمات سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔

یہود کی ناپاک سازش

دنیا میں مختلف قومیں وجود پذیر ہوئیں اور اپنے مدت تک رہ کر ہمیشہ کے لئے صفحۂ ہستی سے ناپید ہوتی گئیں ''لکل امۃ اجل''(۱)اور کچھ قومیں ایسی ہوئیں جو مذہبی تعلیمات کو پس پشت ڈال کر ہلاکت و بربادی کی راہ پر گامزن ہوئیں، جن میں سرفہرست عیسائی اور یہودی ہیں۔ یہ دونوں مذہب باطل ہیں۔قرآن کریم ان کے مکر وفریب، بغض وحسد اور افتراء ودغابازیوں کے سلسلہ میں رطب اللسان ہے اور جگہ جگہ ان کی آپسی رنجشوں کو بے نقاب کیا ہے۔قرآن حکیم نے مذہب سے منحرف قوموں میں سب سے بدترین یہود ونصاریٰ کو بتلایا ہے۔اور رسول اللہ ﷺ نے یہود ونصاریٰ کی چال بازیوں سے امت کو آگاہ فرمایا ہے۔

آج روئے زمین پر پائے جانے والے انسانوں کی تعداد میں سب سے زیادہ نصاریٰ ہیں اور سب سے کم تعداد یہودی ہیں۔بعثت رسول اللہ ﷺ سے ہی یہود ونصاریٰ کو مسلمانوں سے کدورت رہی ہے اور تاریخ شاہد ہے کہ یہ اقوام باطلہ مسلمانوں کو ہر دور میں صفحۂ ہستی سے مٹانے کی سرتوڑ کوشش کرتی آرہی ہیں، لیکن فرمانِ خداوندی ہے :یریدون لیطفئوا

---

(۱)الاعراف: ۳۴

نور اللہ بأفواھھم... الخ (۱) کہ یہ لوگ اللہ کے نور کو بجھانا چاہتے ہیں تب بھی اللہ اپنے نور کو مکمل کر کے رہے گا۔ چنانچہ جب بھی باطل نے حق کے خلاف آواز اٹھائی تو اہلِ حق نے ہر دور میں اس آواز کو اپنے ایمانی جوش وحمیت سے سرنگوں کر دیا اور باطل کو منہ کیے کھانی پڑی۔

جب انہوں نے دیکھا کہ مسلمانوں کو میدانِ جنگ میں مات دینا ان کے بس کی بات نہیں ہے تو انہوں نے باہمی تعاون واشتراکِ عمل سے سوچا کہ مسلمانوں کے ایمان پر حملہ کیا جائے چنانچہ بہت غور وفکر کے بعد ایک سازش رچی کہ مسلمانوں کے اندر سے شعائر اسلام کو نکال کر عیسائیت کے شعائر کا رنگ دے کر پیش کیا جائے اور ان کی روحانیت کو تار تار کیا جائے اور مذہبی قوت سلب کر لی جائے، چنانچہ وہ اپنے مقاصد میں کامیاب نظر آرہے ہیں اور مسلمان ان کے اس فریب میں آسانی کے ساتھ پھنس رہے ہیں اور اس کو حقیقی شعائر اسلام سمجھ رہے ہیں اور ابھی تک اس سے لاعلم ہیں۔

ایک یہودی جو سعودیہ عربیہ میں اپنی کسی تنظیم کا مبعوث تھا تقریباً ۲۷ سال تک سرزمین عرب پر تبلیغ کی نیت سے رہا جب اس سے پوچھا گیا کہ تم نے کتنے مسلمانوں کو یہودی بنایا تو اس نے کہا کہ ''ہم نے ان کے ظاہر کو تو یہودی نہیں بنایا لیکن ہم نے ان کی ذہنیت میں یہودیت کا رنگ دے دیا ان کے گھروں میں اسلامی چیانلس کے ذریعہ ٹی وی کو داخل کیا اور ان کے ہاتھوں سے مسواک کی سنت چھڑا کر ''برش'' دے دیا اور اسلامی لباس کو کالج ویونیورسٹیوں کے ذریعہ ترک کروایا، غرض ان کے استعمال کی ہر ہر چیز ہماری مصنوعات میں سے ہوتی ہے''۔ (مجلہ شاہراہِ علم)

ظاہر ہے کہ اس قسم کے واقعات ہم روز بروز سنتے رہتے ہیں اور ان کی آمیزش کا مشاہدہ بھی کرتے رہتے ہیں۔ اگر ہم روزمرہ کی استعمال کردہ چیزوں کی تہہ تک پہنچ جائیں تو شاید ہی

---

(۱) التوبہ: ۳۲

کوئی چیز خالص اور پاک ملے۔

آج اسلام دشمن طاقتوں کی زہر آلود روحانیت کش ایجادات مسلمانوں کی غیرت وحمیت کو للکار رہی ہیں اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ اس قسم کی سازشوں کو امت کے سامنے بے نقاب کیا جائے اور صحیح صورت حال سے واقف کرایا جائے، شاید ہی کسی کو بھروسہ ہو لیکن حقیقت یہی ہے۔

مہینوں کے شرکیہ ناموں کی تفصیل

اس وقت جس انگریزی تقویم کا رواج عام ہے وہ دراصل رومن تقویم ہے، رومیوں اور یونانیوں نے مختلف انگریزی مہینوں کو اپنے مختلف معبودوں کے ناموں سے موسوم کیا ہے، جس سے بت پرستی صاف طور پر جھلکتی ہے،

۞ مثلاً جنوری کا مہینہ رومیوں کے معبود (janus) کے نام سے موسوم ہے، جوان کے گمان کے مطابق سورج کا معبود ہے، اس معبود کا مجسمہ وہ اس انداز سے بناتے تھے کہ اس کے دو چہرے ہوا کرتے تھے ایک چہرہ سے وہ مشرق کی طرف متوجہ رہے اور دوسرے سے مغرب کی طرف، سورج کے طلوع وغروب کے وقت یہ معبود اس کا استقبال کرتا ہے، اور اسے الوداع کہتا ہے، اس معبود کا دروازہ جنگ کے دنوں بالکل کھلا رکھا جاتا اور حالتِ امن میں بند کیا جاتا تھا۔

۞ یہی حال فروری کا ہے، اہل روم کے نزدیک (fevcbru) کے معنی کفارہ اور معافی کے آتے ہیں، پانچ فروری کو اہل روم طہارت وپاکیزگی کی عید مناتے تھے اور یہ تہوار "لوبرتوس" نامی بت کے لئے منایا جاتا تھا، اس بت کے پجاری کوئی بکری یا کتا ذبح کر کے اس کے خون کو اپنے پیشانیوں پر مل لیا کرتے تھے، ان کا عقیدہ تھا کہ اس بکری یا کتے کے چرم کا ٹکڑا لے کر اگر اس بت کا طواف کیا جائے، پھر اس ٹکڑے کو کسی بانجھ عورت پر مارا جائے تو اس سے اس کا بانجھ پن ختم ہو جائے گا، ذبح شدہ جانور کے چرم کے اس ٹکڑے کو

وہ لوگ (febua) کہا کرتے تھے۔

❁ مارچ دراصل مریخ سیارے کی طرف منسوب ہے، جو اہل روم کے گمان کے مطابق جنگ کا معبود ہے اور جنگ کے دوران رومیوں کا حامی ومددگار ہے، ان کا خیال ہے کہ گذشتہ زمانہ میں یہ معبود آندھیوں کا معبود تھا، پھر کھیتی اور نباتات کا معبود ہوگیا، یہ معبود ان کے عقیدہ کے مطابق مختلف صلاحیتوں کا حامل ہے۔

❁ اپریل (aprial) سے مشتق ہے، جس کے معنی کھلنے اور کھل جانے کے آتے ہیں اور یہ ''اقینوس'' نامی پھول کا رمز ہے، قدیم رومیوں کے پاس اپریل کے مہینہ سے سال کا آغاز ہوتا ہے۔ اپریل کی آمد پر ایک رقص کرنے والا موسیقی کی دھنوں پر رقص کیا کرتا تھا، پھر سال کا آغاز اپریل سے منتقل کر کے مارچ سے کیا جانے لگا پھر جنوری کو سال کا پہلا مہینہ قرار دیا گیا۔

❁ مئی (mains) سے مشتق ہے، یہ بھی ایک یونانی اور رومی معبود ہے، یہ دراصل ''اطلس'' نامی بت کی لڑکی کا نام ہے، اس مہینہ کے آغاز میں اہل روم اپنی لڑکیوں میں سب سے خوبصورت ترین لڑکی کا انتخاب کر کے اس کے سر پر مس یونیورس کا تاج پہنایا کرتے تھے۔ آج کل حسن کے عالمی مقابلے میں جو تاج پوشی ہوتی ہے، اس کا تعلق بھی اہلِ روم کی مذہبی روایت سے ہے، ۲۸/اپریل سے لے کر ۲/مئی تک کے دنوں میں پھولوں کے معبود ''قلورہ'' کا تہوار منایا جاتا تھا۔

❁ جون ایک رومی قبیلہ کا نام ہے، اس قبیلہ اور اس کے معبود کو زندہ جاوید رکھنے کے لئے مہینہ کا نام رکھا گیا۔

❁ جولائی قیصر روم کایوس یولیوس کے نام سے رکھا گیا، اس لئے اس سے پہلے اس مہینہ کا نام (sixligis) تھا، جس کے معنی چھٹے مہینہ کے آتے ہیں۔

ستمبر، اکتوبر، نومبر اور دسمبر اپنی پرانی حالتوں پر برقرار رکھے گئے، جن کے معنی بالترتیب ساتویں، آٹھویں، نویں، دسویں، آتے ہیں۔ سال کے مہینوں میں ایرانی ترتیب

کے لحاظ سے ان کے نمبر یہی تھے۔(۱)

ایام کے شرکیہ ناموں کی تفصیل

آج کل جتنے بھی کیلنڈر چھپتے ہیں خواہ اردو میں ہوں یا انگریزی میں ان سب میں ہفتے کے دنوں کے نام خالص شرکیہ ہیں، جو کیلنڈر اردو میں چھپتے ہیں اس میں ہفتہ کے دنوں کے نام اس طرح ہیں :اتوار، سوم وار، منگل، بدھ، جمعرات، جمعہ، سنیچر، اور جو کیلنڈر انگریزی میں شائع ہوتے ہیں اس میں ایام کے نام یوں ہیں : Sunday, Monday, Tuesday,Wednesday,Thursday,Friday,Saturday، ان چودہ ناموں میں جمعہ اور جمعرات کے علاوہ باقی سب نام شرک اور کفر پر دلالت کرتے ہیں۔

(۱) اتوار، Sunday، اتوار ہندی کا لفظ ہے اصل میں آیت وار سے بنا ہے جو دو لفظوں پر مشتمل ہے آیت اور وار، آیت بمعنی سورج اور وار بمعنی دن، سنڈے انگریزی کا لفظ ہے جو سن اور ڈے سے مرکب ہے۔ سن بمعنی سورج اور ڈے بمعنی دن، اتوار اور سنڈے دونوں کے مقصودی معنی یہ ہیں کہ ''سورج کی پوجا کا دن'' لہٰذا یہود ونصاریٰ یہ دو فرقے اس دن چھٹی کر کے مخصوص عبادت کرتے ہیں اور اسی طرح ہندو لوگ سورج کو سب سے بڑا کارساز دیوتا سمجھتے ہیں، اس لئے وہ سورج کے چڑھنے اور ڈوبنے کے وقت اس کی شعاعوں کو پوجتے ہیں بلکہ ہندوستان میں ایک قوم اپنے آپ کو ''سورج بنسی''، یعنی سورج کی اولاد کہلاتی ہے جو بڑا معزز سمجھا جاتا ہے۔

(۲) سوم وار Monday: ہندی میں سوم چاند کو کہتے ہیں اور من انگریزی میں چاند کے معنی میں آتا ہے جو کہ مون تھا، دونوں کا مقصودی معنی ''چاند کی پوجا کا دن'' ہندوؤں کا سوم

---

(۱) مجلہ کویت ۱۴ : رشوال ۱۴۲۲ھ

ناتھ مندر مشہور ہے جو کاٹھیاواڑ گجرات میں تھا، سومناتھ کے معنی ہیں ’’چاند کی صورت پر بنا ہوا خدا‘‘ چوں کہ اس مندر میں چاند کی شکل بلا کسی سہارے کے معلق رکھی تھی اور سادہ لوح ہندوؤں کو پنڈت یہ کہتے تھے کہ یہ چاند واقعی خدا ہے جو بلا کسی سہارے کے کھڑا ہے اس بناء پر ہندوستان میں ایک قوم اپنے کو ’’چندا بنسی‘‘ یعنی چاند کی اولاد کہلاتی ہے۔ جس کو بڑا معزز خیال کیا جاتا ہے۔

(۳) منگل وار، Tuesday: منگل کے معنی سرسبز وشاداب کے ہیں منگل وار کا مقصد یہ ہے کہ ’’شادابی کے دیوتا کی پوجا کا دن‘‘ انگریزی میں Tuesday کا مقصد یہ ہے کہ ’’مریخ سیارے کی پوجا کا دن‘‘ چوں کہ ہندوؤں اور قدیم یونانیوں کا یہ عقیدہ ہے کہ مریخ سیارہ سرسبزی وشادابی کا دیوتا ہے، اس لئے ان کے نزدیک مریخ کو پوجنے اور اس سے دعا مانگنے سے زراعت خوب سرسبز وشاداب ہوتی ہے اور یہ مقولہ بھی مشہور ہے کہ ’’جنگل میں منگل‘‘ اس میں یہی معنی مراد ہیں۔

(۴) بدھ وار، Wednesday ہندی میں بدھ عطارد سیارے کو کہتے ہیں اور Wednesday ماخوذ ہے وڈن سے جو رومن زبان میں عطارد کو کہتے ہیں، دونوں کے مقصودی معنی یہ ہوئے ’’عطارد کی پوجا کا دن‘‘ چوں کہ ہندوؤں اور سکنۂ نیوباوالوں کا یہ عقیدہ ہے کہ جس پر عطارد دیوتا مہربان ہو جائے وہ عقل وشعور کا مالک بن جاتا ہے اس لئے یہ دونوں فرقے عطارد کی پوجا کرتے ہیں۔

(۵) Thursday جس کو سنسکرت میں روی وار کہتے ہیں اور تھرس اور روی دونوں کے معنی مشتری سیارے کے ہیں اور دونوں کے مقصودی معنی ’’مشتری کی پوجا کا دن‘‘۔

(۶) Friday: شکروار: فرائی ماخوذ ہے فریگا دیوی جس کے معنی خدا کی بیوی یعنی زہرہ اور شکر بمعنی خوبصورتی عطا کرنے والی بیوی جس سے زہرہ مراد ہے اب دونوں کے مقصودی معنی ’’زہرہ کی پوجا کا دن‘‘

Saturday، سنیچر: سٹر زحل ستارے کو کہتے ہیں اور سنیچر ماخوذ ہے سچرن سے جس

کے معنی زحل کے آتے ہیں مقصودی معنیٰ ”زحل کی پوجا کا دن“

مغربی ممالک کے لوگ عیسائی ہونے سے پہلے ان سیاروں کو پوجتے تھے، اور بعض علاقوں میں اب بھی ان کے تہوار منائے جاتے ہیں، اور ہندو تو مسلسل اس شرک میں مبتلا چلے آرہے ہیں۔(١)

نوٹ: مہینوں اور ایام کے نام اگرچہ شرکیہ ناموں کی طرف منسوب ہیں مگر اب ان کی حقیقت بدل چکی ہے، اب یہ اپنے معنی موضوع لہ میں مستعمل نہیں ہیں کہ ان سے بت یا بتوں کی پوجا کا عقیدہ رکھا جاتا ہو، بلکہ ان سے صرف مہینے اور ایام کے نام ہی مراد ہوتے ہیں، لہٰذا اب ان کا استعمال شرک شمار نہیں ہوگا، اور ان ناموں کے بولنے سے مسلمان مشرک یا شرک کا گناہ نہیں ہوگا۔

مختلف ممالک میں استقبال کے نت نئے انداز

نئے سال کی آمد پر دنیا کے مختلف ملکوں میں خوشی کا اظہار کیا جاتا ہے، اور اس کے لئے مختلف ملکوں میں مختلف اقوام کے لوگ الگ الگ انداز سے نئے سال کا جشن مناتے ہیں، جس میں بعض اوقات تو ان کے اپنے کلچر، اپنی تہذیب وثقافت کی جھلک نمایاں ہوتی ہیں، جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، بلکہ یہ سب روایات اور رسومات توہم پرستی کے زمرہ میں آتی ہیں۔

امریکہ کے ٹائم اسکوائر کی گھڑی جیسے ہی رات کے گیارہ بجکر ۵۹ منٹ کا اعلان کرتی ہے، نئے سال کی آمد کا شور مچ جاتا ہے، دنیا بھر کے مختلف لوگ اپنے اپنے معیاری وقت کے مطابق نئے سال کے آنے پر جشن مناتے ہیں اور نئے سال کا کھلے دل کے ساتھ خیر مقدم کرتے ہیں آئیے دیکھئے کہ دنیا کے مختلف ملکوں میں نئے سال کو کس طرح خوش آمدید کہا

(١) مجلہ شاہراہِ علم ۱۴۲۹ھ ص ۱۱۹

جاتا ہے۔

نیویارک شہر کے ٹائمز اسکوائر times square میں نصف رات تک الٹی گنتی گننا مشہور روایت ہے، یہاں ہزاروں افراد وقت مقررہ پر ایک رخ دار کرسٹل Crystal کے گیند کو گرتے ہوئے دیکھنے کے لئے اکھٹے ہوتے ہیں۔

کیلی فورنیا کے شہر پلیسیڈ Placid میں ۱۸۹۰ء کے بعد سے ہر سال منائے جانے والی ”گلابوں کے ٹورنامنٹ کی پریڈ“ کے بعد عام طور پر کالجوں کے طلباء کے درمیان ”روز باؤل“ نامی اسٹیڈیم میں فٹبال کا مقابلہ ہوتا ہے، ٹیلی ویژن پر اس پریڈ اور کھیل کو دیکھنا نئے سال کا کافی پرانا مشغلہ ہے۔

تھائی لینڈ Thailand میں سال نو کے تہوار کو congener کہا جاتا ہے، نئے سال کی آمد پر یہاں کے باسی ایک دوسرے پر دل کھول کر پانی پھینکتے ہیں۔ اس کا مقصد نئے سال کی نیک خواہشات کا اظہار کرنا اور گزرے سال کی ناکامیوں اور غلطیوں کو دھونا ہوتا ہے۔

برازیل Brazil: فٹبال کے متوالے برازیل کے رہنے والے سال نو کا استقبال سفید رنگ کا لباس پہن کر کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اگر آپ نے مکمل طور پر سفید لباس زیب تن کیا تو کہ نئے سال میں کوئی بھی بدروح آپ کو نہیں ستائیگی۔

برازیل میں دوسری انوکھی روایت یہ بھی ہے کہ اس شام کو لوگ پہلے سے سمندر کے کنارے جا کر کھڑے ہو جاتے ہیں، اور جب گھڑی میں بارہ بجتے ہیں تو سمندر کی لہروں میں چھلانگ لگاتے ہیں اور اور جب وہ ڈبکی لگا کر سمندر کے پانی سے سر باہر نکالتے ہیں تو گویا وہ نئے سال میں داخل ہو چکے ہوتے ہیں۔ اور خیال کرتے ہیں کہ ایسا کرنے سے نیا سال انکے لئے خوش بختیاں لائے گا۔

چلی(۱) کے لوگ آدھی رات کے قریب یعنی بارہ بجے سے چند سیکنڈ پہلے ایک چمچا بھر مسور کی دال یا مختلف بیج کھاتے ہیں، اس کے ساتھ ایک کام اور بھی کرتے ہیں، یہ لوگ اپنے جوتے کے تلے میں بہت رقم بڑے اہتمام سے رکھ دیتے ہیں، ان کا یہ عقیدہ ہے کہ یہ عمل کرنے سے اگلے بارہ ماہ تک انہیں روپئے پیسے کی کوئی کمی یا پریشانی نہیں ہوتی۔

اور جولوگ چیالنج قبول کرنے کے شوقین ہوتے ہیں وہ نئے سال کی آمد کے موقع پر رات کا یہ خاص حصہ قبرستان میں گزارتے ہیں اور وہاں گھنٹی بجا کر اپنے محبوب لوگوں کو بتاتے ہیں کہ نیا سال آگیا ہے۔

چین China میں نئے سال کی آمد کے موقع پر زبردست آتش بازی کا مظاہرہ کیا جاتا ہے، اور آسمان نصف شب کو مختلف رنگوں سے منور ہو جاتا ہے۔

اہل چین نئے سال کی آمد کے موقع پر ایک اور خصوصی کام بھی کرتے ہیں۔ جو انکا لازمی رواج بن چکا ہے، یہ لوگ یعنی یہاں کے مرد، عورت، بوڑھے، اور جوان، سبھی سرخ لباس زیب تن کرتے ہیں سرخ غباروں اور اسی رنگ کی آرائشی چیزوں سے اپنے گھروں، بازاروں، گلیوں، دکانوں، اور عمارتوں کو سجاتے ہیں، اس رات کو بچوں کو سرخ رنگ کے لفافوں میں کچھ رقم بطورِ انعام دی جاتی ہے جسے بچے اپنے لئے نیک شگون قرار دیتے ہیں، ان کے عقیدہ کے مطابق یہ رقم ان کے لئے خوشی اور خوش حالی لاتی ہے۔

کیوبا Cuba کے لوگ جب نصف شب کو نیا سال آرہا ہو، اپنے گھروں کی صفائی کرتے ہیں، اسے جھاڑو لگاتے ہیں، اور کھڑکیوں میں کھڑے ہو کر باہر پانی پھینکتے ہیں تاکہ گھر کے اندر کی بلائیں باہر نکل جائیں اور سال بھر پلٹ کر نہ آئیں، اس طرح یہ لوگ اپنے گھروں کو موجودہ سال کے لئے صاف اور محفوظ بنالیتے ہیں۔

---

(۱) جنوبی امریکا اور مشرق اور پیسیفک اوقیانوس مغرب کو Andes پہاڑوں کے درمیان جا قابض ایک طویل، تنگ ساحلی پٹی میں ایک ملک ہے۔

ڈنمارکDenmark کے لوگ نئے سال کی آمد کے خاص موقع پر اپنے دوستوں اور پڑوسیوں کے گھروں اور مکانوں کی دیواروں پر پلیٹیں اور گلاس پھینکتے ہیں جو ان سے ٹکرا کرٹکڑے ٹکڑے ہوجاتے ہیں۔

اس کے علاوہ یہاں کے لوگ نصف شب کے قریب ایک کرسی پر کھڑے ہوتے ہیں اور جیسے ہی رات کے بارہ بجتے ہیں تو اپنی کرسیوں سے چھلانگ لگاتے ہیں اور یہ اعلان کرتے ہیں کہ وہ سال بھر اسی طرح ہر کام کریں گے، اور کسی سے نہیں ڈریں گے۔

ایکواڈور Ecuador میں نئے سال کی آمد پر لوگ اپنے سیاست دانوں کے پتلے تو جلاتے ہی ہیں، ساتھ ہی اس موقع پر فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے مخالفین کے پتلے بنا کر انہیں بھی نذر آتش کرتے ہیں، گویا اس ملک میں گزرے سال کے آخری لمحات اور آنے والے سال کی ابتدائی گھڑیوں میں لوگ اپنے دل کی بھڑاس نکال کر یہ خیال کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنے ناپسندیدہ لوگوں کو صفحۂ ہستی سے مٹادیا۔

جرمنی Germany کے لوگ نئے سال کی آمد کے موقع پر یعنی نصف شب کو اہل جرمنی ایک چائے کی پتی لے کر اسمیں پانی ڈالتے ہیں اور پھر اس میں جھانکتے ہیں تو انہیں مستقبل میں پیش آنے والے واقعات کی جھلکیاں دکھائی دے سکتی ہیں، ایسا ہی کچھ آسٹریلیا میں بھی ہوتا ہے، ویسے جرمنی کے لوگ نئے سال کی آمد کے موقع پر ٹی وی کے سامنے بیٹھ کر اپنے پسندیدہ پروگرام دیکھتے ہیں۔

یونان میں لوگ خصوصی طربیہ نغمات تیار کرتے ہیں، یہ تمام خوشی کے گیت بچے گاتے ہیں، جس کے بدلے میں ان کے بڑے، ان کے پڑوسی اور ان کے خاندان کے لوگ انہیں انعامی رقم بھی دیتے ہیں، اس رقم کی ان کی نظر میں بڑی اہمیت ہوتی ہے، اور یہ بچے اسے سال بھر سنبھال کر رکھتے ہیں، کیونکہ یہ ان کے لئے خوش بختی کی علامت ہے، اہل یونان نئے سال کا خیر مقدم کھلی آنکھوں سے کرتے ہیں، جیسے ہی کاؤنٹ ڈاؤن Countdown شروع ہوتی ہے تو اہل یونان اپنے گھروں، بازاروں کی لائٹس Lights بند کردیتے ہیں، تاکہ نئے سال کو اپنی کھلی اور تازہ آنکھوں سے اترتے دیکھیں، جسکے بعد تمام

لائٹس Lights آن ہو جاتی ہیں تو پرانے سال کا نام ونشان باقی نہیں ہوتا، جبکہ نیا سال پوری آب وتاب کے ساتھ آچکا ہوتا ہے۔

ہالینڈ Holland میں اکثر شوقین لوگ اس موقع پر سمندر کا رخ کرتے ہیں جہاں وہ اس سرد موقع پر سوئمنگ کے مختصر لباس میں نہ صرف منجمد کرنے والے پانی میں غوطہ خوری کرتے ہیں، بلکہ شمالی سمندر کی سرد لہروں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نئے سال کا استقبال اس جرأت سے کرتے ہیں کہ دیکھنے والے دنگ رہ جاتے ہیں گویا ہالینڈ کے لوگ آنے والے نئے سال کو جرأت و بہادری کے حوالے سے وقف کرتے ہیں۔

فلپائن Philippine کے لوگ ہر نئے سال کی آمد کے لئے مخصوص لباس زیب تن کرتے ہیں جن پر گول گول سے ڈیزائن ہوتے ہیں اس مخصوص شام کو وہ اپنی جیبوں میں گول سکے بھی رکھتے ہیں، کیونکہ گول ڈیزائن Design انہوں نے اس ایونٹ event کے لئے خاص کیا ہوا ہے۔

روس میں نئے سال کے حوالے سے ایک دلچسپ رواج ہے، ہوتا یہ ہے کہ اگر کسی کے دل میں کوئی ایسی خواہش ہے جسکے لئے وہ چاہتا ہے کہ یہ جلد از جلد پوری ہو، اس کا کوئی خواب شرمندہائے تعبیر نہ ہو تو وہ نئے سال کے موقع پر یہ کرتا ہے کہ اپنی اس خواہش کو کسی کاغذ پر لکھ کر اس کاغذ کو جلاتا ہے، اور اس کی راکھ شمپین Shampion کے ایک گلاس میں ڈال کر اسے غٹا غٹ پی جاتا ہے۔

اسکاٹ لینڈ Scotland کے لوگ اپنے دوستوں اور اپنے رشتہ داروں کو بہانے بہانے سے تحفہ دیتے ہیں، اگر آپ اپنے کسی دوست یا رشتہ دار کے ہاں اس وقت پہنچتے ہیں جب نیا سال اپنی آمد کی گھنٹی بجا رہا ہوتا ہے تو میزبان آپ کے سامنے بچھ جائیں گے اور آپ کی خاطر مدارات میں کوئی کسر نہیں چھوڑیں گے، لیکن چونکہ آپ اس گھر میں نئے سال میں داخل ہونے والے پہلے فرد قرار پائے، اس لئے آپ پر لازم ہے کہ اپنے میزبانوں کے لئے تحفے تحائف ضرور لے جائیں، لیکن یہ تحفے زیادہ قیمتی نہیں ہونے چاہئے، بلکہ کم قیمت اور

چھوٹے ہوں ۔مگر ان سے محبت کا اظہار ہوتا ہو۔

جوہانسبرگ Johannesburg کے لوگ نئے سال کی آمد کے موقع پر اپنا پرانا فرنیچر بجلی کی مصنوعات جیسے: ریڈیو، ٹی وی وغیرہ اٹھا کر بڑی بے پرواہی کے ساتھ گھروں کی کھڑکیوں میں سے باہر سڑکوں پر پھینک دیتے ہیں، گویا جنوبی افریقہ کے لوگ نئے سال کے آنے سے پہلے پرانی چیزوں سے نجات پانا پسند کرتے ہیں، اور نئے سال میں نئی چیزیں خریدتے ہیں، تاکہ نیا زمانہ ان کے لئے خوشیاں لائے۔

اسپین Spain اور اسپینی زبان بولنے والے دوسرے ملکوں میں نصف شب کو بارہ انگور کھانا یہاں کی قدیم روایت ہے، بارہ انگور بارہ مہینوں کی ترجمانی کرتے ہیں، اور انہیں کھانے کا مقصد یہ ہے کہ آنے والے سال کا ہر مہینہ ان کے لئے خوش بختی لائے گا۔

روس سالِ نو کی آمد کے موقع پر روس میں بہت زیادہ کھانا پکایا جاتا ہے تاکہ نیا سال خوشحالی لے کر آئے، کرسمس ٹری Christmas tree نصب کرتے ہیں، اور گھر کو مختلف درختوں کی ٹہنیوں سے سجا دیتے ہیں، دراصل روس میں کرسمس ٹری Christmas tree کو نیو ئیر ٹری (new year tree) کہا جاتا ہے، ایک اور روایت کے مطابق سالِ نو کے موقع پر گزرنے والے سال میں رونما ہوئے واقعات کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

۳۱ر ڈسمبر کو بارہ بجے سے چند منٹ پہلے صدر روس عوام سے خطاب کرتے ہیں، مختلف قومیتوں کے تارکین وطن کا یقین ہے کہ تیز شور جیسے پٹاخے اور توپوں کا داغنا گزرے ہوئے سال کی بدروحوں کو بھگاتا ہے، اور نئے سال کو بدروحوں سے پاک بنانے کو یقینی بناتا ہے۔

بدروحوں کو گولی مار کر بھگانا، ابتدائی دور کے امریکیوں میں اتنا زیادہ مقبول ہوگیا تھا، کہ 1700ء کے وسط میں کچھ علاقوں میں شور اور خطرات کو کم کرنے کے لئے اس پر پابندی عائد کردی ۔تاہم نئے سال کی منادی کرنے کے لئے شور شرابہ اب بھی آتش بازی، سیٹیاں

بجانے اور پارٹیوں میں شور کی صورت میں نئے سال کی تقریبات کالازمی حصہ ہے۔(۱)

اسلامی تقویم کو رواج دیں

خلاصۂ مضمون یہ نکلا اتوار، سنڈے ''سورج کی پوجا کا دن''۔ سوموار، منڈے ''چاند کی پوجا کا دن''۔ منگل، ٹیوز ڈے ''مریخ کی پوجا کا دن''۔ بدھ، ویڈنس ڈے ''عطارد کی پوجا کا دن''، شکروار، فرائی ڈے ''زہرہ کی پوجا کا دن''۔ روی وار، تھرس ڈے ''مشتری کی پوجا کا دن''، سنیچر، سٹر ڈے ''زحل کی پوجا کا دن''۔

آپ نے دیکھ لیا کہ مروجہ تقویم نے ہفتہ کے دنوں کے پیچھے باقاعدہ مذہبی روایات کارفرما ہے اور ہم مسلمان غیر شعوری اور نادانستہ طور پر ان دیومالائی تصویرات کو سینے سے لگا کر ان ناموں کی ترویج کر رہے ہیں۔

اس لئے انتہائی ضروری ہے کہ مسلمانوں میں ہفتہ کے دنوں کے وہی نام رائج کئے جائیں جو اسلامی تقویم نے ہمیں عطا کئے ہیں اور عرب ممالک میں جو رائج ہیں۔

جیسے :**الجمعة، السبت، الاحد، الاثنين، الثلثاء، الاربعاء، الخميس۔**

اور اگر مذکورہ نام غیر مانوس ہونے کی وجہ سے مشکل محسوس ہوتے ہوں تو فارسی زبان کے نام رائج کئے جائیں، جو اورنگ زیب عالمگیرؒ کے زمانے میں رائج تھے اور اب بعض علاقوں میں بولے اور لکھے جاتے ہیں، جیسے جمعہ، شنبہ، یکشنبہ، دوشنبہ، سہ شنبہ، چہارشنبہ، پنجشنبہ۔

خصوصاً اہل مدارس کو اس سلسلے میں غور و خوص کرنا چاہیئے اس لئے کہ سالانہ کیلنڈر چھپتے ہیں اگر یہاں اصلاح کر لی جائے تو بدعات و رسوم کا ازالہ ہوسکتا ہے۔

حاصل یہ کہ ہمیں اپنی پہچان ہجری تقوم کو بنانا چاہیئے بلکہ اسے یاد رکھنا چاہیئے، کہیں ایسا نہ ہو

---

(۱) روزنامہ منصف

کہ آئندہ چند سالوں میں ہماری نئی نسل کے ذہنوں سے یہ تصور ہی محو ہو جائے کہ ہم بھی ایک زندہ جاوید تہذیب وتاریخ کے امین ہیں، ہمارا بھی ایک شاندار ماضی ہے، ہمارا بھی ایک تشخص ہے، بلکہ تمام تہذیبوں نے تہذیب کا درس ہم سے ہی لیا ہے۔

ترقی کی نئی راہیں جو زیر آسمان نکلیں
میاں مسجد سے نکلے اور حرم سے بیبیاں نکلیں

مغربی تہذیب کی یلغار کا اثر

مذکورہ تفصیلسے واضح ہوتا ہے کہ آج کل جس انگریزی تقویم (calendar) کا عام رواج ہے وہ دراصل قدیم رومیوں کی تہذیبی بنیادوں پر رکھی گئی تقویم ہے، اور مہینوں کے نام تقریباً کسی نہ کسی بت کی یادگار کے طور پر رکھے گئے ہیں، اس کے بالمقابل اسلامی تقویم جس کا آغاز محرم سے کیا گیا ہے، اسلامی مہینوں کے نام ہیں، اسلامی عبادات کی پوری نمائندگی کرتے ہیں، یہ مہینے زبانِ وحی سے طے کئے گئے ہیں اسلامی تقویم کا آغاز واقعۂ ہجرت سے کیا گیا، جس طرح عبادات خدا کی طرف سے متعین کردہ ہیں، اسی طرح عبادات کو جن مہینوں سے وابستہ کر دیا گیا ہے وہ بھی خدا کی طرف سے متعین کردہ ہے۔

آج مغربی تہذیب کی یلغار کا عالم یہ ہے کہ ہماری نئی نسل اسلامی مہینوں کے ناموں سے تک واقف نہیں، اگر اسے کسی معاملہ میں اسلامی اور قمری تاریخ کا حوالہ دیا جائے تو وہ بالکل سمجھ نہ پائیں گے، اسے یہ تک معلوم نہیں کہ اسلامی سال کا آغاز کس مہینہ سے ہوا؟ کس قدر افسوسناک بات ہے کہ ہر وقت اپنی زبانوں سے رومی بتوں کے نام دہراتے رہیں، لیکن اسلامی مہینوں سے ہمیں کوئی سروکار نہیں، اسلامی مہینے دراصل شعائر ہیں اور قرآن مجید میں شعائر کے احترام کو تقویٰ کی علامت قرار دیا گیا ہے "ومن یعظم شعائر اللہ فانھا من تقویٰ

القلوب"(۱) یہود ونصاریٰ کو اپنی تقویم پر فخر ہے لیکن مسلمانوں کو اسلامی تقویم جو توحید پر قائم تقویم ہے نہ صرف یہ کہ فخر نہیں بلکہ اسلامی تقویم اور مہینوں کے استعمال کو ایک طرح کی گالی سمجھا جاتا ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلم معاشرہ میں اسلامی مہینے یاد کروائیں، والدین اولاد کو اسلامی مہینے یاد کروائیں شادی بیاہ اور مختلف حالات میں اسلامی مہینوں کا استعمال کریں۔

دوافسوسناک پہلو

مغربی تہذیب ونقالی کے دو پہلو انتہائی افسوسناک ہیں : ایک یہ کہ مسلمانوں کا اسلامی تہذیب کو چھوڑ کر غیروں کے طریقوں کو اپنانے کا مطلب یہ ہے کہ انہیں اسلامی تہذیب کے کامل ومکمل اور سب سے عظیم تہذیب ہونے کا یقین نہیں، تب ہی تو وہ دوسرے تہذیب کی چیزوں کو اپنا رہے ہیں، واقعہ بھی یہی ہے کہ ایسے مسلمان عموماً مغربی تہذیب سے مرعوب ہوتے ہیں اور اسلامی تہذیب کو اس کے مقابلہ انتہائی کمزور اور غیر ترقی یافتہ سمجھتے ہیں۔

صورتِ حال کا دوسرا پہلو یہ ہے کسی بھی طور وطریقہ کو آدمی اسی وقت اپناتا ہے جب کہ وہ طریقہ اس کے دل میں محبوب و پسندیدہ بن جاتا ہے، مغربی اور دیگر اقوام کے طریقوں کو اپنانا دراصل ربانی تہذیب کے مقابلے میں خدا کی باغی اقوام کے طریقوں سے محبت کرنا ہے، جو سراسر ایمانی تقاضوں کے خلاف ہیں۔

غیروں کی نقالی کے چند اسباب ہیں، جن سے امت تیزی کے ساتھ مغرب کے سیل رواں میں بہتی جارہی ہے۔ ذیل میں ان کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے:

(۱) الیکٹرونک میڈیا (Electronic Media) کے ذریعہ مغربی تہذیب کی اشاعت، چنانچہ ٹی وی کے ذریعہ جو کچھ پیش کیا جارہا ہے وہ سب مغرب کی نقالی ہوتی ہے

---

(۱) سورۃ الحج آیت: ۲۲

اور مسلمان ٹی وی کے ذریعہ مغرب کی ساری چیزوں کو اپناتے ہیں۔

(۲) اسلامی تہذیب اور اس کی خوبیوں سے مسلمانوں کی ناواقفیت، بہت سے تعلیم یافتہ مسلمانوں کے ذہنوں میں اسلام کی مسخ شدہ تصویر بٹھائی گئی ہے، جس میں اسلام کو ایک انتہائی پسماندہ اور غیر ترقی یافتہ مذہب کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔

(۳) ذرائع ابلاغ کے ذریعہ اسلام کے خلاف زبردست پروپیگنڈا۔ چنانچہ مغربی ذرائع ابلاغ نے منصوبہ بند طریقہ سے اسلام کو بدنام کرنے کی مہم چلائی، جس سے انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ سب سے زیادہ متأثر ہوا۔

(۴) سیکولر نظام اور دینی تعلیم سے محرومی بھی مغرب سے دلدادگی کا ایک اہم سبب ہے۔ عصری اداروں میں سارا ماحول غیر اسلامی اور مغربی طرز کا ہوتا ہے، جس سے نوجوانوں کے ذہن اسی طرح تشکیل پاتے ہیں۔ (مجلہ شاہراہ علم ۲۹ سنہ ۱۴۲۹ھ ص ۱۲۱)

کہیں ایسا نہ ہو کہ بہت دیر ہو جائے

دراصل اس وقت دنیا سچی روحانیت سے محروم ہے، وسائل کی کثرت ومن پسند زندگی گذارنے کے باوجود انسان کی روح کو سکون نہیں مل رہا ہے، اسی لئے لوگ سکون کی تلاش میں ان میلوں تماشوں کا سہارا لیتے ہیں، لیکن دل کا سکون اور روح کی تشفی تو رجوع الی اللہ اور تعلق مع اللہ سے حاصل ہوتی ہے، اس لہو ولعب سے حاصل ہونے والی عارضی خوشی اور جھوٹی مسرت سے تسکین پانے کی کوشش کرنا خود کو دھوکہ دینے کے مترادف ہے، اور خود کو دھوکہ دینے والا جلد ہی ہر چیز سے حتی کہ اپنے آپ سے بھی اکتا جاتا ہے، اور اس وقت جو بے چینی اور بے کلی انسان پر مسلط ہوتی ہے، اس کا مداوا پھر کسی کے پاس نہیں ہوتا، اسی لئے مسلم معاشرہ اور بالخصوص جدید تہذیب (modernism) کی فریب خوردہ نوجوان نسل کو وقت رہتے پر ہی سنبھلنے اور ہوش کے ناخن لینے کی ضرورت ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ بہت دیر ہو جائے اور ہم خوابِ خرگوش میں مست رہیں۔

نیوائیر نائٹnew year nightکا آغاز

دیگر فتنوں کی طرح یہ فتنہ بھی یہود ونصاریٰ کی اسلام دشمنی کا ایک حصہ ہے جو انیسویں صدی کا پیدا شدہ ہے،تاریخی روایات سے اس کا شجرہ نسب ’’رائل نیوی‘‘ کے منچلے نوجوان سے جاملتا ہے،اس کا پس منظریہ ہے کہ’’رائل نیوی‘‘Royal Navy کے نوجوان اکثر بحری جہاز کا سفر کیا کرتے تھے،جو بہت دور دراز کا سفر ہوا کرتا تھا،اس طویل سفر کی وجہ سے ان کی طبیعتیں اکثر بے چینی اور بوریت کا شکار ہوجاتی تھیں،چنانچہ وہ اس بے چینی،بوریت اور اکتاہٹ کو دور کرنے کے لئے مختلف تقریبات منعقد کیا کرتے تھے،کبھی تو یہ تقریبات ایک دوسرے کی سالگرہ کی شکل میں مناتے،کبھی اپنے بچوں کی سالگرہ کرتے تو کبھی اپنے گھروں کی سالگرہ مناتے،جب تمام لوگ خود اپنے ہم سفر،اولاد اور گھروں تک کی سالگرہ منانے سے فارغ ہوگئے لیکن ان کی بے چینی ابھی دور نہ ہوئی تو انہوں نے ایک قدم آگے بڑھ کر خوشی منانے کا نیا طریقہ ایجاد کرلیا،یعنی اپنے جانوروں کتے،بلیوں کی سالگرہ منانے لگے،جب یہ چیزیں بھی ان کی اضطراری اور اکتاہٹ کو ختم نہ کرسکیں،اوران کا دل نہ بھرا تو دوسرے طریقہ سے اپنی خواہش کا سامان مہیا کرنے میں کوشاں رہے،اتفاقاً اسی دوران دسمبر کا مہینہ تاریخ کی منزلیں طے کرتا ہوا اپنی انتہا کو پہنچنے کے قریب تھا کہ اچانک ان نوجوانوں میں سے ایک کے ذہن میں یہ فاسد خیال ابھرا کہ کیوں نہ ہم نئے سال کا استقبال کریں۔اسے خوش آمدید کہیں اور اس کی خوشیاں منائیں،چنانچہ دسمبر کی ۳۱/ تاریخ یکم جنوری میں تبدیل ہونے سے قبل جہاز کا سارا عملہ جمع ہوا،اور جہاز کو خوب آراستہ کیا گیا،شراب نوشی کی گئی،موسیقی بجائی گئی،ناچ گانے کا اہتمام کیا گیا،اوررات ٹھیک بارہ بج کر ایک منٹ پر تمام لوگوں نے آپس میں ایک دوسرے کوhappy new year کہہ کر مبارکبادیاں دیں،خوشیاں منائیں،اوراس طرح اس فتنہ کا آغاز ہوا،جو ہر سال ترقی کرتا گیا۔

آئندہ سال ۳۱ دسمبر کو جونیئر Junior آفسروں نے اپنے سینیر senior آفیسروں

سے اس بے ہودہ رسم میں شرکت کرنے اور خوشی کے اظہار کے لئے چند رقاص عورتوں کا مطالبہ کیا، سینئر آفیسروں نے ان کی اس خواہش کو ضرورت کا تقاضہ سمجھ کر ساحل سمند سے چند فاحشہ قسم کی عورتوں کو منگوا کر ان جونیئر آفیسروں کو پیش کر دیا۔ پھر یوں ہوا کہ ٹھیک بارہ بجے جہاز کی روشنی گل کر دی گئی، جس سے تمام مسافرین کی چیخیں نکل گئیں اور پھر یکا یک جہاز کو روشن کیا گیا، اور جہاز کے بڑے کمانڈر نے ہاتھ میں مائک لے کر تمام مسافرین کو نئی سال کی ’’ہیپی نیوائیر‘‘ happy new year کہہ کر مبارکباد پیش کی، اور تمام لوگوں نے خوشی خوشی تالیاں بجا کر اس کا شکریہ ادا کیا، اس کے بعد والے سال اس قبیح رسم میں مزید اضافہ ہوا کہ شادی شدہ لوگ اپنی بیویوں، منگیتروں اور زنانہ دوستوں یعنی ’’گرل فرینڈ‘‘ کو ساتھ لے کر اسکاٹ لینڈ Scotland کے ’’اناڈین‘‘ ساحل پر جمع ہوئے کچھ کنواری نوجوان لڑکیاں بھی وہاں جمع ہوئیں، جو اپنے آپ کو کنوارے اور اکیلے آنے والے نوجوان لڑکوں کے سپرد کرتیں۔

جہاں شہنائیاں، ڈھول، تاشے، باجے اور ناچ گانوں کا سلسلہ شروع ہوا، پھر اس طرح بے حیائی، بے غیرتی، فحاشی، بدکاری، وزناکاری کے ساتھ ہیپی نیوائیر کا انسانیت سوز، ایمان سوز، اور اخلاق سوز فتنہ پروان چڑھتا گیا، گویا عدم سے وجود میں آکر عروج کو پہونچا، آج دنیا کے بیشتر ممالک شمسی سال نو کے آغاز پر ’’نیوائیر نائٹ‘‘ New year night کے عنوان سے اس فحش فتنہ کو فروغ دے رہے ہیں، اور دنیائے انسانیت کے لئے ہزارہا برائیوں اور منکرات کا دروازہ کھول رہی ہیں۔

یاد رہے کہ یہ امریکیوں اور عیسائیوں کی اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ایک خطرناک سازش ہے، جس کا مقصد صرف اور صرف مسلمانوں کو اسلامی تعلیمات اور مذہبی روایات سے ہٹا کر ان کی شناخت اور تشخص کو تہس نہس کرنے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔

نیوائیر نائٹ اور مسلم معاشرہ

چند سالوں سے ایک خطرناک رجحان یہ چل پڑا ہے کہ مغرب سے درآمدہ بے ہنگم، مضحکہ خیز اور اسلامی روایات سے متصادم مختلف قسم کے فضول و نامعقول تہوار اور دن منائے جانے لگے ہیں، پھر رفتہ رفتہ یہ منکرات ورسم ہماری مذہبی شناخت کو کھوکلا کرتی جارہی ہیں، آج مغربیت کا جنون، سر چڑھ کر بول رہا ہے، چنانچہ مغربی تہذیب کی یلغار کے نتیجے میں مسلم معاشرہ خود بھی ایسی واہیات قسم کی رسوم اور نت نئے دن اور راتیں منانے کو اپنے لئے باعث افتخار سمجھنے لگا ہے (اعاذنا اللہ منہ)

پہلے یہ سلسلہ اپریل فول April fool کی جھوٹی اور دھوکہ بازی کی بری صفت تک محدود تھا، مگر دیکھتے ہی دیکھتے کبھی ’’ویلنٹائن ڈے‘‘ valentine day تو کبھی ’’فرنڈشپ ڈے‘‘ Frindship day تو کبھی ’’ٹیچرس ڈے‘‘ Teachers day تو کبھی ’’چلڈرنس ڈے‘‘ Children day تو کبھی ’’مدرز ڈے‘‘ mothers day تو کبھی ’’برتھ ڈے‘‘ Birth day تو کبھی ’’کرسمس ڈے‘‘ Christmas day کبھی ’’گڈ فرائڈے‘‘ Good friday کبھی ’’نیوائیر ڈے‘‘ New year day اور نیوائیر نائٹ new year night۔

اور نہ جانے کتنے بے ہودہ ولایعنی دن اور راتیں مغربی تہذیب کے زیر اثر مسلم معاشرہ میں آئیں ہیں، ان واہی تباہی ناموں کے ساتھ منائے جانے والے منکرات سے جہاں اسلامی پہچان متأثر ہورہی ہے، وہیں مسلم معاشرہ پر اس کے ناگفتہ بہ اثرات پڑرہے ہیں، اور روز بروز ان کی شدت ووسعت بڑھتی جارہی ہے۔

نیوائیر نائٹ (سالِ نو کا جشن واستقبال) کے نام پر اس وقت طوفان بدتمیزی و بے حیائی، فحاشی وعریانیت کا ننگا ناچ اور ہزار ہا قسم کی برائیاں فروغ پارہی ہیں، نہ جانے اس رات کتنی جانیں ہلاکت وبربادی کے دروازہ پر دستک دیتی ہیں، کتنی ہی عصمتیں پامال کی

جاتی ہیں، ہزاروں بلکہ لاکھوں کروڑوں روپئے جو حلال طریقہ سے کمائے گئے تھے۔اس رات مئے نوشی،عیش کوشی،ناچ گانوں اور رقاصاؤں پرلٹائے جاتے ہیں۔

ہرسال نیوائیر نائٹ کے موقع پر اس طرح کی بے شمار خبریں اخباروں کی زینت بنتی ہیں کہ فلاں مقام پر نیوائیر کا جشن مناتے ہوئے اتنے افراد ہلاک ہوئے،اتنے افراد مئے نوشی کی وجہ سے زخمی،اتنے نوجوان موٹر ریزنگ کرتے ہوئے شدید زخمی،اتنی رقاصائیں دیر رات تک ناچتے گاتے ہوئے گرفتار وغیرہ،بلاشبہ یہ چیزیں باعث افسوس ہیں،مگر اس سے بھی زیادہ بری اور شرمناک بات امتِ مسلمہ کیلئے تب ہوتی ہے،اور مارے شرم کے مسلم معاشرہ کا سر تب نیچے ہوجاتا ہے جب ان افعال میں شریک ہونے والے اکثروں کے نام اسلامی ہوتے ہیں۔ذرا غور کریں کہ ہم کیا کررہے ہیں اور کدھر جارہے ہیں؟۔

نظر سوئے دنیا قدم سوئے مرقد
کہاں جارہے ہو ؟کدھر دیکھتے ہو ؟(۱)

۳۱ر دسمبر کی یہ رات جوکسی ویلنٹائن ڈے valentine day سے کم نہیں،اس رات میں شائد ہی کوئی ایسا گناہ بچتا ہو،جو اس رات میں نہ ہوتا ہو،بلکہ کچھ لوگ گناہوں کی شروعات آج ہی سے مبارک رات سمجھ کر کرتے ہیں،اس رات میں کچھ لوگ پہلی بار شراب کو منھ سے لگاتے ہیں،جسم فروشی وزنا کے دربار سجا کر بے حیائی آوارگی وفحاشی کو فروغ دیتے ہیں بھولی بھالی لڑکیوں کو happy new year بتا کر ان کی عزتوں کے ساتھ کھلواڑ کرتے ہیں پٹاخہ،سنیما بینی،جوّا بازی،ناچ گانے کا بازار گرم رہتا ہے،یہ وہ رات ہے جس میں ہر وہ برے کام کئے جاتے ہیں جسے اسلام نے حرام قرار دیا ہے Happy new year کے نام پر بڑی بڑی پارٹیاں اور جگہ جگہ پروگرام منعقد کرکے فضول خرچی کی جاتی ہے،حلانکہ یہی مال یہی پیسہ لوگوں کی فلاح وبہبودی کے لئے کرسکتے ہیں،انسانی حقوق

---

(۱) ماخوذ ماہنامہ پیام ۲۰۱۵ء

کے ٹھیکیدار بننے والی دنیا کی تنظیمیں بھی اس موقع پر چشم پوشی سے کام لیتی ہے۔

یہی پیسہ یہی مال غریب، مسکین، بیواؤں، ونادر طلبۃ پر خرچ ہوسکتا ہے، کسی کے گھر کا چولا جل سکتا ہے، سردی سے بچنے کے لئے سوئٹر، کمبل، وغیرہ تقسیم کے کام آسکتا ہے، کسی بیمار کے علاج کے کام آسکتا ہے، کسی بھوکے کو روٹی کھلانے کام آسکتا ہے، حدیث رسول ﷺ ہے کہ: مسکین اور بیوہ عورت کی مدد کرنے والا اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کرنے والے کی طرح ہے۔ عن أبي هريرة، قال :قال النبي ﷺ: الساعي على الأرملة و المسكين، كالمجاهد في سبيل الله، أو القائم الليل الصائم النهار (۱) بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ "جو شخص کسی مسلمان کو ضرورت کے وقت کپڑا پہنائے گا، اللہ تعالیٰ اس کو جنت کے سبز لباس پہنائے گا، اور جو شخص کسی مسلمان کو بھوک کی حالت میں کچھ کھلائے گا، اللہ تعالیٰ اس کو جنت کا پھل کھلائے گا، جو شخص کسی مسلمان کو پیاس کی حالت میں پانی پلائے گا، اللہ تعالیٰ اس کو جنت کی ایسی شراب پلائے گا، جس پر مہر لگی ہوئی ہوگی. ما من مسلم كسا مسلما ثوبا إلا كان في حفظ من الله ما دام منه عليه خرقة، هذا حديث حسن غريب من هذاالوجه۔(۲)

ہم کدھر جارہے ہیں؟

زمانہ جس برق رفتاری سے دورِ نبوت سے دور ہوتا جارہا ہے اتنی ہی تیزی سے اسلامی ماحول ومذہبی شناخت اور ملی تشخص بھی رخصت ہو رہا ہے، نوجوان نسل اور بالخصوص عصری علوم وفنون کے دلدادہ مذہبی طور وطریق اسلامی شناخت سے بیزار اور مغربی تہذیب وثقافت کو اختیار کرنے میں فخر محسوس کرتے نظر آرہے ہیں۔

ہر شخص ہر ادارہ اس کوشش میں ہے کہ وہ خود کو مغربیت کے طور وطریق میں ڈھال

---

(۱) بخاری شریف، حدیث: ۵۳۵۳۔

(۲) سنن ترمذی، حدیث: ۲۴۸۴۔

کر سرخرو ہو جائے، افکار و خیالات اعمال و کردار ہر چیز میں مغربیت اس حد تک محبوب ومقبول بن چکی ہے کہ لباس مغربی، رہن سہن مغربی، تراش خراش مغربی، کردار مغربی، انداز مغربی، تہذیب مغربی، معاشرہ مغربی الغرض ہر چیز مغربی رنگ میں رنگین اور مغربی تکلفات کے بوجھ تلے دب چکی ہے، کوئی اس بوجھ کو اتارنے کے لئے تیار نہیں، بلکہ اس بوجھ کو نام نہاد جدت پسندی ترقی یافتہ طبقہ ''ارتقاء'' کا نام دیتا ہے، اور جو اس کے خلاف کرے یا مغربی مرعوبیت کو قبول نہ کرے، اسے قدامت پسند اور دقیانوس جیسے الفاظ سے نوازا جاتا ہے۔

ہر سال نیو ائیر نائٹ New year nighr کے موقع پر شہر کے حساس اور مسلم اکثریتی علاقوں میں نوجوان برقعہ پوش لڑکیاں بیکریوں سے نیو ائیر کے لئے کیکس، Cakes گفٹس، Giftsاور گریٹنگ کارڈس Greeting cards خریدتی ہوئی دیکھی جاتی ہیں، پوچھنے پر جواب ملتا ہے کہ ''ٹائم پاس'' اور چھوٹے بچوں کی خوشی کے لئے کیا جارہا ہے۔

بڑے بڑے شہروں کے معروف شاپنگ مالوں میں نیو ائیر کے موقع پر مال کے ذمہ داران کی جانب سے ناچ گانے کا اہتمام کیا جاتا ہے، جس میں نوجوان مسلم لڑکیوں کے والدین دور کھڑے یہ بے حیائی کا تماشہ دیکھتے ہوئے تالیاں بجا کر انہیں شاباشی دیتے ہیں (الامان والحفیظ)۔

اب تو ''نیو ائیر نائٹ'' (نئے سال کا جشن) کی تقریبات کا مسلم معاشرہ ایسا عادی ہو گیا ہے، جیسا کہ کسی مذہبی تہوار کا عادی ہوا کرتا ہے۔

مسلم گھرانے بھی نیو ائیر نائٹ کے موقع پر سارے گھر والوں کے ساتھ مل کر کیک cake کاٹتے اور ڈی جے DJ وغیرہ کے ساتھ رقص وسرور کی محفلیں سجاتے ہیں، نوجوان نسل گلیوں میں یہ جشن مناتے نظر آتی ہے، گویا مسلم معاشرہ کا اکثری طبقہ مغرب کی

غلاظتوں میں لتھڑنے کا عادی ہوا جارہا ہے، جسے دیکھ کر لگتا ہے کہ اگلے چند سالوں میں یہود ونصاری کی نقالی اتنی عام ہوجائے گی کہ قدرت کی طرف سے کسی بڑے عذاب کے بغیر نہ چھوٹ سکے گی۔

کیوں کہ عوام الناس دین داری کی ترغیب دینے والی آوازوں سے اتنی بے توجہی برت رہی ہے اور بے دینی کی طرف اتنی شدت اورکثرت سے ان کا میلان ہورہا ہے کہ معاملہ اب داعیان دین اور مبلغین و واعظین کے بس میں نہیں رہا۔پھر ایسے وقت انتظار کرنا چاہئے کسی ایسی غیبی آفت کا جو مستیوں کی لذت میں گم ہوجانے والے،شہوت پرستی میں مدہوش ہونے والوں کو کان پکڑ کر سیدھا کردے،چنانچہ آج ایسی غیبی آفات روز بروز ہمارے مشاہدے میں آتی رہتی ہیں، پھر بھی غفلت کا پردہ چاک کرنے کو کوئی تیار نہیں ہوتا آخر مسلم معاشرہ کو کیا ہوگیا ہے؟ کون ان کو بتلائے کہ یہ سارے کام گناہ اور اللہ تعالی کے غضب کو بھڑ کانے والے ہیں ،یہ کیسے مسلمان ہیں؟ جو کہتے ہیں کہ اسلام ہمارا دین ہے ،مگر ہر معاملے میں لادینی اور اسلام مخالف قوموں کی بات مانتے ہیں ،قرآن حکیم کو اللہ کی کتاب تو مانتے ہیں ،مگر اس کو اپنی انفرادی واجتماعی زندگیوں میں نافذ کرنے کے بجائے صرف خوبصورت غلافوں میں لپیٹ کر طاقوں میں سجانے،تعویذوں میں گھول کر پلانے ،دلہنوں کے سر پر گزارنے اور اپنے جھوٹ سچ پر دوسروں کو یقین دلانے کیلئے قسم کھانے تک محدود کردیا ہے ،ہم محمد ﷺ کو اللہ کا آخری نبی تو مانتے ہیں ،مگر اس پاک ہستی کے احکامات وارشادات کو بھی بھلا بیٹھے ہیں ،ہمارے معاملات روز بروز ان اسلامی تعلیمات وہدایات کے برعکس بڑھتے جارہے ہیں ،جو بحیثیت مسلمان کے ہمارے لئے ضروری اورلازمی ہیں ہم نے تو مسلمان ہوتے ہوئے بھی اللہ کی حدود کا خیال نہ رکھا،تو کیا ہم مسلمان کہلانے کے مستحق ہیں؟ سوچیں !غور کریں اورخود جواب تلاش کریں۔

لبرل ازم (liberalism) کی کوئی حد بھی ہے! دین میں تنگی نہیں ہے یہ بات اپنی

جگہ حق ہے لیکن بنیادی سوال یہ ہے کہ اعتدال پسندی، وسعت نظری، آزاد خیالی یالبرل Liberal اور موڈریٹ Moderat ہونے کی بھی کوئی حد ہوگی آخر! حقیقت تو یہ ہے کہ اس دین میں تنگی نہ ہونے اور وسعت نظری کے اس غیر مطلوب اور نامسعود نظریے کو اتنا مستحکم کردیا گیا ہے کہ اب دین اسلام کو ہی لبرل یا موڈریٹ اسلام اور تنگ نظر یا فنڈامنٹل Fundamental اسلام جیسے باقاعدہ دوخانوں میں بانٹ کر رکھ دیا گیا ہے۔ اور جو دین کے بنیادی تقاضوں کے ساتھ مصالحت نہ کرتے ہوئے غیر دینی رجحانات کے فروغ میں معاون نہیں بنتا اسے فنڈامنٹلسٹ Fundamentalist، قدامت پسند قرار دیا جاتا ہے اور پورے سماج میں اور خود اپنے ملّی حلقوں میں ہی اچھوت بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جبکہ لبرل یا موڈریٹ اسلام کا نمائندہ اسے قرار دیا جاتا ہے جو دین کے بنیادی تقاضوں کو بالائے طاق رکھتا ہے اور دین وشریعت مطہرہ کو دنیاوی اور نفسانی تقاضوں اور آلائشوں سے ہم آہنگ کرنے کے لئے حمیت دینی کا سودا کر بیٹھتا ہے۔ اور دنیا اسے سر پر بٹھائے رکھنے کا ناٹک کرتی رہتی ہے، ہمارے سامنے عبدالکریم چھاگلہ، حمید دلوائی، تسلیمہ نسرین، سلمان رشدی جیسی درجنوں مثالیں موجود ہیں جنہیں دنیا نے لبرل اسلام کا نمائندہ بنا دیا جبکہ وہ کفر والحاد کی چوکھٹ پر پڑے ہوئے نظر آتے ہیں اور سوچنے والا سوچتا رہ گیا کہ:

کردیا اہلِ حرم پر برہمن نے کیا فسوں
شیخ بھی مصروف ہیں تعمیر بت خانہ میں آج (۱)

اپنی شناخت کھو رہے ہو

مسلم معاشرہ مغربیت کی اندھی تقلید کرتے ہوئے کتنے ناجائز دن، راتیں اور تقریبات منعقد کر رہا ہے، لیکن آج تک یہ دیکھا نہیں گیا کہ دوسری قومیں ہمارے اسلامی تہوار مناتے

(۱) ماہنامہ پیام ۲۰۱۵ء۔

ہوں، مسلمان دیوالی منائے گا مگر کوئی غیر مسلم عید الفطر نہیں منائے گا، مسلمان بسنت مناتے ہوئے پتنگ بازی کرے گا مگر کوئی غیر مسلم عید الاضحیٰ نہیں منائے گا، مسلمان کرسمس منائے گا مگر کوئی عیسائی عید جمعہ میں شریک نہ ہوگا۔

ایسا ہرگز نہیں ہوتا کہ اغیار آپ کو دیکھ کر ذی الحجہ میں ''قربانی ڈے'' منائیں یا آپ کی تقلید کرتے ہوئے ایام تشریق میں بلند آواز سے تکبیر پڑھا کریں، آپ کی روش اختیار کرتے ہوئے اسلامی رسوم ومذہبی روایات پر عمل شروع کردیں، یا کبھی ''شب براءت نائٹ'' ''شب قدر نائٹ'' عید ین نائٹس nights'' منانے لگیں، ایسا پوری دنیا میں کسی ملک یا خطہ کے غیر مسلم نہیں کرتے اور نہ کریں گے۔

لیکن یہ ضرور ہو رہا ہے کہ جو کچھ وہ کر رہے ہیں، ہم بھی کر رہے ہیں، ہم ''برتھ ڈے'' birth day، اینورسری ڈے annibversary day'' بھی مناتے ہیں ''ویلنٹائن ڈے valentine day، فرنڈ شپ ڈے frindship day'' بھی مناتے ہیں میریج ڈے Marriage day، اپریل فول April fool'' بھی مناتے ہیں، ہم کس کی پیروی کر رہے ہیں؟ ہمارے شعائر تو خود اللہ نے مقرر کئے ہیں، ہم کیوں غیروں کے شعائر اپنانے میں فخر محسوس کرتے ہیں؟

حق سبحانہ وتعالی نے ہمیں خیر امت اسلئے بنایا کہ لوگ ہماری پیروی کریں، ہمیں دیکھ کر ہمارے طریقوں پر چلیں، اور ہم ان طریقوں کو اتنا خوبصورت اور متأثر کن بنا کر پیش کریں کہ لوگ اس راستہ پر آجائیں، اسی مقصد کے تحت اللہ تعالی نے انبیاء کرام کے بعد امت مسلمہ کو اٹھایا، تاکہ انکے ذریعہ ساری مخلوق اور ساری انسانیت اس کی طرف رجوع کریں، اپنے خالق کو پہچانے، اپنے مالک کو جانے، اسکا حق ادا کرتے ہوئے شکر گزار بندے بنیں۔

لیکن افسوس! ہم تو اپنی شناخت کھوتے جا رہے ہیں، ہائے ہمارے طور وطریقے، ہمارا

اٹھنا بیٹھنا ،ہماری پسند ناپسند کس کے مطابق ہوگئی ؟ اللہ کا فرمان ہے ”قل ان صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العالمین“(۱) یعنی میری نماز،میری قربانی،میرا جینا،میرا مرنا،سب اللہ کیلئے ہے گویا میری زندگی کی ہرادا وہ ہوگی جو میرے رب کو پسند آئے گی لیکن اب تو ہم نے ہر وہ ادا اختیار کرلی جس سے ہم غیروں کی نظروں میں کسی طرح جچ جائیں ،اوران کو پسند آجائیں ،تھوڑی دیر کیلئے توقف کرکے سوچیں توسہی کہ ہم روز نماز میں کھڑے ہوکر دعا مانگتے ہیں ،ہمیں سیدھا راستہ دکھا ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام کیا ہے یعنی صحابہؓ ،صدیقین ،شہداء اور صالحین کا راستہ ،اوران کے راستہ سے بچا جن پر تیرا غضب ہوا اور جو بھٹک گئے ہیں ،ان کا راستہ نہیں چاہئے۔

لیکن عملی زندگی میں کیا ہم واقعی ان انعام یافتہ بندوں کی زندگی کی پیروی کی کوشش کرتے ہیں؟ یا ہم اپنی ہر چیز میں ان کی پیروی کررہے ہیں،جنہیں اللہ تعالیٰ نے غیر المغضوب علیھم ولا الضالین (۲) اور ضربت علیھم الذلۃ والمسکنۃ(۳) کے لعنت آمیز خطاب کے ذریعہ صبحِ قیامت تک ذلیل وخوار کردیا ہے،حضرت مولانا عمر پالنپوریؒ فرماتے ہیں کہ تین انچ کی زبان سے ہدایت مانگتے ہو اور پانچ فٹ کے جسم کو گمراہی پر لے جاتے ہو ،ان سب کے بعد کیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں؟ ایسے کام کرکے کیا ہم اللہ تعالیٰ کی رحمت کو دعوت دے رہے ہیں؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بروز قیامت شفاعت کے متمنی بنے ہوئے ہیں؟ ہرگز نہیں!

یہ صرف خام خیالی ہے اوراندھیرے میں تیر چلانے کے مترادف ہے،حقیقت یہ ہے کہ ہم تو ان لوگوں کے پیچھے چل پڑے ہیں جو ظاہری چمک دمک،ظاہری چیزوں کی

---

(۱)الانعام:۱۶۲

(۲)الفاتحہ/۷

(۳)البقرۃ:۶۱

خوبصورتی سے نہال ہورہے ہیں، اور انہیں کے پیچھے دوڑ رہے ہیں، جنکے نزدیک ساری خوشیاں اور ساری لذتیں صرف دنیا کے لئے ہوکر رہ گئی ہیں، یاد رہے کہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے: من تشبه بقوم فهو منهم (۱) جس نے کسی قوم کی مشابہت اختیار کی وہ انہیں میں سے ہے، یعنی اس کا حشر بھی اسی قوم کے ساتھ ہوگا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک شخص نے اجازت چاہی کہ مقام بوانہ پر ایک قربانی کی منت مانی تھی پوری کرنا چاہتا ہوں تو آپ نے پوچھا اس مقام پر کسی بت کی پوجا یا انکے کسی تہوار کو تو منعقد نہیں کیا جاتا تھا؟ صحابہ نے نفی میں جواب دیا تو تب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دی۔ هل كان فيها وثن من أوثان الجاهلية يعبد؟قالوا :لا، قال:هل كان فيها عيد من أعيادهم؟قالوا :لا، قال رسول الله صلى الله عليه وسلم:أوف بنذرك، فإنه لا وفاء لنذر في معصية الله، ولا فيما لا يملك ابن آدم۔ (۲)

واضح ہوا کہ مسلمان کا ان مشرکانہ مراسم ومقامات سے دور رہنا شریعت کو کس حد تک مطلوب ہے۔

معلوم ہوا کہ نیوائیر نائٹ میں مسلم معاشرہ کی شرکت اسلام دشمن قوموں کی تعداد اور شوکت کو بڑھانے والا عمل ہے، اسلئے ایسے تمام اعمال سے اجتناب ضروری ہے، کہیں ہمارا حشر بھی ان جیسا یا ان کے ساتھ نہ ہوجائے۔

کیا سالِ نو کا آغاز خوشی کا موقع ہے؟

ہر قوم اپنے کلینڈر کے حساب سے نئے سال کے پہلے دن کی بڑی اہمیت دیتی ہے

---

(۱)ابوداؤد عن ابن عمر باب فی لبس الشهرة حدیث۲۹۹۶، حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری ۱۰/۲۷۱ باب فی لبس الشهرة میں اس حدیث کی سند کو حسن کہا ہے، مصنف ابن ابی شیبه باب ما قالوا فیما ذكر من الرماح حدیث،۳۳۰۱۶،

(۲)سنن ابی داؤ، حدیث: ۲۳۱۳۔

اور اس دن کو بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا ہے، حالانکہ یہ نیا اور پہلا دن بھی دوسرے ایام سے کچھ الگ نہیں ہوتا، ایسا نہیں ہے کہ نئے سال کے پہلے دن میں صرف خوشی ہی خوشی ہوتی ہے، دیکھا جاتا ہے غم میں ڈوبے لوگ آج بھی غمگین ہی ہوتے ہیں، نئے سال پہ بھی لوگوں کو موت آتی ہے، اکسڈنٹ Antioxidant ہوتا ہے مصائب ومشکلات پیش آتے ہیں پھر آج کے دن خوشی کے طور پہ منانے کا سبب ومحرک کیا ہے؟ خوشی منانے کے معتدل سنجیدہ اور مہذب طریقہ پر بات کرنے سے قبل خود اس بات پر ایک سوالیہ نشان ہے کہ آیا یہ اس قدر خوشی منانے کا موقع ہے بھی یا نہیں؟

کیا نبی کریم ﷺ نے نئے سال کا جشن منایا تھا؟ کیا صحابہ کرامؓ نے آپس میں ایک دوسرے کو ہیپی نیوائیر (happy new year) کی مبارک باد دی، کیا تابعین اور تبع تابعین کے زمانے میں اس رسم کو منایا گیا؟ کیا دیگر مسلم حکمرانوں نے اس کے جشن کی محفلوں میں شرکت کی؟ حالانکہ اس وقت تک اسلام ایران، عراق، مصر، شام اور مشرق وسطی کے اہم ممالک تک پھیل چکا تھا، یہ وہ سوالات ہیں جن کا جواب ہر عقل مند شخص نفی میں دے گا، پھر آج کیوں مسلمان اس کام کو انجام دے رہے ہیں؟

آخر ایک بات سمجھ میں نہیں آتی کہ رات 11:59PM سے 12:00AM کے درمیان صرف ایک منٹ کا فاصلہ ہے، سوال یہ ہے کہ اس ایک ساعت میں دنیا میں کون سی ایسی عجیب تبدیلی واقع ہوجاتی ہے کہ ہم اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھتے ہیں اور عجیب وغریب غیر سنجیدہ حرکات پر اتر آتے ہیں، ہماری مذہبی تعلیمات، پاکیزہ روایات اور صاف ستھرا تمدن اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ ہم نئے سال کا اس انداز میں استقبال کریں؟ یقینا جواب نفی میں ہوگا، یہ طرز عمل ہماری تعلیمات اور روایات سے ذرہ برابر میل نہیں کھاتا، ہماری دینی تعلیمات اور اسلاف کی زندگیاں تو یہ بتاتی ہیں کہ کسی بھی کام کے آغاز میں اپنے خالق حقیقی کو یاد کرنا چاہئے، بحیثیت انسان اپنے معاشرتی واخلاقی اور دینی فرائض کی تن دہی اور دیانت

داری سے ادائیگی کا مخلصانہ عزم کرنا چاہئے، سال نو کی ابتداء میں مالک حقیقی کے سامنے سر بسجود شب گزاری انسانوں کی بھلائی اور فلاح کی جانب ہماری توجہ کیوں نہیں جاتی ؟ ہم یہاں یہ نیک فال کیوں نہیں لیتے کہ چلو سال کا پہلا دن ہے کوئی اچھا عمل کر لیتے ہیں تا کہ سال بھر اس کی توفیق ملتی رہے، ایک یہ بھی اصول ہے جو ہر وقت ملحوظ رہنا ضروری ہے، کہ ہم اپنے تمدن اور تہذیبی اقدار کو تعلیمات اسلام کی چھلنی سے چھان کر اپنائیں ، جو ہماری ثقافت ہمارے دین کی ارفع تعلیمات و ہدایات سے متصادم نہ ہوں تو ان کے اپنانے میں بظاہر کوئی مانع نہ ہونا چاہئے، رہا مسئلہ مغربی تمدن اور اجنبی ثقافت کی اندھی تقلید کا تو یہ افسوسناک ہے ،اسکا بڑا اور بنیادی سبب ہمارے اندر پایا جانے والا احساس کمتری ہے، انگریز برصغیر پر ایک طویل عرصہ حکمرانی کے بعد واپس انگلستان چلا گیا مگر یہاں کے باشندوں پر اسکا فکری رعب تاحال قائم ہے اپنے خالص اور صاف ستھرے تمدن کے بارے میں معذرت خواہانہ رویہ اور مغربی انداز زیست کو قابل فخر سمجھنا دراصل اسی فکری بیماری کا نتیجہ ہے جسے اہل درد نے خوئے غلامی کہا ہے مغربی کلچر کی بالادستی اور اسکے رجحان میں تیز رفتار اضافے کا ایک اور بڑا سبب میڈیا ہے، میڈیا بالخصوص اس مہم میں سرگرم ہے، اور ہم سادہ لوح عوام چمکتی چیز کو سونا سمجھ کر اس کے پیچھے سرپٹ بھاگنا شروع کر دیتے ہیں۔

خود فراموشی اور خدا فراموشی

لوگ سالِ نو کی خوشیاں مناتے ہیں لیکن غور کیجئے تو یہ موقع خوشی سے زیادہ غم کا ہے، یہ ساعت جشن و مسرت نہیں، بلکہ لمحہ عبرت و موعظت ہے، کیونکہ سال کے گذرنے سے عمر بڑھتی نہیں ہے، بلکہ عرصۂ حیات تنگ ہوتا جاتا ہے اور مقررہ عمر میں کمی ہو جاتی ہے، اس لئے سالِ نو کی آمد غفلت شعار طبیعتوں کے لئے صورِ انتباہ اور سونے والوں کے لئے بیداری کا الارم Alarm ہے، نہ کہ سرمستی و عیش کوشی کا پیغام؛ یہ وقت ہے کہ ایک مومن کی پیشانی خدا کی

چوکھٹ پرخم ہوکہ تونے میرے بہت سے ہم عمروں کو اٹھالیا اور مجھے اپنی مہلت سے سرفراز کیا ہے، اس لئے تیرے دربار میں شکر وامتنان کے جذبات پیش کرتا ہوں، یہ وقت ہے کہ خدا کے حضور التجا والحاء کے ہاتھ اٹھیں، کہ خدایا میرے مستقبل کو میری ماضی سے بہتر فرما، میری نامرادیوں کو کامیابیوں سے اور میری پستیوں کو بلندیوں سے بدل دے، خاص کر مسلمان اس وقت پورے عالم میں خدا سے غفلت شعاری اور دنیا اور متاعِ دنیا کی محبت کی جو سزا پارہے ہیں اس پس منظر میں پوری امت کو عالم اسلام اور مقامات مقدسہ کی حفاظت کی دعاء کرنی چاہئے۔

لیکن افسوس اور ہزار بار افسوس! کہ عبرت پذیری اور موعظت انگیزی کی اس ساعت کو بھی ہم نے عیش کوشی، خود فراموشی اور خدا فراموشی کی ساعت بنالیا ہے، اس موقع سے رقص وسرور کی محفلیں سجائی جاتی ہیں، تفریح گاہوں اور پارکوں کے کھلے عام بے حیائی کے مناظر دیکھے جاتے ہیں، اور جن بیہودہ حرکات وسکنات کے لئے کبھی اہلِ مشرق اہلِ مغرب کو شرم وعار دلاتے تھے اب خود مشرق اس بے حیائی کی دوڑ میں زیادہ سے زیادہ آگے بڑھنے کو مضطرب ہے، کیا کسی شریف انسان کے لئے اس طرح کھلے عام بادۂ ساقی سے ہم دہن وہمکنار ہونا زیبا ہے؟ اور کیا مسلمانوں کے لئے اس خود فراموشی اور غفلت کوشی کا کوئی موقع ہے؟ جس قوم کا قبلۂ اول اس کے ہاتھوں سے نکل چکا ہو، عالم اسلام کے قلب وجگر تک دشمن کی رسائی ہو چکی ہو جس کی عبادت گاہ بلا کسی دلیل اور جواز کے زمین بوس کردی گئی ہو، جس کا لہو گجرات کے چپہ چپہ سے ایسا ٹپک رہا ہے جیسے موسم سرما میں کہر، ایسی مظلوم اور ستم رسیدہ اور ذلت ونکبت کی سرحدوں پر کھڑی امت کے لئے خوشی کے شادیانے بجانے اور عیش ونشاط کے شانے بجانے کا کوئی بھی موقع ہے؟؟ فاعتبروا یاأولی الابصار!(۱)

تعلیماتِ اسلامیہ سے بے بہرہ، اپنے اسلاف سے کٹے ہوئے، بے یقینی اور

---

(۱) نقوش وموعظت: ۱۵۴۔

ناامیدی کا طوق اپنے گلے میں ڈالے ہوئے کچھ لوگ تعلیماتِ الٰہی سے نظریں چرا رہے ہیں جس کا بدل پوری کائنات میں نہیں، ذرا اپنی خواہشِ نفس سے بالا ہو کر اس تہذیب کو دیکھ تو سہی جہاں تہذیب کا مطلب ہی مذہب سے آزادی، ناچ گانا، مصوری، بت تراشی و بت پرستی، مرد وزن کا اختلاط، کثرت شراب نوشی جنسی آوارگی، بے راہ روی، ہم جنس پرستی، سود اور لوٹ کھسوٹ ہے، جبکہ اسلام کے نزدیک لفظ تہذیب کا معنیٰ ہی سجانا، آراستہ کرنا ہے، ہمارے یہاں ہر وہ عمل جزوِ تہذیب ہے جو ہماری شخصیت کو حسین بنائے، ہمارے کردار کو عظیم بنائے نیز ہماری دنیا و آخرت کو سنوارے، یہ ہماری تہذیب ہے، علم، اخلاص، خدمت اور محبت ہماری تہذیب کے بنیادی اجزا ہیں۔

فضول خرچی اور نیا سال

دسمبر اور یکم جنوری کے بیچ کی رات میں نئے عیسوی سال کے آغاز کی خوشی مناتے ہوئے بڑی مقدار میں پٹاخے بجائے جاتے ہیں اور آتش بازیاں کی جاتی ہیں کیک Cake کاٹے جاتے ہیں رقص ہوتا ہے اس کام پر بے تحاشہ پیسہ خرچ کیا جاتا ہے گویا ہم اپنے خون پسینے کی کمائی کو نذر آتش کر رہے ہیں، گانا بجانا، پیشہ ور خواتین کے ذریعہ رقص و سرور کی محفلیں سجانا، عورتوں مردوں کا باہم ملنا، نوجوان لڑکے لڑکیوں کا مذاق و دل لگی کرنا، آتش بازی اور پٹاخوں میں پیسوں کو برباد کرنا، غیر ضروری لائٹنگ Lighting کرانا، خوشنمائی اور دکھاوے کے لئے مہنگے سے مہنگے اسٹیج بنانا، جھوٹی شان میں قرض کے بوجھ کو اُٹھانا، قرض حسنہ نہ ملے تو سود پر قرض کو لینا۔تھوڑی دیر کی خوشی کیلئے سالہا سال قرض کی ادائیگی میں پریشان ہونا اور دوسروں کو پریشان کرنا۔کیا یہ سب ایک مسلمان کو زیب دیتا ہے؟ کیا شراب نوشی کی کسی بھی مذہب میں کوئی بھی گنجائش ہوگی؟ یہ انسانی عقل کو سلب کر کے آدمی کو بلکل ناکارہ بنا دیتی ہے اور اس کے نشہ میں چور آدمی قتل و غارت گری، زنا کاری و بدکاری اور بہت ساری دوسری برائیوں کا بلا جھجھک ارتکاب کرتا ہے نئے انداز سے، پہلے سے بڑھ کر

،بے جا اسراف سے ایک دوسرے سے بڑھ کر رنگ ریلیوں محفلیں سجائی جاتی ہیں ،خوشی کا تہوار اسلامی ہو یا ثقافتی کہا جاتا ہے کہ اس پر بے تحاشا اخراجات کئے جا تے ہیں،جتنی فضول خرچی ہم کرتے ہیں اس سے بہت سارے غریبوں کی مدد کی جا سکتی ہے،بات تو دل کو لگتی ہے لیکن اس پر عمل کرنا مشکل ہے۔

ایسا نہ کبھی ہوا ہے اور نہ اس کا امکان ہے،نئے سال کی خوشیاں منانے کی بجائے اس سے غریب بچوں کے لیے کتابیں خریدی جا سکتی ہیں،غریبوں میں کھانا تقسیم کیا جا سکتا ہے،لیکن جو جشن مناتے ہیں،ان کو یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ غربت کس بلا کا نام ہے اور پھر یہ بھی کہ جشن کے ماحول میں کون انسانی مجبوریوں کو سمجھتا ہے اور کسے فکر ہے۔

اس طرح کی فضول خرچی یا بے عقلی وحماقت ہمیں دعوت فکر دیتی اور سوچنے پر مجبور کرتی ہے کہ آج ہندوستان ہی نہیں بلکہ ساری دنیا میں لوگ کسمپرسی میں زندگی بسر کر رہے ہیں ہمارے کروڑوں مسلم باشندے عورت ومرد،بوڑھے بچے کیمپوں میں رفیوجی کی زندگی بسر کر رہے ہیں ہمارے بھائی کھلے آسمانوں کے نیچے سخت ٹھنڈک وگرمی کے عالم میں شب وروز گذار رہے ہیں اور کروڑوں مسلمان اس ملک میں بھی اور دنیا کے دوسرے ملکوں میں بھی نان شبینہ کے محتاج اور دانے دانے کو ترس رہے ہیں، اس صورتحال کے باوجود ہمارے اندر دکھاوے کا یہ عالم ہے کہ ہم محض دکھاوے کے لئے لاکھوں روپئے یوں ہی پھینک رہے ہیں، جیسے ان کے پاس دولت کا انبار لگا ہو اور یہ سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ کہاں خرچ کریں؛ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انہیں اپنے انجام کار کی کوئی پرواہ نہیں وہ سمجھتے ہیں کہ شاید ہم سے اس کے بارے میں پوچھ ہوگی ہی نہیں؛ حالانکہ اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا ہے : ”قیامت کے دن حساب وکتاب کے وقت بندے کا قدم اس وقت تک اپنی جگہ سے نہیں ہٹے گا جب تک اس سے چار چیزوں کے بارے میں باز پرس نہ کیا جائے اور اس میں

سے ایک مال ہے کہ کہاں سے حاصل کیا اور کہاں خرچ کیا"۔(۱)

نئے سال پر ۷ منٹ میں ۶۳ کروڑ کی آتش بازی

دبئی کے حکمرانوں کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ وہ دنیا کی ہر بڑی چیز اپنے چھوٹے سے جزیرے میں سمو دیں چاہے وہ دنیا کی سب سے بڑی عمارت ہو یا دنیا کا سب سے بڑا شاپنگ سنٹر ہو یا دنیا کا سب سے بڑا انسانی ساختہ جزیرہ ہو کچھ دنوں قبل دبئی کو ایک اور بڑا اعزاز اس وقت حاصل ہوا جب اس نے دنیا کی آتش بازی کا یہ مظاہرہ نئے سال کے موقع پر کیا جس میں چند منٹوں میں ۵/ لاکھ سے زائد فائر ورکس Fireworks فضاء میں چھوڑے گئے اس طرح گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ Genius Book of world record میں شامل کرلیا۔ دبئی کو قدامت پسند خطے کا جدید ترین شہر قرار دیا جاتا ہے، جہاں ۲۰۰ سے زائد ممالک کے باشندے مقیم ہیں گذشتہ چند برسوں سے دبئی کو نئے سال کے آغاز کے موقع پر آتش بازی اور دیگر تفریحات کے حوالے سے عالمی شہرت حاصل رہی ہے۔ حالیہ آتش بازی کا ٹھیکہ امریکہ کی معروف کمپنی گروچی کو دیا گیا تھا، کمپنی نے ۱۰ مہینوں کی انتھک محنتوں سے آتش بازی کے اس مظاہرہ کو مرتب کیا تھا جس پر تقریباً ۶ ملین ڈالر (۶۳/ کروڑ روپیے) کی لاگت آئی تھی اس طرح نئے سال کی آمد پر ۳۱/ ڈسمبر ۲۰۱۶ء کی درمیانی شب ۲۰۰/ ٹیکنیکر نے ۱۰۰ کمپیوٹروں کی مدد سے ۵ لاکھ سے زائد فائر ورکس فضاء میں چھوڑے جس سے دنیا کے سب سے بلند ترین ٹاور برج الخلیفہ سے لے کر انسانی ساختہ بام آئی

---

(۱) ترمذی باب فی القیامۃ حدیث ۲۴۱۶، وقال الترمذی ھذا حدیث غریب لانعرفہ من حدیث ابن مسعود عن النبی ﷺ من حدیث الحسین بن قیس و حسین بن القیس یضعف فی الحدیث من قبل حفظہ (مصنف ابن ابی شیبہ باب کلام معاذ ابن جبل حدیث: ۳۴۶۹۴، سنن الدارمی باب من کرہ الشھرۃ والمعرفۃ حدیث ۵۵۴، کنز العمال حدیث: ۳۸۹۸۳)

لینڈ کا پورا جزیرہ جگمگا اٹھا اور ایسا لگنے لگا کہ جیسے سمندر میں سورج نکل آیا ہو ۶ رمنٹ تک جاری رہنے والی اس آتشبازی نے رات میں بھی دن کا سماں پیدا کر دیا تھا پہلے منٹ میں ایک لاکھ سے زائد فائر ورکس فضا میں چھوڑے گئے جس نے ۲۰۱۲ میں کویت کی ۵۰ ویں سالگرہ کے موقع پر ایک منٹ میں ۷۷ ہزار ۲۴۲ فائر ورکس فضا میں چھوڑنے کے عالمی ریکارڈ کو توڑ دیا جس کے بعد یکے بعد دیگرے مزید ۴ رلاکھ فائر ورکس فضاء میں چھوڑے گئے آتش بازی کو دیکھنے کے لئے دنیا بھر سے لوگ خصوصی طور پر دبئی پہنچے تھے جن میں خلیجی ممالک بالخصوص سعودی عرب کے ہزاروں افراد شامل تھے اس دوران متحدہ عرب امارات کے ہوٹلوں میں کوئی کمرہ خالی نہ تھا جبکہ بڑے ہوٹلوں نے اپنے کرائے کئی گنا بڑھا رکھے تھے جہاں کوئی کمرہ ۵۰۰۰ ڈالر (۵۲ ہزار روپئے) یومیہ سے کم میں دستیاب نہ تھا۔ آتش بازی دیکھنے کے لئے دوپہر سے ہی لوگ گاڑیوں میں آتشبازی کے مقامات کی طرف آنا شروع ہو گئے تھے۔

گھڑی نے جیسے ہی نصف شب میں ۱۲ بجائے گویا آسمان پر رنگ و روشنیوں کا سیلاب امڈ آیا اور آتش بازی نے رات میں بھی دن کا سماں پیدا کر دیا تھا جس سے دنیا کی بلند ترین ۱۶۳ منزلہ عمارت جگمگا کر نہایت دلفریب منظر پیش کر رہی تھی۔

یہ سب کچھ ایک اسلامی ملک میں ہو رہا ہے جسے امریکی کمپنی نے آتش بازی کا مہنگا ترین شو کہکر فروخت کیا تھا کہ اس آتش بازی کو چاند سے بھی دیکھا جاسکتا ہے، اور اس سے دبئی ایک دوسرے اسلامی ملک کا ورلڈ ریکارڈ توڑ کر اپنا نام گینز بک آف ورلڈ میں شامل کرسکتا ہے، اس طرح یہ جانتے ہوئے بھی کہ آتش بازی پیسے کا ضیاع ہے جس کی ہمارا مذہب قطعاً اجازت نہیں دیتا صرف ۶ رمنٹ کی آتش بازی کی خاطر ۶ ملین ڈالر کی خطیر رقم آگ کی نذر کر دی گئی سرمایہ دارانہ نظام کے باعث امیر اور غریب ممالک اور لوگوں کے درمیان فاصلوں میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے ایک جانب کچھ اسلامی ممالک میں

دولت کی بہتات ہے اور وہاں محض اپنا نام گینز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں شامل کرنے کے لئے خطیر رقم آتش بازی کی مد میں خرچ کی جارہی ہے تو دوسری جانب پاکستان سمیت کچھ اسلامی ممالک میں غربت بے روزگاری اور بھوک وافلاس سے روزانہ کئی لوگ موت کے منہ میں جارہے ہیں۔

سرکاری اور غیر سرکاری تقریبات اور شادی بیاہ کے موقع پر لاکھوں روپئے آتش بازی کی نذر کردیئے جاتے ہیں یہ سوچے بغیر کہ آتش بازی جیسی فضول رسم پر خرچ ہونے والی رقم سے کتنے بھوکوں کو کھانا کھلایا جاسکتا تھا کتنی غریب لڑکیوں کی شادی کی جاسکتی تھی کتنے اسکول اور مدرسے قائم کئے جاسکتے تھے کتنی زندگیاں بچائی جاسکتی تھیں اور موت کے منہ میں جانے والے لاعلاج مرض میں مبتلا میک اے وش (make a wish) کے کتنے بچوں کی آخری خواہشات کو پورا کیا جاسکتا تھا۔

غور طلب امر ہے کہ آج کل کے موجودہ عرب حکمراں جو خود کو اسلام کا داعی کہتے ہیں کیا نئے سال کی آمد پر اس آتش بازی میں جس میں ۶۳ کروڑ روپئے خرچ ہوئے اس سے کئی شاندار تعلیمی ادارے قائم نہیں ہوسکتے تھے؟ اب تو شک سا ہونے لگا ہے کہ کیا دبئی حکمران جو خود کو مسلمان اور عرب روایات وثقافت کا پاسدار کہتے ہیں کہیں یہود ونصاریٰ تو نہیں؟

ایک معمولی اندازے کے مطابق اسلام دشمن قومیں اس بے ہودہ رسم ”نیو ائیر نائٹ“ کے موقع پر ہر سال ۱۷/ارب ڈالر کی شراب نوشی ۶۰۰/ارب ڈالر کی موسیقی اور تمام مقام جشن کی زیبائش وآرائش اور فاحشہ اور رقاص عورتوں کے لئے کئی ارب ڈالر صرف کرتی ہیں، اور بے شمار ارب ڈالر کی آتش بازی بھی کی جاتی ہے۔

ماضی کی تاریخ سے عبرت لیں

ہمیں تاریخ اور پہلوں کے احوال سے عبرت حاصل کرنی چاہئے، ہمیں دیکھنا چاہئے کہ بہت سے مسلم ملک پہلے کیسے تھے اور اب کیسے ہوگئے ہیں، تاریخ شاہد ہے کہ صومالیہ نہایت

مالدار ملک تھا اور مغرب کی نظر لگنے سے پہلے یہاں کے باشندوں کے پاس دولت کی ریل پیل تھی، یہاں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ بہت سے لوگ محض اس کی کلیجی کھانے کے لئے مینڈھے اور بکرے ذبح کرتے اور کلیجی نکال کر اسے استعمال کرتے باقی پورا کوڑے دان میں پھینک دیا کرتے تھے، کسی کی خواہش ہوتی گردا یا کوئی عضو کھانے کی تو اس کے لئے بکرا ذبح کیا جاتا اور وہ عضو نکال کر اس کے لئے تیار کیا جاتا اور پورا بکرا پھینک دیا جاتا تھا اور آج وہ کئی دہائیوں سے بھوک مری کے شکار ہیں، دانے دانے کے لئے ترس رہے ہیں اور دنیا کے انتہائی غریب و نادار ملک میں اس کا شمار ہوتا ہے، عراق والے صدام اور اس سے پہلے کے زمانہ میں کہتے تھے کہ جب تک ہمارے پاس کھجور اور پٹرول ہے ہم غربت کا تصور نہیں کر سکتے مگر آج وہی عراق ایران اور امریکہ کی نظر لگ جانے کے بعد پٹرول و کھجور رہتے ہوئے بھی فقر و افلاس میں مبتلا اور دانے دانے کو ترس رہے ہیں، ان کے پاس سامان ضروریہ تک نہیں، افغانستان، دمشق، کشمیر طرح طرح کے میووں اور پھلوں کا ملک تھا جو دنیا کے کونے کونے میں سپلائی کئے جاتے تھے اور یہاں کے باشندے خوشحال و مالدار تھے، مگر جب انہوں نے اللہ کی نعمتوں کی ناشکری و ناقدری کی تو آج جنگ و جدال، خشک سالی، قحط اور فقر و افلاس میں مبتلا ہیں، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ”اور جب ہم کسی بستی کے ہلاک کرنے کا ارادہ کرتے ہیں تو وہاں کے خوشحال لوگوں کو حکم دیتے ہیں اور وہ بستی میں کھلی نافرمانی کرنے لگتے ہیں تو ان پر عذاب کی بات ثابت ہو کر رہ جاتی ہے؛ پھر ہم انہیں تباہ و برباد کر دیتے ہیں“(۱) ایک جگہ ارشاد ہے: ”اللہ تعالی اس بستی کی مثال بیان فرماتا ہے جو پورے اطمینان سے تھی، اس کی روزی اس کے پاس ہر جگہ سے چلی آ رہی تھی؛ پھر اس نے اللہ کی نعمتوں کا کفر کیا تو اس نے بھوک اور ڈر کا مزہ چکھایا جو بدلہ تھا ان کے کرتوتوں کا“۔ وضرب الله مثلا قرية كانت آمنة مطمئنة يأتيها رزقها رغدا من كل مكان

(۱) الاسراء: ۱۶

فکفرت بانعم اللہ فأذاقھا اللہ لباس الجوع والخوف بما کانوا یصنعون (۱)

نیا سال اور Picnic

پہلی جنوری کو لوگ گاؤں/ شہر سے نکل کر صحراء وجنگل میں جا کر مشترکہ دعوت کا اہتمام کرتے ہیں، اس میں کھانے پینے کے ساتھ شراب نوشی، آتش بازی اور رقص وسرود کی محفل قائم کی جاتی ہے، نیز مغربی تہذیب کی نقالی کرتے ہوئے مرد کے ساتھ نوجوان لڑکیاں بھی اس پکنک میں شامل ہوتی ہیں، پکنک دراصل موج مستی کا دوسرا نام ہے، اس میں پائے جانے والے امور اسلام مخالف ہیں۔

نیا سال اور آتش بازی

نئے سال کی آمد پہ آتش بازی کا بڑا ہولناک منظر دیکھنے کو ملتا ہے۔ گھر پہ، گلی میں، چوراہوں پہ، محفلوں میں اور عام گذرگاہوں پہ اس قدر آتش بازی کی جاتی ہے کہ اس سے جا بجا حادثات واقع ہوتے ہیں، اس آتش بازی میں مسلمانوں کو دیکھ کر بہت دکھ ہوتا ہے کہ دین محمدی کے نام لیوا کفار کی نقالی میں شانہ بشانہ کیونکر؟ آتش بازی میں فضول خرچی، جانی ومالی نقصان کا پہلو اور کفار کی مشابہت پائی جاتی ہے جو نئے سال کی مناسبت سے ہی نہیں بلکہ ہر مناسبت سے یہ حرام ہے۔

نیا سال اور توہمات

نئے سال کے تعلق سے بہت ساری توہمات پائی جاتی ہیں۔ کچھ کا تعلق تو رسم ورواج سے مگر کچھ توہمات سیدھے عقائد سے ٹکراتے ہیں اور تقریبا ہر ملک میں عجیب وغریب قسم کی روایات پائی جاتی ہے، ہندوستان تو عجائبات کے لئے ویسے بھی دنیا بھر میں مشہور ومعروف

---

(۱) النحل: ۱۱۲، بحوالہ ماہنامہ پیام: ۶/۲۰۱۶ء

ہے،کہیں نئے سال کی آمد پہ گھر کے پرانے فرنیچر کو نکال کر نئے فرنیچر Furniture کا اضافہ کیا جاتا ہے تو کہیں پرانے سامان سے بدفالی لی جاتی ہے اور اسے پھینک کر نیا سامان لایا جاتا ہے،کہیں کچڑا گھر سے نکالنا بدقسمتی نکالنے کے برابر سمجھا جاتا ہے تو کہیں پہ سکہ اچھال کر قسمتوں کا فیصلہ کیا جاتا ہے،اسلام میں اس قسم کی روایات وتوہمات اور بدفالی کی کوئی گنجائش نہیں۔

نیاسال اورحادثات

سالِ نو کے موقع پر نوجوانوں کی آوارہ گردی میں بے شمار جان لیوا حادثات پیش آتے ہیں،شراب کے نشہ میں دسیوں کی موت ہوجاتی ہے،معمولی بات پر جھگڑوں کی قیمت جان دے کرادا کرنی پڑتی ہے،۲۰۱۹ءختم اور ۲۰۲۰ءشروع ۳۱ ڈسمبر کی رات حیدرآباد کے ایک علاقے سائبرآباد کمشنر کے حدود میں ٹریفک پولس نے حالت نشہ میں گاڑیاں چلانے والوں کے خلاف ۸۶۸ مقدمات درج کئے ہیں،جن میں بڑی تعداد اعلیٰ تعلیم یافتہ اور بڑی آرگنائزیشن Organization سے وابستہ افراد بھی شامل تھے۔(روزنامہ منصف ۲ رجنوری ر ۲۰۲۰ء)

تلنگانہ کے ضلع عادل آباد کے اوٹنور منڈل میں سال نو کی تقریب منانے کے دوران حالت نشہ میں آپسی ان بن جھگڑے میں بدل گئی،بحث وتکرار یہاں تک بڑھ گئی کہ ایک شخص نے چاقو سے تین دوستوں پروار کرکے شدید زخمی کردیا جن میں سے ایک کی حالت تشویشناک ہوگئی،لطف یہ کہ حملہ کرنے کے بعد مقامی پولیس اسٹیشن میں اپنے آپ کو خود سپرد بھی کردیا،خود کم سزا پانے کے بہانے اور دوسروں کو موت کی نیند سلادیا۔

آندھراپردیش کے ضلع نیلور کے قریب پانچ افراد نئے سال کا جشن منارہے تھے اور ساحل کے قریب پانی سے کھیلنے میں مگن تھے کہ اچانک تیز لہر سب کو بہالے گئی،مقامی ماہی گیروں نے ایک شخص کو بچالیا،چارافراد جن میں دولڑکیاں بھی شامل تھی ۲۰۲۰ء کے جشن

نے انھیں اپنے دامن میں گہری نیند سلا دیا۔(روز نامہ منصف ۲/جنوری/ ۲۰۲۰ء)
یہ حادثات بطور نمونہ ذکر کئے گئے ہیں ورنہ دسیوں حادثات ایسے ہوتے ہیں جو سال نو کے نام پر جان لیوا ہوتے ہیں۔

نیا سال اور وقت کی ناقدری

دن، ہفتے، مہینے اور سال یہ سب انسانوں کے لئے بنائے گئے ہیں تاکہ وہ وقت کی قدر کرسکیں۔ ہر نئے سال پر اسے نئی امیدوں کے ساتھ آگے بڑھنے کی مدد ملتی ہے، نئے سال کا سورج بنی نوع انسان کے ماضی کی تلخ حقیقتوں کو پیچھے چھوڑے گا، اور ماضی کا ایک حصہ بن جائے گا۔ جانے والے سال میں جو خوشگوار یا ناخوشگوار واقعات ہمارے ساتھ پیش آئے ہیں، وہ تمام ایک یادِ ماضی بن کر رہ جائیں گے، اور یہ جانے والا سال زندگی کے کچھ رنگا رنگ فتوحات اور دل برداشتہ کر دینے والی ناکامیوں کا تحفہ دیتے ہوئے منظر عام سے یکسر غائب ہو جاتا ہے، اور صرف اور صرف یادوں کا سرمایہ ہی ہمارے پاس چھوڑ جاتا ہے۔

جو کبھی ہمارے لبوں پر دل فریب مسکراہٹ بن کر کھلتی ہے، تو کبھی یہ آنسو بنکر ہماری آنکھوں سے چھلکنے لگتی ہیں، لیکن ہم ان کھٹی میٹھی یادوں کو اپنی ذات سے یکسر جدا نہیں کرتے بلکہ ان یادوں کو سجا کر رکھتے ہیں۔

کبھی آپ نے سوچا کہ ہمارے لئے ایک منٹ کی کیا حقیقت ہے، جسے ہم سینکڑوں چھوٹے لیکن اہم امور نمٹانے کے لئے استعمال کرسکتے ہیں، لیکن منٹ تو کیا ہم گھنٹوں کا حساب رکھنے کے بھی قائل نہیں، وقت ایک ایسی چیز ہے جو کبھی کسی کے لئے رکتا نہیں بلکہ پر لگا کر اڑتا ہی چلا جاتا ہے، اسلئے وقت کی قدر و اہمیت کو جاننا بہت ضروری ہے، ہمیشہ وقت سے ہوشیار رہیں اور وقت کی خبر رکھیں۔

وقت کو برباد اور ضائع نہ ہونے دیں، اور نہ ہی غیر مفید باتوں میں صرف کریں، تاریخ بھی ہمیں یہی سبق دیتی ہے، اور وقت کا تجربہ بھی ہم کو یہی سکھلاتا ہے، کہ دنیا میں جس قدر

کامیاب وکامران ہستیاں گزرچکی ہیں ان کی کامیابی وشہرت کا راز یہی وقت ہے کہ انہوں نے اس کا صحیح ومناسب استعمال کیا۔

وقت اورزمانہ کی حقیقت کیا ہے! وقت اور زمانے کا تعین کرنے کے لئے دنیا میں کیلنڈروں Calendars کا استعمال کیا جاتا ہے۔کیلنڈر اصل میں وہ خاکے ہیں جن کے اندر وقت کو تقسیم کیا گیا ہے۔تو پھر وقت کیا ہے؟ وقت کا دوسرا نام زندگی ہے یہ طے شدہ بات یہ ہے کہ وقت یا زمانہ مسلسل سفر میں ہے۔جیسے کسی نے صرف دو مصرعوں میں یوں باندھا ہے کہ:

صدیاں گزر گئیں، زمانہ سفر میں ہے　　کس کی تلاش کونسی منزل نظر میں ہے

❁ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ :میں کسی چیز پر اتنا نادم اور شرمندہ نہیں ہوا جتنا کہ ایسے دن کے گذرنے پر جس کا سورج غروب ہوگیا جس میں میرا ایک دن گم ہوگیا اور اس میں میرے عمل میں اضافہ نہ ہوسکا۔(۱)

حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ :اے ابن آدم! تو ایام ہی کا مجموعہ ہے جب ایک دن گذرگیا تو یوں سمجھ تیرا ایک حصہ بھی گذرگیا۔(۲)

❁ وقت گزرتے ہوئے واقعات کا ایک ایسا دریا ہے جس کا بہاؤ تیز اور زبردست ہے، جونہی کوئی چیز اس کی زد میں آجاتی ہے اس کی لہریں اسے اپنے ساتھ بہالے جاتی ہیں، پھر اور کوئی شئی اس کی جگہ لے لیتی ہے،لیکن وہ بھی اسی طرح بہہ جاتی ہے۔

❁ وقت ایک سونا ہے اور یہ تو صرف ان لوگوں کے لئے صحیح ہے جو موجودات کی قدر وقیمت محض قیاس وتصور کے ذریعہ ہی حاصل کرسکتے ہیں،لیکن جو پاکیزہ خیالات ونظریات

(۱)قیمة الزمن عند العلماء :ج۱ص۲۷مکتبة المطبوعات الاسلامیه حلب،

(۲) شعب الایمان باب فیما بلغنا من الصحابةرضوان الله علیهم رقم :۱۰۱۸۰، حلیةالاولیاء ۲،۱۴۸،الزهد لابن ابی الدنیا رقم:۴۲۶ج۱ ص۱۸۷دار ابن کثیر دمشق

اوراچھے افکار کے حامل ہوتے ہیں،ان کے ہاں تو وقت کی قیمت بہت گراں ہے،انکے نزدیک وقت کامقام بہت بلنداورارفع ہے۔

سونامال وجواہرتو آنے جانے والی چیز ہے،وہ ہاتھ سے نکل بھی جاتا ہے،یااسے کھو بھی دیاجاتاہے،تودوبارہ اسے حاصل بھی کیاجاسکتاہے،اور پہلے سے کئی گنازیادہ بھی ہوسکتا ہے،لیکن جووقت گذرچکاہے،اورجوزمانہ بھی چلاگیاہے،وہ کسی صورت اورکسی قیمت پرواپس نہیں آسکتا۔(۱)

توسوچئے وقت سونے سے زیادہ مہنگا ہوایانہیں؟اس پرعربی کی ایک مثل صحیح ثابت ہوتی ہے"الوقت اثمن من الذھب"کہ وقت سونے سے زیادہ قیمتی ہے،کیاوقت الماس سے زیادہ مہنگانہیں؟کیایہ ہرچیز سے زیادہ قیمتی وبے بہانہیں؟

❁ یادرکھئے کہ دنیاکےتمام اغراض وجواہروقت کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتے،وقت کے مقابلے میں ان کی کوئی قدروقیمت نہیں،کیونکہ وقت سونااورجواہرنہیں بلکہ ایک انمول زندگی ہے۔

کامیابی کسی تھوڑے سے وقت یاپے درپے کام کرنے ہی پرموقوف نہیں ہے،بلکہ وقت کی مناسب تقسیم پربھی مبنی ہے،ہرکام اپنے وقت مقررہ پرہو،اورکام میں بے جا تقدیم وتاخیربھی غفلت کے مترادف ہے،اسلئے اہل عقل کےنزدیک قبل ازوقت کام کرنایابے جاتاخیرکرناناپسندیدہ ہے،ہرعمل اپنے وقت مقررہ اورمناسب اندازے کے مطابق ہونا چاہئے،پس وقت کی قدرکیاکریں،اورعمرکوغنیمت شمارکریں،اوروقت کورائیگاں نہ جانے دیں،وقت سے کام لینے والے افراداس تھوڑی سی زندگی میں موجداورفلاسفہ بن گئے۔

برخلاف اس کے جتنے بھوکے اورفاقہ کش دنیامیں موجودہیں یہ وہی سب لوگ ہیں،جنہوں نےبچپن میں وقت کورائیگاں کھودیاہو،اسکی ایک بنیادی ٹیڑھی اینٹ نےان کی

---

(۱)قیمة الزمن عند العلماء :الوقت ھو الحیاة وھو اغلی من الذھب ج۱ ص۱۲۳مکتبة المطبوعات الاسلامیه حلب،

تمام زندگی کی عمارت کو ٹیڑھا کر دیا بے کار کھویا ہوا ایک لمحہ عمر بھر کے ننھے پودے کی کئی شاخوں کو کاٹ ڈالتا ہے، اسلئے ایک وقت میں ایک ہی کام کو مکمل طور پر اور خوش اسلوبی کے ساتھ کرنا کئی نامکمل کاموں کا خون کر دینے سے کہیں بہتر ہے۔(۱)

سلفِ صالحین اور وقت کی قدر

سلف صالحین جنہوں نے اعلیٰ درجہ اور بلند قیمت علمی کام کئے ہیں، اپنے وقت کے ایک ایک لمحہ کو وصول کرتے تھے، اور ایک منٹ کا ضائع ہونا بھی ان کو گوارہ نہ تھا، وہ آخر دم تک اپنے وقت کو مشغول رکھتے تھے۔ چنانچہ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں منقول ہے کہ انہوں نے سترہ سال تک اپنے استاذ امام ابو حنیفہؒ کی مجلس میں اس طرح شرکت کی کہ کبھی فجر کی نماز فوت نہیں ہوئی، یہاں تک کہ عید الفطر اور عید الاضحی کے دن بھی، بلکہ صاحبزادے کا انتقال ہو گیا، تو تجہیز و تکفین کا انتظام اپنے اعزہ اور پڑوسیوں کے حوالہ کر کے درس میں شریک رہے، اور درس سے محرومی کو گوارہ نہ کیا۔(۲)

حافظ ابن حجرؒ کا حال یہ تھا کہ جس وقت تصنیف کرتے تو لکھتے وقت جب قلم کا خط خراب ہو جاتا تو اس کو چاقو سے دوبارہ درست کرتے، اس دوران جتنا وقت قلم کو درست کرنے میں لگتا اتنی دیر آپ تیسرا کلمہ سبحان اللّٰہ و الحمدللہ و لا الہ الا اللّٰہ و اللّٰہ اکبر، پڑھتے رہتے تھے، تاکہ یہ وقت بھی ضائع نہ ہو جائے۔(۳)

---

(۱) نقوش وموعظت: ۴۳۔

(۲) مناقب مکی ۱: / ۴۷۲۔

(۳) اسلام اور ہماری زندگی ۷: / ۲۹۵

احمد بن یحییٰ شیبانیؒ (۲۰۰۔۲۹۱ھ) کا حال یہ تھا کہ اگر دعوت دی جاتی تو داعی سے فرماتے کہ کھانے کے وقت ان کے لئے چمڑے کے تکیہ کی مقدار جگہ خالی رکھی جائے، جس میں وہ کتاب رکھ کر مطالعہ کریں۔(۱)

ایک بڑے محدث عبید بن یعیشؒ گذرے ہیں جو امام بخاری اور امام مسلم رحمہما اللہ کے اساتذہ میں سے ہیں، ان کے بارے میں حافظ ذہبی نے نقل کیا ہے کہ تیس سال تک رات میں اپنے ہاتھ سے کھانا نہیں کھایا، بلکہ خود حدیث لکھنے میں مصروف رہتے، اور بہن منہ میں لقمہ دیتی جاتی۔(۲)

امام ابن جوزیؒ ان لوگوں کو بہت ناپسند کرتے تھے، جو چاہتے تھے کہ ان کے پاس ملاقاتیوں اور ہم نشینوں کی بھیڑ لگی رہے، خود بھی بے مقصد آنے والوں سے بہت سے نالاں رہتے، اور مجبوراً جن لوگوں سے ملاقات کرنی ہوتی، ان سے ملاقات کے اوقات کو اسی طرح استعمال فرماتے کہ اس وقت حسب ضرورت کاغذ کاٹے جاتے، قلم تراش لیتے، اور لکھے ہوئے اوراق باندھ لیتے۔

مشہور مفسر اور صاحب نظر امام رازیؒ کھانے کے وقت پر بھی افسوس کا اظہار کرتے کہ اس وقت علمی مشغلہ فوت ہو جاتا ہے۔(۳)

---

(۱)الحث علی طلب العلم الخ للعسکری:۷۷،قیمة الزمن عند العلماء :ج۱ ص۴۱،مکتبة المطبوعات الاسلامیه حلب

(۲)سیر اعلام النبلاء:۱۱/۴۵۸،قیمة الزمن عند العلماء :ج۱ص۳۲مکتبة المطبوعات الاسلامیه حلب،الجامع لأخلاق الراوي وآداب السامع ج۲ص ۱۷۸

(۳)عیون الأنباء في طبقات الأطباء ۲،۳۴،قیمة الزمن عند العلماء :ج۱ص۶۵ مکتبة المطبوعات الاسلامیه حلب،

امام نوویؒ راستہ چلتے ہوئے بھی علمی مذاکرہ میں اپنا وقت گذارتے، اس کا نتیجہ ہے کہ صرف ۴۵/سال کی عمر پائی، لیکن ہزارہا صفحات ان کے قلم سے آج بھی محفوظ ہیں، جو اہلِ علم کے لئے حرزِ جاں ہیں۔(۱)

شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ کا حال یہ تھا کہ سفر وحضر اور صحت وبیماری کا ایک لمحہ بھی ضائع نہ ہونے دیتے، ان کے شاگرد علامہ ابن قیمؒ نے ان کی تصنیفات کی تعداد پر جو رسالہ لکھا ہے وہ خود ۲۲/صفحات کا ہے۔(۲)

مشہور محدث علامہ منذری کے صاجزادے رشید الدین (م ۶۴۳) کا انتقال ہوگیا، جو ان کو بہت محبوب تھے، تو اپنے جواں مرد بیٹے کی نماز جنازہ خود پڑھائی، مدرسہ کے دروازہ تک جنازہ کے ساتھ خود چلے اور وہاں سے اللہ کے حوالہ کرکے اپنے معمولات میں مشغول ہوگئے۔(۳)

اسی وقت کی قدر کا نتیجہ یہ تھا کہ اسلام کے ابتدائی دور میں اہلِ علم نے اتنا عظیم تصنیفی اور تالیفی کام انجام دیا ہے کہ سن کر اور پڑھ کر حیرت ہوتی ہے، اور آج ان کتابوں کو ایک شخص کا پڑھ لینا بھی دشوار ہے، امام جریر طبریؒ بہت ہی بلند پایہ، مفسر، محدث اور فقیہ ہیں، انہوں نے اپنی عظیم الشان تفسیر ۳/ہزار اوراق میں ۲۸۳ھ تا ۲۹۰ھ یعنی صرف سات سال کے

---

(۱)قیمة الزمن عند العلماء :ج۱ص۷۲مکتبة المطبوعات الاسلامیه حلب،

(۲)قیمة الزمن عند العلماء :ج۱ص۷۶مکتبة المطبوعات الاسلامیه حلب،

(۳) طبقات الشافعیةالکبری ۸٫ ۲۶۰،قیمة الزمن عند العلماء :ج۱ ص۶۹ مکتبة المطبوعات الاسلامیه حلب

عرصہ میں مکمل کی، پھر ایک تفصیلی تاریخ لکھنی شروع کی، جس سے ۳۰۳ھ میں فارغ ہوئے، یہ دونوں کتابیں تین تین ہزار گویا ٦/ ہزار صفحات پر مشتمل ہیں۔(١)

حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں لکھا ہے کہ انہوں نے جو روشنائی خریدی، اس کا حساب کیا گیا تو وہ سات سو درہم کی تھی۔

ہندوستان کے علماء میں مولانا عبدالحی فرنگی محلی نے صرف ۳۹/ سال کی عمر پائی لیکن ان کی تصانیف ۱۱۰/ سے بھی زیادہ ہیں، اور ہر کتاب گویا اپنے موضوع پر حرف آخر ہے، مولانا اشرف علی تھانویؒ کی کتابوں اور رسائل کی تعداد ہزار کے قریب ہے۔

شیخ عبدالفتاح ابوغدہؒ کی نہایت اہم اور فاضلانہ تصنیف "قیمۃ الزمن عند العلماء" میں سلفِ صالحین کے ایسے کتنے ہی واقعات ملتے ہیں۔

آج ماضی کی مثالیں ناپید ہیں

ظاہر ہے کہ یہ سب وقت کی قدر جاننے اور اس کی قیمت پہچاننے کا نتیجہ ہے، جو لوگ وقت کو سستی اور بے قیمت شئ سمجھتے ہیں اور اس کی قدر دانی نہیں کرتے، وہ زندگی میں کوئی بڑا کام نہیں کرسکتے، اسلام نے وقت کی اہمیت کو ظاہر کرنے کے لئے تمام عبادات کو وقت سے جوڑ رکھا ہے، نمازوں کے اوقات مقرر ہیں، روزہ متعین وقت سے شروع ہوتا ہے، اور متعین وقت پر ختم ہوتا ہے، حج کے افعال بھی متعین ایام واوقات میں انجام دیئے جاتے ہیں، قربانی بھی متعین دنوں میں ہوتی ہے، زکوۃ میں بھی مال پر ایک سال گذرنے کا وقت

(١)تذكرة الحفاظ للذهبي :۲،۷۱۱،قيمة الزمن عند العلماء :ج١ص٤١ مكتبة المطبوعات الاسلاميه حلب

مقرر کیا گیا ہے، اور شریعت میں کتنے ہی احکام ہیں، جو وقت سے مربوط ہیں، لیکن افسوس کہ یہ امت اپنے وقت کو جس قدر ضائع کرتی ہے اور اس کو جتنا بے قیمت سمجھتی ہے، شاید ہی اس کی کوئی مثال مل سکے، مسلمان نوجوانوں کی یار باشی، ہوٹل بازی اور بے مقصد سیر وتفریح ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے، بلکہ ضرب المثل بنتی جارہی ہے، شادی بیاہ وغیرہ کی تقریبات میں جس بے دردی اور بے رحمی کے ساتھ اوقات ضائع کئے جاتے ہیں، یہاں تک کہ دینی جلسوں اور اجتماعات میں بھی اوقات کی پابندی کے معاملہ میں جو بے احتیاطی برتی جاتی ہے، وہ کس قدر افسوس ناک ہے!

آئیے! نئی صدی اور نئے ہزار سال کا استقبال کرتے ہوئے ہم عزم مصمم کریں، کہ وقت کی پوری قدر دانی کریں گے، اور اپنے ایک ایک لمحہ کو ضائع ہونے سے بچائیں گے اگر ہم سب اس کا عزم کریں اور اپنے آپ کو اس پر قائم رکھیں تو کون ہے جو اس امت مرحوم کی سربلندی کو روک سکے؟ (۱)

سالِ نو کے موقع پر کیا کریں

نیا سال خواہ وہ قمری ہو شمسی اس کی ابتدا ذاتی محاسبے سے کرنا چاہئے ہم میں سے ہر شخص مختلف قسم کی گھریلو، خاندانی، معاشرتی، سماجی اور مذہبی ذمہ داریوں کا حامل ہے ہر شخص کی ذات سے دوسرے بہت سے افراد کے حقوق متعلق ہوتے ہیں سال بیت جانے پر اور نئے سال کے شروع میں ہمیں ہٹلر بازی کے مظاہرے کرنے کے بجائے اپنے آپ کو احتساب کے کٹھرے میں کھڑا کرنا چاہئے ہمیں اپنی ذمہ داریوں اور حقوق کی ادائیگی کے حوالے سے سال بھر کی کارکردگی کا جائزہ لینا چاہئے، کسی بھی کام کی ابتداء اچھی ہو تو پورا کام بہتر انداز میں انجام پذیر ہو جاتا ہے، ہم زندگی کے جس شعبہ سے بھی وابستہ ہوں ہمیں چاہئے

---

(۱) نقوش وموعظت: ۴۶

کہ نئے سال کی ابتداء ایک ولولے سے انجام دیں، سال بھر سستی اور کاہلی سے بچنے کا عزم مصمم کریں، معاشرے میں بسنے والے ہر فرد (جو کسی بھی نسبت سے متعلق ہو) کے حقوق کا خیال رکھیں، اس انداز میں ہم اپنے سال کی ابتداء کر کے مثبت اور تعمیری نتائج کی امید رکھ سکتے ہیں۔

دینی اور دنیوی محاسبہ

نیا سال خواہ وہ قمری ہو یا شمسی ہمیں دینی اور دنیوی دونوں میدانوں میں اپنا محاسبہ کرنے کی طرف متوجہ کرتا ہے کہ ہماری زندگی کا جو ایک سال کم ہوگیا ہے اسمیں ہم نے کیا کھویا اور کیا پایا؟

ہمیں عبادات، معاملات، اعمال، حلال وحرام، حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی کے میدان میں اپنی زندگی کا محاسبہ کر کے دیکھنا چاہیئے کہ ہم سے کہاں کہاں غلطیاں ہوئیں؛ اس لئے کہ انسان دوسروں کی نظروں سے تو اپنی غلطیوں کو چھپا سکتا ہے لیکن خود کی نظروں سے نہیں بچ سکتا، چنانچہ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ ”حاسبوا قبل ان تحاسبوا“(۱) کہ تم خود اپنا محاسبہ کرو قبل اس کے کہ تمہارا محاسبہ کیا جائے۔

اسلئے ہم سب کو ایمانداری سے اپنا محاسبہ کرنا چاہیئے اور ملی ہوئی مہلت کا فائدہ اٹھانا چاہیئے اس سے پہلے کہ مہلت ختم ہو جائے، کیونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے کلام پاک میں ایک خاص انداز سے ارشاد فرمایا ہے ”وَأَنْفِقُوا مِنْ مَا رَزَقْنَاكُمْ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُولَ رَبِّ لَوْلَا أَخَّرْتَنِي إِلَى أَجَلٍ قَرِيبٍ فَأَصَّدَّقَ وَأَكُنْ مِنَ الصَّالِحِينَ

---

(۱) مصنف ابن ابی شیبہ حدیث: ۳۴۴۵۵، حلیۃ الاولیاء ۵۵/۱۔ یہ روایت عمر بن خطاب پر موقوف ہے اور اس کے تمام رواۃ ثقہ ہیں اور امام ترمذی نے اس کو ”یروی عن عمر“ کے الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے۔ ترمذی حدیث: ۲۴۵۹

وَلَنْ يُؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفْسًا إِذَا جَاءَ أَجَلُهَا وَاللّٰهُ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ"(۱)

ترجمہ: اور جو کچھ ہم نے تمہیں دیا ہے اسمیں سے خرچ کرو اس سے پہلے کہ تم میں سے کسی کو موت آجائے پھر وہ کہنے لگے کہ اے میرے پروردگار مجھ کو اور تھوڑے دنوں کی مہلت کیوں نہ دی کہ میں خیر خیرات دے لیتا اور نیک کام کرنے والوں میں شامل ہو جاتا اور اللہ تعالیٰ کسی شخص کو جب اس کی میعاد آجاتی ہے ہرگز مہلت نہیں دیتا اور اللہ کو تمہارے سب کاموں کی پوری خبر ہے(۲)

عمر گذشتہ پر توبہ

سالِ نو کے موقع پر اپنا احتساب کرتے ہوئے اپنی عمر گذشتہ پر توبہ کریں اور مصلیٰ بچھائے ہاتھ اٹھائے بارگاہ صمدی میں عاجزی وانکساری اور نہایت مسکنت کے ساتھ آنسوں بہاتے ہوئے کہیں کہ: الہی تیری دی ہوئی زندگی میں سے ایک قیمتی سال گزر گیا سال گذشتہ بھی آپ نے ہمیشہ کی طرح کھلایا پلایا اور بے شمار نعمتوں سے نوازا جس کی کوئی گنتی نہیں مگر ہماری بے حسی و بے پرواہی کہ ہم نے ان نعمتوں کی ناقدری کی وقت کی ناقدری کی قیمتی لمحات کو یوں ہی ضائع کر دیا، ہم دیکھ رہے ہیں کہ سال آیا بھی اور رخصت بھی ہو گیا اور ہم اپنے اعمال کے دفتر میں اعمال صالحہ کے ذریعہ نہ نیکیوں میں اضافہ کر سکے اور نہ ہی توبہ واستغفار کے ذریعہ کچھ صفحات کو گناہوں سے صاف کر سکے خدایا اپنے فضل وکرم سے اس قصور کو معاف فرما، سال گذشتہ کے یوں ہی گذر جانے پر ہمیں ندامت وشرمندگی ہے اس شرمندگی کو توبہ میں شمار فرما اور سال نو میں ہم کو اعمال صالحہ کی توفیق عطا فرما۔

(۱) المنافقون آیت: ۱۰

(۲) بیان القرآن ج ۳ ص ۵۴۸، مکتبہ جاوید دیوبند

آگے کا لائحہ عمل

سوچنے کی بات یہ نہیں کہ آنے والے نئے سال میں ہم کیا کریں گے بلکہ سوچنے کی بات یہ ہے کہ ہم نے گزرنے والے سال میں کیا کیا؟ کیا کھویا؟ کیا پایا؟ کسی غریب کی مدد کی ؟ حقوق العباد کا خیال رکھا؟ عبادت میں کوتاہی تو نہیں کی ؟ کسی کا دل تو نہیں دکھایا؟ ماں باپ کی خدمت کی ؟ کوئی نیکی کا کام جان بوجھ کر تو نہیں چھوڑا؟ بدی کے راستے پر تو نہیں چلے؟ کتنے اچھے کام کئے؟ وغیرہ۔ اگر ان سب سوالات کا جواب ہاں میں ہے تو آئندہ سال یہ سب کچھ کرنا ہوگا۔ اگر نہیں ہے تو نئے سال میں ہمیں اپنی ان غلطیوں کو سدھارنا ہوگا اور اپنی غلطیوں کی توبہ کر کے اچھے اور نیک کام کرنے ہوں گے۔

اپنی خود احتسابی اور جائزے کے بعد اس کے تجربات کی روشنی میں بہترین مستقبل کی تعمیر اور تشکیل کے منصوبے میں منہمک ہونا ہوگا کہ کیا ہماری کمزوریاں رہی ہیں اور ان کو کیسے ختم کیا جا سکتا ہے؟ اور ان کمزوریوں کی تلافی کیسے کی جا سکتی ہے۔

یہ منصوبہ بندی دینی اور دنیوی دنوں معاملات میں ہو جیسا کہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے **"اغتنم خمسا قبل خمس شبابک قبل هرمک وصحتک قبل سقمک وغناک قبل فقرک وفراغک قبل شغلک وحیاتک قبل موتک"** (۱)

(پانچ چیزوں سے پہلے پانچ چیزوں کو غنیمت جانو (۱) اپنی جوانی کو بڑھاپے سے پہلے (۲) اپنی صحت کو بیماری سے پہلے (۳) اپنی مالداری کو فقر وفاقہ سے پہلے (۴) اپنے خالی اوقات کو مشغولیت سے پہلے (۵) اپنی زندگی کو موت سے پہلے۔

اور آخرت کی زندگی کی کامیابی کا مدار اسی دنیا کے اعمال پر منحصر ہے جیسا کہ ارشادِ ربانی

---

(۱) مصنف ابن ابی شیبہ حدیث ۳۴۳۱۹، السنن الکبریٰ للنسائی، کتاب المواعظ، حدیث ۱۱۸۳۲، المستدرک علی الصحیحین کتاب الرقاق ۷۸۴۶۔ امام حاکمؒ نے فرمایا کہ یہ حدیث شیخین کی شرط پر صحیح ہے۔

ہے ”وان لیس للانسان الاماسعی وان سعیه سوف یری ثم یجزاه الجزاء الاوفی“(۱)

خلاصہ یہ کہ ہر نیا سال خوشی کے بجائے ایک حقیقی انسان کو بے چین کر دیتا ہے اس لئے کہ اس کو اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ میری عمر رفتہ کم ہو رہی ہے اور برف کی طرح پگھل رہی ہے وہ کس بات پر خوشی منائے بلکہ اس سے پہلے کہ زندگی کا سورج ہمیشہ کے لئے غروب ہو جائے کچھ کر لینے کی تمنا اس کو بے قرار کر دیتی ہے اس کے پاس وقت کم اور کام زیادہ ہوتا ہے۔

ہمارے لئے نیا سال وقتی لذت یا خوشی کا وقت نہیں ہے بلکہ گذرے ہوئے وقت کی قدر کرتے ہوئے آنے والے لمحات زندگی کا صحیح استعمال کرنے کا عزم وارادے کا موقع ہے اور از سر نو عزائم کو بلند کرنے اور حوصلوں کو پروان چڑھانے کا وقت ہے۔

ایک اینٹ گرگئی دیوارِ حیات سے
ناداں کہہ رہے ہیں نیا سال مبارک

سالگرہ کی حقیقت

جب عمر کا ایک سال گذر جاتا ہے تو لوگ سالگرہ مناتے ہیں اور اسمیں اس بات کی بڑی خوشی مناتے ہیں کہ ہماری عمر کا ایک سال پورا ہو گیا، اور اس میں موم بتیاں جلاتے ہیں، اور کیک Cake کاٹتے ہیں، خدا جانے کیا کیا خرافات کرتے ہیں، اس پر اکبر الہ آبادی نے بڑا حکیمانہ شعر کہا ہے:

جب سالگرہ ہوئی تو عقدہ یہ کھلا
یہاں گرہ سے ایک برس اور جاتا ہے

---

(۱) سورۂ نجم آیت: ۳۹

عقدہ بھی عربی میں گرہ کو کہتے ہیں، مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے گرہ میں جو برس دیئے تھے۔اس میں ایک اور کم ہوگیا۔ارے یہ رونے کی بات ہے یا خوش ہونے کی بات ہے؟ یہ تو افسوس کرنے کا موقع ہے کہ تیری زندگی کا ایک سال اور کم ہوگیا۔

لیکن آج ہمارے معاشرے میں سب سے زیادہ بے قیمت چیز وقت ہے اس کو جہاں چاہا کھو دیا، اور برباد کر دیا، کوئی قدر و قیمت نہیں۔گھنٹے، دن، مہینے بے فائدہ کاموں میں اور فضولیات میں گذر رہے ہیں جس سے نہ تو دنیا کا فائدہ ہے نہ تو دین کا۔

اور اگر آپ کو زندگی سے محبت ہے تو وقت کو برباد نہ ہونے دیں، کیونکہ اسی کا نام زندگی ہے، اور ایک ساعت کی بربادی سے جو نقصان ہوتا ہے، بقائے دوام بھی اس کی تلافی نہیں کرسکتی، اور یہ کمی کبھی پوری نہیں ہوسکتی، سچ یہ ہے کہ وقت کو ضائع کرنا ایک طرح کی خودکشی ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ خودکشی ہمیشہ کے لئے زندگی سے محروم کر دیتی ہے، اور تضییع اوقات ایک محدود زمانہ تک زندہ کو مردہ بنا دیتی ہے۔

یہی منٹ گھنٹے اور دن جو غفلت اور بے کاری میں گزرجاتے ہیں اگر انسان حساب کرے، تو ان کی عمومی تعداد مہینوں بلکہ برسوں تک جا پہنچتی ہے، اگر چہ وقت کا بے کار کھونا، عمر کا کم کرنا ہے، لیکن اگر یہی نقصان ہوتا تو چنداں غم نہ تھا کیونکہ دنیا میں عمر سب کو طویل نصیب نہیں ہوتی لیکن بہت بڑا نقصان جو بیکاری اور تضییع اوقات سے ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ آدمی کے خیالات ناپاک اور زبوں ہوجاتے ہیں۔اور طرح طرح کے عوارض جسمانی و روحانی میں مبتلا ہوجاتا ہے، حرص، طمع، ظلم وستم، قمار بازی، حق تلفی، اور نافرمانی عموماً وہی اشخاص کرتے ہیں جو معطل و بے کار رہتے ہیں، کیونکہ انسان کچھ نہ کچھ کرتے رہنے کے واسطے بنایا گیا ہے۔جب تک ان کی طبیعت اور دل و دماغ نیک اور مفید کام میں مشغول نہ ہونگے، اسکا میلان ضرور بدی اور معصیت کی طرف رہے گا، پس اگر انسان انسان بننا چاہتا ہے اور زندگی کو بآرام بسر کرنے کی خواہش رکھتا ہے تو سب کاموں سے مقدم کام اسکے واسطے

یہ ہے کہ وہ اپنے وقت کا نگران رہے، ایک لمحہ بھر بھی فضول نہ کھوئے، اور ہر کام کے لئے ایک وقت اور ہر وقت کے لئے ایک کام مقرر کردے ورنہ جو شخص وقت برباد کرے گا، وقت اس کو برباد کردیگا۔

اگر آپ غور کریں تو نوے فیصد لوگ صحیح طور پر یہ نہیں جانتے کہ وہ اپنے وقت کا زیادہ حصہ کہاں اور کیوں صرف کرتے ہیں، فرینکلن نہایت محنتی انتھک کام کرنے والا، از حد پابند اوقات اور ایک بھی وقت ضائع نہ کرنے والا انسان تھا، اپنے کھانے اور سونے کے لئے کم سے کم جو وقت دے سکتا تھا وہ دیتا تھا۔ وقت کی قدر کریں اور وقت کو غنیمت جانیں۔ اللہ ہم سب کو وقت کی قدر کرنے اور فضولیات سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔(۱)

سالگرہ کی ریت

تم جیو ہزاروں سال۔ عمر خضر پاؤ۔ جگ جگ جیو۔ تم جیو ہزار برس- ہر برس کے دن ہوں ہزار ہزار- یہ اور اس طرح کے فقروں سے لوگ اپنے پیاروں کو جھوٹی دعائیں دیتے رہتے ہیں۔

فیس بک پر یوم پیدائش ڈالدو تو سمجھو بس کام بن گیا- دیکھے ان دیکھے دوستوں، عزیز وں رشتہ داروں کی طرف سے ایک سے ایک لپکتے چھکتے پیغامات موصول ہوجائیں گے، ایک سے ایک کارڈ، گلدستے' کیک اسکے اوپر بھیجے جاتے ہیں- خوشیاں بانٹنے کے کیا آسان ذرائع میسر آگئے- ہینگ لگے نہ پھٹکڑی -اور رنگ بھی چوکا آئے۔

انجانے رشتوں اور خوشیوں کے عالم میں اور کچھ ہو نہ ہو اپنی اہمیت کا احساس ہونے لگتا ہے کہ ابھی بھی ہمارے کچھ چاہنے والے ہیں، یوم پیدائش کے ساتھ لوگوں کی اتنی توقعات وابستہ ہوگئی ہیں کہ اکثر کو یہ شکوہ ہوتا ہے کہ ہم کو تو برتھ ڈے Birthday پر وِشWish ہی

---

(۱) اسلام اور ہماری زندگی: ۲/ ۲۹۵۔

نہیں کیا، جو زندہ ہیں انکی سالگرہیں تو ہیں جو دنیا سے جاچکے ہیں انکی سالگرہوں کی دھوم بھی کم نہیں ہے، کرسمس Chirstmas میں عیسائی عقیدے کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی سالگرہ منائی جاتی ہے اسکی دیکھا دیکھی مسلمانوں نے بھی عید میلاد النبی منانا شروع کیا، دوسرے مذاہب میں انکے پیشواؤں کے یوم پیدایش منائے جاتے ہیں، مشہور شخصیات کی سالگرہوں کو منایا جاتا ہے، پہلے لوگوں میں یوم پیدائش یاد رکھنے معمول کچھ اسطرح تھا ''وہ فلانے کی جب شادی تھی تو یہ ایک سال کا تھا'' جب فلاں چچا حج کرکے آئے تھے تو یہ چھ مہینے کی تھی'' فلاں سال رمضان جب گرمیوں میں آئے تھے یا عید تھی تو چھوٹا پندرہ مہینے کا تھا'' وغیرہ، اب تو اسکولوں اور دفتروں میں بھی سالگرہ منائی جاتی ہے، پیدایش کی سرٹیفکیٹ کی پابندی ہوگئی ہے، مغربی ممالک میں ۶۵ ویں سالگرہ کی بہت اہمیت ہے یہ سال پورے ہوئے تو ہم معمر شہری کہلائے، بہت ساری سہولتوں اور رعایتوں کے اہل ہوئے، لطف یہ کہ جہاں معمر لوگوں کی آبادی جوانوں سے بڑھ گئی ہے انکو معاشرے پر بوجھ نہیں سمجھا جاتا بلکہ معمر شہریوں کی عزت اور توقیر میں مزید اضافہ ہوجاتا ہے، لوگ اسی انتظار میں ہوتے ہیں کہ ریٹائر ہوئے تو عیش ہی عیش ہیں اگر ذہنی اور دماغی طور پر تندرست ہوں تو، اسلئے ۶۵ ویں سالگرہ کی بہت دھوم ہوتی ہے، اگر جوڑی سلامت ہے تو ازسرنو پوری شادی کی رسومات انجام پاتی ہیں اور مرد کا ساٹھ سالہ جشن پیدایش منایا جاتا ہے، مغربی دنیا میں جوانوں کے اٹھارویں سالگرہ کا بھی اہتمام کیا جاتا ہے، جہاں وہ اٹھارہ سال کو پہنچ جائیں، کیونکہ مغربی دنیا میں خودمختاری مل جاتی ہے، کہ بچہ جوان ہوچکا ہے سرکاری طور پر کوئی اسکے معاملات میں مداخلت نہیں کرسکتا، وہ جس طرح چاہے اپنی زندگی گزارے کوئی روک ٹوک نہیں کوئی پابندی نہیں، کتنی بغیر شادی کی وداعیاں ہوجاتی ہیں۔

برتھ ڈے کی شرعی حیثیت

آج مسلمانوں نے دیگر اقوام کی دیکھا دیکھی بہت سی چیزیں اپنی زندگی میں لازم و

ضروری قرار دے لی ہیں، بچوں کا ’’برتھ ڈے‘‘ بڑوں کی شادی ’’اینورسری‘‘ Anniversary اور پچھلوں کا ڈیتھ ڈے Deathday، اس دھوم سے منایا جا رہا ہے، جیسا کہ وہ کوئی کارِ خیر اور باعث ثواب عمل ہو، بچوں کیلئے برتھ ڈے کیک، شادی شدہ لوگوں کیلئے سلور جوبلی Sliver Jubilee اور گولڈن جوبلی Golden jubilee، اینورسری کیک، یا ہر سال پھر فرسٹ اینورسری First anniversary کی باضابطہ دعوتیں ہو رہی ہیں، من جملہ ان کے سالانہ یومِ پیدائش یعنی برتھ ڈے کی رسم بھی ہے، ظاہر ہے کہ اس میں اگر کوئی چیز خلافِ شریعت نہ کی جائے یعنی محض کچھ حلال کھانے پینے کا انتظام ہو تو یہ فی نفسہ جائز ہے، لیکن زندگی کے اوقات گزرنے پر خوشی منانا یا کسی دن کو بذاتِ خود خاص خوشی کا دن ٹھہرا لینا درست معلوم نہیں ہوتا، اول تو زندگی کی منزلیں طے کرنا احتساب کا موقع ہوتا ہے نہ کہ خوشی کا اس موقع پر اس بات کا حساب کرنے کی ضرورت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا کی زندگی کی شکل میں آخرت کو سنوارنے کا ہمیں جو موقع عنایت فرمایا تھا، اس میں ہم نے کس حد تک کامیابی حاصل کی۔

دوسرے یہ کہ مسلمان کی ہر خوشی اللہ کی خوشی میں ہے اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے یومِ پیدائش پر کسی قسم کی خوشی منانے کا حکم نہیں دیا۔ پھر اس عمل میں اغیار کی نقالی ہے جس سے اجتناب کا حکم دیا گیا ہے، ان وجوہات کی بنا پر علماءِ اسلام نے ’’برتھ ڈے birth day‘‘ کے نام سے تقریبات منعقد کرنے سے منع فرمایا ہے۔

فتاویٰ حقانیہ میں ہے:

سوال: آج کل خوشی منانے کی ایک عجیب رسم کا رواج ہے، وہ یہ کہ جب کسی پیدائش کی تاریخ یا دن آجاتا ہے، تو عزیز و اقارب کو کھانے کی دعوت دی جاتی ہے اور پھر بڑی دھوم دھام سے موم بتیاں جلا کر مخصوص قسم کا کیک کاٹا جاتا ہے، معاشرے میں اس کا بہت اہتمام کیا جاتا ہے، لوگ اس خوشی میں ایک دوسرے کو گراں قدر تحفے تحائف دیتے ہیں اور اس

سب کچھ کو ’سال گرہ‘ کہا جاتا ہے، تو کیا شرعاً اس کا کوئی ثبوت ہے اور اس قسم کی دعوت میں شرکت کرنا، تحفہ وغیرہ دینا جائز ہے یا نہیں؟

جواب : اسلام میں اس قسم کے رواج کا کوئی ثبوت نہیں ہے، خیر القرون میں کسی صحابی، تابعی، تبع تابعی یا ائمۂ اربعہ میں سے کسی سے مروجہ طریقہ پر سالگرہ منانا ثابت نہیں، یہ رسم بد انگریزوں کی ایجاد کردہ ہے، ان کی دیکھا دیکھی کچھ مسلمانوں میں بھی یہ رسم سرایت کر چکی ہے، اس لیے اس کو ضروری سمجھنا، ایسی دعوت میں شرکت کرنا اور تحفے تحائف دینا فضول ہے، شریعتِ مقدسہ میں اس کی قطعاً اجازت نہیں۔(۱)

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی مدظلہ فرماتے ہے:

’’یومِ میلاد منانا جس کو ’برتھ ڈے‘ کہتے ہیں، نہ کتاب وسنت سے ثابت ہے، نہ صحابہ کرامؓ اور سلفِ صالحینؒ کے عمل سے۔ شریعت نے بچوں کی پیدائش پر ساتویں دن عقیقہ رکھا ہے، جو مسنون ہے اور جس کا مقصد نسب کا پوری طرح اظہار اور خوشی کے اس موقع پر اپنے اعزہ واحباب اور غرباء کو شریک کرنا ہے، برتھ ڈے کا رواج اصل میں مغربی تہذیب کی ’برآمدات‘ میں سے ہے، جو حضرت مسیح علیہ السلام کا یومِ پیدائش بھی مناتے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دوسری قوموں کی مذہبی اور تہذیبی مماثلت اختیار کرنے کو ناپسند فرمایا ہے، اس لیے جائز نہیں، مسلمانوں کو ایسے غیر دینی اعمال سے بچنا چاہئے۔(۲)

دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:

’’اسی طرح یومِ ولادت میں دعوت وغیرہ کا اہتمام جسے سالگرہ بھی کہتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، صحابہ کرامؓ اور سلفِ صالحینؒ سے ثابت نہیں، یہ مغربی اقوام سے متاثر ہونے کا نتیجہ ہے، چوں کہ اسے دینی عمل سمجھ کر انجام نہیں دیا جاتا، اس لیے اسے بدعت تو نہیں کہہ

---

(۱) فتاویٰ حقانیہ: ۲/۷۵۔
(۲) جدید فقہی مسائل ۱:/۳۱۰۔

سکتے، کیوں کہ بدعت کا تعلق امرِ دین سے ہوتا ہے، لیکن غیر مسلموں سے مماثلت اور غیر اسلامی تہذیب سے تاثر اور مشابہت کی وجہ سے کراہت سے بھی خالی نہیں، اس لیے احتراز کرنا چاہئے۔(۱)

نیز ایسی تقریبات میں شریک ہوتے وقت یہ اصول یاد رکھنا چاہیے کہ فضول چیزوں میں شرکت بھی فضول ہے، جب سال گرہ کی خوشی ہی بے معنی ہے (کہ انسان کی عمر حقیقتاً اس دنیا میں بڑھتی نہیں بلکہ گھٹتی ہے) اس میں شرکت بھی بے معنیٰ ہے، اگر کوئی ان تقریبات میں شرکت نہ کرے اور وہ خود جس کی سال گرہ ہو، آ کر کیک وغیرہ لا کر دے تو ان کے کھانے کے متعلق حکم یہ ہوگا کہ اگر اس فضول رسم میں شرکت مطلوب ہو تو کھا لیا جائے، ورنہ انکار کر دیا جائے، ایسے موقعوں پر جنھیں انکار کرنا عجیب لگتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ دل و دماغ میں انگریزیت رچ بس گئی ہے، ایسے موقعوں کو خصوصی اہمیت دیتے ہوئے تحفے تحائف لینا دینا بھی درست نہیں۔(۲)

دارالافتاء، جامعہ علوم اسلامیہ علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن کا فتوی ہے کہ: ’’

سالگرہ منانے کا شرعاً کوئی ثبوت نہیں ہے، بلکہ یہ موجودہ زمانہ میں اغیار کی طرف سے آئی ہوئی ایک رسم ہے، جس میں عموماً طرح طرح کی خرافات شامل ہوتی ہیں، مثلاً: مخصوص لباس پہنا جاتا ہے، موم بتیاں لگا کر کیک کاٹا جاتا ہے، موسیقی اور مرد وزن کی مخلوط محفلیں ہوتی ہیں، تصویر کشی ہوتی اور پھر ان میں غیر اقوام کی نقالی بھی ہوتی ہے، اور یہ سب امور ناجائز ہیں، لہذا مروجہ طریقہ پر سالگرہ منانا شرعاً جائز نہیں ہے، ہاں اگر اس طرح کوئی خرافات نہ ہوں اور نہ ہی کفار کی مشابہت مقصود ہو، بلکہ گھر والے اس مقصد کے لیے اس دن کو یاد رکھیں کہ رب کے حضور اس بات کا شکر ادا ہو کہ اللہ تعالیٰ نے عافیت وصحت اور عبادات کی

---

(۱) کتاب الفتاویٰ ۱:/ ۴۰۵۔

(۲) آپ کے مسائل اور ان کا حل ۲:/ ۵۱۹-۵۱۸ جدید محقق، ماخوذ: تعمیر نیوز 21،11،2014، ندیم انصاری۔

توفیق کے ساتھ زندگی کا ایک سال مکمل فرمایا ہے اور اس کے لیے اگر منکرات سے خالی کوئی تقریب رکھ لیں یا گھر میں بچے کی خوشی کے لیے کچھ بنا لیں یا باہر سے لے آئیں تو اس کی گنجائش ہوگی، تاہم احتیاط بہتر ہے“۔فقط واللہ اعلم(۱)

سالگرہ پر مبارکبادی دینا

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے، حضرات صحابہ کرام وتابعین سے ائمہ اربعہ سے، بزرگان دین سے جنم دن یا سالگرہ منانے کا کوئی ثبوت نہیں ملتا، یہ غیر قوموں کا طریقہ ہے، ہم مسلمانوں کو غیروں کا طریقہ اپنانا جائز نہیں، نہ ہی اس موقعہ پر مبارکباد دینا درست ہے، ہمیں اسلامی طریقہ پر زندگی گذارنا چاہیے، غیروں کے طریقوں کو اختیار نہ کرنا چاہیے۔ ”وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْه“(۲) واللہ تعالیٰ اعلم۔(۳)

بعض لوگ کہتے ہیں کہ ”اگر خوشیاں معصوم سی ہوں نہ اسمیں فحاشی ہو نہ بے حیائی تو ایک دوسرے کا دل رکھنے میں اور تھوڑی خوشیاں دینے اور بانٹنے میں کیا ہرج ہے، کیک کاٹنا اور موم بتی جلانا ہمارے ایمان میں کسطرح سے مخل ہوسکتا ہے؟

ان سے پوچھا جائے کہ ”خوشیاں معصوم کیسے ہوتی ہیں؟ کیا یہ محافل بے حیائی سے خالی ہوتی ہیں؟ اگر ہوتی ہیں تو مطلب یہ ہوا کہ اولیائے زمانہ اپنا سالگرہ منا رہے ہیں، بالکل گناہوں سے پاک، جیسے ہی وہ لمحہ آیا جس میں پیدائش کی خوشی منانی ہو سب تلاوت وتسبیح میں مصروف ہوجاتے ہیں، اور دل رکھنے کے لیے خوشیاں بانٹنے میں حرج نہیں، مگر کونسی بانٹنا ہے؟ جس خوشی میں اللہ ناراض ہوجائے، غیروں کی نقالی کی خوشی بانٹنا ہے؟ دل رکھنے کے لیے پھر کسی کو دل دیے بیٹھنے کی بھی گنجائش ہونی چاہئے، دل رکھنے کے لیے تھوڑا بوس

---

(۱) دارالافتاء، جامعہ علوم اسلامیہ علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن، فتوی نمبر 143909201174 :۔

(۲) آل عمران: ۸۵

(۳) دارالافتاء، دارالعلوم دیوبند، 363=296-3/1433۔

وکنار بھی ہونا چاہئے، نیز موم بتی جلانا ایمان میں مخل نہیں تو مندر میں گھنٹہ بجانا بھی ایمان میں مخل نہیں ہونا چاہئے، دیش بھگتی کے نام پر، رواداری کے نام پر پوجا میں حصہ لینا بھی ایمان میں مخل نہیں ہونا چاہئے، سچ تو یہ ہے کہ جب انسان اپنے رب سے نڈر ہو جاتا ہے مغربیت کے رنگ میں رنگا جاتا ہے تو صحیح وغلط کو ناپنے کا پیمانہ اسلامی نہیں رہتا ہے۔

جب یہ کہا جاتا ہے کہ سالگرہ پر خوشی کیا منانی، اس میں تو عمر کا ایک سال گھٹ گیا ہے تو کہتے ہیں کہ ”اب اس سال کو تو گھٹنا ہی تھا کیا کوئی وقت کے دھارے کو روک سکتا ہے، وقت تو گزرتا ہی جاتا ہے چاہے رو کر گزارو، چاہے ہنس کر گزارو سالگرہ مناؤ یا نہ مناؤ سال تو گزرہی جائیگا، اسکو تو بہر حال گزرنا ہی ہے“؟

جب اتنی عقل ہے کہ وقت تو گذرنا ہی ہے تو یہ بھی سمجھ لیں کہ ”گذرتے وقت میں کیا ہوا عمل ہمیشہ کے لیے باقی رہ جاتا ہے، نیکی ہو یا گناہ وہ محفوظ ہو جاتا ہے، پھر گذرتے وقت کو اپنے خلاف حجت بنانا، سچ ہے ہم وقت کو روک نہیں سکتے ہیں مگر گذرتے وقت میں اپنے کو معصیت کے دھارے سے تو روک سکتے ہیں؟ بنیادی سوال یہ ہے کہ عمر گذر جانے پر کس بات کی خوشی ہو رہی ہے؟ وقت گزرہی جاتا ہے، خوشیاں تو ہوا کی طرح اڑ جاتی ہیں، مگر گذرتے وقت میں کی ہوئی حرکتیں یوم آخرت کے لیے باقی رہ جاتی ہیں۔

نئے سال کی ابتداء میں مبارک بادی کا شرعی حکم

پہلی جنوری کو سب ایک دوسرے کو خوشی کا اظہار کرتے ہیں اور ہیپی نیو اِیئر (happy new year.) کا میسج بھی بھیجتے ہیں، تو کیا ہم بھی اس کے جواب میں ہیپی نیو اِیئر کہہ سکتے ہیں؟ کیا ایسا کہنا حرام ہے؟ کیا ایسا کہنے سے ایمان ختم ہو جائے گا؟

ہیپی نیو ایئر (happy new year) کہنا حرام تو نہیں اور نہ ہی ایسا کہنے سے آدمی ایمان سے خارج ہوتا ہے، تاہم پہلی جنوری کو ”ہیپی نیو ایئر“ کہنا نصاریٰ وغیرہ کا طریقہ

ہے، اس لیے "ہیپی نیو ایئر" کہنے سے احتراز کرنا چاہیے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔(۱)

کسی کو سال نو کی کیا مبارک باد دی جائے
کلینڈر کے بدلنے سے مقدر کب بدلتا ہے

نئے سال کی آمد پر جو خوشی منائی جاتی ہے، اور اس خوشی کے اظہار کیلئے جو افعال اختیار کئے جاتے ہیں مثلاً: پٹاخے پھوڑنا، تالیاں بجانا، سیٹیاں بجانا، ناچ گانا کرنا Happy New Year کہنا، یا نئے سال کی مبارکبادی دینے کیلئے موبائل سے ایک دوسرے کو SMS بھیجنا وغیرہ، یہ سب ناجائز ہیں، اور اس میں شرکت یہود و نصاری کی مشابہت اختیار کرنا ہے، جس پر سخت وعید وارد ہوئی ہے۔(۲)

نئے سال کی آمد پر جو ہولی ڈے Holi day اور چھٹی رکھ کر جشن منایا جاتا ہے، وہ یہود و نصاریٰ کی رسم ہے، شریعتِ اسلامی میں اس کی کوئی اصل و بنیاد نہیں ہے، بلکہ اسلام نے اپنے ماننے والوں کو یہود و نصاریٰ کی مشابہت اور ان کی عیدوں اور تہواروں میں کسی بھی طرح کی شرکت پر سخت وعید بیان فرمائی اور جو شخص مسلمان ہوتے ہوئے غیروں کے رسم و رواج کا طالب ہو، وہ عند اللہ سخت مبغوض اور ناپسندیدہ ہے اس لیے کرسمس ڈے Christamas day، برتھ ڈے Birth day، مدر ڈے Mother day ویلین ٹائن ڈے valentine day اور دیگر تمام ڈیز days کو بطورِ عید منانا شرعاً ناجائز اور ممنوع ہے۔(۳)

---

(۱) دارالافتاء، دارالعلوم دیوبند۔

(۲) محقق ومدلل جدید مسائل: ۱/ ۸۳، آپ کے مسائل اور ان کا حل: ۸/ ۱۲۹۔

(۳) المسائل المہمہ: ۷/ ۱۷۲۔

ہسپانیہ تو خونِ مسلماں کا امین ہے
مانند حرم پاک ہے تو میری نظر میں

۲ جنوری یوم سقوط اندلس

Battle of Andalus

اندلس (اسپین) کی تاریخ، زوال کے اسباب، عیسائی مکاریاں، مسلمانوں کی خانہ جنگیاں، ہندوستانی حکومت کا زوال، مسلمانوں کے لیے لائحۂ عمل، مضمون کا بیشتر حصہ آزاد ائرۃ المعارف ویکیپیڈیا سے بھی مستفاد ہے

مدینۃ الزہراء (روشن شہر)

خلافت قرطبہ کا وہ عظیم شہر جو صرف ۷۰ ربرس قائم رہا، اس شہر کا شمار دنیا کے خوبصورت ترین شہروں میں ہوتا تھا، ایک ایسا شہر کہ جس نے بھی دیکھا دنگ رہ گیا اور اس کی تعریف کیے بنا نہ رہ سکا، یہ شہر خلافت کی طاقت کی ترجمانی کرتا تھا اس میں ہر چیز کو بھرپور شان و شوکت دکھانے کے لیے بنایا گیا، جنوبی اسپین کے علاقے قرطبہ کے شہر اندلس سے آٹھ کلومیٹر کے فاصلے پر قائم یادگار شہر جس کو مسلم ریاست اندلس کے شہزادے اور خلیفہ سوئم عبدالرحمان نے ۹۳۸ ؁ءمیں اسپین کے شہر قرطبہ کے مغربی پہاڑی سلسلے اور دریائے گوداکلیو کے دائیں کنارے پر اپنی حکومت کے دارالحکومت اور ایک نئے شہر کی تعمیر کا حکم دیا تھا۔

اس کا نام خلیفہ کی پسندیدہ خاتون زہراء کے نام پر مدینۃ الزہراء رکھا گیا اور ۱۰ ربرس کے قلیل عرصے میں اس کی تعمیر مکمل کر کے ۹۴۵ ؁ءمیں خلیفہ کا دربار وہاں منتقل ہو گیا۔

نئے دارالحکومت مدینہ الزہراء کی تعمیر میں تقریباً ۱۰۰۰۰ رمزدوروں نے کام کیا تھا، روزانہ ۶۰۰۰ رپتھر کے بلاکس Blacks لگائے گئے اور تقریباً ۶۸۰۰۰ رکلو تک چونے اور پلستر کا استعمال کیا گیا جس کو ۱۵۰۰ رگدھوں اور خچروں کی مدد سے لایا گیا تھا، اس وقت کے بہترین کاریگروں کو جہازوں، محرابوں، راہداریوں اور ستونوں کو سجانے کا کام سونپا جاتا تھا، سفید سنگِ مرمر پرتگال Portugal سے لایا گیا تھا، جامنی رنگ کے چونے کے پتھر قرطبہ کے پہاڑی سلسلے سے حاصل کیے گئے، لال پتھر کو قریبی ”سیئیرا ڈی کیبرا“ نامی پہاڑی سلسلہ سے حاصل کیا گیا سفید چونے کے پتھر ۸۵ رکلومیٹر دور ریوق شہر سے منگوائے گئے، اس وقت خلافت کا سالانہ بجٹ تقریباً ۴۰ رسے ۵۰ رلاکھ درہم تھا اور مدینہ الزہراء کی تعمیر کے لیے اس کا ایک تہائی استعمال کیا گیا، زمین کی ناہمواری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس شہر کو تین سطحوں پر تعمیر کیا گیا۔ سب سے اوپر خلیفہ وقت عبدالرحمان کی شاہی رہائشگاہ کو انتہائی مہارت سے کی گئی کشیدہ کاری سے سجاوٹ اور شاندار ستونوں کے ساتھ تعمیر کیا گیا، جہاں

ایک بڑے اور اونچے دالان سے خلیفہ پوری شان وشوکت اور جاہ وجلال کے ساتھ شہر پر نظر رکھ سکتا تھا اور دور تک دیکھ سکتا تھا، شہر کی دوسری سطح پر حکومتی عمارات اور اہم درباریوں کے گھر تھے اور سب سے نچلی سطح پر عوام اور سپاہیوں کے گھر، مساجد، باغات اور حمام تھے، اپنی پوری شان وشوکت اور خوبصورتی کے باوجود یہ شہر صرف ۷۰ ربرس تک قائم رہا۔

۹۶۷ء میں اس وقت کے خلیفہ الحاکم دوئم جو اس شہر کو تعمیر کرنے والے خلیفہ سوئم عبدالرحمان کے بیٹے اور جانشین تھے کی موت کے بعد اس شہر کا زوال اور بربادی شروع ہوئی تھی، مغرب کے سب سے خوبصورت شہر کو لوٹا گیا، جلایا گیا اور اس کے حسن سے اسے محروم کر دیا گیا، اس کی دولت اور مہنگی ترین عماراتی سجاوٹ کی اشیا کو فروخت کر دیا گیا، یہاں تک کہ یہ شہر گمنامی میں چلا گیا اور یہ گمنامی ۱۹۱۱ء تک جاری رہی جب پہلی مرتبہ کھدائی کی گئی اور اس اساطیری شہر کے خزانے دنیا کے سامنے آئے، اور آج بھی یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس شاندار شہر کا صرف 11 فیصد حصہ دنیا کے سامنے آیا ہے۔

اسپین

برِاعظم یورپ کے جنوب مغربی کنارے پر موجود جزیرہ نما آئبیریا (Iberian Peninsula) جو کوہستانِ پیرینیز (Pyrenees) کی وجہ سے باقی برِاعظم سے کافی حد تک کٹا ہوا ہے اور آج کل اسپین (Spain) اور پرتگال (Portugal) نامی دو ممالک پر مشتمل ہے، مسلمانوں نے اُس پر تقریباً 800 برس تک حکومت کی، اِسلامی تاریخ میں اس ملک کو 'اندلس' کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، اندلس جو کبھی اپنی وُسعت میں پھیلتا ہوا موجودہ اسپین اور پرتگال کے ساتھ ساتھ فرانس کے جنوبی علاقوں اربونہ (Narbonne)، بربنیان (Perpignan) قرقشونہ (Carcassonne) اور تولوشہ (Toulouse) وغیرہ تک جا پہنچا تھا، دورِ زوال میں اُس کی حدُود جنوب مشرقی سمت میں سکڑتے ہوئے محض غرناطہ (Granada) تک محدُود ہوگئیں، سپین میں 471 مساجد، 300 عوامی

غسل خانے، 63,000 امراء کے مکانات اور 200,077 عام لوگوں کے مکانات تھے، کاروباری مراکز میں 80,000 دکانیں ان کے علاوہ تھیں، پہاڑوں سے پانی شہر کے ہر کونے میں پہنچایا گیا تھا، جس کے لیے خالص سونا، چاندی، تانبا اور جست کے مختلف شکلوں کے پائپ بنائے گئے تھے، ان کے ذریعے پانی بڑی جھیلوں، تالابوں ٹینکون اور سنگ مرمری فواروں تک پہنچایا جاتا تھا مکانات میں گرمیوں میں باغات کی تازہ معطر ہوا کے گزر کا اہتمام تھا اور سردیوں میں دیواروں میں نصب گرم ہوانلوں کی مدد سے گھروں کو گرم رکھا جاتا تھا، مزید اہم کاموں میں بڑے راستوں پر جو محلات کی طرف جاتے تھے، روشنی کا اہتمام تھا۔ ان بڑے محلات میں سے ایک ازہارہ کا محل تھا جس کے 15,000 دروازے تھے، بلاشبہ خلافت کے دورِ عروج میں قرطبہ یورپ کا اہم دارالخلافہ اور دنیا کے عظیم شہروں میں سے ایک تھا۔

قرطبہ اندلس کا دارالخلافہ رہا ہے اس کے علاوہ غرناطہ، اشبیلیہ، ملاغنہ اور دانیہ سمیت کتنے ہی خوبصورت شہر اس دور میں اسلامی تہذیب وتمدن کی آماجگاہ تھے۔ اسلامی اندلس میں ہر دو شہروں کے درمیان پکی سڑکیں تھیں اور مسافر دو کوس بھی نہ چلنے پاتا تھا کہ اسے کوئی مسافر خانہ مل جاتا جہاں اسکی مفت خدمت کی جاتی تھی۔ سڑک کے دونوں طرف پھل دار درختوں کی لمبی لمبی قطاریں تھیں، شہروں میں بھی پتھر کی پختہ سڑکیں تھیں ہر گھر والے شام کو رات بھر کیے ایک چراغ روشن کر دیتے تھے جس سے گلیاں اور پھر پورا شہر روشن روشن رہتا، دن نکلنے پر ایک گدھا گاڑی والا ہر ہر گھر سے کوڑا اکٹھا کر لیتا۔ ہر ہر گھر تک پانی کی فراہمی اور نکاسی آب کا بہترین نظام تھا مسلمانوں کے بعد عیسائیوں نے ایک علاقے کا آبی نظام کھودا لیکن پھر نہ بنا سکے اسکے بعد انہوں نے پھر کسی نظام کو نہیں چھیڑا۔

اندلس پر حملہ کی وجہ

ولید بن عبدالملک کے دورِ خلافت (705ء تا 715ء) میں موسیٰ بن نصیر کو شمالی

افریقہ کی گورنری تفوِیض ہوئی، اُس دور میں سپین کی سیاسی ومعاشی حالت اِنتہائی اَبتر تھی، عیش کوش ُ گاتھ' حکمرانوں نے غریب رِعایا کا جینا دوبھر کر رکھا تھا عیش وعشرت کے دِلدادہ بدمست اُمراءاور پادریوں نے عوام کو ٹیکسوں کے بوجھ تلے دبا رکھا تھا، یہودیوں کی حالت سب سے بری تھی، اُنہیں کوئی دَم سکھ کا سانس نہیں لینے دیا جاتا تھا۔ظلم و بربریت کے اُس نظام سے تنگ آ کر بڑی تعداد میں لوگوں نے ہجرت کی سوچی اور وہاں سے فرار ہو کر موسیٰ بن نصیر کے زیرِ اِنتظام شمالی افریقہ میں پناہ لینا شروع کر دی جہاں اِسلامی نظامِ حکومت کے باعث لوگ پُرامن زندگی بسر کر رہے تھے۔ جب معاملہ حد سے بڑھا اور مہاجرین بڑی تعداد میں سمندر پار کر کے افریقہ آنے لگے تو موسیٰ نے سپین کی مظلوم رِعایا کو بدمست حکمرانوں کے چنگل سے آزاد کروانے کا منصوبہ بنایا۔

مسلم سپہ سالار طارق بن زیاد صرف سات ہزار کا لشکر لے کر چار بحری جہازوں میں اندلس کے ساحل پر اترا اور عیسائیوں کے بادشاہ راڈرک سے ایک ایسی عورت کی عصمت کا بدلہ لینے کے لئے اندلس جیسے عظیم الشان ملک پر حملہ آور ہو گیا تھا جو مسلمان بھی نہیں تھی اور اپنے ہی ہم مذہب عیسائی بادشاہ ''راڈرک'' (Rodrigo) کی ہوس کا نشانہ بنی تھی، یہ ایک ولولہ انگیز اور ایمان افروز داستان ہے جس کا آغاز 5 رجب 92 ہجری بمطابق 9 جولائی 711ء کو ہوا جب ایک عیسائی حاکم ''کاؤنٹ جولیٹین'' (Count Joelton) امیر مصر وافریقہ موسیٰ بن نصیر کے دربار میں فریاد لے کر آیا کہ اندلس کے بادشاہ راڈرک نے اسکی کنواری بیٹی کو بے آبرو کیا ہے اور وہ اپنی بیٹی کی آبرو کا بدلہ مسلمانوں کی مدد کے بغیر نہیں لے سکتا موسیٰ بن نصیر نے طارق بن زیاد کو بلایا اور سات ہزار کا لشکر دے کر اندلس روانہ کیا تاکہ مظلوم عورت کی عصمت لٹنے کا بدلہ راڈرک کی بادشاہت کی اینٹ سے اینٹ بجا کر لیا جائے۔

سپین پر باقاعدہ حملے سے قبل دُشمن کی فوجی طاقت کے صحیح اندازے کے لیے موسیٰ نے اپنے ایک قابل غلام ُطریف' کی کمان میں جولائی ۷۱۰ءمیں ۱۰۰ سواروں اور ۴۰۰ ر

پیادوں کا دستہ روانہ کیا، جس نے سپین کے جنوبی ساحل پر پڑاؤ کیا، جسے آج تک اُس کی یاد میں ’طریفہ‘ کہا جاتا ہے، آس پاس کے علاقوں پر کامیاب یلغار کے بعد ’طریف‘ نے موسیٰ کو اِطلاع دی کہ فضاء ساز گار ہے، اگر حملہ کیا جائے تو جلد ہی عوام کو ظالم حکمرانوں کے پنجۂ تسلط سے نجات دِلائی جاسکتی ہے۔

موسیٰ بن نصیر نے اگلے ہی سال ۷۱۱ئ بمطابق ۹۲ھ معروف بربر جرنیل ’طارق بن زیاد‘ کو 7,000 فوج کے ساتھ سپین پر لشکرکشی کے لیے روانہ کیا۔ افریقہ اور یورپ کے درمیان واقع 13 کلومیٹر چوڑائی پر مشتمل آبنائے کو عبور کرنے کے بعد اِسلامی لشکر نے سپین کے ساحل پر جبل الطارق (Gibraltar) کے مقام پر پڑاؤ کیا۔

’طارق‘ کا سامنا وہاں سپین کے حکمران ’راڈرک‘ کی ایک لاکھ سے زیادہ اَفواج سے ہوا۔ تین روز گھمسان کی لڑائی جاری رہی مگر فتح کے آثار دِکھائی نہ دیے۔ چوتھے دِن طارق بن زیاد نے فوج کے ساتھ اپنا تاریخی خطاب کیا، جس کے اِبتدائی الفاظ یوں تھے:

اے لوگو! جائے فرار کہاں ہے؟ تمہارے پیچھے سمندر ہے اور سامنے دُشمن اور بخدا تمہارے لیے ثابت قدمی اور صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ ”أیھا النّاسُ! أین المفرّ؟ البحر مِن ورائِکم و العدوّ أمامکم، و لیس لکم و اللہِ إلا الصّدق و الصبر“(۱)

شریف اِدریسی نے اپنی کتاب ”نُزھةُ المشتاق“ میں لکھا ہے کہ اِس خطاب سے قبل ’طارق‘ نے سمندر میں کھڑی اپنی کشتیاں جلا دی تھیں تاکہ فتح کے سوا زِندہ بچ نکلنے کے باقی تمام راستے مسدُود ہو جائیں، چنانچہ مسلمان فوج بے جگری سے لڑی۔

اندلس پر قیام کے دوران اندلس کی ساحلی فوج سے چھوٹی موٹی جھڑپیں چلتی رہیں اسی دوران طارق بن زیاد کو موسیٰ بن نصیر کی طرف سے پانچ ہزار مزید نفری کی کمک حاصل ہوگئی تھی ،یوں کل ملا کر بارہ ہزار کے لشکر کے ساتھ راڈرک کی فوج کا انتظار کیا جانے لگا ۷۱۱ئ کی آخری

---

(۱) دولۃُ الاسلام فی الاندلس: ۱/۴۶۔

سہ ماہی کا ایک دن تھا، دریائے گادلیت کے ساتھ ساتھ پھیلے ہوئے وسیع میدان میں راڈرک کی ایک لاکھ فوج لڑنے کے لئے تیار تھی، راڈرک کی فوج نے کشتیوں کا پل بنا کر دریا پار کیا، مسلمان بھی مقابلے کے لئے تیار تھے راڈرک نے حملے کا حکم دیا کہ دو دو، تین تین دستوں سے حملہ کیا جائے، راڈرک جو کہ فن حرب وضرب کا استاد مانا جاتا تھا اس نے اپنے جرنیلوں کو کہا : ضرب لگاؤ اور بھاگو، دشمن کو اپنے پیچھے پہاڑیوں میں لاؤ، پھر انہیں تیر انداز سنبھال لیں گے ادھر طارق بھی سمجھدار اور معاملہ فہم سپہ سالار تھا، اِس نے بھی اپنے چھوٹے بڑے کمانداروں کو ذہن نشین کروادیا کہ جم کر کہیں بھی نہیں لڑنا، مقصد یہ تھا کہ ہجوم کی صورت حملہ کرنے سے گھوڑے تیروں سے زخمی ہو کر اپنے پیادوں کو کچلتے پھریں گے راڈرک نے حملے کا حکم دیا، طارق نے تین چار دستے آگے کئے جو اس طرح لڑنے لگے جیسے انہیں بھاگنے کی جلدی ہو، اندلسی کچھ سمجھ ہی نہ سکے، مسلمان ایک پہاڑی کے دامن میں آ کر اِدھر اُدھر بکھر گئے پہاڑی کی ڈھلان سے اندلسیوں پر تیروں اور برچھیوں کا مینہ برسنے لگا، طارق کے جو دستے دائیں بائیں ہو گئے تھے وہ بھی اکٹھے ہو گئے دشمن کے دستے تیروں سے گھبرا کر واپس پلٹے تو دائیں بائیں سے مسلمانوں نے ان پر ہلہ بول دیا، اندلسی بری طرح کٹنے لگے اس روز راڈرک نے چند اور دستوں سے حملہ کروایا لیکن طارق کی حکمت عملیوں کے آگے ناکام رہا سورج غروب ہو گیا، میدان راڈرک کی فوج کی لاشوں سے بھرا پڑا تھا مسلمانوں نے نصف شب کو راڈرک کے اصطبل پر شب خون مارا اور گھوڑوں کی رسیاں کاٹ کر انکو زخمی کر دیا، گھوڑوں نے رات کو راڈرک کی فوج کا بہت نقصان کیا، اگلے دن کفار نے اور بھی شدت سے حملہ کیا لیکن راڈرک کو اس دفعہ بھی ہزیمت اٹھانا پڑی، تیسرے دن راڈرک شدید قہر میں تھا، اس نے ”گوتھ“ قوم کے جرنیل کو حکم دیا کہ ہلہ بول دو لیکن اس دن آسمان نے اور ہی منظر دیکھا، بیس ہزار گوتھ تلواریں نیاموں میں ڈالے طارق کے لشکر کی طرف دوڑ پڑے، طارق کا لشکر بھی پریشان تھا کہ یہ کیسے حملہ آور ہیں؟ اچانک مسلمانوں کو طارق بن زیاد کی آواز

سنائی دی'' ان کا استقبال کرو یہ اب تمہارے ساتھی ہیں'' دراصل یہ گوتھ قوم کے دستے تھے جو راڈرک کے ظلم وستم کے ستائے ہوئے تھے اور مسلمانوں کو مسیحا خیال کرتے ہوئے ان کے ساتھ شامل ہو گئے، مسلمانوں کے ثابت قدم رہنے سے اللہ نے مدد بھیج دی تھی، یہ صرف بیس ہزار کی نفری نہیں تھی بلکہ جذبہ انتقام سے بھری ہوئی فوج تھی، مزید پانچ دن راڈرک نے جنگ جیتنے کی بہت کوشش کی لیکن اسکی ہر کوشش ناکام ہوئی، آٹھویں روز طارق بن زیاد نے راڈرک کی فوج کو مکمل شکست دے دی، راڈرک مارا گیا، پچاس ہزار کی نفری قتل ہوئی، اور تیس ہزار کو قیدی بنالیا گیا، مال غنیمت بھی کثیر تعداد میں ہاتھ آیا اور اندلس کا دروازہ اسلام کے لئے کھل گیا۔

اِس بڑے معرکے کے بعد جہاں عالم اِسلام خصوصاً افریقہ میں مسرّت کی لہر دوڑ گئی وہاں اسپین کے عوام نے یومِ نجات منایا، اس کے بعد اکتوبر 711ء میں اِسلامی اندلس کا نامور شہر قرطبہ (Cordoba) 'مغیث رومیؒ' کے ہاتھوں فتح ہوا اور دُوسرے شہر بھی یکے بعد دیگرے تیزی سے فتح ہوتے چلے گئے۔ بعد اَزاں جون 712ء میں 'موسیٰ بن نصیرؒ' نے خود 18,000 فوج لے کر اندلس کی طرف پیش قدمی کی اور 'اشبیلیہ' (Seville) اور 'ماردہ' (Merida) کو فتح کیا۔ دونوں اِسلامی لشکر 'طلیطلہ' (Tledo) کے مقام پر آن ملے جو پہلے ہی کسی مزاحمت کے بغیر فتح ہو چکا تھا۔

اِسلامی لشکر جن شہروں کو فتح کرتا وہاں کے مفلوک الحال مقامی باشندے خصوصاً یہودی مسلمانوں کا بھرپور ساتھ دیتے، عوامی پزیرائی کچھ اِس قدر بڑھی کہ مسلمان تھوڑے سے وقت میں پورا اسپین فتح کرنے میں کامیاب ہو گئے، طارق بن زیاد کی فتوحات میں سے آخری فتح 'خلیج بسکونیہ' (Bay of Biscay) پر واقع شہر 'خیخون' (Gijon) کی تھی، جس کے بعد فتوحات کا سلسلہ روک کر ملکی اِنتظام و اِنصرام کی طرف توجہ دی گئی۔ (دولۃُ الاسلام فی الاندلس، 1 : 51)

اِسی اثناء میں موسیٰ بن نصیر کو خلیفہ ولید بن عبدالملک کی طرف سے پیغام موصول ہوا کہ وہ اور طارق بن زیاد اس مہم کو یہیں چھوڑ کر دِمشق چلے آئیں۔ دو سال کی قلیل مدّت میں کم و بیش سارا اسپین فتح ہو چکا تھا، موسیٰ نے وہاں سے واپسی سے پہلے اُس کے اِنتظامِ حکومت کا اِہتمام کیا۔ قرطبہ (Cordoba) کو اندلس کا دارالحکومت قرار دیا، اپنے بیٹے 'عبدالعزیز' کو وہاں کا حاکم بنایا اور خلیفہ کے حکم کے مطابق دِمشق کی طرف عازمِ سفر ہوا۔

عصرِ وُلاۃ

'موسیٰ بن نصیر' اور 'طارق بن زیادؒ' کی واپسی کے بعد 714ء سے 756ء تک 43 سالوں میں ملک سیاسی حوالے سے عدمِ اِستحکام کا شکار رہا، اُس دوران میں کل 22 گورنر اندلس میں مقرر ہوئے، یہی وجہ ہے کہ علمی اور تہذیبی اِرتقاء کے ضمن میں اُس دور میں کوئی خاص پیش رفت نہ ہوسکی، اندلس کی تاریخ میں یہ دور کافی حد تک غیر واضح ہے، اُس دَور کو اِسلامی اسپین کی تاریخ میں عصرِ وُلاۃ (یعنی گورنروں کا دَور) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

دورِ بنو اُمیہ

40 ہجری سے 132 ہجری تک عالمِ اِسلام پر حکمرانی کے بعد جب اموی دورِ خلافت کا خاتمہ ہوا اور بنو عباس نے غلبہ پانے کے بعد شاہی خاندان کے اَفراد کو چن چن کر قتل کرنا شروع کیا تو اموی خاندان کے چند اَفراد بمشکل جان بچا سکے، اُنہی بچ نکلنے والوں میں سے 'ہشام بن عبدالملک' کا 20 سالہ نوجوان پوتا 'عبدالرحمن اول' بھی تھا جس کی ماں 'قیوطہ' افریقہ کے بربری قبیلہ 'نفرہ' سے تعلق رکھتی تھی، عبدالرحمن اول نے عباسیوں کے مظالم سے بچنے کے لیے افریقہ کا رُخ کیا جہاں اُس کے لیے پناہ کے مواقع ایشیا کی نسبت بہت زیادہ تھے۔ وہ افریقہ سے گزرتا ہوا 5 سال بعد اندلس کے ساحل تک جا پہنچا، جہاں اموی دور کی شاہی اَفواج موجود تھیں، کچھ ہی دنوں میں عبدالرحمن اول نے اُن میں اِتنا اثر پیدا کرلیا کہ

اُنہوں نے اُسے اپنا کمانڈر بنالیا، یہ فوج شمال کی سمت چلی اور چند ہی سالوں میں تمام اندلس اُس کے زیرِ قبضہ آگیا، مقامی اُمراء اور عوام نے اُس کی اِطاعت قبول کرلی اور پورا ملک آزاد اُموی ریاست کی صورت اِختیار کرگیا۔

تاریخ اُسے 'عبدالرحمن الداخل' کے نام سے یاد کرتی ہے، اُس نے اندلس پر 756ء سے 788ء تک کل 32 سال حکومت کی، اس دوران میں اُس نے مقامی اُمراء کی بغاوتوں کو فرو کرنے کے علاوہ فرانس کے بادشاہ 'شارلیمان' کا حملہ بھی بری طرح پسپا کیا، اُس کے بعد اُس کا بیٹا 'ہشام' تختِ سلطنت پر بیٹھا، اُس کے عہد میں مسلمانوں نے جنوبی فرانس کے بہت سے شہروں کو فتح کیا، یہ وہ دور تھا جب فقہ مالکی کو ریاست میں قانون کی بنیاد کے طور پر نافذ کیا گیا۔

۸۲۲ئہ میں 'عبدالرحمن ثانی' تخت نشین ہوا۔ اُس کے ۳۰ ر سالہ دورِ حکومت میں ملک اِنتظامی طور پر مضبوط ہوا، علوم وفنون کی ترقی کا آغاز ہوا، سائنسی علوم کی ترویج عام ہونے لگی، صنعت وحرفت نے بھی بہت زیادہ ترقی کی اور تجارت دُور دراز ممالک تک پھیل گئی۔ اندلس کی بحری طاقت بڑھ جانے سے تجارت کو خوب فروغ حاصل ہوا، یہ دَور تعمیرات اور دولت کی فراوانی کا دَور تھا، دُوسری طرف یہی وہ دَور ہے جس میں یورپ میں اِسلام کے خلاف باقاعدہ طور پر مسیحی تحریک کا آغاز ہوا، جس نے بعدازاں صدیوں تک سپین کے مسلمانوں کو جنگوں میں اُلجھائے رکھا اور بالآخر جزیرہ نما آئبیریا (Iberian Peninsula) سے نکال کر دَم لیا۔

اِسلامی اسپین کی تاریخ میں سب سے عظیم حکمران 'عبدالرحمٰن الناصر' تھا۔ اُس نے ۲۱ر برس کی عمر میں ۹۱۲ئہ میں اپنے دادا 'عبداللہ' کی وفات کے بعد سلطنت کا اِنتظام سنبھالا۔ یہ وہ دَور تھا جب اندلس میں مسلمان رُو بہ زوال تھے اور صلیبی تحریک خوب زور پکڑ چکی تھی۔ اُس نے ہر طرح کی داخلی بے امنی اور خارجی شورشوں کو کچل کر معاشرے کا امن بحال کیا اور ایک

نئے دَور کی بنیاد رکھی، یہ اندلس کا پہلا حکمران تھا جس نے 'الناصر لدین اللہ' کے لقب کے ساتھ اپنی خلافت کا اِعلان کیا۔ اپنے ۹۱۲ء سے ۹۶۱ء تک ۴۶ رسالہ دورِ حکومت میں اُس نے نہ صرف بہت سی مسیحی ریاستوں کو اپنا زیرِ نگیں کرلیا بلکہ ملک کو عظیم اِسلامی تہذیب وتمدّن کا گہوارہ بنادیا، اُس کے دَور میں علوم وفنون کو عروج ملا جس سے اندلس اپنے دَور کی ایک عظیم ویلفیئر سٹیٹ (welfare state) بن کر اُبھرا۔

'عبدالرحمٰن الناصر' کے بعد 'حکم ثانی'، 'ہشام' اور 'مظفر' تخت آرائے خلافت ہوئے مگر اُن کے بعد ۱۰۱۰ء میں سلطنت کا اِنتظام بکھرنا شروع ہوا اور پورا اندلس خانہ جنگی کی لپیٹ میں آگیا۔ ۱۰۱۰ء سے ۱۰۳۱ء تک ۲۱ رسالوں میں کل ۹ رخلفاء تختِ نشین ہوئے مگر کوئی بھی حالات کے دھارے کو قابو میں نہ لاسکا۔ ۱۰۳۱ء میں اِنتشار اِس حد تک بڑھا کہ اُس کے نتیجے میں اندلس سے اموی خلافت کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہوگیا، سلطنت بہت سے حصوں میں بٹ گئی اور ہر علاقے میں مقامی سرداروں اور ملوک نے حکومت شروع کردی، تاریخ اُن سرداروں کو 'ملوکُ الطوائف' کے نام سے یاد کرتی ہے۔

دَورِ مرابطون

شمالی افریقہ کے بربری خاندان اور تحریکِ مرابطین کے زیرِ اِنتظام قائم حکومت کے تیسرے حکمران 'یوسف بن تاشفین' کا دورِ حکومت (1091ء تا 1106ء) شمالی افریقہ کے بہترین اَدوار میں سے ایک ہے۔ اُس کے کارہائے گراں مایہ کے اِعتراف میں بغداد کی خلافت کی طرف سے اُسے 'امیر المؤمنین' کے خطاب سے بھی نوازا گیا تھا۔ جب اندلس میں طوائفُ الملوکی حد سے بڑھی اور مسیحی حکومتوں کی طرف سے مسلمان ریاستوں پر حملوں کا آغاز ہوا اور اِسلامی سپین کی سرحدیں سُکڑنا شروع ہوئیں تو ملوکُ الطوائف کو اپنے اِنجام سے خطرہ لاحق ہوا۔ ایسے میں اُنہیں ہمسایہ مسلمان ریاست کا فرمانروا 'یوسف بن تاشفین' اپنی اُمیدوں کے آخری سہارے کی صورت میں دِکھائی دیا۔ اندلس کے سفیروں نے 'یوسف بن تاشفین' کو

اندلسی مسلمانوں پر ہونے والے مسیحیوں کے مظالم کی لرزہ خیز داستان سنائی اور اُسے صلیبی حملوں کے خلاف اِمداد کے لیے بلایا، جس کے نتیجے میں وہ 1086ء میں 100 جہازوں کے بیڑے کے ساتھ 12 ہزار کی فوج لے کر افریقہ کی بندرگاہ 'سبتہ' سے اندلس روانہ ہوا۔ ملوکُ الطوائف بالخصوص معتمد اشبیلیہ (Seville) کے 8,000 اَفواج بھی اُس کے ساتھ آن ملیں۔ یوں 20,000 اَفواج کے ساتھ اُس نے 'سرقسطہ' (Zaragoza) کے مقام پر 'لیون' (Leon) کے حملہ آور باشادہ 'الفانسو ششم' کے 80,000 سپاہیوں کو تہِ تیغ کیا، جن میں سے بمشکل چند سو سپاہی جان بچا کر اپنے وطن واپس لوٹ سکے۔

جنگ زلاقہ کے نام سے معروف یہ لڑائی اِس اِعتبار سے سپین کی تاریخ میں اہم مقام رکھتی ہے کہ مسیحیوں کی طرف سے مسلمانوں کو جو زبردست خطرہ لاحق ہوگیا تھا وہ ایک طوِیل عرصے کے لیے ٹل گیا۔ اگر یوسف بن تاشفین مسیحیوں کا پیچھا کرتا تو اُن کی طاقت کو مستقل طور پر ناقابل تلافی نقصان سے دو چار کرسکتا تھا مگر اُس نے واپسی کا اِرادہ کیا اور اپنی 3,000 فوج اشبیلیہ (Seville) کی حفاظت کے لیے چھوڑ کر باقی لشکر کے ساتھ عازمِ افریقہ ہوا۔

'یوسف بن تاشفین' تو 'الفانسو' کو شکست سے دو چار کرنے کے بعد واپس افریقہ چلا گیا مگر اندلس کے ملوک اِس قدر بگڑے ہوئے تھے کہ اُن کا اِتحاد کسی صورت نہ رہ سکا اور ملک میں پھر سے اَمن وامان کا مسئلہ اُٹھ کھڑا ہوا، چنانچہ یوسف نے چند سال بعد اندلسی علما اور عوامُ النّاس کے بھرپور اِصرار پر 1091ء میں اندلس کو اپنی افریقی ریاست کے ساتھ مدغم کرلیا، یہیں سے مرابطین کے دور کا آغاز ہوا۔

اُس دَور میں اندلس کا امن اور خوشحالی ایک بار پھر عود کر آئی تاہم یہ کوئی زیادہ طویل دَور نہ تھا۔ مرابطون کا دورِ حکومت صرف 54 سال تک قائم رہنے کے بعد 1145ء میں ختم ہوگیا۔ صدیوں پر محیط اندلس کی تاریخ میں اِس مختصر دَور کو فلاحِ عامہ کے نکتہ نظر سے اِنتہائی اچھے الفاظ میں یاد کیا جاتا ہے۔

دورِ موحدین

مغربِ اَقصیٰ (موجودہ مراکش) سے 1120ء میں ایک نئی اِصلاحی تحریک نے جنم لیا، جس کا بانی 'محمد بن تومرت' تھا۔ مہدیت کے دعوے پر مشتمل اُس کی تبلیغ مَن گھڑت عقائد و نظریات کے باوُجود بڑی پُراثر تھی، جس کے نتیجے میں نہ صرف ہزاروں کی تعداد میں لوگ اُس کے مُرید ہونے لگے بلکہ جلد ہی وہ افریقہ کی ایک عظیم سیاسی قوت کی صورت میں اُبھرا، اُس کے مریدین مؤحّدون کہلاتے تھے۔ 'محمد بن تومرت' کے جانشین 'عبدالمومن علی' کے دَور میں اُس تحریک نے اپنی سیاسی قوت میں بے پناہ اِضافہ کیا، جس کے نتیجے میں 1145ء میں مرابطون کی حکومت کا خاتمہ ہوگیا۔

جن دِنوں مؤحّدون نے مرابطون کا خاتمہ کیا اسپین کے صلیبی حکمران 'الفانسو ہفتم' نے 'قرطبہ' (Cordoba) اور 'اشبیلیہ' (Seville) سمیت اندلس کے بہت سے شہروں پر قبضہ کرلیا۔ چنانچہ اندلس میں موحدین کے دَور کا آغاز ایک سُکڑی ہوئی ریاست کے طور پر ہوا۔ اس کے باوُجود عبدالمومن کے جانشینوں نے نہ صرف صلیبی حملوں کا پُرزور مقابلہ کیا بلکہ ریاست کی تمدّنی ترقی کی طرف بھی خصوصی توجہ دی۔ بہت سی مساجد، محلات، فوجی مدرسے، قلعے، پل اور سڑکیں اُسی دَور میں تعمیر ہوئیں، اُس دَور میں بندرگاہوں کی توسیع بھی عمل میں آئی اور جہاز رانی کے کارخانے قائم ہوئے، صنعت وحرفت کو خوب فروغ ملا اور تجارت نے بھی ترقی کی۔

1214ء میں مؤحّدون کے آخری فرمانروا 'ابو عبد اللہ محمد الناصرؒ' نے 'الفانسو نہم' کی زیرِقیادت حملہ آور قشتالہ، لیون، نبرہ اور ارغون کی مشترکہ اَفواج سے 'العقاب' کی جنگ میں شکست کھائی، یہ جنگ مسلمانوں کے حق میں فیصلہ کن ثابت ہوئی اور آئندہ کہیں بھی وہ مسیحیوں کے خلاف جم کر نہ لڑ سکے اور اُن کی عظمت وشکوہ کا سکہ پامال ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ جس کے نتیجے میں اندلس ایک بار پھر طوائفُ الملوکی میں گھِر گیا جو 1232ء تک جاری رہی۔

دورِ بنو نصر

مؤحّدون کے بعد ملک میں چھانے والی طوائف الملوکی کے دوران اندلس کی حدُود تیزی سے سمٹنے لگیں اور بہت سی مسلم ریاستیں یکے بعد دیگرے مسیحی مقبوضات میں شامل ہوتی چلی گئیں، حتیٰ کہ خاندانِ بنو نصر کے آغاز سے قبل اِسلامی سپین محض 700 میل کے لگ بھگ رقبے پر مشتمل رہ گیا، جس میں غرناطہ (Granada)، المریہ (Almeria)، مالقہ (Malaga)، قادِس (Cadiz)، بیضاء (Baza) اور جیان (Jaen) کے مشہور شہر شامل تھے۔

غرناطہ کا خاندانِ بنو نصر جس نے 1232ء سے 1492ء تک 260 سال حکومت کی، تاریخِ اندلس میں ایک خاص مقام رکھتا ہے، اُس خاندان نے اِتنے طوِیل عرصے تک اپنے محدُود ریاستی وسائل کے باوُجود یورپ بھر کی اِجتماعی یلغار کو روکے رکھا۔ 1423ء میں صحیح معنوں میں ریاست کے زوال کا آغاز ہوا جو بالآخر 2 جنوری 1492ء کے تاریخی دِن اپنے اِنجام کو جا پہنچا۔

مسیحی قابضین نے غرناطہ (Granada) کے مسلمان عوام کے ساتھ کیے گئے جان، مال، عزت و آبرو اور مذہبی آزادی کے وعدے کے برخلاف اُن پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑے اور اُنہیں تبدیلی مذہب یا جلاوطنی میں سے ایک پر مجبور کیا گیا۔ جس کے نتیجہ میں اسپین سے مکمل طور پر مسلمانوں کا خاتمہ ہو گیا۔

اسپین کی علمی تاریخ

اسپین کی سرزمین اِسلام کی علمی تاریخ میں بڑی زرخیز ثابت ہوئی ہے، اُس کا مقام مردم خیزی میں کسی طرح بھی بغداد (Baghdad) اور دمشق (Damascus) کی یونیورسٹیوں سے کم نہیں۔ اندلس کی کوکھ سے جن عظیم سائنسدانوں نے جنم لیا یہ اُنہی کا کسب

کمال تھا جس کی بدولت قرطبہ (Cordoba) جیسا عظیم شہر قرونِ وُسطیٰ میں رشکِ فلک بنا۔ اندلس کی تمدّنی زندگی کے پیچھے اُس کے جلیل القدر سائنسدانوں ہی کا ہاتھ تھا، قرونِ وُسطیٰ کی بہت سی نامور شخصیات اندلس ہی سے تعلق رکھتی تھیں، چنانچہ عظیم مفسرِ قرآن اِمام شمس الدین قرطبی رحمۃ اللہ علیہ، مشہورِ عالم سیاح ابن بطوطہ اور ابن جبیر، موجدِ سرجری و ماہرِ اَمراضِ چشم ابو القاسم الزہراوی، معروف فلسفی وطبیب ابن باجہ، خالق فلسفۂ وحدتُ الوُجود ابن عربی، عظیم فلسفی وطبیب ابن رشد، بطلی موسیٰ نظریہ کو اکب کا دلائل کے ساتھ ردّ کرنے والے عظیم اِسلامی ماہرین فلکیات ابو اسحاق الزرقالی اور ابو اسحاق البطروجی، تاریخ وعمرانیات کے اِمام ابن خلدون، نامور طبیب یونس الحرانی، معروف جغرافیہ نگار و ماہرِ فلکیات شریف الادریسی، ہوائی جہاز کا موجد عباس ابن فرناس، نامور طبیب ابن الہیثم، ماہرِ فلکیات و الجبراء نصیر الدین طوسی اور دِیگر بے شمار علمی و ادبی شخصیات کا تعلق اسپین ہی کی عظیم سرزمین سے تھا۔

اِن مسلمان سائنسدانوں نے علم کو صرف اِسلام ہی کی دولت سمجھتے ہوئے محدُود کرنے کی بجائے اپنے دروازے ہر مذہب کے ماننے والوں کے لیے کھلے رکھے اور علم کو بنی نوع انسان کا مشترکہ وِرثہ قرار دیا۔ چنانچہ سپین کی یونیورسٹیوں میں مسیحی اور یہودی طلبہ بھی بڑی تعداد میں تعلیم حاصل کرنے آتے تھے، حتیٰ کہ مسلمان سائنسدانوں کے یہودی و مسیحی شاگرد بعد میں نامور سائنس دان ہوئے اور اپنی قوم میں سائنسی تعلیم کی ترویج کا باعث بنے۔ یہیں سے سپین کا علمی سرمایہ مغربی اور وسطی یورپ منتقل ہونا شروع ہوا۔

اسپین کا علمی مقام

مسلمان جب یہاں پہنچے تو اس خطے سمیت پورا یورپ بدتمیزی اور بدتہذیبی کا مرکز بنا ہوا تھا۔ میلوں مشرق اور میلوں مغرب تک کوئی پڑھا لکھا شخص نہیں ملتا تھا بلکہ اپنی جہالت اور کم علمی پر لوگ ناز کیا کرتے تھے، حکمران طبقے کا حال بھی اس سے کچھ مختلف نہ تھا بادشاہ تک

تعلیم سے نابلد اور مرقع جہالت ہوا کرتے تھے ،خاندان کے خاندان اور قبیلے کے قبیلے سالہاسال گزرجانے کے باوجود کوئی پڑھالکھا شخص پیدا نہیں کر پاتے تھے۔صدیوں کے اس طویل دورانیے میں یورپ نے کوئی قابل ذکر فلسفی یا دانشور پیدا نہیں کیا اور نہ ہی کسی ایک دوکتابوں کا ہی پتہ ملتا ہے جوتاریخ کے اس دور میں یورپ میں تدوین کی گئی ہوں۔

اہل مذہب اس پر مستزاد تھے،کلیسا نے تعلیم وتعلم پر پابندی لگا رکھی تھی ،قدیم روم اور قدیم یونان کے عظیم الشان کتب خانے اورفلاسفہ کی تحریریں اور انکا علمی وتہذیبی وثقافتی سرمایہ تہہ خانوں میں بند ہو کر دفن ہو چکا تھا اور ہر تخت نشین ہونے والا بادشاہ اہل کلیسا کوخوش کرنے کے لیے ان تہہ خانوں کے دروازے پر اپنے نام کا سب سے بڑا تالالگا دیتا تھا،کلیسا نے غسل کرنے کو گناہ قرار دے رکھا تھا چنانچہ اس آسمان نے وہ وقت بھی دیکھا جب میل ،کچیل ،کیچڑ،گندگی اور بدبو سے بھرے ہوئے لوگ اپنے خدا کے بہت پیارے گردانے لگے اورناپاکی وغلاظت اورآلودگی اہل مذہب کی پہچان بن گئی۔

مسلمانوں کے تعلیمی نظام کی بدولت اندلس میں ایک زمانے میں شرح خواندگی سوفیصد تک پہنچ رہی تھی ،اندلس میں مسلمانوں نے ایسے ایسے تعلیمی ادارے بنائے جن کا شہرہ پوری دنیامیں پہنچا اوران تعلیمی اداروں سے فارغ التحصیل ہونے والوں کی گونج آج تک کے ترقی یافتہ دور کے بین الاقوامی اداروں میں بآسانی سنی جاسکتی ہے،جامعہ قرطبہ اس وقت دنیا کی سب سے اعلی یونیورسٹی تھی ،دنیائے عیسائیت کے دو پوپ جو اس مذہب کا سب سے بڑا پروہت ہوتا ہے،انہوں نے جامعہ قرطبہ سے تعلیم حاصل کی،اس جامعہ میں داخلے کے لیے کسی قوم،علاقے یامذہب کی قید نہ تھی دنیا بھر سے آنے والے تشنگان علم وفن یہاں فیض علم سے بہرہ ور ہوتے تھے،عبدالرحمن ثالث جو اندلس کا تاریخی بادشاہ گزرا ہے اس نے بغداد سے یہودی طبیب ہشدے بن شبروت کو بلوایا جس نے قرطبہ میں یہودیوں کا طبی تعلیمی ادارہ کھولا۔

اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد اندلس کے بادشاہوں کے درباروں سے بھاری بھاری وظائف پاتے تھے، بادشاہان وقت ہر اہم مسئلے میں اہل علم و دانش کو شریک مشورہ کرتے، ابن عربی، عبدالرحمن ابن خلدون اور ابن حزم رحمہم اللہ جیسے نابغہ روزگار اندلس کے ہی سپوت تھے، اندلس کی لائبریریوں کے تذکرے آج تک کی علمی دنیاؤں میں زندہ ہیں، بڑے بڑے رؤسا اپنے گھروں کے اندر ایک ہی رنگ کے کتب خانے بناتے تھے جیسے کسی نواب نے نیلے رنگ کا کتب خانہ بنایا تو کتابوں کی جلدیں، عمارت کا رنگ، فرنیچر کی پالش، قالین، گدے اور تکیے تک سب کچھ نیلے رنگ کا ہوتا اور ہر ہر کتب خانے میں سینکڑوں نہیں ہزارہا کتب ہوتی تھیں جبکہ شاہی کتب خانوں میں کتب کی تعداد لاکھوں تک ہوتی تھی۔

کتب خانوں کے اندر ایک کمرہ موسیقی کے لیے مخصوص ہوتا تاکہ تھکاوٹ دور کی جاسکے، کتب خانوں میں مطالعہ کرنے والے دور دراز سے آتے اور کئی کئی دن قیام کرتے اس دوران انکے قیام وطعام اور کاغذ، قلم اور چراغ وغیرہ سب کچھ میزبان کی طرف سے دیا جاتا، نواب آپس میں جب ملتے تو کتب کی کثرت اور مہمانوں کی آمد پر باہم فخر کرتے تھے۔ بادشاہ اس حد تک علم دوست تھے کہ جس کسی کو بادشاہ سے کوئی کام ہوتا تو وہ سفارش یا مہنگے تحفے پیش کرنے کی بجائے کوئی نادر کتاب پیش کر دیتا اور یہ عمل بادشاہ کو خوش کر دیتا اور اس سائل کا کام آسانی سے ہو جاتا۔

کتابوں کی نقل تیار کرنے والے "نساخ" کہلاتے تھے، ہر ہر نساخ نے سو سو شاگرد بٹھا رکھے ہوتے اگر کوئی طالب علم ہزار صفحوں کی کتاب لے کر جاتا اور کہتا کہ مجھے آج شام کے بحری جہاز سے قاہرہ روانہ ہونا ہے اور اس کتاب کی نقل تیار کر دیجئے تو نساخ اسے کہتا نماز پڑھ کر لے جایئے گا۔ اس دوران وہ نساخ کتاب کی جلد کھول کر اسکے اجزا اپنے شاگردوں کو دے دیتا، یہ نوجوان برق رفتاری سے کتاب کی نقل تیار کرتے آج اتنی رفتار سے لوگ پڑھ نہیں سکتے جتنی تیزی سے وہ لکھ لیا کرتے تھے، تآنکہ نماز سے واپسی پر دونوں

کتابیں اصل اور نقل نئی جلد میں تیار ہوتیں، قرطبہ کے جنوبی محلے میں ایک سو ستر کے لگ بھگ خواتین خط کوفی میں قرآن لکھا کرتی تھیں، ان خواتین کا خط نہایت عمدہ ہوتا تھا اور مردوں کی نسبت سستے ہدیے پر قرآن کا نسخہ فراہم کر دیتی تھیں۔

اندلس میں مسلمانوں کے زوال کے بعد تین سو سال تک جرمنی، اٹلی اور فرانس کے شاہی درباروں میں مسلمانوں کی تدوین کردہ کتب کے یورپی زبانوں میں ترجمے ہوتے رہے، اس مقصد کے لیے وہاں کے بادشاہوں نے بھاری تنخواہوں پر عربی زبان کے ماہرین تعینات کر رکھے تھے جنہوں نے سینکڑوں یا ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں کتب کا عربی سے یورپی زبانوں میں ترجمہ کیا۔ ان تراجم کے بعد یورپ اس قابل ہوسکا کہ وہ سائنس کے میدان کوئی کارہائے نمایاں سرانجام دے سکے۔ مورخین نے ایسے شواہد بھی پیش کیے ہیں جن سے متعصب یورپیوں کی بد دیانتی ثابت ہوتی ہے کیونکہ مسلمانوں کی کتب کی کتب کو یورپیوں نے ترجمہ کر کے تو انکو اپنے نام سے منسوب کرلیا اور اندلسی مسلمانوں کی کئی ایجادات تک کو انہوں نے اپنی تحقیق کا نتیجہ قرار دے دیا۔ اتنے بڑے پیمانے پر تراجم اور سرقہ کے باوجود آج تک مذکورہ ملکوں کے عجائب گھروں کے تہہ خانے مسلمانوں کی لکھی گئی ان کتب سے بھرے پڑے ہیں جن پر کوئی کام نہیں ہوا۔

اِسلامی اسپین کا علمی وفنی اِرتقاء

اسلامی اسپین کے آٹھ سو سالہ دَور میں مذہبی علوم کے ساتھ ساتھ سائنسی علوم بھی اِرتقاء کے عمل سے گزرے، اسپین میں سائنسی علوم کی وسیع پیمانے پر ترویج کا باقاعدہ آغاز عبدالرحمن النّاصرؒ کے دَور (912ء تا 961ء) میں ہوا، جو اسپین کی اُموی خلافت کا پہلا باضابطہ خلیفہ تھا، اِسلامی سپین کے اِبتدائی 200 سالہ دَور میں مختلف حکمرانوں نے اپنے اپنے زمانے میں علمی وفکری مجالس کے اِنعقاد اور دُنیا کے تمام علوم وفنون پر کتابیں جمع کرنے کے کام کا آغاز کر دیا تھا مگر اُس کام کی رفتار کوئی خاص نہ تھی، اُس دو سو سالہ دَور کی علمی سرگرمیوں کے

مشاہدے کے بعد ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ اندلس میں علمی و فکری اِرتقاء مشرق کے اِسلامی مما لک کی نسبت تاخیر سے شروع ہوا، اس تاخیر کا بڑا سبب سلطنت کا سیاسی عدم اِستحکام تھا۔ ’عبدالرحمٰن الناصر‘ کا دَور جہاں تمدّنی حوالے سے قابل رشک ہے وہاں سیاسی اِستحکام کی بدولت علوم وفنون کی ترویج میں بھی سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے، یہی وہ دَور تھا جب اندلس کے مسلمانوں کو صحیح معنوں میں آزادیٔ اَفکار نصیب ہوئی اور اُنہوں نے علومِ عقلیہ پر کھل کر تجربی تحقیقات شروع کیں، اُسی دور میں اندلسی سائنسدانوں نے سائنسی طریق کار کو فروغ دیا اور علم ہیئت (astronomy)، علم ریاضی (mathematics)، علم طب (medical science)، علم نجوم (astrology)، علم کیمیا (chemistry)، علم نباتات (botany)، علم جغرافیہ (geography) اور بے شمار صنعتی علوم وفنون اندلس کی روزمرّہ زندگی کا حصہ بنتے چلے گئے۔

تعلیم اِس قدر عام ہوئی کہ شرحِ خواندگی سو فیصد تک جا پہنچی، یہ اُس دور کی بات ہے کہ جب براعظم یورپ کے تمام صلیبی مما لک جہالت کے اٹاٹوپ اندھیروں میں گم تھے، اگر کوئی لکھنا پڑھنا جانتا بھی تھا تو وہ چند پادری لوگ تھے جو فقط اپنے مذہبی علوم سے آشنا ہوتے، سائنسی و عقلی علوم کا تصوّر بھی اُس دَور کے یورپ میں مفقود تھا بلکہ کلیسا کی طرف سے عقلی علوم پر کفر کا فتویٰ صادِر کیا گیا تھا، دُوسری طرف اِسلامی تعلیمات کے طفیل اندلس کے علمی عروج کا یہ عالم تھا کہ ’عبدالرحمٰن الناصر‘ کے جانشین ’حکم ثانی‘ کے دورِ خلافت (961ء تا 976ء) میں قرطبہ ایک عالمی علمی مارکیٹ کی حیثیت سے دُنیا بھر میں شہرت اِختیار کر گیا تھا۔ وہاں کتب فروشوں کی دُکانیں 20 ہزار تک جا پہنچی تھیں کتب فروش نہ صرف کتابیں فروخت کرتے تھے بلکہ خاص اِہتمام کے ساتھ وسیع پیمانے پر ماہر خطاطوں سے کتابت کے ذریعے اُن کی نقول بھی تیار کرواتے تھے۔

قرطبہ (Cordoba)، غرناطہ (Granada)، مالقہ (Malaga)، سرقسطہ

(Zaragoza)، اشبیلیہ (Seville) اور جیان (Jaen) میں اعلیٰ تعلیم کے لیے یونیورسٹیاں موجود تھیں، صرف قرطبہ شہر میں حکم ثانی نے بالکل مفت تعلیم کے لیے 27 اسکول قائم کر رکھے تھے، پرائیویٹ(Private) تعلیمی اِدارے اُن کے علاوہ تھے، نہ صرف تمام اَساتذہ بلکہ مستحق طلبہ کو بھی حکومت کی طرف سے وظائف ملتے اور دورانِ تعلیم اُن کی کفالت کی مکمل ذِمہ داری حکومت پر تھی۔ اندلس تعلیمی میدان میں دورِ حاضر کی جدید تہذیب کی کسی بھی فلاحی ریاست کے مقابلے میں کسی طور پر کم نہ تھا، لوگ علم کو برائے علم حاصل کرتے تھے نہ کہ برائے معاش۔

اندلس کے دُوسرے اُموی خلیفہ حکم ثانی (961ء تا 976ء) کی لائبریری اپنے دَور میں دُنیا کی سب سے بڑی لائبریری تھی، جہاں قرآن، حدیث، فقہ اور دیگر مذہبی علوم کے علاوہ ہیئت (astronomy)، ریاضی (mathematics)، طب (medical sciences)، نجوم (astrology)، کیمیا (chemistry)، طبیعیات (physics) فلسفہ (philosophy)، منطق (logic)، تاریخ (history) اور جغرافیہ (geography) سمیت تمام علوم عقلیہ پر مشتمل 4 لاکھ سے زیادہ (ایک رِوایت کے مطابق 6 لاکھ) کتب موجود تھیں، اُس لائبریری کی کیٹلاگ (Catalogue) 44 بڑی جلدوں پر مشتمل تھی، خلیفہ چونکہ خود بہت بڑا عالم تھا اور سائنس سے گہری دِلچسپی رکھتا تھا اِس لیے اُس نے اُن میں سے بیشتر کتب کا نہ صرف مطالعہ کیا تھا بلکہ اُن پر جا بجا حواشی بھی چڑھا رکھے تھے۔

بنو اُمیہ کے بعد اندلس پر چھانے والی 'طوائف الملوکی' اور بعد ازاں 'مرابطون' کے دَور میں علمی اِرتقاء کا کام کسی حد تک زیرِ زمین چلا گیا مگر جونہی مؤحّدون کا دَور شروع ہوا پہلے کی سی تیزی پھر سے لوٹ آئی اور علمی و فکری میدانوں میں اِرتقاء کی رفتار روز اَفزوں ہوگئی۔ ملک بھر میں جا بجا سینکڑوں تعلیمی اِدارے قائم ہوئے۔ عہدِ مؤحّدون میں صرف قرطبہ

(Cordoba) میں ثانوی واعلیٰ تعلیم کے 800 سے زائد تعلیمی اِدارے قائم تھے، جہاں 10,000 سے زیادہ طلبہ مذہبی وسائنسی ہر دو قبیل کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔

سقوطِ قرطبہ کے بعد جب 'بنو نصر' غرناطہ (Granada) کی ریاست کے حکمران ہوئے تو اُن کے دَور میں بھی علم وفن نے خوب ترقی کی۔ اُنہوں نے غرناطہ میں اعلیٰ تعلیم کے لیے ایک عظیم یونیورسٹی قائم کی جس میں مذہبی علوم کے ساتھ ساتھ تاریخ وادب کے علاوہ سائنسی علوم کی تدریس کا بھی خاطر خواہ اِنتظام کیا گیا تھا۔ مرکزی یونیورسٹی کے علاوہ شہر میں سینکڑوں اسکول اور کالج (College) بھی تھے جو اِبتدائی اور ثانوی تعلیم کی ترویج میں مصروف تھے۔ شہر میں 70 بڑی لائبریریاں (Library) تھیں، سیاسی عدمِ اِستحکام اور صلیبی شورشوں کے باوُجود غرناطہ اُن دِنوں سپین کا سب سے بڑا علمی شہر بن کر اُبھرا تھا۔

اِسلامی اسپین کے چند اہم علوم

عبدالرحمٰن الناصر کا دَور کاملاً آزادئ اَفکار کا دَور تھا، جس کے نتیجے میں فقہائے مالکیہ کی گرفت خاصی کمزور پڑ گئی اور لوگ آزادانہ طور پر سائنس وفلسفہ کی تعلیم حاصل کرنے لگے۔ سائنس کی بہت سی شاخوں میں باقاعدہ تصنیف وتالیف کا سلسلہ شروع ہوا۔ 'عبدالرحمٰن الناصر' اور اُس کے جانشین 'حکم ثانی' نے یونانی علوم کی وہ کتابیں جنہیں پہلے سے بغداد میں عربی میں ترجمہ کرلیا گیا تھا وہ اندلس منگوائیں اور اُنہیں سائنسی علوم کی بنیاد قرار دے کر مزید تحقیقات کے دروازے کھول دیئے گئے۔

یونانی علما کا اندازِ فکر فلسفیانہ مُوشگافیوں میں بند تھا، مسلمانوں نے اپنی تحقیقات میں تجربہ کو کسوٹی قرار دیا اور علم کے باب میں ایک نئے فکر 'سائنسی طریق کار' کو فروغ دیا۔ سائنسی طریق کار کا حقیقی بانی بغداد کا مسلمان سائنس دان 'ابو البرات البغدادی' (1065ء تا 1155ء) ہے جس نے اسلام کی آفاقی تعلیمات کی سائنسی شواہد کے ساتھ مطابقت پر گہرے غور وخوض کے بعد اسلام قبول کیا تھا۔ مسلمانوں نے اِس فکر کو فروغ دیا کہ تجربہ ہی وہ کسوٹی

ہے جو سائنسی علوم میں حقیقت تک رسائی کا واحد ذریعہ ہے۔

بغداد سے نشر ہونے والے اِس نئے فکر کو جو اِسلام ہی کی دی گئی تعلیمات پر مشتمل تھا جلد ہی تمام مسلمانانِ عالم نے دِل و جان سے قبول کرلیا، چنانچہ اسپین میں بھی تجربہ علومِ سائنس کے حصول کے لیے حتمی کسوٹی قرار پایا۔

یوں تو اسپین میں بہت سے سائنسی علوم وفنون پر کام ہوا جن میں سے بیشتر کا ذِکر ’’قرونِ وُسطیٰ میں سائنسی علوم کے فروغ‘‘ کے تحت گزر چکا ہے، تاہم علم الطب (medical sciences)، علم الھیئت (astronomy) اور علمِ نباتات (botany) دیگر علوم کی نسبت زیادہ نمایاں مقام رکھتے ہیں۔

علم الطب (Medical Sciences)

اَوائل دَورِ اِسلام میں دُوسرے بہت سے عقلی علوم کے ساتھ ساتھ علم الطب (Medical sciences) کی کتب کو بھی عربی میں ترجمہ کیا گیا۔ اُس دَور میں طبی تحقیقات کا سارا دار و مدار مسیحیوں بالخصوص یونانیوں کی مترجمہ (translated) کتب پر تھا، بغداد کی طرح اسپین میں بھی پہلے پہل یونانی کتبِ طب متعارف ہوئیں، جن پر مسلمان اَطباء نے اپنی تحقیقات کی بنیاد رکھی۔

اسپین میں اِسلامی طب ایشیا سے ہجرت کرکے آنے والے اَطباء کے ذریعہ متعارَف ہوئی جو اپنے ساتھ طبی کتب کا ذخیرہ بھی لائے تھے، علاوہ ازیں بغداد کی تحقیقات سے مستفید ہونے کے لیے اسپین کے نوجوان حصولِ علم کے لیے افریقہ کی ہزارہا کلومیٹر طویل مسافت طے کرکے بغداد پہنچتے اور وہاں برس ہا برس کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد طب میں مشّاق ہونے کے بعد وطن واپس لوٹتے۔ یونس الحرانی، اسحاق بن عمران، اسحاق بن سلیمان اور ابن الجزار اُس دَور میں اسپین میں طبی علوم کے اِفشاء کا باعث ہوئے، یہ وہ لوگ تھے جو مشرقی ممالک سے ترکِ سکونت کرکے اسپین میں آئے تھے

اسپین میں اِسلامی طب کی معروف شاخوں تشخیصِ امراض، امراض نسواں، امراضِ اطفال، امراض چشم اور سرجری پر خصوصی کام ہوا۔ بہت سے ماہر اَطباء نبض دیکھ کر مریض کی جملہ کیفیت بیان کر دیتے تھے۔ ابو العلا زہر صرف نبض اور قارورہ دیکھ کر مرض کی کامل تشخیص کر لیتا تھا، جبکہ ابن الاصم تشخیصِ اَمراض میں اِس قدر ماہر تھا کہ محض نبض دیکھ کر معلوم کر لیتا تھا کہ مریض کیا کھا کر آیا ہے۔

سرجری میں ابو القاسم الزہراوی کا مقام تمام اندلسی اَطباء میں بڑھ کر تھا، بلکہ اگر اُسے جدید علم جراحت (surgery) کا بانی قرار دیا جائے تو غلط نہ ہوگا، وہ ایسا ماہر سرجن تھا کہ ایک بار اُس نے ایک ایسے آدمی کا کامیاب آپریشن کیا جس کا پیٹ چاک ہوئے 24 گھنٹے سے زیادہ وقت گزر چکا تھا، زہراوی نے کمال مہارت سے اُس کے پیٹ سے باہر نکل آنے والی انتڑیوں کو اصل مقام پر رکھا اور اپنے ہی اِیجاد کردہ آلاتِ سرجری کی مدد سے اُس کا پیٹ سی دیا۔ نہ صرف اُس شخص کی زندگی بچ گئی بلکہ چند ہی روز میں وہ بیٹھنے کے قابل بھی ہو گیا۔

ابو القاسم الزہراوی قرونِ وُسطیٰ کا سب سے بڑا سرجن تھا۔ بغداد میں ابو بکر الرازی کے بعد دُنیائے اِسلام میں وہ سب سے بڑے مطب (clinic) کا مالک تھا۔ اُس نے آپریشن کے لیے خاص مہارت کے ساتھ خود ایسے بہترین آلات تیار کر رکھے تھے، جن کی مدد سے وہ ایسے پیچیدہ آپریشن (Operation) کرنے میں کامیاب ہو جاتا تھا جن میں 100 فیصد کامیابی کی توقع دورِ حاضر کے ماہر سرجن بھی نہیں کر پاتے۔ وہ آنتوں کے آپریشن کے لیے بلی کی آنتوں سے تیار کردہ دھاگہ اِستعمال کرتا۔ زخم کی سلائی یوں کرتا کہ باہر کی سمت اُس کا نشان مکمل طور پر غائب ہو جاتا۔ وہ آپریشن سے قبل بڑی شریانوں کو باندھ دیتا اور نچلے حصۂ بدن کے آپریشن کے دَوران میں پاؤں کو سر سے اُونچا رکھنے کی تاکید کرتا۔ یہ دونوں طریقے بالترتیب فرانس کے ایک سرجن (Pare) اور جرمنی کے سرجن

(Frederich) کی طرف غلط منسوب کیے جاتے ہیں۔ وہ تکلیف دِہ سرجری کی صورت میں مریض کو بے ہوشی کی دوا (anaesthesia) دینے سے بھی بخوبی آگاہ تھا۔ علاوہ ازیں وہ آنکھوں کے آپریشن کا بھی ماہر تھا۔

لوزتین (tonsils) کے آپریشن کا طریقہ اُسی کا اِیجاد کردہ ہے۔ پیٹ، جگر، پیشاب کی نالی، ناک، کان، گلے اور آنکھ کے آپریشن میں وہ ماہر تھا۔ مثانہ سے پتھری توڑ کر نکالنے کا طریقہ بھی اُسی کا اِیجاد کردہ ہے۔

زہراوی نے علم الطب پر ایک ضخیم کتاب ''التصریف لمن عجز عن التالیف'' بھی لکھی۔ اِس کتاب میں اُس نے علم العلاج اور علم الدواء کے ساتھ ساتھ جراحت (surgery) پر بھی خاص روشنی ڈالی ہے۔ زہراوی نے اپنے اِیجاد کردہ آلاتِ سرجری کے اِستعمال کا طریق کار اپنی اس کتاب میں تفصیل کے ساتھ قلمبند کیا ہے، جن میں اکثر اُس نے تصویروں کی مدد سے اُن آلات کی وضاحت اور اُن کا طریق استعمال بیان کیا ہے۔ اُس کے اِیجاد کردہ بعض آلاتِ جراحی اِس قدر ترقی یافتہ تھے کہ اُن کا اِستعمال آج تک جاری ہے۔

ابو القاسم الزہراوی کے علاوہ ابن زہر بن مروان کا شمار بھی اِسلامی اسپین کے ماہر سرجنوں میں ہوتا ہے۔

آنکھوں کے اَمراض میں احمد الحرانی اور عمر الحرانی اندلس کے ماہر اَطباء میں سے تھے۔ یہ دونوں معروف اندلسی طبیب یونس الحرانی کے بیٹے تھے جو حصولِ علم کے لیے بغداد میں ۱۰ سال رہ چکے تھے۔ اندلس واپس آ کر اُنہوں نے آنکھوں کے اَمراض کو اپنی تحقیقات کا موضوع بنایا اور اِس فیلڈ میں خاصے مشّاق (expert) ہو گئے۔ ابو القاسم الزہراوی نے بھی آنکھوں کے آپریشن کے سلسلے میں اُن کی تحقیقات سے اِستفادہ کیا۔ علاوہ ازیں ابن رشد اور ابوبکر محمد بن عبد الملک بن زہر بھی آنکھوں کے اَمراض کے ماہر (ophthalmologist) تھے۔

عورتوں کے اَمراض بالخصوص ایامِ حمل اور جنین کی پرورش کے بارے میں اندلس میں عریب بن سعد الکاتب کا کوئی ہمسر نہ تھا۔ بچوں اور خواتین کے اَمراض کا ماہر معالج ہونے کے ناطے اُس نے اِس موضوع پر ”خلق الجنین و تدبیر الحبالیٰ و المولود“ کے نام سے ایک کتاب بھی لکھی، جس میں اُس نے جنین کی نشو ونما، حاملہ عورتوں کی بیماریوں، اُن کے بارے میں حفظ ما تقدم اور علاج کے بارے میں تفصیلی بحث کی ہے، اِس کتاب کا ایک قلمی نسخہ ”اسکوریال“ (Monasterio y Sitio de El Escorial en Madrid) اسپین میں محفوظ ہے، ابو القاسم الزہراوی نے بھی ایک ماہر سرجن ہوتے ہوئے اپنی کتاب ”التصریف لمن عجز عن التالیف“ میں خواتین کے امراضِ مخصوصہ اور اُن کے علاج کے ساتھ ساتھ جنین کی مختلف حالتوں، وضعِ حمل اور غیر طبعی وِلادت کی صورت میں آپریشن (Operation) کے حوالے سے تفصیلی معلومات فراہم کی ہیں۔

اندلس کے اَطباء کی فہرست اِس قدر طویل ہے کہ اُن کے کارناموں کا اِحاطہ کرنے کے لیے الگ کتاب درکار ہوگی۔

علم الہیئت (Astronomy)

عبدالرحمٰن الناصر کے دَور (912ء تا 961ء) سے قبل سپین میں علم ہیئت کے مطالعہ وتحقیقات پر بہت کم توجہ دی گئی، اُس سے پہلے فقط اِسی قدر مطالعۂ اَفلاک کو مشروع اور رَوا رکھا جاتا تھا جس سے امورِ شرعیہ میں مدد ملتی ہو، نمازوں کے اَوقاتِ اِبتداء و اِختتام اور روزے میں سحری و اِفطاری کے اَوقات پر ہونے والی تحقیقات سے علم المیقات (time keeping) کی بنیاد پڑی، سمتِ قبلہ کے تعین میں ستاروں کی پوزیشن (Position) کا فائدہ اُٹھانے کے لیے علم الہیئت کا سہارا ضروری تھا، علاوہ ازیں اِبتدائے رمضان اور عیدین کے ہلال کی رؤیت کے لیے بھی مطالعۂ اَفلاک ناگزیر تھا۔ چنانچہ اِن اُمورِ شرعیہ کی بہتر بجا آوری کے لیے ضروری حد تک علم الہیئت (astronomy) حاصل کیا جاتا تھا۔

عبدالرحمٰن الناصر کے عہد تک یہ حالت برقرار رہی اور فقہائے مالکیہ کے اَثر و رُسوخ کے باعث فلسفے کی طرح علم ہیئت (astronomy) اور علم نجوم (astrology) کو بھی ناجائز تصوّر کیا جاتا رہا، اُس دور کے اکثر سائنس دان اپنی علمی قابلیت وصلاحیت کو صیغۂ راز میں رکھتے اور کسی صورت ظاہر نہ ہونے دیتے، کیونکہ اگر لوگوں کو یہ پتہ چل جاتا کہ فلاں شخص علومِ عقلیہ یعنی فلسفہ و منطق یا ہیئت و نجوم کا ماہر ہے تو اُسے زِندیق مشہور کر دیا جاتا اور لوگ اُس سے ملنا جلنا ترک کر دیتے۔

عبدالرحمٰن الناصر نے اپنے دورِ خلافت میں باضابطہ طور پر علومِ عقلیہ کی سرپرستی شروع کر دی، جس کے نتیجے میں سرزمین اندلس ایک خوشگوار اِنقلاب سے فیضیاب ہوئی، متلاشیانِ علم علم الطب (medical sciences) کی طرح علم الہیئت (astro nomy) کے حصول کے لیے بھی بلادِ مشرق بالخصوص بغداد و دمشق کا رُخ کرنے لگے۔

اندلس کا سب سے پہلا ماہرِ فلکیات جو ملک میں سائنسی علوم وفنون کے اِفشاء و اِشاعت کا باعث بنا وہ 'یحییٰ بن یحییٰ ابن السمینہ' تھا۔ اُس نے حصولِ علم کے لیے مشرقی اِسلامی ممالک کا سفر کیا اور حساب (mathematics)، نجوم (astrology)، ہیئت (astronomy) اور طب (medical science) کے علوم حاصل کیے۔ اُس کے علاوہ اُس دَور میں علم فلکیات و نجوم میں 'مسلمہ بن قاسم' اور 'ابوبکر بن ابی عیسیٰ' کے نام بھی قابلِ ذِکر ہیں۔

اِسلامی اسپین کے ماہرین ہیئت نے مشرقی علوم کو اپنے ملک میں محض متعارف ہی نہ کرایا بلکہ مشرقی تحقیقات کو تجربے کی کسوٹی پر پرکھ کر اُن میں بہت کچھ اِضافہ جات بھی کیے، اندلسی سائنسدانوں نے بہت سے آلاتِ رصد اِیجاد کیے جن کی بدولت آج کی جدید ہیئت کو مضبوط بنیادیں فراہم ہوسکیں، اندلس کی سب سے بڑی رصدگاہ اشبیلیہ (Seville) میں تھی، جہاں مشہورِ عالم مسلمان سائنسدانوں نے اپنی سماوِی تحقیقات کی بنیاد رکھی۔ ابواسحاق ابراہیم

الزرقالی (Arzachel) نے صدیوں سے مسلّمہ 'بطلیموسی نظریۂ اَفلاک' ردّ کرتے ہوئے زمین کے بجائے سورج کو نظامِ شمسی کا مرکز قرار دیا اور یہ ثابت کیا کہ تمام سیارے بیضوِی مداروں (elliptic orbits) میں سورج کے گرد محوِ گردش ہیں، تمام سیاروں کی بیضوِی مداروں میں سورج کے گرد گردِش ایک ایسی عظیم حقیقت ہے جسے نکولس کوپرنیکس (Nicolaus Copernicus) جیسا عالی دِماغ جس پر پورے عالمِ مغرب کو فخر ہے 1514ء میں نظامِ شمسی سے متعلق دیے جانے والے اپنے نظریے میں بھی پیش نہ کرسکا۔ ابو اسحاق الزرقالی ہی وہ عظیم سائنس دان ہے جس نے اندلس میں سب سے معیاری اسطرلاب بنایا اور اُس کا نام ''الصحیفہ'' رکھا۔ اُس کے بنائے ہوئے اُسطرلاب کے ذریعے اجرامِ سماوی کا مُشاہدہ اِس قدر دُرست ہوتا تھا کہ بغداد کے رہنے والے اِس فن کے بانی مسلمان سائنس دان بھی اُس کی عمدگی پر حیران تھے۔ ہوائی جہاز کے موجد 'عباس ابن فرناس' نے اپنے گھر میں ایک فلکیاتی کمرہ (planet arium) بنا رکھا تھا جس میں اُس نے سیارگانِ فلکی کی گردِش، بادلوں کی حرکات اور آسمانی بجلی کی مصنوعی گرج چمک کا اِنتظام بھی کر رکھا تھا۔

'ابو بکر بن ابی عیسیٰ' کا نامور شاگرد 'مسلمہ المجریطی' بڑا ماہر سائنس دان تھا، اُس نے سورج، چاند اور دِیگر سیاروں کی حرکات کو عددی اُصول پر منظم کرتے ہوئے 'الخوارزمی' سے بھی بہتر 'زیج' (astronomical table) ترتیب دی اور اُسے عربی تاریخوں میں ظاہر کیا۔ اُس کے علاوہ بھی اندلس کے بہت سے سائنسدانوں نے ازیاج (astronomical tables) بنائے، جن کی رُو سے مشاہدۂ اَفلاک میں خاصی مدد ملتی تھی۔

ابو اسحاق الزرقالی کے علاوہ اِسلامی اسپین کے دُوسرے بہت سے ماہرینِ فلکیات بھی اپنے دَور کا مسلّمہ نظریۂ بطلیموس ردّ کر چکے تھے، ابو اسحاق بطروجی نے بطلیموسی نظریۂ کواکب کو دلائل کے ساتھ ردّ کیا اور حرکتِ زمین کا نظریہ پیش کیا، اُس سے قبل ابن باجہ نے بھی اپنے طور پر اِس نظریہ کا بطلان کر دیا تھا، 'بطروجی' کا شمار جدید علمِ ہیئت کے بانیوں میں کیا

جاتا ہے۔ جابر بن افلح، کا ذکر بھی اُنہی سائنسدانوں میں ہوتا ہے، اُس نے بطلیموس کے نظریہ کے ردّ میں ''کتابُ الھیئۃ فی اصلاح المجسطی'' لکھی۔

علمُ النباتات (Botany)

اندلس میں علمِ نباتات کا مطالعہ مسلمانوں نے اپنے اَوائل دَور ہی میں شروع کر دیا تھا۔ طبی بنیادوں پر نباتات پر تحقیق علم الطب کے فروغ کے لیے ایک جزوِ لاینفکّ تھی، چنانچہ عبدالرحمن اول نے قرطبہ میں ''حدیقہ نباتاتِ طبیہ'' کے نام سے ایک ایگریکلچرل ریسرچ فارم بنایا، جہاں اَطباء اور نباتیوں (botanists) کو پودوں کے خواص، اُن کی اَفزائش اور اَثرات پر تحقیق کے گوناگوں مواقع میسر تھے۔ عبدالرحمن اول نے علمِ نباتات (botany) کی سرپرستی میں خاص دِلچسپی لی اور اندلس میں میسر نہ آنے والے پودوں اور درختوں کے بیج اور قلمیں دُور دراز ممالک سے درآمد کروائیں، چنانچہ اُس نے نہ صرف براعظم افریقہ بلکہ بیشتر ایشیائی ممالک کی طرف بھی سرکاری وفود بھیجے جو نایاب پودوں، درختوں اور جڑی بوٹیوں کی تلاش اور پیداوار میں مددگار ثابت ہوئے۔

طبی جڑی بوٹیوں کی اَفزائش میں وادی آش (Guadix)، المریہ (Almeria) اور غرناطہ (Granada) کے قریب جبل شلیر (Mulhacen) اندلس بھر سے بڑھ کر تھے۔ خوشبودار بوٹیاں بھی بکثرت پیدا ہوتی تھیں۔ زعفران کو مسلمان ماہرین نباتات (botanists) ہی نے اندلس میں متعارف کرایا۔ طلیطلہ (Toledo)، بلنسیہ (Velencia)، بیاسہ (Beyasa) اور وادیٔ حجارہ (Hijara Valley) زعفران کی پیداوار میں مشہور تھے۔ ماہرین نباتات کی شبانہ روز محنت سے اندلس میں زعفران اِس کثرت سے پیدا ہونے لگ گیا تھا کہ آس پاس کے ممالک کو برآمد کیا جاتا تھا، اِسی طرح بنفشہ کی پیداوار بھی خاصی تھی۔ اندلس کے نباتیوں (botanists) کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ وہ برس ہا برس کی تحقیقات سے نباتات میں موجود جنسی تفاوت کا دُرست مشاہدہ کرنے

میں بھی کامیاب ہو گئے تھے۔

اندلس کے نباتی نہ صرف طبی نباتات پر تحقیق کرتے بلکہ ہر قسم کے اُناج اور نقد آور فصلوں پر بھی تجربات کرتے، ملک کا اکثر حصہ دریاؤں اور اُن سے نکالی جانے والی نہروں سے بہتر انداز میں سیراب ہوتا تھا، چنانچہ پورا ملک فصلوں سے لدا رہتا، حتیٰ کہ پہاڑوں کو بھی بنجر نہیں رہنے دیا گیا، اکثر پہاڑی علاقوں میں انگور کی کاشت کی جاتی، اِس کے علاوہ لیموں، امرود، سیب، انجیر، زیتون، بہی، بادام، کیلا، آڑو، چکوترا، خربوزہ، انار، گنا، گندم، جو، چنا، جوار، مکئی اور چاول کی کاشت ملک بھر میں بڑے پیمانے پر ہوتی تھی اور اِن میں سے اکثر اَجناس بیرونِ ممالک برآمد کر کے خطیر زرِمبادلہ بھی کمایا جاتا تھا۔

وادئ آش (Guadix) اور اشبیلیہ (Seville) میں اعلیٰ قسم کی ’روئی‘ پیدا ہوتی جو مسلمان ماہرین نباتات ہی نے اسپین میں متعارف کروائی، روئی کو عربی میں ’قطن‘ کہتے ہیں۔ یہ لفظ ہسپانوی میں alagodon اور انگلش میں cotton کہلانے لگا۔ اندلسی مسلمانوں کی تحقیقات سے ’پٹ سن‘ کے ایک نہایت اعلیٰ ریشے نے بھی جنم لیا، جس سے اچھی نسل کے دھاگے اور عمدہ قسم کا کاغذ تیار کیا جاتا تھا۔

ملک کے جنوبی ساحل پر واقع اکثر مقامات پر گنا کی فصل نہایت شاندار ہوتی، جس سے اعلیٰ قسم کی شکر (sugar) تیار کی جاتی۔

ابو عبید البکری، ابو جعفر بن محمد الغافقی، ابن بصال، ابن حجاج، شریف الادریسی، ابن الرومیہ، ابن بکلارش، ابو الخیر اشبیلی، ابن العوام اور ابن البیطار اندلس کے اسلامی عہد کے نامور نباتی (botanists) تھے، اُنہوں نے نہ صرف اپنی تحقیقات کے ذریعے اندلس کو پودوں، درختوں اور فصلوں سے لاد دیا بلکہ اُن کی حفاظت کا بھی بخوبی اِنتظام کیا، چنانچہ ابن العوام نے پھلوں اور اناج کو زیادہ دیر تک محفوظ رکھنے کے بہت سے طریقے ’کتاب الفلاحۃ‘ میں ذِکر کیے ہیں، اُس نے کچھ ایسے طریقے بھی تحریر کیے ہیں جن سے گندم بیسیوں سال تک

خراب ہونے سے بچی رہتی تھی، چنانچہ حکومت کی طرف سے اُن ماہرین کے بتلائے ہوئے طریقوں کے مطابق بڑے بڑے گودام تیار کیے جاتے جن میں غلہ اور اناج سالہاسال تک محفوظ رہتا۔

آٹھ سوسالہ دورِ اقتدار میں مسلمان اقلیت میں رہے اور افسوس کی وہاں مسلمانوں کی مقامی نسل تیار نہ ہوسکی۔ مسلمانوں کے باہمی قبائلی جھگڑے اور اقتدار کی رسہ کشی نے انہیں اندر سے کھوکھلا کر دیا، ہر مشکل وقت میں مشرق سے کمک آجانے پر وہاں کے مسلمان اپنے پاؤں پر کھڑے نہ ہوئے اور ان میں مقابلہ کے لیے اعتماد نفسی ہمیشہ قلت کا شکار رہا، زن زر اور زمین نے وہاں کے مسلمانوں کو تیزی سے رو بہ زوال کرنا شروع کر دیا، بڑی ریاستوں کے امرا کی سپاہ کی تعداد انکی حرم کی عورتوں سے کم ہوتی تھی اور آہستہ آہستہ ان کے اندر کم علمی، احساس برتری اور تکلفات اس حد تک در آئے کہ قانون خداوندی نے وہاں سے مسلمانوں کا بوریہ بستر گول کر دیا۔ مسلمانوں کے دورِ اقتدار کے خاتمے کے بعد عیسائیوں نے اندلس کی مسلمان آبادی پر اسی طرح ظلم وستم کے پہاڑ توڑے اور انکی نسل کشی کرنے کی کوشش کی جس طرح مہذب و متمدن صلیبی افواج نے گزشتہ صدی کے آخر میں بوسنیا ہرزگوینیا میں مسلمانوں کو تختہ مشق بنایا اور جس طرح امریکی و یورپی روشن خیال افواج عراق اور افغانستان سمیت پوری دنیا میں درندگی، سفاکی اور بربریت کی تاریخ رقم کر رہی ہیں۔

اِسلامی اسپین کا تہذیبی وثقافتی اِرتقاء

اندلسی مسلمانوں نے یورپ کو ایک نئی تہذیب سے متعارف کروایا۔ اِسلام کی آمد سے قبل یورپ میں گندگی اور غلاظت کے ڈھیر ختم نہ ہوتے تھے، سیوریج کا گندہ پانی گلیوں اور بازاروں میں ہر سُو بکھرا رہتا تھا عموماً لوگ مہینہ بھر نہاتے نہ تھے اور کوئی ہفتے میں ایک آدھ بار نہالے تو اُس کے مسلمان ہونے کا شک کیا جاتا تھا۔ لوگوں کو پینے کا صاف پانی میسر نہ تھا، پورے یورپ میں ہسپتالوں کا وُجود ہی نہ تھا، خطرناک بیماریوں کا علاج جادُو، ٹونے اور

عملیات کے ذریعے کیا جاتا تھا۔لوگ توہمات کے اِس قدر رسیا تھے کہ معالج کی بجائے عامل کی طرف رُجوع کرنے میں ہی عافیت سمجھتے تھے،کھانے اور پہناوے میں نفاست کا فقدان تھا۔علمی حالت سب سے بڑھ کر قابل رحم تھی،لاکھوں کی آبادی کے شہروں میں گنتی کے چند پادریوں کے سوا کوئی لکھنا پڑھنا نہیں جانتا تھا اور وہ پادری چمڑے پر لکھی پرانی کتابوں کو کھرچ کر اُنہی کے اُوپر نئی تحریریں لکھنا شروع کر دیتے تھے جس سے اُن کا بچا کھچا علمی سرمایہ بھی ضائع ہوتا چلا جا رہا تھا،تعلیم،علاج اور تہذیب وثقافت غرض عملی زندگی کا ہر شعبہ قابل رحم حالت کو پہنچا ہوا تھا۔

مسلمانوں نے یورپ کو ایک فکرِ تازہ سے رُوشناس کیا۔زندگی کے نئے اَسالیب عملی طور پر اُن کے سامنے رکھے اور دیکھتے ہی دیکھتے اسپین کی زندگی کی کایا ہی پلٹ دی۔تہذیب وتمدن کا گہوارہ اِسلامی اسپین یورپ بھر کے لیے رشکِ فلک بنا،دُنیا اسپین کی ترقی اور تہذیب کی مثالیں دینے لگی،اسپین نے جہاں علوم وفنون،صنعت وحرفت اور تجارت میں خوب ترقی کی وہاں تہذیب وثقافت میں بھی قرونِ وُسطیٰ میں ہر طرف اُسی کا طوطی بولتا تھا۔

اِسلامی اسپین کا کلچر عرب مسلمانوں ہی کا مرہونِ منّت تھا،جو ترکِ سکُونت کر کے یورپ میں جا آباد ہوئے تھے،وہ اِسلامی تہذیب کی خوشنما روایات بھی اپنے ساتھ یورپ لے گئے تھے،جس سے اسپین کی سرزمین تہذیبی کمال کے عروج کو پہنچی۔

اِسلامی اسپین کے دارُالحکومت قرطبہ (Cordoba) کی آبادکاری کچھ اِس حسین انداز سے تھی کہ اُس کی سڑکوں،پلوں اور دیگر تعمیرات نے اُسے چار چاند لگا دیے تھے۔قرطبہ اپنی علمی وفنی سرگرمیوں اور صنعتی وتجارتی اہمیت کے باعث دُنیا میں اپنا ثانی نہ رکھتا تھا۔اندلس کے مسلمانوں نے خلفائے عباسیہ کی شان وشوکت اور پُرتکلف مہذّب زندگی کو بھی ماند کر دیا تھا۔اندلس تہذیب وثقافت اور فیشن میں دُنیا بھر میں ایک معیار کی حیثیت اِختیار کر چکا تھا اور دُنیا اُس کی مثالیں دیتے نہ تھکتی تھی۔بڑے بڑے عالیشان محلات اور بنگلوں کے علاوہ

بڑے شہروں میں میلوں تک پھلوں اور پھولوں کے باغات اُسے جنتِ ارضی کی صورت دے چکے تھے۔

مسلمانوں نے جہاں اسپین کو تعمیرات سے آراستہ کیا وہاں اُسے تہذیبی اِرتقاء سے بھی منوّر کیا۔ اسپین جہاں معاشرہ اَمن وامان کی ناقابلِ مثال صورت میں چین سے زندگی بسر کر رہا تھا، وہاں صنعت وحرفت اور تجارت کے فروغ نے شہریوں کو آسودہ حال کر دیا تھا۔ لوگ زیادہ سے زیادہ سرمایہ نئی صنعتوں میں لگانے لگے تھے، لوگوں کی قوتِ خرید بہت زیادہ تھی جس کی وجہ سے وہ اعلیٰ لباس اور بہترین اَشیائے خورونوش پر بے دریغ رقم خرچ کرتے تھے۔ تہذیبی تکلّفات اُن کی زندگی کا حصہ بن چکے تھے، آرائش وزیبائش پر خصوصی توجہ دی جاتی تھی، گھروں کے باہر دالان بنانے اور اُن میں دُور دراز ممالک سے نایاب درخت منگوا کر لگانے کا رواج عام تھا، اکثر گھروں میں فوارے اور حوض بھی بنائے جاتے تھے۔

عبدالرحمن الداخل کے دورِ حکومت میں جب اسپین میں اِسلامی سلطنت کو اِستحکام نصیب ہوا تو اُس نے ملک کی تعمیر وتزئین کی طرف خاص توجہ دی، اُس نے تقریباً تمام بڑے شہروں میں جابجا باغات، فوّاروں، پختہ گلیوں، سڑکوں اور دِیدہ زیب عمارات کا جال بچھا دیا۔ گلی کوچے پختہ ہوتے اور اُن میں روشنی کا بخوبی اِنتظام حکومت کے خرچ سے ہوتا، شہروں میں سیورِیج کا بھی بہت اعلیٰ اِنتظام تھا۔ بلنسیہ (Valencia) کے بڑے گندے نالے پر پکی چھت تھی اور وہ اِتنا چوڑا تھا کہ ایک چھکڑا بآسانی اُس کے اُوپر چل سکتا تھا، عبدالرحمن اوّل ہی نے دریائے وادئ کبیر (Guadalimor River) اور دریائے شنیل (Genil River) کے کنارے آباد اکثر شہروں کو متعدّد نہریں کاٹ کر پانی بہم پہنچایا، غرناطہ کے باہر ایک عظیمُ الشان محل بنایا اور اُس کے اَطراف میں وسیع وعریض باغ لگایا، جس کا نام رُصّافہ رکھا۔

عرب سے درخت منگوا کر اندلس کی سرزمین میں لگانے کا سلسلہ بھی عبدالرحمن اوّل ہی

کے دَور سے جاری تھا۔ اُسی محل کے پائیں باغ میں اُس نے اپنے وطن دِمشق سے کھجور کا ایک درخت منگوا کر لگایا جو اُسے اُس کے وطن کی یاد دِلاتا تھا۔ ایک روز کھجور کے اُس درخت کو دیکھ کر اُسے اپنا وطن اور اپنی بے سروسامانی کی حالت یاد آگئی جس پر اُس نے بڑے ہی پُرسوز اَشعار کہے۔ 'تاریخِ مقرّیٰ' میں اُس کے وہ اَشعار محفوظ ہیں۔

علامہ محمد اِقبال رحمۃ اللہ علیہ نے بالِ جبریل میں اُن اَشعار کا مفہوم اور اپنے اِحساسات ایک نظم کی صورت میں یوں پیش کیے ہیں:

میری آنکھوں کا نور ہے تو — اپنی وادی سے دُور ہوں میں
میرے دل کا سرُور ہے تو — میرے لیے نخلِ طور ہے تو
مغرب کی ہوا نے تجھ کو پالا — پردیس میں ناصبور ہوں میں
صحرائے عرب کی حور ہے تو — پردیس میں ناصبور ہے تو
غربت کی ہوا میں بار وَر ہو — عالم کا عجیب ہے نظارہ
ساقی تیرا نمِ سحر ہو — دامانِ نگہ ہے پارہ پارہ
ہمت کو شناوری مبارک — ہے سوزِ درُوں سے زندگانی
پیدا نہیں بحر کا کنارہ — اُٹھتا نہیں خاک سے شرارہ
صبحِ غربت میں اور چمکا — مومن کے جہاں کی حد نہیں ہے
ٹوٹا ہوا شام کا ستارہ — مومن کا مقام ہر کہیں ہے

اِسلامی اسپین کے دُوسرے بہت سے مسلمان حکمرانوں نے بھی خطۂ عرب سے بہت سے نئے پھلدار درخت اسپین میں متعارف کروائے اور جا بجا اُن کے باغات لگوائے، اُن میں سے کچھ باغات کی باقیات ابھی تک موجود ہیں۔

عبدالرحمن دُوُم کے دورِ حکومت میں ملک تہذیب کے عروج کمال کو جا پہنچا تھا، مشرقی و مغربی تہذیب کے سنگم سے ایک نئے اِمتزاج نے جنم لیا۔ موسیقی سے عبدالرحمن

ڈوم کو خاص لگاؤ تھا، اُس کے عہد میں اندلس میں موسیقی کے بڑے باکمال اساتذہ پیدا ہوئے جنہوں نے مشرق ومغرب کے دُور دراز ممالک سے بھی صاحبانِ ذوق سے خراجِ تحسین حاصل کیا، اِسلامی عہد کی صوفیانہ موسیقی اُس عہد میں اپنے کمال کو جا پہنچی اور بعد اَزاں اُس نے یورپ کی موسیقی پر بھی گہرے اَثرات مرتب کیے۔

اسپین کی ثقافتی ترقی کا تذکرہ ہو اور اُس میں 'اُستاد زریاب' کا ذِکر نہ آئے، یہ ممکن نہیں۔ خلافتِ بغداد کے نامور موسیقار اِسحاق موصلی' کا عظیم شاگرد' زریاب' بغداد سے ہجرت کر کے اسپین میں جا آباد ہوا، اُس نے اسپین کی تہذیب وثقافت میں کئی درخشاں اَبواب کا اِضافہ کیا۔ وہ بلامبالغہ اسپین کا 'تان سین' (Taansen) تھا، ایک رِوایت کے مطابق اُسے ہزار راگ یاد تھے۔ موسیقی و دِیگر فنونِ لطیفہ کا رسیا ہونے کے ساتھ ساتھ اُس کی شخصیت میں یہ خوبی تھی کہ وہ ہرفن مولا تھا۔ اُس کا ذوقِ لطیف بڑا اعالی تھا اور وہ بے حد ذہین بھی تھا۔

نئے نئے فیشن نکالنے میں اُسے کمال مہارت حاصل تھی۔ اُس نے ملک میں 'فنِ آرائش' (decorative art) کو ترویج دی۔ وہ شاہی مجالس کی تزئین وآرائش کا ماہر تھا، اُس نے اندلس کے لباس اور طعام میں حیرت انگیز تبدیلیاں پیدا کیں، نئے نئے فیشن اِیجاد کر کے جہاں اُس نے لوگوں کو بہترین اور دیدہ زیب لباس تیار کرنے کا ڈھنگ سکھایا اور اسپین کے طرزِ معاشرت میں اِنقلاب پیدا کیا، وہاں وہ ایک ماہر کک (cook) بھی تھا۔ اسپین کے بہت سے کھانے اُسی نے اِیجاد کیے، جن کی باقیات آج کے اسپین میں بھی موجود ہیں۔ اُس نے عام کھانے پکانے کے بھی نئے نئے طریقے نکالے جن سے کھانے زیادہ لذیذ تیار ہوتے تھے۔ اُس نے کھانے کے لیے شیشے کے برتنوں کو بھی رواج دیا اور چمچ اور چھری کانٹے سے کھانے کا طریقہ بھی نکالا۔

اُس کی وجہ سے لوگ مختلف موسموں میں مختلف فیشن اور رنگوں کا لباس پہننے لگے، سر کے بالوں کی مانگ بائیں طرف سے نکالنے کا طریقہ بھی اُسی کا اِیجاد کردہ ہے، اُس سے قبل

ساری دُنیا کے لوگ ہمیشہ درمیان سے مانگ نکالتے تھے۔ یورپ بھر میں اُسے فیشن کا باوا آدم سمجھا جاتا تھا۔ الغرض اُس نے یورپ کے کلچر میں ایک حسین اِنقلاب بپا کردیا جس کے اَثرات آج کے یورپ میں بھی بخوبی دیکھے جاسکتے ہیں، آج اِن میں سے بہت سی اشیاء کو 'مغرب نے اپنی تہذیب' کا نام دیدیا ہے، حالانکہ صورت حال یہ ہے کہ یورپ کی موجودہ تہذیب میں بہت کچھ ہمارے ہی اَجداد کا تہذیبی وِرثہ ہے اور اگر آج ہم اُس میں سے کسی اچھی بات پر عمل کرتے ہیں تو وہ یورپ کی نقّالی ہرگز نہیں بلکہ ہماری اپنی ہی کھوئی ہوئی تہذیب کی بازگشت ہے۔

دارُالحکومت۔قرطبہ

''اگر دُنیا کو ایک انگوٹھی فرض کرلیا جائے تو قرطبہ اُس کا نگینہ ہے''۔ یہ وہ الفاظ ہیں جو آج سے ۱۲؍صدیاں قبل ایک جرمن نن نے عبدالرحمن سوُم کے شہر قرطبہ (Cordoba) کے بارے میں کہے تھے، اِسلامی اسپین کا دارُالحکومت 'قرطبہ' خلافتِ عباسیہ کے دارُالخلافہ 'بغداد' (Baghdad) سے کسی طور کم نہ تھا، بلکہ بعض وُجوہ کی بنا پر اُسے بغداد پر فوقیت حاصل تھی۔

شہر کی آبادی 10,00,000 سے متجاوز تھی، جس میں 2,00,000 سے زائد رہائشی مکانات موجود تھے۔ سکے سے بنی پائپ لائنوں کی مدد سے اِتنے وسیع وعریض شہر کو پینے کے تازہ پانی کی فراہمی اُس دَور کا سب سے عظیم کارنامہ تھا، قرطبہ میں کل 80,400 دُکانیں تھیں، قرطبہ یورپ کے دورِ جاہلیت (dark ages) کے دوران ایک عظیمُ الشان علمی مرکز کے طور پر اُبھرا، شہر میں 3,000 مساجد، 80 کالج، 50 ہسپتال، 700 حمام اور غلّے کو محفوظ رکھنے کے لیے 4,300 گودام تھے، میلوں طوِیل سڑکیں پختہ پتھروں سے بنی تھیں ک، رات کے وقت شہر میں روشنی کا بخوبی اِنتظام تھا، سرِشام ہرکارے گلیوں میں نصب ستونوں سے آویزاں لیمپوں (lemps) میں تیل ڈال جاتے، غروبِ

آفتاب پر اُنہیں جلا دیا جاتا اور ساری ساری رات اُن کی روشنی سے سڑکیں اور گلیاں منوّر رہتیں۔ یہ اُس دَور کا ایک اور نا قابلِ یقین عظیم کارنامہ تھا۔

اِسلامی اسپین کی تہذیب تو آج سے 12 صدیاں قبل ترقی کی اِس اَوج پر فائز تھی جبکہ کوہِ پیرینیز (Pyrenees) کی دُوسری طرف یورپ بھر کے تمام مسیحی ملکوں کی علمی و تہذیبی حالت اور معیارِ زندگی اِس قدر ناگفتہ بہ تھا کہ پیرس اور لندن جیسے بڑے شہروں میں بھی راتیں گھپ اندھیرے میں گزرتی تھیں، جس سے اکثر وہاں امن و امان کا مسئلہ درپیش رہتا۔ گلیاں کیچڑ اور سیوریج کے بیماریاں پھیلاتے پانی سے اَٹی رہتیں اور صدیوں بعد تک بھی اُن کی گلیوں میں اسٹریٹ لائٹس (Street lights) کا اِنتظام نہ ہو سکا۔

اِسلامی اسپین میں صنعت و ٹیکنالوجی کا اِرتقاء

حرکت میں برکت اور کام میں عظمت اسلام کی بنیادی تعلیمات میں سے ہے۔ اسلام نے اپنے ماننے والوں کو محنت و مشقت کے ساتھ زندگی گزارنے کا حکم دیا ہے۔ ہر نبی اپنی اُمت کے لیے آئیڈیل Ideal حیثیت رکھتا ہے اور تاجدارِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شخصیت قیامت تک کی انسانیت کے لیے مشعل راہ ہے۔ آپ نے اپنی تعلیمات اور عمل کے ذریعے اُمتِ مسلمہ کو محنت میں عظمت کا درس دیا۔

کسی خاص فن میں کی گئی محنت جب ایک خاص مہارت تک پہنچتی ہے تو اُسے 'حرفہ' کہا جاتا ہے۔ یہیں سے صنعت و حرفت کو بنیاد ملتی ہے اور انسانی معاشرے میں ٹیکنالوجی Technology کو فروغ ملتا ہے، یوں ٹیکنالوجی 'محنت میں عظمت' کے عظیم تصوّر کا نتیجہ قرار پاتی ہے۔

تاجدارِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے: بیشک اللہ اِس بات کو پسند کرتا ہے کہ جب تم میں سے کوئی کسی کام کو سر انجام دے تو اُسے مضبوطی سے کرے۔ ''إنّ اللّٰہ یحب إذا عمل أحدکم عملاً أنْ یتقنہ'' (مجمع الزوائد ۴: ۹۸)

اِسلام کی تعلیمات سے ملنے والے محنت کے سبق نے جاہل اور گنوار عرب قوم کو چند ہی برسوں میں اس قابل کر دیا کہ اُن کا پھریرا تین براعظموں پر لہرانے لگا، مسلمان جہاں کہیں فتوحات کرتے وہاں کی آبادی کے دلوں میں اپنے طرزِ حکومت اور عدل و انصاف کے باعث ایک اچھا مقام بنا لیتے ہیں۔ ہر ملک میں 'محنت میں عظمت' کا تصور لے کر پہنچنے والے مسلمانوں نے ہر خطے کو فلاحی ریاست کے قیام کے لیے دن رات محنت میں مشغول کر دیا۔ صدیوں کی فراغت زدہ قومیں کام کی عظمت سے شناسا ہوتی چلی گئیں اور دیکھتے ہی دیکھتے اُنہوں نے اپنے دور کی مناسبت سے ٹیکنالوجی کے میدان میں کمال حاصل کر لیا۔ طلبِ علم اور فنی مہارت کے حصول کی ترغیب اقوامِ عالم کو اسلام ہی کے آفاقی پیغام سے نصیب ہوئی۔ اسلام سے قبل بھی 'علم' یونانی سانچوں میں موجود تھا، جس کا 'عمل' سے دُور کا بھی تعلق نہ تھا۔ اسلام نے علم کو برائے علم نہیں رہنے دیا بلکہ علم برائے زندگی کی تعلیم سے مسلمان قوم کو دنیا کی سب سے متحرک قوم بنا دیا اور جن خطوں پر انہیں سیاسی غلبہ حاصل ہوا وہاں کے عوام نے ان سے متاثر ہو کر محنت شروع کر دی اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ ٹیکنالوجی کے میدان میں کمال پا گئیں۔ آج مسلمان تو اگرچہ اپنی اصل دینی تعلیمات سے رُوگرداں ہو کر پسماندہ ہو چکے ہیں مگر محنت کا وہ تصوّر جو انہوں نے سپین Spain کے راستے یورپ کو دیا تھا وہ پوری دنیا میں اپنے ثمرات مرتب کر رہا ہے۔

سرِدست ہم سپین Spain کے اِسلامی دور کی ٹیکنالوجی کا ذِکر کریں گے تا کہ قارئین پر اسلامی سپین Spain میں فروغ پانے والی صنعت و ٹیکنالوجی عیاں ہو سکے:

کاغذ سازی (Paper industry)

حصول و اِفشائے علم میں کاغذ کو مرکزی کردار حاصل ہے۔ بغداد کی خلافتِ عباسیہ اور سپین کی خلافتِ اُمویہ کے دور میں علم کی وسیع پیمانے پر ترویج اشاعت کتب ہی کے ذریعے ممکن ہوئی۔ کاغذ کی ایجاد سے قبل جن اشیاء (چمڑے وغیرہ) پر کتابیں لکھی جاتی تھیں وہ اس

قابل نہ تھیں کہ فقط اُن کے بل بوتے پر لاکھوں کتب پر مشتمل بڑی بڑی لائبریریاں وُجود میں آسکتیں۔

رُوئی سے بننے والا کاغذ مسلمانوں کی ایجاد ہے، اُس سے پہلے دُنیا میں ریشمی کیڑے کے خول سے کاغذ بنایا جاتا تھا، جو نہ صرف بہت زیادہ مہنگا ہوتا بلکہ صرف انہی ممالک میں دستیاب ہوتا جن کی آب وہوا اس قدر موزوں ہو کہ ریشم کا کیڑا وافر مقدار میں پرورش پاسکے۔ چنانچہ قرونِ وُسطیٰ میں یورپی ممالک میں چمڑا ہی وہ واحد شے تھی جس پر کتب لکھی جاتیں۔ چمڑا اِس قدر مہنگا اور کم یاب تھا کہ اُس دَور کے پادریوں نے مذہبی رسائل لکھنے کے لیے قدیم یونانی کتب کے حروف چھیل کر اُن کا چمڑا استعمال کرنا شروع کر دیا جس سے یونانیوں کی بہت سے عقلی اور فلسفیانہ تصانیف تلف ہوگئیں۔

مسلمانوں نے جب 704ء میں چین کے مغربی علاقے سنکیانگ کو فتح کیا تو اُس وقت چین کے قیدی سپاہیوں کی مدد سے سمرقند میں کاغذ بنانے کے کارخانے قائم کیے۔ یہیں سے انہیں کاغذ کی صنعت کو اپنانے اور فروغ دینے کا خیال آیا۔ کچھ کاغذ نمونے کے طور پر اسلامی سلطنت کے مرکزی شہروں دمشق اور بغداد بھیجے گئے اور فقط دو سال کے انتھک تجربات کے بعد 706ء میں یوسف بن عمر نامی مسلمان سائنس دان نے روئی سے بننے والا کاغذ ایجاد کرلیا۔ جسے ''دِمشقی'' کاغذ کے نام سے جانا جانے لگا۔ یہ کاغذ سمرقندی کاغذ کو مات کرگیا۔ یوں آٹھویں صدی عیسوی کے اندر اندر تمام مسلمان ممالک میں بقدرِ ضرورت کاغذ سازی کی صنعت فروغ پزیر ہوئی اور سستا اور معیاری کاغذ وافر مقدار میں بننے لگا۔ بغداد میں 794ء میں کاغذ سازی کا پہلا بڑا سرکاری کارخانہ فضل بن یحیٰ برمکی نے قائم کیا جسے 'صناعۃ الورقہ' کا نام دیا گیا۔ روئی کے کاغذ کی آمد سے مصری قرطاس (papyrus) کا استعمال ختم ہونے لگا اور کچھ ہی عرصے میں تہامہ، دمشق اور طرابلس میں کاغذ سازی کی صنعت فروغ پزیر ہوئی۔ طرابلس کے بعد مراکش میں بھی کچھ فیکٹریاں کاغذ بنانے لگیں۔ یہیں سے یہ صنعت سپین

میں داخل ہوئی۔

یورپ بھر میں اسپین پہلا ملک ہے جہاں کاغذ بنانے کا کام شروع ہوا۔ اسلامی سپین میں کاغذ سازی کی صنعت مشرقی اسلامی سلطنت ہی سے پہنچی۔ 1085ء میں شاطبہ (Xatiua) میں کاغذ سازی کا کارخانہ قائم ہوا۔ تھوڑے ہی عرصے میں اسلامی سپین کے ماہرین نے کاغذ سازی کو نئے انقلابات سے روشناس کیا۔ سپین کا کاغذ مضبوط اور معیاری ہوتا۔ بالخصوص شاطبہ (Xatiua) میں نہایت عمدہ کاغذ تیار ہوتا تھا جس کی نظیر دنیا بھر میں نہیں ملتی۔ اپنے بہترین معیار کی بدولت اُسے آس پاس کے بہت سے ممالک کو برآمد کیا جانے لگا۔ شاطبہ (Xatiua) کے علاوہ قرطبہ (Cordoba)، غرناطہ (Granada)، قسطلہ اور بلنسیہ (Valencia) میں بھی کاغذ سازی کے بڑے کارخانے موجود تھے۔

ٹیکسٹائل انجینئری (Textile engineering)

خوراک کے بعد لباس انسانی زندگی کی سب سے بنیادی ضرورت ہے۔ اس کی ضرورت و اہمیت سے کسی دور کے کسی بھی معاشرے نے انکار نہیں کیا۔ یہ الگ بات کہ دولت کی فراوانی اور اخلاقی بے راہ روی لباس پہنے ہوئے بھی بے لباسی کی کیفیت پیدا کر دے۔ اسلام نے جہاں لباس کے لیے ضروری ستر کی حدود متعین کی ہیں وہاں اُس کی زینت کی طرف بھی توجہ دلائی ہے۔ جہاں باطنی حسن و زیبائش کے لیے "لِبَاسُ التَّقْوٰى ذٰلِكَ خَيْرٌ"(۱) میں تقویٰ کا لباس اپنانے کا حکم دیا گیا وہاں جمیع بنی آدم کو اللہ کے حضور حاضری اور سجدہ ریزی سے قبل بہترین لباس زیبِ تن کرنے کا بھی حکم دیا۔

فرمانِ خداوندی ہے: "يٰبَنِىۡۤ اٰدَمَ خُذُوۡا زِيۡنَتَكُمۡ عِنۡدَ كُلِّ مَسۡجِدٍ"(۲)

اے اولادِ آدم! تم ہر نماز کے وقت اپنا لباسِ زینت (پہن) لیا کرو۔

---

(۱) الاعراف، 26 : 7۔

(۲) الاعراف، 31 : 7۔

اِس آیتِ کریمہ میں اللہ ربّ العزت نے لباس کی اہمیت اور زِینت کی طرف دِلائی، یہ اِسی توجہ کا ثمرہ تھا کہ مسلمانوں نے پارچہ بافی کی صنعت میں کمال حاصل کرلیا۔ ابتدا میں نومفتوحہ علاقوں (newly conquered) میں پہلے سے مروّجہ ٹیکسٹائل کی صنعت مسلمانوں میں متعارف ہوئی۔ جس کے کچھ ہی عرصے بعد مسلمانوں نے اِس فن میں بھی اپنا ایک تشخص قائم کرلیا اور ٹیکسٹائل کے باب میں بھی دنیا بھر کے اِمام (leader) قرار پائے۔

اسلامی اسپین میں ٹیکسٹائل کی صنعت اپنے عروج پر تھی یہاں کے تیارشدہ ملبوسات (garments) آس پاس کے بہت سے ممالک کو برآمد بھی کیے جاتے تھے۔ حتیٰ کہ مرکزی اسلامی سلطنت کے دارالخلافہ بغداد میں بھی سپین کے معیار کا کپڑا تیار نہ ہوتا تھا۔ اسپین کا 'دِیباج' اور 'طِراز' دُنیا بھر میں خاص شہرت رکھتے تھے۔ اور اکثر مؤرخین سپین Spain کے شاہی ملبوسات کو بغداد کے شاہی ملبوسات پر فوقیت دیتے ہیں۔

اسپین Spain کے جنوبی ساحل پر واقع شہر المریہ (Almeria) 'دِیباج' کی تیاری میں سب شہروں سے بڑھ کر تھا، جہاں پارچہ بافی کی 4,500 سے زائد مشینیں نصب تھیں۔ اُس دَور کے سیاحوں اور مؤرّخین نے المریہ کے دِیباج کی اعلیٰ بُنت کی بہت تعریف کی ہے۔

ٹیکسٹائل کے سلسلے میں بغداد کی مرکزی اسلامی سلطنت کی طرح مسلم اسپین Spain میں بھی روئی کو مرکزی مقام حاصل تھا۔ کپاس کی وسیع پیمانے پر کاشت کا بخوبی انتظام کیا جاتا اور ماہرین نباتات (botanists) اعلیٰ قسم کی کپاس کی کاشت کے لیے نت نئے تجربات کرتے جن کے نتیجے میں سپین کی ٹیکسٹائل ٹیکنالوجی اپنے دور کے عروج کو جا پہنچی۔

اسپین Spain میں ٹیکسٹائل ٹیکنالوجی کو متعارف کروانے کا سہرا بھی عرب مسلمانوں

ہی کے سر ہے۔ مسلمانوں نے دوسری صدی ہجری میں وہاں ٹیکسٹائل کی صنعت کا آغاز کر دیا تھا۔ جبکہ فرانس اور جرمنی میں یہ صنعت بہت عرصہ بعد بالترتیب چھٹی اور آٹھویں صدی ہجری میں پہنچی۔

گھڑیاں (Watches)

علم فلکیات (astronomy) کی طرح علم المیقات (time keeping) بھی مسلمانوں کا پسندیدہ علم رہا ہے۔ ان دونوں علوم میں مسلمانوں نے بیش بہا اضافے کیے اور یونانی دور کی بے شمار خطاؤں کو دُور کر کے بنی نوع انسان کے زائیدہ ان علوم کو حقیقی معنوں مین فطری بنیادوں پر اُستوار کیا۔ علم فلکیات اور علم المیقات دونوں میں وقت کی پیمائش نہایت اہم چیز ہے۔ سالوں، مہینوں اور دنوں کی پیمائش کے لیے تو قدرت کی طرف سے مہیا کردہ سورج اور چاند رہنمائی کرتے ہیں، جن سے بننے والی تقویمات انسان کو وقت شماری کے قابل بناتی ہیں لیکن دن کو گھنٹوں، منٹوں اور سیکنڈوں میں تقسیم کرنا خالصتاً انسان کی شعوری کاوِش کا نتیجہ ہے۔ اور سب سے بڑی بات ایسے آلات کا بنانا ہے جن کی مدد سے دن کے مختلف پہروں اور لمحوں کا شمار ممکن ہو سکے۔

وقت کی پیمائش کے لیے اسلام کی آمد سے قبل بھی کچھ قدیم پیمانے اور آلات مروّج تھے لیکن سادگی کی بنا پر اُن کی کارکردگی خالی از خطا نہ تھی۔

مسلمانوں نے میکینکل Mechanical گھڑیاں ایجاد کیں اور اُن میں پنڈولم pendulum استعمال کر کے ان کی کارکردگی کو بہتر کیا۔ جامع دمشق (شام) میں ایک کافی بڑی اور عجیب وغریب گھڑی آویزاں تھی جو دن کے پہروں اور گھنٹوں کا اعلان مختلف طریقوں سے کرتی تھی اور اُس کی کارکردگی بھی نہایت عمدہ تھی۔ وہ گھڑی اپنے دور کا نہایت حسین عجوبہ تھی، بلنسیہ (Velencia) کے نامور سیاح ابن جبیر نے اپنے سفرنامہ میں اس گھڑی کی کارکردگی کو کافی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ (رحلہ ابن جبیر: ۲۰۷)

اِسلامی اسپین میں ہاتھ پر باندھی جانے والی گھڑیاں بھی بنائی جاتی تھیں جنہیں ’’منتقلہ‘‘ کہا جاتا تھا۔اُن گھڑیوں کی مدد سے منٹوں تک کے وقت کا صحیح تعین کیا جاسکتا تھا۔عباس بن فرناس نے بھی ایک نہایت عمدہ گھڑی بنائی تھی جس کی کارکردگی بے مثل تھی ۔ یوں علم المیقات (timekeeping) کے شعبے میں بھی اسپین کے مسلمان ایشیا کی اِسلامی خلافت سے کسی طور پیچھے نہ تھے۔

حرکی توانائی (Kinetic energy)

پانی اور بجلی کے ذریعے حرکی توانائی کا حصول اور اُس کی مدد سے روزمرّہ زندگی کے کئی ایک چھوٹے بڑے کام سر انجام دینا اسلامی سپین میں معروف تھا۔ ماہر انجینئرز Engineers کے علاوہ عام لوگ بھی نہ صرف حرکی توانائی کا استعمال سمجھتے تھے بلکہ عملاً اُس سے فائدہ بھی اُٹھاتے تھے۔

اناج کی پسائی وغیرہ کے لیے پانی اور ہوا کے زور سے چلنے والی چکیاں پورے ملک میں عام تھیں۔ پون چکیاں (windmills) عموماً ایسے پہیوں پر بنائی جاتی تھیں کہ بوقت ضرورت اُن کا رُخ ہوا کی سمت گھما لیا جاتا تھا، پن چکیوں (water mills) کے لیے دریاؤں کا پانی نہروں کے ذریعے مخصوص جگہوں پر لاکر بلندی سے یکدم گرادیا جاتا جس سے نیچے لگی چرخیاں گھومنے لگ جاتیں۔ پن بجلی کے لیے بنائے جانے والے بڑے بڑے ڈیم آج کل اسی بنیاد پر قائم کیے جاتے ہیں، چنانچہ دریائے وادی کبیر‘ (Guadalimar River) اور دریائے شنیل‘ (Genil River) کے کنارے سینکڑوں پن چکیاں غلہ پیسنے کے لیے نصب تھیں، حرکی توانائی کا استعمال اس قدر عام ہو چکا تھا کہ پون چکیاں کشتیوں پر نصب ہونے لگ گئی تھیں، ایسی پون چکیاں بالعموم لوگوں کو کرایہ پر دینے کے لیے بنائی جاتی تھیں اور انہیں بآسانی دوسرے مقامات پر منتقل کیا جاسکتا تھا۔

اسلامی اسپین میں عربوں نے حرکی توانائی (kinetic energy) کے جس سلسلے کا

آغاز کیا تھا گیارھویں صدی عیسوی تک وہ مغربی یورپ کے چند ممالک تک بھی پھیل گیا اور وسطی یورپ میں یہ طریق کار چودھویں صدی تک پہنچ سکا، چنانچہ آج بھی یورپ کے اکثر ممالک بالخصوص ہالینڈ Howlandاور بیلجیئم میں پون چکیاں (windmills) بڑی تعداد میں موجود ہیں۔

کیمیکل ٹیکنالوجی (Chemical technology) اِسلامی اسپین کے دورِ عروج میں مسلمانوں نے کیمیکل Belgium ٹیکنالوجی کی طرف بھی خاص توجہ دی اور روزمرّہ زندگی میں کارآمد بہت سی اشیاء بنائیں۔

خطاطی مسلمانوں کا ہر دِلعزیز فن تھا، بہترین خطاطی کے لیے معیاری روشنائی اور رنگوں کی ضرورت پڑتی ہے، انہوں نے رنگوں کے معیار کو بہتر کیا اور خاص قسم کی روشنائیاں ایجاد کیں جو سالہا سال اپنا اثر نہ چھوڑتی تھیں، مصوری میں استعمال ہونے والے رنگوں کے لیے وہ ایک خاص قسم کی وارنش Varnish بھی بناتے جس سے وہ دیرپا ہوجاتے۔

شیشہ سازی کی تاریخ میں بھی مسلمانوں نے کارہائے نمایاں سرانجام دیے۔ مسلمانوں کی سپین Spain آمد سے قبل شیشہ کی صنعت وہاں موجود تھی اور قرطبہ (Cordoba) کے قریب شیشے کی ایک بڑی کان موجود تھی، اسلامی دور کے اوائل میں شیشے کے برتنوں کا رواج نہ تھا مگر 'زریاب' کی اندلس آمد کے بعد اُس کے اِیماء پر محلاتِ شاہی میں سونے چاندی کے برتنوں کی بجائے شیشے کے برتنوں کو رواج پڑا، یہیں سے شیشہ سازی کی صنعت نے ترقی کی اور دیکھتے ہی دیکھتے عوام و خواص بھی شیشے کے برتنوں کا عام استعمال کرنے لگے۔

ہوائی جہاز کے موجد عباس بن فرناس نے شیشہ بنانے کا ایک نیا طریقہ ایجاد کیا۔ وہ چکنی مٹی کو بھٹی میں پکاتا اور اس سے شیشہ بناتا۔ شیشہ سازی کا یہ نیا اُسلوب جلد ہی سپین میں رواج پکڑ گیا۔ اُس نے اس نئے طریقے کی ترویج کے لیے اس پر ایک کتاب بھی لکھی تھی۔ جنوبی ساحل پر واقع شہر المریہ (Almeria) میں شیشہ سازی کے بڑے کارخانے قائم

تھے۔ جہاں سے شیشے کی مصنوعات کی اندرونِ ملک سپلائی کے علاوہ برآمد بھی کی جاتی تھیں۔ اِس کے علاوہ مُرسیہ (Murcia)، مالقہ (Malaga)، غرناطہ (Granada)، قرطبہ (Cordoba)، لورقہ (Lorca) اور موجودہ پرتگال میں واقع شہر باجا (Beja) میں بھی شیشہ سازی کی صنعت فروغ پزیر تھی اور مقامی استعمال کے لیے وافر مقدار میں مصنوعات تیار کی جاتی تھیں۔

چمڑے کی مصنوعات کے سلسلے میں بھی سپین Spain کے مسلمان کافی آگے تھے۔ اُنہوں نے چمڑے کی تیاری میں استعمال ہونے والے ایسے کیمیکلز (Chemicals) ایجاد کیے جو چمڑے کو دیرپا رکھتے۔ قرطبہ (Cordoba) اور باجا (Beja) چمڑے کی صنعت میں خاص مقام رکھتے تھے، قرطبہ تولیدر انڈسٹری کی بدولت پورے یورپ میں مشہور تھا، یہی وجہ ہے فرانس میں ایک عرصے تک چمڑے کو cordovan اور چرم سازی کا کاروبار کرنے والوں کو cordo nniers کہا جاتا رہا۔

سمور کی پوستین کے سلسلے میں سرقسطہ (Zaragoza) اہم مقام رکھتا تھا۔ خلیج بسکونیہ (Bay of Biscay) سے 'سمور' نامی جانور کا شکار کیا جاتا۔ جس کے بعد اُس کی کھال کو سرقسطہ لے جایا جاتا جہاں چرم سازی کا بخوبی انتظام تھا۔ 'سمور' کی کھال سے بننے والی پوستین کو بھی 'سمور' ہی کہا جاتا تھا۔ یہ نہایت قیمتی ہوتی اور اس کی برآمد سے بھی زرمبادلہ کمایا جاتا۔ مرسیہ (Murcia) میں بعض قسم کے اسلحہ کے لیے بھی چمڑے کا استعمال کیا جاتا۔ یہاں کی شیلڈز Schedule بڑی مضبوط اور معیاری ہوتی۔

اسلحہ سازی (Ordnance)

جہادِ اِسلام کے بنیادی ارکان میں سے ہے۔ ظلم اور جبر و بربریت کی ہر ناروا صورت کو صفحۂ ہستی سے ناپید کر دینا مسلمانوں پر فرض ہے۔ تاریخِ عالم گواہ ہے کہ جب بھی کسی مفلوک و مظلوم نے مسلمانوں کو مدد کے لیے پکارا آنِ واحد میں وہ ظلم کا سر کچلنے کو پہنچ گئے۔ چنانچہ

ایسے بہت سے واقعات تاریخ کے صفحات میں بکھرے ہوئے ہیں۔

جہاد کے سلسلے میں سب سے اہم اور ضروری شے اسلحہ سازی میں خود کفالت تھی۔ مرکزی اسلامی سلطنت کی طرح اندلس کی اسلامی حکومت بھی اسلحہ سازی میں مکمل طور پر خود کفیل تھی۔سپین (Spain) کے بہت سے اضلاع میں لوہے کی کانیں موجود تھیں جن سے بھاری مقدار میں لوہا نکالا جاتا تھا، چنانچہ دیگر بہت سی ضروریاتِ زندگی کے ساتھ ساتھ اُس سے تلواریں، تیر، نیزے، زرہیں اور خود (ہیلمٹ Helmet) وغیرہ بھی بنائے جاتے تھے۔ طلیطلہ (Toledo) کی تلواریں اپنی مضبوطی اور کاٹ میں دُنیا بھر میں اپنا ثانی نہیں رکھتی تھیں۔شمشیر سازی میں اشبیلیہ (Seville) کا بھی اچھا مقام تھا۔اُن کے علاوہ قرطبہ (Cordoba)، غرناطہ (Granada)، مُرسیہ (Murcia)، المریہ (Almeria) اور سرقسطہ (Zaragoza) بھی اسلحہ سازی میں مشہور تھے، ان شہروں میں عمدہ قسم کے ہتھیار تیار ہوتے اور انہیں حسبِ ضرورت ملک کے دُوسرے شہروں میں بھی بھیجا جاتا تھا۔

اپنے دور کے روایتی ہتھیاروں کے علاوہ اسلامی اسپین Spain کے مسلمان بارود اور توپ کا استعمال بھی شروع کر چکے تھے، بارود کا استعمال انہوں نے ایشیا کی مرکزی اسلامی خلافت سے سیکھا تھا مسلمانوں نے حجاج بن یوسف کے دور میں 692ء میں پہلی بار توپ اور بارود کا استعمال کیا، بعد میں اسلامی اسپین میں توپ کا استعمال عام ہونے لگا اور اسے متعدد جنگوں میں استعمال کیا گیا جبکہ مدمقابل انگریزوں کی طرف سے اسلامی سپین Spain کے خلاف جنگ میں توپ کا سب سے پہلا استعمال 1346ء کی جنگ میں کیا گیا۔

ہوائی جہاز (Aeroplane)

اپنی تخلیق کے اوّل روز سے ہی انسان کے دل میں تجسس کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے، یہ تجسس ہی تھا جو سیدنا آدم علیہ السلام کو دانۂ گندم تک لے گیا، تجسس نے ہمیشہ بنی نوع انسان کو ترقی کے شاہراہ پر گامزن کیا۔سمندر کے پار اور پہاڑ کی اوٹ میں کیا واقع ہے؟ یہ

تجسس اِنسان کو صحرانوردی پر مجبور کرتا رہا اور ایک وقت آیا کہ انسان نے پورے کرۂ ارضی کا چپہ چپہ چھان مارا اور انچ انچ کے نقشے بنانے میں کامیاب ہوگیا، سطحِ زمین کا قیدی انسان جب پرندوں کو آزادانہ فضا کی بلندیوں میں اڑتے دیکھتا تو اُس کے دل میں بھی اُڑنے کی خواہش جنم لیتی۔ پرندوں کے لیے اپنی خالی خولی اور ہلکی پھلکی ہڈیوں کی نسبت فضائی اُڑان ممکن تھی جبکہ انسان کے اعصاب اُس کے بدن کے وزن کو اُڑانے کے لیے کافی نہ تھے، تاہم مختلف ادوار میں مختلف معاشروں کے لوگوں نے اپنے بازوؤں کے ساتھ پر باندھ کر اُڑنے کی کوشش کی اور پہاڑی ڈھلانوں سے کود کر مختصر سی اڑان بھی کی مگر اُن میں سے اکثر اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ اس دیرینہ خواہش کی تکمیل 17 ستمبر 1903ء میں اُس وقت ہوئی جب رائٹ برادران Brothers نے اپنے خود ساختہ ہوائی جہاز کی پہلی کامیاب پرواز کی جو صرف 12 منٹ پر مشتمل تھی۔ 1903ء میں کامیاب ہونے والا انسان ایک صدی گزرنے سے بھی بہت پہلے ستاروں پر کمندیں ڈالنے لگا اور اُس نے آواز سے تیز رفتار سفر کرنے والے جہاز ایجاد کر لئے، ایسا کرتے وقت صدیوں کا انسانی شعور اُس کی پشت پناہی کرتا ہے۔

دنیا کا سب سے پہلا ہوائی جہاز اسلامی سپین Spain کے مسلمان سائنس دان عُباس بن فرناسؒ نے نویں صدی عیسوی میں ایجاد کیا اور اُسے اُڑانے میں کامیاب ٹھہرا۔ اُس نے اپنے جہاز کے دائیں بائیں بڑے بڑے پر بھی لگائے تھے جو جہاز اور اُس کا بوجھ اُٹھائے دور تک چلے گئے، تاہم وہ جہاز کی لینڈنگ ٹھیک طرح سے نہ کرسکنے کی بنا پر اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ دراصل اُس نے اپنے جہاز کی دُم نہیں بنائی تھی اور وہ اس بات سے آگاہ نہیں تھا کہ پرندے اپنی دُم کی مدد سے زمین پر واپس اُترتے ہیں۔

ہوائی اُڑان کی حد تک عباس بن فرناس کی یہ کوشش بنی نوع انسان کے اذہان پر ایک دستک تھی، بڑی بڑی ایجادات کے پس منظر میں انسان کی ایسی ہی ابتدائی

کوششیں بنیاد بنتی ہیں، اسلامی سپین Spain کی تاریخ میں میسر اس ایک مثال سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ وہاں کے مسلمان سائنس دان سائنس وٹیکنالوجی کے فروغ میں کس قدر جنونی انداز اختیار کر چکے تھے کہ اپنی جان کو بھی داؤ پر لگا دینے سے گریز نہیں کرتے تھے۔

سِول انجینئری (Civil engineering)

مسلمان جس خطۂ ارضی میں بھی حکمران ہوئے وہاں کے تہذیب وتمدن کے ارتقا اور اُس میں اسلامی روایات کے فروغ کے علاوہ تعمیرات کی صورت میں بھی انہوں نے وہاں اَنمٹ نقوش چھوڑے، اِسلامی سپین Spain کے مسلمان حکمران بھی تعمیرات کا نہایت عمدہ ذوق رکھتے تھے، اندلس میں اُنہوں نے بہت سی باقیات چھوڑیں، اُن کی تعمیرات میں عمارات، شاہراہیں اور دریاؤں پر بنائے گئے پل شامل ہیں، جو سپین Spain کے انجینئروں کی ماہرانہ کاریگری کا منہ بولتا ثبوت ہیں، سِول انجینئری کے ذیل میں اسلامی سپین Spain بہت آگے تھا، یہاں ہم تفصیل میں جائے بغیر چند اہم عمارات کا ذکر کرتے ہیں تاکہ قارئین پر سپین Spain کے اسلامی دور کا یہ نقشہ بھی واضح ہو سکے:

مسجدِ قرطبہ

قرطبہ کی عظیم جامع مسجد جس کا سنگِ بنیاد عبدالرحمن سوُم نے اپنی وفات سے دو برس پہلے 959ء میں رکھا تھا، بعد کے خلفاء نے اُسے مزید وسعت دی اور وہ تاریخِ اِسلام کی عظیم الشان مساجد میں سے ایک ٹھہری۔ وہ ایک مستطیل شکل کی مسجد ہے جس کی دیواریں بڑے قیمتی اور نفیس پتھروں سے بنی ہیں۔ اُس کے مینار 70 فٹ بلند بنائے گئے۔ مسجد میں 4,700 فانوس روشن ہوتے جن کے لیے سالانہ 24,000 پاؤنڈ زیتون کا تیل اِستعمال ہوتا تھا۔ مسجد کے ستونوں کی کل تعداد 1,093 ہے جو اعلیٰ کوالٹی کے دِیدہ زیب ماربلز

بنا کر اُن محرابیں ڈہری میں حصہ اُوپری کے ستونوں تھے۔ گئے کیے تعمیر سے marbles کے حسن کو مزید اُجاگر کیا گیا ہے، جو تمام عالم اِسلام میں اپنی نوعیت کا انوکھا کام ہے۔ مسجد کی تعمیر میں اِسلامی شان وشوکت اور اِستقامت دِیدنی ہے۔ آٹھویں صدی عیسوی میں قرطبہ کے اندر ایسی حسین وجمیل اور مضبوط عمارت کا وُجود حیرت انگیز بات ہے، جبکہ اُس دوران میں دُنیا میں عام طور پر انجینئرز Engineers میں اِتنی قابلیت بھی نہیں پائی جاتی تھی۔ مسجد کی تعمیر میں کاشی کاری کا کام اپنی نفاست اور دیدہ زیب رنگوں کے حسین اِمتزاج سے اِنتہائی خوبصورت شکل اِختیار کر گیا ہے، جسے دیکھ کر آج بھی اِنسان کی آنکھیں خیرہ ہوتی ہیں۔

ایک انگریز مؤرخ نے اُس مسجد کے بارے میں یہاں تک لکھا ہے کہ:

Whatever the human eye has witnessed this is the most charming of them all, and its craftsmanship and splendour are not to be found in any of the ancient or modern monuments.

ترجمہ: ’’یہ اِنسانی آنکھ کے سامنے سے گزرنے والے تمام مناظر میں سے سب سے زیادہ دِلکش منظر ہے اور اس کی مہارت اور عظمت قدیم یا جدید عمارات میں کہیں نہیں ملتی۔‘‘

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے مسجدِ قرطبہ پر بالِ جبریل میں ایک طوِیل نظم لکھی، جو اندلس میں مسلمانوں کے عروج وزوال میں مخفی اَسرار سے پردہ سرہٹاتی نظر آتی ہے اور دورِحاضر کے مسلمان کو ایک عظیم اِنقلاب کا درس دیتی ہے۔ اُس طویل نظم میں مسجدِ قرطبہ کی تعریف میں کہے گئے چند اَشعار یوں ہیں:

تیرا جلال و جمال، مردِ خدا کی دلیل
وہ بھی جلیل و جمیل، تو بھی جلیل و جمیل
تیری بنا پائیدار، تیرے ستوں بے شمار

شام کے صحرا میں ہو جیسے ہجومِ نخیل
تیرے دَر و بام پر وادیٔ اَیمن کا نور
تیرا منارِ بلند جلوہ گہِ جبرئیل
مٹ نہیں سکتا کبھی مردِ مسلماں کہ ہے
اُس کی اَذانوں سے فاش سرِ کلیم و خلیل

قصرُ الزہراء

قرطبہ سے ۴۰۰ میل مغرب کی طرف ’عبدالرحمن سوم‘ نے ایک محل ’قصر الزہراء‘ تعمیر کروایا، جواُس کی ایک بیوی ’الزہراء‘ کے نام سے موسوم تھا۔ بعد اَزاں اُس محل کے اِرد گرد ’مدینۃُ الزھراء‘ نامی شہر آباد ہوگیا۔ قصر الزہراء ایک ایسی عظیم الشان عمارت تھی جس کا مقابلہ عظیم تاریخی عمارات میں کسی کے ساتھ بھی کیا جاسکتا ہے۔ اُس کے درو دیوار منقّش تھے اور اُن میں جگہ کی مناسبت سے تصاویر بھی کندہ کی گئی تھیں جو اندلس میں اِسلامی فن مصوّری کی عظمت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ ’قصر الزہراء‘ کی تعمیر کے لیے بغداد اور قسطنطنیہ جیسے دُور دراز ممالک سے انجینئروں اور کاریگروں کو بلایا گیا تھا، جنہوں نے اپنی کمالِ صناعی سے عمارت کو وہ حسنِ دوام بخشا کہ وہ رشکِ خلائق ہوگئی۔ پانی کی بہم رسانی کے لیے بُعدِ مسافت پر واقع پہاڑوں سے نہر کاٹ کر لائی گئی تھی جس سے نہ صرف محل کے حوض اور فوّاروں کو پانی میسر آتا بلکہ مقامی آبادی کے پینے کے لیے بھی کافی ہوتا۔ ’قصر الزہراء‘ کو ’دارالروضہ‘ کا نام بھی دیا گیا جو اندلس میں اِسلام کی تہذیبی روایات کا امین تھا۔(١) ’قصر الزہراء‘ کے دروازے پر عبدالرحمن سوم کی محبوب بیوی ’زہراء‘ کی تصویر نقش کی گئی، جس کے نام پر اُس کا نام ’قصر الزہراء‘ پڑ گیا۔(٢) یہ عجوبہ روزگار اِس قدر عظیم فن کا آئینہ دار تھا کہ ایک ترکی مؤرّخ ’ضیاء پاشا‘ بیان کرتا

(١) تاریخ ابن خلدون: ۴/ ١٧٢۔
(٢) دولۃ الاسلام فی الاندلس: ۴/ ۵١٠۔

ہے:

This palace is such a wonder of the world that a concept of the design of this type could not occur to any human being from the dawn of creation to this day and human intellect has through the ages failed to produce a parallel or even approaching it in beauty of design.

, Some Glittering Aspects of 'Dr. Mustafa Siba) (the Islamic Civilization

ترجمہ: ''یہ محل دُنیا کا ایک ایسا عجوبہ ہے کہ اُس کی ساخت کا تصوّر روزِ اوّل سے لے کر آج تک کسی اِنسان کے بس میں نہیں، اِنسانی شعور کئی اَدوار سے اُس جیسی یا جمالیاتی ساخت میں اُس کے قریب قریب بھی کوئی مثال پیدا کرنے سے قاصر رہا ہے''۔

'دریائے وادئ کبیر'(Guadalimar River) کے کنارے تعمیر ہونے والے 'قصر الزہراء' کو صحیح معنوں میں سپین Spain کا تاج کہا جاسکتا ہے۔ اُس محل میں کل 400 کمرے تعمیر کیے گئے۔ تعمیر میں اِستعمال ہونے والا بہت سا تعمیراتی سامان جس میں سنہری ستون اور دیگر سامانِ آرائش شامل ہے، 'قسطنطنیہ' سے منگوایا گیا تھا۔ سنگِ مرمر کا بڑا ذخیرہ ہمسایہ مسلمان افریقی ریاست 'مراکش' سے درآمد کیا گیا تھا۔ بعض تاریخی رِوایات کے مطابق اُس محل کی تعمیر 10,000 مزدوروں کی محنت سے صرف 4 سال کی مختصر مدّت میں تکمیل پزیر ہوئی۔ 'قصر الزہراء' صنعتِ تعمیر کا عظیم شاہکار تھا جس کا گنبد 4,316 سنہری ستونوں پر قائم تھا۔ محل میں صاف شفاف پانی کی چھوٹی چھوٹی نہریں ہر طرف رواں رہتیں جو اُس کے حسن کو اور بھی دوچند کیے دیتیں، اُس کی دیواروں پر نقّاشی کے نمونوں میں سنگِ

مرمر، سونے اور جواہرات کا عام اِستعمال کیا گیا تھا۔(۱)

الحمراء

'مسجدِ قرطبہ' کے علاوہ دُوسری اہم عمارت جو سپین Spain میں اِسلامی فن تعمیر کے منہ بولتے ثبوت کے طور پر زندہ سلامت کھڑی ہے، وہ 'الحمراء' ہے، جو 2,200 مربع میٹر رقبے پر محیط ہے، اگرچہ اُس کی تعمیر 'مسجدِ قرطبہ' کی طرح مضبوط بنیادوں پر نہیں ہے؛ مگر اُس کے باوُجود صدیاں گزرنے کے بعد بھی عمارت کا ابھی تک سلامت رہنا ایک معجزے سے کم نہیں۔

'الحمراء' دُنیا کی یادگار عمارات میں سے ایک ہے جسے صدیوں قبل نہایت نفاست کے ساتھ تعمیر کیا گیا تھا۔ وہ اپنی فصیل اور برجوں کی وجہ سے ایک قلعہ دِکھائی دیتا ہے، اُس کی تعمیر غرناطہ کی سرخ مٹی سے ایک پہاڑی کی ڈھلان پر کی گئی تھی اور اُس میں جابجا حوض اور فوّارے نصب ہیں۔ پانی کے بہاؤ کے لیے قدرتی ڈھلان سے مدد لی گئی ہے جس کی وجہ سے اِضافی توانائی کی بہم رسانی ضروری نہیں رہی۔ محل کا ہر حصہ مرکزی حصے کی سی دِلکشی کا حامل ہے اور دیکھنے والا اُسی حصہ کو اُس کا مرکز سمجھنے لگتا ہے، اُس کے ہر حصے میں آیات، اَحادیث اور عربی اَشعار و عبارات کندہ ہیں، جو اِسلامی فن خطاطی (calligraphy) کے بہترین شہ پارے ہیں۔

'الحمراء' کے پہلو میں بعد کے اَدوار میں ایک مسیحی بادشاہ نے بھی محل بنوایا تھا جو پختہ پتھروں سے بنا ہے۔ اُس محل کے تضاد کے ساتھ الحمراء کا حسن اور بھی دوبالا ہو جاتا ہے۔ پورے محل میں پتھر کی تراشی ہوئی جالیاں اور مختلف انداز کی محرابیں اُس کے حسن کو چار چاند لگائے ہوئے ہیں، یہاں مصوّری اور سنگ تراشی کے بھی چند بہترین نمونے موجود ہیں، جن

---

(۱) آزاد دائرۃ المعارف، ویکیپیڈیا۔

میں اُس دَور کے لوگوں کا طرزِ بود و باش منقّش کیا گیا ہے۔

اِسلامی اسپین کا طرزِ تعمیر مجموعی طور پر تمام دُنیائے اِسلام میں منفرد حیثیت کا حامل ہے۔ مساجد کے مینار مربع شکل کے ہیں جو عالم اِسلام میں ایک انوکھا طرزِ تعمیر تھا۔ اُس دَور کی عمارتوں پر جابجا خطاطی کے بے مثل نمونے ثبت ہوتے تھے۔ عمارات عربی عبارتوں اور آیاتِ قرآنیہ کی دِیدہ زیب خطاطی سے مزین ہوتیں۔ اندلس کا فن خطاطی (calligraphy) اپنے کمال کی بنا پر یورپ کے بہت سے ملکوں میں فروغ پزیر ہوا، چنانچہ اکثر مسیحی سیدنا عیسیٰ علیہ السلام اور سیدہ مریم علیہا السلام کی تصاوِیر اور مجسموں کی تزئین و آرائش کے لیے کلمۂ طیبہ کی نقاشی بھی کرواتے، اگرچہ وہ یہ نہ جانتے تھے کہ یہ کیا الفاظ نقش کیے جا رہے ہیں۔

اَغیار کا اِعترافِ عظمت

بعثتِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زیر اثر عربوں میں شروع ہونے والی علمی و ثقافتی تحریک نے عالم اِسلام میں علم و تحقیق اور تہذیب و ثقافت کو خوب فروغ دیا، جس کے نمایاں اثرات سپین Spain کی اِسلامی حکومت کے دَور میں بھی دیکھے گئے ہیں۔

Sir Thomas W. Arnold نے یوں بیان کیا ہے:

دسویں صدی عیسوی میں ہی قرطبہ یورپ کا مہذب ترین اور متمدّن شہر بن چکا تھا۔ یہ دُنیا کے قابلِ تحسین اور حیران کن عجائبات میں شامل تھا، یہ ریاست ہائے بلقان کا ''وِینس'' کہلاتا تھا۔ شمال سے جانے والے سیاحوں کے علم میں جب یہ بات آتی کہ اُس شہر میں 70 لائبریریاں اور 900 حمام ہیں تو وہ خوف اور حیرت کے ملے جلے جذبات کا اِظہار کرتے۔ لیون (Leon)، ناقار (Navarre) اور برشلونہ (Barcelona) کی ریاستوں کے حکمرانوں کو جب کبھی سرجن، ماہرِ تعمیرات (Architect)، ماہرِ ملبوسات (Dress maker) یا کسی عظیم موسیقار (Singer) کی خدمات کی ضرورت ہوتی تو اُن کی نظریں قرطبہ کی طرف ہی اُٹھتی تھیں اور وہ اُنہیں یہیں سے منگواتے تھے۔ (The legacy of

(Islam)(۱)

غرناطہ سے مسلمانوں کا تعلق

مسلم اسپین اسلامی تاریخ کا ایک روشن باب تھا جو کہ اب عبرتناک خواب کی حیثیت اختیار کر چکا ہے، سپین کی مہم کے دوران جبل الطارق نامی جزیرے (موجودہ جبرالٹر) پر پہنچنے کے بعد جب طارق بن زیاد نے اپنے لشکر کو کشتیاں جلانے کا حکم دیا تھا، تو اس کے وہم گمان میں بھی نہ ہوگا کہ تقریباً آٹھ سو سال بعد مسلمانوں کی واپسی ایسی حالت میں ہوگی کہ 8 صدیوں تک اسپین پر حکمرانی کرنے کے بعد مسلم حکمران نامردوں کی طرح آنسو بہاتا ہوا اقتدار کی کنجیاں عیسائی حکمرانوں کے حوالے کر دے گا۔

ساپین کے آخری مسلم حکمران ابوعبداللہ جس نے آج سے 527 سال قبل 2 جنوری 1492 کو غرناطہ کا اقتدار ملکہ ازابیلا اور شاہ فرڈینینڈ کے حوالے کر کے اسپین میں صدیوں پر محیط عظیم الشان مسلم اقتدار کے خاتمے پر مہر ثبت کر دی تھی، مسلمانوں کی گرفت کمزور ہونے کے بعد اسپین متعدد چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم ہو چکا تھا جن میں سے غرناطہ واحد ریاست بچی تھی جس پر مسلمانوں کا اقتدار تھا، باقی تمام ریاستیں عیسائی حکمرانوں کے قبضے میں جا چکی تھیں۔

اگر ہم سقوط بغداد، سقوط ڈھاکا، جنگ پلاسی، میسور اور خلافت عثمانیہ کے زوال سے لیکر سقوط غرناطہ تک کا جائزہ لیں تو ہمیں مسلمانوں کی شکست اور زوال میں غیروں کی اہلیت اور ہمت سے زیادہ اپنوں کی نااہلی، غداری اور مال و دولت اور اقتدار کی ہوس کارفرما نظر آتی ہے، سقوط غرناطہ کی بھی بنیادی وجہ مسلمانوں کی باہمی رنجش اور اقتدار کا لالچ تھی، باہمی لڑائیوں سے مسلمان بقیہ اسپین تو کھو ہی چکے تھے، غرناطہ کا بھی دفاع نہ کر سکے اور تاریخ میں ایسے فنا

(۱) الکامل لابن اثیر: ۱۷۶/۴، تاریخ طبری: ۱۱/۴، خلافت اندلس، نواب ذالقدیر جنگ بہادر: ۷۶

ہوئے کہ صدیوں بعد بھی اسپین کے درو دیوار ان کی بربادی اور زوال پر ماتم کناں ہیں۔

سقوط غرناطہ کے 100 سال کے اندر عیسائی حکمرانوں کے ظلم وستم کے باعث لاکھوں مسلمان ہجرت کر کے مراکش اور شمالی افریقہ کے دیگر ممالک میں آباد ہو گئے جو آج بھی وہاں مہاجر کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ لاکھوں مسلمانوں کا قتل عام ہوا اور بیشمار اہل ایمان عیسائی ظلم وستم کی تاب نہ لا کر عیسائی بن گئے۔

آج بھی ایسے لوگ ملتے ہیں جو عملاً تو عیسائی ہیں، لیکن ان کے ناموں میں عربی لہجے کے نام بھی شامل ہیں جو ان کے آبا کے مسلمان ہونے کا پتہ دیتے ہیں، اور وہ لوگ اس سے انکار بھی نہیں کرتے، جب کہ ایسے لوگ بھی ہیں جو اسلام پر باقاعدگی سے عمل پیرا ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ایسے لوگوں میں دونوں طرح کے لوگ ہیں، ایک تو وہ جو عرب مسلمانوں کی نسلوں سے ہیں، اور دوسرے وہ جو یہاں کے مقامی ہسپانوی باشندوں کی اولادیں ہیں جن کے اجداد صدیوں قبل مسلمان ہو گئے تھے۔

اسپین پر مسلمانوں کی حکمرانی کے ادوار میں یورپ جہالت کے اندھیروں میں گم تھا، جب کہ اسپین میں علم وحکمت، زرعی، صنعتی، معاشی ترقی اور خوشحالی کا دور دورہ تھا۔ اور پورے یورپ ہی نہیں دنیا بھر سے طالبان علم یہاں فیض یاب ہونے آیا کرتے تھے، مؤرخین تسلیم کرتے ہیں کہ اسپین کو جو عروج مسلم عہد میں حاصل ہوا، وہ دوبارہ اسے نصیب نہ ہو سکا، مسلمانوں کے زوال کے کئی سو سال بعد بھی ان شخصیات کی تدوین کردہ کتابیں یورپی زبانوں میں ترجمہ ہوتی رہیں اور یورپ کی معروف جامعات میں پڑھائی جاتی رہیں، بقول اقبال:

مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آباء کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارہ

مسلمان چاہے کتنے ہی بے عمل یا مغربی تہذیب کے دلدادہ کیوں نہ ہو جائیں، اس

عروج کو پانے کی کسک ان کے دل میں آج بھی کروٹیں بدلتی ہے جس پر ان کے اجداد صدیوں تک موجود تھے، اس سرزمین سے وابستہ مسلمانوں کی تقریباً آٹھ صدیوں کی تاریخ ہے جو صرف سلطنت وخلافت کی تاریخ نہیں، بلکہ تہذیب وثقافت اورعلوم وفنون کی درخشاں مثال ہے۔

ہسپانیہ تو خون مسلماں کا امین ہے
مانند حرم پاک ہے تو میری نظر میں

یہ بات طے شدہ ہے کہ جب بھی مسلمانوں نے کتاب اللہ کا راستہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو چھوڑا وہ باہمی منافرت، مال و دولت کی لالچ اور ہوس اقتدار کا شکار ہو کر ذلیل وخوار ہو گئے، میں یہ نہیں کہہ رہا کہ ہمیں دوبارہ اسپین کو حاصل کرنے کی جدوجہد کرنی چاہیے، اصل بات تو یہ ہے کہ ہم انہی اعلیٰ اوصاف کو اپنائیں اور حکمت کو اپنی گمشدہ میراث سمجھتے ہوئے حاصل کریں، جس کی بنیاد پر ہمارے آبا نے دنیا پر ہی نہیں، دنیا والوں کے دلوں پر بھی حکمرانی کی تھی۔

سقوط غرناطہ: مسلم تاریخ کا ایک اور نوحہ

اسپین میں آخری مسلم امارت غرناطہ کے حکمران ابو عبداللہ نے تاج قشتالہ اور تاج اراغون کے مسیحی حکمرانوں ملکہ آئزابیلا اور شاہ فرڈیننڈ کے سامنے ہتھیار ڈال دیے اور اس طرح اسپین میں صدیوں پر محیط مسلم اقتدار کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو گیا۔ معاہدے کے تحت مسلمانوں کو مکمل مذہبی آزادی کی یقین دہانی کرائی گئی لیکن مسیحی حکمران زیادہ عرصے اپنے وعدے پر قائم نہ رہے اور یہودیوں اور مسلمانوں کو اسپین سے بے دخل کر دیا گیا۔ مسلمانوں کو جبرا مسیحی بنایا گیا جنہوں نے اس سے انکار کیا انہیں جلاوطن کر دیا گیا۔ سقوطِ غرناطہ سے قبل پے درپے واقعات وحوادث اور آخری حکمران ابو عبداللہ کا شرمناک کردار ترمیم" جس چیز کی حفاظت تم مردوں کی طرح نہیں کرسکے، اس کے چھن جانے پر عورتوں کی طرح آنسو

بہانے سے کیا فائدہ۔" یہ وہ تاریخی الفاظ ہیں جو مسلم اسپین (اندلس) کے آخری حکمراں ابو عبداللہ بن مولائے ابوالحسن کی والدہ نے اُسے اُس وقت کہے جب وہ غرناطہ کی چابیاں مسیحی حکمرانوں کے حوالے کر کے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے غرناطہ سے جلاوطن ہو رہا تھا۔ اس نے جب آخری نگاہ اپنے آباؤ اجداد کے ورثے پر ڈالی تو اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ اس مقام پر جہاں ابوعبداللہ کی آہ نکلی مسیحیوں نے مسلمانوں کی شکست کی علامت کے طور پر محفوظ کر لیا اور آج اسے مور کی آخری آہ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ خیال رہے کہ یورپی تاریخ داں اندلس کے مسلمانوں کے لیے "مور" Moors کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ ابوعبداللہ، اندلس کی آخری مسلم ریاست غرناطہ کا وہ بدبخت حکمران تھا جس نے عین اس وقت اپنے والد ابوالحسن اور چچا محمد بن سعد الزاغل کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا جب وہ اندلس میں مسیحیوں کے مشترکہ لشکر سے اندلس میں مسلمانوں کی بقا کی آخری لڑائی لڑ رہے تھے۔

سقوط اندلس کا پس منظر

1469ء کے اندلس کے سیاسی منظر نامے پر ایک نگاہ ڈالتے ہوئے اس داستان کے آخری باب کی طرف چلتے ہیں جس کا آغاز تقریباً آٹھ سو سال قبل جبل طارق یا جبرالٹر کے ساحل پر طارق بن زیاد نے مسیحی گاتھ شہنشاہ راڈرک کو عبرتناک شکست دے کر کیا تھا۔ موسیٰ بن نصیر اور طارق بن زیاد نے جلد ہی اسپین سے مسیحیوں کی حکومت کا خاتمہ کر دیا اور اسی طرح اسپین، دمشق کی خلافت کے زیر نگیں آ گیا۔ دمشق کے انقلاب کے بعد اسلامی خلافت بغداد منتقل ہو گئی اور اندلس کی حکمرانی اموی شہزادے عبدالرحمن الداخل کو مل گئی۔ وقت گزرتا گیا اور اندلس کی حکومتیں بدلتی رہیں اور مسلمان اندلس میں مضبوط اور مستحکم ہوتے چلے گئے۔ آہستہ آہستہ اندلس عالم سلام کا علم و ہنر کا مرکز بن گیا۔ دورِ عروج میں اندلس نے ابن بیطار، ابن رشد، ابن باجا، الفارابی۔ ابنِ حزم، اسحق موصلی، اور الخطیب رحمہم اللہ جیسے ہزاروں علما اور فضلاء پیدا کیے۔ پھر وقت نے پلٹا کھایا اور اندلس کے مسلمانوں کا زوال شروع ہو گیا، پھر قدرت

نے یوسف بن تاشفین کی صورت میں اندلس کے مسلمانوں کو سنبھلنے کا بہترین موقع فراہم کیا مگر ان کے نصیب میں زوال لکھ دیا گیا تھا۔ الداخل کی عظیم سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہونا شروع ہو گئی۔ سرقسطہ، قشطالیہ، اشبیلہ اور قرطبہ جیسے عظیم علم و ہنر کے مراکز مسلمانوں کے ہاتھ سے نکلنے شروع ہو گئے۔ اراغون اور قشطالیہ کی مضبوط مسیحی ریاستیں وجود میں آ گئیں۔ اراغون کی حکمران ازابیلا نامی ملکہ تھی جو تاریخ میں ملکہ ازابیلا کے نام سے مشہور ہوئی۔ یہ وہی ملکہ ہے جس کی تحریک پر کولمبس نے اپنی بحری مہم شروع کی تھی۔ دوسری طرف قسطلہ کا شاہ فرنڈیڈ (Ferdinand) نامی متعصب مسیحی شخص تھا۔ یہ دونوں حکمراں شدت پسند اور مسلمان دشمن تھے۔ یہ دونوں اندلس سے مکمل طور پر مسلمانوں کا خاتمہ چاہتے تھے، اسی مشترکہ مفاد کے تحت ان دونوں حکمرانوں نے 1469ء میں اراغون اور قسطلہ کی ریاستوں کو باہم مدغم کر لیا اور آپس میں شادی کر لی۔ 1469ء تک اندلس کے مسلمان غرناطہ کی ریاست تک محدود ہو کر رہ گئے تھے۔ سارا اندلس ان کے ہاتھ سے نکل چکا تھا، مسلمان اندلس بھر سے سمٹ کر غرناطہ میں اپنی بقاء کی لڑائی میں مصروف تھے۔ غرناطہ کا موجودہ حکمران ایک نڈر اور قابل شخص مولائے ابوالحسن تھا۔ اہل اندلس کو طویل عرصے بعد ایک لائق حکمران نصیب ہوا تھا۔ اہل اندلس اسے اپنا نجات دہندہ تعبیر کر رہے تھے۔ سلطان ابوالحسن سے مسلمانوں کی توقعات کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ سلطان کا بھائی محمد بن سعد الزاغل (جو الزاغل کے نام سے مشہور ہے) مالقہ کے علاقے کا حکمران تھا اور جب اس نے یہ محسوس کیا کہ مسیحی ان دونوں بھائیوں میں پھوٹ ڈلوانا چاہتے ہیں تو الزاغل فوراً غرناطہ پہنچا اور اس نے مالقہ کے تخت سے دست بردار ہوتے ہوئے ابوالحسن کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ اسی طرح ابوالحسن طاقتور ہو گیا اور جب فرنڈیڈ نے ابوالحسن سے خراج طلب کیا تو اس نے وہ تاریخی جواب دیا جو ہمیشہ کے لیے تاریخ میں محفوظ ہو گیا۔ ابوالحسن نے کہا ''غرناطہ کے ٹکسال میں مسیحیوں کو دینے کے لیے سکّوں کی بجائے اب فولاد کی وہ تلواریں تیار ہوتی ہیں جو ان کی گردنیں اتار سکیں۔'' یہ جواب سن کر

فرنڈیڈاورازابیلامبہوت رہ گئے،اس وقت قسطلہ اوراراغون کی باہمی ریاست کارقبہ سوالاکھ مربع میل کے لگ بھگ تھا،جبکہ غرناطہ کی ریاست سمٹ سمٹا کرصرف چار ہزارمربع میل رہ گئی تھی،یہ مختصر رقبہ بھی مسیحیوں کی نگاہ میں کھٹک رہا تھا وہ اندلس سے مسلمانوں کامکمل خاتمہ چاہتے تھے،انہوں نے ابوالحسن سے فیصلہ کن جنگ کاارادہ کیااور خاموشی سے جنگی تیاریاں تیز کر دیں،ابوالحسن بھی غافل نہیں تھا،آخرکارغرناطہ کے سرحدی مقام لوشہ میں سلطان ابوالحسن اورفرنڈیڈ(Ferdinand) کاٹکراؤ ہوگیا،اہل غرناطہ قوت اورعدد دونوں اعتبارسے مسیحیوں کی مشترکہ افواج کے مقابلے پرکمزور تھے،مگران کوعلم تھاکے اندلس میں یہ ان کے پاس یہی آخری خطہ اراضی رہ گیا ہے ،اس کے دفاع کے لیے اہل غرناطہ نے سر دھڑ کی بازی لگادی،آخرکارلوشہ کے میدان میں طارق بن زیاد کی یاد تازہ کرتے ہوئے ابوالحسن نے فرنیڈنڈکوشکست فاش سے دو چارکیا،ابھی ابوالحسن لوشہ کے میدان میں ہی تھا کہ غرناطہ میں اس کے ولی عہدابوعبداللہ نے بغاوت کردی اورغرناطہ کے تخت کامالک بن بیٹھا،مسیحیوں سے جہادمیں مشغول مسلمانوں کے لیے یہ خطرناک اطلاع تھی،لوشہ کی فتح کے بعدوہ ابوالحسن کی سربراہی میں اندلس میں مسلمانوں کی نشاط ثانیہ کا خواب دیکھ رہے تھے،ابوعبداللہ کی بغاوت نے ان کے ہوش اڑادئے اورسلطان ابوالحسن کومجبوراًلوشہ چھوڑ کرمالقہ میں پناہ لینی پڑی یعنی اس نازک دورمیں جب اہل اندلس اپنے بقاء کی جنگ میں مصروف تھے،ابو عبداللہ کی اقتدارکی ہوس نےغرناطہ کی سلطنت کو دوحصوں میں تقسیم کردیا،بجائے باپ کے ہاتھ مضبوط کرنے کے ابوعبداللہ اس کی سلطنت کے درپے ہوگیا،دوسری طرف مسلمانوں کو منقسم دیکھ کرشکست خورہ فرنڈیڈکوحوصلہ مل گیااوراس نے مالقہ پرحملہ کردیا،مالقہ میں ابوالحسن اورفرنڈیڈکوبرسرپیکاردیکھ کرابوعبداللہ نے بےغیرتی کی انتہا کرتے ہوئے ابوالحسن پرپشت سے حملہ کردیا،ابوالحسن تجربہ کارسپہ سالارتھا،اس نے ایک طرف تومسیحیوں کاڈٹ کرمقابلہ کیا دوسری طرف ابوعبداللہ کوواپس غرناطہ جانے پرمجبورکردیا،اسی دوران ابوعبداللہ اورفرنڈیڈ

کالوشنیہ کے مقام پر آمنا سامنا ہوگیا، ناتجربہ کار ابوعبداللہ نے شکست کھائی اور گرفتار ہوگیا، ابو عبداللہ کے فرنڈیڈ کی قید میں جانے کے بعد غرناطہ کا تخت خالی ہوگیا، بیٹے کی بغاوت نے ابو الحسن کو بیمار کر دیا تھا، اس پر زبردست فالج کا حملہ ہوگیا تھا، اس نے ریاست سے کنارہ کشی اختیار کرتے ہوئے اپنے بھائی الزاغل کو غرناطہ کا تخت سنبھالنے اور فرنیڈنڈ کا مقابلہ کرنے کا حکم دیا، الزاغل غرناطہ پہنچا اور اس نے مسلم افواج کی ازسرِنو تنظیم شروع کر دی، الزاغل بلاشبہ ابوالحسن کا حقیقی جانشین تھا اور ممکن تھا کہ اپنی دلیری اور صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے وہ اندلس کے مسلمانوں کا نجات دہندہ بن جاتا مگر اس موقع پر ابوعبداللہ کا ایک دفعہ پھر مکروہ کردار سامنے آتا ہے، دوران قید فرنیڈنڈ نے ابوعبداللہ کی خصلت پہچان لی، وہ سمجھ گیا کہ ابو عبداللہ کو مسلمانوں سے زیادہ اپنے اقتدار کی خواہش ہے، اب فرنیڈنڈ نے ابوعبداللہ کو الزاغل اور ابوالحسن کے خلاف استعمال کرنے کا منصوبہ بنایا، اس نے ابوعبداللہ کو یقین دلایا کہ وہ اسے غرناطہ کا وارث تسلیم کرتا ہے اور یہ کہ فرنیڈنڈ غرناطہ کا تخت حاصل کرنے میں ابوعبداللہ کی مدد کرے گا، ابوعبداللہ سے ساز باز کرنے کے بعد فرنڈیڈ نے اسے اپنی قید سے رخصت کر دیا، ابوعبداللہ سیدھا مالقہ پہنچا جہاں الزاغل کا قبضہ تھا اہل مالقہ کو یقین دہانی کرائی کہ فرنڈیڈ اس کے ساتھ ہے اور اگر اہل مالقہ، ابوعبداللہ کا ساتھ دیں تو وہ ان کی مسیحیوں سے صلح کروا سکتا ہے، جنگ و جدل سے گھبرائے ہوئے مسلمان اس کی باتوں میں آگئے اور انہوں نے مالقہ پر ابوعبداللہ کی بالا دستی تسلیم کرلی، اب ابوعبداللہ نے الزاغل کو پیغام بھیجا کہ اگر وہ لوشہ کا قلعہ اس کے حوالے کر دے تو ان دونوں کی صلح ہو سکتی ہے، اس طرح مسیحیوں کی مشترکہ افواج کا مقابلہ دونوں مل کر کریں گے، لوشہ کا قلعہ دراصل غرناطہ کا دفاعی مورچہ تھا فرنڈیڈ کئی سالوں سے لوشہ پر قبضہ کرنے کے چکر میں تھا اس طرح اُس کا راستہ غرناطہ تک آسان ہو جاتا مگر اہل لوشہ نے اپنے علاقے کا دفاع بڑی بے جگری سے کیا ہوا، لوشہ کی دفاعی اہمیت کے باوجود مسلمانوں میں اتحاد کے خواہش مند الزاغل نے ابوعبداللہ کا کہا

مان لیا اور لوشہ کا قلعہ اس کے حوالے کر دیا، لوشہ پر قبضہ فرنڈیڈ کے منصوبے کا حصہ تھا، اب ابو عبداللہ مالقہ اور لوشہ دونوں پر قابض تھا، اس نے فوراً فرنیڈنڈ کو لوشہ آنے کی دعوت دے ڈالی، مسلمان حیران و پریشان ہو گئے کہ جس لوشہ کی حفاظت کے لیے انہوں نے سالوں سے سر دھڑ کی بازی لگائی ہوئی ہے وہ بغیر کسی خون خرابے کے فرنڈیڈ کو مل گیا، ادھر مالقہ میں جب مسلمانوں نے یہ صورت حال دیکھی تو انہوں نے ابوعبداللہ کے خلاف بغاوت کر دی اس پر فرنڈیڈ نے مالقہ کا محاصرہ کر لیا، اہل مالقہ کی مدد کے لیے الزاغل غرناطہ سے روانہ ہو گیا، غرناطہ خالی دیکھ کر ابوعبداللہ کو سنہری موقع مل گیا، وہ فوراً غرناطہ پہنچ گیا اور تخت غرناطہ پر قبضہ کر لیا، یہاں سے المناک داستان کا وہ باب شروع ہوتا ہے جس کا انجام مسلمانانِ اندلس کی مکمل بربادی پر ختم ہوا، وہ لوگ جو آٹھ سو سال قبل اندلس میں روشنی کا پیغام لے کر آئے تھے اور روشنی کی مانند پورے اندلس میں پھیل گئے تھے وہ راستہ بھول گئے، افراد راستہ بھول جائیں تو گھرانے تباہ ہو جاتے ہیں مگر جب قومیں راستہ فراموش کر دیں تو سلطنتیں برباد ہو جاتی ہیں، اندلس کے مسلمانوں کے ساتھ بھی یہی ہوا، غرناطہ پر ابوعبداللہ کا قبضہ بھی مسلمانان اندلس کے لیے بربادی کا پیش خیمہ ثابت ہوا، یہ منظر نامہ دیکھتے ہوئے مالقہ والوں نے فرنیڈنڈ سے صلح کر لی، اس طرح لوشہ اور مالقہ پر فرنڈیڈ کا قبضہ مکمل ہو گیا، ابوعبداللہ کو بیٹا کہنے اور مسلمانوں کی خیر خواہی کا دم بھرنے والا فرنڈیڈ اب اپنے اصل روپ میں آگیا، اس نے ابوعبداللہ کو پیغام بھجوایا کہ اب غرناطہ کی چابیاں مسیحیوں کے حوالے کر دی جائیں، یہ پیغام ملتے ہی ابوعبداللہ کے پیروں تلے زمین نکل گئی۔ اپنوں سے غداری کرنے کا انجام اسے نظر آنے لگا اس نے اہل غرناطہ سے مشورہ کیا اہل غرناطہ موسیٰ اور طارق کے فرزند تھے، انہوں نے آخری دم تک جنگ لڑنے کا ارادہ ظاہر کیا، اہل غرناطہ اور فرنڈیڈ میں سخت لڑائی لڑی گئی، مسلمانوں کو علم تھا کہ اندلس میں اب غرناطہ ہی ان کی آخری امید ہے لہٰذا وہ جم کر لڑے اور انہوں نے مسیحیوں کو شکست سے دوچار کر دیا غرناطہ کے مضافات کے علاقے دوبارہ مسلمانوں کے قبضے

میں آگئے، ان میں البشرات نامی پہاڑی علاقہ بھی شامل تھا، قدرت قوموں کو سنبھلنے کے لیے کئی مواقع دیتی ہے، یوسف بن تاشفین کی آمد سے لے کر ابوالحسن کی تخت نشینی تک اہل اندلس کو سنبھلنے کے کئی مواقع ملے، مگر اقتدار کی خواہش اور ہوس میں اپنوں سے غداری نے اہل اندلس کو برباد کر کے چھوڑا، اس نازک موقع پر جب مسیحی اندلس میں مسلمانوں کو آخری پناہ گاہ کے سامنے مورچہ زن تھے اس وقت بھی اہل اندلس کی آپس کی نااتفاقی ختم نہ ہوئی، اہل غرناطہ کی ابوعبداللہ کی سربراہی میں مسیحیوں کے خلاف کامیابیاں اس کے چچا الزاغل کو ایک آنکھ نہ بھائی، وہی محمد بن سعد الزاغل جو کچھ عرصہ قبل مسلمانوں کے اتحاد کی خاطر اپنے بھائی سلطان ابوالحسن کے حق میں اپنی سلطنت سے دستبردار ہو چکا تھا اس دفعہ اس نے شرمناک حرکت کی، الزاغل نے اہل غرناطہ کے خلاف فرنڈیڈ کے حق میں اپنی خدمات پیش کرتے ہوئے فرنڈیڈ کو ابوعبداللہ پر حملہ کرنے پر اکسایا، فرنیڈنڈ نے یہ سنہری موقع جانے نہ دیا اور ایک دفعہ پھر مسلمانوں کو آپس میں لڑوا دیا، اب الزاغل نے فرنیڈنڈ کی مدد کے ساتھ ابو عبداللہ پر حملے کرنے شروع کیے، غرناطہ کے مضافات کے تمام قلعے ایک ایک کر کے مسیحیوں کے قبضہ میں دوبارہ چلے گئے اور آخر کار اہل غرناطہ محصور ہو کر رہ گئے، غرناطہ کے تخت کا خواہش مند الزاغل کو فرنڈیڈ نے اس کی خدمات کا صلہ دیتے ہوئے اسے اسپین سے نکل جانے کا حکم دیا، الزاغل، فرنڈیڈ کا منہ دیکھتا رہ گیا اور آخر کار مراکش میں جلاوطن کر دیا گیا اور وہیں گم نامی کی موت مر گیا۔ غداروں کا انجام یہی ہوتا ہے۔

آٹھ سو سال قدیم ہسپانوی مسلم سلطنت کا خاتمہ

فرنڈیڈ اور ازابیلا نے فیصلہ کن معرکہ کی تیاریاں شروع کر دیں 1492ء کا سال آگیا اور اسی سال موسم گرما میں مسیحیوں کی مشترکہ افواج نے غرناطہ کا محاصرہ کر لیا، غرناطہ کے شمال میں پہاڑی سلسلہ تھے اور محاصرے کے دوران اہل غرناطہ کو مدد ملتی رہی، مگر سردیاں شروع ہوتے ہی پہاڑوں پر برف باری شروع ہوگئی اور غرناطہ کو کمک ملنا بند ہوگئی، شہر میں

اشیاءِ خور د نوش کی قلت ہوگئی، اہل غرناطہ اب بھی مسیحیوں پر فیصلہ کن حملہ کرنے پر آمادہ تھے غرناطہ کا سپہ سالار موسیٰ بن ابی غسانؒ افسانوی شہرت کا حامل کردار تھا، وہ آخری سپاہی تک لڑنا چاہتا تھا مگر ابوعبداللہ ذہنی طور پر شکست قبول کر چکا تھا، وہ اور اس کے اکثر امراء فرنڈیڈ سے صلح کا معاہدہ کرنا چاہتے تھے وہ سمجھتے تھے کہ اسی طرح وہ اپنے لیے زیادہ سے زیادہ مراعات حاصل کرسکیں گے، امراء سلطنت سازش میں مصروف ہو گئے، پس پردہ مسیحیوں سے رابطے قائم کرنے لگے ان سازشی عناصر کا سرغنہ وزیراعظم غرناطہ ابوالقاسمؒ تھا۔ فرنڈیڈ نے غرناطہ پر قبضے کی صورت میں اس کو غرناطہ کا اہم عہدہ دینے کا وعدہ کرلیا، ابوعبداللہ کی ذہنی شکست میں ابوالقاسم کا مرکزی کردار تھا، بلا آخر ابوعبداللہ نے ابوالقاسم کو خفیہ سفارتکاری کی اجازت دے دی، صلح کی شرائط طے کرلی گئیں، بظاہر ان شرائط میں مسلمانوں کے لیے ہر قسم کا تحفظ یقینی بتایا گیا تھا مگر بعد میں مسیحیوں نے اس پر کتنا عمل کیا وہ ایک علاحدہ باب ہے، معاہدے کے تحت ابوعبداللہ کو البشرات کے علاقے میں ایک جاگیر دے دی گئی، آخر کار وہ تاریخی دن آگیا جسے آج تک تاریخ اسلام کا طالب علم سیاہ دن سے تعبیر کرتا ہے، 2 جنوری 1492ء کو غرناطہ کی چابیاں ابوعبداللہ نے اپنے ہاتھوں سے فرنڈیڈ اور ازابیلا کو پیش کر دیں، پادری اعظم نے قصر الحمراء پر لہراتا صدیوں پرانا پرچم اسلامی اتار کر صلیب کو نصب کر دیا اور اس طرح سقوط غرناطہ کے ساتھ ساتھ اندلس میں مسلمانوں کا آٹھ سو سالہ حکمرانی کا سورج بھی غروب ہوگیا۔ سو سال کے اندر اندر مسیحیوں کے ظلم وستم کے باعث لاکھوں مسلمان ہجرت کر کے مراکش اور شمالی افریقہ میں آباد ہو گئے ان کے قبائل آج بھی وہاں مہاجر کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ لاکھوں مسلمانوں کا قتل عام ہوا اور بیشمار اہل ایمان مسیحی ظلم وستم کی تاب نہ لاکر مسیحی بن گئے۔ یوں ایک غدار اور بزدل حکمران ابوعبداللہ کی شامت اعمال کا نتیجہ اہل اندلس کو دیکھنا پڑا۔

آہ وہ کیسا دن تھا

آہ وہ کیسا دن تھا جب اندلس پر 800 سال تک زبردست حکمرانی کرنے والے مسلمانوں نے غرناطہ کی چابیاں انبیاء کے دشمنوں کو تھمائیں، وہ کیسا سمے تھا جب ہزاروں عزتیں یک لخت لٹیں، وہ کیسا لمحہ تھا جب صلیب کے ماننے والوں نے اپنی فتح کا اعلان کیا وہ کیسا درد تھا جو وہاں سے لٹ کر نکلنے والے مسلمانوں نے محسوس کیا، وہ کیسی اذیت تھی جب جبراً عیسائی بننے پر مجبور کیا گیا۔ وہ کیسا دن تھا جب مسجد قرطبہ کے اندر صلیبی گھوڑے باندھے گئے، اللہ! وہ کیسی گھڑی تھی جب قصر سلطانی میں شراب کے جام چلے جب علماء کی داڑھیاں نوچ ڈالی گئیں، جب بچے ماؤں سے چھین لے گئے، جب گھوڑے مسلمانوں کے بہتے خون پر پھسلنے لگے، جب علم وعرفان کی حامل لاکھوں کتب دریا برد کرنے سے پانی کا رنگ سیاہی مائل ہوگیا، جب غرناطہ کو غرق کردیا گیا، قرطبہ کو قتل کردی گیا اور اندلس کو لوٹ لیا گیا۔ ایک سرد آہ جو اپنے اندر سقوط غرناطہ و بغداد و ڈھاکہ سے کر سقوط کابل کا درسموئے ہوئے آخر اس ذلت و پستی کی وجہ کیا تھی ؟ کیا ہمارا رب بدل گیا تھا، ہمارا اسلام بدل گیا تھا،! کیوں زمین وآسمان ہمارے دشمن ہوئے، کیوں ہم اپنے گھروں سے نکالے گئے جلائے گئے بے آبروں کئے گئے،! وجہ یہ تھی کہ ہم نے اپنی ترجیحات بدل دیں،! وہ میدان عمل میں نکلنا، امت کی سطح پر سوچنا، اپنی صلاحیتوں کو مظلوموں کے حق کے لیے صرف کرنا، بندوں کو بندوں کی غلامی سے نکال کر رب العالمین کی غلامی میں دینے کے منہج کو چھوڑنا، اس دنیاوی عیش وعشرت میں پڑ کر سہل پسندی کو اپنا لینا، یہ وہ جرائم تھے جس نے ہمیں ثریا سے زمین پر دے مارا۔

فخر کا سلسلہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے شروع ہوتا، جناب ابوبکر، عمر، عثمان، علی معاویہ سے ہوتا ہوا خالد بن ولید سعد بن ابی وقاص حسن وحسین رضی اللہ عنہم اجمعین سے لے کر عمر بن عبد العزیز،

محمد بن قاسم، موسیٰ بن نصیر، طارق بن زیاد، عبدالرحمن اول وثانی، صلاح الدین ایوبی، یوسف بن تاشفین ؒ جیسے عظیم سپہ سالاروں اور حکمرانوں سے بھرا پڑا ہے۔ ایسے ایسے ہیرے کہ اگر میڈیکل کے میدان میں اترے تشخیص وجراحت میں دنیا کی قیادت کی، اگر فلکیات Astronomy وفزکس physics کے میدان میں آئے تو دنیا کے کو نئے اصول دے گئے، اگر جنگ کے میدان میں آئے تو جنگوں کے اصول ہی بدل کر رکھ دئے، اگر انٹیلی جنس کے میدان میں آئے تو دشمن کی آنکھوں کو اندھا اور کانوں کو بہرا کر کے رکھ دیا۔ دنیا کے سامنے عدل وانصاف ومعیشت ومعاشرت کا ایسا فلاحی ورفاہی ماڈل عملاً پیش کیا کہ دنیا آج تک اس کو دوبارہ نافذ کرنے کا خواب دیکھتی ہے، کیسا عظیم الشان ماضی تھا، کاش کہ ہم مغربی زاویہ نظر کی بجائے اپنوں کے نقش قدم پر چلتے اور اسی آنکھ سے سوچتے اور دماغ سے فیصلے کرتے جو اسلام ہمیں بصیرت عطا کرتا ہے تو زمانے میں اتنے رسوا نہ ہوتے نہ اندلس اجڑتا نہ بیت المقدس مقبوضہ کہلاتا، نہ کشمیر میں بیٹیاں سسکتیں، نہ عراق وشام میں بچے تڑپتے، نہ لیبیا کی اینٹ سے اینٹ بجتی، نہ افغانوں پر بموں کی آزمائش ہوتی۔ لیکن بحمداللہ آج ہم گرتے پڑتے دوبارہ کھڑے ہورہے ہیں، امت کے جوان غفلت سے بیدار ہورہے ہیں، اپنے اپنے میدان چن کر اس میں لوہا منوا رہے ہے، اب ہمارے جوان فرد کی سطح سے بلند ہو کر امت کی سطح پر کچھ کرنا چاہتے ہیں، ان کا عزم اس ظاہری دنیاوی چکا چوند سے بہت بلند تر ہے، اپنے اپنے شعبہ میں رہتے ہوئے اپنے اندر وہ صلاحیتیں پیدا کررہے ہیں، جو اس دنیا کی قیادت کرنے کیلئے ضروری ہیں پوری دنیا میں نوجوان نسل آگے آرہی ہے وہ اپنے سے پیشتر قیادت سے پوچھ رہے ہیں کہ انھوں نے اتنے وسائل ہوتے ہوئے ان کے لیے کیا کچھ کیا ہے؟ مسلمان نوجوان بھی قیادت سے سوال کناں ہے۔

نوجوان نسل اپنے مستقبل کے لیے سرتوڑ کوشش کررہے ہیں۔ وہ جہاں دنیاوی علوم سے مستفید ہورہے ہیں وہی پر دینی علوم پر بھی دسترس حاصل کرنے اور حتی الامکان عمل کرنے

کی شش بھی کررہے ہیں۔ بہرحال امت مسلمہ کا نوجوان اس وقت اپنے آپ کو منوانے کی سعی میں مصروف عمل ہے تاکہ اسلام کی نشاۃ ثانیہ میں وہ عملی طور پر شریک ہوسکے۔(مینارۂ نور ۱۰؍جنوری ۲۰۲۰ء)۔

عروج سے زوال کا سفر

سیدنا عیسیٰ علیہ السلام سے لے کر سرکار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت باسعادت تک تقریباً چھ سو سال کا عرصہ بنتا ہے، ان چھ صدیوں میں دنیا میں کوئی نبی، کوئی رسول نہیں آئے۔ یہ چھ بدقسمت صدیاں تھیں، خاص طور پر ولادت باسعادت سے پہلے کے دوسو برس انتہائی تاریک سال تھے، جہالت اپنے عروج کو پہنچ چکی تھی اور روشنی کی کوئی کرن نظر نہیں آتی تھی انسانیت اُس عظیم پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انقلاب کی راہ تک رہی تھی جن کے آنے کی نوید سیدنا مسیح علیہ السلام اور دیگر تمام انبیائے کرام دیتے آئے تھے، قافلے مسلسل خزاں میں سفر کرکر کے تھک گئے تھے اور اب بہاروں کو ڈھونڈ رہے تھے، ایسے وقت میں کہ انسانیت پر نزع کا عالم طاری تھا، دنیا اپنے تمام ساز وسامان کے ساتھ ہلاکت کے مہیب و عمیق غار میں گرنے والی تھی۔عین وقت پر اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو وحی ورسالت کے ساتھ مبعوث فرمایا، یہ اللہ بزرگ و برتر کا اس کائنات پر سب سے عظیم ترین احسان ہے، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تاریخ انسانی کا ایسا عظیم انقلاب برپا فرمایا کہ عقلیں عاجز ہوگئیں، ایسا ہمہ گیر انقلاب کہ سب کچھ ہی بدل گیا، عقائد، عبادات، رسومات، معاشرت، معاشیات، سیاست، اخلاقیات، ایسا حسین انقلاب انسانیت نے کبھی نہیں دیکھا تھا، ساتھ ہی عرب کے صحرا نشین، پیغمبر انقلاب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات کی بدولت دنیا کے حکمران بن گئے، ان کی آخرت بھی سنور گئی کہ دنیا میں بھی انہیں سیادت اور عروج نصیب ہوا، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دنیا سے پردہ فرمانے کے بعد خلافت راشدہ کا سنہری دور شروع ہوا، ایسا تابناک دور جو کسی خوبصورت خواب کی طرح مسلمانوں اور انسانوں کے اجتماعی شعور میں بس گیا، خلافت راشدہ کا دور محض مسلمانوں کا

ہی نہیں بل کہ پوری انسانیت کا Combined Nostalgia مشترکہ پرانی یادوں ہے۔

دکھلا دے اے تصور پھر وہ ہی صبح وشام تو
دوڑ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو

خلافت راشدہ کے بعد بنو امیہ کے دور کا آغاز ہوا، مسلم سلطنت وسیع ہوتی گئی، اسلام سندھ سے لے کر جزیرہ نما آئیبیریا (سپین) تک پھیل گیا، بنو امیہ کے بعد بنو عباس برسر اقتدار آئے وہ پانچ سو سال کے لگ بھگ مسند نشین رہے، آخر 656 ہجری میں ان کی سلطنت کا خاتمہ ہوا اور بڑے دردناک انداز میں ہوا۔

آسماں راحق بود اگر خوں ببارد زمیں
برزوال ملک معتصم امیر المومنیں

بنو عباس کے دور میں ہی چھوٹی چھوٹی خود مختار سلطنتیں پیدا ہو چکی تھیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان پر بھی زوال کی شب آتی گئی تھی، جب بنو عباس سریر آرائے سلطنت ہوئے تھے تو ادھر ہسپانیہ میں عباسی سلطنت کے متوازی بنو امیہ کی حکومت بن چکی تھی، وہ ہسپانیہ جس کو طارق بن زیاد نے فتح کیا تھا اور جہاں عبد الرحمن الداخل نے بنو امیہ کا اقتدار قائم کیا تھا، اس گلستان اندلس سے ۱۴۹۲ء میں مسلمان بے دخل ہو گئے، غرناطہ، اشبیلیہ، طلیطلہ سے ان سے چھن چکے تھے، قرطبہ کی مسجد اذانوں سے محروم ہو گئی تھی اور کوہ سیرا نویدا کی برف پوش چوٹیوں میں مسلمانوں کی عظمت کا سورج ڈوب گیا تھا۔

بنو عباس کے بعد سلطنت عثمانیہ دنیا کے نقشے پر ابھری، عثمانی سلاطین کے ہم عصر ایران کے صفوی اور ہند کے مغل تھے، سب سے پہلے صفویوں کا خاتمہ ہوا، اس کے بعد ۱۸۵۷ء میں مغل محروم تخت ہوئے اور بالآخر ۱۹۲۴ء میں خلافت عثمانیہ بھی ختم ہو گئی، تب سے مسلمان مغلوب ہیں اور دنیا کی غالب اقوام جاہلیت جدیدہ کی علم بردار اقوام مغرب ہیں۔

مسلمانوں کی تاریخ میں ایک دور ایسا گذرا ہے، جب دنیا کی سیاسی، اخلاقی، سماجی اور تہذیبی قیادت ان کے ہاتھ میں تھی، لیکن پھر حالات نے کچھ اس طرح کروٹ بدلی کہ یہ سب ان کے ہاتھ سے نکل گیا، عروج زوال سے آشنا ہوا، اور قیادت مسلمانوں کے گھر سے ایسی نکلی کہ پھر لوٹ کر نہیں آئی، اس دوران ایسا نہیں ہوا کہ مسلمان ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے رہے ہوں، بلکہ انہوں نے اس مسئلہ پر سوچا، غور کیا اور اس صورتحال کو بدلنے کی بہت سی کوششیں بھی کیوں مگر بدقسمتی سے یہ کوششیں نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوسکیں، مسلمانوں کے حالات میں کوئی جوہری تبدیلی نہیں آسکی، اور آج بھی دنیا کے حالات پر ہم اگر ایک نظر ڈالیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ علمی، سیاسی، فکری ہر اعتبار سے پست مقام ہمارے حصے میں آتا ہے، یہ صورتِ حال کیوں ہے؟ یہ ہمارے اعمال کا نتیجہ ہے؟ یا اس کا تعلق خارجی عوامل اور خارجی طبقات سے بھی ہے۔؟

عروج وزوال کے اسباب جاننا کیوں ضروری ہے؟

مفکر اسلام مولانا ابوالحسن علی ندوی صاحب کا ایک عظیم علمی کارنامہ اُن کی کتاب ''ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین'' ہے جو عالم عرب میں بہت مقبول ہوئی، مصنف ہی نے اِس کتاب کا اُردو زبان میں ترجمہ کیا ''انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر'' کے نام سے یہ اُردو میں طبع ہوئی مذکورہ کتاب میں، اُمت کے زوال سے مسلمانوں کے علاوہ باقی دنیا کو کیا عظیم نقصان ہوا؟ ہر شخص کو اس کتاب کا مطالعہ کرنا چاہئے، نیز یاد رکھیں کہ قوموں کے عروج و زوال کی حقیقی بنیادوں سے ناواقف رہنما اور رہبر قوم کو لاحق امراض کی صحیح تشخیص کر پاتے ہیں اور نہ مناسب علاج، نہ بھرپور غذا دے پاتے ہیں اور نہ وقت پر دوا۔ اس کے بعد قوم کمزور ہو جاتی ہے، اس کی بنیادیں کھوکھلی ہو جاتی ہیں، مگر کسی کو اس بات کا احساس نہیں ہوتا، ایک بیمار کے سامنے طبل جنگ بجایا جاتا ہے اور ایک ناتواں اور ناسمجھ بچے کو دنیا کی امامت پر آمادہ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، اس کے بعد جو کچھ ہوتا ہے، اسے الفاظ میں بیان

کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

جاہلیتِ جدیدہ کی حکمرانی

مسلمان اِس دنیا کے امام تھے، ایک ہزار سال سے زیادہ انہوں نے دنیا کی قیادت کی ان کے اسلاف شمشیر وسناں کی تعبیر تھے اور اخلاف طاؤس ورباب کی تصویر بن گئے، نتیجتاً زوال اُن کا مقدر ٹھہرا، عالمی قیادت ان کے ہاتھ سے نکل گئی، دنیا کا رخ دوبارہ ہمہ گیر خدا فراموشی اور جاہلیت (جدیدہ) کی طرف پھر گیا، دنیا کی قیادت کمزور، غافل خداشناسوں کے ہاتھ سے نکل کر طاقتور ناخداشناس اور مادہ پرست مغرب و یورپ کی طرف منتقل ہوگئی، دنیا میں جاہلیتِ جدیدہ کا، جس کے سر کردہ سرغنے ڈارون(Daron)، فرائیڈ(Fried)، میکڈوگل (Mac duggal)، ایڈلر(Adler)، مارکس(Marks)، میکاوَلی اور کیرک گارڈ ہیں، سیلاب آگیا جو اپنے ساتھ تمام اعلیٰ انسانی اقدار بہا کے لے گیا، پھر ایسے انسان وجود میں آئے کہ جنگل کے درندے انہیں دیکھ کر ہکا بکا رہ گئے، ڈارون نے نظریہ پیش کیا کہ انسان کی اصل جانور ہے، میکڈوگل کے بقول انسان اپنی جبلتوں کو پورا کرنے کے لیے جیتے ہیں، یہی ان کا واحد مقصدِ حیات ہے، فرائیڈ کے خیال میں انسانی زندگی کا مقصد جنسی خواہشات کی تکمیل ہے، چناں چہ انسان کو جنسی خواہشات کو پورا کرنے کے لیے لامحدود آزادی ہونی چاہیے، بصورت دیگر وہ نفسیاتی عوارض میں مبتلا ہو جائیں گے، ایڈلر نے سمجھایا کہ حبِ تفوق اور بالادستی کی آرزو انسان کے افعال کی محرک ہے، مارکس نے جتلایا کہ معاش انسانی زندگی کی اساس ہے چنانچہ زندگی کا مقصد زیادہ سے زیادہ نفع کا حصول Maximization of Profit ٹھہرا، میکاوَلی نے خیال آرائی کی کہ انسان کو اپنی قوم اور ملک کا غلام ہونا چاہیے، قومی اور ملکی زندگی ہی انسان کا محور ہے، ایک قوم اپنی سربلندی کے لیے جو وہ چاہتی ہے، کر گزرے چاہے وہ اخلاقی اعتبار سے کتنا ہی پست اور تباہ کن نتائج کا حامل ہو، کمزور قوموں کو جینے کا حق نہیں، قوموں کی سیاست میں مذہب و اخلاقیات بچکانہ باتیں ہیں، وجودی فلسفے

جس کا بانی کیرک گارڈ تھا، کے ہمنواؤں نے تمناء کی کہ کسی بھی فرد کو کسی بھی کام کے لیے مکمل آزادی ہونی چاہیے، فرد خود طے کرے گا کہ کون سا عمل اس کے لیے اچھا ہے اور کون سا برا؟ منطقی ثبوتیت کا یہ نتیجہ نکلا کہ صرف حسیات طبعی اور عقل کے تجربے و تجزیے سے ثابت ہونے والی چیزیں ہی یقینی قرار پائیں اور بقیہ امور کے متعلق انکار یا غیر جانب داری (جو انکار ہی کی شکل تھی) کا رویہ اپنا لیا گیا۔

ان سارے نظریات (جو علم وحی کی روشنی سے تہی دامن تھے) کو بلینڈ (Blend) کیا گیا تو پھر انسان نہیں بلکہ خون آشام بھیڑیے تیار ہوئے، یہ ہی اسفل السافلین کی تشریح ہیں، سب اس لیے ہوا کہ مسلمانوں کے ہاتھوں سے عالمی قیادت نکل گئی اور خود ان کے اپنے اعمال کے سبب نکلی۔

یقین کی کمی

زوال کا پہلا سبب: یہ ہے کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی تعلیمات کو چھوڑ دیا، قرآن سے بے وفائی کی، نتیجتاً ذلت و مسکنت ان پر مسلط کر دی گئی، مسلمانوں کے عروج و زوال میں سائنس و فنیات کو اہمیت نہیں رہی، ان کا عروج و زوال اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے وفاداری سے مشروط ہے، اسلام اور مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کے لیے لازم ہے کہ تجدید ایمان کی ایک تحریک برپا ہو، مولانا علی میاں ندوی ؒ لکھتے ہیں "عالم اسلام کو اس مقدس فریضے کو ادا کرنے کے لیے معنوی تیاری اور اندرونی تبدیلی کی بھی ضرورت ہوگی، ظاہر ہے کہ عالم اسلام خدا ناشناس یورپ کا مقابلہ تمدن و تہذیب کے کھوکھلے مظاہر مغربی زبانوں کی مہارت اور زندگی کے اس رنگ ڈھنگ کو اختیار کر لینے سے نہیں کر سکتا جس کو قوموں کی ترقی میں کوئی دخل نہیں، وہ اپنا پیغام اس روح اور معنوی طاقت ہی کی مدد سے پہونچا سکتا ہے، جس میں یورپ روز بروز دیوالیہ ہوتا جا رہا ہے، عالم اسلام اپنے مدمقابل پر اسی صورت میں غلبہ حاصل کر سکتا ہے کہ وہ اپنے حریف سے ایمان میں فائق ہو، زندگی کی

محبت اس کے دل سے نکل چکی ہو، خواہشات نفسانی کے بند سے آزاد ہو چکا ہو، اس کے افراد شہادت کے حریص ہوں، جنت کا شوق ان کے دلوں میں چٹکیاں لیتا ہو، فانی مال و متاع ان کے دل میں وقعت نہ رکھتا ہو، اللہ کے راستے کی تکلیفیں وہ ہنسی خوشی برداشت کرتے ہوں، درحقیقت ایک خدا ناشناس منکر آخرت کے مقابلہ میں مومن کا یہ امتیاز ہے، اور اسی بناہ پر اس سے یہ توقع کی گئی ہے کہ اس میں برداشت کی قوت زیادہ ہوگی..... واقعہ یہ ہے کہ مومن کی طاقت اور اس کے فتح و غلبے کا راز یہ ہے کہ اس کو آخرت کا یقین اور اللہ کے اجر وثواب کی امید ہوتی ہے، اگر عالم اسلامی کے سامنے بھی تمام تر وہی دنیاوی مقاصد اور مادی منافع ہیں اور وہ بھی محض محسوسات و مادیات کے طلسم میں گرفتار ہے، تو یورپ کو اپنی مادی طاقت صدیوں کی تیاری اور وسیع تر ساز وسامان کی بناء پر غلبہ کا زیادہ حق ہے''، قرون اولیٰ کا ایک ایک مسلمان مقابلے میں تیس تیس کافر پر بھاری ہوا کرتا تھا، ظاہری اعتبار سے وسائل کی قلت اور عددی قوت کی کمی کے باوجود وہی غالب رہتے، اصل میں ایمانی قوت انہیں جانوں کے نذرانے پیش کرنے پر ابھارتی، وہ قیصر و کسریٰ سے جا ٹکرائے اور ان کی شان و شوکت کو خاک میں ملا دیا، ایمان میں ضعف، جذبات کو سرد کر دیتا ہے، افواج فرار کے راستے اختیار کرتی ہیں، شجاعت و جرات کے پیچھے بھی قوت ایمانی ہی کارفرما ہوتی ہے۔

قرآن وصاحب قرآن سے دوری

دوسرا سبب قرآن اور صاحب قرآن سے مہجوری ہے، جملہ مشکلات کی کنجی تعلق مع اللہ اور نسبت عشقی کا احیاء ہے، جس نہج پر اس امت کے اولین کی اصلاح ہوتی تھی اسی طرح آخرین کی اصلاح بھی ہوگی، جس منہاج نے ان پر فتح ونصرت اور کامیابیوں کے دروازے کھولے تھے اس پر چل کر آج بھی عظمت رفتہ کو بحال کیا جا سکتا ہے، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا : اللہ تعالیٰ اسی کتاب کی بدولت قوموں کو اُٹھائے گا' ترقی دے گا' عروج بخشے گا' انہیں اس دنیا میں بلندی سے سرفراز فرمائے گا' اور

اسی کتاب کو چھوڑنے کے باعث قوموں کو ذلیل وخوار کرے گا۔ ”اِنَّ اللّٰہَ یَرْفَعُ بِھٰذَا الْکِتَابِ اَقْوَامًا وَیَضَعُ بِہٖ آخَرِیْنَ“ (۱) یہ صدی عیسوی دنیا میں ہماری ذلت ورسوائی کی آخری حد ہے، یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم نے کبھی اپنے عروج وزوال کے ادوار کی طرف نظر تک نہیں کی ہم تو اپنے ماضی سے بالکل منقطع ہو کر رہ گئے ہیں، انگریز کے مسلط کردہ نظام تعلیم نے ہمیں اپنے ماضی سے بالکل کاٹ کر رکھ دیا ہے، عربی اور فارسی سے تعلق منقطع ہوا تو اپنے ماضی سے تعلق منقطع ہوگیا ہے، کس کو یہ معلوم ہے کہ ایک وقت وہ بھی تھا جب بنوامیہ کی فوجیں پورے اسپین کو اپنے قدموں تلے روندتی ہوئی عین فرانس کے قلب میں پہنچ گئی تھیں 'اور ایک وقت وہ بھی آیا تھا کہ ترک افواج پورا مشرقی یورپ فتح کرنے کے بعد اٹلی کے دروازوں پر پہنچی ہوئی تھیں، جب تک نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ تعلق حبی اور عشقی کا تحقق یقینی نہیں ہوجاتا درستی احوال ممکن نہیں۔ وانتم الاعلون ان کنتم مومنین۔(۲) غلبہ ایمان کے ساتھ مشروط ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایمان کی جان ہیں۔

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
تم خوار ہوئے تارک قرآن ہو کر

اسلامی نظامِ حیات سے دوری

تیسرا سبب : اسلامی نظام ترک کردینا عروج وزوال کے اس قانون سے ہم واقف ہوں یا نہیں، اس کے پابند ضرور ہیں دوسری ہر چیز کی طرح وہ قوم بھی، جس کے ہم فرد ہیں اور وہ معاشرہ جس کا ہم جز ہیں، اسی راہ کے مسافر ہیں، یہ اس دنیا کی زندگی کی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ جو قوم اپنے نصب العین اور مقصد زندگی کو پس پشت ڈال دیتی ہے، اس کے

---

(۱) صحیح مسلم' کتاب صلاۃ المسافرین وقصرھا' باب فضل من یقوم بالقرآن ویعلمہ
(۲) آل عمران، ۱۳۹

تقاضوں اور ضروریات کے مطابق طرز عمل اختیار نہیں کرتی اور ان کے حصول کیلئے مسلسل ایثار وقربانی اور جدوجہد کرنے کیلئے کمربستہ نہیں رہتی اس کا صفحہ ہستی سے مٹ جانا اسی طرح یقینی ہوتا ہے جس طرح تیل ختم ہوجانے کے بعد چراغ کا گل ہوجانا یقینی ہوتا ہے۔

حدیث میں ہے: ''مسلمان اور اس کے ایمان کی مثال ایک کھونٹے سے بندھے ہوئے گھوڑے کی سی ہے جو خواہ کتنا ہی اِدھر اُدھر گھومے پھرے لیکن اپنی رسی کی حد کے اندر رہتا ہے۔'' ہم اپنے دین کی رسی کو توڑ کر اللہ عزوجل اور اسکے پیارے رسول ﷺ کی مقرر کردہ حدود سے تجاوز کر گئے ہیں، دنیا میں اس وقت ڈیڑھ ارب مسلمان موجود ہیں مگر اس کے باوجود وہ اسلامی نظام زندگی جس پر وہ ایمان رکھتے ہیں کہیں بھی نظر نہیں آتا۔

فی زمانہ دنیا بھر میں مسلمانوں کی تعداد ڈیڑھ ارب ہے، دنیا کا ایک چوتھائی یعنی دنیا میں مسلمانوں کی اتنی بڑی تعداد موجود ہے جو اس سے پہلے کبھی نہ تھی، ایسے ہی یہ بھی درست ہے کہ مسلمانوں کے پاس ۶۰ کے قریب باقاعدہ آزاد اسلامی ریاستیں ہیں، جن میں سے بعض ممالک اقتصادی لحاظ سے کافی مضبوط ہیں اور وہاں قدرتی وسائل کی بھی فراوانی ہے۔اس کے علاوہ جن ممالک میں حکومت مسلمانوں کی نہیں، وہاں بھی مسلمان خاصی تعداد میں آباد ہیں۔ہندوستان، امریکہ، برطانیہ، فرانس اور ایشیا وافریقہ کے ملکوں میں مسلمان بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں مگر اس کے باوجود یہ بھی تلخ حقیقت ہے کہ وہ اتنی کثیر تعداد میں ہونے اور بے پناہ قدرتی وسائل و ذرائع سے لیس ہونے کے باوجود پسماندگی و زبوں حالی سے اس درجہ دوچار ہیں کہ پسماندگی و پستی کی علامت بنے ہوئے ہیں، آپ دیکھیں اس وقت پوری دنیا میں مسلمانوں کی معیشت گر رہی ہے، روز بروز مسلمانوں پر زندگانی تنگ ہوتی جارہی ہے تمام تر وسائل و ذرائع اور افرادی قوت ہونے کے باوجود اپنے چاروں اطراف نظر دوڑائیں مغرب میں یورپ و امریکہ کی معیشت کو دیکھیں، مشرق میں جاپان، چین، آسٹریلیا کی معیشت، شمال میں روس کو دیکھیں، جنوب میں لاطینی امریکہ کے ممالک و جنوبی افریقہ کی معیشتیں

آسمانوں کو چھو رہی ہیں۔

ہر مہذب اور باشعور قوم کا نظامِ حیات اس کے بنیادی عقائد و نظریات، اقدار و روایات، اصول وضوابط اور نظریۂ حیات کا آئینہ دار ہوتا ہے اس لئے اگر آج مسلمانوں میں اسلامی نظامِ حیات رائج نہیں تو ماننا پڑے گا کہ انہوں نے اسلام کو محض زبانی دعوؤں اور ایمان کے کھوکھلے نعروں کے علاوہ اسے ایک دین اور ایک مکمل ضابطۂ حیات کی حیثیت سے قبول ہی نہیں کیا۔ اسے ایک کامل دین اور ایک مکمل نظام ہائے زندگی کی حیثیت سے اپنے دل و دماغ میں جگہ ہی نہیں دی، اس کی بجائے جو ضابطۂ حیات ہم نے اختیار کیا وہ ہمارے اجتماعی نظام (معاشرت، معیشت، عدل و انصاف، قانون وسیاست) وغیرہ سے صاف ظاہر ہے، اِسے جو چاہے نام دیں مگر یہ ایک اسلامی نظامِ حیات ہرگز نہیں۔

ذرا سنجیدگی سے سوچئے کہ آخر یہود کا کیا قصور تھا جن پر قرآن مجید میں جگہ جگہ پر لعنت کی گئی ہے اور انہیں کافروں اور مشرکوں سے بھی زیادہ سخت تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ انہیں دنیا میں ہی بندر اور سور بنا دیا گیا، قیامت تک کیلئے ان پر ذلت و رسوائی مسلط کی گئی اور آخرت میں بھی ان کیلئے ذلت کے دردناک عذاب کی وعید ہے۔ حالانکہ وہ لوگ اللہ تعالیٰ کو ماننے والے تھے۔ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت و حاکمیت پر پختہ یقین رکھتے تھے، حکم خداوندی کے مطابق عبادت بھی کرتے تھے، نماز، روزہ کے پابند تھے مگر ان کا قصور یہی تھا کہ وہ دین کی کچھ باتوں کو چھوڑ کر کفر سے مصالحت کر بیٹھے اور اہل باطل کی چند باتوں کو اپنے دین میں شامل کر لیا تھا، اس پر اللہ رب العزت نے انہیں سخت تنبیہ دی اور ڈانٹ پلاتے ہوئے فرمایا:

”کیا تم کتاب الٰہی کی کچھ باتوں پر تو عمل کرتے ہو اور کچھ سے انکار کرتے ہو؟ یاد رکھو! اللہ کے دین کے ساتھ ایسا طرز عمل اختیار کرنے والوں کیلئے دنیا میں ذلت و رسوائی اور آخرت میں بدترین عذاب کے سوا اور کچھ نہیں۔“ (البقرۃ ۸۵)۔

آج ہمارا حال بھی بالکل یہی ہے کہ ہم قرآن وسنت کی بعض باتوں پر تو عمل کرتے ہیں اور بعض سے اختلاف کرتے ہیں یا ان پر عمل نہیں کرتے، اس کا انجام ''دنیا میں ذلت و رسوائی''، تو آج ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اور انجامِ آخرت بھی بہت جلد ہمارے سامنے آجائے گا۔

دین اسلام اور مسلمان ہونے کا صرف زبانی اقرار جس کی تائید اعمال وافعال سے نہ ہو، اللہ تعالیٰ کے ہاں قابل قبول نہیں، صحیح اور سچا مسلمان بننے کیلئے ضروری ہے کہ دین حق کو صرف نظری اور اعتقادی حد تک ہی نہیں بلکہ اسے اپنے نظامِ حیات اور طرز زندگی کے طور پر اختیار کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ کا دین پوری انسانی زندگی پر محیط ہے، اس کا کوئی حصہ اختیاری نہیں کہ کوئی یہ کہے کہ اتنا تو مانوں گا، اتنے پر تو عمل کروں گا اور اتنے پر نہیں کروں گا، اللہ تعالیٰ کے دین میں سودے بازی اور کمی بیشی کی کوئی گنجائش نہیں، یہ تو زندگی بسر کرنے کا ایک متعین طریقہ ہے، ظاہر ہے کہ یا اس پر چلا جائے یا اس کو چھوڑ کر کسی اور طریقے پر عمل کیا جائے۔

۱۔ ہمارا اقتدارِ اعلیٰ (حکومت بنانے کا) پورے کا پورا نظام غیر اللہ کا ہے۔
۲۔ ہمارا نظامِ معاشرت (رہن سہن کا طریقہ) غیر اللہ کا ہے۔
۳۔ ہمارا نظامِ تعلیم غیر اللہ کا تعین کردہ ہے۔
۴۔ ہمارا نظامِ معیشت غیر اللہ کا ہے۔
۵۔ ہمارا عدالتی نظام غیر اللہ کا ہے۔
۶۔ ہمارے ہاں جرائم کی سزا وجزا کا قانون غیر اللہ کا تعین کردہ ہے۔
۷۔ ہمارا امن وعامہ (پولیس Police) کا نظام غیر اللہ کا تعین کردہ ہے۔
۸۔ ہمارا کاروباری و دفتری نظام غیر اللہ کا ہے۔
۹۔ ہمارا نظامِ بنکاری غیر اللہ کا متعین کردہ ہے۔

۱۰۔ ہمارا عسکری و دفاعی نظام غیر اللہ کا ہے۔

۱۱۔ ہماری خارجہ پالیسی غیر اللہ کی متعین کردہ ہے، قرآن وسنت کو پس پشت پھینک کر مفاد پرستی، خود غرضی اور لالچ کو اہمیت دی گئی ہے۔

۱۲۔ ہماری شکل وصورت غیر اللہ کی ہے کہ ہمارے چہروں پر انبیائے کرام علیہم السلام کی محبوب ترین سنت، مسلمانوں کی پہچان کی توہین آمیز سوچ موجود ہے۔(اردو نیوز، ۸ فروری ۲۰۱۸ء)

باہمی تعاون واتحاد کا فقدان

چوتھا سبب : باہمی تعاون و اتحاد کا فقدان اور اختلافات کا فروغ ہے، آج صورت حال یہ ہے کہ اگر کسی گاؤں یا قصبہ میں چند سو مسلمان ہیں تو وہ مختلف مسلکوں اور برادریوں میں تقسیم ہیں، پھر مسلک اور برادری کی خلیجیں اتنی گہری ہیں، جو ایک دوسرے کو قریب نہیں ہونے دیتیں، وہ مسلمان جو خود کو اعلی برادریوں سے منسلک سمجھتے ہیں وہ دوسری برادریوں کے ساتھ میل جول رکھنا پسند نہیں کرتے یا پھر انہیں حقارت سے دیکھتے ہیں اور ان کے ساتھ مل بیٹھنا اپنی توہین سمجھتے ہیں، صد افسوس ہے کہ ہمارے ہاں برادری کی خلیجیں اس قدر گہری ہوگئی ہیں کہ مختلف برادریوں نے مسجدیں تک اپنی الگ الگ بنالی ہیں، اگر بات مسلکی اختلاف کی کی جائے تو مسلک کے نام پر لڑائی جھگڑوں کی بھی خبریں سننے کو ملتی ہیں، اختلاف صرف اور صرف برادریوں یا مسلکوں تک محدود نہیں، بلکہ اختلاف مسلم ملکوں وحکومتوں کے درمیان بھی پایا جاتا ہے، آج مسلم مملکتوں کی تعداد ساٹھ کے قریب ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ باہم متحد نہیں، بلکہ سخت اختلافات کی شکار ہیں، کہیں وہ باہم متصادم ہیں تو کہیں ایک دوسرے کی ترقی کو روکنے کے لیے کوشاں۔ گذشتہ چند دہائیوں کے درمیان کئی مسلم ممالک باہم زار ونزار ہو چکے ہیں اور آج بھی جب کہ حالات ان کے خلاف ہیں وہ ایک پلیٹ فارم پر نظر نہیں آتے اور نہ ہی دوسرے مسلم ملک کے تحفظ کے لیے کوئی کردار ادا کرتے ہیں،

افغانستان، عراق، لیبیا، شام پر حملہ کیا گیا کسی نے زبان تک کھولنا اور مزاحمت کرنا گوارا نہیں کیا، مسلمانوں کے عروج واقبال کا ایک دور تھا کہ آپس کے اختلافات کے شباب کے وقت بھی دشمن کے سامنے سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن جاتے اور اسے منہ کی کھانی پڑتی۔ زندہ اور غیرت مند اقوام کا یہی وطیرہ رہا ہے کہ وہ آزمائش کی گھڑی میں، دشمن کے مقابلے اور محاذ آرائی کے وقت اپنے باہمی اختلاف کو بھلا کر اس کے سامنے ایک مضبوط دیوار بن جاتی ہیں اور ہر فرد کو اربوں، کھربوں ڈالر کے خزانوں سے بھی زیادہ قیمتی سمجھ کر ان کی حفاظت کیلئے اپنا سب کچھ قربان کر دیتی ہیں، وہ دشمن کو کبھی بھی یہ موقع نہیں دیتیں کہ وہ ان کے باہمی اختلافات سے فائدہ اٹھا کر ان کے کسی گروہ یا جماعت پر حملہ آور ہو یا ان کے کسی مفاد کو نقصان پہنچائے۔

امیر المومنین حضرت سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اختلاف کا دور تھا، روم کے بادشاہ قیصر نے ان اندرونی خلفشار سے فائدہ اٹھانا چاہا اور شام کے سرحدی علاقوں پر لشکر کشی کا ارادہ کیا جو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زیر کنٹرول تھے، حضرت امیر معاویہ کو جب یہ اطلاح ملی کہ دشمن ان کے اندرونی اختلافات سے فائدہ اٹھا کر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زیر حکومت علاقے پر حملہ آور ہونے کا پروگرام بنا رہا ہے تو انہوں نے دشمن کو ایمان افروز، غیر تمندانہ پیغام لکھ بھیجا کہ ”مجھے اس بات کا علم ہوا ہے کہ تم حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زیر حکومت علاقے پر لشکر کشی کرنا چاہتے ہو، یاد رکھو! اگر تم نے ہمارے باہمی اختلافات کی وجہ سے ایسا کرنے کی کوشش کی تو تم امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی پہلے مجھے اپنے مقابلے پر پاؤ گے اور ہم پورے قسطنطنیہ (روم) کو جلا کر راکھ کر کے رکھ دیں گے۔“ (اردو نیوز، ۸ فروری ۲۰۱۸ء)

اجتماعی اخلاق سازی کی اشد ضرورت

پانچواں سبب : قوموں کے عروج وزوال کی داستان میں اجتماعی اخلاق کو بڑی

اہمیت حاصل ہے، قومی استحکام کی بنیاد اخلاق پر ہوتی ہے اور یہ فصیل کا کام بھی دیتا ہے، ایمانی قوت کا مقابلہ مادی وسائل سے نہیں کیا جاسکتا، اخلاقی زوال کے نتیجے میں جو قومی زوال شروع ہوتا ہے اسے علوم وفنون کی ترقی بھی نہیں روک سکتی، عقیدے کی لازوال قوت ہی کامیابی کا اصل راز ہے نفس پر حکمرانی کا سلیقہ آجائے تو جہانبانی کوئی مشکل کام نہیں۔

خُلق عمومی یعنی داخلی اور خارجی نظام کی پائیداری ہے، نظام سے مراد عدل، مساوات اور احسن رویہ ہے، یہ تین قدریں دورِ نبویؐ میں عروج پر تھیں اور صحابہ وتابعین کے دور میں بھی کسی حد تک، ان قدروں کو قائم رکھا گیا لیکن بعد میں آہستہ آہستہ یہ قدریں پائمال ہونا شروع ہوگئیں، جب انصاف کی قدر گرجائے گی تب تعصب کے جذبات پیدا ہونگے اور تصادم کی فضا بنے گی، تصادم کی فضا میں معاشرے زوال کی طرف بڑھنے لگتے ہیں، خُلق عمومی چھوڑ دینے سے معاشرے کا فاتحانہ اور قائدانہ تصور ختم ہونا شروع ہوجاتا ہے، قومیں رعب اور دبدبہ سے نہیں بنتیں بلکہ اعلیٰ اخلاقی ومعاشرتی اقدار سے پروان چڑھتی ہیں، حکومتی سطح پر عدلِ اجتماعی کی قدر ترک کرنے سے مسلمان عالمی قیادت سے محروم ہوگئے، مسلم معاشرہ نے گرتی ہوئی اقدار اور بگڑتی ہوئی تہذیب سنوارنے کی کوشش نہیں کی، دینی علوم تو جانتے تھے مگر تاویل سے کام لے کر حقیقی نظریات کو پسِ پشت ڈال دیتے تھے، غلام لونڈی کا تصور، مالِ غنیمت کا تصور، ذمی کا تصور معاشرے میں جڑ پکڑنے لگا حالانکہ اسلام نے مساویانہ شہریت، عزتِ نفس اور خُلق خدا کی فلاح کی قدر عطا فرمائی ہے، سرمایہ دارانہ نظامِ معاشرت اور فکری سطح پر اپنی من مانی کرنے والوں نے اسلامی نظریات کو بہت نقصان پہنچایا جس کی وجہ سے فکری زوال کا عمل تیز ہوگیا۔

کمزور پر سوار ہوجانا اور طاقتور کو دیکھ کر اس کے سامنے سرنگوں ہوجانا ایک عام روش بن گئی ہے۔ یہ نتیجہ ہے صدیوں کی غلامی کا۔ کاش صدیقی اسوہ مشعل راہ بن جائے، آپؓ نے بحیثیت خلیفہ جو پہلا خطبہ ارشاد فرمایا اس میں کہا ”تم میں سے کمزور میرے لئے طاقتور ہے

جب تک کہ اس کا حق اسے دلا نہ دوں اور تم میں سے طاقتور میرے نزدیک کمزور ہے جب تک کہ حق اس سے وصول نہ کرلوں" اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے راستے میں ایک بڑی رکاوٹ فرعونی ذہنیت بھی ہے۔کسی قوم کا عروج کفر کے ساتھ تو ممکن ہے لیکن ظلم کیساتھ ناممکن، فرعونیت اور غلامانہ ذہنیت کا خاتمہ کرکے راہ اعتدال اپنانے کی ضرورت ہے۔

مادی اسباب سے بے توجہی

چھٹا سبب : مادری علوم سے عدم دلچسپی فکری زوال کے بعد واحد ذریعہ عسکریت ومادیت ہے جو پائدار ذریعہ نہیں ہے بلکہ کمزور طرزِ عمل ہے چونکہ یہ ذریعہ مخالفت اور مقابلہ کی زد میں ہوتا ہے اور آخر ِکار شکست خوردہ ہو جاتا ہے، ہم نے دیکھا کہ خُلق عمومی کو کن عوامل کی وجہ سے نقصان پہنچا، اگلا جزوی ستون ارتقا کا مزاج Follow نہ کرنے کی وجہ سے ہوا، جن لوگوں نے ارتقاء کے لیے جدو جہد کی، ان کے نظریات کو نہ صرف پس پشت ڈالا گیا بلکہ ان پر طرح طرح کے الزامات بھی لگائے گئے ابن ھیثمؒ ، ابن ماجہؒ، ابن طینؒ، ابن سیناؒ، فارابیؒ، یعقوبیؒ نسائیؒ مسکویہؒ، ابن عربیؒ، ابن رِشیدؒ، جیسے جدت پسند سائنسدانوں کی فکر کو بھی قدامت پسند لوگوں نے سمجھنے سے انکار کردیا،مسلم معاشرہ سائنسی دور میں ارتقا کی منازل طے نہ کرسکا اور یوں یورپی اقوام مسلمانوں کو مادی اور عسکری میدان میں شکست دے کر عالمی افق پر نمودار ہوگئیں، یاد رہے کہ مغربی اقوام غالب تو ہو گئے مگر خُلق عِمومی (عدل، مساوات اور احسن رویہ) سے محروم ہیں، یہی وہ طاقت ہے جس کے بل بوتے پر مسلمان قیادت کا منصب دوبارہ سنبھال سکتے ہیں مگر اس کا واحد راستہ اسوۂ حسنہ پر عمل پیرا ہونا ہے، مگر ترقی کے لیے یورپ کی نقالی نہ کریں کہ یورپ کو جب آگے جانے یا بڑھنے کی تدابیر میں سیاست، اکنامکس(Economics) اور فلسفہ بھی شامل تھا، مذہب جب ان کے سامنے آیا تو انہوں نے چرچ سے علیحدگی کو ترجیح دی، تاکہ ایک نئی سوچ کے لیئے انہیں مکمل طور پر فکری آزادی میسر آئے، اور یہ سوچ تقریباً ڈیڑھ، دوسو سال تک غالب رہی کہ اگر ہم چرچ سے

منسلک رہے تو کبھی ترقی نہیں کر سکتے۔

دعوتِ دین روحانی قوت پر محنت کی کمی

ساتواں سبب : دعوت دین کی کمی بعض مفکرین کا خیال ہے کہ مسلمانوں کا زوال اس وجہ سے ہوا کہ وہ علم و ہنر وفنون میں اور تسخیر کائنات میں پیچھے رہ گئے، مغرب نے ان میدانوں میں سبقت حاصل کی، عروج وزوال سے متعلق گزشتہ دوسو برس کے تجزیوں میں متفقہ تجزیہ یہی ہے کہ جدید علوم کے ذریعے ہی اسلام کا غلبہ قائم ہوگا، اس کے سوا کامیابی اور کامرانی کا کوئی راستہ نہیں ہے، یہ رویہ خالصتاً غلامانہ سوچ کا آئینہ دار ہے، اگر مغرب کے راستے کو کاملاً اختیار کرلیا جائے تو مشرق مغرب بن جائے گا مگر روحانی اخلاقی طور پر مغرب سے بدتر ہوگا، غلبے کی تشخیص وتجزیے میں تبلیغ اور دعوت دین کا کوئی ذکر نہیں کیا جاتا ہے، تاریخ بتاتی ہے کہ مسلمانوں نے اندلس میں زبردست مادی ترقی کی لیکن روحانی طور پر وہ غیر مسلموں کو متاثر نہ کر سکے، اندلس یورپ میں اسلام کی اشاعت نہ کرسکا، خلافت عثمانیہ اور مغلیہ سلطنت نے اپنے زیر تسلط علاقوں میں اسلام کی دعوت کو عام کرنے اور دائرہ اسلام کو وسیع کرنے پر کوئی توجہ نہ دی، یہ تمام سلطنتیں مادی طور پر بہت مستحکم سلطنتیں رہیں، لیکن رعایا پر یہ روحانی برتری قائم نہ کر سکے، انہوں نے زمین مسخر کرلی، دل مسخر نہ کرسکے، دعوت سے اغماض ان کی ناکامی تھا لیکن عروج وزوال کی تمام قدیم وجدید بحثوں میں اس بحث کا ذکر نہیں۔

خلافت عباسیہ جو ٹیکنالوجی میں منگولوں اور تاتاریوں سے برتر تھی اور تہذیب وتمدن میں اس کا ان سے مقابلہ نہ تھا، آخر کیسے شکست کھاگئی؟ ایک غالب اور برتر تہذیب وحشیوں کی یلغار کا سامنا کیوں نہ کرسکی؟ شکست خوردہ اسلامی تہذیب صرف پچاس سال کے عرصے میں بغیر کسی مادی ترقی کے دوبارہ کیسے غالب آگئی؟ اور وہ کون سی سائنسی ٹیکنالوجی، علوم اور فلسفے تھے جس نے چنگیز کے پوتے برقے کو قبولیت اسلام کیلئے آمادہ کیا؟ اور طاقت کا توازن آناً فاناً تبدیل ہوگیا۔؟ ہندوستان میں مغلیہ سلطنت اور ریاستیں انگریزوں سے کیوں شکست کھا

گئیں جبکہ اس وقت عسکری سطح پر دونوں گروہوں کے پاس کم وبیش توازن طاقت برابر تھا۔ پورے ہندوستان کو فتح کرنے والی انگریزی فوج کی تعداد صرف چند ہزار تھی لیکن ہندوستان کیونکر سرنگوں ہوگیا۔؟

ترکی، مصر، ملیشیا نے مغربی تہذیب اور تعلیم کو اختیار کرلیا تو وہاں کیا انقلاب برپا ہوا؟ سرسید کی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا خواب پورا ہوگیا لیکن اس جامعہ کے ذریعے کیا عروج کا وہ سفر طے ہوگیا جس کی آرزو کی گئی تھی اس جامعہ سے شائع ہونے والی کتنی کتابیں آج کیا دنیا بھر کی جامعات میں پڑھائی جارہی ہیں؟

جدیدیت پسندوں کے یہاں ایک لہر مغربی علوم کو عروج کا ذریعہ سمجھتی ہے دوسری لہر صرف سائنس کو ترقی اور تیسری لہر مغربی علوم کے ساتھ مغربی ثقافت کو، ان تینوں لہروں میں ایک اندرونی غیر محسوس ادغام دنیا پر غلبے اور بالادستی کا تصور ہے، جدیدیت پسندوں کے یہاں یہ بالادستی دعوت ایمان، قلوب کی تسخیر، دین کے لئے محنت، پیغام محبت، عمل صالح، اتحاد، اجماع اور جہاد کے مراحل کے فلسفے کے بغیر صرف سائنسی علوم اور معیشت کی طاقت پر اصرار کرتی ہے، طاقت کے مختلف مظاہر اسی حکمت عملی کا شاخسانہ ہیں۔

سلطنت روما کو عیسائیت نے ٹیکنالوجی کے بل پر شکست نہیں دی، روما جیسی عظیم الشان سلطنت فتح کرنے والے گدھوں پر سوار تھے، حملہ آوروں کی دعوت نے قلوب مسخر کر لیے تھے، روس کو امریکا نے عسکری میدان میں شکست نہیں دی بلکہ روسی عوام کا نظریہ زندگی بدل دیا، انہیں لبرل بنا دیا گیا، یہ جنگ میدان جنگ میں نہیں عقیدہ اور نظریہ کی تبدیلی کے ذریعے کی گئی، یہی صورتحال چین کے ساتھ درپیش ہے، سرمایہ دارانہ نظام کے باعث چین کا تشخص ختم ہوگیا ہے وہ نظریاتی اساس کھو بیٹھا ہے، مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ نئے فلسفے، نئے شعور، نئے علم، سیاست کی نئی بساط، کی ضرورت نہیں یا اس کا ترقی میں دخل نہیں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ ترقی کے صرف یہی عوامل نہیں ہیں، جب قوم پر مادیت کا رنگ غالب

آجائے اور فرقہ واریت کا زہر اس کی رگ و پے میں سرایت کر جائے تو پھر اس سے اعلیٰ اخلاقی قدروں کے احترام کی توقع عبث ہے پھر نسلی، لسانی اور علاقائی عصبیتوں کا شکار ہو کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جانا اس کا مقدر بن جاتا ہے، مفادات کی جنگ میں جائز و ناجائز کے سارے فرق مٹ جاتے ہیں اندرونی حالات مادیت کی بجائے روحانیت کا احیاء ہی امت کے باقیات الصالحات کو ایک رسی میں پرو کر قوت متحرکہ بنا سکتا ہے۔

ماحول کا اثر

اسپین کی معاشرتی کیفیت ابتدا ہی سے تنگ نظری، تعصب، جہالت، بے دینی، گمراہی، تاریکی، زنا کاری، شراب خوری اور قمار بازی پر مشتمل ہے دوسری طرف ہندوستان کے ہر علاقے کا اپنا ایک ثقافتی مزاج تھا، جب محمد بن قاسمؒ سندھ کے راستے حملہ کیا اور وادی کو فتح کیا ہندوؤں کی شکست کے اسباب میں دوسرے مسائل کے ساتھ اخلاقی اور بے دینی کے وجوہات بھی تھے۔

دراصل زوال اور شکست کے اسباب کا مسئلہ ایسا ہے جس میں عموماً مشکل ہوتا ہے کہ قطعی اور بالکل صحیح فیصلہ کر سکیں، اقوام عالم میں صرف مسلمان ہی وہ قوم ہے جو سب سے زیادہ شاندار تاریخ رکھتی ہے اور سب سے بڑھ کر اپنے بزرگوں کے کارناموں کی نسبت ایسا یقینی علم حاصل کر سکتی ہے جو ہر قسم کے شک و شبہ سے پاک ہے کیونکہ نہ مسلمانوں کو کسی شاہناموں کی ضرورت ہے اور نہ افسانوں کی، اسلام سے پیشتر دنیا میں فن تاریخ نویسی کا نام ہی نہیں تھا، مسلمانوں نے علم حدیث کی ترتیب و تدوین سے اس کا آغاز کیا جو دنیا والوں کے لئے بالکل ایک نئی چیز ثابت ہوئی۔

مغلیہ سلطنت کے زوال کے اسباب پر اے۔ ایچ حسنی لکھتے ہیں :

"مغلیہ حکومت کے زوال کے اسباب میں درجہ ذیل امور ہو سکتے ہیں (۱) جانشین کی کمزوری اور نااہلی (۲) تخت نشینی کا مسئلہ (۳) مغل امراء کا باہمی کشمش (۴) فوجی کمزوری

اور خامیاں (۵) انتظامی بے ضابطگیاں (۶) مسلسل جنگ اور اقتصادی بدحالی (۷) ہندوؤں کی بیداری، بلبن کہا کرتا ہے تھا کہ " اگر کوئی بادشاہ بارعب نہیں تو اس کی رعایا سرکشی اور بغاوت کی طرف مائل ہو جاتی ہے۔

اسپین اور ہندوستان کے سیاسی زوال کے اسباب

کافروں سے دوستیاں

اندلس کے مسلمانوں نے باہمی جنگوں میں غیر مسلموں کو شروع سے ہی شامل کر لیا تھا ،ایک دوسرے کو زیر کرنے کے لیے غیر مسلموں کی مدد طلب کی ،یہ رسمِ بد آٹھ سو سالہ سلطنت اندلس کی پہلی صدی سے ہی شروع ہوگئی تھی:

۞ عبدالرحمن الداخل نے جب اندلس کی حکومت سنبھالی تو ۱۵۸ھ میں اپنے سپہ سالار ثعلبہ بن عبید الجذامی کو بھیجا کہ سرکش سرداراوں کا مزاج درست کر آئے، مگر بدقسمتی سے اسے شکست ہوگئی ان باغیوں میں بارسلونہ کا سردار سلیمان بن یقظان اور سرقسطہ کا والی حسین بن یحی انصاری بھی تھے، انہوں نے جب داخل کے لشکر کی شکست دیکھی تو فیصلہ کن جنگ کے لیے مسلمانوں کے بدترین دشمن حاکم "روماشارلمان" سے مدد طلب کی۔

۞ ۲۳۸ھ میں امیر محمد بن عبدالرحمن کے دور میں طلیطلہ کے باسیوں نے بغاوت کر دی ،انہوں نے اپنی مدد کے لیے عیسائی بادشاہ "اردون بن ازفونش" کو دعوت دی، امیر محمد نے جب عیسائی اور مسلم گٹھ جوڑ دیکھا تو اس نے اپنا لشکر چھپا دیا، لشکر ٹکرائے تو بادشاہ کے فوجی کم تھے جیسے ہی عیسائی اور باغی فوج آگے بڑھی چھپا ہوا لشکر حملہ آور ہوا اور بادشاہ کو فتح ہوئی، اس جنگ میں ۲۰ ہزار افراد مارے گئے۔ (نفح الطیب: ۱/ ۳۵۰)

۞ حاکم اندلس کے باغی عیسائیوں کے پاس جا کر پناہ لیتے، یہ ایک ایسی روایت بن گئی جس کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں، عبدالرحمن بن مروان الجلیقی نے ۲۶۲ھ میں عیسائی

بادشاہ ''اذفونس بن اردوان'' کے پاس پناہ لی ،وہ لشکر جمع کر کے اندلس کی فوج پر حملہ آور ہوتا اور پھر شکست کھا کر واپس عیسائیوں کے پاس پناہ لے لیتا۔(۱)

۞ منذر بن یحی التجیبی نے بارسلونہ کے امیر ''سان شو'' اور ''لیون'' کے بادشاہ ''الفانسو'' کے پاس پناہ لی۔

۞ طلیطلہ کے علاقے میں مامون بن ذی النون کی جنگ سلیمان سے ہوتی تھی ''سلیمان بن ہود'' کے لشکر کی مامون کے لشکر سے جنگ ہوئی جس میں مامون کو شکست ہوئی، مامون بمشکل جان بچا کر بھاگا، اس نے ''قشتالہ'' کے بادشاہ ''فرنینڈو'' سے مدد مانگی اور طے یہ کیا کہ اس علاقے کو فتح کر کے اس کا جزیہ ''فرنینڈو'' کو ادا کریں گے، ''فرنینڈو'' نے اپنے سپاہی بھیجے یوں سلیمان کے لشکر کو شکست ہوئی، اب کی بار سلیمان نے ''فرنینڈو'' کو تحفے بھیجے اور اسے اپنی مدد کرنے پر آمادہ کرلیا، فرنینڈو نے فوج دیدی اور یوں پورا طلیطلہ ایک بار پھر تباہ ہوگیا۔(۲)

۞ عماد الدولۃ جب سرقسطہ کے والی بنے تو لوگوں نے اس شرط پر بیعت کی کہ وہ کبھی بھی رومیوں سے مدد طلب نہیں کریں گے، مگر کچھ عرصے بعد عماد الدولہ کو محسوس ہوا کہ لوگ تو مرابطین کی طرف مائل ہو رہے ہیں، اس نے فوری طور پر عیسائیوں سے مدد طلب کرلی، لوگ اس کے مخالف ہو گئے، اور اسے سر چھپانے کے لیے سرقسطہ جانا پڑا جہاں عیسائی اسکے محافظ تھے۔

۞ معتمد بن عباد نے اپنے وزیر کو عیسائی علاسے ''قشتالہ'' کے سربراہ ''الفانسو'' کے پاس بھیجا اس نے ''الفانسو'' سے معاہدہ کرلیا، معاہدے میں یہ طے پایا کہ جب بھی کوئی مسلمان حملہ کرے گا ''الفانسو'' معتمد کا ساتھ دے گا، اس کے بدلے میں ''ابن عباد'' بھاری بھرکم جزیہ

---

(۱) البیان المغرب: ۲/ ۱۰۵

(۲) البیان المغرب: ۳/ ۲۸۲

''قشتالہ'' کے عیسائی بادشاہ کو دے گا، یہ بھی طے پایا کہ اگر ''الفانسو'' مسلمانوں کے شہر طلیطلہ پر حملہ کرے گا تو معتمد اور اس کی فون اس کے راستہ میں رکاوٹ نہیں بنے گی۔(۱)

۞ غرناطہ کے والی عبد اللہ بن بلقین نے ''قشتالہ'' کے بادشاہ ''الفانسو'' سے معاہدہ کیا ،اس سے معتمد بن عباد کے خلاف مدد طلب کی ،جس کا معاوضہ ۲۰ ہزار سونے کے سکے طے ہوئے تھے، اس لشکر نے ''اشبیلیہ'' پر حملہ کیا۔

غیر مسلموں کو عہدوں سے نوازنا

اندلس میں مسلمانوں نے یہودیوں کو اپنے ہم قدم رکھا، انہیں معاشرے میں برابری کا مقام دیا اور زندگی کے تمام شعبوں میں انہیں نمایاں کردار دیا:

۞ اندلس کے اہم شہروں میں یہودی آباد تھے، قرطبہ میں یہودیوں کی بستی خلیفہ کے محل اور الجامع الکبیر سے متصل تھی، اسی طرح غرناطہ میں بھی یہودیوں کی بڑی تعداد آباد تھی۔(۲)

۞ سرقسطہ شہر کی کل آبادی میں تقریباً ایک چوتھائی یہود تھے۔(۳)

۞ مسلمانوں کے اچھے اخلاق سے متاثر ہو کر دنیا بھر سے یہودی ہجرت کر کے اندلس جمع ہو گئے، انہیں مختلف اعلی عہدوں پر بھی فائز کیا جانے لگا :

۞ ''حسدائی بن شبروط''خلیفہ عبد الرحمن ناصر نے اس یہودی کو اپنا طبیب بنایا، اس کے بعد ٹیکس وصولی کا نگران مقرر کر دیا، اس کے بعد یہ یہودی حکومت کا سفیر بن گیا، بارسلونہ میں مذاکرات کی ذمہ داری اس کے سپرد کی گئی۔(الیہود فی الاندلس: ۲۳)

خلیفہ نے اگرچہ اس کو وزیر نہیں بنایا مگر اس سے یہودیوں کو اعلی عہدے دینے کا

---

(۱) الحلل الموشیۃ فی الاخبار المراکشیۃ: ۵۵

(۲) تاریخ النصاری فی الاندلس: ۴۶

(۳) الیہود تحت حکم المسلمین: ۹۷

دروازہ کھل گیا، جس نے حکومت کی تباہی میں نمایاں کردار ادا کیا۔

۞ ''اسماعیل بن نغدلہ'' وزیر ''ابوالعباس بن العریف'' اس یہودی کی صلاحیت سے بہت متاثر تھا، اس نے غرناطہ میں اپنا معاون مقرر کرلیا، بعد میں ٹیکس جمع کرنے کی ذمہ داری دیدی، بادشاہ ''حبوس'' نے اس یہودی کو وزیر کا عہدہ دیا، یوں ''اسماعیل'' وہ پہلا یہودی ہے جسے اندلس میں وزارت کا منصب دیا گیا، اسکے بعد ''اسماعیل'' اتنا منہ زور ہوگیا کہ فقیہ ابن حزمؒ کے خلاف خط لکھتا اور اسلامی احکام پر کھلم کھلا تنقید کرتا اور کوئی اسے روکنے والا نہ تھا۔(۱)

نسلی فسادات

۞ عرب اور بربر نسل پرستی رفتہ رفتہ بڑھتی گئی، بربر اور عرب مسلمانوں کے درمیان نفرت اس حد تک بڑھ گئی کہ دونوں ایک دوسرے پر حملے کرتے، جلیقیہ کے علاقے میں بربر زیادہ تھے انہوں نے عربوں کو تہ تیغ کیا جس کے انتقام میں عبدالملک بن قطن نے فوج جمع کرکے بربروں پر حملے شروع کئے، طلیطلہ کے اطراف میں بربروں پر حملہ کرکے ہزاروں نوجوانوں کو قتل کردیا گیا۔(البیان المغرب: ۳۱/۲)

۞ بلج بن بشر شامی عرب تھے جبکہ عبدالملک بن قطن اندلسی عرب، شامیوں نے پناہ گزینوں کے مسئلے پر ابن قطن کو قتل کردیا، اسکے جوابی حملے میں شامی عربوں کے امیر ''بلج بن بشر'' کو قتل کردیا گیا۔(البیان المغرب: ۳۱/۲)

۞ جب خلافت بنوامیہ کا خاتمہ ہوا تو فوری طور پر اندلس میں بھی اموی اور عباسی فسادات شروع ہوئے، جس میں متعدد افراد مارے گئے۔ ''عمروس بن یوسف'' کو طلیطلہ کا گورنر بنا کر بھیجا گیا، وہ بنوامیہ سے بے حد بغض رکھتا تھا، اس نے ایک وسیع محل بنوایا، جب

(۱) الذخیرہ لابن بسام: ۷۶۶/۲

تعمیر مکمل ہوگئی تو شہر کے سرکردہ لوگوں کو دعوت کے نام پر بلایا، لوگ جب اپنی سواریوں پر محل میں داخل ہوئے تو سواریوں کو ایک مخصوص طرف ہنکا دیا گیا، وہاں پر تلوار بردار جلاد موجود تھے، جو سوار کے قریب آتے ہی اسے موت کے گھاٹ اتار دیتے، یوں ساڑھے پانچ ہزار مسلمان قتل کردیے گئے، جس کے بعد اہل متحد ہوکر ''عمروس'' اور اسکے ساتھیوں سے جنگ کر کے موت کے گھاٹ اتار دیا، جس میں ہزاروں لوگ مارے گئے۔(۱)

۞ مرسیہ کے علاقے میں بھی مضر اور یمن کے لوگوں کے درمیان جنگ ہوئی، اس کا آغاز ایک مضری شخص نے یمنی شخص کے باغ سے انگور کے پتے توڑنے سے ہوا، یمنی نے اسے قتل کردیا، یہ جنگ سالہاسال چلتی رہی جس میں بے شمار لوگ مارے گئے۔(۲)

اندلس کے فتح کے بعد ایک اہم وجہ قوم بربر پر اسلام تمدن کا ایک ایسا اثر ہوا کہ وہ اپنے آپ کو عربوں کے برابر سمجھنے لگے مثلاً اسپین میں موسیٰ بن نصیر کے ساتھ رویا، امیر ایوب بن حبیب اللخمی اور امیر الحر بن عبدالرحمن کے درمیان مسئلہ، ہشام ابن عبدالملک کا دورہ، عبدالرحمن ثالث کا دور، بن نصر اور بربر قوموں کی بغاوت، جو شروع سے جاری تھی۔ اس کے علاوہ مختلف ادوار میں جاگیریں اور مراعات دینا بھی نسلی تعصب کا ایک اہم ذریعہ بنا۔(۳)

ہندوستان جس میں شروع سے ذات پات کا نظام رائج تھا، مسلم دور میں علاؤالدین کا دور حکومت، التمش کے بعد اُن کے غلاموں کا کردار، معزالدین کے دور میں نظام الدین کا کردار، شہاب الدین بن علاؤالدین کے دور میں خاندانِ علائی کے سلوک اور مغل دور میں مختلف یورش کا اصل مسئلہ یہی تھا۔

---

(۱) تاریخ افتتاح الاندلس، لابن القوطیہ: ۶۴

(۲) الکامل لابن اثیر: ۵/۷۰۴

(۳) تاریخ اندلس بنی امیہ، عبدالقوی ضیاء حیدرآباد پاکستان ۱۹۵۷ء ص ۱۳۱۔۱۲۶

خانہ جنگی وطوائف الملوکی

اندلس کے دوعلاقوں کے سردار معتضد اور ابن المظفر میں جنگ چھڑگئی، جنگ کے بعد المظفر بن الافطس نے قرطبہ سے لونڈیاں خریدنے کے لیے اپنے نمائندے بھیجے، راستے میں معتضد بن عباد نے انہیں روک لیا جس پر دوبارہ جنگ چھڑگئی اور ہزاروں مسلمان مارے گئے۔(الذخیرہ لابن بسام: ۳۶/۳)

امام ابن حزم اندلسی سے کسی نے طوائف الملوکی کے بارے میں دریافت کیا تو آپ کا جواب تھا: ''اس بارے میں اللہ تعالی مسلمانوں کا امتحان لے رہا ہے، اللہ حفاظت فرمائے، اس فتنے نے ادیان کو تباہ کردیا، سوائے اس شخص کے جس کو اللہ بچائے، ہمارے دور میں اندلس کا ہر حکمران اللہ ورسول کا نام لے کر جنگ کررہا ہے، مگر اس نے زمین میں فساد ہی پھیلایا ہے، اس کا مقصد صرف یہی ہے کہ اس کی حکومت طویل عرصے تک چلتی رہے۔(۱)

امارت وخلافت کے جھگڑے امت مسلمہ کی حکومت کو سپین اور ہندوستان میں ختم کرنے کا سبب ہیں، سپین میں مختلف ادوار میں ملوک الطوائف، ہشام ثانی (۳۶۶ھ) میں اُن کی حکومت، المرابطین اور الموحدین کا یکے بعد دیگر اندلس پر مسلط ہونا، بنونصر کے وقت ابوالحسن کی تخت نشینی کے مسائل (۲) ہندوستان میں محمود غزنوی کے بیٹوں کے درمیان جھگڑا، جلال الدین خلجی کا تخت سنبھالنا اور اُن کے بیٹے اور شہزادوں کے ساتھ اُن کا سلوک، سادات خاندان کی اولاد، لودھی کی اولاد اور پھر مغل خاندان کی آپس میں خلافت کا حصول یہی طریقہ رائج تھا۔(۳) لہٰذا مسلمانوں کی سیاسی زوال میں مسئلہ خلافت سے روگردانی کا اہم کردار تھا۔

---

(۱) دولۃ الاسلام فی الاندلس: ۲۳۸/۳

(۲) خلافت اندلس، نواب ذوالقدر جنگ بہادر، ص، ۱۴۲، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۲۰۰۶ء

(۳) محمد قاسم فرشتہ ترجمہ عبدالحی خواجہ، تاریخ فرشتہ۔ شیخ غلام علی اینڈ سنز لمٹڈ پبلیشرز لاہور، کراچی حیدرآباد

یہی آپس کے جھگڑے مسلمانوں کی سپین اور ہندوستان میں حکومت کے خاتمے کے سبب بنے۔(۱) مثلاً سپین میں خلیفہ سلیمان کا قتل، سلطان ہشام کے خلاف اُنکے بھائیوں کا دعویٰ، المنطو راور خود خلیفہ ہشام کا قتل، علی بن حمود کے بعد بغاوتیں، یوسف ابن الاحمر اور بعد میں پیدا ہوئی بغاوتیں۔(۲) ہندوستان میں سبکتگین کی اولاد میں لڑائی، محمود غزنوی کے بیٹوں کی آپس کی لڑئی، التمش اور دوسرے شہزدوں میں لڑائی، رضیہ سلطانہ کا دور، خلجی حکومت کی آپس کی لڑائی، جلال الدین کی اولاد کی تباہی، تغلق دور میں بہاوالدین، ابراہیم لودھی کی اولاد، شیر شاہ سوری دور میں اور شاہ جہاں کی اولاد میں لڑائی(۳) یہ ظاہر کرتی ہے کہ مسلمانوں کی سیاسی زوال میں خلافت کے جھگڑے کا اہم کردار ادا کر رہا تھا۔

دینی اختلاف

۞ اندلس میں فقہ مالکی کے پیروکاروں کی کثرت تھی، مگر فقہی وابستگی میں شدت کی وجہ سے بے شماری دینی مسائل پیدا ہوگئے، ابن حزم اندلس سے تعلق رکھتے تھے، مالکی فقہ نہ ماننے کے سبب انہیں بالآ خر شہر سے نکلنا پڑا، اور آخر عمر میں ایک گاؤں میں قیام کرنا پڑا۔ (۴)

۞ علی بن یوسف کے دور میں امام غزالی کی کتاب احیاء علوم الدین کو نذر آتش کرنے کی مہم چلی، ابن تاشفین نے حکم دیا کہ جو شخص اس کتاب کو رکھے گا اس کا گھر جلا دیا جائے گا، قرطبہ کے قاضی ابن حمدین کہتے تھے کہ جو شخص اس کتاب کو پڑھتا ہے وہ کافر ہو جاتا ہے، انہوں نے امیر علی بن یوسف کو اس پر آمادہ کیا کہ تمام کتابیں جمع کر کے جلائی جائیں،

---

(۱) ابوکلام آزاد، مسئلہ خلافت

(۲) خلافت اندلس، ص، ۵۴۔۲۳۲

(۳) تاریخ فرشتہ جلد اول، ص ۹۸ تا ۴۰۵

(۴) وفیات الاعیان لابن خلکان: ۳/۳۲۵

لہٰذا مسجد قرطبہ کے صحن میں کتابیں جمع کر کے زیتون کے تیل سے جلائی گئیں۔(۱)

شراب نوشی وعیاشی

عبدالرحمن بن حکم کے دور سے ہی شراب نوشی عام ہو چکی تھی، یہاں تک کہ نماز کے وقت لوگ آواز لگاتے ''الصلوہ یا مخمور الصلاۃ'' طلیطلہ کا گورنر'' مامون بن ذی النون'' اپنے مہمانوں کو مشروب کے طور پر شراب بھی پیش کرتا تھا۔(۲)

''زریاب'' ایران کا اک ہمہ دان جو فلکیات، جغرافیہ، موسمیات، نجوم، جمالیات، موسیقی ،تاریخ طبیعیات، کیمیا اور غذائیات پر عبور رکھتا تھا، وہ بیک وقت شاعر، موسیقار، گلوکار، فیشن ڈیزائر (fashion desire)، پالیسی ساز، رجحان ساز اور عود نواز تھا، اس ''زریاب'' کی پذیرائی اندلس میں اس طرح ہوئی کہ حکم کے بیٹے عبدالرحمن ثانی نے اپنے باپ کے وعدے کا پاس رکھتے ہوئے اسے درباری موسیقار کا عہدہ دیا، اور دوسوطلائی سکے ماہانہ تنخواہ مقرر کی، جلد ہی وہ اپنی صلاحیتوں، سرگرمیوں کی وجہ سے پورے اندلس میں مشہور ہوگیا، ''زریاب'' دنیا کا پہلا سلیبرٹی (Celebrity) ہے، مورخ المقری لکھتا ہے: ''زریاب سے پہلے اور نہ اس کے بعد دنیا میں کوئی ایسا شخص پیدا ہوا جسے عوام اور خواص میں اس قدر شہرت پذیرائی اور محبت ملی ہو'' موسیقی (Music) فیشن، اسٹائل (Style)، غذائیات اور جدید طرز رہن سہن میں اس نے انقلابات برپا کر دیے، اس نے ایک ساز عود میں پانچویں سر کا اضافہ کیا اور لکڑی کی بجائے عقاب کی ہڈی استعمال کی، قرطبہ میں دنیا کے پہلے موسیقی کے اسکول کی بنیاد رکھی، اس کی بنائی دھنوں اور نغموں نے پورے عرب کو اپنے سحر میں جکڑ لیا، ''زریاب'' وہ پہلا شخص تھا جس نے مختلف ہیئر سٹائل (Hair Style) ایجاد کئے خصوصا چھوٹے بالوں کا فیشن متعارف کروایا، زریاب نے ہی داڑھی شیو (beard Shave)

---

(۱) المعجب للمراکشی: ۱۸۷

(۲) المغرب فی حلی المغرب: ۵/ ۴۱۳، نہایۃ الارب للنویری: ۲۳/ ۲۱۷

کرنے کا رواج ڈالااور مختلف صابن ،کریم(cream)اور پاؤڈر (Powder) ایجاد کیے،خوش ذائقہ ٹوتھ پیسٹ (toothpaste) ایجاد کیا،مختلف موسموں کے لیے مختلف انداز کے لباس بنائے اور دن میں دو مرتبہ نہانے کو فروغ دیا،کہا جاتا ہے کہ اس نے طبقہ امراکی خواتین کے لیے بیوٹی پارلر(Beauty Parlour) بھی بنائے،اس نے مختلف سبزیاں اور پھل متعارف کروائے،جن سے لوگ پہلے واقف نہیں تھے اور سہ دورانی کھانے کاانداز پیش کیا جس میں پہلے سوپ یاسلاد وغیرہ پیش کیاجاتا ہے،اسے ابتدائیہ(starter) کہا جاتا ہے،اسکے بعد اصل کھانا یعنی جو بھی گوشت ، چاول جسے اصل دور کہا گیا،اور آخر میں میٹھاوغیرہ یایوں کہہ لیجیے کہ سلاد اور میٹھا کو اصل کھانے میں شامل کرلیا،اس نے شیشے کا گلاس ایجاد کیا،جبکہ اس سے پہلے صرف دھات کا گلاس ہوتا تھا۔(بحوالہ: عالم اسلام کے چارسقوط ،جامعہ الرشید کراچی)

ہندوستان کے مسلم دور میں رکن الدین فیروز ، علاؤالدین اور معزالدین کی عیش وعشرت ، مبارک شاہ کے دور میں عورتوں کی فراوانی ،مغل دور میں جیسے داراشکوہ (شاہ جہاں) اور بعد کے اکثر مغل بادشاہ کے عیش وعشرت کی انتہا کردی (۱) دوسری طرف اسپین کے مسلم دور میں المہدی دور، الناصر سے پہلے چند بادشاہ، ہشام المؤید کا دور،محمد مہدی باالله، المستعین باالله اور المستظہر کے دور میں یہ معاملہ کافی عروج پر پہنچ گیا تھا۔(۲)

فضول خرچی

ظ عبدالرحمن بن حکم بن ہشام یعنی عبدالرحمن ثانی نے اپنی لونڈی کو منانے کے لیے کمرے کا دروازہ درہموں سے بھری پوٹلیوں سے بنانے کا حکم دیا، جب اس نے دروازہ کھولاتو درہم کی برسات ہوئی یہ تقریباً بیس ہزار درہم تھے، اس کے بعد بادشاہ دس ہزار

---

(۱) تاریخ فرشتہ،ص ۲۵۷،سلطنت مغلیہ،ص ۲۶۲

(۲) خلافت اندلس بنی امیہ،عبدالقوی ضیاء،ص ۶۴۴

سونے کے سکے دینار کا ہار بنوا کر اسے دیا، درباریوں نے اشکال کیا تو کہنے لگا: اسے پہننے والی اس سے بھی زیادہ قیمتی اور بلند مرتبہ ہے“ (البیان المغرب لابن عذاری: ۱۳/ ۱۷۹)

۞ اشبیلیہ کے حکمران معتمد بن عباد کی لونڈی ”رمیکیہ“ ایک دن دونوں باغ میں بیٹھے ہوئے تھے ”رمیکیہ“ نے کہا کاش بادل آتے اور بارش ہوتی، معتمد نے فوری طور پر حکم دیا کہ عنبر اور عود جلائی جائے، ہر طرف اتنی عود و عنبر جلی کہ چاروں طرف دھویں کے بادل چھا گئے، اس کے بعد بادشاہ نے حکم دیا کہ اس دھوئیں کے اوپر سے عرق گلاب چھڑکا جائے، یوں بارش برسی اور گھٹا چھائی۔ (وفیات الاعیان لان خلکا: ۴/ ۴۲۸)

بلند و بالا عمارتیں

عبدالرحمن ناصر نے ٹیکس سے حاصل ہونے والی آمدنی عمارتوں کے لیے مختص کر رکھی تھی۔ (اعلام الاعلام، لابن الخطیب: ۳۸) خلیفہ ناصر کی باندی کا انتقال ہوا تو اس نے بیش بہا مال ترکہ کے طور پر چھوڑا جس سے خلیفہ ناصر نے مدینۃ الزہراء تعمیر کروایا، یہ شہر خوبصورتی میں اپنی مثال تھا، اس میں سونے اور چاندی کے قبے بھی بنائے گئے ”مدینۃ الزہراء“ کے مقابلہ میں ”خلیفہ حاجب المنصور“ نے ”مدینۃ الزاہرہ“ تعمیر کروایا، جس میں دنیا کے قیمتی ترین پتھر منگوائے اور مدینۃ الزہراء کو مات (record break) کر دیا، مگر یہ شہر صرف تیس سال ہی آباد رہا۔ (۱)

لاپرواہی

اسپین پر قابض عیسائیوں سے لڑنے والے مسلمانوں کی تعداد ۸۰ ہزار تھی جبکہ دشمن دو کروڑ بیس لاکھ، مسلمانوں کے خلاف جب تین لاکھ فوجیوں نے چڑھائی کی تو مسلمانوں کی مدد کے لیے عالم اسلام نے صرف ۱۵۰۰ پونڈ کی مدد کی۔ (اسباب زوال امت: ۲۵)

(۱) البیان المغرب لابن عذاری: ۲/ ۴۱۰، نفح الطیب للمقری: ۲/ ۶۵

جب مسلمانوں سے اندلس چھینا جارہا تھا تو اس وقت مراکش کا صدر المقری مسلمانوں کو عیسائی ہوجانے کی ترغیب دے رہا تھا، ''فاس'' کے گورنر ''البغدادی'' نے ۱۰۰ جوانوں کو اس لیے کوڑے لگوائے کہ وہ یہ شعر پڑھ رہے تھے ''لا تفرق بیننا و بین اخواننا البربر'' جبکہ عیسائی مسلمانوں کو مٹا رہے تھے، فاس کے مفتی اعظم نے فتوی دیا تھا کہ ''بربر قبائل شریعت پر عمل نہ کرنے کی وجہ سے دائرہ اسلام سے خارج ہوچکے ہیں''۔(۱)

نااہل خلفاء کی قیادت

اگر ہم برصغیر پاک وہند کی مسلم تاریخ کا مطالعہ کریں تو مختلف ادوار میں ایسے بادشاہ گزرے ہیں جنہوں نے اپنی نااہلیت ثابت کی ہے، جیسے کہ محمود غزنوی کے بعد اُن کی اولاد، تغلق خاندان کے آخری فرماں روا، مبارک شاہ کا شہزادوں کو قتل کرنا، ناصر الدین کا دور شہاب الدین کے بعد اُن کی اولاد کا تخت کے حصول کے لئے لڑنا اُن کی نااہلی ثابت کرتی ہے۔(۲) دوسری طرف اسپین کے مسلم دور کے مطالعے سے پتہ چلا ہے کہ اسپین میں شروع سے بادشاہ تبدیل کرنا اُن کی ایک عادت بن گئی تھی، عبدالرحمن اول ایک اچھے انسان تھے پر ان کے جانشینوں نے نااہلی کا ثبوت دیا، المنطور کا دور حکومت، المہدی (۱۰۱۰ء) اور اُن کی عیش وعشرت بنوحمود کے دور حکومت میں تخت نشینی، المرابطین اور الموحدین کے آخری جانشین، بنونصر اور الاحمر کے آخری فرماں رواؤں کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان جانشینوں میں کافی لوگ نااہل تھے۔(۳)

---

(۱) اسباب زوال امت: ۱۳۱، بحوالہ: عالم اسلام کے چار سقوط، جامعہ الرشید کراچی

(۲) تاریخ فرشتہ، ص ۱۷۱، تا ۴۷۶، سلطنت مغلیہ ص، ۲۲۱

(۳) خلافت اندلس، ص ۱۴۷، ۲۳۲

دولت کی غیر منصفانہ تقسیم

معاشرے میں دولت کی غیر منصفانہ تقسیم معاشرے کو ختم کر دیتی ہے ،دولت کی گردش سے ہی معاشرہ ترقی کرتا ہے،مسلم تاریخ میں عبدالرحمن اول نے اپنے عزیزوں کو دور سے بلوا کر اچھے اچھے عہدوں پر فائز کیا،تلواروں کو مزین کرنا، جاگیریں اور القابات دینا، عبداللہ کے دورِ حکومت میں بعض لڑائیاں چھوٹی چھوٹی آرائش وزیبائش پر لڑی گئیں ہندوستان کی تاریخ پر اگر نظر ڈالیں تو تقریباہر دور میں القابات اور اپنے لوگوں کو آگے بڑھنے کی ترجیح کا رواج عام تھا اور یہی امیر لوگ بادشاہ کا تختہ اُلٹ دیا کرتے تھے، جیسے آرام شاہ کی دورِ حکومت کے حالات ، رکن الدین کا عیاشی پر دولت اُڑانا اور التمش کا غلاموں کی ایک بڑی تعداد قائم کرنا، مبارک شاہ اور علاؤالدین کی عیاشی، تغلق اور خاندان سادات کے ابتدائی دور کے حالات کے مطالعے سے ہمیں دولت کی تقسیم کا بہ خوبی اندازہ ہوتا ہے۔

خلاصہ: اسپین اور برصغیر پاک وہند پر مسلمانوں نے اپنے دورِ حکومت میں وہ کارنامے انجام دیئے جس کی مثال ملنا مشکل ہے۔لیکن ان خوبیوں کے ساتھ ساتھ بعض مسلم بادشاہوں سے وہ غلطیاں سرزد ہوئیں جس کی وجہ سے ان سلطنتوں کا شیرازہ بکھیرنے لگا، آج بھی مسلمان اقوام اگر ماضی سے سبق سیکھ لے اور اپنے آباواجداد کی ان لحظوں والی اغلاط کو نہ دہرائیں جن کی وجہ سے صدیوں نے سزا پائی تو یقیناً وہ دور بعید نہیں کہ اس دنیا پر ایک بار خلافت راشدہ والا دور آسکتا ہے اور دنیا پھر سے مسلمانوں کے قدموں میں ہوگی۔ان شاءاللہ

ہندوستانی مسلمان اسپین کی تاریخ سے درس عبرت لیں

”یاد رہے کہ اسپین سے مسلمانوں کے اخراج کا موضوع ۱۹۳۰ء کے دہے سے بھارت کے ہندو نازیوں کے عمیق مطالعے کا مرکز رہا ہے، وہ اُسی وقت سے ہندستان میں اسپین کے منظر نامے کو دہرانے کی منصوبہ بندی کر رہے ہیں اور (برائے نام اور غیر مؤثر ہی سہی لیکن)

مسلم قائدین نے بھی اسپینی ہتھکنڈوں سے بچاؤ کے امکانات پر غور کیا ہے، ہندوؤں کے (نام نہاد) اونچی ذات والوں کے لیے ہندستان کی سب سے بڑی اقلیت کے طور پر یہ مسلمان ایک بڑا اسر درد بن چکے ہیں (جو ۱۹۸۱ء کی مردم شماری رپورٹ کے مطابق ملک کی مجموعی آبادی کا گیارہ اعشاریہ تین فی صد ہیں) لیکن (المیہ یہ ہے کہ) عصر حاضر کے مسلمان اسپین میں اسلام اور مسلمانوں کے زوال کی تاریخ اور ہندستان میں اُن کے اِرد گرد رچائی جانے والی گھری سازشوں سے پوری طرح ناواقف ہیں، اس تحریر کے ذریعے اس موضوع پر کچھ روشنی ڈالنا ہے تاکہ مسلمانوں کے اہل فکر و دانش اس سلسلے میں مزید تحقیق کرسکیں۔(۱)

۱۔ہندستان ہی کی طرح اسپین میں بھی مسلمان تین طبقوں میں تقسیم تھے۔(۱) اصل عربوں کی نسل (۲) عرب مردوں اور اسپینی ماؤں کی اولادوں پر مشتمل نسل (۳) عیسائیت کو ترک کر کے اسلام قبول کرنے والے ہسپانوی مسلمان۔

سقوط غرناطہ کے فوراً بعد اصل عربوں کی اکثریت نے اپنی جانیں بچانے کے لیے (جائداد بچانے کی نہیں، کیونکہ انہیں اپنی دولت ساتھ لے جانے کی اجازت نہیں تھی) سپین چھوڑ کر تیونس اور مراکش جیسے عرب ملکوں کا رخ کیا، ان میں سے بھی سب اپنی جان نہیں بچا سکے بلکہ ان کی اکثریت راستوں میں عیسائی لشکروں کے حملوں میں ہلاک کر ڈالی گئی۔

۲۔ہسپانیہ میں باقی رہ جانے والے اصل عرب مسلمانوں کو، جنہوں نے اپنے نئے وطن کو نہ چھوڑنے اور وہیں رہنے کا فیصلہ کیا تھا نئے عیسائی حاکموں نے غیر ملکی اور اسپین کے غارت گر قرار دے دیا (جیسا کہ ہندستان میں بھی کہا جاتا ہے)۔

۳۔مسلمانوں کے اُس دوسرے گروہ نے، جن کے باپ مسلمان لیکن مائیں ہسپانوی النسل عیسائی تھیں کنگ فردیننڈ کے اِس وعدے پر اعتبار کرتے ہوئے کہ اُن کی حکومت

---

(۱) یہ ہفت روزہ دلت وائس، بنگلور ۱۶۔۳۱ مئی ۱۹۹۹ کے اداریے کا عنوان ہے جو اُس کے ایڈیٹر وی ٹی راج شیکھر (پیدائش ۱۹۳۲) نے بیس سال قبل لکھا تھا، مذکورہ اداریے سے ماخوذ ہے۔

یں سبھی شہریوں کو، کامل مذہبی آزادی ہوگی، ہسپانیہ ہی میں رہنے کا فیصلہ کیا، ابتدائی برسوں کے دوران اُن کی جانوں اور املاک پر عیسائی (دہشت گردوں) کے حملے ہوتے رہے لیکن (کنگ فردینینڈ کی نئی عیسائی حکومت نے) انہیں عارضی واقعات قرار دے کر نظر انداز کر دیا (اور مجرموں کو کبھی سزائیں نہیں دی گئیں) یہی ہندستان میں ہوا کہ آزادی کے بعد اُن سے مکمل مذہبی آزادی اور برابر کے انسانی حقوق کا وعدہ کیا گیا لیکن فرقہ وارانہ فسادات میں فسادیوں کھلی چھوٹ دی گئی اور اُن کے خلاف کبھی کوئی سخت کارروائی نہیں کی گئی، اِس کا موازنہ تقسیم ہند ۱۹۴۷ء کے بعد ہندستان میں ہونے والی تبدیلیوں سے کیا جاسکتا ہے۔

غرض اسپین میں اُن دوسرے زُمرے والے مسلمانوں کی جان و مال پر ہونے والے حملے کبھی کم نہیں ہوئے بلکہ قریب پچاس سال تک بے روک ٹوک جاری رہے، بالکل ویسے ہی جیسے آج، آزادی کے بیالیس سال بعد بھی ہندستان میں ہو رہے ہیں۔

ابتدائی برسوں میں مسلمانوں نے کچھ مزاحمت بھی کی کہیں کہیں گلیوں میں کچھ جنگ و جدل کا ساسماں دیکھنے میں آیا لیکن بتدریج یہ مزاحمت دم توڑ گئی اور یک طرفہ حملوں میں مزید شدت آتی چلی گئی، اب تو پولیس نے بھی ہندستان میں مسلمانوں کے قتل عام کی چھوٹ دے رکھی ہے۔

ان کے مکان اور املاک جلائے جارہے ہیں فوج، پولیس اور انتظامیہ کے دروازے ان کیلئے بند ہیں، اس کے باوجود اسلام کی حفاظت کی خاطر مسلم تنظیمیں خود رو گھاس کی طرح وجود میں آتی چلی جارہی ہیں، نہ اسلام کی حفاظت کی فکر نہ مسلمانوں کی حفاظت کی تدبیر، حکمراں طبقے کی پالیسیوں کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اِس میں اور اسپین میں فرڈنانڈ اور ازابیل کی پالیسیوں میں بہت زیادہ مماثلت ہے فرق صرف اتنا ہے کہ بیسوی صدی میں اقوام متحدہ کے منشور برائے انسانی حقوق اور بین الاقوامی رائے عامہ کی وجہ سے اعلیٰ ذات کے ہندو زیادہ تیز اور مکاری میں زیادہ سلیقہ مند ہیں، آئے دن کے منظم

مسلم کش فسادات میں جانی اور مالی نقصان، سب سے بڑھ کر یہ کہ مسلمانوں میں خوف کی کیفیت، دفاع، افواج اور پولیس میں مسلمانوں کا صفایا کر کے ان شعبوں میں برہمنی سوچ کا فروغ دیا جانا، سرکاری نوکریوں اور اداروں میں تقرری کے دروازے مسلمانوں کیلئے بند کر دینا، تعلیم اور ذرائع ابلاغ مثلاً ریڈیو اور ٹیلی ویژن وغیرہ میں برہمنی سوچ کا پھیلا دیا جانا۔

۴۔ادھر اسپین میں جہاں منظم عیسائی گروپ مسلمانوں کو قتل کرتے پھر رہے تھے وہیں کنگ فردی ننڈ کی حکومت نے سرکاری نوکریوں (سروسز services، خدمات) سے مسلمانوں کو بے دخل کرنے کی پالیسی اختیار کی اور درج ذیل اقدامات کیے:

پہلے تو نظم و نسق سے عربی زبان کو بہ یک بینی و دو گوش نکال باہر کیا گیا پھر مساجد میں قائم مدارس پر یہ پابندی عائد کر دی گئی کہ وہ عمومی نصابی مضامین مثلاً سائنس، ریاضی، تاریخ اور فلسفہ وغیرہ کی تعلیم نہیں دے سکتے وہ صرف مذہبی تعلیم تک خود کو محدود رکھیں، اور ملک کے عیسائیوں کو جو تاریخ پڑھائی جانے لگی اس میں پوری مسلم حکمرانی کو بربریت کا تاریک دور قرار دے دیا گیا اور اسپین کی ترقی میں مسلمانوں کی حصہ داری کو بیک قلم مسترد کر دیا گیا

۵۔ہتھیار چھپا کر رکھنے اور خفیہ اجلاس کرنے کے الزامات کی آڑ میں ہسپانوی پولیس کی جانب سے مسلمانوں کے گھروں کی تلاشی معمول بن گئی، اصل عرب مسلمانوں کو عیسائیوں کے دشمن اور اسپین کے غارتگر کے طور پر نمایاں کیا جانے لگا، اور، عیسائی سے مسلمان ہو جانے والوں کو یہ باوَر کراتے ہوئے کہ اُن کے اَجداد کو جبراً مسلمان بنایا گیا تھا دوبارہ عیسائیت قبول کرنے پر مجبور کیا جانے لگا اور کہا یہ جانے لگا کہ اب چونکہ نظام جبر ختم ہو چکا ہے اس لیے اُنہیں عیسائیت میں واپس آجانا چاہیے۔

۶۔اسلامی شریعت کو غیر قانونی قرار دے دیا گیا اور اسلامی طریقے سے ہونے والے نکاحوں کا سرکاری رجسٹریشن لازمی کر دیا گیا (آپ دیکھ سکتے ہیں کہ) اسپین میں اختیار کردہ اِن سبھی حربوں پر ہندستان میں عرصہ دراز سے عمل درآمد جاری ہے! اس طرح سقوطِ ہسپانیہ

کے بعد منظم طریقے سے مسلمانوں کو تضحیک و تذلیل، لوٹ مار اور قتل و غارت گری کا نشانہ بنایا جاتا رہا، اُن کی معیشت کو تباہ کرنے کے لیے اُن کے گھروں اور دوکانوں وغیرہ کو نذرِ آتش کیے جانے کی حوصلہ افزائی کی جاتی رہی، مسلمانوں کے دوبارہ عیسائیت قبول کرنے کی جھوٹی تقریبات منعقد کی جاتی تھیں اور پھر پورے ہسپانیہ میں اس کی منظم تشہیر کی جاتی تھی ہندستان میں بھی ہندو نازی تنظیمیں وہی سب کچھ کر رہی ہیں۔ (اور اب تو اکیسویں صدی کی اِس دوسری دہائی کے اختتام کے قریب، اُن کے لیے نام نہاد 'لَو جہاد' اور 'گھر واپسی' کی اصطلاحیں تک وضع کر لی گئی ہیں)

۷۔ ہسپانوی مسلمانوں کی پہلی دو نسلوں نے تو اپنے بچوں کو مساجد اور گھروں میں عربی (اور قرآن) سکھا کر اپنے دین کو محفوظ رکھنے کا 'بے مزاحمت طریقہ کار' اختیار کر رکھا تھا لیکن بتدریج وہ اپنی غیرت و حمیت کھوتے چلے گئے اور جب صرف سرکاری ایجنسیوں کے توسط ہی سے شادیاں کروانے کا حکم دیا گیا تو ابتدائی مرحلے میں تو مسلمانوں نے متوازی طور پر دونوں طریقوں سے شادیاں کرنے کا طریقہ اپنائے رکھا یعنی پہلے گھر پر شرعی طریقے سے نکاح کیا اور پھر سرکاری طریقے سے بھی شادی کی لیکن بتدریج گھروں میں خفیہ طور پر ہونے والی تقریبات نکاح ختم ہوتی چلی گئیں اور صرف سرکاری شادی ہی باقی رہ گئیں، اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ گھروں میں نکاح کی تقریب کو ممنوع قرار دے دیا گیا تھا اور مسلمانوں کے لیے اس طرح چھپا کر نکاح کرنا آسان نہیں رہ گیا تھا، اس دوران خود کو (نام نہاد) اَشرافیہ کہلانے والے امیر مسلمان، اسپین کے غریب مسلمانوں کو اسپین ہی میں بے یار و مددگار چھوڑ کر ترکی مصر، تیونس اور مراکش وغیرہ جا کر آباد ہو گئے، کچھ اسی طرح کے حالات ہندستان میں بھی ہیں۔ متمول، انگریزی تعلیم یافتہ مسلمان عملاً برہمنیت اختیار کرتے جا رہے ہیں اور نام نہاد اعلیٰ ذات والے ہندوؤں کی کاربن کاپی (Carbon copy) بن کر رہ گئے ہیں، انہی کی جیسی شاندار کالونیوں (Colony) میں رہتے ہیں جبکہ غریب مسلمان جو مجموعی مسلم آبادی کا ۹۵ فی

صدیں' باڑوں' (اور جھونپڑ پٹیوں، اور کچی بستیوں) میں رہتے ہیں اور دلتوں جیسی یا اُن سے بھی بدتر زندگی گزارتے ہیں حالانکہ یہی لوگ اسلام کے نسبتاً بہتر پیرو ہیں لیکن متمول مسلمانوں نے انہیں بے سہارا چھوڑ رکھا ہے، اور اس طرح وہی (غریب مسلمان) اَینٹی (anti) مسلم فسادات میں سب سے زیادہ مارے بھی جاتے ہیں۔

۸۔اسپین میں سقوط کے بعد کی ابتدائی نصف صدی میں نفرت کے جو بیج بوئے گئے تھے وہ فصل دوسرے نصف میں پوری طرح پک کر تیار ہو چکی تھی اور عیسائیوں کی منشا کے عین مطابق نتائج برآمد ہونا شروع ہو گئے تھے یعنی وہاں مسلمانوں کی کوئی سیاسی قیادت نہیں رہی، مسلمانوں کا تحفظ کرنے والی تنظیمیں اور ان کی قیادت کرنے والی روشن ضمیر شخصیتیں بھی نہیں رہیں، بے بصر مذہبی رہنما سرکاری پروپیگنڈے اور حکومت کی اسلام دشمن کارروائیوں کا نہ کوئی توڑ کر سکے نہ ملت کی صحیح رہنمائی کا حق ادا کر سکے، وہاں ضرورت تھی صالح، طاقتور اور مسلح مسلم قیادت کی جو ناپید تھی، جو لوگ مصر اور مراکش وغیرہ سے مدد حاصل کرنے کی باتیں کرتے تھے، خود خوف زدہ مسلمان ہی سرکار دربار میں ان کی نشاندہی کر دیتے تھے اور وہ بے موت مارے جاتے تھے، وہاں فی الواقع ہسپانوی مسلمانوں کی مدد کے لیے ایک احمد شاہ ابدالی (اور صلاح الدین ایوبی) کی ضرورت تھی مگر اس وقت نہ کوئی ابدالی تھا نہ ایوبی! (کیا ٹھیک یہی صورت حال آج بھی نہیں ہے؟)

۹۔مسلمانوں کی اکثریت ملک کے عیسائی قومی دھارے میں شمولیت ہی کو نجات سمجھے بیٹھی تھی، اور جنہیں موقع ملا وہ باقی سب کو اُن کے حال پر چھوڑ کر دوسرے ملکوں میں، جہاں جن کو پناہ ملی، چلے گئے، سولہ سو بارہ عیسوی میں اسپین چھوڑنے والا مسلمانوں کا آخری جتھہ ملاؤں پر مشتمل تھا، ہندستان میں بھی مسلمانوں کی قیادت اعلیٰ ذاتوں والی ہندو پارٹیوں کا دُم چھلہ بن کے رہ گئی ہے، لے دے کے صرف دینی قیادت نے مسلمانوں کے مذہبی اور ثقافتی تشخص کو باقی رکھنے کی اپنے امکان بھر کوشش کی ہے، فی الواقع اسپین کے تجربے کو عظیم تر

توانائی اور استعداد کے ساتھ ہندستان میں آزمایا جا رہا ہے۔

۱۰۔اردو کا ہندستان میں وہی حال ہوا ہے جو اسپین میں عربی کا ہوا تھا،مسلمان اپنے طور پر کسی نہ کسی طرح،مدارس کے ذریعے دینی تعلیم (اور کچھ صوبوں میں کسی حد تک اردو کو بھی باقی رکھے ہوئے ہیں،انگریزی تعلیم یافتہ متمول سیکولر مسلمان ،اپنے غریب بھائیوں سے با لعموم پوری طرح کنارہ کش ہیں، 1947ء- 48 میں، پنجاب، ہریانہ، یوپی، بہار اور مدھیہ پردیش، مہاراشٹرا، آندھرا پردیش، اور کرناٹک کے کچھ علاقوں سے اردو زبان کا خاتمہ، آہستہ آہستہ اردو اسکولوں کا بند کیا جانا، یہ سب مسلم دشمن پالیسیوں کی واضح مثالیں ہیں۔

۱۱۔ہر وہ مسلم تنظیم جو اعلیٰ ذاتوں کی حمایت نہیں کرتی مسلم قوم پرست قرار دے دی جاتی ہے،اس طرح عام مسلمانوں اور متمول مسلمانوں کے درمیان خلیج دن بہ دن بڑھتی جا رہی ہے، یہاں تک کہ مسلمانوں کے قتل عام کی وارداتوں کو ایک فطری امر تصور کیا جانے لگا ہے اگر کبھی کسی بین الاقوامی اسلامی پلیٹ فارم سے ہندستانی مسلمانوں کا مسئلہ اٹھانے کی کوشش بھی ہوتی ہے تو اسے ہندستان کے داخلی امور میں بے جا اور نا قابل تسلیم بیرونی مداخلت قرار دے کر مسترد کر دیا جاتا ہے۔

۱۲۔ہندستانی نصابی کتب سے مسلمانوں کی تاریخ کو نکالا جا رہا ہے اور ہندستان کے لیے جان دینے والے مسلمانوں کا بھی تذکرہ کرنے سے پرہیز کیا جانے لگا ہے، یہاں تک کہ ٹیپو سلطان جیسے عظیم ہندستانی شہید سپوت کے نام سے ملک کے نوجوانوں کی اکثریت ناواقف ہے جبکہ تاتیا ٹوپے (Tatya Tope) جنہوں نے ملک کے لیے نہیں، محض اپنے وظیفے کے لیے جنگ کی تھی، اور' جھانسی کی رانی لکشمی بائی جس نے اپنے متبنّٰی بیٹے کو سلطنت کی جا نشینی دلانے کے لیے جنگ کی تھی، اُن کے نام ہر ہندستانی کے ہونٹوں تک پہنچا دیے گئے ہیں! (اور اب تو ٹیپو سلطان کی یاد منانے پر بھی کئی جگہ پابندی لگ چکی ہے۔)

۱۳۔سائنس، طب، فنون لطیفہ وغیرہ میں گراں قدر خدمات یا بہادری کے لیے کوئی بھی

مسلمان ایوارڈ نہیں پاتا۔

۱۴۔ملک کی آزادی کے لیے لڑنے اور جیل جانے والے مولانا آزاد، محمد رفیع قدوائی سید محمود، اور ہمایوں کبیر جیسے عظیم مسلم رہنماؤں کے نام پر کوئی سڑک یا عمارت معنون نہیں کی جاتی جبکہ نصف درجن سے زائد نام نہاد اعلی ذات والے ہندو قائدین کے ناموں سے منسوب مقامات یا اداروں سے شاید ہی کوئی شہر بچا ہو۔(اور اب تو مسلم نام والے قدیم شہروں کے نام بھی بدلے جانے لگے ہیں)

۱۵۔نفسیاتی جنگ کے محاذ پر مسلم پرسنل لا، جسے اب یکساں سول کوڈ کا نام دے کر اسے تحلیل کرنے کی کوشش کی گئی ہے، ہندو ثقافت کی بڑائی کا شور، ملک کی ترقی اور تعمیر میں مسلمانوں کی خدمات کو کم کرکے دکھانے کیلئے بدنام زمانہ مسلم دشمن شخصیات مثلاً ''مہاتما'' گاندھی، جی بی تلک، مدن موہن مالویہ، ویر ساورکر، لالا لاجپت رائے کو بطور ہیرو پیش کرنا ہندوستان کی تاریخ دوبارہ لکھنا، جو کاروبار مسلمانوں کے ہاتھ میں ہیں مثلاً گوشت کا کاروبار اسے گناہ بتا کر گائے کی حفاظت کی پالیسیوں کو فروغ دینا اور مسلمانوں کے ذریعے امپورٹ (Import) ایکسپورٹ (ecport) کے کاروبار کو اسمگلنگ (Smuggling) سے تعبیر کرنا، یہ وہ حرکتیں ہیں جن سے ہندوستان کے سادہ لوح عوام کو گمراہ کیا جاتا ہے جس سے مسلمانوں کے خلاف نفرت پیدا ہوتی ہے۔

۱۶۔مسلم اکثریتی حلقہ انتخاب کو مختلف طریقوں سے تقسیم کیا جاتا ہے تاکہ مسلمانوں کے ووٹ بے وزن ہو جائیں اور ان علاقوں پر ایسے انتہا پسند سیکولر مسلم لیڈروں کو مسلط کر دیا جاتا ہے جنہوں نے اب گائے کی پرستش شروع کر دی ہے اور ان مناظر کو باقاعدہ ٹیلی ویژن پر دکھایا جاتا ہے، بدقسمتی سے حکومت سے ناامید مسلم قائدین ہندوؤں پر مزید انحصار کرنے لگتے ہیں اور اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ ہندو (دلت) عوام اس پروپیگنڈے کا سب سے زیادہ شکار ہیں، اس وقت تو محض بیج بوئے جا رہے ہیں فصل کاٹے جانے کا وقت تو ابھی آنا

ہے اور فصل کاٹے جانے کے وقت ہندوستان میں جو کچھ کاٹا جارہا ہوگا وہ وہی ہوگا جو اسپین میں ہو چکا ہے الا یہ کہ مسلمان جلدی سے جوابی اقدامات کی تیاری کر لیں، یہی وقت ہے جب مسلمان یا ان میں دانشمند حضرات اٹھ کھڑے ہوں اور ہندوستان میں اسپین کی تاریخ دوہرائے جانے کو روک دیں، اسلام کی حفاظت ہمیشہ عوام نے کی ہے نہ کہ اونچے طبقے سے تعلق رکھنے والوں نے، دولت مند مسلمانوں کا تناسب (استثناء کے ساتھ) پانچ فی صد بھی نہیں ہے جو استحصال کرنے والے اعلیٰ ذات والوں کے ساتھ شامل ہو رہے ہیں، ہوسکتا ہے یہ طبقہ اسلام کی باتیں کرتا ہو مگر مسلمانوں کو بھول چکا ہے، برائے مہربانی یہ بات ذہن میں رکھیں کہ مذہب اپنے ماننے والوں کی حفاظت نہیں کرتا بلکہ مذہب کے ماننے والے مذہب کی حفاظت کرتے ہیں، یاد رکھیں کہ ہندوستان میں اسلام کو بچانے کیلئے مسلمانوں کو بچانا پڑے گا۔(Tuesday, 30 Apr، روزنامہ معیشت)

عروجِ اُمت کا منہاج

جب قوم ایک بار پستیوں کی جانب لڑھکنا شروع ہو جائے تو پھر راستے میں سے واپسی ممکن نہیں ہوتی، زوال جب انتہا کو چھونے لگے تو پھر عروج کا آغاز ہوتا ہے، تاریخ کا اصول ہے کہ ہر تہذیب کا ایک نقطہ عروج ہوتا ہے، بلند ترین چوٹی کو سر کر لیا جائے تو آگے نشیب ہی ہوتا ہے، زوال کا عمل شروع میں تو غیر محسوس ہوتا ہے لیکن آگے چل کر نمایاں ہو جاتا ہے بالآخر بلندی، پستی میں تبدیل ہو جاتی ہے اور عروج، زوال میں بدل جاتا ہے، عروج و زوال کی داستان بھی تغیر پذیر موسموں کی طرح ہے، زوال سے دوچار ہونا ایک فطری عمل ہے لیکن اس کے کچھ اسباب ہوتے ہیں، دورِ عروج میں جسدِ ملت کو کچھ بیماریاں لاحق ہو جاتی ہیں کیونکہ یہ ایسا دور ہوتا ہے جس میں فکر کی جگہ بے فکری، یقین کی جگہ بے یقینی، مذہب کی جگہ خرافات، صراطِ مستقیم کی جگہ بے راہ روی، محنت و مشقت کی جگہ عیش و عشرت اور شمشیر و سنان کی جگہ طاؤس و رباب لے لیتے ہیں، جس طرح اندھیری رات کے بعد خوشنما سویرا

طلوع ہوتا ہے اور خزاں کی ویرانی میں موسم بہار کی آمد کی نوید بھی شامل ہوتی ہے اسی طرح زوال کو بھی عروج میں بدلا جاسکتا ہے، امت کی بقاء اسلام کی نشاۃ ثانیہ سے وابستہ ہے؛ لہٰذا اس کی جد و جہد فرض عین ٹھہری۔ (ماہنامہ منہاج القرآن، ستمبر 2007ء)

مسلمانوں کا زوال اسلام کا زوال نہیں

مسلمانوں کے زوال کا تعلق اقدار (Values) سے ہیں، جب مسلمان اعلیٰ اقدار کے حامل تھے تب عروج پر تھے اور جب وہ اقدار پامال ہونا شروع ہوئیں تو وہ زوال کا شکار ہوئے، اسلام کسی تمدنی فلسفہ یا علاقائی سطح تک محدود نہیں، عرب کے لوگوں نے جب خلافتِ راشدہ کے بعد سیاسی سطح پر اس سے انحراف کیا تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ اسلام ختم ہوگیا، عجم کے لوگوں نے فنونِ لطیفہ کے حوالے سے اس میں غیر حقیقی چیزوں کو شامل کیا تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ اسلام کا تہذیبی رنگ گدلا گیا مشرق کے لوگوں نے مقامی رسومات کو اعتقادات کا حصہ بنالیا تو اسلام کا اصولیاتی نظام ناقابل اخذ ہوگیا، ایسا ہرگز نہیں، اسلام دراصل کائنات کے لیے اللہ کا منشور ہے اور دنیوی اور اخروی فلاح کے لیے نظامِ الٰہی ہے، حضرت آدمؑ سے لے کر جتنے بھی انبیاءؑ آئے اس منشور کی تکمیل اور رسول اللہؐ پر اس منشور کی اکملیت ہوگئی، اس کے بعد روزِ حشر تک کسی منشور کو نہیں آنا، احکامات الٰہی ناقابل تبدیل ہیں، ہاں اس میں اجماع اور اجتہاد کی گنجائش رکھی گئی ہے تاکہ کوئی بھی مسئلہ درپیش ہونے کے بعد لوگ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں کسی نتیجہ پر پہنچ پائیں، اس گنجائش کی وجہ یہ ہے کہ معاشرتی اور اقتصادی تبدیلیاں ہر دور میں ہوتی رہیں گی جن کے ساتھ ضروریات زندگی اور مسائل کی نوعیت بھی تبدیل ہوتی رہے گی۔

عالم اسلام کی جماعتوں اور مفکرین کو مشورہ

مولانا علی میاں ندویؒ فرماتے ہیں: ”آج عالم اسلامی کے قائدین و مفکرین اور اس

کی جماعتوں اور حکومتوں کے لیے کرنے کا کام یہ ہے کہ مسلمانوں کے دلوں میں اسلام کا تخم دوبارہ بونے کی کوشش کریں، جذبہ دینی کو پھر متحرک کریں، اور پہلی اسلامی دعوت کے اصول اور طریق کار کے مطابق مسلمانوں کو ایمان کی دعوت دیں اور اللہ و رسول اور آخرت کے عقیدے کی پوری طرح تبلیغ و تلقین کریں، اس کے لیے وہ سب طریقے اختیار کریں جو اسلام کے ابتدائی داعیوں نے اختیار کیے تھے، نیز وہ تمام وسائل اور طاقتیں کام میں لائیں جو عصر جدید نے پیدا کر دی ہیں... قرآن مجید اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت اب بھی زندگی اور طاقت کا ایسا سر چشمہ ہے جس سے عالم اسلام کی خشک رگوں میں زندگی کا گرم اور تازہ خون پھر دوڑ سکتا ہے، ان کے مطالعہ اور اثر سے اس جاہلی دنیا کے خلاف بغاوت کا جذبہ ابھرتا ہے، اور ان کی تاثیر سے ایک اونگھتی سوتی قوم ایک پر جوش، بے چین اور سرگرم عمل قوم بن جاتی ہے''۔

اپنی نسل کو اپنی تاریخ بتائیں

ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم تاریخ کے بھولے ہوئے اسباق کو یاد دلائیں۔آج پورے ملک میں دینی مدارس بھی ہیں اور مسلم انتظامیہ کے تحت عصری تعلیمی ادارے بھی۔بیشتر تعلیمی اداروں کا اپنا نصاب ہے۔اگر نہ بھی ہوں تو ان تعلیمی اداروں کا انتظامیہ ہندوستانی مسلمانوں کی قربانیوں کو نصاب کے ایک حصہ کے طور پر ہر شامل کرسکتا ہے، آج کا دور میڈیا اور سوشل میڈیا کا ہے، نوجوان اور نئی نسل آسانی سے اسے قبول کرسکتی ہے، چنانچہ دلچسپ موسیقی ریز ڈاکومنٹری (Documentary) فلمس تیار کی جاسکتی ہیں، جنہیں سوشل میڈیا کے ذریعہ عام کیا جاسکتا ہے اور مسلم معاشرہ کے درمند اصحاب خیر کے تعاون سے مختلف ٹی وی چیانلس پر ٹائم اسپانسر (Time sponsor) کرکے اسے پیش کیا جاسکتا ہے، ہندوستان کی ہر زبان میں یہ کوشش کی جانی چاہئے، ہماری یہ ذمہ داری ہے کہ ہم جہاں نوجوان نسل کو اپنی تاریخ سے واقف کروائیں بلکہ انہیں ان اسباب اور محرکات سے بھی واقف کروائیں جس کی

وجہ سے ایک ہزار سال تک حکومت کرنے والے محکوم بن گئے، کیا وجہ تھی کہ پھٹے پرانے پیوند لگے کپڑوں میں بھی خلفائے راشدین کا دنیا کے ایک بڑے حصے تک جاہ وجلال تھا اور وہ کیا وجہ رہی ہوگی کہ عیش وعشرت، ہیرے جواہرات، حرم سرا، فوج ان سب کے باوجود ہندوستان کا کوئی بھی مسلم حکمران مساجد تو تعمیر کرسکا، دین کو پھیلا نہ سکا، وہ آخر کیا وجہ تھی کہ خلفائے راشدین تک کے دور میں مسلمانوں کے اعمال وکردار سے متاثر ہوکر اغیار جوق در جوق حلقہ اسلام میں داخل ہوتے گئے اور کیا وجہ رہی ہوں گی کہ دولت، اقتدار، طاقت سب کچھ ہونے کے باوجود ہندوستان کے مسلم حکمرانوں کو حالات سے سمجھوتہ کرنا پڑا اور اپنی حکومت چلانے کے لئے بعض کو اپنے دین سے دور بھی ہونا پڑا، نئی نسل کے سامنے جب حالات کا تجزیہ اور تقابل کیا جائے گا تو وہ ماضی کے حالات سے آج کی حالات کا تقابل کر کے اپنے مستقبل کو بہتر بنانے کی کوشش کرسکتے ہیں، آج ہم جس دور سے گزر رہے ہیں یہ اُتنا برا دور نہیں ہے جتنے برے دور سے ہمارے اسلاف گزر چکے ہیں، انہوں نے جو سختیاں جھیلیں، مصائب سہے اس کے مقابلے میں ہماری آزمائش ہلکی پھلکی ہے، ہاں اگر ہم غفلت میں رہے، اپنی نئی نسل کو حالات سے مقابلہ کرنے کے لئے تیار نہ کریں تو ان کے لئے وہی حالات پیدا ہوسکتے ہیں جس سے اسپین کے مسلمانوں کے ساتھ ساڑھے تین سو برس پہلے گزر چکے ہیں، تاریخ کو محفوظ کرنے کا اصل مقصد محاسبہ ہے، کہ آخر ہم کیوں حاکم سے محکوم بنے، کثیر تعداد کے باوجود ہر شعبہ حیات میں بے وزن کیوں ہیں، دشمنوں یا مخالفین کے دل آزار ریمارکس (Remarks) پر کسی ردعمل کا بہتر طریقہ یہی ہے کہ ہم عمل کریں، اپنے آپ کو، اپنے کردار کو سنواریں، نکھاریں کیوں کہ بلند کردار کے لوگ ہی ابھی تک تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہیں۔ (ادارہ فکر وخبر، 19/اکتوبر 2017ءِ)

اللہ سے کرے دور، تو تعلیم بھی فتنہ　　املاک بھی اولاد بھی جاگیر بھی فتنہ

ناحق کے لیے اٹھے تو شمشیر بھی فتنہ　　شمشیر ہی کیا نعرہ تکبیر بھی فتنہ

۶ جنوری یوم جنگ عظیم اول

worldwar1

پہلی جنگ عظیم کا پس منظر، اسباب، جنگ کی وجہ سے ہوئے نقصانات، چند مختلف جنگوں کا ذکر، اسلام میں انسانی جان کی عظمت واحترام جو درسِ موعظت وحقیقت شناسی پر مشتمل ہے۔

دنیا میں جنگوں کے اسباب

دنیا کی تاریخ پر اگر نظر دوڑائیں تو اس میں اس قدر ہولناک جنگوں کی لرزہ خیز داستانیں مدفون نظر آئیں گی، جنہیں انسان آج تک بھلا نہیں پائے، جنگ اگرچہ انسانی فطرت کا حصہ نہیں سمجھی جاتی تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ جنگوں کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنا خود انسان قدیم ہے، دنیا کی تاریخ اور جنگوں کا تجزیہ کرنے سے ہمیں اندازہ ہوگا کہ آج تک جتنی بھی جنگیں لڑی گئیں وہ معمولی باتوں سے ہی شروع ہوئیں، زیادہ تر جنگیں بادشاہوں، ریاستوں اور حکومتوں کے چھوٹے چھوٹے مفادات کی خاطر شروع ہوئیں جن سے لاکھوں انسان اپنے جیسے ہی دوسرے انسانوں کی وحشت کا نشانہ بنے۔

دنیا کی تاریخی جنگیں، انسانی کھوپڑیوں کے مینار، بھوک، افلاس اور تشدد سے بھری پڑی ہے اور حیران کن بات یہ ہے کہ ایسی جنگیں انسانی خودغرضی کی وجہ سے ہی ہوئیں جن کی لرزہ خیز داستانیں آج بھی لوگوں کے رونگٹے کھڑے کر دیتی ہیں۔

اگر دنیا کی قدیم ترین جنگوں کو چھوڑ کر آخری ۱۰۰ر سال کی جنگوں کا جائزہ لیا جائے تو بھی ایسی داستانیں سامنے آئیں گی جنہیں سننا یا برداشت کرنا ہر انسان کے بس کی بات نہیں۔

جنگ عظیم اول سے لے کر عرب-اسرائیل جنگ اور پھر نائن الیون (Nine eleven) حملوں کے بعد دہشت گردی کے خلاف جدید جنگوں نے دنیا کو صرف تشدد، خوف، بھوک اور بے بسی ہی دی ہے، جنگ عظیم اول سے لے کر اب تک کی تمام جنگوں کا جائزہ لینے سے پتہ چلے گا کہ یہ جنگیں معمولی باتوں اور کچھ شخصیات کی انا کی وجہ سے ہی لڑی گئیں۔

جنگ سے پہلے کے مختصر احوال

جنگ کا آغاز اصل میں ایک شہزادے کے قتل سے شروع ہوا، اور اس قتل کی وجہ

سے بالخصوص یورپ اور بہت سے دیگر ممالک دو حصوں میں بٹ گئے، ایک کروڑ سے زائد لوگ مارے گئے، یہ بھی ذہن میں رہے کہ دوسرے عالمی جنگ کی بھی بنیادی وجہ یہی جنگ تھی، جس میں تقریبا ۶ سے ۸ کروڑ لوگ ہلاک ہوئے تھے۔

یہ ۲۸/جون 1914ء کا واقعہ ہے، آسٹریا ہنگری کے شہزادے آرک ڈیوک فرینز فرڈینڈ اور ان کی اہلیہ صوفیہ کو بوسنیا و ہرزیگووینا کے شہر سرائیوو کو گولی مار کر قتل کر دیا اسی واقعہ کی بنیاد پر ۲۸/جون 1914ء کو آسٹریا نے سربیا کے خلاف اعلان جنگ کر دیا، پہلی عالمی جنگ بیسویں صدی کا پہلا بڑا عالمی تنازعہ تھا، جو اس قتل کی وجہ سے شروع ہوا، اور اگلی چار دہائیوں تک مختلف محاذوں پر جاری رہا، آسٹریا کے اتحادی جرمنی نے بھی آسٹریا کا فوری ساتھ دیا، ادھر سربیا کی حفاظت کے لئے ہالینڈ، بیلجیم، فرانس اور انگلینڈ کی فوجیں بھی تیار ہو گئیں، اس طرح یہ واقعہ ایک عظیم جنگ کی شکل اختیار کر گیا۔

اگست ۱۵/کو آسٹریا کے رفیق جرمنی کی فوجیں ہالینڈ اور بیلجیم کے ممالک کو روندتی ہوئی فرانس کی سرزمین تک پہنچنے کی کوشش کر رہی تھیں، جرمنوں نے فرانس پر حملہ آور ہونے کے لیے جو منصوبہ تیار کیا تھا، اس میں یہ قرار پایا تھا کہ فرانس کے شمالی ساحل کے ساتھ ساتھ ہو کر فرانس کے دارالخلافہ پیرس پر اس طرح حملہ کیا جائے، جیسے پھیلے ہوئے بازو کی درانتی وار کرتی ہے، فرانسیسی فوج کا اعلیٰ کمان اس منصوبے کو بھانپ نہ سکا اور اس نے اپنی مشرقی سرحد پر سے جرمنوں پر ۱۴/اگست کو حملہ کر دیا، یہ حملہ تدبیر و منصوبہ کے تحت نہیں ہوا تھا، لہٰذا جرمنوں نے جو پہلے ہی گھات لگائے بیٹھے تھے، ایک بھرپور وار کیا اور فرانسیسی واپس ہٹنے پر مجبور ہو گئے...... اس کے بعد جرمنوں نے اپنے حملے کیا سکیم (scheme) کو، جسے "شلفن منصوبہ" کہتے ہیں اور جو 1905ء سے پہلے ہی تیار پڑا تھا، عملی جامہ پہنانا شروع کر دیا تجلد ہی فرانس کے دارالحکومت کو خطرہ لاحق ہو گیا، فرانس کی بدقسمتی کہ اس وقت اس کی بے نظیر افواج کی قیادت "جافرے" کے ہاتھوں میں تھی،

جو مدبر سپہ سالار ثابت نہ ہوا، انگریزوں کا جرنیل ہیگ بھی جرمنوں کے جرنیلوں کا مقابلہ نہیں کرسکا تھا۔لہذا ایسا معلوم ہونے لگا کہ پیرس چند دنوں میں ہی ہار جائے گا،مگر عین اس وقت ایک ہوشمند فرانسیسی جرنیل ''گلینی'' نمودار ہوا، جس نے جرمنوں پر وہ کاری وار کیا کہ انھیں پریشانی کے عالم میں پیچھے ہٹتے ہی بنی، اس کے بعد جرمنوں کی پیش قدمی رک گئی اور آئندہ چار برسوں تک بھی تھوڑا جرمن بڑھ آتے،تو کبھی فرانسیسی۔

پہلی جنگ عظیم کے دوران اتحادی قوتوں برطانیہ،فرانس،سربیااور روسی بادشاہت (بعد میں اٹلی، یونان، پرتگال، رومانیہ اور ریاستہائے متحدہ امریکہ بھی شامل ہو گئے) جرمنی اور آسٹریااور ہنگری پر مشتمل مرکزی قوتوں کے خلاف لڑیں، جن کے ساتھ بعد میں سلطنت عثمانیہ کا مرکز ترکی اور بلغاریہ بھی شامل ہو گئے جنگ کا ابتدائی جوش و جذبہ اس وقت ماند پڑ گیا جب لڑائی ایک انتہائی مہنگی اور خندقوں کی جنگ جیسی شکل اختیار کرگئی، مغربی محاذ پر خندقوں اور قلعہ بندیوں کا سلسلہ ۴۷۵ر میل تک پھیل گیا،مشرقی محاذ پر وسیع تر علاقے کی وجہ سے بڑے پیمانے کی خندقوں کی لڑائی ممکن نہ رہی لیکن تنازعے کی سطح مغربی محاذ کے برابر ہی تھی،شمالی اٹلی، بالکن علاقے اور سلطنت عثمانیہ کے ترکی میں بھی شدید لڑائی ہوئی ،لڑائی سمندر کے علاوہ پہلی مرتبہ ہوا میں بھی لڑی گئی ...... پہلی عالمی جنگ جدید تاریخ کی سب سے زیادہ تباہ کن لڑائی تھی۔

پہلی جنگ عظیم اور ہندوستانی فوج

پہلی جنگِ عظیم میں ہندوستان کے ۱۳ر لاکھ فوجیوں نے حصہ لیا جن میں سے ۷۴ر ہزار سے زیادہ مارے گئے،تاریخ دان جارج مارٹن جیک لکھتاہے: پہلی جنگ عظیم میں 1914ء سے 1918ء میں حصہ لینے والے ہندوستانی فوجیوں کی تعداد آسٹریلیا، نیوزی لینڈ،

کینیڈا، جنوبی افریقہ اور کریبئن جزائر سے حصہ لینے والے فوجیوں کی تعداد سے زیادہ تھی۔(۱)

جنگ کے نقصانات

ساڑھے چار سالہ(۲) کشت خون کے بعد جنگِ عظیم اول کا اختتام ہوگیا مگر یہ ساڑھے چار سال تاریخ عالم پر ان مٹ نقوش چھوڑ گئے، کروڑوں خاندان سوگوار ہو گئے، لاکھوں لاپتہ، لاکھوں بے گھر اور لاکھوں اپاہج ہو گئے۔ زمینیں بنجر اور بارود زدہ ہوگئیں، ممالک کی معیشت تباہ حال ہوگئی۔ بچے کھچے انسانوں کے اوسان خطا ہو گئے اور وہ نفسیاتی مریض کی حیثیت سے زندگی گزارنے لگے۔

سخت کوشی ان کے دلوں میں گھر کرگئی۔ بے حسی عام ہوگئی اور اپنی ذات سب سے اہم اور مقدم گردانی گئی، اپنے مفاد کے لئے دوسروں کو اذیت میں مبتلا کرنے کی سوچ پروان چڑھی اور اخلاقیات کی دھجیاں اڑا کر رکھ دی گئیں۔

چنانچہ اس جنگ میں تقریباً ایک کروڑ فوجی ہلاک ہوئے یہ تعداد اس سے پہلے کے ایک سو برس میں ہونے والی لڑائیوں کی مجموعی ہلاکتوں سے بھی زیادہ ہے، اور تقریباً ۲۱ ملین افراد زخمی ہوئے، یکم جولائی ۱۹۱۶ء کو ایک دن کے اندر سب سے زیادہ ہلاکتیں ہوئیں جب سومے میں موجود برطانوی فوج کے ۵۷ ہزار فوجی مارے گئے۔ سب سے زیادہ جانی نقصان جرمنی اور روس کو اٹھانا پڑا، جرمنی کے ۱۷ لاکھ ۷۳ ہزار سات سو اور روس کے ۱۷ لاکھ فوجیوں کی ہلاکتیں ہوئیں، محققین کے اندازے کے مطابق اس جنگ میں براہ راست یا بالواسطہ طور پر ہلاک ہونے والے غیر فوجی افراد کی تعداد ایک کروڑ تیس لاکھ ہے، اتنی بڑی ہلاکتوں کی وجہ سے اسپینش (Spanish flu) فلو پھیل گیا جو تاریخ کی سب سے موذی انفلوئنزا (influenza) کی وباء ہے، لاکھوں کروڑوں افراد بے گھر ہوگئے یا اپنے گھروں سے

---

(۱) اردو بی بی سی نیوز، 13 نومبر 2018ء۔

(۲) ۲۸ جولائی ۱۹۱۴ء تا نومبر ۱۹۱۸

بے دخل ہو گئے، جائیداد اور صنعتوں کا نقصان بہت خطیر تھا خاص طور پر فرانس اور بلجیم میں جہاں لڑائی خاص طور پر شدید تھی۔

ان نقصانات کے علاوہ بیواؤں، یتیموں، زخمیوں اور اپاہج افراد کی کثرت تعداد جنگِ عظیم اول کے تحائف تھے جو پورے یورپ میں پھیلے ہوئے تھے۔کیا اتحادی اور کیا مرکزی قوتیں! سب کے سب انتہائی ناگفتہ بہ حالت کا شکار تھے۔

مجموعی طور پر جنگ عظیم اول کی فوجی ہلاکتیں 85,38,315، زخمیوں کے اعداد وشمار 2,12,19452، قیدی یا غائب ہونے والے فوجیوں کی تعداد 36,29,829، رہی جبکہ فوجی نقصان بلحاظ افواج 57.6 فیصد رہا۔

معاشی اثرات

جنگ عظیم کے نتیجے میں ہونے والی تباہ کاریوں لاکھوں گھر مسمار ہوئے، کھیت کھنڈر بن گئے، سڑکیں اور ریلوے کا نظام تباہ حال ہو گیا، مواسلات اور رسل وترسیل کا نظام جڑوں سے اکھڑ کر رہ گیا، تار کی لائنیں صفحۂ ہستی سے مٹ گئیں مال مویشی کی بہت بڑی تعداد ہلاک ہوئی جنگلات جل کر راکھ کا ڈھیر بن گئے۔

دورانِ جنگ نہ پھٹنے والے بموں اور بارودی سرنگوں کی وجہ سے قابل کاشت زمین میں کاشتکاروں کا داخلہ بند ہو گیا، جو زرعی ضروریات کے لئے پیداوار کی واضح کمی کا باعث بنا، دورانِ جنگ لئے گئے قرضوں کے بارے میں ایک محتاط اندازہ یہ ہے کہ ۲۶۰ ملین ڈالر کی خطیر رقم بطور قرض متحارب ممالک نے وصول کی۔

عالم دنیا پر جنگ کے اثرات

جنگِ عظیم اول کے اثرات پورے عالم پر بہت دور رس اور دیر پا قائم ہوئے، خصوصاً یورپ جو بیسویں صدی کے آغاز پر عالمی امامت کے منصب کا علمبردار تھا، اپنے منصب اور

عہدے سے بتدریج پیچھے ہٹنے لگا، جنگِ عظیم کی تباہ کاریوں نے تمام یورپی ممالک کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا، اور یہی یورپی ممالک دنیا بھر میں اپنی نو آبادیوں اور راج دھانیوں کے ذریعے اپنا اقتدار قائم کئے ہوئے تھے۔

جن کو عالمی ممالک کا اقتدار حاصل نہ تھا انہیں اپنے تجارتی مکروفریب کے ذریعے دام میں پھنسانے کے لئے پھندے تیار کیے جارہے تھے، اس طرح یورپی ممالک خصوصاً برطانیہ، فرانس، جرمنی، بیلجیم اور اٹلی یورپ کے علاوہ دیگر دنیا سے بھی بہت زیادہ متعلق اور کم از کم تجارتی رابطے میں ہونے کے باعث اثرات مرتب کررہے تھے۔

یہی وجہ ہے کہ جنگِ عظیم کے منفی اثرات پورے عالم پر محسوس کئے گئے سنہ ۱۹۱۹ء کے بعد کا بین الاقوامی نظام نصف صدی قبل کی سفارتی، معاشی، معاشرتی اور سیاسی صورتِ حال سے یکسر مختلف اور غیر مستحکم تھا، ساڑھے چار سالہ عالمی جنگ نے دنیا بھر کی آبادی کو تہس نہس کر کے رکھ دیا تھا، معاشی اور اقتصادی صورتِ حال ابتری کا شکار تھی، جنگ کے فوراً بعد یورپ میں وبائیں، امراض، قحط سالی اور ننگ وافلاس نے ڈیرے جما لئے تھے۔

مسلم دنیا پر جنگ کے اثرات

ترک افواج کی شکست کے باعث سب سے زیادہ نقصان امتِ مسلمہ کو ہوا، فلسطین کے علاقوں پر اتحادی افواج نے اپنی دیرینہ خواہش کے مطابق یہودیوں کو اباد کر کے امت مسلمہ کے سینے میں خنجر گھونپنے کا منصوبہ بنایا، مزید اندرونی خلفشار، ریشہ دوانیوں اور سازشوں کے ذریعہ مسلمانوں کے اتحاد کی علامت ''خلافت'' کو بھی ختم کر کے اپنے من پسند اور پروردہ عناصر کو زمامِ اِقتدار پر براجمان کیا تا کہ ان کے ذریعہ امت مسلمہ پر اصل حکمرانی مغربی ممالک کی ہی قائم رہے۔

ترک افواج کی فلسطین، حجاز، مصر، شام، میسوپوٹامیا اور کاکیشا کے محاذوں پر پے در پے شکستوں اور اتحادی افواج کے قبضے نے نہ صرف حکومت کو سیاسی، جغرافیائی اور فوجی لحاظ

سے سخت کمزور کردیا تھا بلکہ اقتصادی لحاظ سے بھی بری طرح ہلاکت کا شکار کردیا تھا، عوام الناس بھوک اور افلاس کے باعث جنگ سے بیزار ہو چکے تھے۔

بھوکوں مرنے والوں کی نظر میں ہمیشہ ذاتی مفادات قومی مفادات سے زیادہ اہم اور ضروری ہوجایا کرتے ہیں، اسی لئے بہت سے علاقوں میں اتحادی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کے باعث چھوٹے چھوٹے گروپوں کی شکل میں بغاوتیں سر اٹھانے لگیں جنہیں اتحادی افواج نے بھرپور انداز سے پھیلنے کے لئے ہر ممکن تعاون اور امداد بہم پہنچائی۔

انہیں دگرگوں حالات اور ناگفتہ بہ صورتِ حال نے ترک حکومت کو مجبور کردیا کہ وہ مسندِ حکومت سے دستبردار ہوجائے اور صدیوں سے قائم خلافت کا خاتمہ ہوجائے، ترکی کو ذلت آمیز شرائط اور امتِ مسلمہ کے ناقابل تلافی نقصانات کے بعد آخرکار جنگ بندی کے لئے اتحادی ممالک سے استدعا کرنی پڑی، اور ذلت آمیز شرائط کو تسلیم کرنا پڑا۔

جس طرح موسموں میں تغیر اور موجوں میں سکون وتلاطم ہے، ایک شخص کی پیدائش سے نوجوانی، جوانی، ادھیڑ عمری، بڑھاپا، خوشی اور غمی، قوت اور کمزوری، بہار اور خزاں۔ غرض سب ہی رنگ مل کر زندگی گزارتے ہیں۔ بالکل اسی طرح دنیا میں ازل سے قوموں اور طبقوں کی حرکت ایک طرح سے دوری گردش کا شکار ہے۔ جس کی تاریخِ عالم گواہ ہے، اس گردش میں تمام قومیں، ممالک اور طبقے آتے ہیں۔ اور اپنے اپنے دور کے مطابق گردشِ ایام سے گزرتے ہوئے اپنے انجامِ کار کی جانب بڑھتے چلے جاتے ہیں۔

کبھی ایک قوم عروج کے منصبِ پُر وقار پر فائز ہوتی ہے تو دوسری ذلت وغلامی سے ہمکنار ہوتی ہے، کہیں شادیانے بجتے ہیں اور کہیں صفِ ماتم بچھتی ہے، مگر ہمیشہ ایک ہی قوم غالب، فائق اور مقامِ تفوق پر براجماں نہیں رہتی، اگلے ہی دور میں اس کی قوت، زور، پھیلاؤ، بہار، حسن ورعنائی اور ترقی کے پایہ ثبات میں لغزش آتی ہے، ضعف اور توانائی، کمزوری وکم مایئگی اس پر چھانے لگتے ہیں اور وہ مرجھانے لگتی ہے، اس کی ترقی وایجادات، تحقیق

وذرائع ہی اس کے زوال کے اسباب پیدا کردیتے ہیں، اور آخر کار اس کا بحیثیت عالمی قوت وطاقت مقام ختم ہوجاتا ہے، وہ قوم یا تو صفحۂ ہستی سے مٹ جاتی ہے یا پھر ناتواں اور نحیف اقوامِ عالم کی طرح پردہ عمل سے غائب ہوجاتی ہے۔

خلاصہ یہ کہ اس جنگ کی وجہ سے مسلمانوں کی عظیم خلافت کا دور ختم ہوگیا اور اس کے بعد ہم کبھی اکٹھے نہ ہوسکے۔ فرقوں، قومیت اور ذاتوں میں بٹ گئے جس کا درد علامہ محمد اقبال کے ان اشعار سے واضح ہوتا ہے۔

منفعت ایک ہے اِس قوم کی، نقصان بھی ایک
ایک ہی سب کا نبی، دین بھی، ایمان بھی ایک
حرمِ پاک بھی، اللہ بھی، قُرآن بھی ایک
کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مُسلمان بھی ایک؟
فرقہ بندی ہے کہیں، اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں؟

جنگوں کا بدلتا رخ

جنگِ عظیم اول کو ایک صدی ہونے کو ہے، اس دوران دنیا کے جغرافیائی، نظریاتی، سیاسی اور معاشی نقشوں میں بہت سی تبدیلیاں رونما ہو چکی ہیں، جنگِ عظیم اول ودوم کی نسبت خطرناک ترین ہتھیار بھی معرضِ وجود میں آچکے ہیں، ایٹم بم کی ایجاد، ہائیڈروجن کیک ایجاد کے لئے تحقیق اور بین البراعظمی مار کرنے والے طاقتور اور وسیع پیمانے پر گولہ بارود لے جانے والے میزائلوں کی ایجاد نے جنگ کے اندازِ حرب وضرب میں یکسر تبدیلی رونما کردی ہے۔

بڑے بڑے ایئر کرافٹ کیریئر اور سمندروں کی سطح پر چلتے پھرتے بڑے بڑے شہروں کی مانند بیڑے پوری دنیا کے کسی بھی سمندری اور خشکی کے حصے میں رسائی اختیار

کرسکتے ہیں۔اب جنگ لڑنے کے لئے ضروری نہیں ہے کہ متحارب ممالک کی سرحدیں باہم ملتی ہوں۔بلکہ سات سمندر پار سے اپنے بحری بیڑوں، طاقتور اور دورمار میزائلوں اور کمپیوٹرائز ریموٹ کنٹرول جہازوں و بموں کے ذریعے دنیا بھر کے کسی بھی ملک پر کسی بھی مقام سے حملہ آور ہونا پہلے کی نسبت بہت زیادہ آسان اور سہل اس سے قبل کبھی نہیں تھا۔ صرف متذکرہ بالاذرائع کی موجودگی بہرحال شرط ہے۔

دوسری طرف طرزِ جنگ میں بھی جدت آگئی ہے بڑی بڑی افواج کے بجائے نئی طرز کے زرہ بکتر پہنے،اپنے ہیڈکوارٹر سے مسلسل مربوط، جدید تباہ کن گنز، لیزرو دیگر خطرناک تکنیکی ہتھیاروں سے آراستہ مختصر مگر انتہائی مضبوط وطاقت ور چھوٹے چھوٹے فوجی دستے جولمحہ بہ لمحہ کمپیوٹرائزڈ سسٹم کے تحت ایک ایک انچ اور ایک ایک زاویے سے مکمل واقفیت رکھتے ہوئے اعلیٰ حکام سے مسلسل ہدایات حاصل کرتے ہوئے دشمن کو نیست ونابود کردینا اوراس مقصد کے لئے فضائی ،میزائلی اورسمندری ہتھیاروں اورمشینوں کاوسیع پیمانے پراستعمال کرنا شامل ہیں۔

پھر جنگ صرف افواج واسلحہ کی نہیں رہ گئی بڑی بڑی قوتیں اس امر سے بھی بخوبی واقفیت رکھتی ہیں کہ اب کوئی بھی جنگ انسانی تباہی کے اس خطرناک درجے تک لرزہ خیز ہوسکتی ہے جس کے بعد شاید صفحہ ہستی کی یہ بساط بالکل الٹ جائے اور عالم وجود میں انسانوں کا وجود ماضی کی تاریخ بن کر رہ جائے، اسی لئے اب حربی لڑائی کی جگہ معاشی، معاشرتی اور سیاسی جنگ کا سلسلہ شروع ہوچکا ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام اور آزاد تجارت کے قیام کے پیچھے یہی سوچ کارفرما ہے کہ اب زیرِ دست قوموں کو اسلحے کی بجائے معاشی دباؤ کے ذریعے رکھا جاسکے، ان کی سیاسی انارکی اور انتشار سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے انہیں ہمیشہ زیر دست رہنے پر مجبور کردیا جائے، اور ایسی ایسی سیاسی ومعاشرتی تبدیلیاں اور حکمتِ عملیاں وضع کی جائیں جو عالمی امامت کے

منصب پر فائز ممالک کی قیادت وامامت کے قیام ودوام کے لئے ممد ومعاون ثابت ہوسکے۔

اسی سلسلے کی کڑیاں ہمارے اردگرد مختلف پالیسیوں کا شوروغا اکثروبیشتر بپارہتا ہے۔ کبھی ''ورلڈٹریڈ آرگنائزیشن'' (wto) کے پلیٹ فارم سے نئی ہدایات موصول ہوتی ہیں، کبھی ''نیوورلڈ آرڈر'' اور کبھی اقوامِ متحدہ کی اصلاحات وپابندیوں کی صورت میں دراصل عالمی قیادت کے گرتے ہوئے نظام کو سہارادینے کی کوشش بروئے کارلائی جاتی ہیں۔

تیسری دنیا کے ممالک پر پابندیاں، چھوٹے ممالک کو آئے دن بڑی طاقتوں کی جانب سے موصول ہونے والی دھمکیاں، معاشی دباؤ، اقتصادی اصلاحات اور بزورمسلط کئے گئے سیاسی نظام بھی دراصل کسی اصلاحی اور فلاحی مقصد کے حصول کے لئے نہیں بلکہ ازمنہ قدیم سے چلنے والی عالمی قوتوں کو اعانت فراہم کرنے کے فرسودہ ہتھکنڈوں کی جدید شکل ہے۔

ثقافتوں کی جنگ، مذہبوں کی جنگ، معیشت کی جنگ، فکری جنگ، سیاسی جنگ اور معاشرتی جنگ، ان سب محاذوں کے لئے انٹرنیٹ، موبائل فون، بڑھتے ہوئے ٹیلی کمیونیکیشن (communicaion) کے ذرائع اور میڈیا دورِحاضر کی جنگ اہم ہتھیار بن چکے ہیں، جن کے بغیر کسی جنگ کے مثبت نتائج حاصل کرنے کی توقع کرنا احمقوں کی جنت میں رہنے کے مترادف ہے، اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ ذرائع بھی موجودہ عالمی طاقتوں کے پیدا کردہ اور انہیں کے ہاتھوں کنٹرول ہورہے ہیں۔

یہ امر روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ عالمی طاقتوں کا عدمِ توازن ہی جنگ اور تباہی کا سب سے بڑا موجب ہوتا ہے، بڑی طاقتیں اپنا اثر ورسوخ بڑھانے اور چھوٹی طاقتیں قیامِ توازن ممکن بنانے کے لئے کوشاں ہوتی ہیں، یہی رویہ دونوں گروہوں کو ایک دوسرے کے مخالف کھڑا کردیتا ہے، اور کمزور ممالک خود پر جبر کرتے ہوئے بڑی طاقتوں کے آگے اس وقت تک خاموشی سادھے رہتے ہیں جب تک معاملات ان کے صبر واستقامت سے تجاوز

نہیں کرجاتے، بعدازاں ''تنگ آمد بجنگ آمد'' کے مصداق، نتائج سے کسی قدر بے پرواہ ہوکرلڑنے مرنے کے لئے تیار ہوجاتے ہیں۔

دورِحاضر کی واحد سپر پاور (super power) کو اپنے مذموم مقاصد کے حصول سے روکنے کے لئے اقوامِ عالم کاذمہ دارادارہ ''اقوام متحدہ'' بھی بری طرح ناکام ہوچکا ہے، اور موجودہ صورتِ حال میں اس کی حیثیت ایک غیر فعال، فرسودہ اور بے بس تنظیم کی سی رہ گئی ہے، جس کا مقصد بڑی قوتوں کے احکام کی بجا آوری اور ان کی مرضی کے خلاف کسی قسم کی آواز کو دبانے کے لئے ایک ہتھیار کی طرح استعمال ہوتے رہ گیا ہے، آخرکار اس ادارے کو چلانے کے لئے درکار ''فنڈ'' کی فراہمی کا مکمل انحصار انہی ممالک پر ہے جو اپنی من مانی کرتے ہیں، اور سیانے کہتے ہیں کہ ''جس کا کھائیے اسی کے گیت گائیے''!

مہذب دنیا کے منہ پر تماچہ

یہ جنگ آج بھی ظلم و برداشت کے داستانوں اور برداشت و رواداری کے جذبوں کو مزید کم سے کم تر کرتی چلی گئی، دنیا کے بیشتر اقوام اس جنگ میں آہستہ آہستہ حصہ بنتے گئے۔اور یوں پوری دنیا اس جنگ کی آگ میں جھلستی چلی گئی، دنیا میں پہلی بار جدید ٹیکنالوجی استعمال کی گئی، پہلی بار دنیا نے کیمیائی اور زہریلی گیس کا استعمال دیکھا، یہ انسانی تاریخ کی تباہ کن جنگ تھی، جس میں تقریباً ایک کروڑ تیس لاکھ اور بعض کے نزدیک تقریباً دو کروڑ لوگ ہلاک ہوئے، اور اتنے ہی افراد غربت، بھوک اور بیماری کی نذر ہوگئے۔تاریخ کے مطابق ۱۹رویں صدی کے آواخر میں یورپ میں اتحاد بننے لگے تھے۔ ۱۹۰۴ء میں فرانس اور برطانیہ نے ایک معاہدہ کیا جو باقاعدہ اتحاد تو نہیں تھا، تاہم قریبی تعلقات کے لیے بے حد اہمیت کا حامل تھا، اسی طرح ایک معاہدہ برطانیہ اور روس کے مابین 1907 میں (TRIPLE ENTENTE) کے نام سے ایک معاہدہ ہوا تھا، جس میں روس، فرانس اور برطانیہ شامل تھے......ایک طرف جرمنی، آسٹریا ھنگری، سربیا اور اٹلی، جبکہ دوسری طرف

روس، فرانس اور برطانیہ تھے، جاپان بھی ۱۹۰۲ء میں برطانیہ سے معاہدہ کر چکا تھا، اس لیے اس نے برطانیہ کی طرفداری کرتے ہوئے اعلان جنگ کیا، اسی خوف اور طاقت کے نشے میں دنیا کے بیشتر ممالک اس جنگ کا حصہ بنتے چلے گئے، پہلی عالمی جنگ بیسویں صدی کا پہلا بڑا تنازعہ تھا، اس تنازعے کی بظاہر ابتدا ایک قتل سے ہوئی لیکن جنگ کے سائے کافی عرصے سے ان علاقوں پر منڈلا رہے تھے لیکن اس کا باقاعدہ آغاز ۱۹۱۴ء میں قتل کے بعد ہوا، اس جنگ میں جانی اور مالی لحاظ سے اتنا نقصان ہوا کہ، دنیا کی تاریخ میں اسکی مثال مشکل سے ملے گی، اور اسی جنگ کا غصہ دوسری عالمی جنگ کا پیش خیمہ بنا جس میں بھی ایک اندازے کے مطابق ٦ سے ۸ کروڑ ہلاک ہوئے......! (واللہ تعالیٰ اعلم)

اس جنگ میں جانی اور مالی لحاظ سے اتنا نقصان ہوا، کہ دنیا کی تاریخ میں اس کی مثال مشکل سے ملے گی، بلکہ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا، کہ دنیا میں اس جنگ سے پہلے کی جتنی اموات ہوئی تھیں، کو اگر ایک طرف رکھا جائے اور اس جنگ میں جتنی اموات ہوئیں، یہ اموات اُن تمام جنگوں سے زیادہ تھیں، پہلی عالمی جنگ میں دو کروڑ سے زیادہ افراد ہلاک، لاکھوں غربت، بھوک، بیماریوں کی نذر ہو گئے تھے، ان تمام میں ہلاک فوجیوں کی تعداد الگ تھی، جو ایک کروڑ کے لگ بھگ تھی، پہلی عالمگیر جنگ اس بات کی غماز ہے، کہ دنیا چاہے جتنی بھی ترقی کرے، اور انسان جتنا بھی اپنے آپ کو مہذب کہلائے، وہ نظریے اور ذہنیت سے اب بھی ایک وحشی درندے سے کم نہیں، اور اُس نے اکثر مواقع پر یہ بات ثابت کی ہے، پچھلی صدی کی یہ جنگ عالمی امن و برداشت کے لیے کام کرنے والے لوگوں اور اس نظریے کے لیے ایک زہر قاتل کی حثیت رکھتی ہے، انسان اب بھی اگر عالمی امن و برداشت کے حوالے سے کوئی قدم اٹھاتا ہے، تو اُسے اپنے اسلاف اور آباواجداد کے ہاتھوں لڑی گئی اس جنگ کی طرف بھی ایک بار دیکھنا پڑتا ہے، کیونکہ مہذب دنیا کے منہ پر یہ جنگ ایک زوردار طمانچہ ہے۔

جنگ عظیم دوئم worldwar2

جنگ عظیم اول سے قبل جرمنی بہت طاقتور ملک تھا،مگر جنگ کے اختتام تک وہ کمزور ہو چکا تھااور پھر فرانس، برطانیہ اور روس جیسے ممالک نے امریکی مدد سے اسے مزید کمزور اور کمتر کر دیا تھا اور وہ 1919 سے 1930 تک ایک شکست خوردہ ملک کی طرح چلتا رہا۔

ایڈولف ہٹلر(Adolf Hitler) کے اقتدار میں آنے کے بعد جرمنی ایک بار پھر طاقتور ملک کے طور پر ابھرنے لگااور پھر ہٹلر نے برطانیہ، روس اور فرانس سمیت دیگر ممالک کی جانب سے عائد کردہ پابندیوں کا جواب دینے کے لیے 1938 میں طاقت اور جارحیت کامظاہرہ کرنا شروع کر دیا۔

طاقتور ملک بننے کے بعد ہٹلر کی قیادت میں جرمنی نے 1938 میں پہلے آسٹریا پھر چیکو سلواکیہ اور بعد میں پولینڈ پر قبضہ کیا۔

جرمنی کی اس جارحیت کو عالمی قوانین کی خلاف ورزی قرار دیا گیا، کیوں کہ جرمنی نے جنگ عظیم اول میں شکست کے بعد ایک معاہدے پر دستخط کیے تھے کہ وہ کسی بھی ملک پر حملہ آور نہیں ہوگا،لیکن پولینڈ پر حملہ کرنے کے بعد برطانیہ نے اس کے خلاف جنگ کا اعلان کیا اور یوں ستمبر 1939 میں جنگ عظیم دوئم کا آغاز ہوا۔

کیوں کہ اس زمانے میں ممالک کے ایک دوسرے کے ساتھ معاہدے میں تھے جن کے تحت اتحادی ممالک کو ایک دوسرے کا ساتھ دینا تھا، اس لیے یہ جنگ بھی جنگ عظیم اول کی طرح کئی ممالک کے درمیان لڑی گئی اور اس جنگ نے دنیا کے نقشے کو ہی بدل دیا۔

جنگ عظیم دوئم کے درمیان ہی ایشیائی ملک جاپان بھی طاقتور ملک کے طور پر ابھر کر سامنے آیا، تاہم 1945 میں امریکا کی جانب سے اس پر گرائے گئے بموں نے دنیا کا نقشہ اور طاقت کا توازن ہی بدل دیا۔

جنگ عظیم دوئم کے اختتام پر 1945 سے پہلے طاقت میں رہنے والے برطانیہ، جاپان، اٹلی، جرمنی اور فرانس جیسے ممالک سمیت سب ممالک کمزور ہو گئے اور امریکا اور روس نئی طاقت بن کر ابھرے۔

اس جنگ نے اس وقت کسی نہ کسی طرح دنیا کے 50 سے زائد ممالک کو متاثر کیا اور اس سے لگ بھگ 2 کروڑ افراد ہلاک ہوئے، کروڑوں افراد زخمی ہوئے اور لاکھوں افراد کو ایک سے دوسرے ملک ہجرت کرنا پڑی۔

جنگ عظیم دوئم کے ختم ہونے کے بعد برطانیہ اور فرانس جیسے ممالک کمزور ہونے لگے تو انہوں نے ایشیا اور افریقا میں اپنے زیر تسلط رہنے والے ممالک کو آزاد کرنا شروع کیا۔

عراق جنگ iraq-us-war

یہ جنگ بھی جدید زمانے کی ایک ایسی جنگ ہے جسے خانہ جنگی کا نام دیا جاتا ہے اور اس جنگ کو بھی امریکا نے برطانیہ سمیت دیگر مضبوط ممالک کے اتحاد سے 2003ء میں شروع کی۔

امریکا اور اس کے اتحادیوں نے دہشت گردی کے خلاف جنگ کا نعرہ لگا کر 2003 میں عراق پر ایٹمی ہتھیار بنانے کا الزام عائد کر کے اس پر حملہ کر دیا اور اسی حملے کے نتیجے میں عراق کے صدر صدام حسین کو گرفتار کر کے ان پر مقدمے چلا کر انہیں پھانسی دی گئی اور بعد میں اعلان کیا گیا کہ اتحادی افواج عراق سے نکل رہی ہیں۔

مختلف رپورٹس اور اندازوں کے مطابق اس جنگ میں 6 لاکھ عام عراقی افراد مارے جا چکے ہیں، اگرچہ امریکا نے 2011ء میں عراق سے فوجیں واپس بلانے کا اعلان کیا، تاہم تا حال عراق میں اس جنگ کے اثرات جاری ہیں اور اب بھی یہ ملک خانہ جنگی کا شکار ہے۔

عرب انقلاب - شام خانہ جنگی syria

عرب ممالک میں دسمبر 2010ء کے بعد انقلاب کے نام پر حکومتوں کے خلاف ایک نئی عوامی مہم شروع ہوئی جس نے تیونس سمیت کئی ممالک میں کئی سال سے قائم حکومتوں کو ختم کر دیا۔

یہ انقلابی تحریک جنہیں ابتدائی طور پر عرب بہار کا نام دیا گیا تھا دسمبر 2010ء میں شروع ہوئی جب تیونس کے ایک گریجویٹ (Graduate) نوجوان محمد بوعزیزی نے بے روزگاری اور ملک کی بدحالی کے باعث خود کو آگ لگا دی تھی، وہ کئی سال تک نوکری تلاش کرنے میں ناکام ہونے کے بعد پھلوں کا ٹھیلہ لگا کر گزر سفر کر رہا تھا، مگر پولیس نے ان سے ٹھیلے لگانے کی بھی رشوت مانگی تھی، یہ نوجوان واقعے کے چند روز بعد ہسپتال میں دم توڑ گیا تھا اور ان کے مرنے کے بعد ہی عرب بہار یا انقلاب کا باقاعدہ آغاز ہوا۔

عرب انقلاب کی وجہ سے ہی کئی سال سے حکومت کرنے والے لیبیا کے حکمران کرنل معمر قذافی کو جان سے ہاتھ دھونا پڑا اور اب تک لیبیا میں خانہ جنگی جاری ہے۔

اسی انقلاب اور بغاوت نے لیبیا، تیونس اور مصر کے بعد شام کا رخ کیا اور خیال کیا جا رہا تھا کہ وہاں پر بھی حکومت پر کئی سال سے قابض بشار الاسد سے عوام کو چھٹکارہ ملا، شام میں جاری خانہ جنگی کے باعث اب تک لاکھوں افراد ہلاک اور لاکھوں افراد اپنا گھر چھوڑ کر بیرون ملک جا چکے ہیں اور شام کھنڈرات میں تبدیل ہو چکا ہے، تاہم شامی خانہ جنگی ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی، عرب انقلاب، بغاوت اور خانہ جنگی کے شکار ممالک میں یمن بھی شامل ہے۔

فائدہ: اس قدر جانوں کا ضیاع کرنے والی قوموں کو انسانوں کی جان کی قدر معلوم ہونا چاہئے کہ جان اتنی عظیم نعمت ہے کہ جب جاتی ہے تو واپس نہیں آتی۔

انسانوں کی جان ومال کا احترام

اِسلام تکریم اِنسانیت کا دین ہے، یہ اپنے ماننے والوں کو نہ صرف اَمن و آشتی، تحمل و

برداشت اور بقاء باہمی کی تعلیم دیتا ہے بلکہ ایک دوسرے کے عقائد ونظریات اور مکتب و مشرب کا احترام بھی سکھاتا ہے۔ یہ نہ صرف مسلمانوں بلکہ بلاتفریق رنگ ونسل تمام انسانوں کے قتل کی سختی سے ممانعت کرتا ہے۔ اسلام میں کسی انسانی جان کی قدر و قیمت اور حرمت کا اندازہ یہاں سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس نے بغیر کسی وجہ کے ایک فرد کے قتل کو پوری انسانیت کے قتل کے مترادف قرار دیا ہے۔ اللہ نے تکریم انسانیت کے حوالے سے قرآن حکیم میں ارشاد فرمایا: ”جس نے کسی شخص کو بغیر قصاص کے یا زمین میں فساد (پھیلانے کی سزا) کے (بغیر، ناحق) قتل کر دیا تو گویا اس نے (معاشرے کے) تمام لوگوں کو قتل کر ڈالا۔ ”مَنۡ قَتَلَ نَفۡسًۢا بِغَيۡرِ نَفۡسٍ اَوۡ فَسَادٍ فِى الۡاَرۡضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيۡعًا ۔“ (سورۃ المائدۃ: ۵/ ۳۲)

اس آیت مبارکہ میں انسانی جان کی حرمت کا مطلقاً ذکر کیا گیا ہے جس میں عورت یا مرد، چھوٹے بڑے، امیر وغریب حتی کہ مسلم اور غیر مسلم کسی کی تخصیص نہیں کی گئی۔ مدعا یہ ہے کہ قرآن نے کسی بھی انسان کو بلا وجہ قتل کرنے کی نہ صرف سخت ممانعت فرمائی ہے بلکہ اسے پوری انسانیت کا قتل ٹھہرایا ہے۔ جہاں تک قانونِ قصاص وغیرہ میں قتل کی سزا، سزائے موت (capital punishment) ہے، تو وہ انسانی خون ہی کی حرمت وحفاظت کے لئے مقرر کی گئی ہے۔

اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نزدیک مومن کے جسم وجان اور عزت و آبرو کی اَہمیت کعبۃ اللہ سے بھی زیادہ ہے۔ صاحبِ شریعت حضور نبی اکرم ﷺ نے ایک مومن کی حرمت کو کعبے کی حرمت سے زیادہ محترم قرار دیا ہے، ”حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ انہوں نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خانہ کعبہ کا طواف کرتے دیکھا اور یہ فرماتے سنا : (اے کعبہ!) تو کتنا عمدہ ہے اور تیری خوشبو کتنی پیاری ہے، تو کتنا عظیم المرتبت ہے اور تیری حرمت کتنی زیادہ ہے، قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد

کی جان ہے! مومن کے جان و مال کی حرمت اللہ کے نزدیک تیری حرمت سے زیادہ ہے اور ہمیں مومن کے بارے میں نیک گمان ہی رکھنا چاہئے۔"عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عُمَرَ قَالَ: رَأَيْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَطُوفُ بِالْكَعْبَةِ، وَيَقُولُ: مَا أَطْيَبَكِ وَأَطْيَبَ رِيحَكِ، مَا أَعْظَمَكِ وَأَعْظَمَ حُرْمَتَكِ، وَالَّذِي نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهِ، لَحُرْمَةُ الْمُؤْمِنِ أَعْظَمُ عِنْدَ اللهِ حُرْمَةً مِنْكِ مَالِهِ وَدَمِهِ، وَأَنْ نَظُنَّ بِهِ إِلَّا خَيْرًا"(۱)

مسلمان کی طرف ہتھیار سے محض اشارہ کرنا بھی منع ہے

فولادی اور آتشیں اسلحہ سے لوگوں کو قتل کرنا تو بہت بڑا اقدام ہے۔حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اہلِ اسلام کو اپنے مسلمان بھائی کی طرف اسلحہ سے محض اشارہ کرنے والے کو بھی ملعون ومردود قرار دیا ہے۔

۱۔حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تم میں سے کوئی شخص اپنے بھائی کی طرف ہتھیار سے اشارہ نہ کرے،تم میں سے کوئی نہیں جانتا کہ شاید شیطان اس کے ہاتھ کو ڈگمگا دے اور وہ (قتلِ ناحق کے نتیجے میں) جہنم کے گڑھے میں جا گرے۔"لَا يُشِيرُ أَحَدُكُمْ إِلَى أَخِيهِ بِالسِّلَاحِ، فَإِنَّهُ لَا يَدْرِي أَحَدُكُمْ لَعَلَّ الشَّيْطَانَ يَنْزِعُ فِي يَدِهِ، فَيَقَعُ فِي حُفْرَةٍ مِنَ النَّارِ"(۲)

یہاں اِستعارے کی زبان میں بات کی گئی ہے یعنی ممکن ہے کہ ہتھیار کا اشارہ کرتے ہی وہ شخص طیش میں آجائے اور غصہ میں بے قابو ہو کر اسے چلا دے،اس عمل کی مذمت اور قباحت بیان کرنے کے لئے اسے شیطان کی طرف منسوب کیا گیا ہے تا کہ لوگ اِسے شیطانی فعل سمجھیں اور اس سے باز رہیں۔

حضور ﷺ نے کسی دوسرے پر اسلحہ تاننے سے ہی نہیں بلکہ عمومی حالات میں اسلحہ کی

---

(۱) ابن ماجہ، السنن، کتاب الفتن، باب حرمة دم المؤمن وماله، حدیث: ۳۹۳۲

(۲) صحیح مسلم، الصحیح، کتاب البر والصلة والآداب، باب النهی عن إشارة بالسلاح، حدیث: ۲۶۱۷

نمائش کو بھی ممنوع قرار دیا۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: ''رسول اکرم ﷺ نے ننگی تلوار لینے دینے سے منع فرمایا۔ ''نَهَی رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ أَنْ يُتَعَاطَى السَّيْفُ مَسْلُولًا'' (۱) ننگی تلوار کے لینے دینے میں جہاں زخمی ہونے کا احتمال ہوتا ہے وہاں اسلحہ کی نمائش سے اِشتعال انگیزی کا بھی خدشہ رہتا ہے، اسلام کے دین خیر وعافیت اور مذہبِ امن وسلامتی ہونے کا اس سے بڑا اور کیا ثبوت ہوسکتا ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے کھلے بندوں اسلحہ کی نمائش پر پابندی لگا دی، تاکہ نہ تو اسلحہ کی دوڑ شروع ہو اور نہ ہی اس سے کسی کو threat کیا جا سکے، مذکورہ حدیث میں لفظِ مَسْلُول اِس اَمر کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ ریاست کے جن اداروں کے لیے اسلحہ ناگزیر ہو وہ بھی اس کو غلط استعمال سے بچانے کے لیے foolproof security کے انتظامات کریں۔

درج بالا بحث سے ثابت ہوتا ہے کہ جب اسلحہ کی نمائش، دکھاوا اور دوسروں کی طرف اس سے اشارہ کرنا سخت منع ہے تو اس کے بل بوتے پر ایک مسلم ریاست کے نظم اور اتھارٹی کو چیلنج کرتے ہوئے آتشیں گولہ و بارود سے مخلوقِ خدا کے جان و مال کو تلف کرنا کتنا بڑا گناہ اور ظلم ہوگا۔ (۲)

---

(۱) ترمذی، السنن، کتاب الفتن، باب ما جاء فی النہیعن تعاطی السیف مسلولا، حدیث: ۲۱۶۳، سنن اَبی داود، السنن، کتاب الجهاد، باب ما جاء فی النہی اَن یتعاطی السیف مسلولا، حدیث: ۲۵۸۸)

(۲) بحوالہ ماہنامہ منہاج القرآن۔

یتیمی ساتھ لاتی ہے زمانہ بھر کے دکھ عابی
سنا ہے باپ زندہ ہو تو کانٹے بھی نہیں چبھتے

یوم یتیم

orphan,s day

۶ جنوری جنگ عظیم کے نتیجے مرنے والوں کی اولاد کا دن ہے، البتہ عالمی پیمانہ پر ۱۱ر نومبر کو یہ دن منایا جاتا ہے، یتیموں کی پرورش کی فضیلت، نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرامؓ کا یتیموں کے ساتھ سلوک، یتیم کی کفالت، یتیم کی تربیت، یتیم کی وراثت، یتیم کے مال کے احکام، یتیم کا ہدیہ دینا، یتیم کا ہدیہ لینا، بچہ گود لینے کے احکام، یتیم کی پرورش کے بجائے ٹسٹ ٹیوب بے بی اور کرایہ کی ماں کا حکم، جنگ عظیم اول کے نتیجہ میں لاکھوں بچے یتیم ہونے کی وجہ ہر سال عالمی یوم یتیم منایا جاتا ہے۔

یتیمی کیا ہے؟

انسان اس دنیا میں آنے کے بعد عمر کے کئی مراحل طے کرتا ہے، ایک مرحلہ بچپن کا ہوتا ہے، دوسرا جوانی کا پھر بڑھاپے کا ان مراحل میں بھی وہ کئی حالات سے گذرتا ہے، بعض لوگوں کی زندگی میں کچھ بڑے حوادث پیش آجاتے ہیں جن کی وجہ سے وہ بے سہارا ہوجاتے ہیں، جیسے عورت کا شوہر انتقال کرجائے، تو وہ عورت بے سہارا ہوجاتی ہے، اسی طرح کسی بچہ کے سر سے ماں باپ کا سایہ اٹھ جاتا ہے تو بچہ بے سہارا ہوجاتا ہے، ہر بچہ جو دنیا میں آتا ہے تو اسے ماں کی گرم آغوش اور باپ کے مشفق سائے کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے، لیکن اس دنیا میں سینکڑوں ہزاروں لاکھوں نہیں، کروڑوں بچے یتیمی کا دکھ سہہ رہے ہیں، ایک وہ بچے ہوتے ہیں جنہیں ماں باپ کا بے جالاڈ پیار بھی ملا ہوتا ہے اور دنیا جہان کی نعمتیں اور آسائشیں بھی میسر ہوتی ہیں، انہیں دکھ تکلیف مصیبت بیماری ذمہ داری کسی چیز کا پتہ نہیں ہوتا، ان کی زندگی عیش وآرام سے گزرتی ہے لیکن ہر وہ بچہ جو یتیم ہوجاتا ہے، وہ جانتا ہے کہ یتیمی کیسا روگ ہے جو ایک کم سن معصوم بچے سے اس کا بچپن اور سائبان چھین لیتی ہے، اکثر والدین اپنے بچوں کیلئے دولت اور آسائش اکٹھی کرنے کی خاطر گناہ ثواب کا فلسفہ بھی فراموش کردیتے ہیں بلکہ ناجائز ذرائع رشوت سفارش بد یانتی خیانت اور غلط ذرائع آمدن سے اپنے بچوں کو شاہانہ طریقہ سے پالتے ہیں، بے شمار لوگوں کا حق مارتے ہیں کسی کو دھوکہ دیتے ہیں، کسی کے مال میں غبن کرتے ہیں اور کسی جگہ رشوت یا جعلسازی سے پیسہ کماتے ہیں لیکن اپنی بیوی کیلئے بھی دولت کے انبار اکٹھے کرتے ہیں اور اپنے بچوں کیلئے بھی دھوکہ دہی سے جائیدادیں بناتے ہیں اور دوسری طرف یتیم بچے جنہیں باپ کا سہارا بھی نصیب نہیں باپ کی دولت اور پیار تو دور کی بات ہے، اسلام سے پہلے بیواؤں اور یتیموں پر بہت ظلم ہوتا تھا؛ لیکن مذہب اسلام نے تمام لوگوں کے حقوق متعین کئے، اولاد پر والدین کے کیا حقوق ہیں، والدین پر اولاد کے کیا حقوق عائد ہوتے ہیں، اسی طرح مسلمانوں پر یتیموں کے کیا حقوق عائد ہوتے ہیں۔

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لئے کچھ کم نہ تھے کروبیاں

ایسی مائیں قابلِ تعریف ہیں جو بچوں کو بھی پالتی ہیں گھر کے کام کاج بھی کرتی ہیں، گھر میں رہ کر سلائی کڑھائی یا لوگوں کے کام کر کے بچوں کیلئے پیسے کماتی ہیں اور باہر جا کر نوکری بھی کرتی ہیں، یتیم بچوں کی ماؤں پر دوہری بلکہ تین گنا زائد ذمہ داریاں عائد ہو جاتی ہیں بغیر مرد اور بغیر پیسوں کے بچے پالنا مشکل کام ہے لیکن بیوہ عورتیں بہادری سے یہ کام کرتی ہیں۔

یتیم کس کو کہتے ہیں

اس کائنات میں بے سہارا انسان کی اس قدر کثیر انواع واقسام ہیں جن کا تجزیہ اور غور وفکر کئے جانے سے مصائب وآلام کا ایک کائناتی تسلسل اور طویل داستانیں سامنے آسکتی ہیں البتہ پریشان حال انسانوں اور کمزور طبقات کے ذیل میں یتیم کی حالت زیادہ اہم اور قابل توجہ محسوس ہوتی ہے، یتیم نفسیاتی اور طبعی طور پر اپنے کو زیادہ کمزور اور بے سہارا محسوس کرتا ہے قرآن حکیم نے یتیم کی پرورش اور حقوق کے بارے میں خصوصی توجہ فرمائی ہے، یتیم سے حسنِ سلوک کے لئے ارشادِ قرآنی ہے ”فاما الیتیم فلا تقھر“(۱) یتیم کو قہر اور غصہ کی نگاہ سے بھی مت دیکھو بلکہ یتیم پر نظرِ شفقت اور رحم کی نظر ہی رہنا چاہئے، کیونکہ یتیم کہتے ہیں ”ھو المنفرد عن الاب لان نفقته علیه لا علی الام و الانثی الیتیمة و الیتیم انقطاع الصبی عن ابیه قبل بلوغه و فی الحدیث لا یتیم بعد الحلم“(۲)
یتیم وہ نابالغ لڑکا لڑکی ہے جس کا باپ موجود نہ ہو اور وہ باپ کے بغیر تنہا رہ گیا ہو اسلئے

(۱) سورۃ ضحیٰ آیت: ۹
(۲) قواعد الفقہ ص: ۳۵۴

یتیم کے معنی میں لڑکا لڑکی دونوں شامل ہیں یتیم کی جمع یتامیٰ قرآن کریم نے استعمال فرمائی ہے، یتیم کے لئے نابالغ ہونا ضروری ہے کیونکہ حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے کہ بالغ ہونے کے بعد کوئی بھی شخص یتیم نہیں رہتا البتہ لڑکی بالغ ہونے کے بعد بھی نکاح ہونے تک یتیمہ کہلاتی ہے کیونکہ عقد نکاح سے پہلے لڑکی کی پوری ذمہ داری باپ پر ہے باپ نہ رہے تو پھر دادا یا پھر بھائی یا چچا اور عصبات وغیرہ اور آخر میں چچا کا بیٹا یتیم لڑکی کا کفیل اور ضامن ہوسکتا ہے، نتیجتاً وہ بے سہارا ہوگیا ہے یا ایسی بالغ لڑکی جو شادی کی منزل تک نہ پہونچی ہو یا شوہر نے واپس بھیج دیا ہو یا ایسا بالغ لڑکا جو معذور مریض شدید ہو ایسے لوگ بھی حکماً یتیم کی مثل تسلیم کئے جاتے ہیں۔ (۱)

لفظ ''یتیم'' کتنا عجیب وغریب ہے، اس لفظ کو سنتے ہی دل میں احساس محبت جنم لیتا ہے، یتیم بچے یا بچی کے لیے ہمارے دل میں محبت اور پیار میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اللہ کرے کوئی یتیم نہ ہو، کسی عورت کا سہاگ چھن جائے، بچوں کا والد اس دنیا سے رخصت ہو جائے تو غم و درد کی کیفیت اسی سے پوچھیے جس کے ساتھ یہ معاملہ گزرا ہو، باپ تو سائبان کی طرح ہوتا ہے، ہر شخص اپنی اولاد سے بے پناہ محبت کرتا ہے، وہ چھوٹے بچے کو چومتا ہے، گلے سے لگاتا ہے، اس کی پرورش کرنے اور اس کو زندگی کی سہولتیں مہیا کرنے کے لیے صبح و شام محنت کرتا ہے، گھر آتا ہے تو سیدھا بچوں کے پاس جاتا ہے، وہ بھی بھاگتے ہوئے آتے ہیں، اپنے بابا کی ٹانگوں کے ساتھ چمٹ جاتے ہیں، باپ بے اختیار بوسے دینے لگ جاتا ہے، بچے توتلی زبان میں والد کو باتیں سناتے ہیں، کبھی شکایت لگاتے ہیں، والد بچوں کی باتیں سن کر بے اختیار مسکراتا ہے، خوش ہوتا ہے، اسی کا نام زندگی ہے۔

---

(۱) قرآن اور پسماندہ طبقات کے حقوق ص: ۸۲

یتیموں کی تعداد

دنیا میں ہر ۳۰ سکینڈ میں دو بچے یتیم ہو جاتے ہیں، دنیا چھ ارب سے زائد نفوس پر مشتمل ہے جس میں اس وقت ۱۵ کروڑ ۳۰ لاکھ بچے یتیم ہیں اور اقوام متحدہ کے ادارے یونیسف کے مطابق دنیا بھر میں یتیم بچوں کی تعداد ۱۶/کروڑ سے تجاوز کر رہی ہے ان میں سے تقریباً ۶/ کروڑ یتیم بچوں کا تعلق ایشیا سے ہے، آزاد اور غیر جانبدار ذرائع کے مطابق ان میں سب سے زیادہ تعداد مسلمان بچوں کی ہے، جن کا تناسب ۷۵ فیصد بنتا ہے

اور اِن بچوں کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ اگر یہ یتیم بچے انسانی ہاتھوں کی زنجیر بنائیں تو پوری دنیا کے گرد حصار بن سکتا ہے، وادیٔ کشمیر جہاں مختلف سروے کے مطابق سوا دو لاکھ بچے یتیم، پچاس ہزار عورتیں بیوہ اور ایک لاکھ سے زائد افراد ذہنی بیماریوں میں مبتلا ہیں چند مسلم ممالک عراق، افغانستان، فلسطین اور شام میں بھی گزشتہ چند سال سے جاری خانہ جنگی کے باعث یتیم بچوں کی تعداد میں خطرناک حد تک اضافہ ہوا ہے دنیا میں مسلط جنگوں اور مناپلی کی جنگ میں بہت سے چھوٹے اور کمزور ممالک میں جنگ وجدل جاری ہے، خاص طور پر اسلامی اور افریقی ممالک میں یہ صورتحال گھمبیر ہے۔(۱)

یورپ میں یتیموں کا استحصال

اقوام متحدہ کی ہی رپورٹ کے مطابق یورپ میں ۲۰/لاکھ یتیم بچوں کو جسم فروشی کے عذاب میں جھونک دیا جاتا ہے، آگن مافیا کے ہاتھوں برباد ہونے اور موت کے گھاٹ اترنے والے یتیم بچوں کی تعداد بھی ۱۵/لاکھ سے زیادہ ہے جن کو ہیومن ٹریفکنگ (Human traffickeng) کے بعد اپنے جسموں کے قیمتی اعضا سے محروم کر کے پوری بے رحمی کے ساتھ تڑپ تڑپ کے مرنے دیا جاتا ہے، لیکن یہ بات بھی اپنی جگہ

---

(۱) روزنامہ نوائے وقت، Mar 06, 2018

حقیقت ہے کہ گھروں میں پلنے والے ان یتیم بچوں کو برابر حقوق حاصل نہیں ہیں۔ بلکہ جو رشتہ داران یتیم بچوں کو پناہ دیتے ہیں، وہ ان سے گھروں میں ملازموں جیسا سلوک کرتے ہیں، انہیں تعلیم نہیں دی جاتی بلکہ ان سے کام لیا جاتا ہے، بالخصوص یتیم بچیوں کو تو گھر میں گھر کے کام کروانے کے لئے رکھ لیا جاتا ہے۔ کیونکہ ویسے تو ملازم بہت مہنگے ہیں۔ اس طرح صرف کھانے اور پرانے کپڑوں پر مفت ملازم مل جاتا ہے، اس طرح یورپ اور مغرب کے یتیم بچوں کو اور قسم کے استحصال کا سامنا ہے۔

مہنگائی کے دور میں یتیموں کی پرورش

نیکی کیلئے لازم نہیں کہ آپ کی دونوں جیبیں پیسوں سے بھری ہوں یا آپ اقتدار کی مسند پر جلوہ افروز ہوں، نیکی کیلئے نیت اور ارادہ کافی ہوتا ہے، معاشرے میں یا بہت امیر لوگ ہیں یا بہت غریب لوگ ہیں جس کی وجہ سے معیشت، معاشرت، ثقافت اور تعلقات متاثر ہوتے ہیں، اتنی زیادہ مہنگائی میں بے آسرا یتیم بچوں کیلئے زندگی گزارنا کسی امتحان سے کم نہیں لیکن یہ طے شدہ امر ہے کہ یتیم بچوں پر اوائل عمری سے ذمہ داریوں کا بوجھ پڑ جاتا ہے، یہ بچے بغیر باپ یا ماں کے پلتے ہیں، انکی ماؤں پر گہری ذمہ داریوں کا بوجھ ہوتا ہے، یہ بچے زمانے کا گرم سرد دیکھ کر بڑے ہوتے ہیں اس لئے ان بچوں کا تجربہ اور مشاہدہ عام بچوں سے زیادہ ہوتا ہے، ان بچوں میں ذمہ داری، فرض کی ادائیگی ہوتی ہے، یہ بچے ڈسپلن (discipline) کا خیال رکھتے ہیں، دیگر ممالک میں یتیم بچوں کو مفید شہری بنایا جاتا ہے، لیکن ہمارے ہاں حکومتی سطح پر یتیم بچوں کے ساتھ معمولی رویہ رکھا جاتا ہے، یتیم بچوں کی انا سے کبھی نہیں کھیلنا چاہئے، ان کو اپنی صلاحیتوں اور ذہانتوں کے مطابق مواقع دینے چاہئیں کیونکہ ذہانت کسی کی میراث نہیں ہوتی، جن بچوں کو انکی صلاحیتوں کے مطابق مواقع دیئے گئے تو بچے بڑے بڑے عہدوں تک جا پہنچے، مغربی ممالک میں تو کئی یتیم بچے صدر اور وزیر اعظم بھی بنے، اور کون جانتا ہے کہ انہی بن ماں باپ کے بچوں میں سے کوئی کل کو ہمارا

صدر، وزیراعظم، چیف جسٹس، آرمی چیف، گورنر یا وزیر بنے، ہم سب کو بطور انسان اس کارخیر میں حصہ لینا چاہئے، کون جانے ہماری ایک چھوٹی سی نیکی معمولی سا نذرانہ پیار کے دو میٹھے بول کسی یتیم کا مقدر جگادیں اور ہمیں خدا کی نگاہ میں سچ مچ اشرف المخلوقات بنادیں۔

بچوں کو اسکول بیگ، کتابیں، کاپیاں، اسٹیشنری، خوراک، رہائش کا انتظام، کھیل وتفریح کے مواقع کے علاوہ بچوں کے طبی معائنے کا اہتمام، بچوں کے علاوہ ان کی ماؤں کیلئے بھی میڈیکل کیمپ کا اہتمام، فری میڈیکل کیمپ میں مکمل ہیلتھ اسکریننگ (health screening) اور ساتھ ہی ادویات بھی فراہم بھی یتیموں کی خدمت کا اہم حصہ ہے۔

درِ یتیم

یتیم ہونا انسان کا نقص نہیں اور نہ ہی اس میں بندہ کا اختیار ہے، بلکہ یہ منشائے خداوندی ہے کہ وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے، اُس نے اپنے محبوب ترین بندے سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حالتِ یتیمی میں پیدا فرمایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے والد ماجد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت باسعادت سے بھی پہلے وصال فرما چکے تھے، پھر چھ سال کی عمر میں ہی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی والدہ ماجدہ بھی انتقال فرما گئیں، چچا نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو باپ کی شفقت اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی باندی ام ایمن رضی اللہ عنہا اور حضرت ابو طالب کی بیوی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے آپ کو ماں کی محبت اور ممتا دی؛ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس کیفیت کا ذکر قرآن حکیم میں یوں کیا ہے: ”(اے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم!) کیا اُس نے آپ کو یتیم نہیں پایا، پھر اُس نے (آپ کو معزز ومکرم) ٹھکانہ دیا“ پھر اس دُرِّ یتیم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یتامیٰ کی محبت، ان کے ساتھ شفقت وحسنِ سلوک اور اِحسان برتنے کی نہایت اعلی مثالیں قائم کیں، حضرت عبد اللہ بن دینار رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو حضرت ابو طالب کا یہ شعر پڑھتے ہوئے سنا: وہ گورے مکھڑے والے آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جن کے چہرہ انور کے توسّل سے بارش مانگی جاتی ہے، اور آپ صلی اللہ علیہ والہ وسلم یتیموں کے والی اور بیواؤں کا سہارا ہیں۔ ”عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ دِیْنَارٍ

رضی اللہ عنہ قَالَ :سَمِعْتُ ابْنَ عُمَرَ رضي اللہ عنہما يَتَمَثَّلُ بِشِعْرِ أَبِي طَالِبٍ:

وَأَبْيَضَ يُسْتَسْقَى الْغَمَامُ بِوَجْهِهِ ثِمَالُ الْيَتَامٰى عِصْمَةٌ لِلأَرَامِلِ (۱)

لیکن والدین کی جدائی میں انسان کے جو احساسات ہوتے ہیں، ان کی حیثیت آپ کے لئے جگ بیتی کی نہیں، آپ بیتی کی تھی، نیز مکہ کے معاشرہ میں یتیموں کے ساتھ جو بدسلوکی ہوتی تھی، وہ بھی آپ کی نگاہوں میں تھی، اسی لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کثرت سے یتیموں اور ناداروں کے بارے میں حسن سلوک کی تعلیم دی۔

دورِ جاہلیت میں یتیموں کے ساتھ سلوک

دورِ جاہلیت میں یتیموں کے ساتھ بہت ظالمانہ برتاؤ کیا جاتا تھا جس کا نقشہ قرآن نے اس طرح کھینچا ہے یتیم بچیوں کے ساتھ انصاف کرو اگر انصاف نہیں کر سکتے تو ان کے ساتھ نکاح مت کرو تمہارے لئے دوسری عورتوں کے ساتھ نکاح کا راستہ کھلا ہے۔ "وان خفتم الا تقسطوا فی الیتمٰی" اس آیت کی تفسیر میں حضرت عائشہؓ سے اس طرح مروی ہے کہ صاحب حیثیت اور صاحب جمال یتیم لڑکی کسی ولی کی سرپرستی میں ہوتی تو وہ اس کے مال و جمال کی وجہ سے اس سے شادی تو کر لیتا لیکن اسکا دوسری عورتوں کی طرح پورا حق مہر نہ دیتا، اسی طریقہ سے ابن عباسؓ اور ان کے شاگرد عکرمہؒ اس آیت کی تفسیر یہ بیان کرتے ہیں کہ جاہلیت میں نکاح کی کوئی حد نہ تھی جب مصارف بڑھ جاتے تھے تو مجبور ہو کر اپنے یتیم بھتیجوں، بھانجوں اور دوسرے بے بس عزیزوں کے حقوق پر دست درازی کرتے تھے اسی طریقہ سے یتیم کے مال کے سلسلہ میں یہ رواج تھا کہ جب کوئی یتیم ان کی سرپرستی میں رہتا تو وہ اس کو اس کا مال نہیں دیا کرتے، اگر کوئی یتیم بچی ہوتی اور وہ سن بلوغ کو پہنچ جاتی تو اگر اس میں حسن و جمال ہوتا تو اس کو نکاح کر کے اپنے پاس رکھتے تھے اور اسکے مال پر

---

(۱) صحیح بخاری، کتاب ال[illegible] حدیث نمبر: ۹۶۳۔

قابض رہتے تھے اور اگر ان میں حسن و جمال نہ ہوتا تو اس کو مجبور کرتے تھے یہاں تک کہ وہ مال دے کر اپنے آپ کو آزاد کرلے، بہر حال اکثر لوگ یتیموں کا مال لے کر قبضہ کرلیتے تھے اور ان کے ساتھ بہت ذلت سے پیش آتے تھے اگر اس یتیم لڑکی سے نکاح بھی کر لیتے تو کسی غرض کی وجہ سے کرتے تھے۔(۱)

لیکن اسلام نے ان تمام جاہلانہ سلوک کا قلع قمع کیا اور یتیم کو وہ درجہ دیا جو دیگر مذاہب میں معدوم ہے چنانچہ یتیم کی پرورش کرنے والے اور اس کے ساتھ حسن سلوک کرنے والے کو جنت کی بشارت سنائی ہے، اور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”احب بیوتکم الی اللہ بیت فیہ یتیم مکرم“(۲) اللہ کو زیادہ محبوب وہ گھر ہے جس میں کوئی یتیم ہو اور اس کی ناز برداری ہوتی ہو۔

پہلا یتیم خانہ اسلام میں بنایا گیا

یتیموں کے حقوق کی حفاظت کے سلسلہ میں اسلام کی جو خدمات رہی ہیں، اس سلسلہ میں علامہ سید سلیمان ندویؒ نے اپنی کتاب سیرۃ النبی ﷺ میں بڑی اچھی تفصیل کی ہے، جس کا ایک پیرا گراف (pragraph) یہ ہے:

”آج دنیا کے شہر شہر میں یتیم خانے قائم ہیں، اگر یہ سوال کیا جائے کہ محمد ﷺ سے پہلے بھی بدقسمت گروہ اس نعمت سے آشنا تھا، تو تاریخ کی زبان سے جواب نفی میں ملے گا، اسلام پہلا مذہب ہے جس نے اس مظلوم فرقہ کی دادرسی کی، عرب

---

(۱) جمالین شریف شرح جلالین: ۱/۶۰۰۔

(۲) المعجم الکبیر للطبرانی، محمد بن طلحہ عن ابن عمر حدیث: ۱۳۴۳۴، علامہ ہیثمیؒ نے فرمایا کہ اس کو طبرانی نے روایت کیا ہے اور اس میں اسحاق بن ابراہیم الحنینی ہے وقد کان ممن یخطئ. مجمع الزوائد باب ماجاء فی الایتام والارامل والمساکین حدیث: ۱۳۵۱۳

پہلی سرزمین ہے جہاں کسی یتیم خانہ کی بنیاد پڑی، اور اسلام کی حکومت دنیا کی پہلی حکومت ہے جس نے اس ذمہ داری کو محسوس کیا، اور عرب، مصر، عراق، ہندوستان، جہاں جہاں مسلمانوں نے اپنی حکومتوں کی بنیاد ڈالی، ساتھ ساتھ ان مظلوموں کے لئے بھی امن وراحت کے لئے گھر بنائے، ان کے وظیفے مقرر کئے، مکتب قائم کئے، جائیدادیں وقف کیں، یہ یتیموں کے سلسلہ میں اسلام کی خدمات رہی ہیں"۔(۱)

یتیم کے ساتھ حسن سلوک قرآن کا حکم ہے

اسلام میں یتیموں اور بے سہارا لوگوں کے ساتھ حسن سلوک کی جس قدر تعلیم دی گئی ہے، شاید کسی اور مذہب میں دی گئی ہو، عام طور پر مذہب کے کچھ جزوی کاموں کو انجام دے کر لوگ سمجھتے ہیں کہ انھوں نے اجر وثواب کے بہت سے کام کر لئے، قرآن مجید نے اس مزاج کو رد کرتے ہوئے فرمایا کہ محض یہ بات کہ: تمہارا رخ مشرق کی طرف ہو کہ مغرب کی طرف، اصل نیکی نہیں ہے؛ بلکہ اصل نیکی ایمان لانا، خود ضرورت مند ہونے کے باوجود قرابت داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں وغیرہ پر خرچ کرنا ہے "لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّينَ وَآتَى الْمَالَ عَلَى حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَى وَالْيَتَامَى وَالْمَسَاكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَالسَّائِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ"۔(۲)

بنی اسرائیل سے جن باتوں کا عہد لیا گیا، جن کا قرآن مجید نے ذکر کیا ہے، ان میں والدین، قرابت داروں، یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ حسن سلوک کا خاص طور پر ذکر آیا ہے، "وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَائِيلَ لَا تَعْبُدُونَ إِلَّا اللهَ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَذِي الْقُرْبَى

(۱) سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حصہ دوم ۴۲۷۔ ۴۲۸، علامہ سید سلیمان ندویؒ، مکتبہ ادارۂ اسلامیات ۲۰۰۲ء

(۲) البقرۃ: ۱۷۷۔

وَالْيَتَامَى وَالْمَسَاكِينِ وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ إِلَّا قَلِيلًا مِنْكُمْ وَأَنْتُمْ مُعْرِضُونَ"۔(۱)

اللہ تعالیٰ نے یہ بات بھی فرمائی کہ اگر تقسیم میراث کے وقت کچھ قرابت دار، یتیم اور مسکین آجائیں، جن کا اس میں حق نہیں ہو، تو اپنی طرف سے اخلاقاً کچھ ان کو بھی دیدو اور ان سے بھلی بات کرو، اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ایک بات ارشاد فرمائی ہے، جو انسان کو لرزا دینے والی ہے، اللہ تعالیٰ نے دعوت فکر دی ہے کہ سوچو! اگر تم اپنے پیچھے کمزور و بے سہارا بچوں کو چھوڑ کر جاتے تو تم ان کے بارے میں کس طرح ڈرتے؟ اسی طرح دوسروں کے چھوڑے ہوئے یتیموں کے بارے میں اللہ سے ڈرو: "وَلْيَخْشَى الَّذِينَ لَوْ تَرَكُوا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعَافًا خَافُوا عَلَيْهِمْ فَلْيَتَّقُوا اللهَ۔(۲)

اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو دین حق کا جھٹلانے والا قرار دیا ہے جو یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ بے رخی اور بدسلوکی کا معاملہ کرے، "فَذَلِكَ الَّذِي يَدُعُّ الْيَتِيمَ، وَلَا يَحُضُّ عَلَى طَعَامِ الْمِسْكِينِ' (۳) قرآن مجید کا بیان ہے کہ جو لوگ ضرورت مند ہونے کے باوجود ناداروں، یتیموں اور قیدیوں کو کھلائیں گے، آخرت میں بہترین نعمتوں سے سرفراز کئے جائیں گے۔ وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَى حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا، إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللهِ لَا نُرِيدُ مِنْكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكُورًا(۴)

یتیموں پر خرچ کی فضیلت

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ مال انسان کے لئے اس وقت خیر کا ذریعہ ہے، جب وہ اس

---

(۱)(البقرۃ :۸۳)

(۲)(النساء :۹)

(۳)(الماعون :۲–۳)

(۴)(الدہر۵ :تا۸)

سے ناداروں ،یتیموں اور مسافروں کی خدمت کرے ”فنعم مال المسلم ما أعطی منه المسكين واليتيم وابن السبيل “(۱) اگر یتیم کا کچھ مال موجود ہوتو اس میں بھی خیانت اور بے احتیاطی سے باز رہنے کی خصوصی تاکید کی گئی ہے اور حکم دیا گیا کہ بدنیتی کے ساتھ ان کے مال کے قریب بھی نہ جاؤ ،وَلَا تَقْرَبُوا مَالَ الْيَتِيمِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ حَتَّى يَبْلُغَ أَشُدَّهُ وَأَوْفُوا بِالْعَهْدِ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُولًا (الأسراء : ۳۴) اور ارشاد ہوا کہ یتیم کا مال کھانا گویا جہنم کی آگ کھانا اور اپنے لئے دوزخ میں جانے کا راستہ پکڑنا ہے ۔”إِنَّ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ أَمْوَالَ الْيَتَامَى ظُلْمًا إِنَّمَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ نَارًا وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيرًا“ (۲)

یہاں تک کہ عورت خود اپنے یتیم بچہ کی محبت کے ساتھ پرورش کرے اور ان پر خرچ کرے تو اس کا بھی بڑا اجر ہے ،حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی زوجہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ رسول اللہ نے مسجد نبوی میں خواتین کو تلقین فرمائی کہ وہ صدقہ کریں ، چاہے اپنا زیور ہی دینا پڑے ،حضرت زینب رضی اللہ عنہا اپنے شوہر عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ پر اور اپنے زیر پرورش یتیم بچوں پر خرچ کیا کرتی تھیں ، انہوں نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے کہا کہ حضور ﷺ سے پوچھیں کہ کیا ان کی طرف سے یہ صدقہ کے لئے کافی ہو جائے گا؟ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو غالباً حضور ﷺ سے یہ پوچھنے میں حجاب ہوا ،انہوں نے کہا کہ تم خود پوچھ لو ،حضرت زینب رضی اللہ عنہا پوچھنے گئیں تو وہاں ایک اور انصاری خاتون بھی اسی سوال کے ساتھ حاضر تھیں ،بہرحال حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے واسطہ سے سوال بارگاہ نبوی ﷺ میں پہنچا ،آپ ﷺ نے فرمایا : ایسا کرنے

---

(۱) بخاری ،حدیث نمبر ۱۴۶۵ :۔

(۲) (النساء :۱۰)

میں دوہرا اجر ہے، قرابت کا بھی حق ادا ہوگا اور صدقہ کا بھی۔(۱) حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے زیر پرورش حضرت ابوسلمہ رضی اللہ عنہ کے بچے تھے، جو یتیم ہو چکے تھے، حضور ﷺ نے ان کے استفسار پر فرمایا کہ تم اپنے ان بچوں پر جو خرچ کروگی، اس کا بھی تمہیں اجر ہوگا۔(۲)

ماں کو اپنی اولاد سے جو محبت اور ممتا ہوتی ہے، وہ ظاہر ہے، اس فطری تقاضہ کے تحت ماں اس پر خرچ کرنے پر مجبور ہوتی ہے، اس کے باوجود جب اللہ تعالیٰ نے اس کو باعث اجر قرار دیا تو دوسرے یتیم بچوں کے ساتھ حسن سلوک کا جو اجر ہوگا، وہ ظاہر ہے۔

یتیم پر کتنا خرچ کریں؟

یتیم کے وصی پر ضروری ہے کہ اس کے حال اور اس کے مال کے بقدر خرچ کرے، اگر یتیم کا مال زیادہ ہو تو اس پر کشادگی کے ساتھ خرچ کرے گا، اور اگر کم ہے تو اسی کے بقدر خرچ کرے گا، اگر یتیم فقیر ہو تو اس کا نفقہ اس پر لازم ہوگا جو یتیم سے زیادہ قریب ہے۔(۳)

یتیم کا اکرام

یتیموں کی صرف پرورش ہی کا حکم نہیں ہے؛ بلکہ ان کی توقیر اور ان کے ساتھ اکرام سے پیش آنے کا بھی حکم ہے، اللہ تعالیٰ نے کفار مکہ کے اس مزاج پر بھی نقل فرمایا کہ وہ یتیم کے ساتھ بے اکرامی اور بے توقیری کا معاملہ کرتے تھے: ”کَلَّا بَلْ لَّا تُکْرِمُوْنَ الْیَتِیْمَ“ (الفجر:۱۷) سائب بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کو فتح مکہ کے دن حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ وغیرہ لے کر آپ ﷺ کی خدمت میں آئے، یہ لوگ حضرت سائب رضی اللہ عنہ کی تعریف کررہے تھے، آپ نے ارشاد فرمایا: مجھے نہ بتاؤ، یہ تو زمانہ جاہلیت سے میرا ساتھی ہے،

---

(۱) بخاری، حدیث نمبر:۱۴۶۶

(۲) صحیح بخاری، حدیث:۱۴۶۸۔

(۳) الاحکام فی حقوق الانسان فی الاسلام، ص:۳۸۴، مکتبۃ الحمیض مکہ مکرمہ ۱۴۲۶ھ

حضرت سائب رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ہاں، اے اللہ کے رسول! ہم آپ ﷺ کے ساتھی تھے، اور آپ کیا ہی بہتر ساتھی تھے، آپ ﷺ نے فرمایا: سائب تم زمانہ جاہلیت میں جن اخلاقی خوبیوں کے حامل تھے، اسلام میں بھی ان کو قائم رکھو، یعنی ”مہمانوں کی مہمان نوازی، یتیموں کا اکرام اور پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک“۔(۱)

اسلام یتیموں کا محافظ

یتیم انسانی معاشرہ کے کمزور لوگ ہیں اور طاقت ور انسان سے زیادہ تر ان ہی طبقات کو استحصال، جبر اور تشدد کا نشانہ بننا پڑتا ہے، دنیا میں جب اسلام اور اس کا نظام انسانی معاشرہ کے لئے راہ نما ہوا تو اس وقت کے طاقتور لوگ یتیم بچوں اور کمزور انسانوں کے حقوق انسانی ترکہ ومیراث وغیرہ مالیت کے حقوق اور پرسکون زندگی دینے کے لئے تیار نہ تھے باپ کے مرنے کے بعد طاقتور لوگ یتیموں اور کمزوروں کا مال اٹھا کر لے جاتے، یتیم اپنے باپ کی شفقت سے محرومی کے ساتھ روٹی کے ٹکڑے کو بھی محتاج ہو جاتا ہے، نزولِ قرآن کے وقت ایک عظیم ظالمانہ نظام قائم تھا جس ظلم کی اپیل کے لئے عدالت بھی نہ تھی، طاقت کی حکمرانی تھی یتیم اپنے حقوق کے لئے کوئی آواز اٹھانے کی جرأت وہمت نہیں کر سکتے تھے ایسے شدید اور مشکل اور جابرانہ دور میں اسلام نے یتیموں اور کمزوروں کے لئے منشور انسانی کا نہ صرف لفظی اجر فرمایا بلکہ عملی طور پر پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ نے انسانی حقوق کے لئے پورے عزم وحوصلے کے ساتھ کوششیں شروع فرمائیں، اس وقت کے شدید حالات میں حضور ﷺ نے اپنی دو انگلیوں سے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا جس طرح ہاتھ کی یہ دو انگلیاں ایک دوسرے سے نزدیک ہیں ایسے ہی یتیم کا ضامن اور مددگار قرب محمدی ﷺ روز قیامت پائے گا اور دونوں جہاں کی خوشحالی سے کامیاب ہوگا، یہی وجہ ہے کہ اسلام نے یتیموں

---

(۱) سنن أبو داوٗد، حدیث: ۴۸۳۶۔

اور کمزور انسانوں کے تحفظ کا وہ نظام پیش کیا کہ جو دیگر مذاہب میں مفقود ہے، انسانی ہمدردی کا وہ نمونہ بتایا ہے کہ یتیموں کی پرورش پر بہشت کا وعدہ کیا اور یہ تحفظ یتیم کو آج سے چودہ صدی (۱۴۰۰) سال پہلے جابرانہ وظالمانہ مزاج معاشرہ کے سامنے پیش کیا گیا تھا جب کہ عالمی معاشرہ اس پر خاموش تماشائی تھا جب کہ یتیم اور بے سہارا انسان کو کوئی مقام اور تحفظ حاصل نہ تھا اور اس وقت کا سماج یتیم اور کمزوروں کو گائے بھینس کی طرح طاقت کے زور پر ظلم وستم کرنا اور مال چھین لینا درست سمجھتا تھا۔

اسلام نے ایسے ظالمانہ ماحول میں نہ صرف یتیم کو تحفظ دیا ہے بلکہ ''الخلق عیال اللہ'' (۱) بزبان نبی ﷺ تلقین فرما کر تمام انسانوں کو خدا کا پریوار اور برابر کا انسان قرار دیا ہے۔ اس طرح نتیجتاً قرآن کریم غریب اور بے سہارا انسانوں کا نقیب اور محافظ انسانیت ہے۔

خلاصہ یہ کہ اسلام نے یتیموں کے حقوق کی پاسبانی کی ہے، تاکہ وہ امن وسکون کے ساتھ زندگی گزار سکیں، پھر یتیم کی تربیت کرنے کا حکم دیا اور اس کی کفالت کو مستحب قرار دے کر اس پر اجر عظیم رکھا، اس کے مال کی حفاظت اور اس کو بڑھانے کا حکم دیا، ظلماً اس کے کھانے سے منع کیا، جہاں اسلام نے یتیم کے ساتھ نرمی، مہربانی، اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے اور یتیم بچیوں کے حفظ وامان کا ذمہ لینے کی تعلیم دی ہے، وہیں اسکی اہانت، اسکے ساتھ بدسلوکی اور ظلم وزیادتی اور ان کے اموال کے حرص میں ان سے نکاح کرنے سے احتراز اور بچنے کا بھی تاکیدی حکم دیا ہے۔ (۲)

یہ بات کسی اہلِ علم سے مخفی نہیں ہے کہ اسلام نام ہے خالق ومخلوق کے حقوق ادا کرنے

---

(۱) مسند البزار مسند ابی حمزہ انس بن مالک حدیث ۶۹۴۷، علامہ ہیثمیؒ نے فرمایا کہ اس کو ابویعلیٰ اور بزار نے روایت کیا ہے اس میں یوسف بن عطیہ الصفار ہے اور وہ متروک ہے مجمع الزوائد: ۱۳۷۰۶

(۲) الاحکام فی حقوق الانسان فی الاسلام ص ۳۸۴، عبدالعزیز محمد سندی، مکتبہ الحمیض مکہ مکرمہ

کا،اورمخلوق میں صرف انسان ہی نہیں بلکہ بے زبان جانوروں کے حقوق کی بھی تلقین کی گئی ہے، مزید براں عالم انسانیت میں لگے بندھے رشتے ہی نہیں بلکہ سفر کے پڑوسی "الصاحب بالجنب" کا حق بھی سکھلایا ہے،مومن کو کعبہ سے بھی اشرف بتایا گیا "ولکن المؤمن اعظم حرمۃ منک" ایسا معتدل مذہب یتیم کے حقوق سے بھلا کیسے صرف نظر کرسکتا ہے،خود خدائے ذوالجلال نے "ولا تتبدلوا الخبیث بالطیب"(۱)

حرام مال کو حلال سے مت بدلو!اسی طریقہ میراث سے محروم رہنے والے یتیم پوتے تک کے لئے کچھ بطورِ ہدیہ دینے کا وارثین کو مشورہ دیا" فارزقوھم منه وقولوا لھم قولا معروفاً"(۲)

یتیم کے ساتھ حسن سلوک اور فرمانِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

اسلام نے ہمیں یہ تعلیم دی ہے کہ یتیموں کے ساتھ شفقت ومحبت کا معاملہ کریں،انسان کو محبت والدین سے ملتی ہے، جب انسان کو اصل محبت دینے والے نہ ہوں تو ان سے ایسا معاملہ کرنا چاہئے کہ ان کو اس کمی کا احساس ہونے نہ پائے،اسی وجہ سے قرآن میں جگہ جگہ ان کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید فرمائی گئی ہے۔(۳)

جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے چند احکام اور سابقہ شریعتوں میں مشترک ہیں،جن میں توحید، والدین، رشتہ داروں، یتیموں اور مسکینوں کی خدمت اور تمام انسانوں کے ساتھ گفتگو میں نرمی وخوش خلقی کرنا وغیرہ امور داخل ہیں۔

☆ قرآنِ حکیم کی ترجمانی حدیث رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہوتی ہے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود اپنی زندگی کا آغاز دورِ یتیمی سے فرمایا تھا اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یتیم اور کمزور طبقات کا

(۱) النساء آیت:۲

(۲) النساء آیت:۹

(۳) البقرہ:۸۳،النساء:۳۶

خصوصی خیال تھا آپ ﷺ نے یتیم کی کفالت اور یتیم سے حسن سلوک کے سلسلہ میں یہ ارشاد فرمایا:

عن سهل بن سعد عن النبی ﷺ قال انا و كافل اليتيم فی الجنة هكذا وقال باصبعيه السبابة و الوسطیٰ (۱) یتیم کا کفیل اور میں کل قیامت کے دن ایسے قریب ہونگے جیسے شہادت کی انگلی اور بیچ کی انگلی ایک دوسرے کے نزدیک تر ہیں، خواہ وہ یتیم رشہ دار ہو یا غیر ہو۔(۲)

☆عموماً جب کبھی دوست اکٹھے ہوتے ہیں تو ایک دوسرے کو یہ بتانے کے لیے کہ میں بڑا اہم شخص ہوں کہتے ہیں : ہمارے فلاں بڑی شخصیت سے بڑے قریبی تعلقات ہیں وہ تو ہماری شادی پر بھی آیا تھا، ہمارے ہاں وفات ہوئی تو تعزیت کے لیے آیا تھا، ہمارے شہر کا بڑا الیڈر رہو یا وہ وزیر بن جائے تو ہم بڑے فخر سے کہتے ہیں کہ ہاں یار فلاں تو ہمارے شہر کا رہنے والا ہے، یار وہ تو اپنا ہی آدمی ہے، اپنے علاقے کا ہے۔

اگر خوش قسمتی سے کوئی بڑا لیڈر (leader) یا وزیر ہمارا محلے دار یا ہمسایہ ہو تو ہم بڑے فخر سے لوگوں کو بتاتے پھرتے ہیں کہ ہم فلاں وزیر یا فلاں آفیسر (officer) یا سیاست دان کے پڑوس میں رہتے ہیں۔ یہ فطرت کے تقاضے ہیں، ہر شخص اپنی اہمیت جتانا چاہتا ہے، ذرا تصور کریں کہ اگر آپ کے پڑوس میں اللہ کے رسول ﷺ کا گھر ہو تو آپ کیسا محسوس کریں گے؟ اچھا! اس سے بڑھ کر غور کریں کہ اگر یہ ہمسائیگی جنت میں، اللہ کے رسول ﷺ کے ساتھ ہو تو پھر آپ کو کیسا لگے گا؟! کیا آپ نہیں چاہیں گے کہ آپ اللہ کے رسول ﷺ کے ہمسایہ میں رہتے ہوں، مجھ سمیت اگر ہم اپنے گناہوں کی طرف دیکھیں تو حیا آتی ہے، کہاں اللہ کے رسول ﷺ کی شان، آپ ﷺ کی منزلت، آپ ﷺ کا مقام ومرتبہ، آپ ﷺ

---

(۱) بخاری شریف، رقم الحدیث: ۶۰۰۵ باب فضل من یعول یتیما، مکتبہ دارطریق النجاۃ۔ بیروت
(۲) معارف الحدیث: ۶/ ۳۱۴، مولانا منظور احمد نعمانیؒ، مکتبہ دارالاشاعت کراچی، اپریل ۲۰۰۷ء

کائنات کی سب سے اعلیٰ وارفع شخصیت ہیں، اگر کسی کو آپ ﷺ کا قرب یا ہمسائیگی مل جائے تو کیا آپ اپنی خوش قسمتی پر ناز نہیں کریں گے۔ بلاشبہ وہ شخص بڑا ہی خوش نصیب ہے جسے اللہ کے رسول ﷺ کی ہمسائیگی نصیب ہو جائے، اللہ کے رسول ﷺ کی ہمسائیگی کیسے کسے اور کب نصیب ہوگی؟

☆ اسلام نے ہمیں یہ تعلیم دی ہے کہ جو لوگ مالدار ہیں ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ ان یتیموں کی مالی امداد کرتے رہیں؛ کیونکہ ان کے پاس کوئی خاص ذریعۂ معاش تو نہیں ہوتا؛ مگر زندگی گزارنے کے لئے مال کی ضرورت پڑتی ہے رسول اکرم ﷺ نے یتیم کی پرورش اور اس کی کفالت اور مدد کی فضیلت اس طرح بیان فرمائی: حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جو شخص کسی یتیم کو اپنی کفالت اور ذمہ داری میں لے لے اور کھانے پینے اور ضروریات زندگی کی ذمہ داری قبول کرلے اس نیک عمل کی جزا عنداللہ یہ ہے کہ اللہ اس کو جنت میں داخل فرمائے گا، اور اس کو یقینی طور پر جنت ملے گی صرف ایک صورت مستثنیٰ ہے کہ وہ شرک کفر کرنے لگے کیونکہ شرک کا گناہ بغیر ترک شرک معاف نہیں ہوتا۔ "**عن ابن عباس رضی اللہ عنہ ان النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قال من قبض یتیما من بین المسلمین الی طعامه و شرابه ادخله الجنة البتة الا ان یعمل ذنبا لایغفر** (۱)

☆ حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص کسی مسلمان کے یتیم بچہ کو کھانے پینے وغیرہ ضروریات میں اپنے ساتھ ملالیتا ہے حتیٰ کہ وہ خود

---

(۱) ترمذی حدیث: ۱۹۱۷ باب ماجاء فی رحمۃ الیتیم، امام ترمذیؒ نے فرمایا کہ اس میں ایک راوی "حنش" ہے اور وہ محدثین کے نزدیک ضعیف ہے۔ مسند ابی یعلی، اول مسند ابن عباس حدیث ۲۴۵۷: مجمع الزوائد باب ماجاء فی الأیتام والارامل والمساکین حدیث: ۱۳۵۱۵، علامہ ہیثمیؒ نے فرمایا کہ اس حدیث کو امام احمد اور طبرانی نے روایت کیا ہے اور اس کی سند میں علی بن زید ہے، اس کی حدیث حسن ہے۔ شرح السنہ للبغوی، رقم الحدیث ۳ : ۷ ۴۵ باب ثواب کافل الیتیم، المکتب الاسلامی۔

کفیل ہو جائے اللہ اس کے لئے یقیناً جنت واجب فرما دیتے ہیں الا یہ کہ وہ کوئی کام ہی ایسا کر بیٹھے جس کی مغفرت نہیں ہوتی اور جس شخص کی بینائی جاتی رہے اور وہ اس پر صبر کرے اور اجر کا امیدوار ہو تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے ضرور جنت واجب فرما دیتے ہیں مگر یہ کہ وہ کام ہی ایسا کر گزرے جس کی اللہ کے ہاں معافی نہیں اور جس شخص کی تین بیٹیاں ہوں جن کی اس نے اچھی تربیت کی ان پر خرچ کرتا رہا حتیٰ کہ ان کا نکاح کر دیا یا فوت ہو گئیں اس کے لئے بھی اللہ تعالیٰ ضرور جنت واجب فرماتے ہیں مگر یہ کہ کوئی عمل ہی ایسا کر بیٹھے جو قابل معافی نہ ہو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک بدوی نے آ کر کہا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اگر کسی کی دو ہی بیٹیاں ہوں۔ ارشاد فرمایا دو ہوں تو بھی یہی اجر ہو گا عکرمہؒ کہتے ہیں کہ حضرت ابن عباسؓ یہ حدیث بیان کرتے تو فرمایا کرتے خدا کی قسم بہت ہی عجیب حدیث ہے۔(۱)

☆ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یتیموں کے سروں پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے اور پیار کرتے تھے اور خود حضرت عمرؓ کا بھی یہی معمول تھا۔

☆ ابو عمران جونیؒ ابو خلیلؒ سے نقل کرتے ہیں کہ میں نے حضرت داؤد علیہ السلام کے سوالات میں جو انہوں نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش کئے یہ بھی پڑھا کہ آپ نے پوچھا یا اللہ اس شخص کی جزا کیا ہے جو کسی یتیم بچے اور بیوہ عورت کا محض تیری رضا کے لئے سہارا بنتا ہے ارشاد فرمایا اس کی جزا یہ ہے کہ میں اسے اپنے سایہ میں اس وقت پناہ دوں گا جب کہ میرے عرش کے سایہ کے سوا کوئی سایہ نہ ہو گا۔(۲)

☆ وہ عورت جس کے چہرہ کا رنگ محنت اور کمائی میں بدل گیا ہو جنت میں ان دو انگلیوں کی طرح ہوں گے اور اپنی مبارک انگلیوں کو ملا کر اشارہ فرمایا: ”قال رسول اللہ

---

(۱) ترمذی حدیث: ۱۹۱۷ باب ماجاء فی رحمۃ الیتیم، امام ترمذیؒ نے فرمایا کہ اس میں ایک راوی ”حنش“ ہے اور وہ محدثین کے نزدیک ضعیف ہے۔ مسند ابی یعلی، اول مسند ابن عباس حدیث: ۲۴۵۷،

(۲) حلیۃ الاولیاء، حدیث: ۷۱۷۷، بعض روایات میں حضرت موسیٰ کے حوالے سے منقول ہے۔

صلی اللہ علیہ وسلم:أنا و امرأة سفعاء الخدين كهاتين يوم القيامة، وأومأ يزيد بالوسطى والسبابة"۔(١) یعنی ایسی عورت جس کا خاوند مرگیا اور اس نے اپنی یتیم بچیوں کی دیکھ بھال کی خاطر کہیں نکاح نہیں کیا اور خود محنت کر کے انہیں پروان چڑھایا اور نکاح کر دیا یا وہ فوت ہوگئیں۔

☆ایک روایت میں ہے کہ: ''میں سب سے پہلے جنت کا دروازہ کھولوں گا مگر میں ایک عورت دیکھوں گا جو مجھ سے بھی سبقت لے جائے گی تو میں اس سے پوچھوں گا: ''تمہارا کیا معاملہ ہے اور تم کون ہو؟'' تو وہ کہے گی: ''میں وہ عورت ہوں جو اپنے یتیم بچوں کو لئے بیٹھی رہی۔'' اور ان کی وجہ سے دوسرا نکاح نہ کیا۔(٢)

☆ رسول اکرم ﷺ نے یتیم کی کفالت کے ساتھ ساتھ یتیم سے حسن سلوک اور مخلصانہ اظہارِ محبت کی فضیلت اور برکتیں اس طرح ارشاد فرمائی ہیں: حضرت ابوامامہؓ رسول اکرم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے یہ ارشاد فرمایا کہ جو کوئی خلوص نیت کے ساتھ یتیم کے سر پر ہاتھ پھیرتا ہے تو سر کے ہر ایک بال کے بدلے دس دس نیکیاں ملتی ہیں۔"عن ابی امامة عن النبی ﷺ من مسح رأس يتيم لم يمسحه الا لله كان له بكل شعر مر عليها يده عشر حسنات"(٣)

ایک روایت میں ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: جو شخص رحمت اور شفقت کے ساتھ یتیم کے سر پر ہاتھ رکھے تو جس قدر بالوں پر سے اس کا ہاتھ گذرتا ہے، اس کے لئے اتنی نیکیاں لکھی جاتی ہیں۔"من وضع على رأس اليتيم ترحما كانت له بكل شعرة تمر بيده عليها حسنة"(٤)

---

(١) سنن أبی داود، رقم الحدیث ٥١٤٩:۔

(٢) مسند ابی یعلی الموصلی، مسند ابی هريرة، حدیث :٦٦٢١۔

(٣) مسند الامام أحمد بن حنبل، ٢٢١٥٣

(٤) کنز العمال الاکمال من الرحمة بالشیوخ، حدیث: ٦٠٣٦، مسند احمد بن حنبل، حدیث: ٢١٥٧٥۔

☆ جس مکان میں یتیم کی پرورش اور حسن سلوک وخلوص پیش کیا جا رہا ہے اس کی فضیلت حدیث پاک میں اس طرح فرمائی گئی ہے:

”عن ابی هریرہ رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قال خير بيت فى المسلمين بيت فيه يتيم يحسن اليه و شر بيت فى المسلمين بيت فيه يتيم يساء اليه“ (۱)

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا مسلمانوں میں سب سے اچھا گھر وہ ہے جس میں یتیم کو لا کر کفالت کے لئے رکھا گیا ہو اور یتیم سے حسن سلوک کیا جا رہا ہو اور مسلمانوں میں سب سے برا گھر وہ ہے جس میں یتیم کے ساتھ برائی اور ظلم کیا جا رہا ہے، اس کے مال اور زندگی کو نقصان پہونچایا جا رہا ہو۔

جن گھرانوں میں یتیم بچے پلتے ہیں وہ گھرانے بڑے ہی قابل احترام ہوتے ہیں، ان پر رزق اور خیر و برکت کے دروازے کھلتے چلے جاتے ہیں، کہنے کو تو یہ بڑا آسان لگتا ہے کہ جی ہم یتیم بچے یا بچی کو پال لیں گے، وہ خواتین بڑی عظیم ہوتی ہیں جو اپنے بچے کے ساتھ ساتھ کسی یتیم بچے کو بھی اپنا دودھ پلاتی ہیں، ذرا تصور کیجیے کہ دونوں بچے بھوکے ہیں، دونوں ہی رو رہے ہیں، ماں کے لیے بڑا مشکل ہوتا ہے کہ وہ کس بچے کو دودھ پلائے؟ اپنے بچے کو یا یتیم بچے کو پہلے دودھ پلائے، وہ دوڑتی ہے، بھاگتی ہے، کبھی اپنے بچے کو چپ کروا رہی ہے کبھی یتیم بچے کو خاموش کرنے کی کوشش کر رہی ہے، اسے معلوم نہیں کہ یہ جدو جہد، یہ کوشش، یہ تڑپنا، بھاگنا، بچے کو چپ کروانا، اسے دودھ پلانا اللہ کے ہاں اس کی نیکیوں اور درجات میں کتنے اضافے کا سبب بن رہا ہے۔

ایک دوسری روایت میں ہے:

---

(۱) ابن ماجہ حدیث: ۳۶۷۹ باب حق الیتیم علامہ بوصیریؒ فرماتے ہیں کہ یہ اس حدیث کی سند ضعیف ہے اس میں یحیی بن سلیمان ابوصالح ہیں جس کے بارے میں بخاریؒ نے کہا کہ وہ منکر الحدیث ہے اور ابو حاتم نے مضطرب الحدیث کہا ہے۔ (مصباح الزجاجۃ ج ۴ ص ۱۰۳، دار العربیہ بیروت)

’’حضور ﷺ کے پاس ایک آدمی آیا اور حضور ﷺ سے اپنے دل کی سختی کی شکایت کرنے لگا، آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تو چاہتا ہے کہ تیرا دل نرم ہو جائے اور تیری ضرورت پوری ہو جائے؟ تو یتیم پر رحم کر، اس کے سر پر ہاتھ پھیر اور اپنے غلے میں سے کھانا کھلا، تیرا دل نرم ہو جائے گا اور تیری ضرورت بھی پوری ہو جائے گی‘‘۔(۱)

سائل نے نبی ﷺ سے اپنی سخت دلی بیان کی اور آپ ﷺ نے اسے روحانی مرض قرار دے کر اس کا بہترین علاج تجویز فرمایا کہ یتیم کے سر پر شفقت کا ہاتھ پھیرو اور دوسرا یہ کہ بھوکے فقیر ومسکین کو کھانا کھلایا کرو، یہ ایسا علاج ہے کہ اس سے قساوت درمندی سے بدل جائے گی۔(۲)

ابو جہل کی زیر پرورش یتیم بچہ کو حق دلانا

ابو جہل ایک یتیم کا سرپرست تھا، وہ بچہ ایک دن اس کے پاس اس حالت میں آیا کہ اس کے بدن پر کپڑے تک نہ تھے اور اس نے التجا کی کہ اس کے باپ کے چھوڑے ہوئے مال میں سے کچھ دے دے؛ مگر اس ظالم نے اس کی طرف توجہ تک نہیں کی اور وہ مایوس ہو کر پلٹ گیا، قریش کے سرداروں نے از راہ شرارت اس سے کہا کہ محمد ﷺ کے پاس جا کر شکایت کرو، وہ ابو جہل سے سفارش کر کے تجھے تیرا مال دلوا دیں گے، بچہ بے چارہ ناواقف تھا کہ ابو جہل کا حضور ﷺ سے کیا تعلق ہے، اور یہ بد بخت کس غرض سے اسے مشورہ دے رہے ہیں، وہ سیدھا حضور ﷺ کے پاس پہنچا اور آپ ﷺ سے اپنا حال بیان کیا آپ ﷺ اسی وقت کھڑے ہوئے اور اسے ساتھ لے کر اپنے بدترین دشمن ابو جہل کے پاس تشریف لے گئے۔ آپ ﷺ کو دیکھ کر اس نے آپ کا استقبال کیا اور جب آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس بچے کا حق دے دو، تو فوراً مان گیا اور اس کا مال لا کر دے دیا۔ قریش کے

(۱) الترغیب والترھیب، رقم الحدیث: ۳۵۴۴، الترغیب فی بر الوالدین وصلتھما، مکتبۃ المعارف۔ الریاض

(۲) معارف الحدیث ۶/ ۳۱۵، مکتبہ دارالاشاعت کراچی

سردار کسی مزید ارجھڑپ کی اُمید کر رہے تھے ؛ مگر جب انہوں نے یہ معاملہ دیکھا تو حیران ہوکر ابوجہل کو طعنہ دیا کہ تم بھی اپنا دین چھوڑ گئے ہو اس نے کہا : اللہ کی قسم! میں نے اپنا دین نہیں چھوڑا ؛ مگر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ محمد ﷺ کے دائیں بائیں ایک، ایک نیزہ ہے، جو میرے اندر گھس جائے گا ؛ میں نے ذرا بھی ان کی مرضی کے خلاف حرکت کی ۔(۱)

حضراتِ صحابہ کرامؓ کا یتیموں کے ساتھ حسن سلوک

یتیموں اور ناداروں کے ساتھ حسن سلوک اور ان کی کفالت و پرورش کی اہمیت اور اس کا باعث اجر ہونا رسول اللہ نے کچھ اس طرح صحابہؓ کے ذہن میں بیٹھا دیا تھا کہ عہد نبوی میں اور اس کے بعد بھی غزوات اور جنگی مہمات کا تسلسل تھا، مسلمان مجاہدین کا سیل رواں مغرب اور مشرق کی طرف تیزی سے بڑھ رہا تھا، ظاہر ہے کہ اس میں بہت سی جانیں کام آتی تھیں ، بیوہ عورتوں اور یتیم بچوں اور بچیوں کی کثرت تھی ، ایک شخص شہید ہوتا تو وہ پورے خاندان کو بے سہارا چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہو جاتا، اس کا تقاضا تو یہ تھا کہ مدینہ میں کئی یتیم خانے قائم کرنے پڑتے اور ایسے بے سہارا بچوں اور عورتوں کی پرورش ایک بڑا مسئلہ بن جاتی ؛ لیکن عملا ایسا نہیں ہوا، یہ بے سہارا بچے، بچیاں اور خواتین مختلف خاندانوں کا حصہ بن گئیں، انہیں تنہائی اور بے سہارگی کا زخم نہیں سہنا پڑا ۔

آقائے مدنی ﷺ کی ان پاکیزہ تعلیمات کا اصحاب رسول کے قلوب پر ایسا اثر ہوا کہ ان کی فطرت بدل گئی، ہر صحابی کا گھر یتیم خانہ بن گیا تھا چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا یہ حال تھا کہ وہ کسی یتیم بچے کو ساتھ لئے بغیر کھانا کبھی نہیں کھاتے تھے، صحابہ کرامؓ نے صرف یہی نہیں کیا بلکہ یتیموں کو ان کا حصہ دینے اور ان کے مال و دولت کی نگرانی میں دیانت داری برتنے لگے انکی جائیداد کی حفاظت میں فیاضی اور ستر پوشی کا پورا ثبوت دیا۔

---

(۱) سیرت سرور عالم : ۱/ ۵۰۸۔

*حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ: اس دوران کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے یہاں بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک لڑکا آیا اور کہنے لگا: میرے ماں باپ آپ پر قربان اے اللہ کے رسول! ایک لڑکا یتیم ہے، اسکی بہن یتیمہ ہے، اور اس کی ماں بیوہ ہے، ہمیں آپ کھلائیے اللہ عزوجل آپ کو اپنے پاس سے کھلائے گا، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: لڑکے! تم نے کتنی اچھی بات کہی، چلو ہم اپنے اہل کے پاس جاتے ہیں اور جو کچھ انکے پاس ہے لے کر آتے ہیں، حضرت بلالؓ اکیس (۲۱) کھجور لے کر آئے، اس کو حضور ﷺ نے ہتھیلی میں رکھا، رسول اللہ ﷺ نے اپنی ہتھیلیوں کو اپنے منہ کے قریب کیا، ہم یہ سمجھے کہ آپ ﷺ اس میں برکت کی دعا کریں گے، پھر فرماتے ہیں کہ اے لڑکے! سات تو تیرے لئے ہیں، سات تیری ماں کے لئے ہیں، اور سات تیری بہن کے لئے، ایک کھجور سے شام کا کھانا کھانا، اور ایک سے صبح کا، پھر وہ لڑکا حضور ﷺ کے پاس سے واپس ہونے لگا، حضرت معاذؓ نے کھڑے ہو کر اس کے سر پر ہاتھ رکھا، پھر فرمایا: اللہ عزوجل تیری یتیمی کی تلافی کرے اور تیرے لئے تیرے باپ کا نائب بنادے، حضرت معاذ بن جبلؓ نے فرمایا اے اللہ کے رسول ﷺ! میں نے اس لڑکے پر بطورِ رحمت وشفقت کے یوں کیا ہے، تو اسوقت رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ کی قسم! جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے، جب کوئی مسلمان کسی مسلمان یتیم کا ولی بنتا ہے تو اس کے ہر بال کے بدلے ایک نیکی ملتی ہے اور اس پر اس کو ایک درجہ بلند کیا جاتا ہے اور اس کے ہر بال کے بدلے ایک گناہ مٹادیا جاتا ہے "وکفر عنہ بکل شعرۃ سیئۃ"(۱)

*حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

---

(۱) مجمع الزوائد حدیث: ۱۳۵۲۸ علامہ ہیثمیؒ فرماتے ہیں کہ اس کو بزار نے روایت کیا ہے اور اس کی سند میں فائد ابوالورقاء ہے جو کہ متروک ہے۔

"ماقعد یتیم مع قوم علی قصعتھم فیقرب قصعتھم شیطان"۔(۱)ان لوگوں کے ساتھ کوئی یتیم ان کے برتن میں کھانے کے لئے بیٹھے تو شیطان ان کے برتن کے قریب نہیں آتا۔

یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ان تعلیمات نے عرب کی فطرت بدل دی، وہی دل جو بے کس وناتواں یتیم کے لئے پتھر سے سخت تھے، وہ موم سے زیادہ نرم ہوگئے، ہر صحابی کا گھر یتیم خانہ بن گیا۔ ایک روایت میں ہے کہ حضرت عائشہؓ اپنے خاندان اور انصار وغیرہ کی یتیم لڑکیوں کو اپنے گھر لے جا کر دل وجان سے پالتی تھیں۔(۲)

* عمرۃ القضاء میں واپسی کے وقت حضرت حمزہؓ کی ایک چھوٹی صاجزادی جن کا نام "امامہ" تھا، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو چچا چچا کہتی ہوئی دوڑی آئیں، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ جنگ احد میں شہید ہو چکے تھے، ان کی یہ یتیم چھوٹی بچی مکہ میں رہ گئی تھیں، جس وقت یہ بچی آپ کو پکارتی ہوئی دوڑی ہوئی آئیں تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے شہید چچا جان کی اس یادگار کو دیکھ کر پیار آگیا، اس بچی نے آپ کو بھائی جان کہنے کی بجائے چچا جان اس رشتہ سے کہا کہ آپ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے رضاعی بھائی ہیں، کیونکہ آپ نے اور حضرت حمزہؓ نے حضرت ثوبیہ رضی اللہ عنہا کا دودھ پیا تھا، جب یہ صاجزادی قریب آئیں تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے آگے بڑھ کر ان کو اپنی گود میں اٹھا لیا، لیکن اب ان کی پرورش کے لئے تین دعویدار کھڑے ہو گئے، حضرت علیؓ نے یہ کہا کہ یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ میری چچازاد بہن ہے اور میں نے اس کو سب سے پہلے اپنی گود میں اٹھا لیا ہے اس لئے مجھ کو اس کی پرورش کا حق ملنا چاہیے، حضرت جعفرؓ نے یہ گزارش کی کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! یہ میری چچازاد بہن بھی ہے اور اس کی خالہ میری

(۱) المعجم الاوسط:من اسمه محمد حديث: ۷۱۶۵ علامہ ہیثمیؒ نے فرمایا کہ اس حدیث کو طبرانی نے روایت کیا ہے اس میں حسن بن واصل وہ سوء حافظہ کی وجہ سے ضعیف ہے اور یہ حدیث حسن ہے واللہ اعلم۔ مجمع الزوائد ۸/۱۶۰، مکتبہ القدسی قاہرہ

(۲) مسند احمد: ۶/۲۶۹۔

بیوی ہے اس لئے اس کی پرورش کا میں حقدار ہوں، حضرت زید بن حارثہؓ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ ﷺ! یہ میرے دینی بھائی حضرت حمزہؓ کی لڑکی ہے اس لئے میں اس پرورش کروں گا۔ تینوں صاحبوں کا بیان سن کر حضور ﷺ نے یہ فیصلہ فرمایا کہ "خالہ ماں کے برابر ہوتی ہے" لہٰذا یہ لڑکی حضرت جعفر کی پرورش میں رہے گی۔ پھر تینوں صاحبوں کی دلداری و دل جوئی کرتے ہوئے رحمت عالم ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا کہ "اے علی! تم مجھ سے ہو اور میں تم سے ہوں۔" اور حضرتؓ سے فرمایا کہ "اے جعفر تم سیرت وصورت میں مجھ سے مشابہت رکھتے ہو اور حضرت زید بن حارثہؓ سے یہ فرمایا کہ اے زید! تم میرے بھائی اور میرے مولیٰ (آزاد کردہ غلام) ہو(۱)

حضور ﷺ کا بشیر بن عقبہ کی پرورش کرنا

حضرت بشیر بن عقبہ جہنیؓ سے روایت ہے کہ فرماتے ہیں کہ: میں نے احد کے دن رسول اللہ ﷺ سے ملاقات کی، میں نے کہا: میرے باپ کا کیا ہوا؟ تو آپ نے فرمایا: وہ تو شہید ہو گئے، تو میں رو پڑا، تو آپ ﷺ نے مجھے پکڑا اور میرے سر پر ہاتھ پھیرنے لگے اور مجھے اپنے ساتھ لے گئے اور فرمایا، کیا تم یہ پسند نہیں کرتے کہ میں تمہارا باپ ہو جاؤں اور عائشہ تمہاری ماں، "أما ترضى أن أكون أنا أبوك وتكون عائشة أمك" (۲)

ایک یتیم بچے کا دردبھرا قصہ

ایک یتیم بچہ تھا، اس کے چچا نے اس کی پرورش کی تھی، جب وہ بچہ جوان ہوا تو چچا نے اونٹ، بکریاں غلام دے کر اس کی حیثیت مستحکم کر دی تھی، اس نے اسلام کے متعلق

(۱) صحیح بخاری، حدیث: ۱۶۱۰۔

(۲) شعب الایمان حدیث: ۱۱۰۴ مجمع الزوائد: ۱۳۵۱۷ علامہ ہیثمیؒ فرماتے ہیں کہ اس کو بزار نے روایت کیا ہے اور اس میں ایک جماعت ہے جس کو میں نہیں جانتا۔

کچھ سنا اور دل میں توحید کا شوق پیدا ہوا، لیکن چچا سے اس قدر ڈرتا تھا کہ اسلام کا اظہار نہ کرسکا، جب نبی کریم صلی اللہ علیہ والہ وسلم فتح مکہ سے واپس گئے تو اس نے چچا سے کہا، مجھے برسوں انتظار کرتے گزر گئے کہ کب آپ کے دل میں اسلام کی تحریک پیدا ہوتی ہے اور آپ کب مسلمان ہوتے ہیں؛ لیکن آپ کا حال وہی پہلے کا سا چلا آرہا ہے، میں اپنی عمر پر زیادہ اعتماد نہیں کرسکتا، مجھے اجازت دیجئے کہ میں مسلمان ہو جاؤں۔

چچا نے جواب دیا: دیکھ! اگر تو محمد (صلی اللہ علیہ والہ وسلم) کا دین قبول کرنا چاہتا ہے تو میں سب کچھ تجھ سے چھین لوں گا، تیرے بدن پر چادر اور تہبند تک باقی نہ رہنے دوں گا۔

اس نے جواب دیا: چچا جان! میں مسلمان ضرور ہوں گا اور محمد صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی اتباع قبول کروں گا، شرک اور بت پرستی سے بیزار ہو چکا ہوں، اب آپ کا جو منشاء ہے کریں اور جو کچھ میرے قبضہ میں مال وزر وغیرہ ہے سب کچھ سنبھال لیجئے.. میں جانتا ہوں کہ ان چیزوں کو آخر ایک روز یہیں دنیا میں چھوڑ جانا ہے، اس لیے میں ان کے لئے سچے دین کو چھوڑ نہیں سکتا۔

اس نے یہ کہہ کر ان کے دیے کپڑے بھی لوٹا دیے اور ایک پھٹی پرانی چادر اوڑھ لی، پھر اپنی ماں کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا: میں مومن اور موحد ہو گیا ہوں، نبی کریم صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی خدمت میں جانا چاہتا ہوں، ستر پوشی کے لئے کپڑے کی ضرورت ہے، مہربانی کر کے کچھ دے دیجیے۔

ماں نے ایک کمبل دے دیا، اس نے کمبل پھاڑا' آدھے کا تہبند بنالیا' آدھا اوپر کرلیا اور مدینہ کو روانہ ہو گیا، علی الصبح مسجد نبوی میں پہنچ گیا اور مسجد سے ٹیک لگا کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے انتظار میں بیٹھ گیا، نبی اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم جب مسجد میں آئے' اسے دیکھ کر پوچھا: کون ہو؟

کہا: میرا نام عبدالعزیٰ ہے، فقیر و مسافر ہوں.. طالب ہدایت ہو کر آپ کے در پر آپہنچا

ہوں، نبی اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے فرمایا: آج سے تمہارا نام عبداللہ ہے.. ذوالبجادین لقب ہے.. تم ہمارے قریب ہی ٹھہرو اور مسجد میں ہی رہا کرو۔

یوں عبداللہ اصحاب صفہ میں شامل ہو گئے.. نبی اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم سے قرآن پاک سیکھتے اور دن بھر عجب ذوق وشوق اور خوش ونشاط سے پڑھا کرتے..

ایک دفعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ لوگ تو نفل نماز پڑھ رہے ہیں اور یہ اعرابی اس قدر بلند آواز سے ذکر کر رہا ہے کہ دوسروں کی قرآت میں مزاحمت ہوتی ہے.. نبی اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے فرمایا.. عمر! اسے کچھ نہ کہو.. یہ تو اللہ اور اس کے رسول کے لئے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر آیا ہے۔

عبداللہ کے سامنے غزوہ تبوک کی تیاری ہونے لگی تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے انہیں دعا دیتے ہوئے فرمایا.. الٰہی! میں کفار پر اس کا خون حرام کرتا ہوں۔

عبداللہ نے کہا.. یارسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم! میں تو شہادت کا طالب ہوں۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے فرمایا.. جب اللہ کے راستے میں نکلو اور پھر بخار آئے اور مر جاؤ تب بھی تم شہید ہی ہو گے، تبوک پہنچ کر یہی ہوا کہ بخار چڑھا اور انتقال کر گئے۔

بلال بن حارث مزنی رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں نے عبداللہ کے دفن کی کیفیت دیکھی ہے.. رات کا وقت تھا.. پہلے وہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں اترے اور حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما ان کی لاش لحد میں رکھ رہے تھے.. نبی اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم بھی ان کی قبر میں اترے اور حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما سے فرما رہے تھے" اپنے بھائی کو میرے قریب کرو۔

اللہ کے رسول ﷺ! یہ کون خوش قسمت ہے جو آپ کے مبارک ہاتھوں سے لحد میں اُتارا جا رہا ہے؟۔

ارشاد ہوا : یہ تمہارا بھائی عبداللہ ذوالبجادین ہے جو شام کو وفات پا گیا۔اللہ کے رسول

ﷺ نے عبداللہؓ کے گالوں کے نیچے اپنے مقدس اور مبارک ہاتھ رکھے ہوئے تھے۔رات کے اندھیرے میں آپ کے آنسو عبداللہ کے رخساروں پر یوں ٹپک رہے تھے جیسے موتیوں کی لڑیاں گرتی ہیں۔

عبداللہؓ کو قبر میں اُتارا،قبلہ رخ کیا اور بارگاہ الٰہی میں ہاتھ پھیلا دیے االلہ رب العزت سے عرض کیا:

''اے اللہ! آج شام تک (یعنی اس کی وفات تک) میں اس سے راضی تھا تو بھی اس سے راضی ہو جا'' یہ الفاظ آپ ﷺ بار بار دہرا رہے تھے۔واہ رہے مقدر کے سکندر! امام انسانیت لحد میں اتار رہے ہیں۔ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کھڑے ہیں اور اللہ کے رسول ﷺ اس کے لئے بار بار دعائے مغفرت فرما رہے ہیں،عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ہچکیاں لے کر رونے لگے بے اختیار بولے:

''کاش اس قبر میں دفن ہونے کی سعادت مجھے نصیب ہوتی''۔

نبی کریم ﷺ پوری زندگی میں صرف پانچ مرتبہ قبر میں اترے ہیں۔ان میں سے ایک موقع عبداللہ ذوالبجادین رضی اللہ عنہ کو نصیب ہوا۔(۱)

بیوہ اور یتیم کی کفالت کرنے کا صلہ

سعودی عرب کے رہائشی ایک شخص نے خواب دیکھا کہ ایک شخص اس سے کہہ رہا تھا اس فون نمبر پر رابطہ کرو اور فلاں شخص کو عمرہ کراؤ،فون نمبر بڑا واضح تھا،نیند سے بیدار ہوا تو اسے خواب اچھی طرح یاد تھا مگر اس نے وہم جانا اور خواب کو نظر انداز کر دیا،تین دن مسلسل ایک ہی خواب نظر آنے کے بعد وہ شخص محلے کی مسجد کے امام کے پاس گیا اور اسے بتایا: امام مسجد نے کہا فون نمبر یاد ہے تو پھر اس شخص سے رابطہ کرو اور اسے عمرہ کروا دو،اگلے

(۱) السیرۃ النبویۃ لابن ہشام: ۱۸۱/۴، والبدایۃ والنہایۃ: ۲۱/۵، صفۃ الصفوۃ: ۶۷۷/۱، مدارج النبوۃ: ۹۰/۲۔

روز اس شخص نے خواب میں بتلایا ہوا نمبر ڈائل کیا، جس شخص نے فون اٹھایا اس سے ضروری تعارف کے بعد اس نے کہا : مجھے خواب میں کہا گیا ہے کہ میں تمہیں عمرہ کرواؤں، لہذا میں اس نیک کام کی تکمیل کرنا چاہتا ہوں، جس آدمی کو اس نے فون کیا وہ زور سے ہنسا اور کہنے لگا کونسے عمرہ کی بات کرتے ہو؟ میں نے تو مدت ہوئی کبھی فرض نماز بھی ادا نہیں کی اور تم کہتے ہو کہ تم مجھے عمرہ کروانا چاہتے ہو.....!! بالآخر رضامندی کے بعد جب وہ ایک دوسرے سے ملاقات ہوئی تو دیکھا کہ یہ شخص بظاہر شرابی و بے دین نظر آرہا تھا، عمرہ سے فارغ ہونے کے بعد

واپسی کی تیاری شروع کردی، حرم سے نکلنے لگے تو وہ شخص کہنے لگا : دوست حرم چھوڑنے سے پہلے میں دو رکعت نفل ادا کرنا چاہتا ہوں، نجانے دوبارہ عمرہ کی توفیق ہوتی بھی ہے یا نہیں؟ اس نے کہا : شوق سے پڑھلو' جب سجدہ میں گیا تو اس کا سجدہ طویل سے طویل تر ہوتا چلا گیا، جب کافی دیر گزر گئی تو اس شخص نے اسے ہلایا تو پتہ چلا کہ اس کے ساتھی کی روح حالتِ سجدہ ہی میں پرواز کرچکی تھی، اپنے ساتھی کی موت پر اسے بڑا رشک آیا اور وہ رو پڑا کہ یہ تو حسنِ خاتمہ ہے، کاش! ایسی موت میرے نصیب میں ہوتی، ایسی موت تو ہر کسی کو نصیب ہو، حرم میں ہی اس کی نماز جنازہ ہزاروں فرزندان اسلام نے پڑھا، اس دوران اس کی وفات کی اطلاع ریاض اسکے گھر والوں کو دی جاچکی تھی، خواب دیکھنے والے شخص نے اپنے وعدہ کے مطابق اس کی میت کو ریاض پہنچا دیا، جہاں اسے دفن کردیا گیا، چند دنوں کے بعد خواب دیکھنے والے شخص نے اس فوت ہونے والے کی بیوہ کو فون پر تعزیت کے بعد کہا: میں جاننا چاہتا ہوں کہ تمہارے شوہر کی ایسی کونسی نیکی یا عادت تھی کہ اسے حرمِ کعبہ میں سجدہ کی حالت میں موت آئی؟

بیوہ نے کہا : اسکی کوئی خاص خوبی بیان تو نہیں کرسکتی .... ہاں! مگر اس کی ایک عادت یہ تھی کہ وہ ہمارے ہمسایہ میں ایک غریب بیوہ اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کیساتھ رہتی

ہے، میرا شوہر بازار جاتا تو جہاں اپنے بچوں کے لئے کھانے پینے کی چیزیں لاتا وہ اس بیوہ اوراس کے یتیم بچوں کیلئے بھی لے آتا، اوراس کے دروازے پر رکھ کر اسے آواز دیتا کہ میں نے کھانا باہر رکھ دیا ہے، اسے اٹھالو، یہ بیوہ عورت کھانا اٹھاتی اور ساتھ میرے خاوند کے لئے دعا کرتی :اللہ تمہارا خاتمہ بالخیر کرے"۔(۱)

یتیم بچوں کی کفالت کرنے والا سعودی شہری

ریاض :مال و دولت خدا کی نعمت ہوتی ہے، کچھ لوگ اسے اپنی ذات پر خرچ کرتے ہیں لیکن کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنے مال ومتاع لوگوں کی خدمت میں لٹادیتے ہیں۔

عرب میڈیا کے مطابق سعودی شہری علی سترہ سال کی عمر سے یتیموں کی مدد کے لیے اس کار خیر میں کوشاں ہیں، اور اب تک درجنوں پسماندہ ممالک کا دورہ کرتے ہوئے ہزاروں یتیموں کی مدد کر چکے ہیں، دنیا بھر میں اکیس یتیم خانوں میں سات ہزار یتیم اور دو ہزار حاجت مند خاندانوں کی مدد کر رہے ہیں، علی کا کہنا ہے کہ: کبھی کبھی مجھ پر ایسا وقت بھی آتا کہ یتیم خانوں کو چلانے کے لیے قرض کی نوبت بھی آجاتی ہے لیکن میں حوصلہ کبھی نہیں ہارتا، مجھے اس قابل بنانے میں میری بیوی کا اہم کردار ہے۔(۲)

یوم خوشی کا پس منظر یتیم ہے

بین الاقوامی یوم خوشی یا یوم سعادت، اقوام متحدہ کی جانب سے مقرر کردہ ایک عالمی دن ہے جس میں خوشی کے اہمیت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔اس دن کے ذریعہ دنیا بھر میں لوگوں کو یہ پیغام دینے کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ زندگی میں خود بھی خوش رہیں اور آس پاس کے لوگوں اور احباب کے چہروں پر بھی مسکراہٹیں لانے کی کوشش

---

(۱) اسلام آباد، قدرت روزنامہ 19 جون 2017ء

(۲) ویب ڈیسک ویب ڈیسک 17 جولائی 2018ء

کریں، اس دن کا اعلان بین الاقوامی سطح پر 28 مئی 2012ء کو اقوام متحدہ کی جانب سے اس وقت کیا گیا جب تمام 193 اراکین ممالک نے اقوام متحدہ قرارداد 66 / 281 کی تائید کی۔

اصل میں اس دن کو منانے کا مشورہ جیمی الین نامی شخص نے دیا تھا، جیمی الین ایک یتیم بچہ تھا جو بھارتی شہر کولکاتہ کے سڑک سے مدر ٹریسا (Mother tereasa) نے اسے ریسکیو (rescue) کیا تھا اور بعد جیمی کی پرورش ایک امریکی خاتون اینا بیلی الین نے کی، جیمی گود لینے کے بعد اینا بیلی نے ایک غیر منافع بخش تنظیم ایلن اڈوپشن انٹرنیشنل کی بنیاد رکھی جس کا کام یتیم بچوں کی کفالت کرنا ہے۔

نادار کی کفالت کی ترتیب

یتیم ونادار بچوں کی دو حیثیتیں ہوسکتی ہیں: (۱) ان کے پاس مال ہو (۲) ان کے پاس مال تو نہ ہو لیکن ان کے عصبات، قریبی رشتہ دار یا ذوی الارحام میں سے کوئی موجود ہو، پہلی صورت میں یعنی اگر ان کے پاس مال ہے، تو ان کی پرورش وکفالت ان کے مال ہی سے کی جائے گی؛ خواہ ان کا کفیل کوئی قریبی رشتہ دار یا ذوی الارحام یا کوئی غیر ہو، اس کے لیے ضروری ہے کہ پوری احتیاط کے ساتھ ان کا مال ان پر خرچ کرے اور ان کی تربیت وغیرہ کا بھی خاص خیال رکھے، قرآن کریم نے تاکید کی ہے کہ ان کا مال پوری ایمانداری کے ساتھ انھیں پر خرچ کرو، اپنی ذات میں ہرگز ان کا مال استعمال نہ کرو۔ ”وَلاتَاکُلُوا اَموالَھُم الٰی اَموالِکم اِنہ کانَ حُوباً کَبیراً (۱) اور جب بالغ ہو کر سوجھ بوجھ والے ہوجائیں، نفع ونقصان کی تمیز ان کے اندر آجائے تو ان کا مال ان کے حوالہ کردو۔ ”فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِنهُم رُشْداً فَادْفَعُوْا اِلَیْھِمْ اَمْوَالَھُمْ“ (۲)

---

(۱) (سورہ نسا آیت ۲)

(۲) (سورہ نسا آیت ٦)

دوسری صورت جب کہ ان کے پاس مال نہیں ہے؛ لیکن ان کے عصبات یا ذوی الارحام موجود ہیں، تو پھر ان کی پرورش و پرداخت کے ذمہ دار یہی حضرات ہوں گے؛ البتہ ان میں یہ ترتیب ہوگی کہ عصبات میں زیادہ حقدار وہ ہوں گے جو رشتہ میں زیادہ قریب ہوں گے اور اگر عصبات موجود نہ ہوں تو ذوی الارحام ان کی کفالت کریں گے اور ان میں بھی قریبی رشتہ داری کو ترجیح دی جائے گی۔ ”واذلم یکن للحاضن احد ممن ذکر انتقلت الحضانة لذوی الارحام فی احد الوجھین وھو الاولیٰ، لان لھم رحماً وقرابةً یرثون بھا عند عدم من ھو اولیٰ، فیقدم ابو أم، ثم امھاتہ، ثم اخ من أم، ثم خال“(۱) ہاں اگر عصبات اور ذوی الارحام میں سے کوئی موجود نہ ہوتو پھر حاکم وقت ان کو کسی مسلمان کے سپرد کردے گا؛ تاکہ وہ اس کی پرورش کرے، اور اس کا خرچ بیت المال برداشت کرے گا۔ ”ثم حاکم یسلمه الی من یحضنه من المسلمین۔(۲) البحر الرائق میں ہے کہ اگر والدین فقیر ہوں تو باپ لوگوں سے بھیک مانگ کر اپنے چھوٹے بچوں پر خرچ کرے گا، اور ایک قول یہ ہے کہ باپ کو بھیک مانگنے کی ضرورت نہیں؛ بلکہ ان بچوں کا نفقہ بیت المال کے ذمہ ہے۔ ”ان کان فقیرین فعند الخصاف ان الاب یتکفف الناس وینفق علی اولادہ الصغار، وقیل نفقتھم فی بیت المال۔(۳)

معلوم ہوا کہ مذکورہ ترتیب کے اعتبار سے اگر ان لاوارثوں کی کفالت کے ذرائع موجود نہ ہوں تو ان کی کفالت بیت المال کے ذمہ ہے؛ لیکن ہندوستان جیسے ممالک میں بیت المال کی سہولیات نہ ہونے کی وجہ سے ان کی کفالت کا مسئلہ قابل غور رہے۔

---

(۱) (الموسوعة الفقھیہ ج ۱۷/ص ۳۰۵)

(۲) (الموسوعة ج ۱۷/ص ۳۰۵)

(۳) (البحر الرائق ج ۴ ص ۲۰۱)

بیت المال نہ ہوتو؟

بیت المال کے بجائے شرعی تنظیمیں الحمدللہ ہندوستان کے طول وعرض میں کسی نہ کسی شکل میں امت کے مسائل پر نظر رکھ رہی ہیں اور مسلمان اس امارت کے تابع ہوکر احکام شریعت پر عمل کرتے ہیں۔لہٰذا اس صورت میں شرعی امارتوں کی یہ ذمہ داری ہوگی کہ ان یتیم بچوں کی کفالت کا انتظام کرے،خواہ اس کے لیے جو بھی مناسب شکل اختیار کرنی پڑے۔مثال کے طور پر ان بچوں کو اپنی تنظیم کے تحت چل رہے کسی ہوسٹل و یتیم خانہ میں رکھ کر ان پر امت مسلمہ کی طرف سے آئی ہوئی مدات خرچ کرے،یا پھر جہاں وہ بچے ہیں وہیں کے کسی فرد مسلم کو متعین کردے کہ وہ ان کی دیکھ ریکھ اور پرورش کرے اور ان بچوں پر خرچ کرنے کے لیے ہفتہ،مہینہ یا سال کے اعتبار سے رقم اس شخص کو ادا کرے،غرض بیت المال نہ ہونے کی بنا پر شرعی تنظیمیں ان کا انتظام کریں گی۔

اور اگر شرعی تنظیمیں بھی نہ ہوں یا ان کی طرف سے اس طرح کا انتظام نہ ہوسکتا ہو،تو بھی ایسے بچوں کی کفالت خود اسی علاقہ کے مسلمانوں کے ذمہ ہوگی جہاں اس قسم کے یتیم و نادار بچے ہیں، اللہ پاک نے فرمایا ”من ذاالذی یقرض اللہ قرضا حسناً فیضاعفه له اضعافا کثیراً“ (الآیة) کون ہے جو اللہ پاک کو بہترین قرض دے تاکہ اللہ اس کے لیے اسے اور بھی زیادہ بڑھادے۔”یتیماً ذامقربة (الآیه) ای قرابة کما ان الصدقة علی الیتیم الذی لا کافل له افضل من الصدقة علی الیتیم الذی یجد من یکفله(۱)۔

سات بڑے گناہ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے

(۱) الجامع لاحکام القرآن للقرطبی ج۲۰/ ۶۹، ماہنامہ دارالعلوم ،شمارہ 10، جلد 99 :، ذی الحجہ 1436 ہجری مطابق اکتوبر 2015ء

فرمایا؛ سات ہلاک کرنے والی چیزوں سے بچو، صحابہ ؓ نے پوچھا' اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! وہ کون سی ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا' اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کرنا' جادو کرنا' ناحق کسی جان کو قتل کرنا جس کو اللہ نے حرام کیا ہے' سود کھانا' یتیم کا مال کھانا' کافروں سے لڑائی کے وقت پیٹھ پھیر کر بھاگ جانا اور بھولی بھالی' پاک دامن ایماندار عورتوں پر تہمت لگانا۔ "عن أبي هريرة رضي الله عنه، عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: اجتنبوا السبع الموبقات، قالوا: يا رسول الله وما هن؟ قال: الشرك بالله، والسحر، وقتل النفس التي حرم الله إلا بالحق، وأكل الربا، وأكل مال اليتيم، والتولي يوم الزحف، وقذف المحصنات المؤمنات الغافلات" (۱)

یتیم کو مارنا

☆ حدیث شریف میں ہے کہ ایک آدمی نے آنحضرت ﷺ سے سوال کیا کہ میرے پاس ایک یتیم رہتا ہے کیا میں اسے کسی بات پر مار پیٹ کیا کروں؟ ارشاد فرمایا جس قسم کی باتوں پر اپنے بیٹے کو پیٹتا ہے اسے بھی پیٹ لیا کر یعنی تربیت کے لئے مارنے میں کوئی حرج نہیں مگر مار شدید نہ ہو جیسا کہ عموماً اپنی اولاد کی تربیت میں ایسا ہوتا ہے حضرت فضیل بن عیاض ؒ فرماتے ہیں کہ بعض دفعہ تھپڑ مارنا یتیم کو حلوہ کھلانے سے زیادہ مفید ہے۔

☆ حضرت عمر ؓ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب کوئی یتیم کو مارتا ہے تو اس کے رونے سے رحمٰن کا عرش ہلنے لگتا ہے اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں میرے فرشتوں اس بچے کو کس نے رلایا ہے جس کے باپ کو میں نے تہہ زمین میں چھپادیا ہے خود جانتے ہوئے بھی جب یہ سوال ہوتا ہے اور فرشتے عرض کرتے ہیں یا اللہ ہمیں کچھ علم نہیں تو فرماتے ہیں کہ میں تمہیں گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ میری رضا کے لئے اس یتیم بچے کو جو شخص خوش کرے گا

(۱) بخاری شریف: رقم الحدیث، ۲۷۶۶

میں اسے قیامت کے دن اپنی طرف سے خوش کروں گا۔

☆ حضرت فقیہ ابواللیثؒ فرماتے ہیں کہ اگر پٹائی کئے بغیر تعلیم و ادب سکھایا جاسکتا ہے تو پھر یہی مناسب ہے کہ کسی قسم کی سرزنش نہ کرے یتیم کو بلا وجہ مارنا عتاب الٰہی کا سبب ہے۔

☆ مصنف عبدالرزاق کی روایت: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے یتیم کی تربیت کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا میں تو اس وقت تک مارتی رہونگی جب تک کہ وہ سمجھدار ہوجائے۔ ”وذكر عبدالرزاق في المصنف أن عائشة سئلت عن أدب اليتيم؟ فقالت :إني لأضرب أحدهم حتى ينبسط“(۱)

☆ امام احمد رحمہ اللہ سے پوچھا گیا کہ بچے کو کس بات پر مارا جاسکتا ہے؟ تو فرمایا کہ ادب پر مارا جاسکتا ہے اور فرمایا کہ یتیم کو ادب پر مارا جاسکتا ہے اور فرمایا چھوٹے بچے کو ہلکی مار ماری جاسکتی ہے اور یہ بھی پوچھا گیا کہ استاد اپنے شاگردوں کو کتنا مار سکتا ہے؟ تو فرمایا کہ غلطی کے بقدر مارا جاسکتا ہے، البتہ کوشش کریں کہ مار سے بچا جائے اور اگر اتنا چھوٹا بچہ ہے جو کہ ناسمجھ ہے تو اسکو نہ مارا جائے۔ ”وسئل الإمام أحمد عما يجوز فيه ضرب الولد؟ قال :يضرب على الأدب، وقال أيضاً :اليتيم يؤدب، والصغير يضرب ضرباً خفيفاً وسئل عن ضرب المعلم الصبيان؟ فقال :على قدر ذنوبهم، ويتوقى بجهده الضرب، وإن كان صغيراً لا يعقل فلا يضربه“(۲)

☆ ابن جوزی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ جب بچے کو تربیت کیلئے مار کی ضرورت ہو تو مارا جائے لیکن ایسی مار جس سے نشان نہ پڑے۔ ”وذكر ابن الجوزي أن الولد إذا احتيج إلى الضرب ضرب ضرباً غير مبرح، ويحمل على أحسن الأخلاق ويجنب

---

(۱) الادب المفرد، باب أدب اليتيم، حديث: ۱۴۲

(۲) الموسوعة الفقهية: ۴۵/ ۱۷۰۔

سیئھا“

خلاصہ یہ کہ تربیت کیلئے بچے کو مارنا جائز ہے لیکن اس مار میں اعتدال ہونا چاہئے لکڑی، چمڑے کے بیلٹ یا ہنٹر وغیرہ سے اجتناب کیا جائے اور جس قدر ممکن ہو پیار محبت سے سمجھایا جائے، لیکن اگر اصلاح یا تنبیہ کیلئے مجبوراً مارنے کی ضرورت ہو تو اعتدال کا راستہ اختیار کیا جائے۔

یتیم اگر وراثت سے محروم ہو جائے تو ان کو کچھ دے دینا چاہئے

یتیموں کی ہمدردی وخیر خواہی پر جتنا زور اسلام نے دیا ہے شاید ہی کسی دوسرے دین ومذہب نے اتنا زور دیا ہے، شریعت کے احکام وراثت میں سے ایک حکم یہ ہے کہ چچا کی موجودگی میں پوتے محروم ہو جاتے ہیں، یہ اس وجہ سے کہ قرآن وسنت نے یتیموں کی کفالت کا مستقل انتظام کیا ہے، چچا کے ذمہ ہے کہ اپنے بھتیجے کی کفالت کرے، اگر چچا کو محروم کر کے یتیم کو دیا جاتا تو ممکن ہے چچا کی طرف سے مال کی خاطر ظلم ہو یا یتیم اپنے مال کی حفاظت نہ کر پائے، مزید برآں من جانب شرع وراثت میں جو محروم ہیں شریعت میں اس کا بدل بھی موجود ہے، ایک تو یہ کہ اگر مرنے والے کو یہ معلوم ہے کہ بعض رشتہ داروں کو ملے گا اور بعض کو کچھ نہ ملے گا، اور وہ چاہتا ہے کہ ان کو بھی کچھ مل جائے، ایسی صورت میں اسلام نے یہ تعلیم دی ہے کہ وہ ایسے رشتہ داروں کے لئے مرنے سے پہلے کچھ ہبہ کر دے، یا ایک تہائی مال کی حد تک وصیت کر دے، دوسرے یہ بھی کہ خود رشتہ داروں کا اخلاقی فریضہ بنتا ہے کہ ان یتیموں اور مسکینوں کو بھی کچھ دیدے؛ تاکہ ان کی دل شکنی نہ ہو۔

اسی بات کو قرآن نے اپنے الفاظ میں یوں بیان فرمایا: ”اور جب تقسیم کے وقت قرابت دار، یتیم اور مسکین آجائیں تو تم اس میں سے تھوڑا بہت انہیں بھی دیدو اور ان سے نرمی سے بولو“۔ اذا حضر القسمة اولو القربی والیتامی والمساکین

فارزقوھم وقولوا لہ قولا معروفا۔ (۱)

یتیم کا مال غنیمت اور مال میں حصہ

یتیم کہ جہاں دیگر بہت سارے حقوق ہیں، ان میں سے ایک حق مالِ غنیمت اور مالِ فیئ میں ان کا حصہ ہے؛ تاکہ وہ اپنے والد وسرپرست کی کمی اس مال سے پوری کرسکے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ''جان لو کہ تم جس قسم کے جو کچھ غنیمت حاصل کرو اس میں سے پانچواں حصہ اللہ کا ہے اور رسول کا، قرابت داروں کا، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کا ہے''۔ وَاعۡلَمُوا أَنَّمَا غَنِمۡتُم مِّن شَيۡءٍ فَأَنَّ لِلَّهِ خُمُسَهُ وَلِلرَّسُولِ وَلِذِي الۡقُرۡبَىٰ وَالۡيَتَامَىٰ وَالۡمَسَاكِينِ وَابۡنِ السَّبِيلِ (۲)

یتیم کے مال کو ناحق کھانے پر وعیدیں

یتیمی کی زندگی باپ کے سہارے کے بغیر ادھوری اور مشکلات کا مجموعہ بن جاتی ہے یتیم کا دل کمزور اور حوصلے پست ہوجاتے ہیں اسلئے خالق اکبر نے یتیم کے جان ومال کا خصوصی تحفظ فراہم کیا ہے ارشاد قرآنی ہے: ''لاتقربوا مال الیتیم الا بالتی ھی احسن'' الخ (۳) مقصد قرآنی یہ ہے کہ یتیم کے مال کو بے سہارا سمجھ کر غصب اور قبضہ نہ کیا جائے بلکہ مالِ یتیم کا تحفظ اور دیکھ بھال میں مدد کی جائے اور کسی طرح بھی بدنیتی کے ساتھ مالِ یتیم سے قربت نفس اور نظر حرص نہ رکھی جائے، مزید قرآن کریم نے یتیم کے مال میں ناانصافی کرنے والوں کے بارے میں فرمایا: ''ان الذین یأکلون اموال الیتٰمی ظلما انما

---

(۱) النساء: ۸ ترجمہ حکیم الامت

(۲) الانفال: ۴۱، ترجمہ حکیم الامت

(۳) سورۃ انعام آیت: ۱۵۲

یأکلون في بطونهم ناراً وسیصلون سعیراً" (۱) مقصد ارشاد قرآنی یہ ہے کہ بلاشبہ وہ لوگ جو ظلماً یتیم لڑکے اور یتیم لڑکی کا مال کھاتے ہیں بلاشبہ وہ لوگ اپنے پیٹ میں آگ استعمال کر رہے ہیں اور وہ لوگ ضرور جہنم میں داخل ہوں گے، اس ارشاد ربانی کے ذریعہ مالِ یتیم کے ناجائز استعمال پر قطعی پابندی لگادی گئی ہے اس طرح اس بے سہارا اور کمزور طبقے کے جان و مال کا تحفظ قرآن حکیم نے فراہم کر دیا ہے۔ (۲)

اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کی طرف وحی کی کہ اے داؤدؑ! یتیم کے لئے مہربان باپ کی طرح اور مفلس بیوہ کے لئے مہربان شوہر کی طرح ہوجا اور جان لے کہ جیسا بوئے گا ویسا ہی کاٹے گا یعنی تو جیسا کرے گا ویسا ہی تجھ سے کیا جائے گا کیونکہ آخر ایک دن مرنا ہے، تیری اولاد کو یتیم اور بیوی کو بیوہ ہونا ہے۔

صحیح مسلم میں مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا اے ابوذر! میں تجھے کمزور سمجھتا ہوں اور میں تیرے لئے وہی کچھ پسند کرتا ہوں جو اپنے لئے پسند کرتا ہوں، کبھی دو پر حکمران نہ بن اور مالِ یتیم کو اچھا نہ سمجھ۔ (۳)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ادعاء کرتے تھے کہ "بارالٰہا! میں دو کمزور لوگوں یعنی یتیموں اور عورتوں کی حق تلفی سے محفوظ رہوں: "اللهم إني أحرج حق الضعيفين، اليتيم والمرأة" (۴) حاکم نے بسند صحیح روایت کی ہے حضور ﷺ نے فرمایا کہ چار شخص ایسے ہیں کہ یہ اللہ کا عدل ہوگا انہیں جنت میں نہ داخل کرے اور نہ ہی انہیں جنت کی نعمتوں سے لطف اندوز ہونے دے، شرابی، سود خور، ناحق یتیموں کا مال کھانے والا اور

---

(۱) النساء آیت: ۱۰

(۲) قرآن اور پسماندہ طبقات کے حقوق ص ۴۵۔۴۶

(۳) صحیح مسلم، حدیث: ۱۲۰۳۔

(۴) سلسلۃ الأحادیث الصحیحۃ، حدیث نمبر: ۳۶۷۸۔

والدین کانافرمان۔(۱)

یتیم کامال ناحق کھانے والے کاعذاب

ابویعلیٰ کی روایت ہے کہ قیامت کے دن قبروں سے ایک ایسی قوم اٹھائی جائیگی جن کے منہ سے آگ بھڑک رہی ہوگی عرض کیا گیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وہ کون ہیں؟ آپ نے فرمایا کیا تم نے یہ فرمانِ الٰہی نہیں دیکھا:

بے شک جولوگ ظلم کے طور پر یتیموں کامال کھاتے ہیں سوائے اسکے نہیں کہ وہ اپنے پیٹ میں آگ کھاتے ہیں۔ ''إِنَّ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ أَمْوَالَ الْيَتَامَىٰ ظُلْمًا إِنَّمَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ نَارًا وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيرًا''(۲)

صحیح مسلم کی روایت میں ہے کہ: معراج میں اچانک ایسے آدمیوں کے پاس آیا جن پر کچھ لوگ مقرر تھے جو ان کی ڈاڑھیاں نوچ رہے تھے اور کچھ لوگ جہنم کے پتھر لاکر ان کے منہ میں ڈال رہے تھے جو ان کے پیچھے سے نکل رہے تھے میں نے کہا اے جبرئیل! یہ کون لوگ ہیں؟ جبرئیلؑ نے کہا جولوگ ناحق یتیموں کامال کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹ میں آگ کھارہے ہیں پس اس کے سوااور کچھ نہیں (یہ وہی لوگ ہیں)

تفسیر قرطبی میں ہے حضرت ابوسعید الخدریؓ سے مروی ہے انہوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کی ہے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: معراج کی رات میں پھر میں ایسے لوگوں کے پاس سے گزرا جن پر کچھ لوگ مقرر تھے جو ان کے جبڑوں کو چیرتے اور دوسرے آگ کے پتھر لے کر آتے اور ان کے مونہوں میں ڈال دیتے جو ان کی پیٹھوں سے جانکلتے۔'' میں

---

(۱)مستدرک حاکم حدیث: ۲۲۶۰ امام حاکمؒ نے فرمایا کہ اس حدیث کی سند صحیح ہے۔

(۲)مسند ابی یعلی، حدیث ابی برزہ اسلمی رقم الحدیث ۷۴۴۰، علامہ ہیثمیؒ فرماتے ہیں کہ اس کو ابویعلی اور طبرانی نے روایت کیا ہے اور اس میں زیاد بن المنذر ہے اور وہ کذاب ہے۔ (مجمع الزوائد ۷/۲ مکتبہ القدسی، قاہرہ)

نے دریافت کیا: ''اے جبرئیل! یہ کون لوگ ہیں؟'' تو انہوں نے کہا: ''یہ وہ لوگ ہیں جو یتیموں کا مال ناحق کھاتے ہیں وہ تو اپنے پیٹ میں نری آگ بھرتے ہیں۔''(۱)

حضرت ابوسعید خدری ؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''میں نے معراج کی رات ایسی قوم دیکھی جن کے ہونٹ اونٹوں کے ہونٹوں کی طرح تھے اور ان پر ایسے لوگ مقرر تھے جو ان کے ہونٹوں کو پکڑتے پھر ان کے مونہوں میں آگ کے پتھر ڈالتے جو ان کے پیچھے سے نکل جاتے۔'' میں نے پوچھا: ''اے جبرائیل! یہ کون لوگ ہیں؟'' تو انہوں نے بتایا: ''یہ وہ لوگ ہیں جو یتیموں کا مال ظلم سے کھاتے تھے۔''(۲)

یہ بات خوش آئند ہے کہ آج کل ایک طرف مسلمانوں میں خاصی بیداری آچکی ہے، یتیموں کی کفالت کی بہت ساری تنظیمیں بن چکی ہیں جو یتیموں کو گھروالا و ماحول مہیا کرتے ہیں، دنیا کے کسی ملک یا شہر میں چلے جائیں، آپ کو ایسے ادارے مل جائیں گے جو یتیموں کی صرف مالی کفالت ہی نہیں کرتے بلکہ ان کی تعلیم و تربیت پر بھی خوب زور دیتے ہیں، لیکن دوسری طرف یتیموں مسکینوں کے ساتھ جو ظلم وستم ہو رہا ہے ان کے حقوق کو غصب کیا جا رہا ہے، حق تلفی کی اس تلوار نے کئی خونی رشتوں کے تقدس کو بھی فنا کر دیا ہے سب سے پہلے قریبی رشتہ دار یتیموں پر ظلم کا رندا چلاتے ہیں، یتیموں کے مال پر قبضہ، جائیداد پر قبضہ، میراث پر قبضہ ان کو گھروں سے نکالنا اور در بدر ٹھوکریں کھانے پر مجبور کرنا اللہ کے عذاب کو دعوت دینا ہے۔

آج کے مسلمان کا یتیموں کے ساتھ معاملہ انتہائی خطرناک حد تک غلط روی کا شکار ہے چچا یتیم بھتیجے کا، پڑوسی اپنے یتیم پڑوسی کا رشتہ دار اپنے یتیم رشتہ دار کے مال کو بے دھڑک کھائے جا رہا ہے، یہ حقوق العباد ہیں ان کی ادائیگی میں حقوق اللہ سے بھی زیادہ

---

(۱) تفسیر ابن کثیر، سورۃ النساء، تحت الآیۃ ۱۰: ج ۲، ص ۱۹۵، مفہومًا

(۲) تفسیر قرطبی، الجزء الخامس، سورۃ النساء، تحت الآیۃ ۱۰: ج ۳، ص ۳۹۔

احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔

اس لیے ہم سب کو سوچنا چاہیے کہ ہم کسی یتیم پر ظلم تو نہیں کررہے سرکاری، نیم سرکاری اور غیر سرکاری تمام ادارے جہاں یتیم بچے موجود ہوتے ہیں، ان کا خاص طور پر خیال رکھا جائے ان کے حقوق نہ مارے جائیں بلکہ ان کی مالی اور تعلیمی کفالت کرکے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پڑوس میں جنتی بننے کا عزم کریں۔(۱)

مال یتیم کی حفاظت کا منصفانہ واقعہ

خلیفہ عبدالرحمن نے قرطبہ میں ایک مکان اپنی ضرورت کی وجہ سے خریدنا چاہا، وہ مکان یتیم بچوں کی ملکیت میں تھا اور وہ یتیم بچے قاضی منذر کی نگرانی میں تھے، جب قاضی کے پاس اس مکان کی خریداری کا پیغام پہنچا تو قاضی صاحب نے فروخت کرنے سے انکار کردیا اور خلیفہ کی خدمت میں کہلا بھیجا کہ یتیموں کی جائیداد اسی وقت منتقل ہوسکتی ہے جب ان میں تین شرطوں میں سے کوئی ایک شرط پوری ہو۔(۱) کوئی سخت ضرورت لاحق ہو(۲) جائیداد کے تلف ہوجانے کا اندیشہ ہو(۳) ایسی قیمت ملتی ہو کہ جس کے لینے میں یتیموں کا آئندہ فائدہ مقصود ہو، فی الحال ان تین شرطوں میں سے کوئی ایک شرط موجود نہیں اور ملازمین سرکار نے جو قیمت اس مکان کی تجویز کی ہے وہ بہت کم ہے، خلیفہ یہ پیغام سن کر خاموش ہوگیا اور اس نے سمجھا کہ قاضی بغیر قیمت بڑھائے نہ مانے گا، چنانچہ قاضی نے فوراً مکان کو منہدم کروادیا، اس کے بعد ملازمین شاہی نے دوگنی قیمت دے کر اس زمین کو خرید لیا، خلیفہ کو اس واقعہ کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے قاضی کو بلا کر مکان منہدم کرانے کا سبب دریافت کیا، قاضی منذر نے کہا: جس وقت میں نے مکان منہدم کرنے کا حکم دیا تھا اس وقت میرے پیش نظر قرآن کی یہ آیت تھی ”فانطلقا حتی اذا رکبا فی السفینة خرقھا قال اخرقتھا لتغرق

(۱) بصیرت آن لائن۔

اھلھا لقد جئت شیئا امرا“(۱) خلیفہ یہ سن کر خاموش ہوگیا اور اس روز سے قاضی منذر کی اور زیادہ عزت کرنے لگا، اس واقعہ سے خلیفہ اور قاضی دونوں کی پاک باطنی کا ثبوت ملتا ہے۔(۲)

حضرت موسیٰ اور حضرت خضرؑ چلے یہاں تک کہ ایک بستی کے پاس سے گذرے اور ان سے کھانے کے لئے کچھ مانگا تو انہوں نے ان کی مہمانی کرنے سے انکار کر دیا۔ اتنے میں وہاں انہیں ایک دیوار ملی جو گرنے کے قریب تھی تو حضرت خضر علیہ السلام نے اس دیوار کو سیدھا کھڑا کر دیا، موسیٰ علیہ السلام کہنے لگے کہ ہم ان لوگوں کے پاس آئے تو انہوں نے ہماری ضیافت تک نہیں کی اور ہمیں کھانا کھلانے سے بھی انکار کر دیا۔ اگر آپ چاہتے تو اس کام کی اجرت لے سکتے تھے وہ لڑکا جسے میں نے قتل کیا ہے فطرۃً کافر تھا اس کے ماں باپ اس سے بڑا پیار کرتے تھے تو جب وہ بڑا ہوا تو وہ اپنے ماں باپ کو بھی سرکشی میں پھنسا دیتا تو ہم نے چاہا کہ اللہ تعالیٰ ان کو اس لڑکے کے بدلہ میں دوسرا لڑکا عطا فرما دے جو کہ اس سے بہتر ہو اور وہ دیوار جسے میں نے درست کیا وہ دو یتیم لڑکوں کی تھی جس کے نیچے خزانہ تھا۔(۳)

یتیم کی دی ہوئی چیز کھا پی نہیں سکتے

یتیم کسی کو اپنی کوئی چیز ہبہ نہیں کرسکتا کیونکہ ”ہبہ“ صحیح ہونے کی شرائط میں سے ایک شرط ہبہ کرنے والے کا بالغ ہونا بھی ہے جبکہ یتیم نابالغ ہوتا ہے، اسی طرح کوئی دوسرا بھی نابالغ کا مال ہبہ نہیں کرسکتا، باپ کو یہ جائز نہیں کہ نابالغ لڑکے کا مال دوسرے لوگوں کو ہبہ کر دے اگرچہ معاوضہ لے کر ہبہ کرے کہ یہ بھی ناجائز ہے اور خود بچہ بھی اپنا مال ہبہ کرنا چاہے تو نہیں کرسکتا یعنی اس نے ہبہ کر دیا اور موہوب لہ کو دیدیا اس سے واپس لیا جائے گا کہ

---

(۱) سورۃ الکھف: ۷۱

(۲) سنہرے فیصلے: ۲۱۰

(۳) البدایہ والنہایہ لابن کثیر: ۱/ ۳۴۷

(نابالغ کا) ہبہ جائز ہی نہیں، یہی حکم صدقہ کا ہے کہ نابالغ اپنا مال نہ خود صدقہ کرسکتا ہے نہ اس کا باپ، یہ بات نہایت یاد رکھنے کی ہے کہ اکثر لوگ نابالغ سے چیز لے کر استعمال کر لیتے ہیں، سمجھتے ہیں کہ اس نے دے دی حالانکہ یہ دینا نہ دینے کے حکم میں ہے بعض لوگ دوسرے کے بچہ سے (کنوئیں سے) پانی بھروا کر پیتے یا وضو کرتے ہیں یا دوسری طرح استعمال کرتے ہیں یہ ناجائز ہے کہ اس پانی کا وہ بچہ مالک ہو جاتا ہے اور ہبہ نہیں کرسکتا پھر دوسرے کو اس کا استعمال کیوں کر جائز ہوگا، اگر والدین بچہ کو اس لئے چیز دیں کہ یہ لوگوں کو ہبہ کر دے یا فقیروں کو صدقہ کر دے تاکہ دینے اور صدقہ کرنے عادت ہو اور مال و دنیا کی محبت کم ہو تو یہ ہبہ وصدقہ جائز ہے کہ یہاں نابالغ کے مال کا ہبہ وصدقہ نہیں بلکہ باپ کا مال ہے اور بچہ دینے کے لئے وکیل ہے جس طرح عموماً دروازوں پر سائل جب سوال کرتے ہیں تو بچوں ہی سے بھیک دلواتے ہیں۔ ”(وتصرف الصبي والمعتوه) الذي يعقل البيع والشراء (إن كان نافعاً) محضاً (كالإسلام والاتهاب صح بلا إذن وإن ضاراً كالطلاق والعتاق) والصدقة والقرض (لا وإن أذن به وليهما“[1])

یتیم کے مال کا غیر محتاط استعمال

علمِ دین سے دوری اور جہالت کے سبب عموماً خاندانوں میں ترکہ تقسیم نہیں کیا جاتا اور اکثر ورثاء میں یتیم بچے بچیاں بھی شامل ہوتے ہیں اور لوگ بلا جھجک ان یتیموں کا مال کھاتے پیتے اور ہر طرح سے استعمال کرتے ہیں حالانکہ یہ سب ناجائز ہے اور اس کی طرف کسی کی توجہ ہی نہیں ہوتی، یاد رکھئے! میت کے ورثاء میں سے اگر کوئی یتیم ہو تو جب تک ترکہ تقسیم کرکے یتیم کا حصہ الگ نہ کیا جائے تب تک اس میں سے میت کے ایصالِ ثواب کے لئے صدقہ خیرات وغیرہ بھی نہیں کرسکتے۔

---

(۱) الدر المختار مع رد المحتار: ۶/۱۷۳۔

جب یتیم کا مال اپنے مال سے ملا کر کھانا (متعدد صورتوں میں) حرام ہوا تو علیحدہ طور پر کھانا بھی حرام ہے، اس سے معلوم ہوا کہ یتیم کو ہبہ دے سکتے ہیں مگر اس کا ہبہ لے نہیں سکتے یہ بھی معلوم ہوا کہ وارثوں میں جسکے یتیم بھی ہوں اسکے ترکہ سے نیاز، فاتحہ خیرات کرنا حرام ہے، اور اس کھانے کا استعمال حرام، اولاً مال تقسیم کرو پھر بالغ وارث اپنے مال سے خیرات کرے، مزید حکم ہے کہ: ''جب میت کے یتیم غائب وارث ہوں تو مالِ مشترک میں سے اس کی فاتحہ تیجہ وغیرہ حرام ہے کہ اس میں یتیم کا حق شامل ہے بلکہ پہلے تقسیم کرو پھر کوئی بالغ وارث اپنے حصہ سے یہ سارے کام کرے ورنہ جو بھی وہ کھائے گا دوزخ کی آگ کھائے گا حدیث شریف میں ہے کہ یتیم کا مال ظلماً کھانے والے قیامت میں اس طرح اٹھیں گے کہ ان کے منہ، کان اور ناک سے بلکہ ان کی قبروں سے دھواں اٹھتا ہوگا جس سے وہ پہچانے جائیں گے کہ یہ یتیموں کا مال ناحق کھانے والے ہیں۔(۱)

آج کل حالات انتہائی ناگفتہ بہ ہیں یتیموں کا مال کھانے سے بچنے کا ذہن ہی نہیں ہوتا، گھر میں کسی کے فوت ہوجانے پر اگر سارے ورثاء بالغ ہوں تو ایک دوسرے سے حقوق معاف بھی کروائے جاسکتے ہیں اور اگر ایک بھی نابالغ بچہ وارثوں میں شامل ہو تو پھر جو لوگ شریعت کے پابند ہیں وہ سخت امتحان میں پڑ جاتے ہیں کیونکہ فی زمانہ خاندان والوں کا ذہن بنانا ہر ایک کے بس کا کام نہیں ہے، اگر کہیں صراحتاً یا دلالۃً معلوم ہو کہ میت کے گھر والوں نے ابھی تک ترکہ تقسیم نہیں کیا اور میت کے ورثاء میں نابالغ بھی ہیں تو وہاں عامۃ المسلمین کو بھی کھانے پینے وغیرہ سے اجتناب کرنا چاہئے۔

یتیم خانے میں لوگ جو صدقہ کی چیزیں دیتے ہیں اگر ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ یتیم بچوں کو وہ چیزیں کھلائی جائیں یا دیدی جائیں تو یتیم خانے کے ذمہ داران پر ضروری ہوگا کہ وہ یتیم خانہ کے بچوں کو حسب منشائے معطین دیدیں یا کھلادیں، دینے والوں کی اجازت

---

(۱) درمنثور پ ۴ النساء تحت الآیۃ ۱۰، ۲/ ۴۴۳ باختلاف بعض الالفاظ

کے بغیر ایسی چیزیں فروخت کرنا جائز نہیں اگرچہ اس کا پیسہ یتیم بچوں میں تقسیم کردیا جائے یا ان کی ضروریات میں صرف کیا جائے۔(۱)

یتیم معاف نہیں کرسکتا

اگر یتیم بچے بخوشی معاف کردیں تو کیا معافی ہوسکتی ہے؟ نیز مسائل معلوم نہ ہونے کے سبب جس نے نابالغ یا یتیم کا مال کھایا اور یہ بھی معلوم نہیں کہ کتنا کھایا اور اب وہ بچے بالغ ہوچکے ہیں اسے کیا کرنا چاہئے؟

نابالغ بچے معاف نہیں کرسکتے اگر وہ معاف کردیں تب بھی معاف نہیں ہوگا لہٰذا مسائل معلوم نہ ہونے کے سبب جس نے نابالغ یا یتیم کا مال کھایا وہ ظن غالب کا اعتبار کرتے ہوئے اتنا مال ان کو لوٹا دے اور ساتھ میں ان سے معافی بھی مانگے، ہاں بالغ ہونے کے بعد وہ ''سابقہ نابالغ یا یتیم'' اپنی خوشی سے چاہیں تو معاف بھی کرسکتے ہیں لیکن معافی مانگنے کے بجائے ان کا مال ہی لوٹانا چاہئے پھر اگر وہ مال لینے کے بجائے معاف کردیں تو ان کی مرضی ہے۔

یتیموں کا حق کسی کے معاف کئے معاف نہیں ہوسکتا یہاں تک کہ خود یتیم کا دادا یا ماں کسی نابالغ کے ماں باپ اس کا حق کسی کو معاف کردیں ہرگز معاف نہ ہوگا ''فان الولایة للنظر لا للضرر'' (کیونکہ ولایت وسرپرستی نگرانی کے لئے حاصل ہوتی ہے نقصان دینے کے لئے نہیں) بلکہ خود یتیم و نابالغ بھی معاف نہیں کرسکتے نہ ان کی معافی کا کچھ اعتبار ہے ''للحجر التام عاما هو ضرر'' (کیونکہ نقصان دہ معاملہ میں تصرف کرنے سے انہیں مکمل روک دیا گیا ہے) محض یتیموں کا حق ضرور دینا پڑے گا اور جو نکلوا سکتا ہے اسے چاہئے کہ ضرور دلادے، ہاں یتیم بالغ ہونے کے بعد معاف کرے تو معاف ہوسکے گا۔

(۱) واللہ تعالیٰ اعلم دارالافتاء، دارالعلوم دیوبند۔

یتیم کی شادی

یتیموں کا ایک حق یہ ہے کہ جب وہ شادی کی عمر کو پہنچ جائے تو اس کے ولی یا سرپرست کو ان کی شادی کردینی چاہئے، اگر یتیم کا کوئی ولی یا سرپرست نہ ہو تو ایسی صورت میں "السلطان ولی من لا ولی له" کے ضابطہ کے تحت حاکم کی یہ ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ ان یتیموں کی شادی کا انتظام کریں۔(۱)

یہاں ایک بات یاد رکھنی ہے کہ اگر یتیم بچی ایسی ہو جس سے اس کے ولی کو نکاح حلال ہو تو وہ ولی اس یتیم بچی سے شادی کرسکتا ہے، بشرطیکہ اس کے مہر میں کمی نہ کرے اور اس کے حقوق میں کمی نہ کرے۔(۲)

اسی بات کی اصلاح کے لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا: "اگر تم کو اس بات کا خوف ہو کہ یتیموں کے ساتھ انصاف نہ کرسکو گے تو تم اس کے سوا جو عورتیں تمہیں پسند ہیں، دو دو یا تین تین یا چار چار سے نکاح کرلو"۔(۳)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دیا ہے کہ اگر ظلم کا اندیشہ ہو تو یتیم لڑکیوں سے نکاح کرنا جائز نہیں (ایضاً) یہ آیت ان یتیم لڑکیوں کے اولیاء کے بارے میں نازل ہوئی جو یتیم لڑکی اپنے ولی کے مال اور باغ میں بوجہ قرابت باہمی شریک ہوتی، تو اس کا ولی اس کے حسن و مال سے مرغوب ہونے کی صورت میں اس سے کم مہر پر نکاح کرلیتا، اور اگر حسن مرغوب نہ ہو صرف مال مرغوب ہو تو مال کے لئے نکاح کرلیتا مگر اس کی طرف رغبت نہ کرتا۔(۴)

---

(۱) بدائع الصنائع: ۲/۲۵۱، فصل شرط تقدم الولایۃ فی النکاح، مکتبہ دارالکتب العلمیۃ بیروت

(۲) رحمۃ اللہ الواسعۃ ۵/۱۲۹ مفتی سعید احمد پالنپوری، مکتبہ حجاز دیوبند، سنہ ۲۰۰۲ء

(۳) النساء: ۳، ترجمہ حکیم الامت

(۴) بخاری شریف، رقم الحدیث ۲۴۹۴، باب شرکۃ الیتیم واہل المیراث، مکتبہ دار طرق النجاۃ بیروت

نکاح کے لئے یتیم بچی کی رضامندی طلب کرنا

یتیم بچی کا ایک حق یہ ہے کہ جب نکاح کا وقت آجائے تو اس کی رضامندی کے بغیر نکاح کے لئے قدم نہ اٹھایا جائے، بلکہ یتیم بچی سے اجازت لی جائے، اگر وہ اجازت دے دے یا خاموش رہے تو نکاح کرنا جائز ہوگا اور اگر وہ نکاح سے انکار کردے تو ایسی صورت میں زبردستی اس کا نکاح نہیں کیا جائے گا، چنانچہ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے، حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

”نکاح کے لئے یتیم بچی سے اس کے نفس کے بارے میں موافقت طلب کی جائے گی، اگر وہ خاموش رہی تو یہی اجازت ہے اور اگر وہ انکار کردے تو زبردستی اس کا نکاح نہیں کیا جائے گا“۔(۱) حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ ایک صاحب نبی کریم ﷺ کی خدمت میں آکر کہنے لگے: اے اللہ کے رسول! ایک یتیم لڑکی ہماری پرورش میں ہے، اس کے لیے دو رشتے آئے ہیں، ایک مالدار آدمی کا اور ایک تنگدست آدمی کا، ہماری خواہش مالدار آدمی سے نکاح کرنے کی ہے، جب کہ لڑکی کا میلان تنگدست آدمی کی طرف ہے، اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا: دو محبت کرنے والوں کے لیے نکاح جیسی کوئی چیز دیکھی نہیں گئی۔(۲) یعنی جب یک دوسرے کی جانب میلان ہوگیا ہے تو نکاح کی وجہ سے باہمی محبت میں مزید اضافہ ہی ہوگا۔(۳)

لے پالک اولاد اور عرب کا دستور

---

(۱) ابوداؤد، رقم الحدیث: [illegible]: ۱۹۵۱۶ یہ حدیث صحیح لغیرہ ہے علامہ ہیثمیؒ فرماتے ہیں کہ اس روایت کو احمد بزار ابویعلی اور طبرانی نے روایت کیا ہے اور مسند احمد کے رجال صحیح ہیں۔

(۲) کنز العمال، حدیث: ۴۵۵۹۷۔

(۳) مرقاۃ المفاتیح، کتاب النکاح: ۴۶/۱۰۔

اسلام سے پہلے عرب کا دستور یہ تھا کہ یہ لوگ جس بچے کو گود لے کر متبنّٰی بنا لیتے تھے اس کو حقیقی اولاد کی طرح سمجھتے تھے، اسے وراثت ملتی تھی، منھ بولی ماں اور منھ بولی بہنیں اس سے وہی خلا ملا رکھتی تھیں جو حقیقی بیٹے اور بھائی سے رکھا جاتا ہے۔

منہ بولے باپ کی بیٹیوں کا اور اس کے مرجانے کے بعد اس کی بیوہ کا نکاح اسی طرح ناجائز سمجھا جاتا تھا، جس طرح سگی بہن اور حقیقی ماں کے ساتھ کسی کا نکاح حرام ہوتا ہے، اور یہی معاملہ اس صورت میں بھی کیا جاتا تھا جب منھ بولا بیٹا مرجائے یا اپنی بیوی کو طلاق دیدے، منھ بولے باپ کے لیے وہ عورت سگی بہو کی طرح ہوتی تھی۔

جب حضرت محمد ﷺ نے حضرت خدیجہؓ سے نکاح کیا تو حضرت خدیجہؓ نے آپ ﷺ کی خدمت کے لیے ایک پندرہ سالہ غلام زید بن حارثہؓ کو پیش کیا، زیدؓ یمن کے قبیلے بنو قضاعہ کے سردار حارثہ بن شراحیل کے لختِ جگر تھے، آٹھ سال کی عمر میں ڈاکوؤں کے ہاتھ لگ گئے تھے، زید کی والدہ سُعدیٰ بنتِ ثعلبہ قبیلۂ طے کی شاخ بنی مَعن سے تھیں، یہ اپنی والدہ کے ساتھ نانیہال گئے، وہاں سفر میں ان کے پڑاؤ پر قین بن جسر کے لوگوں نے حملہ کیا، پکڑے جانے والوں میں نوعمر زید بھی تھے، ان لوگوں نے طائف کے قریب عُکاظ کے قبیلے میں ان کو بیچ دیا۔ خریدار تھے حضرت خدیجہؓ کے بھتیجے حکیم بن حزامؓ انھوں نے زید کو اپنی پھوپھی حضرت خدیجہؓ کی نظر کر دیا، حضرت خدیجہؓ سے نکاح کے بعد حضور ﷺ نے زیدؓ کو حضرت خدیجہؓ کے یہاں دیکھا اور ان کی عادات واطوار آپ ﷺ کو پسند آئیں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو حضرت خدیجہؓ سے مانگ لیا اور حضرت خدیجہؓ نے آپ ﷺ کی خدمت میں پیش کر دیا۔

کافی دنوں کے بعد زید کے گھر والوں کو پتہ لگا کہ زید مکے میں ہیں، تو ان کے والد حارثہ بن شراحیل اور ان کے ساتھ زید کے چچا تلاش کرتے ہوئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچے اور عرض کیا کہ آپ جو فدیہ چاہیں ہم دینے کو تیار ہیں، ہمارا بچہ آپ ہمیں دے دیں۔

حضور ﷺ نے فرمایا کہ میں لڑکے کو بلاتا ہوں اور اس کی مرضی پر چھوڑے رہتا ہوں اگر وہ آپ کے پاس جانا چاہے گا تو میں کوئی فدیہ نہ لوں گا اور آپ کا بچہ آپ کے حوالے کردوں گا، حضور ﷺ نے زید کو بلایا اور ان سے کہا: ان دونوں صاحبوں کو جانتے ہو؟

انھوں نے عرض کیا: جی ہاں! یہ میرے والد ہیں اور یہ میرے چچا ہیں۔ آپ نے فرمایا: یہ لوگ تمھیں لینے آئے ہیں، اگر تم جانا چاہو تو ان کے ساتھ جاسکتے ہو، میری طرف سے تمھیں اجازت ہے، زید نے چھوٹتے ہی جواب دیا: میں آپ کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا۔

والد اور چچا حیران ہو گئے اور کہا زیدؓ کیا تو آزادی پر غلامی کو ترجیح دیتا ہے، اور اپنے ماں باپ اور خاندان کو چھوڑ کر غیروں کے پاس رہنا چاہتا ہے؟

زیدؓ نے جواب دیا میں نے ان میں جو اوصاف دیکھے ہیں، اس کے بعد میں دنیا میں کسی کو بھی ان پر ترجیح نہیں دے سکتا، زیدؓ کا یہ جواب سن کر باپ اور چچا بہ خوشی راضی ہو گئے کہ زید کو حضور ﷺ کے پاس رہنے دیں۔

جب وہ مایوس ہو کر لوٹنے لگے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے زیدؓ اور ان کے والدین کو حرم میں لے جا کر قریش کے عام مجمع میں اعلان فرمایا کہ: میں زید کو آزاد کرتا ہوں آپ سب لوگ گواہ رہیں کہ آج سے زید میرا بیٹا ہے، یہ مجھ سے وراثت پائے گا اور میں اس سے۔

اسی بنا پر لوگ ان کو زید بن محمد کہنے لگے۔

گود لیا بچہ حقیقی بیٹا نہیں ہوسکتا

لیکن بعد میں حضرت زید کو زید بن حارثہ ہی کے نام سے پکارا جانے لگا، اللہ تعالی نے ”اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَائِهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ“ (۱) کے ذریعہ منع فرمادیا، بخاری، مسلم اور ابوداؤد نے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ حضور ﷺ نے

---

(۱) سورۂ احزاب: ۵

فرمایا: جس نے اپنے آپ کو باپ کے سوا کسی اور کا بیٹا کہا دراں حالیکہ وہ جانتا ہو کہ وہ شخص اس کا باپ نہیں ہے اس پر جنت حرام ہے۔ ''مَنْ اَدَّعٰی اِلٰی غَیْرِ اَبِیْهِ وَھُوَ یَعْلَمُ اَنَّهُ غَیْرُ اَبِیْهِ فَالْجَنَّةُ عَلَیْهِ حَرَام'' (۱)

اخلاقاً بیٹا کہہ دینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے؛ لیکن اس کو باقاعدہ بیٹا بنالینا اور مصنوعی رشتے کو حقیقی رشتے کی جگہ دینا غلط ہے، بیٹوں یا بیٹیوں جیسا حسنِ سلوک کرنا اور قانونی طور پر اس کو حقیقی رشتے کی جگہ دینا شرعاً منع ہے، نیز بہتر ہوگا کہ شوہر اور بیوی دونوں لے پالک بچہ یا بچی کی عمر دو سال ہونے سے پہلے اس کو اپنی کسی محرم خاتون کا دودھ پلانے کا اہتمام کرلیں ؛ تاکہ ایسے بچہ یا بچی کی بلوغت کے بعد ان کے لیے اور ان دونوں کے خاندانوں کے لیے نامحرم ہونے کے مسائل پیدا نہ ہوں۔

اس لیے گود لینے والے کا اس کے نام کے ساتھ بحیثیت باپ اپنا نام لگانا، وراثت میں اس کا حق دار ہونا اور بالغ یا قریب البلوغ ہونے کے بعد مرد گود لینے والے مرد یا عورت کا اس سے پردہ شرعی نہ کرنا (جب کہ اس بچہ یا بچی سے گود لینے والے مرد یا عورت کے لیے حرمت کا کوئی رشتہ نہ ہو) وغیرہ درست نہ ہوگا، زمانہ جاہلیت میں گود لینے کی ایک حیثیت تھی اور کسی دوسرے کے بچے کو گود لینے سے یا اسے اپنا بیٹا قرار دینے سے وہ حقیقی اولاد کے حکم میں ہو جاتا تھا، گود لینے والا اس کے ساتھ مکمل طور پر حقیقی اولاد جیسا معاملہ کرتا تھا لیکن جب اسلام آیا تو اس نے اسے باطل و بے بنیاد قرار دیا اور فرمایا: ذلکم قولکم بأفواھکم (۲)

یعنی : یہ صرف تمہارے منھ کی باتیں ہیں، حقیقت میں ان سے کوئی رشتہ وغیرہ ثابت نہیں ہوتا، اور بعض ملکوں میں اس کو قانون کی حیثیت دیدی گئی ہے جو مذہب اسلام کی رو سے درست نہیں؛ اس لیے مسلمانوں کے لیے جائز نہیں کہ گود لینے والے بچے کو احکام میں حقیقی

---

(۱) بخاری، کتاب الفرائض، باب من ادعی الی غیر ابیہ، ۴/۳۲۶، حدیث: ٦٧٦٦۔

(۲) (سورہ احزاب، آیت ۴:)

اولاد کا درجہ دیں اور اس کے ساتھ حقیقی اولاد کا معاملہ کریں؛ بلکہ اس کی تربیت و پرورش محض گود لیے ہوئے بچہ کی حیثیت ہی سے ہونی چاہئے۔

متبنیٰ بنانے والا شخص نہ باپ ہے نہ متبنیٰ اس کا بیٹا یا اولاد، لٰہذا باپ کی جگہ صرف اور صرف اس کے حقیقی باپ کا نام ہی لکھا اور پکارا جائے گا۔قرآن کریم میں واضح حکم ہے : کہ نہ تمہارے لے پالکوں کو تمہارا بیٹا بنایا یہ تمہارے اپنے منہ کا کہنا ہے اور اللہ حق فرماتا ہے اور وہی راہ دکھاتا ہے، انہیں ان کے باپ ہی کا کہہ کر پکارو یہ اللہ کے نزدیک زیادہ ٹھیک ہے پھر اگر تمہیں ان کے باپ معلوم نہ ہوں تو دین میں تمہارے بھائی ہیں ۔پس متبنیٰ کے حقیقی والدین ہی اس کے والدین ہیں اور رہیں گے خواہ پرورش کوئی کرے، حقیقی والد کا نام ہی والد کے طور پر لکھا اور بتایا جائے گا خواہ کچھ ہو، دوسرے کی طرف منسوب کرکے اس کا بیٹا کہنا یا لکھنا حرام ہے۔۔"وَمَا جَعَلَ أَدْعِيَاءَكُمْ أَبْنَاءَكُمْ ذَلِكُمْ قَوْلُكُم بِأَفْوَاهِكُمْ وَاللهُ يَقُولُ الْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِي السَّبِيلَ٥ ادْعُوهُمْ لِآبَائِهِمْ هُوَ أَقْسَطُ عِندَ اللهِ فَإِن لَّمْ تَعْلَمُوا آبَاءَهُمْ فَإِخْوَانُكُمْ فِي الدِّينِ"۔(۱)

اس کی پرورش کرنے والا اس کا سرپرست کہلوائے گا اور تمام کاغذات میں بطور والد نہیں بلکہ بطور سرپرست اس کا نام درج کیا جائے گا، اگر اصلی باپ کا نام معلوم نہیں تو اس کی معلومات کروا کر باپ کے طور پر حقیقی باپ کا نام لکھنا ہوگا اور اگر کوشش کے باوجود کسی طرح اس کے اصلی باپ کا نام معلوم نہ ہوسکے تو گود لینے والا گفتگو میں حقیقی باپ کے طور پر اپنا نام ہرگز استعمال نہ کرے اور نہ ہی بچہ اسے حقیقی والد کے طور پر اپنا باپ کہے، اسی طرح کاغذات وغیرہ میں سرپرست کے کالم میں اپنا نام لکھے حقیقی والد کے کالم میں ہرگز نہ لکھے، اگر جان بوجھ کر خود کو حقیقی باپ کہے یا لکھے گا تو یہ بھی درج ذیل وعید میں داخل ہے : حضرت سعدؓ سے روایت ہے :نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا : جس شخص کو یہ معلوم ہو کہ اس کا باپ

(۱) سورۃ الاحزاب:۴۔

کوئی اور ہے اور اس کے باوجود اپنے آپ کو کسی غیر کی طرف منسوب کرے تو اس پر جنت حرام ہے۔(۱)

حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس شخص نے خود کو اپنے باپ کے غیر کی طرف منسوب کیا یا جس غلام نے اپنے آپ کو اپنے مولیٰ کے غیر کی طرف منسوب کیا اس پر اللہ عزَّ وجلَّ کی، فرشتوں کی اور تمام لوگوں کی لعنت ہو، قیامت کے دن اللہ عزَّ وجلَّ اس کا کوئی فرض قبول فرمائے گا نہ نفل۔ ”وَمَنِ ادَّعَى إِلَى غَيْرِ أَبِيهِ، أَوْ انتَمَى إِلَى غَيْرِ مَوَالِيهِ، فَعلَيْهِ لَعْنَةُ اللهِ وَالملائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ، لا يَقْبَلُ اللهُ مِنْهُ يَوْمَ الْقِيَامةِ صَرْفًا وَلا عَدْلًا“(۲)

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: اپنے والد سے بے رغبتی واعراض مت کرو؛ اس لیے کہ جو شخص اپنے والد سے اعراض (اپنے آپ کو کسی اور کی طرف منسوب) کرے گا تو یہ کفر ہے۔ ”لاتَرْغَبُوا عَنْ آبَائِكُمْ، فَمَنْ رَغِبَ عَنْ أَبِيهِ فَهُوَ كُفْرٌ“(۳)

متبنیٰ کے لیے وراثت

متبنیٰ کی پرورش کرنے والا شخص اپنی زندگی میں جتنا مناسب سمجھے مکان، روپیہ، دوکان وغیرہ ہبہ کرسکتا ہے، اس کے نام رجسٹری کردے تاکہ اس کے مرنے کے بعد اس میں وراثت کا جھگڑا نہ ہو۔ وراثت صرف اس مال میں چلتی ہے جو مرتے وقت کسی کی ملکیت میں ہو، دوسری صورت یہ بھی ہے کہ مرتے وقت ایک تہائی تک مال اس کے نام کرنے کی وصیت کرجائے، اس شخص نے اپنی زندگی میں جو کچھ متبنیٰ کو دے دیا چونکہ اب وہ اس کی

(۱) بخاری، کتاب الفرائض، باب من ادعی الی غیر ابیہ، ۴/۳۲۶، حدیث: ۶۷۶۶۔

(۲) مسلم، کتاب الحج، باب فضل المدینۃ ودعاء النبی صلی اللہ علیہ وسلم فیھا بالبرکۃ۔۔۔الخ، حدیث: ۴۶۷۔

(۳) ریاض الصالحین: ۳/۱۸۰۔

ملکیت سے نکل کر اس متبنیٰ کی ملکیت میں آچکا، لہٰذا اس پر مرنے والے کی وراثت کا اطلاق نہ ہوگا اور نہ ہی واپسی کا مطالبہ کیا جائے گا، جب متبنیٰ کسی طور پر وارث بنتا ہی نہیں تو صلبی اولاد یا دیگر ورثاء کے ساتھ اس کا وراثت میں کوئی مسئلہ ہی نہ رہا، باقی ورثاء تمام ترکہ میں سے حسب ضابطہ اپنا اپنا مقررہ حصہ پائیں گے، دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ نہ کسی کا حق مارا جائے اور نہ کوئی محروم ہو، حقیقی ورثاء کا حق اس متبنیٰ کی وجہ سے مارا نہ جائے۔

ٹسٹ ٹیوب بے بی (Test tube baby)

اولاد نہ ہو تو لوگ بچہ کو گود لینے اور کسی یتیم کا سہارا بننے کے بجائے نت نئے طریقوں سے اولاد جنم دینے کی کوشش کرتے ہیں، آج کل میڈیکل سائنس کی ترقی کے نتیجے میں بہت سے نئے مسائل جنم لے رہے ہیں، نیز علاج کے نام پر بہت سی ایسی شکلیں مارکیٹ میں متعارف کی جارہی ہیں، جن میں سے بعض تو شرعی اعتبار سے قطعی حرام اور اسلام کے بنیادی اصول سے متصادم ہیں اور ان شکلوں کو طبی کیمپ، اخبارات اور دیگر ذرائع کے توسط سے خوب شہرت دی جارہی ہے، نتیجتاً بہت سے مسلمان بھی ان کو اپنا رہے ہیں، ان جدید شکلوں میں سے ایک شکل آئی وی یف (in vitro fertilization=ivf) ہے، اس سے مراد تولید کے مصنوعی ذرائع ہیں۔

ٹیسٹ ٹیوب بے بی کے ذریعہ افزائش نسل کی سات صورتیں ہیں شریعت کے اصول اور فقہائے کرام کے کلام کی رو سے تمام شکلیں حرام ہیں۔ ایک تو اس لیے کہ ان طریقوں کو اپنانے میں خاتون کا سترِ غلیظ یعنی ناف سے لے کر گھٹنے تک کا حصہ اجنبی ڈاکٹروں؛ بلکہ بسا اوقات معاونین اور ڈاکٹروں کی ایک ٹیم کے سامنے کھولنا تقریباً لازمی ہے، جب کہ عورت کے لیے ستر کا یہ حصہ نہ مرد کے سامنے کھولنا جائز ہے، نہ عورت کے سامنے۔ اور جو عورتیں ان طریقوں کو اپناتی ہیں ان کو کوئی ایسی جسمانی تکلیف نہیں ہوتی؛ بلکہ یہ تو محض جلبِ منفعت اور حصولِ اولاد کے لیے کرتی ہیں، ارتکابِ حرام کی گنجائش ضرورتِ شدیدہ کے وقت ہوتی ہے، نہ

کہ محض حصول منفعت کے لیے۔

فقہائے کرام نے صراحت کی ہے کہ اگر کوئی مسلمان بچہ بالغ ہو جائے اور کسی وجہ سے ختنہ نہ ہو سکا، تو بالغ ہونے کے بعد اس کا ختنہ نہ کرایا جائے اور اس کی وجہ یہ لکھی کہ ختنہ سنت ہے، جب کہ ستر چھپانا فرض ہے یعنی تحصیل سنت کے لیے ترک فرض کا ارتکاب نہیں کیا جائے گا، چنانچہ مجموعہ فتاوی میں ذخیرہ کے حوالے سے منقول ہے :في الذخيرة أنَّ الْمُسْلِمَ يُخْتَنُ مَالَمْ يَبْلُغْ فَاذَا بَلَغَ لَمْ يُخْتَنْ، لِأنَّ سَتْرَ عَوْرَةِ الْبَالِغِ فَرْضٌ وَ الْخِتَانُ سُنَّةٌ فَلاَ يُتْرَكُ الْفَرْضُ لِسُنَّةٍ وَ الْكَافِرُ اذَا أَسْلَمَ يُخْتَنُ بِالْاِتِّفَاقِ لِمُخَالَفَتِه دِيْنَ الْاسْلاَمِ وَهُوَ بَالِغٌ "(۱) تو جب مردوں کا ختنہ جسے تقریباً ضروری اور شعارِ اسلام سمجھا جاتا ہے۔ وہاں اس کی اجازت نہیں دی گئی تو عورت کا ختنہ جو سنت بھی نہیں، اس کے لیے کیسے اجازت دی جاسکتی ہے؟

عدمِ جواز کی دوسری بڑی وجہ اختلاطِ نسب (جس کی شریعت نے بہت تاکید کی ہے) کا اندیشہ ہے؛ اس لیے کہ ٹیسٹ ٹیوب بے بی سے متعلق جانکاری رکھنے والوں کی تحریریں پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس عمل کو انجام دینے والے ڈاکٹرس، عورت کا بیضہ المنی اور مردوں کی منی لے کر باہم ملانے کے بعد ایک ٹیوب میں آبیاری کرتے ہیں، جس کی مدت کم وبیش دو یا چار دن ہے؛ پھر عورت کے رحم میں مناسب جگہ پر اس کو پیوست کرتے ہیں اور یہ کام انتہائی مشکل ہوتا ہے، اس لیے کہ لقیحہ (آمیزہ) رحم میں بہ آسانی چپکتا نہیں ہے؛ بلکہ بسا اوقات کئی کئی بار یہ کوشش ڈاکٹروں کو کرنی پڑتی ہیں؛ اس لیے عموماً ڈاکٹروں کا طرزِ عمل یہ ہے کہ وہ عورت سے حاصل کردہ بیضہُ المنی (جو بے شمار جراثیم پر مشتمل ہوتا ہے) کی مختلف ٹیوب میں آبیاری کرتے ہیں۔

اب اس بات کی ضمانت کون دے گا کہ اگر یہ آمیزے بچ جائیں تو ڈاکٹر انھیں ضائع

---

(۱) بحوالہ فتاویٰ رحیمیہ ج ۱۰ص ۱۳۴ کتاب الحظر والاباحۃ، ط : دارالاشاعت

کر دیں گے؟ جب کہ مخصوص آلے کے ذریعہ عورت کا بیضۂ المنی لینا پھر مرد کی منی کے ساتھ اس کا لقیحہ تیار کرنا انتہائی مشکل مرحلہ ہوتا ہے۔

نیز ٹیسٹ ٹیوب بے بی (ivf) کا طریقہ ایجاد ہونے کے بعد ہسپتالوں میں باقاعدہ منی بینک کا انتظام ہونے لگا ہے، جس میں مختلف صلاحیتوں کے حامل مردوں (مثلاً فنکار، کھلاڑی، سیاستداں، کالا، گورا) کی منیاں محفوظ رکھی جاتی ہیں اور حسب ضرورت عورتیں ان منیوں سے حاملہ ہوتی ہیں؛ بلکہ آج کل بہت سی کمپنیاں وجود میں آچکی ہیں، جو طبی مراکز اور ہسپتالوں کے لیے منیاں، کرائے کی مائیں وغیرہ فراہم کرتی ہیں اور جن ہسپتالوں میں ٹیسٹ ٹیوب بے بی کی سہولیات فراہم ہوتی ہیں، وہاں منی بینک نیز کرائے کی کوکھ کا بھی ضرور انتظام ہوتا ہے، ابتدا تو ان چیزوں کی یورپ امریکا سے ہوئی؛ لیکن اب ہر جگہ یہ چیزیں پھیل چکی ہیں، تو کیا یہ ساری چیزیں انسانیت اور نسب انسانی کے ساتھ سراسر مذاق نہیں ہے؟ تو ان دین بے زار؛ بلکہ اسلامی اصول کو بالکل نظر انداز کرنے والوں سے کیا یہ توقع کی جاسکتی ہے، کہ مرد سے حاصل کردہ منی کو اس کی بیوی ہی کے رحم میں ڈالیں گے؟ یا اس سے بچے ہوئے حصے کو ضائع کر دیں گے؟

نیز ان بے دین؛ بلکہ نسل انسانی کو مذاق بنانے والے ڈاکٹروں سے کیا یہ امید کی جاسکتی ہے کہ وہ منشاءِ شریعت (اختلاط نسب سے بچانا) کے مطابق یہ امور انجام دیں گے؟ ہرگز نہیں؛ اس لیے کسی مسلمان کے لیے جو اللہ پر ایمان رکھتا ہے، ہرگز جائز نہیں کہ اس طریقۂ تولید کو اپنائے، اگرچہ خاتون ڈاکٹرنی ہی سارا کام انجام دے، ہاں اگر شوہر خود اس لائن کا تجربہ رکھتا ہو اور وہ دیانت داری کے ساتھ اس کام کو انجام دے تو شرعاً اس کی گنجائش ہوگی۔ اکابر اربابِ افتاء میں سے حضرت مفتی نظام الدین صاحب نے منتخبات نظام الفتاویٰ (ج ۱ ص ۳۳۹) حضرت مفتی رشید احمد صاحب نے احسن الفتاویٰ (ج ۸ ص ۲۱۴، ط : دارالاشاعت) اور حضرت مفتی عبدالرحیم صاحب لاجپوری نے فتاوی رحیمیہ (ج ۵

ص ۴۸۴، کتاب الحظر والاباحۃ ط : مکتبہ الاحسان) میں عدمِ جواز کا ہی فتویٰ دیا ہے، دارالعلوم دیوبند نے بھی حال ہی میں اس طریقۂ تولید سے متعلق عدم جواز کا فتوی جاری کیا۔ (سوال ۴۷، د ۱۴۳۴ھ، مزید تفصیل کے لیے "جدید طبی مسائل" کا مطالعہ مفید ہے)

ٹسٹ ٹیوب بے بی سے ہونے والے بچہ کا حکم

اگر کسی نے ناواقفیت یا کسی اور وجہ سے ان شکلوں میں سے کسی کو اپنا لیا اور اس کے نتیجے میں بچہ پیدا ہوا، تو بچہ ثابت النسب ہوگا یا نہیں؟ نیز ایک بیوی کے بیضے کو دوسری بیوی کے رحم میں ڈالنے کی صورت میں بچے کی ماں کون بنے گی؟ جس نے بچہ جنا؟ یا وہ عورت جس کا بیضہ لیا گیا؟ تو اس سلسلے میں عرض یہ ہے کہ حدیث میں الولد للفراش وللعاہر الحجر (۱) فرمایا گیا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ منکوحہ کا بچہ اس کے شوہر کی طرف ہی منسوب ہوگا، بہ شرطے کہ مدت کے اندر اس کی گنجائش ہو یعنی نکاح کے کم از کم چھ مہینے کے بعد بچہ پیدا ہوا ہو۔ نیز یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ شرعاً ثبوتِ نسب کے لیے فطری طریقے پر ہی رحم میں منی کا ادخال ضروری نہیں؛ بلکہ غیر فطری طریقے پر ادخال کی صورت میں بھی نسب ثابت ہو جاتا ہے۔ چنانچہ فتاویٰ ہندیہ میں ہے :رَجُلٌ عَالَجَ جَارِيَةً فِيْ مَا دُوْنَ الْفَرْجِ فَأَنْزَلَ فَأَخَذَتِ الْجَارِيَةُ مَائَهُ فِيْ شَيْءٍ فَاسْتَدْخَلَتْهُ فِيْ فَرْجِهَا فَعَلَقَتْ، عِنْدَ أَبِيْ حَنِيْفَةَ أَنَّ الْوَلَدَ وَلَدُه وَتَصِيْرُ الْجَارِيَةُ أُمَّ وَلَدٍ لَه" (۲) لہٰذا دونوں صورتوں میں بچہ ثابت النسب ہوگا، پہلی صورت تو جن دو میاں بیوی کا نطفہ لیا گیا ہے، ان سے ہی نسب ثابت ہوگا۔ رہی دوسری صورت کہ اس میں بچے کی ماں شرعاً کون بنے گی؟ جس کا بیضہ المنی لیا گیا وہ؟ یا وہ جس نے حمل کی مشقت اٹھائی اور جنم دیا؟ تو صحیح بات یہ ہے کہ بچے کا نسب اس خاتون سے ثابت ہوگا جس کے بطن سے وہ پیدا ہوا ہے، جس نے حمل و وضع حمل کی مشقت برداشت کی

---

(۱) بخاری، حدیث: ۶۸۱۷، باب للعاہر الحجر۔

(۲) فتاوی ہندیہ: ۴/ ۱۱۴، الفصل الاول فی مراتب النسب، زکریا۔

قرآن کریم میں ہے انْ اُمَّهَاتُهُمُ الاّ الاّئی وَ لَدْنَهُمْ (المجادلۃ ۲:)

ترجمہ :ان کی مائیں تو بس وہی ہیں جنھوں نے ان کو جنا ہے۔ یہاں پر اللہ تعالیٰ نے ماں انھیں قرار دیا ہے جنھوں نے بچوں کو جنا اور حصر کے ذریعے غیر سے ماں ہونے کی نفی کی ہے۔ نیز دوسری آیت میں ہے یَخْلُقُكُمْ فِيْ بُطُوْنِ أُمَّهَاتِكُمْ (الزمر، الآیۃ ٦) یہاں پر بھی موضع تخلیق ماؤں کے بطون کو بنایا، اس سے بھی یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ مائیں وہ ہوں گی جن کے بطن میں بچہ کی تخلیق ہوئی ہے، نیز آیت کریمہ حَمَلَتْهُ أُمُّه كُرْهًا وَ وَضَعَتْهُ كُرْهاً سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔(۱)

کرایہ کی مائیں

ٹسٹ ٹیوب بے بی (Test tube baby) کی ہی ایک قسم ''کرایہ کی ماں'' فطری نظام اللہ کا اپنی تمام مخلوق میں بلا امتیاز انسان کے افزائش نسل ماں باپ کے ذریعہ سے ہے، انسان کو امتیاز عفت و عصمت میاں بیوی کی وفاداری کی وجہ سے ہے جس کی وجہ سے خاندانی شناخت باقی ہے نسبی نسبتوں کی وجہ سے حقوق کی ادائیگی کی فکر ہے، حیوانوں میں یہ نظام نہیں ہے، جس کی وجہ سے کوئی نر کسی مادہ کا نہ کوئی جانور اپنے ماں باپ کے حقوق کی فکر کرتا نظر آتا ہے، اس سماجی پہچان کو اللہ نے بڑی نعمت شمار کیا ہے۔(۲) اگر بنظر غور جائزہ لیا جائے تو یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ جو بچہ پیدا ہوگا وہ ایک ایسی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوگا جو اُس کی ماں کی بجائے کسی اور عورت کے اور اور مرد کے باہم اختلاط سے اِس دُنیا میں ظہور پذیر ہوا ہوگا۔ کیا ایسی عورت اُس کی ماں کہلا واسکے گی جس نے اُس کو جنا ہی نہیں اور وہ عورت جو پیسے لے کر بچے کو پیدا کرے گے اُس کے جذبات اُس

---

(۱) ماہنامہ دارالعلوم ،شمارہ 4، جلد 97 :، جمادی الثانیہ 1434 ہجری مطابق اپریل 2013ء، مجلۃ مجمع الفقہ الاسلامی التابع لمنظمۃ المؤتمر الاسلامی بجدۃ وہ تصدر عن منظمۃ المؤتمر الاسلامی بجدۃ، العدد الثانی ص ۱۸۶۔

(۲) سورہ حجرات: ۱۳، سورہ فرقان: ۵۴۔

بچے کے لیے کیسے ہوں گے؟۔ یہ زنا نہ ہونے کے باوجود شرعاً حرام ہے،حضرت مولانا خالدسیف اللہ صاحب دامت برکاتہم لکھتے ہیں: ”افسوس کہ موجودہ دور میں مغرب کی خدانا آشنا اوراخلاق بیزار تمدن اس بات کی کوشش کررہاہے کہ انسان صنفی مسائل میں پوری طرح قانونِ فطرت سے آزاد ہوجائے اوراپنی شاخت کھودینے میں اسے کوئی تامل نہ ہو،ایسی ہی صورتوں میں ایک وہ ہے،جس کورحم کو کرایہ پر یاعاریت پر دینے سے تعبیر کیاجاتاہے،اس کی ابتداء ۱۹۵۳ء سے ہوتی ہے،جب ”مرد کے مادہ منویہ کو مثلج (Freezer) کیا گیا،تاکہ اس کہ بعد بھی قابل استعمال بنایاجائے،۱۹۷۱ء میں نیویارک میں اسپم بینک قائم کیا گیا،اور عورتوں کے لیے یہ راستہ کھولا گیا کہ وہ اپنے انتخاب کے مطابق کسی بھی مرد کے مادۂ منویہ سے حاملہ ہوسکیں پھر ۱۹۷۸ء میں برطانیہ میں ٹسٹ ٹیوب کا کامیاب تجربہ ہوا، ۱۹۸۰ء میں امریکہ میں رحم کرایہ پر لگانے کا آغاز ہوا،اور ۱۹۸۵ء میں امریکہ ہی میں پہلی بار کرایہ کے رحم کے ذریعہ ولادت ہوئی ۱۹۸۶ء میں یہ واقعہ پیش آیا کہ رحم کو کرایہ پر لگانے والی عورت نے اس عورت کو بچہ دینے سے انکار کردیا،جس کا بیضہ لیا گیا تھا،لیکن امریکی عدالت نےاس عورت کوحق پرورش دیااورماں تسلیم کیا جس نے اپنا بیضہ دیا تھا،اس طرح کی خلاف فطرت کوششیں عموماً مغرب سے شروع ہوتی ہیں،،بہت جلد مشرقی ممالک اسے قبول کرلیتے ہیں،چنانچہ اس سلسلہ میں بھی ہندوستان کی صورت حال یہی ہے،مثلاً ۲۰۱۰ء میں ہندوستان میں کرایہ کی ماں کے ذریعہ اولاد حاصل کرنے کے ۱۵۰۰/واقعات ہوئے،جن میں دوسو سے زیادہ بچے اسرائیلی شہروں کے تھے،جون ۲۰۱۳ء میں ایک ایسا شخص کرایہ کی ماں سے بچہ حاصل کرکے اپنے ملک چلاگیا،جوخلافِ فطرت فعل کا عادی تھااورجب یہ بات منظرعام پرآئی تواس سے بحث کاایک دروازہ کھل گیا،کہاجاتاہے کہ ہندوستان میں اس وقت یہ ایک انڈسٹری بن چکی ہے،جس کابزنس تین ملین امریکی ڈالر سے آگے بڑھ چکاہے، سالانہ ۹/ ارب ڈالر کا کاروبار ہے ہندوستان میں عام طور پر ۲۰ ہزار ڈالر سے حمل کی تکلیف

اُٹھانے سے ماں باپ بننے کی خواہش پوری ہوجاتی ہے، جب کہ مغربی ملکوں میں اس سے بہت زیادہ اخراجات ہوتے ہیں، اسی لیے اولاد کے خواہش مندوں کا رُخ تیزی سے ہندوستان کی طرف ہورہا ہے، ہندوستان میں ۲۰۰۵ء میں کرایہ پر رحم دینے والی عورتوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے ایک قانون بھی مرتب کیا گیا لیکن عملی طور پر اس کا نفاذ نہیں ہو پا یا۔

کرایہ کی ماں کی اس نئی صورت نے طبی اور اخلاق نقطۂ نظر سے مختلف مسائل پیدا کردیئے ہیں، امریکہ میں دو سے زائد ایسے حمل کی اجازت نہیں دی جاتی، جب کہ ہندوستان میں ایک ہی عورت پر پانچ پانچ دفعہ تک اس کا تجربہ کیا جاتا ہے، بچہ کی پیدائش کے بعد حمل کی تکلیف اُٹھانے والی عورت کو نومولود کی صورت تک نہیں دکھائی جاتی، اس کی وجہ سے وہ ڈپریشن کا شکار ہوجاتی ہیں، کم وقت میں زیادہ بچہ حاصل کرنے کے لیے یا اولاد کے حصول کو یقینی بنانے کے لیے ایک ہی بار میں عورت کے جسم میں کئی بیضے پہنچا دیئے جاتے ہیں، اس سے عورت کی مشقت بڑھ جاتی ہے اور وہ متعدد بیماریوں کی شکار ہوتی ہیں، ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ ایسی عورتوں کو نہ صرف پیشاب میں انفیکشن، شوگر اور ولادت کے قریب خون کے اخراج کی شکایت پیش آتی ہے، بلکہ ایسی خواتین اور بچوں میں اموات کی شرح بمقابلہ عام حالات کے زیادہ ہے، نیز حاملہ کو زیادہ ہارمون پہنچانے کی وجہ سے اس کی صحت پر بہت زیادہ منفی اثر پڑتا ہے‘‘۔(۱)

آپ مزید لکھتے ہیں کہ: ’’افسوس کہ راقم الحروف نے جب اس موضوع پر منعقد ہونے والے ایک سیمینار میں حصہ لینے کی غرض سے مسلمان ڈاکٹروں کی ایک میٹیگ رکھی اور انہوں نے معلومات جمع کیں، تو حیرت ہوئی کہ ہندوستان کے بڑے شہروں میں رحم کو کرایہ پر لگانے والی عورتوں میں اچھی خاصی تعداد مسلم خواتین کی بھی ہے، یہ نہایت خطرناک رجحان

---

(۱) متاع فکرونظر: ۱۷۰تا۱۷۶۔

ہے۔(۱)

جانوروں کے بارے میں تو یہ بات سننے میں آتی تھی کہ مادہ کو نَر کے نطفہ سے بار آور کیا ہے لیکن اب انسان بھی جانور کی سطح پر آ گئے اسلام کا تصور بالکل واضح ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: نِسَاؤُكُمْ حَرْثٌ لَكُمْ فَأْتُوا حَرْثَكُمْ أَنَّى شِئْتُمْ (۲) ''تمہاری بیویاں کھیتیاں ہیں، لہذا اپنی کھیتی پر جس طرح آنا چاہو، آؤ'' کھیتی سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ تمہارے لئے اولاد کی پیدائش کا ذریعہ بیوی ہی کو ہونا چاہئے اور بیوی سے تعلق میں کسی خاص کیفیت کی تحدید نہیں ہے، اس طرح قرآن مجید نے ایک جامع فقرہ کے ذریعہ بیک وقت کئی باتوں کی طرف اشارہ کر دیا، اول یہ کہ اولاد کا حصول مرد وعورت کے باہمی تعلق سے ہونا چاہئے، تنہا مرد یا عورت سے نہیں، ٹھیک اسی طرح جیسے کاشت کار کی محنت اور قابل کاشت زمین کی صلاحیت کے اشتراک سے پیداوار حاصل ہوا کرتی ہے، کلوننگ کا جو طریقہ سائنسدان نے ایجاد کیا ہے نسل انسانی کی افزائش میں اس کا استعمال جائز نہیں، کیوں کہ اس طریقہ میں تنہا مرد یا عورت کے سیل سے بھی بچہ کو وجود میں لایا جاسکتا ہے، دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ مرد و عورت کے تعلق کو فطرت کے دائرہ میں محدود ہونا چاہئے، غیر فطری عمل کی میاں، بیوی کے درمیان بھی اجازت نہیں، تیسری بات جو اس وقت بیان کرنی مقصود ہے، وہ یہ ہے کہ میاں بیوی کے لیے حصول اولاد کا ایک ہی محل متعین ہے، اور وہ ہے مرد کے لیے بیوی اور عورت کے لیے شوہر، نہ مرد کے لیے اس بات کی گنجائش ہے کہ اس کے بچے کی پرورش اس کی بیوی

(۱) اس وقت پوری دنیا میں ''سروگیٹ مدر'' (Mother Surrogate) کے حوالے سے بھارتی خواتین سرفہرست ہیں بھارت میں غیر شادی شدہ غریب لڑکیاں بھی پیسوں کے لیے سروگیٹ مائیں بن رہی ہیں اور یہ کام جسم فروشی کا نعم البدل بنتا جارہا ہے بعض امریکی اور یورپی خواتین ماں بننے کی صلاحیت رکھنے کے باوجود اپنے لیے سروگیٹ مائیں تلاش کرتی ہیں۔ اس طرح اُنھیں 9 ماہ کی مشقت اور زچگی کی تکلیف سے نجات مل جاتی ہے اور اُن کی نوکریاں بھی متاثر نہیں ہوتیں امیر عورتوں کے اس رجحان نے غریب عورتوں کے لیے آمدنی کے نئے دروازے کھول دیے ہیں۔ احمد اللہ۔

(۲) سورہ حجرات: ۱۳، سورہ فرقان: ۵۴۔

کے بجائے کسی اور عورت کے پیٹ میں ہو، نہ عورت کے لیے گنائش ہے کہ اس کے پیٹ میں اس کے شوہر کے علاوہ کسی اور مرد کے بچہ کی پرورش ہو،اس لیے کرائے کی ماں، یا مستعار ماں کا تصور شریعت اسلامی کی رو سے قطعاً ناجائز اور حرام ہے۔(۱)

کرایہ کی ماں اور ہندوستان کا حال

عربی خبر رساں ادارے الجزیرہ کی رپورٹ کے مطابق بھارت میں غربت کی ماری عورتوں میں کوکھ کرائے پر دینے کا رجحان بڑھ رہا ہے، دوسری طرف بعض مَردوں نے بھی مالی فوائد کے لیے اپنی بیویوں کو آمدنی کا ذریعہ بنا رکھا ہے، بھارت کے طول وعرض میں سروگیٹ مائیں بنانے کے لیے نطفے کی مصنوعی افزودگی کی غرض سے ایک ہزار کلینکس (Clinics) قائم ہو چکے ہیں۔ بھارتی سروگیٹ ماؤں کا سب سے بڑا خریدار برطانیہ ہے، ایک رپورٹ کے مطابق بھارتی سروگیٹ ماوؤں کی کوکھ میں پلنے والے نصف سے زائد بچے برطانوی جوڑوں کے ہوتے ہیں، اسی لیے بھارت میں قائم ان کلینکس میں برطانوی ڈاکٹر بڑی تعداد میں موجود ہیں، تاہم بھارت میں یہ کام بغیر رجسٹریشن کے بھی ہو رہا ہے، بھارتی خواتین مصنوعی افزودگی کے لیے کوکھ کرائے پر دینے کے عوض 9 ہزار ڈالر وصول کرتی ہیں۔ یہ رقم ان کی ایک سال کی مزدوری سے کئی گنا زیادہ ہے جب کہ امریکا میں سروگیٹ مدر (Surrogate mother) کی فیس 70 ہزار ڈالر اور برطانیہ میں 40 ہزار پاونڈ ہے، مہنگی فیس سے بچنے کے لیے برطانوی جوڑے، بھارتی عورتوں کو ترجیح دیتے ہیں۔

ادھر برطانوی جریدے سنڈے ٹیلی گراف کے مطابق بھارت میں غربت اور بے روزگاری کے سبب سروگیٹ مائیں بننے کا رجحان زور پکڑ رہا ہے، بھارت کی 10 ریاستوں

---

(۱) متاع فکر ونظر: ۱۷۰تا ۱۷۶۔

میں خواتین کھیتوں میں دن بھر کام کرنے کے باوجود بڑی مشکل سے نصف ڈالر یومیہ اجرت کما پاتی ہیں، چناں چہ غربت سے تنگ بھارتی خواتین 9 ہزار کے بہ جائے 4 ہزار اور 3 ہزار ڈالر پر بھی دوسروں کے بچے پیدا کرنے کے لیے راضی ہو جاتی ہیں، یہ رویہ امیر ممالک کی جانب سے غریب ممالک کے استحصال کا کھلا ثبوت ہے، اب تک جن برطانوی مَردوں نے کرائے کی کوکھ سے بچے حاصل کئے ہیں، وہ تمام بینکر، ڈاکٹر اور اعلیٰ سرکاری عہدوں پر فائز تھے۔ اس سے صاف پتا چلتا ہے کہ یہ کام طبّی مجبوریوں سے زیادہ آسانی اور سہولت کے لیے کروایا جاتا ہے، بھارتی حکومت نے سروگیٹ ماں بننے کے بڑھتے رجحان کے باعث قوانین میں کچھ تبدیلیاں کی ہیں، ان قوانین کے مطابق بچے کی ولادت کے فوری بعد اس کی حوالگی پر پابندی عائد کر دی گئی ہے، بچہ جننے والی عورت پر لازم ہے کہ وہ بچے کو سات ہفتوں تک اپنے پاس رکھے گی۔ یہ قانون برطانوی شہریوں کے لیے کافی پریشان کن ہے۔ تاہم یہ کاروبار اب بھارت میں اتنے بڑے پیمانے پر پھیل چکا ہے کہ اس کی روک تھام یا اسے قانونی دائرے میں لانا آسان نہیں رہا، بھارت میں اس کام کے لیے مخصوص کلینکس کی انتظامیہ کے پاس ہزاروں ایسی خواتین کا اندراج ہے، جو سروگیٹ مائیں بننے کی خواہش مند ہیں۔ انسانی اسمگلنگ میں ملوث گروہ بھی اس صورت حال سے فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔ بھارت، جو انسانی تجارت کے حوالے سے دنیا میں پہلے نمبر پر تھا، اب سروگیٹ مائیں رکھنے والا بڑا ملک بننے والا ہے، غربت، بے روزگاری اور صنفی امتیاز مل کر بھارتی ناری کو دیمک کی طرح چاٹ رہے ہیں۔ (نوائے وقت)

مسلمانوں کے لئے لمحۂ فکریہ

ہندوستان کے مختلف شہروں میں بے سہارا لڑکیوں اور عورتوں کے لئے ''ناری نکیتن'' کے نام سے گورنمنٹ کے ادارے قائم ہیں، اس میں بے سہارا لڑکیوں اور عورتوں کی پرورش کی جاتی ہے، ان کی تعلیم وتربیت کا اہتمام ہوتا ہے اور ان کی شادیاں بھی کر دی جاتی

ہیں، جولڑ کے یہاں سے اپنے لئے رفیقۂ حیات کا انتخاب کرنا چاہتے ہیں، ان کو ادارہ کی طرف سے اس سلسلہ میں تعاون دیا جاتا ہے، اس میں مسلمان اور غیر مسلم کی کوئی تمیز نہیں ہوتی، اس کا نتیجہ ہے کہ بہت سی مسلمان لڑکیاں غیر مسلم لڑکوں سے بیاہ دی جاتی ہیں، بعض دفعہ تو یہ نوبت اس لئے آتی ہے کہ مسلمان لڑکے نکاح کے لئے تیار نہیں ہوتے اور وہ اپنی دینی بہنوں کو اٹھانا نہیں چاہتے، اور بعض دفعہ منتظمین کی طرف سے تعصب اور عدم تعاون کا مظاہرہ ہوتا ہے، اس موقع پر یہ بات بھی سامنے آئی کہ خود مسلمانوں کے ایسے ادارے نہیں ہیں یا کم ہیں، جو ایسی بے سہارا لڑکیوں اور عورتوں کے لئے سہارا بن سکیں، آج کل ایسے بے سہارا لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے ہندو تنظیمیں آشرم بنا رہی ہیں، یہاں لے جائے جانے والے بچے اپنی دین سے بھی محروم ہو جاتے ہیں، اسی طرح کے ادارے عیسائی تنظیمیں بھی قائم کر رہی ہیں، اور ان میں رہائش کا نتیجہ بھی یہی نکلتا ہے۔

یہ مسلمانوں کے لئے لمحۂ فکریہ ہے، اولاً تو قلب میں ایسی وسعت ہونی چاہئے کہ یتیم، لا وارث اور بے سہارا بچوں کو ہم اپنے گھروں میں جگہ دیں، ان کی کفالت اور پرورش کریں اور اپنی اولاد کی طرح ان کے ساتھ سلوک روا رکھیں۔

کرنے کے کام

آج ہمارے معاشرہ میں ایسے بے آسرا لوگوں کی تعداد بحمد اللہ بہت کم ہے، قدرتی آفات کے موقع پر ایسے لوگوں کی تعداد کچھ بڑھ جاتی ہے؛ لیکن عام حالات میں اس کی نوبت کم آتی ہے؛ اس لئے ہونا تو یہ چاہئے کہ ایسے یتیم اور نادار بچوں کو مختلف لوگ اپنی اپنی کفالت اور پرورش میں لے لیں، وہ انہیں باپ کی محبت اور ماں کی ممتا دیں اور انہیں محرومی کے احساس سے بچائیں، یہ اس مسئلہ کا سب سے بہتر حل ہے؛ کیوں کہ اس صورت میں انسان اپنے ساتھ خاندان کی قوت اور پشت پناہی محسوس کرتا ہے اور وہ بے سہارگی اور کس مپرسی کے احساس سے دو چار نہیں ہوتا؛ بشرطیکہ انہیں گھر کی نوکرانی اور خادمہ کی طرح نہیں رکھا

جائے ؛بلکہ بیٹی بنا کر رکھا جائے ۔

دوسرا ضروری کام یہ ہے کہ مسلمان ایسی لڑکیوں کے لئے خود ادارے قائم کریں ،اس میں یتیم بچیوں کے علاوہ نادار، لاوارث لڑکیاں اور بے سہارا مطلقہ و بیوہ خواتین کو بھی جگہ دی جائے ، جو تعلیم حاصل کرنے کے لائق ہوں ، ان کے لئے تعلیم اور ووکیشنل کورس(vocational course) کا بھی نظم ہو، مسلمانوں کے کچھ یتیم خانے گو مختلف شہروں میں موجود ہیں ؛مگر وہ ضرورت کے لحاظ سے بہت کم ہیں ، جو ہیں ان کا نظم ونسق بہت زیادہ قابل اصلاح اور لائق توجہ ہے ،خود یتیم خانہ کا لفظ بھی انسان کے جذبات کو ٹھیس پہنچاتا اور اس کے زخم کو کریدتا ہے ، اگر اس کے بجائے کوئی عمومی انداز کا نام رکھا جائے ، جو رہائشی سہولت کے مفہوم کو ظاہر کرتا ہو تو یہ نفسیاتی نقطۂ نظر سے زیادہ بہتر ہوگا ،یتیم خانوں میں رہنے سہنے کا معیار ایسا بنانا چاہئے کہ وہاں رہنے والے اپنے آپ کو اپنے گھر میں محسوس کریں اور لڑکیوں کے ہاسٹل میں ایسے خدا ترس اور انسانیت دوست ذمہ دار ہونے چاہئے ، جو شریعت کی حدود کو قائم رکھیں اور اجر وثواب کے نقطۂ نظر سے کام کرنے کا جذبہ رکھتے ہوں ۔

تیسری ضروری بات یہ ہے کہ بیوہ خواتین کے لئے خود روز گار اسکیمیں شروع کی جائیں ، بعض دفعہ مائیں اپنی نادانی اور کسمپرسی کی وجہ سے لڑکیوں کو سرکاری نیز ہندو اور عیسائی اداروں کے حوالہ کر دیتی ہیں ، اگر ان کے لئے ان کی صلاحیت کے لحاظ سے ووکیشنل کورس رکھے جائیں ، انہیں روز گار سے جوڑا جائے اور انہیں آپ اپنی پرورش کے لائق بنایا جائے تو وہ خود اپنی ایسی یتیم و نادار لڑکیوں کی پرورش کریں گی اور انہیں خاندان سے کٹ جانے کا احساس بھی نہ ہونے دیں گی ۔

اگر ہم مسلم سماج میں یتیم اور نادار لڑکیوں کی پرورش اور ان کی کفالت ونگہداشت کا جذبہ پیدا نہیں کر سکے ، ہم نے ان کی پرورش کے لئے ملی ادارے قائم نہیں کئے ، مسلمان نوجوانوں نے اپنی دینی بہنوں کے ایمان کو بچانے کے لئے ان سے نکاح کرنے کی

اہمیت کو نہیں سمجھا، اور بے سہارا خواتین کے لئے خود روزگاری کے مواقع فراہم نہیں کئے گئے تو غیر مسلم لڑکوں سے مسلمان لڑکیوں کے نکاح کے تکلیف دہ واقعات سامنے آتے رہیں گے، تقریروں، مضامین اور فتوؤں کے ذریعہ ان واقعات کو نہیں روکا جا سکتا، ان کو روکنے کے لئے منصوبہ بند کوشش اور متبادل انتظام کی ضرورت ہے، کیا ہماری دینی حمیت اور ملی غیرت ایسے وقعات پر کروٹ لینے کو تیار ہے؟(۱)

(۱) مینارۂ نور ۱۸/جنوری/۲۰۱۹ء از مولانا خالد سیف اللہ صاحب دامت برکاتہم۔

ہماری مسکراہٹ پر نہ جانا ۔۔۔ دیا تو قبر پر بھی جل رہا ہے
ہر وقت کا ہنسنا تجھے برباد نہ کر دے ۔۔۔ تنہائی کے لمحوں میں کبھی رو بھی لیا کر

۱۰ جنوری عالمی یومِ قہقہہ

World Laughter Day

مسکرانا، ہنسنا اور قہقہہ لگانا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کی مسکراہٹیں، مذاق کرنے کے احکام، ہنسی مذاق کے پروگرام کی شرعی حیثیت، شعائر کا مذاق، کثرت ضحک کے نقصانات، ہنسی کے پروگرام کا حکم، مسلم معاشرہ کی بے کاری وغیرہ تفصیلاً ہے۔

عالمی یومِ قہقہہ کا پس منظر

عالمی یومِ قہقہہ (world laughter) کا آغاز ڈاکٹر من کٹاریہ....... Dr کی جانب سے شروع کیا گیا، جو عالمگیر سطح پر لافٹر یوگا مومنٹ Laughter yoga movement (قہقہوں سے بھری یوگا تحریک کے) بانی ہیں تحریک کا دعویٰ ہے کہ یوم قہقہہ عالمی امن کا مثبت اظہار ہے اور اس کا مقصد عالمی بھائی چارے اور دوستی کا شعور پیدا کرنا ہے، اس کی مقبولیت قہقہوں والے یوگا کے ساتھ ساتھ کافی بڑھ گئی ہے، تاحال سو ممالک میں ۶۰۰۰ قہقہوں کے کلب بن چکے ہیں۔

پہلا عالمی یومِ قہقہہ اجتماع ۱۰؍جنوری ۱۹۹۸ء کو ممبئی میں منعقد ہوا تھا، اس میں مقامی اور بین الاقوامی قہقہوں کے کلبوں سے بارہ ہزار افراد شریک ہوئے اور ایک منفرد ہنسنے کا اجلاس منعقد ہوا۔

بھارت سے باہر پہلا عالمی یومِ قہقہہ اجتماع کا نام ہیپی ڈیمک (happy demic) تھا۔ یہ سال ۲۰۰۰ء میں کوپن ہیگن، ڈنمارک میں منعقد ہوا جس میں ٹاؤن ہال اسکوائر میں ۱۰۰۰۰ (دس ہزار) افراد جمع ہوئے تھے، کثرتِ تعداد کی وجہ سے اس تقریب کو گینز بک آف ورلڈ ریکارڈ Genius book of world Record میں جگہ ملی تھی۔

اسلام اعتدال پسند مذہب ہے

اسلام ایک اعتدال پسند مذہب ہے اس میں نہ زیادہ سختی ہے کہ اس پر عمل کرنا دشوار ہو اور نہ زیادہ چھوٹ ہے کہ اس کو ہلکا سمجھ کر اس پر عمل کرنا ہی چھوڑ دے، دیگر مذاہب کے مقابلے میں اسلام کے اندر ہر چیز کی رعایت کی گئی ہے، بلکہ اخلاقی حدود میں رہ کر کھیل کود خوش مزاجی کی نہ صرف اجازت ہے بلکہ بعض اوقات میں بعض مفید کھیلوں کی حوصلہ افزائی بھی کی گئی ہے، وجہ یہ ہے کہ اسلام سستی اور کاہلی کو پسند نہیں کرتا، بلکہ چستی اور خوش طبعی کو پسند کرتا ہے، بلکہ اسلام خود کہتا ہے کہ اگر طبیعت میں سستی پیدا ہوجائے تو اس کی تفریح کے لئے حکیمانہ طریقے تلاش کیا کرو۔

ہنسی چونکہ انہی طریقوں میں سے ایک طریقہ ہے اس کے ذریعہ سے بھی طبیعت میں ایک طرح کی تازگی ملتی ہے، مگر اب یہ فعل معاشرہ میں ایک فن کی حیثیت لے لیا ہے، تو ٹی وی چینلوں پر بھی چند مخصوص چینل اس کے لئے خاص ہیں جس پر ہنسانے کا پروگرام انجام دیا جاتا ہے اور عوام کو یہ باور کرانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ زندگی صرف ہنسنے کے لئے ہے اور ایک عام آدمی اس کے ذریعہ سے اپنے جذبات اور حسیات کو جو کہ ایک اہم طاقت ہیں ہنسی کے ذریعہ دبا دیتا ہے، یہی وجہ ہے کہ کثرتِ ضحک کو اسلام میں احساسات ایک طرح کا گھٹیا عمل قرار دیا گیا ہے۔

تفریح کیا ہے؟

تفریح کا لفظ دراصل عربی زبان کا لفظ ہے جو "فرح" سے مشتق ہے جس کے معنی گپ شپ، دل لگی، ہنسی مذاق، خوشی و مسرت، فرحت اور اطمینان وغیرہ حاصل کرنے کے آتے ہیں، فرح کے بارے میں علامہ ابن قیم رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں : کہ محبوب چیز کے پالینے سے جو لذت حاصل ہوتی ہے، اسی کو فرحت اور خوشی کہتے ہیں۔ "الفرح لذة تقع في القلب بإدراك المحبوب" (۱)

اگر یہ فرحت محض قلبی ہو اور احساس نعمت یعنی شکر گذاری سے تعبیر ہو اور اس کے فضل و کرم کے استحضار پر مبنی ہو تو وہ شرعاً مطلوب، مستحسن اور پسندیدہ ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا (۲) "آپ کہہ دیجیے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے فضل اور مہربانی سے ہے، تو چاہیے کہ وہ لوگ خوش ہوں۔" دوسری جگہ ارشاد ہے: [فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰهُمُ

---

(۱) التفسير [illegible]: ۳۱۔

(۲) یونس: ۵۸۔

اللّٰہُ مِنْ فَضْلِہٖ] (۱) ” جنتی لوگ خوش ہوں گے، ان نعمتوں پر جو اللہ نے انھیں اپنے فضل سے عطا کی ہیں“۔

آنحضرت ﷺ سے ایک روایت منقول کی جاتی ہے کہ رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا: کہ دلوں کو وقتاً فوقتاً خوش کرتے رہا کرو۔ "رَوِّحُوا الْقُلُوْبَ سَاعَةً"(۲)

کسی دانا کا حکمت بھرقول ہے کہ: دل اسی طرح اکتانے لگتا ہے، جیسے بدن تھک جاتے ہیں، لہٰذا اس کی تفریح کے لیے حکیمانہ طریقے تلاش کیا کرو“۔ ”القلوب تمل کما تمل الأبدان فابتغوا لها طرائف الحكمة“

مسکرانے کے فائدے

جب انسان مسکراتا ہے تو اس کے چہرے کے ۵ تا ۱۳ اعضلات حرکت میں آتے ہیں اور جب انسان غصے یا کبیدگی یا پریشانی کی حالت میں ہوتا ہے تو اس کے چہرے کے ۴۷ عضلاعت متحرک ہوتے ہیں۔

صحت بخش مسکراہٹ، بلڈ پریشر کم کرنے میں معاون بنتی ہے۔

مسکراہٹ دوران خون تیز کرتی ہے۔

مسکراہٹ، ذہنی وسماجی دباؤ کیخلاف جسم میں مدافعتی نظام کو تقویت پہنچاتی ہے۔

مسکراہٹ کی بدولت دل، دماغ اور جسم کی کارکردگی پر خوشگوار اثر پڑتے ہیں۔

مسکرانے والے انسان کی نبض متوازن شکل میں چلتی ہے۔

مسکراہٹ، انسان کے لاشعور تک سکون اور اطمینان کی لہر پہنچادیتی ہے۔

مسکراہٹ، چہرے کو خوبصورت اور پر رونق بنادیتی ہے۔

---

(۱) آل عمران: ۱۷۰۔

(۲) السلسلة الضعیفة والموضوعة: ۸/ ۱۳۶، البانی نے اس حدیث کو ضعیف کہا ہے۔

مسکراہٹ ایک طرح سے عصری امراض سے بچاؤ کا بہترین علاج ہے۔
مسکراہٹ، بے چینی اور ڈپریشن سے تحفظ دیتی ہے۔
مسکراہٹ، مختلف قسم کے درد کا علاج ہے۔
مسکراہٹ، بے خوابی اور بے چینی پر قابو پالیتی ہے۔

مسکراہٹ اور ہنسی میں فرق

مسکراہٹ دائمی کیفیت کا نام ہے مسکراہٹ، خوشی پر فطری ردعمل کا دوسرا نام ہے جبکہ ہنسی بسا اوقات دردناک حادثے پر ردعمل کا بھی نتیجہ ہوتی ہے۔

مسکراہٹ اندرونی خوشی اور سکون کی علامت ہوتی ہے جبکہ ہنسی کسی ہنگامی ناگہانی حالت کا نتیجہ ہوتی ہے۔

مسکراہٹ کا اثر دیر تک باقی رہتا ہے جبکہ ہنسی کا اثر جلد زائل ہو جاتا ہے۔

مسکراہٹ تواضع وانکساری کی دلیل ہے جبکہ ہنسی اگر قہقہے کے ساتھ ہو تو غرور کی نشانی مانی جاتی ہے۔

مسکراہٹ ہنسی سے زیادہ مشکل کام ہے، مسکراہٹ مختلف قسم کے لوگوں، مختلف طبیعتوں اور مختلف المزاج افراد سے میل ملاپ کے وقت آتی ہے۔ جبکہ ہنسی انتہائی بے تکلف قسم کے لوگوں کے ساتھ ہی نمودار ہوتی ہے۔

مسکراہٹ میں ایک ادب شامل ہوتا ہے جبکہ ہنسی ادب کے دائرے سے خارج بھی ہو جاتی ہے۔ اچھی مسکراہٹ صحت بخش ہوتی ہے۔ یہ انسان کی ذہنی، جسمانی اور اعصابی صحت کی حفاظت کرتی ہے۔(۱)

اطباء کہتے ہیں کہ مسکراہٹ اور ہلکی پھلکی ہنسی، صنفی صلاحیت کو بہتر بناتی ہے۔

---

(۱) اردو نیوز: ۲۴، جنوری ۲۰۱۸ء۔

شریانوں کے تناؤ کو ہلکا کرتی ہے، نبض کی رفتار کو درست کر دیتی ہے، عضلات کو آرام دہ حالت میں لے آتی ہے، ہم میں سے کون شخص ہے جو یہ آرزو نہ کرتا ہو کہ وہ کچھ دیئے بغیر ہر روز مالی صدقے کا ثواب حاصل کر لے؟ پیغمبر اسلام محمد مصطفی ﷺ نے ہمیں جیب سے کچھ خرچ کئے بغیر مالی صدقے کے ثواب کا طریقہ سکھایا ہے، اگر آپ اپنے بھائی یا دوست کو دیکھ کر مسکراہٹ سے پیش آئیں گے تو ایسا کرنے سے تمہیں صدقے جیسا ثواب ملے گا، یہ صدقہ ایسا ہے جس میں آپ کا نہ کوئی دینار خرچ ہو رہا ہے اور نہ آپ کی جیب سے کوئی درہم جا رہا ہے اگر آپ اسے استعمال کرنے کا طریقہ جان لیں، سمجھ لیں تو دنیا بھر کے لوگوں کے دل جیت سکتے ہیں اور پھر دعوت الی اللہ کا فریضہ انجام دیکر کائنات کا نقشہ بدل سکتے ہیں۔

معتدل ہنسی کے فوائد

ہنسنے سے ہمارا بلڈ سرکولیشن ٹھیک رہتا ہے، بلڈ سرکولیشن Blood circulation ٹھیک رہنے سے ہم بیماریوں سے بچ سکتے ہیں، ہنسنے سے ہمارا ایمون سسٹم Immune system مضبوط ہوتا ہے، Immune system مضبوط ہوگا تو ہم کم بیمار پڑیں گے، میڈیکل سائنس کے مطابق ہنسنے کے دوران ہمارے جسم میں اینٹی وائرل خلیات تیزی سے بنتی ہے اور ہمارا Immunity system مضبوط ہوتا ہے۔

کئی لوگ باڈی پین (پٹھوں کے درد) کی وجہ سے پریشان رہتے ہیں ہنسنے سے درد میں کمی ملتی ہے، متاثرہ فرد کو درد سے راحت دلانے کے لیے ڈاکٹر لافینگ تھراپی Dr lifeing therapy کا استعمال کرتے ہیں. میڈیکل تجربے میں پایا گیا ہے کہ 10 منٹ تک ہنستے رہنے سے دو گھنٹے گہری نیند آتی ہے۔

قہقہے لگانے کے نقصانات

طب کی دنیا میں کی جانے والی ایک نئی تحقیق میں بتایا گیا ہے کہ ہنسی کے فوائد سب کے

لیے یکساں نہیں ہو سکتے، اوکسفرڈ یونیورسٹی Oxford university سے وابستہ محققین نے مریضوں پر ہنسی کے مثبت اثرات کا جائزہ لینے کے بعد بتایا ہے کہ ہنسی کو ایک بہترین دوا سمجھنے والوں کو اس بات سے حیرانی ہو سکتی ہے کہ ہنسنا سو فی صد فائدہ مند نہیں ہے بلکہ اچانک ہنسی کا دورہ صحت کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے، اس سے دل پھٹ سکتا ہے یا دمے کا دورہ اور بے ہوشی طاری ہو سکتی ہے، برٹش میڈیکل جرنل کی کرسمس کی خصوصی اشاعت میں ہنسنے کے فوائد اور نقصانات کا جائزہ لینے کے حوالے سے ایک سائنسی رپورٹ پیش کی گئی ہے۔

سائنس دانوں کو مریضوں پر کیے جانے والے ایک تجربے سے پتا چلا ہے کہ اچانک قہقہے لگانے کی وجہ سے نرخرایا دل پھٹ سکتا ہے، اور اس دوران تیزی سے سانس لینے کے باعث دمے کا دورہ پڑ سکتا بھی ہے، اس کے علاوہ دیگر نقصانات میں ہرنیا، درد شقیقہ کا بڑھنا یا جبڑے کی ہڈی کا اتر جانا شامل ہیں۔

نبی اور صحابہ کی مسکراہٹیں

دین سے وابستہ لوگوں اور دینی پیشواؤں کا م نام آتے ہی عموما کسی خشک مزاج شخصیت کا خاکہ ذہن میں آتا ہے جس کے چہرے پر کسی نے مسکراہٹ دیکھی ہو، نہ وہ ہنستا ہو، نہ کسی کے ساتھ گھلتا ملتا ہو، لیکن رہبر کامل صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ان چیزوں سے پاک تھی، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے صحابہ کے ساتھ گھل مل کر رہتے تھے، ہلکا پھلکا مزاح بھی فرمالیا کرتے تھے، عظیم کارنامے انجام دینے والی شخصیت کے لیے یہ ایک لازمی وصف ہے کہ وہ فرائض حیات کے بوجھ کو اپنے تبسم سے گوارا بنا دے اور ساتھیوں کے دلوں میں گھر کرلے، چنانچہ چہرہ مبارک پر ایک مسکراہٹ رہتی تھی، توازن و اعتدال کے ساتھ مزاح فرماتے تھے اور مجلس میں شگفتگی کی فضا پیدا کر دیتے لیکن مزاح کا رنگ آٹے میں نمک کی طرح ہلکا رہتا اور اس میں بھی نہ تو خلاف حق کوئی بات شامل ہوتی، نہ کسی کی دلآزاری کی جاتی، نہ ٹھٹھے لگا کر ہنسنا معمول تھا،

غنچوں کا سا تبسم ہوتا جس میں زیادہ سے زیادہ دانتوں کے کیلے دکھائی دیتے، حلق نظر نہ آتا، عبداللہ بن حارث رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: میں نے رسول ﷺ سے زیادہ کسی کو مسکراتے نہیں دیکھا۔ "ما رأیت أحداً أکثرَ تَبسماً مِن رَسولُ اللهِ صَلی اللهِ عِلیهِ وسَلَّم"(۱)

سیرتِ طیبہ اور احادیثِ نبویہ ﷺ کے مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ اکثر تبسم فرمایا کرتے جس سے غم زدوں، بےکسوں، بے بسوں اور بے نواوں کو تسکین و راحت ملتی اور روتوں، گریہ زاری کرنے والوں اور اشک باروں کو فرحت و تازگی کا احساس ہوتا اور وہ اپنا رنج و غم سب بھول جایا کرتے تھے۔

امام ترمذی نے حارث بن جزءؓ سے روایت کیا ہے: حضرت حارث نے کہا کہ میں نے حضور اکرم ﷺ سے زیادہ کسی کو مسکراتے ہوئے نہیں دیکھا۔ "ما رایت احداً اکثر تبسماً من رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم و فی روایۃ ما کان ضحک رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم الا تبسماً۔(۲)

حضور ﷺ کا مزاح

☆ سیدنا نعمان بن بشیر سے روایت ہے کہ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ رسول ﷺ کے گھر میں داخل ہونے کی اجازت چاہی، اسی درمیان آپ کو گھریلو معاملات میں عائشہ رضی اللہ عنہا کی آواز بلند محسوس ہوئی، جب آپ گھر میں داخل ہوئے تو سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی طرف مارنے کے لیے لپکے اور اپنی بیٹی عائشہ کو تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا: کیا میں تمہیں رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے اونچی آواز میں گفتگو کرتے ہوئے نہیں دیکھ رہا ہوں؟! یہ دیکھ

---

(۱) سنن ترمذی کتاب المناقب عن رسول اللہ باب فی بشاشۃ النبی صلی اللہ علیہ وعلی آلہ وسلم، رقم الحدیث: ۳۶۴۱ هذا حديث غريب

(۲) ترمذی شریف، حدیث: ۳۶۴۲ هذا حديث صحيح غريب لا نعرفه من حديث ليث بن سعد إلا من هذا الوجه

کر رسول اللہ ﷺ عائشہ کو ان کے والد کی مار سے بچانے کی کوشش کرنے لگے، اسی دوران ابوبکر رضی اللہ عنہ غصہ کی حالت میں گھر سے نکل گئے، ابوبکرؓ کو نکلتے دیکھ کر رسول اللہ ﷺ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا : کیا خیال ہے؟ میں نے تمہیں اس شخص سے بچایا کہ نہیں؟ راوی کہتے ہیں کہ ابوبکرؓ کچھ دنوں تک ناراض رہے، پھر رسول اللہ ﷺ کے یہاں حاضر ہو کر اندر آنے کی اجازت چاہی، گھر جا کر محسوس کیا کہ آپ اور عائشہ رضی اللہ عنہا کے مابین صلح ہو چکی ہے، تو آپ نے فرمایا کہ : ''آپ دونوں مجھے اپنی صلح میں شامل کر لیجیے، جس طرح آپ دونوں نے مجھے اپنے جھگڑے میں شامل کیا تھا، تو آپ نے فرمایا کہ : جی ہاں آپ کو صلح میں شامل کر لیا۔(۱)

(اس حدیث میں ابوّت کے رشتہ کے حامل بزرگ جناب ابوبکر رضی اللہ عنہ کو محض (الرجل) کہنے سے جو مزاح پیدا ہوتا ہے، اسے کوئی بھی شخص محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا)۔

مذکورہ احادیث سے معلوم ہوا کہ آداب کی رعایت کرتے ہوئے کبھی کبھی مزاح کی نہ صرف گنجائش ہے، بلکہ مستحسن ہے اور اسوہ نبوی کی اتباع ہے، لیکن اگر مزاح دوسرے آدمی کے لیے ناگواری اور اذیت کا باعث بن جائے، یا حد سے زیادہ ہنسی کا ذریعہ بن جائے یا مزاح کا عمل کبھی کبھار کے بجائے کثرت سے ہونے لگے، تو ایسے مزاح کی ممانعت ہوگی اور اس کی حوصلہ شکنی کی جائے گی۔

☆ حضرت عمرہ بنت عبدالرحمن رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے دریافت کیا کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم گھر تشریف لاتے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقۂ کار کیا تھا؟ آپ نے فرمایا : آپ کا سلوک عام لوگوں کے سلوک کی طرح تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سب سے زیادہ کریم الاخلاق تھے ہنستے بھی تھے مسکراتے بھی تھے

(۱) سنن ابی داوٗد، باب فی المزاح، حدیث: ۴۹۹۹۔

"اکرم الناس خلقاً کان ضاحکا بساماً"۔(۱)

حضرت حبشی بن جنادہ رضی اللہ عنہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں فرماتے ہیں کہ: حضور صلی اللہ علیہ وسلم تمام مخلوق سے بڑھ کر خوش طبع تھے "کان افکہ الناس خلقاً"۔(۲)

☆ حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: "حضور ﷺ کی ہنسی صرف تبسم ہوا کرتی تھی۔" حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ: "میں نے کبھی ایسا نہیں دیکھا کہ آقا ﷺ نے سب کے ساتھ ہنسی مذاق کیا ہو آپ عام لوگوں کی طرح دوسروں کے ساتھ ناشائستہ ہنسی مذاق نہیں فرماتے تھے، صحابہ آپ کی مجلس میں ایسی سنجیدگی و متانت سے بیٹھتے کہ گویا ان کے سروں پر پرندے بیٹھے ہوں۔"

☆ حضرت ابو ذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بے شک میں اس شخص کو جانتا ہوں جو سب سے پہلے جنت میں داخل ہوگا اور اس شخص کو بھی جو سب سے آخر میں جہنم سے نکلے گا، جسے قیامت کے دن لایا جائے گا اور کہا جائے گا "اس کے چھوٹے گناہ اس پر پیش کرو" اور اس کے بڑے گناہ اس سے اوجھل رکھ کر کہا جائے گا "فلاں دن تو نے فلاں فلاں کام کیا تھا نا؟" وہ اقرار کرے گا اور انکار نہیں کر سکے گا اور بڑے گناہوں کے پیش کیسے جانے سے ڈر رہا ہو گا، پھر حکم ہو گا "ہر گناہ کے بدلے میں اسے ایک نیکی دے دو" اس پر وہ بول اٹھے گا "ابھی تو میرے اور گناہ بھی باقی ہیں جنہیں میں یہاں دیکھ ہی نہیں رہا، ابو ذر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ یہ بات بیان فرماتے ہوئے رسول اللہ ﷺ ہنس پڑے یہاں تک سامنے والے نوکیلے درمیانی دو دانتوں کے دائیں بائیں والے دانت مبارک نُمایاں ہو گئے۔" فلقد رأیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

(۱) کتاب السنۃ، حدیث: ۸۹۳۔

(۲) صحیح بخاری: ۶۲۰۳۔

ضحك حتی بدت نواجذه"(۱)

☆ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وعلی آلہ وسلم اپنے عظیم الشان مقام کے باوجود صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مزاح فرمالیتے تھے ان کی یہ مبارک اور مہربان عادت دیکھ کر ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو تعجب ہوا تو عرض کیا: یارسول الله إنك تداعبنا: اے اللہ کے رسول آپ ہمارے ساتھ مزاح بھی فرماتے ہیں؟ تو اِرشاد فرمایا: "نعم غير أني لا أقول إلا حقاً" جی ہاں! میں مذاق کرتا ہوں، لیکن میں حق بات کے علاوہ کچھ اور نہیں کہتا"۔(۲)

☆ حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سواری مانگی، تو (مزاحاً) اِرشاد فرمایا: "إني حاملك على ولد ناقة" میں تمہیں اونٹنی کے بچے پر سوار کروں گا"، تو اس شخص نے کہا: اے اللہ رسول! اونٹنی کے بچے کو لے کر میں کیا کروں گا؟۔ "يا رسول الله ما أصنع بولد الناقة"؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وعلی آلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ہر اونٹ کسی اونٹنی کا بچہ ہی تو ہوتا ہے۔ "وهل تلد الإبل إلا النّوق؟(۳)

☆ حضرت حسن رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک بوڑھی عورت نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئی اور کہنے لگی "اے اللہ کے رسول! دعا کیجیے کہ اللہ مجھے جنت میں داخل کر دے" تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اے فلاں کی ماں! جنت میں تو کوئی بوڑھی عورت داخل نہیں ہوگی۔"يا أم فلان إن الجنة لا تدخلها عجوز" وہ یہ سن کر رونے لگیں، تو نبی صلی اللہ علیہ وعلی آلہ وسلم نے حاضرین سے فرمایا: "أخبروها أنها لا تدخلها وهي عجوز إن الله تعالى يقول: إنا أنشأناهن إنشاء فجعلناهن أبكارا عربا أترابا" اسے بتاؤ کہ وہ اس حال میں جنت میں نہیں جائے گی کہ وہ بوڑھی ہو یعنی اللہ تعالیٰ جنتی عورتوں کو جوان کر کے اس میں داخل کرے گا، اللہ

---

(۱) کتاب السنۃ، حدیث: ۸۹۳۔

(۲) سنن ترمذی کتاب البر والصلۃ عن رسول اللہ باب ماجاء فی المزاح، حدیث: ۱۹۹۰۔

(۳) کتاب السنۃ، حدیث: ۸۹۳۔

تعالیٰ فرماتا ہے، بے شک ہم نے ان عورتوں کو خاص طور پر پیدا کیا اور پھر انہیں کنواریاں ہم عمر بنایا۔"(۱)

☆ ایک دیہاتی صحابی حضرت زاہر بن حرام رضی اللہ عنہ سرکارِ دوعالم ﷺ کی خدمتِ اقدس میں دیہات کی چیزیں بہ طورِ تحفہ لایا کرتے تھے، آقا ﷺ ان کو شہر کی چیزیں تحفہ دیا کرتے تھے، وہ اگرچہ زیادہ خوش شکل نہیں تھے مگر حضورِ ﷺ ان سے بہت زیادہ محبت فرماتے، ایک دن وہ بازار میں بیٹھے کچھ سامان بیچ رہے تھے، سرکارِ دوعالم ﷺ نے پیچھے سے آکر آنکھوں پر اپنا دستِ مبارک رکھ دیا اور فرمایا: "اس غلام کو کون خریدتا ہے؟" من یشتری ھٰذا العبدَ؟

☆ مزاح کا یہ انداز کتنا دل کش، حسین وجمیل اور جود وعطا والا ہے کہ سرکارِ دوعالم ﷺ اپنے صحابی حضرت زاہر (رضی اللہ عنہ) سے خوش طبعی تو فرمارہے ہیں ساتھ ساتھ اُن کی قسمت بھی چمکا رہے ہیں انہیں خود اپنی زبانِ نبوت سے "غلام" کہہ کر پکار رہے ہیں۔(۲)

☆ حضرت محمود بن ربیع انصاری خزرجی رضی اللہ عنہ پانچ سال کے تھے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے گھر تشریف لے گئے ان کے گھر میں ایک کنواں تھا جس سے حضور ﷺ نے پانی نوش فرمایا اور خوش طبعی کے طور پر پانی کی ایک کلّی حضرت محمود بن ربیع رضی اللہ عنہ کے چہرے پر ماری۔ "أَنَّهُ عَقِلَ مَجَّةً مَجَّهَا رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي وَجْهِهِ مِنْ دَلْوٍ مُعَلَّقٍ فِي بِئْرِهِمْ" (۳)

☆ حضرت صہیب رومی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے آپ فرماتے ہیں کہ میں ایک دن بارگاہِ رسالت مآب ﷺ میں حاضر ہوا، جب حضور ﷺ قبا میں تشریف فرما تھے۔ وہاں پکی

---

(۱) کتاب السنۃ، حدیث: ۸۹۳۔

(۲) صحیح ابن حبان: باب المزاح والضحک، حدیث ۵۷۹۰:

(۳) کتاب السنۃ، حدیث: ۹۲ محدثین کرام علیہم الرحمۃ فرماتے ہیں کہ اس کی برکت سے ان کو وہ حافظہ حاصل ہوا کہ آپ ﷺ کے اس قصہ کو یاد رکھے اور اس واقعہ کی وجہ سے صحابہ میں شمار ہوئے۔

ہوئی اور نیم پختہ کھجوریں رکھی تھیں، میری ایک آنکھ دکھتی تھی میں نے کھانے کے لیے ایک کھجور اُٹھالی۔سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تم کھجور کھارہے ہو حال آنکہ تمہاری آنکھ دکھتی ہے؟"اتا کل التمر علیٰ عینیک و انت رمِد" میں نے عرض کی: یارسول اللہ! میں اپنی صحیح آنکھ کی طرف سے کھا رہا ہوں۔حضور(ﷺ) ہنس پڑے۔ فقال النبي صلى الله عليه وسلم ،تأكل تمرا وبك رمد؟ قال، فقلت :إني أمضغ من ناحية أخرى، فتبسم رسول الله صلى الله عليه وسلم"(۱)

☆امام بخاری نے حضرت سفینہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ایک سفر میں مجاہدین کے ساتھ جو بوجھ تھا وہ بہت گراں محسوس ہونے لگا سرکارِ دوعالم ﷺ نے مجھے فرمایا: تم اپنی چادر بچھاؤ، چنانچہ انہوں اپنا بوجھ اس میں ڈال دیا،رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا: اسے اٹھالو تم تو کشتی ہو،"اِحمِل فَاَنتَ سَفِینَۃ"یعنی کشتی میں سارا بوجھ سما جاتا ہے اور وہ اٹھالیتی ہے۔

حضرت سفینہ رضی اللہ عنہ کے نام کو ذومعنی انداز میں ارشادفرما کر سرکارِ دوعالم ﷺ نے اپنے جاں نثار صحابی سے جو خوش طبعی فرمائی،اس سے صحابیِ رسول حضرت سفینہ رضی اللہ عنہ کا ایمان پختہ ہوجاتا ہے اور وہ ﷺ وجد وسرور میں کہہ اُٹھتے ہیں کہ: جب آقا ﷺ نے مجھے"کشتی" فرمایا تو اس کے بعد سات اونٹوں کے بوجھ مجھ پر لاد دیا جاتا تو وہ مجھے بھاری نہ معلوم ہوتا۔(۲) اس دن سے آپ کا یہ لقب اتنا مشہور ہوگیا کہ لوگ آپ کا اصلی نام ہی بھول گئے،لوگ ان کا اصلی نام پوچھتے تو یہ فرماتے تھے کہ میں نہیں بتاؤں گا،میرا نام رسول اللہ ﷺ نے"سفینہ" رکھ دیا ہے اب میں اس نام کو کبھی ہرگز نہیں بدلوں گا۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر سرکارِ دوعالم ﷺ کے اخلاقِ حسنہ میں تواضع اور خوش طبعی نہ ہوتی تو

---

(۱) سنن ابن ماجہ : کتاب الطب، باب الحمیۃ،حدیث: ۳۴۴۳۔

(۲) اسد الغابہ، ج ۲،ص ۳۲۴۔

کسی میں یہ قدرت وطاقت نہ ہوتی کہ آپ کی خدمت میں بیٹھے یا آپ سے کلام کرسکے کیونکہ آپ کی ذاتِ اقدس میں انتہائی درجہ کارعب وجلال اورشوکت ودبدبہ تھا۔

☆ حضرت قتادہؒ کا بیان ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے کسی نے پوچھا کہ کیا رسول اللہ ﷺ کے صحابہؓ بھی ہنسا کرتے تھے؟ انہوں نے فرمایا، ہاں بے شک، وہ حضرات ہنسنے کے موقع پر ہنستے بھی تھے لیکن اس وقت بھی ان کے قلوب میں ایمان پہاڑ سے زیادہ عظیم ہوتا تھا، اور بلال بن سعد کا بیان ہے کہ میں نے صحابہؓ کو دیکھا ہے وہ مقررہ نشانوں کے درمیان دوڑا بھی کرتے تھے جس طرح بچے اور نوجوان کھیل اور مشق کے لئے دوڑ میں مقابلہ کیا کرتے ہیں، اور ایک دوسرے کو ہنستے ہنساتے بھی تھے پھر جب رات ہوتی تو بس درویش ہوجاتے۔(۱) علامہ اقبالؒ نے انہیں مقدس ہستیوں کے بارے میں کہا تھا:

؎ ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

☆ حضرت انس سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ان کو یا ذا الأذنین کہہ کر پکارتے تھے۔(۲)) یہاں پر بھی ایک تو مزاح مقصود ہے اور دوسرے اس بات پر توجہ دلانا ہے کہ اللہ نے دو وکان اس لئے دئے ہیں کہ کسی بھی بات کو بغور سنا جائے۔

☆ ام ایمن نامی ایک عورت خدمت اقدس ﷺ میں حاضر ہوئی اور کہنے لگی : اے اللہ کے رسول ﷺ! میرے شوہر آپ کو بلاتے ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا : کون وہی جن کے آنکھ میں سفیدی ہے؟ اس نے کہا : اللہ کی قسم ان کی آنکھ میں تو سفیدی نہیں ہے، آپ ﷺ نے فرمایا : کیوں نہیں ان کے آنکھ میں تو سفیدی ہے، اس عورت نے کہا : نہیں اللہ کی قسم ان کے آنکھ میں سفیدی نہیں ہے، تو آپ ﷺ نے فرمایا : بھائی کوئی ایسا ہوتا

(۱) مسنون معاشرت: ۲/ ۱۷۷

(۲) ابوداؤد : باب ماجاء فی المزاح، حدیث ۵۰۰۲ :

ہی نہیں جس کی آنکھ میں سفیدی نہ ہوتی ہو "ما من أحد الاّ و بعینه بیاض" (۱) یہاں پر بھی آپ ﷺ نے لطیف مزاح فرمایا جس کو وہ عورت نہ سمجھ سکی اور اس نے اس کو حقیقت پر محمول کیا کہ آپ اس کے شوہر کی کسی آنکھ کی کمی کی طرف اشارہ کررہے ہیں؛ حالانکہ آپ ﷺ وہی سفیدی مراد لے رہے تھے جو ہر کے ایک آنکھ میں ہوتی ہے۔

صحابہ کے مزاح کے واقعات

مزاح ایک فطری جذبہ ہے انسان سے اس کا صدور مذموم اور قبیح نہیں بلکہ ممدوح اور مقصود ہے اس کا صدور انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام سے بھی ہوا ہے صحابہ کرام سے بھی اور اولیائے کرام سے بھی۔

☆ حضراتِ صحابہ بھی اس قسم کا مزاح فرمایا کرتے تھے، حضرتِ عوف بن مالک اشجعی کو پتہ تھا کہ آپ ﷺ لطیف اور حقیقت پر مبنی مزاح کو منع نہیں کرتے اور نہ اس کو اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں، ایک دفعہ کا واقعہ بیان کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ میں غزوۂ تبوک کے موقع سے رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا، آپ ﷺ چمڑے سے بنے ہوئے ایک چھوٹے سے قبہ میں تشریف فرما تھے، میں نے وہاں آکر آپ کو سلام کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: اندر آجاؤ، میں نے کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ! پورا کا پورا آجاؤں، تو آپ ﷺ نے فرمایا: پورے آجاؤ "أکلّی یارسول اللہ، قال: کلّک" تو میں اندر چلا گیا۔ (۲)

جگہ کی قلت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ان صحابی رضی اللہ عنہ نے جس محبت کے ساتھ مزاح کیا رسول اللہ ﷺ نے کمالِ اخلاق مندی سے انہیں کے مزاحیانہ اسلوب میں جواب دیا۔

☆ حضرت بکر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ کے بعض اصحاب

(۱) الشفا ۲: /۱۸۸

(۲) ابوداؤد: باب ماجاء فی المزاح، حدیث ۵۰۰۲:۔

خربوز کی قاشیں ایک دوسرے پر پھینکتے ،یہ ایک طرح کا تفریحی کام تھا؛لیکن جب کوئی مسئلہ تحقیق طلب ہوتا تو یہی لوگ جو آپس میں ہنسی مذاق کرتے مردانِ کار ہوتے تھے ”یتبادحون بالبطّیخ فاذا کانت الحقائق کانو اھم الرجال“(۱)

☆ ایک مرتبہ حضرت ابوبکر صدیقؓ ،فاروق اعظمؓ اور علی مرتضیٰؓ ایک دوسرے کے گلے میں ہاتھ ڈالے اس طرح چلے جارہے تھے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ بیچ میں تھے اور دونوں حضرات دونوں طرف ،حضرت علیؓ ان دونوں کے مقابلہ میں کچھ پستہ قد تھے،حضرت عمرؓ نے مزاحاً فرمایا :”علیٌّ بیننا کالنون فی لنا“ یعنی علی ہم دونوں کے بیچ میں ایسے ہیں جیسے ”لنا“ کے درمیان نون ہے یعنی لنا کے ایک طرف کا لام اور دوسری طرف کا الف لمبے اور درمیان کا نون پستہ قد ہے اس طرح ہم دونوں طویل القامت اور بیچ میں علیؓ پستہ قامت ہیں، اس پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے برجستہ جواب دیا :”لو لا کنت بینکما لکنتما لا“ یعنی ”اگر میں تمہارے درمیان نہ ہوتا تو تم ”لا“ ہوجاتے اور کچھ بھی نہ رہتے“ کیونکہ لنا کے بیچ سے نون ہٹادیا جائے تو وہ ”لا“ رہ جاتا ہے۔

☆ حضرت غوثِ اعظم پیرانِ پیر شیخ عبدالقادر جیلانی کی جلالتِ شان سے کون ناواقف ہے؟کسی نے آپ کو ایک بہت ہی قیمتی چینی آئینہ ہدیتہً دیا تھا حضرت کبھی کبھی اس میں اپنا چہرہ دیکھ لیا کرتے تھے اتفاقاً وہ آئینہ خادم کے ہاتھ سے گر کر ٹوٹ گیا اس کو بڑا ہی ڈر ہوا کہ حضرت عتاب فرمائیں گے اس نے ڈرتے ڈرتے حضرت سے عرض کیا از قضاء آئینۂ چینی شکست (قضاء وقدر کی وجہ سے وہ چینی آئینہ ٹوٹ گیا) تو حضرت نے یہ سن کر فی البدیہ فرمایا خوب شد اسبابِ خود بینی شکست (اچھا ہوا کہ خود بینی کا ذریعہ اور سبب ٹوٹ گیا)(۲)

الغرض مزاح ایک سنتِ مستحبہ ہے جو لوگ اسے اپنی وقار اور شان کے خلاف سمجھتے

---

(۱) الأدب المفرد :باب المزاح :حدیث:۲۶۶۔

(۲) حضرت تھانوی کے پسندیدہ واقعات:۵۰۔

ہیں وہ بہت بڑی غلطی پر ہیں جبکہ یہ شان نبوت کے خلاف نہیں، شانِ صحابیت کے خلاف نہیں، شانِ ولایت کے خلاف نہیں، تو ہما شما کی شان کے خلاف کیسے ہوسکتا ہے؟

ان کی آپس میں تفریحات یا ہنسی مذاق کے جملوں سے یہ نہ سمجھا جائے کہ یہ حضرات ہمیشہ غیر سنجیدہ کھیل اور تفریح کی حرکتیں کیا کرتے تھے، واقعہ یہ ہے کہ یہ لوگ بڑے پایہ کے محقق، حق گو، راست گفتار بزرگ تھے، اور ایسا نہیں تھا کہ ہر وقت چہروں پر خشونت، خشکی برستی ہو اور اپنے آپ کو عوام سے بلند دکھانے کے لئے نہ کبھی مسکرا کر بات کرتے ہوں اور نہ کسی تفریح میں حصہ لیتے ہوں، ان واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ مذاق کرنے میں سامنے والی کی تحقیر نہ ہو، اس کی آبروریزی نہ ہو اور بے ہودگی اور بے حیائی کا کوئی رنگ نہ ہو، خلافِ واقعہ یا جھوٹی بات نہ کہی جائے، اس طرح کے مزاح کی شرعاً اجازت ہے۔

معلوم ہوا کہ اگر سلسلۂ کلام میں کوئی تعجب خیز، حیرت انگیز تذکرہ آجائے تو ان پر ہنسنے اور مسکرانے میں کوحرج نہیں ہے بلکہ ایسے مواقع پر ہنسنا اور مسکرانا چاہئے تاکہ دل کا بوجھ ہلکا اور غبار کم ہو لیکن شرط یہ ہے کہ یہ ہنسنا اور مسکرانا غافلین کی طرح نہ ہو۔

مزاح پر لکھی کتابیں

ادب کے نام پر ہمارے پاس جو اسلاف کے زمانے سے ذخیرے چلے آرہے ہیں، وہ بھی کچھ نہ کچھ مزاحیہ حکایتوں پر مشتمل ہیں اور اکابر کے نزدیک ان کے پڑھنے پڑھانے کا کسی نہ کسی حد تک سلسلہ رہا ہے، اس سلسلے میں ابوالفرج اصفہانی کی ”کتاب الأغانی“ جاحظ کی ”کتاب البخلاء“ اور عبداللہ ابن المقفع کی ”کلیلہ و دمنہ“ کا نام لیا جاسکتا ہے؛ بلکہ موخر الذکر کتاب تو بہت سے مرکزی مدارس وجامعات میں داخل درس ہے، اسی طرح مشہور محقق عالم دین علامہ ابوالفرج ابن الجوازی نے تفریحی مضامین پر مشتمل ایک مستقل کتاب ”أخبارُ الحَمقٰی و المُغفَّلین“ کے نام سے تحریر فرمائی ہے، یہ بھی قابل غور ہے کہ عربی شاعری کے جو ذخیرے موجود ہیں؛ ان میں مزاحیہ شاعری، عشقیہ شاعری، بلکہ فسقیہ وبیہودہ شاعری کا بھی

ایک معتد بہ حصہ ہے، امرء القیس، حطّیہ اور ابوطیب متنبی کی شاعری اس کے لیے شاہد عدل ہے؛ لیکن محض اعلیٰ مقاصد کے لیے اسے انگیز کیا گیا ہے؛ لہٰذا حکمت و دانائی پر مبنی مزاحیہ کہانیوں کو بھی ایک حد تک انگیز کیا جاسکتا ہے؛ لیکن اگر مزاح برائے مزاح ہو، حکمت وموعظت سے خالی ہو، حقائق سے کوسوں دور ہو، غلط بیانی اور جھوٹ کی آمیزش ہو، دوسروں کی کردارکشی کی گئی ہو، تو ایسی مزاحیہ کہانیاں نہ تو لکھنا درست، نہ اس کی خرید وفروخت درست ہے؛ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے لہو الحدیث (کھیل کی باتوں) کے خریدنے کی مذمت فرمائی ہے۔

اگر مزاح کے پہلوؤں کا حامل، مفید امور پر مشتمل کوئی کہانی ہو، تو اسے افادیاتی نقطۂ نظر سے انگیز کیا جاسکتا ہے، ایک بار آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ ﷺ کو عرب کی تیرہ عورتوں اور ان کے شوہروں کا قصہ سنایا جو "حدیثِ امّ ذِرع" کے نام سے حدیث کی کتابوں میں مذکور ہے۔

لیکن موجودہ دور کے ڈاکٹروں کی رائے کے مطابق عمل کرتے ہوئے بہ تکلف قہقہے لگانے کی مجلس منعقد کرنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی ہے، بلکہ بے تکلف فطری انداز میں جس قدر انسان ہنس لے وہی اس کی صحت وتندرستی کے لئے کافی ہے، اس لئے کہ زیادہ ہنسنا رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کے مطابق صحت وتندرستی کا سبب نہیں، بلکہ دلوں کے مردہ ہونے کا سبب ہے(۱)۔

کثرت ضحک کے باطنی نقصانات

آپ ﷺ اپنی زندگی میں صرف تبسم فرماتے تھے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم زیادہ مت ہنسا کرو، اسلئے کہ زیادہ ہنسنا دل کو مردہ کردیتا ہے "لاتکثر الضحک فان

---

(۱) ماہنامہ دارالعلوم ،شمارہ10– 11، جلد 96 :، ذی الحجۃ 1433 ہجری، محرم 1434 ہجری مطابق اکتوبر–نومبر 2012ء

کثرۃ الضحک تمیت القلب"(۱)

کثرتِ ضحک کے نقصانات بتلاتے ہوئے فقیہ ابو اللیث سمرقندیؒ فرماتے ہیں کہ قہقہہ مارکر ہنسنے سے بہت ہی بچو کہ اس میں آٹھ آفتیں ہیں۔(۱) علم وعقل والے تیری مذمت کریں گے (۲) بے وقوف اور جاہل لوگ تجھ پر دلیر ہوجائیں گے (۳) اگر تو جاہل ہے تو اس سے تیری جہالت اور بڑھے گی اگر عالم ہے تو علم میں کمی آئے گی کیونکہ روایت ہے کہ عالم جب ہنستا ہے تو اس کے علم کا ایک حصہ ضائع ہوجاتا ہے (۴) اس سے پرانے گناہ بھول جاتے ہیں (۵) اس سے آئندہ گناہوں پر جرأت ہوجاتی ہے کیونکہ ہنسی سے دل سخت ہوجاتا ہے (۶) اس سے موت اور اسکے بعد والے حالات سے غفلت اور نسیان پیدا ہوتا ہے۔(۷) تجھے دیکھ کر جو ہنسے گا اس کا بوجھ بھی تجھ پر ہوگا (۸) اس ہنسی کی وجہ سے آخرت میں بہت زیادہ رونا پڑے گا۔

حضرت ابن عباسؓ کا فرمان ہے کہ جو ہنستے ہوئے گناہ کرتا ہے وہ روتے ہوئے جہنم میں جائے گا۔ "فَلْیَضْحَکُوْا قَلِیْلًا وَّ لْیَبْکُوْا کَثِیْرًا جَزَآءً بِمَا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ"(۲)

سو یہ لوگ تھوڑے دنوں ہنس لیں اور بہت دنوں روتے رہیں ان کاموں کے بدلے میں جو کچھ وہ کیا کرتے تھے، اس آیت میں منافقین کو تھوڑا ہنسنے اور بہت رونے کا حکم نہیں دیا گیا بلکہ منافقین کی حالت کی خبر دینے کے طور پر کلام کیا گیا ہے، آیت کا معنی یہ ہے کہ منافقین اگرچہ اپنی ساری زندگی ہنسیں اور خوشیاں منائیں یہ کم ہے کیونکہ دنیا اپنی درازی

---

(۱) احمد حدیث: ۸۰۸۱، ترمذی حدیث: ۲۳۰۵ امام ترمذیؒ نے فرمایا کہ یہ حدیث غریب ہے۔ یہ حدیث ابن ماجہ میں حضرت ابوہریرہؓ سے "لَا تکثروا الضحك فإن كَثْرَة الضحك تميت الْقلب" کے الفاظ کے ساتھ منقول ہے۔علامہ بوصیری کہتے ہیں کہ یہ اس حدیث کی سند صحیح ہے (مصباح الزجاجہ ۴/ ۲۳۳، دارالعربیہ بیروت)

(۲) التوبۃ آیت: ۸۲

کے باوجود قلیل ہے اور آخرت میں ان کا غم اور رونا بہت زیادہ ہوگا کیونکہ آخرت کی سزا ہمیشہ کے لئے ہوگی، کبھی ختم نہ ہوگی اور ختم ہو جانے والی چیز نہ ختم ہونے والی کے مقابلے میں تھوڑی ہی ہے۔(۱)

تفسیر خازن میں ہے دنیا میں خوش ہونا اور ہنسنا چاہے کتنی ہی دراز مدت کے لئے ہو مگر وہ آخرت کے رونے کے مقابل تھوڑا ہے کیونکہ دنیا فانی ہے اور آخرت دائم اور باقی ہے۔ آخرت کا رونا دنیا میں ہنسنے اور خبیث عمل کرنے کا بدلہ ہے۔(۲)

آیت میں اگرچہ منافقین سے متعلق کلام ہے البتہ جداگانہ طور پر ہمیں بہر حال یہی حکم دیا گیا ہے کہ تھوڑا ہنسیں اور گریہ وزاری زیادہ کیا کریں، ہمیں چاہئے کہ ہم دوزخ اور اس کے عذاب اور جنت اور اس کی نعمتوں کو ہر وقت یاد رکھیں اور ان کی طرف سے غافل نہ ہوں اور ہمیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ فرمان ہر وقت پیش نظر رکھنا چاہئے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے: "اے امت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کی قسم! میں جو کچھ جانتا ہوں اگر تم بھی جان لو تو تم زیادہ روؤ گے اور بہت کم ہنسو گے۔ خبردار میں دین کے احکام تم تک پہنچا چکا"۔ **یا أمة محمد! واللہ لو تعلمون ما أعلم لبکیتم کثیرا ولضحکتم قلیلا ألا هل بلغت**"(۳) خلاصہ یہ کہ:

۱۔ مزاح کی کثرت انسان کو اللہ کی یاد سے غافل کرتی ہے۔

۲۔ کثرتِ مزاح کے سبب انسان دین کے اہم امور اور دین کے تفکر سے غافل ہو جاتا ہے۔

۳۔ اس سے دل سخت ہو جاتا ہے۔

۴۔ اس سے بغض وحسد پیدا ہوتا ہے۔

۵۔ اس سے انسان کی سنجیدگی اور وقار کو زوال آجاتا ہے۔

---

(۱) تفسیر کبیر، التوبۃ، تحت الآیۃ ۸۲ : ۶/ ۱۱۴، ملخصاً

(۲) تفسیر خازن، التوبۃ، تحت الآیۃ ۸۲ : ۲/ ۲۶۷

(۳) بخاری: ۲/ ۹۶، کتاب الکسوف، باب الصدقة ۱۰۴۴، مسلم: ۲/ ۶۱۸۔

۶۔کثرت مزاح کثرتِ ضحک کا سبب ہے۔کثرتِ ضحک کے نتیجہ میں دل سخت اور اللہ کی یاد سے غافل ہوجاتا ہے۔

۷۔زیادہ مزاح کرنے والے کی بات پر اعتماد کرنا مشکل ہوتا ہے۔سننے والا اس کی سنجیدگی یا مزاح میں تمیز نہیں کرسکتا۔

کس بات پر یہ ہنسی ہے؟

خدا بیزاری و انسانیت بیزار پر!

امت مسلمہ کی پریشانی ومصیبت پر!

اس امت کا تختۂ مشق بننے پر!

عروج واقبال والی امت کے انحطاط وزوال پر!

نوجوانان قوم کی عیاشی،موج مستی،فحاشی وعریانیت پر!

شراب نوشی،قمار بازی کے عام ہوجانے پر!

مسلم لڑکیوں کے ارتداد پر!

مسلم بہنوں کی جسم فروشی پر!

گاؤکشی کے نام پر مرنے والے شہیدوں پر!

اسلامی تعلیمات کی پامالی پر!

قوم کا اجتماعی رنگ وروپ مغرب زدہ ہونے پر!

محکمہ،ادارہ،دفتر،بنک،اسکول،کالج و یونیورسٹی کا ہر فرد مغربی مقلد ہونے پر!

امر بالمعروف،نہی عن المنکر کو زندگی کی ترقی کے لئے رکاوٹ سمجھنے پر!

سقوطِ بغداد،سقوطِ اندلس،خلافت عثمانیہ کے خاتمہ پر!

مسئلہ فلسطین و برما مشرقی تیمور و چیچنیا،بوسینیا و ہندوستانی مسلمانوں کی نسل کشی پر!

افغانستان وعراق،شام،لیبیا کی مسماری یا ہندوستان میں اٹھتے مسلم کش فسادات پر!

ہر سو جلتی نعشیں، بکھرے لاشے، کٹے اعضاء، تڑپتی ماؤں، سسکتی بہنیں، اجڑے سہاگ، بلکتے بے سہارا بچوں پر!

تف ہے ہماری مردہ غیرت وسوئے ضمیر پر، بغداد جلتا رہا قوم سوئی رہی، کابل اجڑتا رہا قوم مدہوش تھی، عراق برباد ہوگیا قوم بے غیرتی کی چادر اوڑھے رہی، لیبیا پر آگ و آہن کی بارش ہوئی قوم غفلت سے بیدار نہ ہوئی، فلسطین، برما میں مسلمانوں کی نسل کشی جاری ہی، قوم کی آنکھیں نہیں کھل رہیں، مسلم پرسنل لاء، ملت اسلامیہ، دینی مدارس دشمن کے نرغے میں ہیں پھر بھی ہم خواب خرگوش سے بیدار ہونے تیار نہیں ۔

کثرت ضحک سے پرہیز کرو

ایسی ہنسی جس سے اللہ کی خشیت ختم ہو جائے، گناہ پر جرأت پیدا ہو جائے، شریعت میں ناپسندیدہ ہے، حضرت یحییٰ بن معاذ رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ چار باتیں ہیں جو مومن میں ہنسی اور خوشی کا نام تک نہیں چھوڑتیں آخرت کا غم، معاش کی مصروفیت، گناہوں کی فکر اور مصائب کا نزول یعنی مومن کو ان چار چیزوں میں لگنا چاہئے، ہنسی از خود دور ہو جائے گی، ہنسی مومن کے لئے کوئی اچھی خصلت نہیں، اللہ تعالیٰ بعض لوگوں کو ان کی ہنسی پر عار دلاتے ہوئے فرماتے ہیں:

"افمن ھذا الحدیث تعجبون وتضحکون ولا تبکون" (۱) کیا تم لوگ اس کلام سے تعجب کرتے ہو اور ہنستے ہو اور روتے نہیں ہو۔

اس آیت کے نزول کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہنستے اور مسکراتے ہوئے نہیں دیکھا گیا یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دنیا سے تشریف لے گئے، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسجد سے باہر تشریف لائے تو آپ نے لوگوں کی ایسی جماعت دیکھی جو ہنس ہنس کر

---

(۱) سورۃ النجم آیت ۵۹، ۶۰

باتیں کررہے تھے آپ ان کے پاس ٹھہر گئے انہیں سلام کیااور فرمایا دنیاوی لذتوں کو توڑنے والی موت کو اکثر یاد کرو(۱)

ربیع بن خثیمؒ فرماتے ہیں کہ دنیا میں تھوڑا ہنسو کہ آخرت میں بہت رونا پڑے گا۔(۲)

حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ کس قدر تعجب ہے اس ہنسنے والے پر جس کے آگے دوزخ ہے اور ان خوشیاں منانے والے پر جس کے پیچھے موت لگی ہوئی ہے۔(۳)

حسن بصریؒ ہی کے بارے میں آتا ہے کہ یہ ایک نوجوان کے پاس سے گذرے جو ہنس رہا تھا فرمانے لگے بیٹا! کیا تو نے پل صراط عبور کرلی ہے؟ کہنے لگا نہیں، پھر حسن بصریؒ کہنے لگے کیا تجھے یہ معلوم ہوگیا ہے کہ تو جنت میں جائے گا یا دوزخ میں، جواب دیا کہ نہیں! تو فرمایا : پھر یہ ہنسی کیسی ہے: کہتے ہیں کہ اس کے بعد اس نوجوان کو کسی نے ہنستے نہیں دیکھا۔(۴)

فقیہ ابواللیث سمرقندیؒ نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ جب خضر علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام سے جدا ہونے لگے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ کوئی نصیحت کی بات سنائیے! کہنے لگے : اے موسیٰ جھگڑے سے بہت بچو، بلا ضرورت سفر نہ کرو، بلا وجہ ہنسنے سے بچو، کسی غلط کار کی خطا پر تعجب نہ کرو، اور بعض روایات میں ہے کہ خطا کاروں کو ان کی خطا پر شرمندہ نہ کرو اور اے عمران کے بیٹے !اپنے سے کوتاہی ہوجائے تو اس پر رویا کرو۔(۵)

یہ سب تنبیہات اسی ہنسی پر ہے جو غفلت پیدا کرتی ہے، خوف الٰہی سے غافل کردیتی ہے۔

---

(۱) ترمذی باب ماجاء فی ذکر الموت حدیث۲۳۰۷،امام ترمذیؒ نے فرمایا کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔

(۲) تنبیہ الغافلین: ۲۱۵

(۳) تنبیہ الغافلین :۲۱۵۔

(۴) تنبیہ الغافلین: ۲۱۵۔

(۵) تنبیہ الغافلین: ۲۱۴۔

مزاح سے متعلق چند شرعی قواعد وضوابط

(1) ہنسی مذاق میں دین حنیف کا مذاق نہیں ہونا چاہئے: ایسا کرنے سے انسان دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔فرمان باری جل وعلا ہے:"وَلَئِن سَأَلْتَهُمْ لَيَقُولُنَّ إِنَّمَا كُنَّا نَخُوضُ وَنَلْعَبُ"(۱) اگر ان سے پوچھو تو کہیں گے کہ ہم تو کھیل مزاح کر رہے تھے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: 'اللہ تعالیٰ، اس کی آیات، اور اس کے رسول کے ساتھ مذاق کرنا کفر ہے اس عمل سے بندہ ایمان لانے کے بعد کافر ہو جاتا ہے'' (۲)

علامہ ابن قدامہ رحمہ اللہ نے اسے ارتداد قرار دیا ہے، اس میں وہ مذاق بھی شامل ہے جیسا کہ بعض لوگ چند شرعی احکام کو مذاق بناتے ہیں جن میں ٹخنے سے کپڑا اونچا رکھنا، داڑھی بڑھانا، نماز اور روزہ وغیرہ، سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''جس نے ہنستے ہوئے گناہ کیا وہ روتے ہوئے جہنم میں داخل ہوگا'' (۳)

جھوٹے مذاق سے پرہیز کریں

امام احمد رحمہ اللہ اپنی مسند میں روایت نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا ''اس شخص کیلئے ہلاکت ہے جو بات کرتا ہے اس میں جھوٹ بولتا ہے تاکہ قوم کو ہنسا سکے اس کے لئے تباہی اور ہلاکت ہے''۔''عن بهز بن حكيم عن ابيه عن جده قال قال رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم ويل للذى يحدث بالحديث ليضحک به القوم فيكذب ويل

---

(۱) التوبة: ۶۵

(۲) مجموع الفتاویٰ: ۲۷۳/۷۔

(۳) الحلية لأبي نعيم: ۹۵/۴ والفردوس للديلمي ۵۷/۳

له، ویل له"۔(۱)

ایک اور روایت میں منقول ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "بندہ ایسی بات کر جاتا ہے کہ جس سے اپنے ساتھ بیٹھے لوگوں کو ہنسا سکے اور اس بات کی وجہ سے جہنم میں اتنا دور جا گرتا ہے جیسا کہ دنیا سے ثریا"۔(۲)

کثرتِ ضحک سے بچنے کے لئے سب سے پہلے مزاح و مذاق اور دل لگی سے پرہیز کیا جائے اس لئے کہ عام طور پر یہی اس کے اسباب ہوتے ہیں جس کے ذریعہ انسان زیادہ ہنسنے پر مجبور ہو جاتا ہے، لوگ مذاق میں بھی جھوٹ بول کر ہنسانے کے عادی ہوتے ہیں انکو جان لینا چاہئے کہ مذاق میں بھی جھوٹ بولنا کتنا بڑا گناہ ہے بلکہ آپ ﷺ کی پوری حیات طیبہ میں کوئی ایسی ضعیف روایت بھی نہیں ملتی جس میں حضور ﷺ نے کبھی مذاق میں جھوٹ بولا ہو، حدیث مبارکہ میں یہ بات موجود ہے کہ جس میں حضور ﷺ نے فرمایا، میں اس شخص کے لئے جنت کے درمیان ایک گھر کی ضمانت لیتا ہوں جو مذاق میں بھی جھوٹ کو ترک کردے۔(۳)

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ اپنے بھائی سے جھگڑا نہ کرو اور نہ اس سے ایسا مذاق کرو جس سے اسکو تکلیف پہنچے اور نہ ایسا وعدہ کرو جس کو تم پورا نہ کرسکو۔(۴)

حضرت ابوالحسن انصاریؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک شخص اٹھ کر چلا گیا اور اپنے جوتے بھول گیا، ان جوتوں کو ایک شخص نے لیا اور اپنے نیچے چھپا لیا، وہ آدمی واپس آیا اور کہنے لگا میرے جوتے؟ لوگوں نے

---

(۱) ترمذی حدیث: ۲۳۱۵، امام ترمذیؒ نے فرمایا کہ یہ حدیث حسن ہے۔ ابوداؤد حدیث: ۴۹۹۰، محقق شعیب الارنوط نے فرمایا کہ اس کی سند حسن ہے۔

(۲) سنن ترمذی، حدیث: ۲۳۱۵۔

(۳) مسنون معاشرت ص ۱۷۶ بحوالہ ریاض الصالحین ۲۲۲

(۴) باب ماجاء فی المراء حدیث: ۱۹۹۵، امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن غریب کہا ہے۔

کہا ہم نے تو نہیں دیکھا، چھپانے والے شخص نے کہا وہ یہ ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا مومن کو ڈرانا اور خوف میں مبتلا کرنا کیسا ہے؟ اس نے کہا، اے اللہ کے رسول ﷺ! میں نے مذاق میں ایسا کیا تھا، آپ نے دو یا تین مرتبہ یہی کہا، مومن کو خوفزدہ کرنا کیونکر درست ہوسکتا ہے؟۔(۱)

ہنسانے کے لیے کسی کا مذاق نہ اڑائیں

مزاح میں کسی کا تمسخر اور استہزاء مقصود نہ ہو یہ ایک حرام اور ناجائز عمل ہے جسے شریعت نے حرام قرار دیا ہے چنانچہ فرمان باری تعالیٰ ہے :یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا یَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓی .... (۲) علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں ''اس سے مراد لوگوں کو حقیر کمتر سمجھنا، ان کا مذاق اڑانا، یہ ایک حرام کام ہے اور منافقین کی صفت ہے''۔ (۳)

امام بیہقی رحمہ اللہ نے شعب الایمان میں روایت نقل کی کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا : ''لوگوں کا تمسخر اور ٹھٹھا اڑانے والوں کیلئے جنت کا دروازہ کھولا جائے۔ ان میں سے ایک کو کہا جائے گا کہ آجاؤ، جب وہ اپنے غم و کرب اور تکلیف میں مبتلا دروازے پر پہنچے گا جب وہ قریب آئے گا تو دروازہ بند کردیا جائے گا'' (۴) کسی کا مذاق اڑانے والے کو اس بات سے ڈرنا چاہیئے کہ اگر وہ کسی کا مذاق اڑا رہا ہے تو کہیں اللہ تعالیٰ بطور سزا اس پر وہ کیفیت اور صفت مسلط نہ کردے۔ اور وہ اس مرض میں مبتلا ہو جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا : ''اپنے بھائی کا تمسخر نہ اڑاؤ ایسا نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ اس پر رحم کرے اور تمہیں کسی آزمائش میں

---

(۱) مسنون معاشرت ص ۱۷۸

(۲) الحجرت:۱۱

(۳) تفسیر ابن کثیر ۷/ ۳۷۶

(۴) شعب الایمان للبیہقی ۵/ ۳۱۰

مبتلا کر دے"۔(۱)

رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کا مذاق اڑانے، مسلمانوں کو تکلیف دینے سے منع فرمایا اور کسی بھی مسلمان کی تحقیر کے سلسلے میں احادیث میں سخت ممانعت وارد ہوئی ہے۔ ارشاد نبوی ہے: ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے، اس پر کوئی ظلم و زیادتی نہ کرے۔ اس کو بے یار و مددگار نہ چھوڑے اور اس کو حقیر نہ جانے اور نہ اس کے ساتھ حقارت کا برتاؤ کرے، پھر آپ نے فرمایا: آدمی کے برا ہونے کے لیے اتنا ہی کافی ہے، کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو حقیر سمجھے اور اس کے ساتھ حقارت سے پیش آئے۔ " اَلْمُسْلِمُ أَخُو الْمُسْلِمِ لاَ یَظْلِمہ وَ لاَ یَخْذُلہ وَ لاَ یُحَقِّرُہ "(۲)

تکلیف دہ مزاح کی ممانعت کی دلیل مندرجہ ذیل حدیث ہے: عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اپنے بھائی سے جھگڑا نہ کرو اور اس سے مذاق نہ کرو اور اس سے تم ایسا وعدہ نہ کرو جس کی وعدہ خلافی کرو۔ اس حدیث میں دیگر تکلیف دہ اعمال (جھگڑا، وعدہ خلافی) کے ساتھ اس مزاح کی بھی ممانعت کی گئی ہے؛ جو اذیّت ناک اور ناگواری کا باعث ہو۔

ہنسانے میں کسی کو تکلیف نہ دیں

امام ابوداؤد نے سنن میں ابن ابی لیلیٰ سے روایت نقل کی کہ " ہمیں اصحاب رسول ﷺ نے بیان فرمایا کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کسی سفر میں تھے ان میں سے ایک شخص سو گیا تو ایک اور فرد نے اس کے پاس موجود رسی سے اسے پکڑا وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا اس پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کسی مسلمان کیلئے جائز نہیں کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو

(۱) [illegible]، ملنبہ حانیمبر ۹ ۲۴۲ ۲:۔

(۲) صحیح مسلم: کتاب البر و الصلة, باب تحریم الظلم

ڈرائے"۔(۱) ایک اور روایت میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "تم میں سے کوئی بھی اپنے بھائی کا سامان کھیل کود میں یا سنجیدگی میں نہ لے"۔(۲)

ہنسانے میں حد سے زیادہ انہماک نہ ہو

ہنسانے میں حد سے زیادہ منہمک ہونا، طول دینا، اور مبالغہ آمیزی کرنا بھی جائز نہیں ہے۔ مذاق کا بنیادی ضابطہ یہ ہے کہ وہ وقتی اور محض کچھ دیر کی خوش طبعی کیلئے ہونا چاہئے نہ کہ اسے پیشہ بنایا جائے۔ مومنین کی صفات سنجیدگی ہے، ہنسی مذاق محض بطور رخصت کے اجازت دی گئی ہے بعض لوگ سنجیدگی اور کھیل کے وقت میں فرق نہیں کرتے۔ امام غزالی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "لوگوں کی ایک بہت بڑی غلطی اور جرم یہ ہے انہوں نے مذاق کو پیشہ بنالیا ہے"(۳)

اتفاقیہ طور پر حسبِ موقع مزاحیہ گفتگو کرلینا اور تفریحی اشعار کہہ سن لینا اگرچہ جائز ہے؛ لیکن اس کے لیے اہتمام سے اجتماع کرنا اور اس میں گھنٹوں لگانا کسی طرح بھی درست نہیں، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: آدمی کے اچھے اسلام کی علامت یہ ہے کہ وہ ان امور کو ترک کردے جن سے انہیں سروکار نہیں۔ "مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْ کُهٗ مَا لَا یَعْنِیه"(۴)
مستقل طور پر مزاح میں لگے رہنا ممنوع ہے، اس لیے کہ وہ زیادہ ہنسنے کا سبب، قلب کے بگاڑ کا ذریعہ اور ذکر اللہ سے اعراض کا موجب ہے، رسول ﷺ کبھی کبھار ہی مزاح فرماتے تھے، وہ بھی کسی خاص مصلحت کے لیے یا مخاطب کو مانوس کرنے کے لیے۔
ہنسی کے مواقع پر ہنسنا اور مسکرانا بھی انسانی فطرت کا تقاضا ہے اور بلا موقع اور محل تکلف

---

(۱) رواہ ابو داؤد: كتاب الأدب ,باب من يأخذ الشيء علي المزاح

(۲) سنن ابیداؤد: كتاب الأدب ,باب لا يأخذن أحدكم متاع أخيه

(۳) احیاء علوم الدین للغزالی: ۱۲۹/۳۔

(۴) ترمذي: كتاب الزهد باب في من تكلم بكلمة ليضحك الناس۔

سے ہنسنا اور قہقہہ لگانا فطرت کے خلاف عمل ہے، اس کے علاوہ قہقہہ لگانا یہاں تک کہ کھل کھلا کر ہنسنا بھی نبی کریم ﷺ (جو بالیقین ایمان والوں کے لیے ہر عمل میں بہترین اسوہ ہیں) سے ثابت نہیں، بلکہ آپ خوشی کے مواقع پر صرف زیرلب مسکرایا کرتے تھے، سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو اس طور پر کھل کھلا کر ہنستے ہوئے کہ آپ کے دہن مبارک کا اندرونی حصہ نظر آجائے، کبھی نہیں دیکھا، آپ ﷺ تو صرف تبسم فرمایا کرتے تھے‘‘۔

معلوم ہوا کہ اگر سلسلۂ کلام میں کوئی تعجب خیز، حیرت انگیز یا مضحکہ خیز بات زیر تذکرہ آجائے؛ تو ان پر ہنسنے اور مسکرانے میں کوئی حرج نہیں ہے بلکہ ایسے مواقع پر ہنسنا اور مسکرانا چاہیے، تاکہ دل کا بوجھ ہلکا اور غبار کم ہو اور موجودہ زمانے کی تحقیق کے مطابق صحت، مستعدی اور نشاط میں اضافہ ہو، لیکن شرط یہ ہے کہ یہ ہنسنا اور مسکرانا غافلین کا سا نہ ہو، اس لیے کہ اس طرح کا ہنسنا دلوں کو مردہ کردیتا ہے، لہٰذا موجودہ دور کے ڈاکٹروں کی رائے کے مطابق عمل کرتے ہوئے بہ تکلف قہقہے لگانے کی مجلس منعقد کرنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی ہے بلکہ بے تکلف فطری انداز میں جس قدر انسان ہنس لے، وہی اس کی صحت وتندرستی کے لیے کافی ہے اس لیے کہ زیادہ ہنسنا رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کے مطابق صحت وتندرستی کا سبب نہیں بلکہ دلوں کے مردہ ہونے کا سبب ہے۔

دوران مذاق عزت ومرتبہ کا خیال رکھا جائے

دوران مذاق لوگوں کے مقام ومرتبہ اور عزت وشرف اور ہیبت ووقار کالحاظ رکھا جائے کیونکہ صاحب حیثیت ومنزلت افراد کے ساتھ مذاق بسا اوقات دائرہ ادب سے نکل جاتا ہے اور بے ادبی کا احتمال ہوتا ہے اس لئے ایسے افراد سے مذاق کرنے میں احتیاط برتی جائے اور دائرۂ ادب کا خیال رکھا جائے۔ جیسا کہ بسا اوقات طالب علم استاد سے مذاق کرتا ہے تو وہ بھی دائرہ ادب سے نکل جاتا ہے اور ایک احترام کا رشتہ قائم رہنا چاہیئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ کی تعظیم میں یہ امر بھی شامل ہے کہ باریش مسلمان کی تکریم کی جائے۔ "إن من إجلال الله إكرام ذي الشيبة المسلم"(۱)

امام طاؤس رحمہ اللہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا: ''عالم کی عزت وتوقیر کرنا سنت ہے'' یہ بھی اسلامی آداب میں سے ہے کہ کسی اجنبی سے مذاق کرنے سے اجتناب کیا جائے جس کی طبیعت نفس اور مزاج سے نا آشنائی ہو۔ کیونکہ اس سے مزاح سے حقارت کے برتاؤ کا پہلو نکلتا ہے، سیدنا عمر بن عبدالعزیز نے عدی بن ارطاۃ کو لکھا کہ ''مذاق سے بچو کیونکہ اس سے مروّت جاتی رہتی ہے''۔

کم عقل افراد سے مذاق کرنے سے اجتناب کیا جائے

سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا: ''مذاق میں میانہ روی اختیار کرو، اس میں افراط سے کام لینے سے ہیبت جاتی رہتی ہے اور بے وقوف لوگوں کو آپ کے خلاف جرأت ہو جاتی ہے''۔ مذاق میں کسی مسلمان بھائی کی غیبت اور چغل خوری نہیں ہونی چاہئے، مسلمان بھائی کی غیبت کرنا اس کے مردہ گوشت کھانے کے مترادف ہے۔ غیبت اور چغل خوری کا نتیجہ فتنہ ہے۔ عصر حاضر میں مزاح کی غالب صورتیں اس قبیح اور ناپاک جرم سے خالی نہیں، اور غیبت کی شرعی اصطلاح میں یہ تعریف بیان کی گئی ہے کہ ''ذكرك أخاك بما يكره''(۲) اپنے مسلمان بھائی کا اس انداز میں تذکرہ کرنا جسے وہ ناپسند کرتا ہو، لہٰذا غیبت اور چغل خوری ایک بہت بڑا اخلاقی جرم ہے مزاح کرنے میں اس سے پرہیز کیا جائے۔

(۱) أبي داود: كتاب الأدب، باب في تنزيل الناس منازلهم۔

(۲) صحيح مسلم: كتاب البر والصلة والآداب، باب تحريم الغيبة۔

دین کی کسی بھی بات کا مذاق نہ اڑائیں

طنز ومزاح لطافت جب مقدّساتِ اسلام اور شعائر دین تک پہنچ جائے تو خطرناک صورت حال اختیار کر لیتی ہے، بسا اوقات انسان ایمان جیسی عظیم دولت سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ’’غزوہ تبوک میں ایک شخص نے ایک مجلس میں مذاق اڑاتے ہوئے کہا: ’’ہم نے اپنے ان قاریوں (اشارہ اصحابِ رسول ﷺ کی طرف تھا) سے بڑھ کر پیٹ کا پجاری، زبان کا جھوٹا اور لڑائی کے میدان میں بزدل اور ڈرپوک نہیں دیکھا‘‘

اس مجلس کے ایک دوسرے شخص نے کہا: ’’تو جھوٹا ہے، منافق ہے، میں اس کی اطلاع نبی اکرم ﷺ کو ضرور دوں گا‘‘ جب نبی کریم ﷺ کو یہ خبر پہنچی تو اس بارے میں قرآنِ حکیم کی مذکورہ آیت نازل ہوئی، سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ: ’’میں نے اس منافق کو دیکھا کہ رسول ﷺ کی اونٹنی کا پالان پکڑا ہوا ہے اور پتھروں پر سے گھسٹتا ہوا جا رہا ہے اور کہہ رہا ہے: ’’اے اللہ کے رسول! ہم تو ہنسی مذاق اور تفریح کر رہے تھے‘‘ اور رسول اللہ ﷺ یہ فرماتے جا رہے تھے: ’’کیا تم اللہ، اس کی آیتوں اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ مذاق کر رہے تھے‘‘۔

اس پس منظر پر اللہ رب العزت نے آیات نازل فرمائی: کہ منافقوں کو ہر وقت اس بات کا کھٹکا لگا رہتا ہے کہ کہیں مسلمانوں پر کوئی سورت نہ اترے جو ان کے دلوں کی باتیں انہیں بتلا دے۔ کہہ دیجئے کہ مذاق اڑاتے رہو، یقیناً اللہ تعالیٰ اسے ظاہر کرنے والا ہے جس سے تم ڈر رہے ہو، اگر آپ ان سے پوچھیں تو صاف کہہ دیں گے کہ ہم تو یونہی آپس میں ہنس بول رہے تھے۔ کہہ دیجئے کہ اللہ، اس کی آیتیں اور اس کا رسول ہی تمہارے ہنسی مذاق کے لئے رہ گئے ہیں۔ تم بہانے نہ بناؤ یقیناً تم اپنے ایمان کے بعد بے ایمان ہو گئے اگر ہم تم میں سے کچھ لوگوں سے درگزر بھی کر لیں تو کچھ لوگوں کو ان کے جرم کی سنگین سزا بھی دیں

گے"۔ "یَحْذَرُ الْمُنَافِقُونَ أَنْ تُنَزَّلَ عَلَيْهِمْ سُورَةٌ تُنَبِّئُهُمْ بِمَا فِي قُلُوبِهِمْ قُلِ اسْتَهْزِئُوا إِنَّ اللّٰهَ مُخْرِجٌ مَاتَحْذَرُونَ وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ لَيَقُولُنَّ إِنَّمَا كُنَّا نَخُوضُ وَنَلْعَبُ قُلْ أَبِاللّٰهِ وَآيَاتِهِ وَرَسُولِهِ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِئُونَ لَا تَعْتَذِرُوا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ إِنْ نَعْفُ عَنْ طَائِفَةٍ مِنْكُمْ نُعَذِّبْ طَائِفَةً بِأَنَّهُمْ كَانُوا مُجْرِمِينَ"(۱)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہونے والے دین کی کسی بات کا مذاق اڑانا کفر ہے چاہے وہ نماز ہو داڑھی ہو، شلوار کا ٹخنے سے اوپر کرنا ہو، شرعی پردہ ہو، سود کا چھوڑنا ہو یا جنت اور جہنم کی کسی چیز کا ذکر ہو کسی کی نماز کا مذاق اڑانا، کسی کے پردہ پر چوٹ کرنا یا دینداری کے دیگر مظاہر پر پھبتی کسنا، لوگوں کو ان باتوں پر ہنسانا اور یوں بالآخر دین کے احکام پر عمل پیرا ہونے کو معاشرے میں ایک شرم اور عار کی بات بنا دینا. بہت سے لوگوں کیلئے ایک شغل کا درجہ رکھتا ہے، افسوس ناک امر یہ ہے جو کام یہودیوں اور منافقوں کا ہوا کرتا تھا اور ہے وہی کام خود کو مسلمان کہلانے والوں میں آتے جارہا ہیں۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، فرشتے، جنت، حوریں دوزخ، اللہ کے عذاب، قرآنی آیات، احادیثِ نبویہ، دینی کتابوں، دینی شعائر، عمامہ داڑھی مسجد، مدرسے، دیندار آدمی، دینی لباس، دینی جملے، مقدس کلمات الغرض وہ کونسی مذہبی چیز ہے کہ جس کا اِس زمانے میں کھلے عام فلموں، ڈراموں، خصوصاً مزاحیہ ڈراموں، عام بول چال دوستوں کی مجلسوں، دنیاوی تقریروں، ہنسی مذاق کی نشستوں اور باہمی گپ شپ میں مذاق نہیں اُڑایا جاتا!؟ اور یہ مذاق اڑانے والے کوئی غیر نہیں بلکہ خود مسلمان ہیں، خود کو مسلمان کہنے والے داڑھی، عمامہ، ٹخنوں سے اونچی شلوار رکھنے اور مذہبی حُلیہ سے نفرت کرتے ہیں، اور اسے کراہت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اور کئی مقامات اور دفاتر میں تو یہاں تک مشاہدہ کیا گیا ہے کہ وہاں السلام علیکم کہنا بھی لوگوں کو انتہائی ناگوار گزرتا ہے، آذان سن کر تکلیف ہوتی ہے۔ قرآن وحدیث کی باتیں انہیں پرانی باتیں لگتی ہیں، یقیناً یہ انتہائی قبیح اور

(۱) سورۃالتوبۃ۶۴۔ ۶۶

برا فعل ہے۔

دین کا مذاق اڑانا بہر صورت منع ہے

استہزاء چاہے قصداً ہو یا از راہ مذاق و تفنن دونوں صورتوں میں کفریہ عمل ہے، اللہ تعالیٰ نے مجبوری واکراہ کی صورت میں کلمہ کفر کہنے والے کا دل اگر ایمان پر مطمئن تھا تو اس کا عذر قبول کیا لیکن مذاق کرنے والوں کا عذر قبول نہیں کیا بلکہ فرمایا: ''وَلَئِن سَأَلْتَهُمْ لَيَقُولُنَّ إِنَّمَا كُنَّا نَخُوضُ وَنَلْعَبُ قُلْ أَبِاللهِ وَآيَاتِهِ وَرَسُولِهِ كُنتُمْ تَسْتَهْزِئُونَ، لاَ تَعْتَذِرُوا قَدْ كَفَرْتُم بَعْدَ إِيمَانِكُمْ ''(۱) اسی طرح اللہ تعالیٰ نے لاعلمی، جہالت اور انجانے میں گناہ کرنے والے کو ناقابل مؤاخذہ قرار دیا لیکن مذاق کرنے والے کا عذر کسی صورت بھی قبول نہیں کیا، البتہ یہ یاد رہے کہ شعائر اسلام سے استہزاء اور چیز ہے اور کسی شخص کی مخصوص ہیئت سے استہزاء اور چیز ہے۔ اول الذکر کفر ہے اور ثانی الذکر فسق۔ مثلاً: داڑھی کا مذاق اڑانا کفر ہے البتہ کسی شخص کی داڑھی کا مخصوص ہیئت کے سبب مذاق اڑانا فسق ہے، اسی طرح دین دار کا مذاق اڑانے کی دو صورتیں ہیں:

(۱) دین کی وجہ سے اس کا مذاق اڑانا۔ جیسے پردہ کرنے کی وجہ سے کسی خاتون کا مذاق اڑانا کفر ہے۔

(۲) دین دار کے مذاق اڑانے کی وجہ دین کے سوا کچھ اور ہونا یا کسی عالم کو علماء سوء میں شمار کرتے ہوئے مذاق اڑانا، یہ اگرچہ گناہ ہے مگر کفر نہیں۔

ایسی محفلوں میں شرکت جائز نہیں

ایک مسلمان کی بحیثیت مسلمان ایک بہت بڑی واجبی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ اگر کسی شخص کو دین پر طعنہ زنی کرتے اور ٹھٹھ و مذاق بناتے پائے تو اس شخص کی مذمت کی جائے

(۱) (سورة التوبة: ٦٥ـ٦٦)

اوراگر یہ چیزاس کی طاقت وسعت سے باہر ہے یا مسلسل تنبیہ اوراصلاح کے باوجود مذاق کرنے والا اپنی ہٹ دھرمی پر قائم ہے تو اس شخص کو چاہئے کہ وہ جگہ چھوڑ دے جس جگہ وہ مذاق کرنے والاموجودہو، اوراللہ تمہارے پاس اپنی کتاب میں یہ حکم اتار چکا ہے کہ تم جب کسی مجلس والوں کو اللہ تعالیٰ کی آیتوں کے ساتھ کفر کرتے اورمذاق اڑاتے ہوئے سنو تو اس مجمع میں ان کے ساتھ نہ بیٹھو! جب تک کہ وہ اس کے علاوہ اور باتیں نہ کرنے لگیں (ورنہ) تم بھی اس وقت انہی جیسے ہو، یقیناً اللہ تعالیٰ تمام کافروں اورسب منافقین کو جہنم میں جمع کرنے والا ہے"۔فرمانِ باری تعالیٰ ہے :" وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتَابِ أَنْ إِذَا سَمِعْتُمْ آيَاتِ اللَّهِ يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَأُ بِهَا ، فَلَا تَقْعُدُوا مَعَهُمْ حَتَّى يَخُوضُوا فِي حَدِيثٍ غَيْرِهِ ، إِنَّكُمْ إِذًا مِثْلُهُمْ، إِنَّ اللَّهَ جَامِعُ الْمُنَافِقِينَ وَالْكَافِرِينَ فِي جَهَنَّمَ جَمِيعاً (۱)

شعائر دین کے مذاق کی بعض صورتیں!

۱۔لوگ بے دریغ جنت وجہنم اورفرشتوں کے حوالے سے لطیفے بناتے ، سناتے اور لوگوں میں شیئر کرتے ہیں یہ بھی دین سے استہزاء ہے، جس میں سے ایک لطیفہ "نقلِ کفر کفر نہ باشد" کسی احمق نے یہ عام کیا کہ جہنم میں باقی سب قوموں کے اوپر داروغہ مسلط تھے ان میں سے اگرکوئی نکلنے کی کوشش کرتا تو وہ داروغہ انہیں اندر دھکیل دیتا جبکہ جہاں مسلمان قوم تھی وہاں کوئی داروغہ نہیں تھا کسی نے پوچھا تو جواب دیا گیا کہ مسلمان دراصل ٹانگ کھینچنے کے ماہر ہیں اس لئے ان میں سے اگرکوئی اوپر نکلنے کی کوشش کرتا ہے تو اس کے دوسرے ساتھی اس کی ٹانگ کھینچ کر اسے دوبارہ جہنم میں گرادیتے ہیں اس لئے مسلمانوں کے ٹھکانے پر داروغہ کی ضرورت نہیں"۔والعیاذ باللہ، جہنم جیسے ہولناک مقام کو طنز ومزاح میں

(۱)(سورۃالنساء:۱۴۰)

لا کر اس کی ہیبت کو کم کرنے کی پوری کوشش کی گئی۔

۲۔عموما لوگ یہ مثال بیان کرتے ہیں کہ بھائی فلاں شخص تو ''احمقوں کی جنت میں رہتا ہے''!۔والعیاذ باللہ۔اس نعمت کو احمقوں کی طرف منسوب کرنا کتنی بڑی جسارت ہے ایسا مقام جو انبیاء، صدیقین ،شہداء، صالحین کا ٹھکانہ ہے،اس سے یہ پیغام ملتا ہے کہ اللہ کی جنت کے علاوہ احمقوں کیلئے یا احمقوں کی بھی کوئی جنت ہے۔

۳۔''لکھے مُوسیٰ پڑھے خُدا'' (کہاوت) 'یعنی موسیٰ موت سے بھاگے اور موت آگے کھڑی تھی''۔ یہ کہاوت اس موقع پر بولی جاتی ہے جب کسی شخص کی لکھی ہوئی خراب تحریر صاف پڑھی نہ جا رہی ہو اصل کہاوت اس طرح ہے : ''لکھے مُو (بال) سا، پڑھے خود آ''۔یعنی جو شخص بال کی طرح باریک لکھتا ہے کہ دُوسروں کے لیے اسے پڑھنا دُشوار ہو تو اسے خود ہی آ کر پڑھے،کوئی اور تو اسے پڑھنے اور سمجھنے سے رہا۔تعجب ہے کہ اُردو کی بڑی بڑی لُغات اور قواعد کی کُتب میں یہ کہاوت عنوان کے مطابق غلط طور پر لکھی ہوئی پائی گئی ہے ۔اُسی طرح ''مُوسیٰ بھاگا گور سے اور آگے گور کھڑی'' (کہاوت) اس میں جلیل القدر نبی کی توہین ہے۔

۴۔صلواتیں سُنانا :(محاورہ)

صلاۃ کا معنی اور مفہوم ہے : برکتیں اور رحمتیں، جو نبی پاک ﷺ کے حق میں ہوں۔ جس کی جمع صلوات ہے اور اس کے معانی درود، دُعا اور نماز کے بھی ہیں، مگر اردو محاروے میں اسے گالی اور دُشنام کے معنیٰ میں استعمال کیا جاتا ہے. لہٰذا ''صلواتیں سُنانا'' کا مطلب ٹھہرا ''گالیاں دینا، بُرا بھلا کہنا''۔ایک اسلامی شعائر کے الفاظ کو کن نامناسب معانی کیلئے استعمال کیا جاتا ہے۔والعیاذ باللہ۔

۵۔نمازیں بخشوانے گئے اور روزے گلے پڑے (کہاوت)

مفہوم 'ایک کام سے جان چھڑانے گئے تھے اور دوسری مصیبت گلے پڑ گئی۔'' اِسلام کی بُنیادی عبادات کے متعلق ایسا گستاخانہ تصور اور طرزِ تکلّم بہت بڑی جسارت ہے۔(۱)

۶۔راستہ کا پتہ معلوم کرنے کے لیے ”اھدنا الصراط المستقیم“ کہنا۔
۷۔دائیں بائیں لوگوں کو جمع کرنے کے لیے ”حی علی الصلوۃ“ اور ”حی علی الفلاح“ کی جانب آجائیں کہنا۔
اس کے علاوہ بہت سے جملے روزمرہ میں استعمال کئے جاتے ہیں اور توجہ بھی نہیں کی جاتی کہ کس قدر گستاخی شعائر کی ہو رہی ہے۔

نبی کی توہین کا انجام

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کسریٰ اور قصریٰ دونوں کی طرف اپنے خطوط بھیجے کہ وہ اسلام کو قبول کرلیں دونوں نے اسلام قبول نہیں کیا لیکن ان میں سے قیصر روم نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خط کی تکریم اور عزت کی اور خط لانے والے کی خاطر داری اور تکریم کی تو اس کی بادشاہت باقی رہی۔
شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”کہا جاتا ہے کہ بادشاہت آج بھی قیصر کے خاندان میں باقی اور جاری ہے اور ابھی تک بعض علاقوں میں ان کی جانشینی پشت در پشت قائم ہے۔“فیقال إن الملك باق في ذريته إلى اليوم، ولايزال الملك يتوارث في بعض بلادهم“۔
جبکہ کسریٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خط کو پھاڑ ڈالا اور اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مذاق اڑایا جس کے انجام میں اللہ تعالیٰ نے اس کی سلطنت کو پارہ پارہ کر دیا۔اور اس جہانِ فانی میں سلطنت کسروی کا کوئی وجود باقی نہ رہا۔
حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ فرمانے لگے میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے سنا کہ: میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جو شخص طلب علم کے لئے کسی راستے میں چلتا ہے اللہ اسے جنت کے راستے پر چلا دیتا ہے اور فرشتے اس طالب علم کی خوشنودی کے لئے اپنے پر بچھا دیتے ہیں۔”من سلك طريقًا يطلب فيه علمًا، سلك الله به طريقًا من

طرق الجنة، وإن الملائكة لتضع أجنحتها رضًا لطالب العلم"(۱)

خطیب بغدادی سلیمان بن احمد بن ایوب الطبرانی کے طریق سے نقل کرتے ہیں انہوں نے فرمایا: میں نے ابویحییٰ زکریا الساجی سے سنا وہ کہہ رہے تھے کہ "ہم بصرہ کی گلیوں میں کسی ایک محدث کے گھر کی طرف جا رہے تھے۔ راستے میں ہم تیز تیز چل رہے تھے، ہمارے ساتھ ایک مسخرہ قسم کا (ماجن) شخص بھی تھا جو غیر دیندار تھا وہ ازراہ مذاق کہنے لگا کہ "اپنے پاؤں کو فرشتوں کے پروں سے اٹھا کر چلو کہیں انہیں توڑ نہ دو!! فرماتے ہیں یہ کہنا تھا کہ وہ شخص وہیں اکڑ گیا اپنا ایک قدم آگے نہ اٹھا سکا یہاں تک کہ اس کی ٹانگیں فالج زدہ ہوگئیں اور وہ زمین پر گر پڑا"۔(۲)

ہنسی کے پروگرام چلانا

ہنسی کے موقع پر ہنسنا اور مسکرانا بھی انسانی فطرت کا تقاضہ ہے اور بلاموقع اور بلامحل ہنسنا اور قہقہہ لگانا فطرت کے خلاف عمل ہے۔

موجودہ دور میں ڈاکٹروں کی رائے میں اگرچہ ہنسنا انسانی صحت کی برقراری اور اس کو چست ونشیط رکھنے کے لئے معاون فعل ہے، اس کے لئے خاص طور پر ہنسنے کے پروگرام منعقد کیئے جاتے ہیں جن میں لوگ بے تکلف قہقہہ لگاتے ہیں اور دیر تک ہنسنے کی کوشش کرتے ہیں، اس کے علاوہ یہ امر بھی قابل غور ہے کہ ایسی مجلسوں میں اس قدر انہماک ہوتا ہے کہ عام طور پر نماز و دیگر فرائض کا پاس وخیال بھی نہیں رہتا، شور وشغب ہوتا ہے، تالیاں پیٹی جاتی ہیں، عاشقانہ شعر وشاعری ہوتی ہے، مرد وزن کا بے محابہ اختلاط ہوتا ہے، ہنسانے کے لئے جھوٹی باتوں کا سہارا لیا جاتا ہے، لہٰذا ایسی مجالس کا انعقاد کراہت سے خالی نہیں

(۱) مسند أحمد، حدیث: ۲۱۷۶۳، سنن ترمذی، حدیث: ۲۶۸۲، وأبی داود، حدیث: ۳۶۴۳۔

(۲) الرحلة في طلب الحديث للخطيب البغدادی: ۸۵، مجموع رسائل الحافظ ابن رجب الحنبلي: ۱/۲۶۔

اور اگر عملی طور پر ایسی مجالس میں محرمات و ناجائز امور کا ارتکاب ہو تو اس کے ناجائز ہونے میں کوئی شبہ نہیں رہ جاتا۔

ہنسی کے پروگرام میں شرکت

ان لوگوں کو عبرت حاصل کرنا چاہئے جو اپنے ٹی وی چینلوں کے ذریعہ ہمیشہ لوگوں کو کثرت ضحک پر آمادہ کرتے رہتے ہیں اور ان کی دنیا و آخرت کو برباد کرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں اور مسلمان بھی گھنٹوں تک ان کے پروگرام کو دیکھ کر مزے لیتے ہیں نہ نماز کی فکر ہوتی ہے اور نہ دیگر اعمال کی بلکہ جب مسجد سے اذان کی آواز بھی آتی ہے تو کوئی اس کی طرف توجہ نہیں دیتا بلکہ جب یہ کثرت ضحک کے پروگرام ٹی وی پر آتے ہیں سارے گھر کے افراد ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں اور پڑوس کو بھی دعوت دی جاتی ہے اور بچوں جوانوں بوڑھوں کو تک بلایا جاتا ہے کہ آؤ! آج ٹی وی پر دلچسپ پروگرام ہے اور یہ بات بھی کہی جاتی ہے کہ اگر یہ پروگرام بچے دیکھیں گے تو ہمارے بچے ہوشیار ہو جائیں گے اور دوسروں سے سبقت لے جائیں گے۔ یہ بات ذہن نشین کرلیں کے ایسے پروگرام از روئے شرع ایسے پروگرام دیکھنا یا اس کی ٹکٹ خرید فروخت کرنا ناجائز و حرام ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ آج مسلمان ہر طرف سے پسماندہ اور ذلیل وخوار ہوتے جارہے ہیں، ایسے لوگوں کے بارے میں اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ: جو زندگی میں ان چیزوں کے مزے لے کر ہنستا ہے وہ موت کے وقت روتا ہے، سوچنے کی بات ہے کہ اگر موت کے وقت ہمارے ان گناہوں کی وجہ سے کلمہ طیبہ زبان پر نہیں آیا تو پھر مرنے کے بعد اللہ رب العزت کے عذاب سے بچانے والا کوئی نہیں ہے اور یہ بات مشہور ہے کہ دنیا میں ہنسنے والا آخرت میں بہت روئے گا اور دنیا میں بکثرت رونے والا خوب ہنسے گا اور خوش ہوگا۔

لطیفہ گوئی اور مزاح کو ذریعۂ معاش بنانا

کبھی کبھار لطیفہ کہہ دینے یا مزاح اور تفریح کر لینے کی تو گنجائش ہے، لیکن مستقل لطیفہ گوئی کرنا اور اس کو ذریعۂ معاش بنالینا، یہ اس مقصد حیات کے برخلاف ہے، جو اسلام افراد اور معاشرے میں پیدا کرنا چاہتا ہے اور مستقل لطیفہ گوئی اور مزاح وتفریح میں مشغول رہنا انسان کو فکرِ آخرت، ذکر اللہ، عبادت اور تلاوت قرآن سے غافل کر دیتا ہے۔ زیادہ ہنسنے ہنسانے سے دل مردہ ہو جاتا ہے، انھی اسباب کی وجہ سے شعر وشاعری کی مذمت کی گئی ہے۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ روایت نقل کرتے ہیں کہ انسان اپنا پیٹ پیپ سے بھرے، یہ اس سے بہتر ہے کہ اشعار سے بھرے۔ ”لأن یمتلیء جوف رجل قیحا یریه خیر من أن یمتلئ شعرا“ (۱)

یہی حال لطیفہ گوئی اور مزاح نویسی کا ہے، اس کو مستقل پیشہ بنالینا انہماک کی دلیل ہے اور ایسی چیزوں میں غالب انہماک ممنوع ہے، لہٰذا اس کی اجرت وصول کرنا بھی درست نہیں، از خود کوئی بطور انعام کے دے دے، تو اس کے لینے کی گنجائش ہے۔

مگر افسوس ہے لوگ ہنسانے والوں پر لاکھوں روپیہ لٹاتے ہوئے شرماتے نہیں ہیں بھارت کے ایک کامیڈین (۲) اپنے ایک شو کے لئے ۶۰ سے ۸۰ لاکھ روپے لیتا ہے، ایک ماہ کی انکم کا حساب لگائیں تو وہ تقریباً ۵ کروڑ روپے ہے، جو کسی بھی نوجوان اسٹار سے کافی زیادہ ہے، لوگ شوق سے شو دیکھنے جاتے ہیں، اس کے علاوہ اس کے ساتھ کام کرنے والوں کا معاوضہ الگ ہے، فلم جو کرنے ۲ ہفتوں میں ۸۷ کروڑ ۸۰ لاکھ امریکی ڈالر کمائے ہیں، کیا قوم یہی رقم کسی یتیم، بیوہ، ہسپتال کے مریضوں اسکول، کالج پر خرچ نہیں کرسکتی؟

---

(۱) سلسلۃ احادیث الصحیحۃ: ۳۳۶۔

(۲) کپل شرما۔

بیکاری کی نحوست

ان پر گراموں میں شرکت ،کامیڈی Comedy شوز دیکھنے کی فرصت مسلم معاشرہ کی بیکاری کی وجہ سے ہے،نوجوانوں کا کوئی مستقبل نہیں ،کوئی منصوبہ نہیں ،فالتو وقت بہت پڑا ہے،حضرت مولانا مفتی شفیع صاحب ؒ فرماتے ہیں: پان کی دکان پر، چائے کے سدابہار ہوٹلوں پر،اورگلیوں اورشاہراہوں کے ٹکڑوں پر، یہ ہم عمروں کی بھیڑکیسی؟ جوہنسی مذاق میں مشغول اورادھرادھرگنہگارنگاہیں ڈالنے میں مصروف ہیں،جائیے قریب جا کرمعلوم کرلیجئے؟ ہرایک اپنی شناخت"اسلامی نام" سے بتا دے گا،لیکن یہ مفت میں یہاں کھڑے ہو کرگناہ لوٹنے میں کیوں دلچسپی لے رہے ہیں؟ کیاانہیں کوئی روک ٹوک کرنے والانہیں ہے ؟ہاں! مگر روکے ٹوکے کون؟ اگرغیر روکے گا تو اس کی عزت کی خیرنہیں اور والدین کو اپنے پیاروں کی بیکاری اور مٹرگشتی پرفکرہوتی تورونا ہی کس بات کا تھا؟ معاشرہ میں بےکاری کارجحان اس کی بنیادوں کوکھوکھلا کر دیتا ہے،بیکاری ہزارخرابیوں کے پروان چڑھنے کا سبب بنتی ہے۔بیکاری سے برائیوں کے چونچلے کھلتے ہیں۔

آدمی مصروف رہےتو بےشمار برائیوں سے خودبخود بچارہتا ہے،غیرقوموں میں اس کا خاص اہتمام ہے کہ وہ اپنے بچوں کو ابتداء ہی سے تعلیم کے ساتھ ساتھ فارغ اوقات میں اپنے کاروبار میں ساتھ لگانے کا اہتمام کرتے ہیں ،مگرمسلمان معاشرہ میں اولاً تعلیم ہی ضرورت سے کم ہے اورتعلیم ہے بھی تو اس کے ساتھ بیکاری اور بری صحبت جیسی خرابیاں بھی ساتھ لگی ہوئی ہے،ضرورت ہے کہ اس سلسلہ میں قومی بیداری پیدا کی جائے اوروالدین کوآگاہ کیا جائے کہ وہ اپنی اولادکو بیکاری کے عیب سے بچائیں، ورنہ اولاد جہنم کا ایندھن بن جائے گی۔

آنحضرت ﷺ کو بری عادتوں سے بچوں کو بچانے کاکس قدرخیال تھااس کااندازہ آپ اس سے لگائیں کہ آپ ﷺ نے ہدایت دی ہے کہ جب بچہ بڑا ہو جائے تو اس کابستر الگ کر

دو، اور ہم عمروں کو ایک جگہ نہ لیٹنے دو۔ وغیرہ وغیرہ، اسی طرح جب وہ جوان ہوں تو انکی شادیوں کی فکر کرو۔(۱)

بیکاری اور شکایت

ایک بوڑھے آدمی کو اسکی اولاد ہر روز یہ طعنہ دیتی کہ آپ نے ہمارے لئے کیا بنایا ہے ، بابا جی یہ سن کر خاموش ہو جاتے ، اگلی صبح پھر اسی بحث کو لیکر بچے اپنے بوڑھے باپ کا جینا حرام کرتے اور بیچارہ بوڑھا صبر کے ساتھ اپنی اولاد کے اس طعنے کو سہتا بھی اور سنتا بھی لیکن خاموش رہتا جب موت کا وقت قریب آیا اور بوڑھا بستر مرگ پر لیٹ گیا تو جاتے جاتے اپنے بچوں کو ایک کاغذ دے گیا جس پر لکھا تھا: ''اس گھر کے نیچے میری عمر بھر کی جمع پونجی ہے، بھاری خزانہ ہے، کھود کر نکال لینا'' یہ پڑھنا تھا کہ بچوں کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا، بڑے احترام سے باپ کی میت کو دفنایا، پھر اگلے ہی دن پورے گھر کو ملبے کے ڈھیر میں تبدیل کر دیا اور کھدائی شروع کر دی، کھدائی کرتے انکی نظر ایک چھوٹے سے صندوق پر پڑی، جسے کھولا گیا تو اس میں ایک پرچی پڑی تھی جس پر لکھا تھا'' اگر تم سب اتنے ہی مرد ہو تو اسی گھر کو دوبارہ بناو جسے میں نے اپنا خون پسینہ بہا کر تعمیر کیا تھا تمہارے سوال کا جواب بھی مل جائیگا'' رہی سہی چھت بھی گنوا بیٹھے، آج کا نوجوان ماں باپ کا خدمت گزار ہو یا نا ہو لیکن یہ سوال ضرور پوچھتا ہے'' ہمارے والدین نے ہمارے لئے بنایا کیا ہے؟ جنہوں نے بنایا وہ بھی اذیت میں جی رہے ہیں، سچ پوچھئے تو ایسی اولادوں کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے جیسا ان بابا جی نے کیا۔

کسب کمال کُن کہ عزیز جہاں شوی

کثرت ضحک لگانے والوں کی نظر میں سب سے زیادہ حقیر چیز وقت ہے، وقت کے

(۱) بحوالہ : آج کا سبق :۵۳، مفتی اعظم حضرت مولانا محمد شفیع صاحبؒ۔

استعمال کا کوئی منصوبہ نہیں، اس بات کا ذکر تو اکثر سننے میں آتا ہے کہ افلاطون نے اپنی مثالی ریاست میں سے شاعروں اور فنکاروں کو نکال باہر کیا تھا لیکن بہت کم لوگ اس بات پر توجہ دیتے ہیں کہ افلاطون کے غیظ و غضب کا نشانہ صرف بے کار اور بے عمل قسم کے فنکار تھے جنھیں معاشرے کی فلاح و بہبود میں کوئی دلچسپی نہیں تھی، افلاطون نے اچھے اور کھرے فنکار کی ہمیشہ قدر کی اور اسے معاشرے کے لیے ایک نعمت قرار دیا، افلاطون کو اس دنیا سے رخصت ہوئے ڈھائی ہزار سال ہو چکے ہیں لیکن معاشرے میں فنکار کے مقام کا تعین ابھی تک نہیں ہوسکا۔

کسی بھی ملک پر نگاہ ڈالیں تو معلوم ہو گا کہ سیاست دان اور بیوروکریٹ bureaucrat وہاں کی حکومت چلا رہے ہیں، ماہرین معیشیت وہاں کی اقتصادیات کے نگران ہوتے ہیں، انجینئر پُل، سڑکیں، عمارتیں اور نہریں بنارہے ہیں، اسی طرح دیگر علوم میں مہارت رکھنے والے لوگ بھی معاشرے کی کوئی نہ کوئی خدمت انجام دیتے نظر آتے ہیں لیکن فنکاروں کے بارے میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ لوگ کیا کرتے ہیں؟ معاشرے کو ان سے کیا مِلتا ہے؟ ان کی وجہ سے کونسی برائی ختم ہورہی ہے، ایجوکیشن Education میں کیا تبدیلی آرہی ہے؟ کونسے ماہرفن پیدا ہورہے ہیں؟ پھر بھی لوگ پردہ (ریل) پر ابھرنے والے نقلی ہیرو کی نقالی کی چکر میں زندگی کے اصل (ریل) ہیروؤں کی زندگی بھلا دیتے ہیں، زبانوں پر ان کے تذکرے، انکے فلمی کارنامے، ان کی تعریف میں گن گاتے رہتے ہیں۔

نوجوانوں کی بے راہ روی

آج سے کچھ سالوں پہلے اخبارات میں جرائم سے متعلق جو خبریں پڑھنے میں آتی تھیں ان خبروں کو پڑھنے کے بعد اطمینان ہوتا تھا اور اللہ کا شکر ادا کرتے تھے کہ الحمد للہ ہمارے مسلم افراد کا نام نہیں ہے لیکن آج اخبارات کا مطالعہ کرتے ہوئے جب جرائم کی خبروں کا صفحہ

کھولا جاتا ہے تو زیادہ تر جرائم میں ملوث مسلم معاشرہ دکھائی دیتا ہے، آج کل گلے سے طلائی چین کھینچ کر بھاگنے والے، ڈاکہ زنی، قتل وغارت گری، گاڑیوں کے سرقہ میں ملوث، اور زنا جیسے جرائم پیشہ نوجوانوں میں مسلم نام دکھائی دیتے ہیں اور ان میں بھی بعض تعلیم یافتہ اور متوسط گھرانے کا طبقہ دکھائی دیتا ہے، ایک طرف ہمارے نوجوان بے راہ روی کا شکار ہورہے ہیں، آپ مسلم علاقوں کے پولس اسٹیشنوں Stations کا سروے کیجئے آپ شرمندہ ہوئے بغیر نہیں رہ پائیں گے آپ وہاں دیکھیں گے کہ برقعہ پوش مسلم عورتیں سسرالی جھگڑوں، آپسی تنازعات مارپیٹ اور مختلف چھوٹی چھوٹی وارداتوں میں ملوث اپنے بچے بچیوں کے مسائل کے حل کے لئے گھنٹوں بیٹھی رہتی ہیں، ایک طرف عالمی سطح پر داعش کی دہشت گردی قوم کو بدنام کررہی ہے تو دوسری جانب ہمارے نوجوانوں کی سرگرمیاں قوم کو شرمسار کرنے کے علاوہ معاشرتی زندگیوں کو تباہ کرنے کا موجب بن رہی ہیں، جو کام اسلام نے مسلمانوں کو کرنے کی ترغیب دی وہی کام مسلمانوں کے بجائے غیر مسلم بجالارہے ہیں۔

(بصیرت فیچرس)

نوجوان ملت کا مستقبل ہیں

نوجوان نسل ملک وملت کے مستقبل کا ایک بیش قیمت سرمایہ ہے، جس پر ملک وملت کی ترقی وتنزلی موقوف ہے، یہی اپنی قوم اور اپنے دین وملت کے لیے ناقابل فراموش کارنامے انجام دے سکتے ہیں، یہ ایک حقیقت ہے کہ نوجوان کی تباہی، قوم کی تباہی ہے، اگر نوجوان بے راہ روی کا شکار ہوجائے تو قوم سے راہِ راست پر رہنے کی توقع بے سود ہے، جوانی کی عبادت کو پیغمبروں کا شیوہ بتایا گیا ہے، نوجوان قوم کا اثاثہ ہوتے ہیں اور جس قوم کے نوجوانوں میں بگاڑ پیدا ہوجائے وہ قوم تباہی کے راستہ پر چل پڑتی ہے، نوجوانوں کی اخلاقی تربیت صرف والدین، علماء یا اساتذہ کی ذمہ داری نہیں ہے بلکہ خود نوجوانوں میں بھی اس بات کا احساس پیدا ہونا ضروری ہے کہ وہ کس راہ پر گامزن ہیں، اور اس کے کیا نتائج

برآمد ہوں گے، علماء، والدین، سرپرست اور اساتذہ کے ساتھ حکومت پر بھی یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ نوجوان نسل کی بربادی کو روکنے اور ان کے اخلاق و کردار کو بہتر بنانے کے لئے مواقع فراہم کریں، دوسری جنگ عظیم کے بعد فرانس کے صدر نے شکست پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ :'ہمارے نوجوان کردار سے عاری ہو چکے ہیں اس لئے ہمیں جنگ سے دو چار ہونا پڑا، اخلاق و کردار ہی انسانی نسل کا سب سے قیمتی اثاثہ ہیں، جب کوئی قوم اخلاق سے محروم ہو جاتی ہے تو کوئی طاقت اسے ترقی سے ہمکنار نہیں کرسکتی۔ (بصیرت فیچرس)

کل اور آج کا مسلمان

ایک دور تھا جب مسلمان اس ملک میں صاحب ثروت تھے، ہم نے ہواؤں کے رخ کو موڑنا اور گرتے ہواؤں کو تھام لینا سیکھا تھا ہم نے کشتیاں بھی جلائیں اور بحر ظلمات میں گھوڑے بھی دوڑائے، ہم نے راجہ دہر سے زوردار ٹکر بھی لی اور صنم خانوں کو بھی توڑ کر بتایا، یہ جذبات یہ قوت یہ عزم اور یہ طاقت وہی نوجوان نسل ہے جس کو قوم نے آج لائق التفات نہیں سمجھا جس توجہ وہ سرپرستی کا وہ مستحق تھا وہ اسے نہ دی گئی، بالآخر وہ بے وقعت ہو کر اپنی ہی نظروں سے ایسا گرا کہ نشان منزل بھی گم کر بیٹھا، اور آج مسلمانوں کی اکثریت چپراسی اور نوکر سے بھی گری ہوئی ہے، ہمارے شہر کے مسلم علاقوں کی گلیوں کا رات میں سروے کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ نصف رات گزرنے کے بعد سے مسلم نوجوانوں کی بیٹھک ہوتی ہے ان میں سے کئی ایسے بھی ہیں جو شادی شدہ ہیں جنکی اولاد ہے اس کے باوجود یہ نوجوان مرد اپنے گھروں میں وقت دینے کے بجائے دوست احباب میں وقت ضائع کررہے ہیں، صبح سویرے اٹھنے کے بجائے دس، گیارہ بجے اٹھتے ہیں، یہ صرف ان مرد نوجوانوں کا ہی حال نہیں بلکہ کئی مسلم گھرانوں میں خواتین و نوجوان لڑکیوں کا بھی یہی حال ہے، لڑکیاں اور خواتین کے ہاتھوں میں ہمیشہ سیل فون لگا رہتا ہے جس کے ذریعہ وہ گیم کھیلتی ہیں یا چاٹنگ

وغیرہ میں مشغول رہتی ہیں اور یہ سلسلہ ہر روز رات دیر گئے تک جاری رہتا ہے۔نوجوان لڑکے اور لڑکیاں رات کا بیشتر حصہ جاگتے ہوئے ضائع کر دیتے ہیں، کھانے پینے کی بھی انکے پاس کوئی اہمیت نہیں، ان نوجوانوں کو نہ کھانے پینے کی پرواہ ہے، نہ نیند کی پرواہ ہے اور نہ اسلامی ماحول میں زندگی گزارنے کی پرواہ، آج پولس کے سروے کے مطابق مسلم محلوں میں گانجہ، افیم غرضیکہ تمام منشیات کی چیزیں با آسانی دستیاب ہیں۔(۱) افسوس ہے ہم ۳۱۳ تھے تو زمانے کی کایا پلٹ دی، آج ہم ڈیڑھ ارب ہیں مگر کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔

حفاظتِ وقت اور ہمارا معاشرہ

وقت کی مثال تیز دھوپ میں رکھی ہوئی برف کی اس سِل سے دی جاتی ہے کہ جس سے اگر فائدہ اٹھایا جائے تو بہتر ورنہ وہ تو بہر حال پگھلتی ہی جاتی ہے اس وقت مسلم معاشرہ عام طور سے ضیاعِ وقت کی آفت کا شکار ہے، یورپی معاشرہ اپنی تمامتر خامیوں اور کمزوریوں کے باوجود وقت کا قدرداں ہے اور زندگی کو باقاعدہ ایک نظام کے تحت گزارنے کا پابند بنا ہوا ہے۔سائنس اور ٹیکنالوجی میں ان کی ترقیوں کا ایک بڑا سبب وقت کی قدردانی ہی ہے۔

جو قومیں وقت کی قدر کرنا جانتی ہیں، صحراؤں کو گلشن بنا دیتی ہیں، وہ فضاؤں پر قبضہ کر سکتی ہیں وہ عناصر کو مسخر کر سکتی ہیں، وہ پہاڑوں کے جگر پاش پاش کر سکتی ہیں، وہ زمانہ کی زمامِ قیادت سنبھال سکتی ہیں؛ لیکن جو قومیں وقت کو ضائع کر دیتی ہیں، وقت انھیں ضائع کر دیتا ہے، ایسی قومیں غلامی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو جاتی ہیں، وہ دین اور دنیا دونوں اعتبار سے خسارے میں رہتی ہیں۔

ہم لوگ بیٹھکوں، چوپالوں، ہوٹلوں اور نجی مجلسوں میں وقت گزاری کرتے ہیں اور ہمارا کتنا ہی قیمتی وقت نکتہ چینی، غیبت، بہتان اور بے تحاشا سونے میں ضائع ہو جاتا

(۱) بصیرت فیچرس۔

ہے اور ہمیں اس کا احساس تک نہیں ہوتا، آج جوانی کا سنہرا دور ملا ہوا ہے، کل بڑھاپے میں نہ جانے کن احوال سے سابقہ پڑے اور کیا امراض وعوارض لگ جائیں آج صاحبِ حیثیت ہیں، کل پتہ نہیں کیا حالت ہو جائے؟ اس لیے جو کرنا ہے کرلیا جائے، جو کمانا ہے کمالیا جائے، جو فائدہ اٹھانا ہے اٹھالیا جائے ورنہ ”اَلْوَقْتُ کَالسَّیْفِ اِنْ لَمْ تَقْطَعْهُ لَقَطَعَکَ“، وقت دو دھاری تلوار ہے۔

ایک بزرگ کہتے ہیں کہ ایک برف فروش سے مجھ کو بہت عبرت ہوئی کہ وہ کہتا جا رہا تھا کہ اے لوگو! مجھ پر رحم کرو میرے پاس ایسا سرمایہ ہے کہ ہر لمحہ تھوڑا تھوڑا ختم ہوتا جا رہا ہے، اس طرح کی ہماری بھی حالت ہے کہ ہر لمحہ برف کی طرح تھوڑی تھوڑی عمر ختم ہو جاتی ہے، اس کے گھلنے سے پہلے جلدی بیچنے کی فکر کرو، فراغت کے وقت کو مشغولی سے پہلے غنیمت سمجھو زندگی کو موت سے پہلے غنیمت سمجھو کام کرنا شروع کر دو۔(۱)

آج ضرورت اس گشت کی ہے

عشاء کے بعد چوراہوں ، چبوتروں پر لایعنی باتوں میں مصروف رہنے والے ہمارے نوجوان جو قوم کا مستقبل اور اصل سرمایہ ہیں انھیں بڑے پیار سے تضیعِ اوقات کے نقصانات نماز فجر کی اہمیت سمجھاتے ہوئے اپنے اپنے گھر جانے کی گذارش کرنے کے لئے ہمارے علماء دین گشت کا اہتمام کریں۔یقیناً کئی دنوں تک اس کا کچھ اثر نہیں ہوگا، کوئی اسے نئی بات کہے گا. کوئی کچھ، کوئی کچھ کہے گا لیکن ہر دن علماء (ورثتہ الانبیاء) کی اس گشت سے اک دن ضرور ہماری قوم اس برائی سے بچے گی، اور جس دن یہ برائی ختم ہوگی، حالات میں ان شاء اللہ مثبت تبدیلی آئے گی، ہر محلہ میں پہنچنے والے تین یا چار علماء کے گروپ میں وہ علماء ہوں جو دوسرے محلہ کے ساکن ہوں کیونکہ خود کے ہی محلہ والوں کی بات اتنا اثر نہیں

---

(۱) تحفۃ المدارس: ۱۴۷/۴۔

کر سکے گی اور ہر دو تین دن میں یہ گروپ بدلتا رہے۔ یقین مانئے کافی فرق ہوگا اور فجر میں مسجد میں صفوں کی تعداد بڑھے گی، پرانے مرض کے علاج کے لئے وقت تو لگے گا ہی لیکن دوائی لینا بھی تو ضروری ہے۔ (منقول)

وقت کی قدر شناسی اور ہمارے اسلاف

چنانچہ امام محمدؒ کے حالات میں لکھا ہے کہ دن رات کتابیں لکھتے رہتے تھے، ایک ہزار تک ان کی تعداد بیان کی جاتی ہے، اپنی تصنیف کے کمرہ میں کتابوں کے ڈھیر کے درمیان بیٹھے رہتے تھے، مشغولیت اس درجہ تھی کہ کھانے اور کپڑے کا بھی ہوش نہ تھا۔ حضرت مولانا عبدالحی فرنگی محلیؒ کی جو مطالعہ گاہ تھی، اس کے تین دروازے تھے، ان کے والد نے تینوں دروازوں پر جوتے رکھوائے تھے؛ تاکہ اگر ضرورت کے لیے باہر جانا پڑے تو جوتے کے لیے ایک آدھا منٹ بھی ضائع نہ ہو، حضرت مفتی محمود حسن گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں بھی حفاظتِ اوقات کا بڑا اہتمام تھا؛ حتیٰ کہ کھانا کھاتے ہوئے بھی کتابیں پڑھا کرتے تھے، چوبیس گھنٹے کی زندگی مشین کی طرح متحرک رہتی تھی، کوئی وقت بھی بیکار نہیں جاتا تھا شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا صاحبؒ ایک عرصہ سے صرف ایک وقت دوپہر کا کھانا کھاتے شام کو کھانا تناول نہیں فرماتے، کہتے کہ میری ایک مشفق ہمشیرہ تھی میں شام کو مطالعہ میں ہوتا تھا، وہ لقمہ میرے منہ میں دیا کرتی تھی، اس طرح مطالعہ کا حرج نہ ہوتا تھا؛ لیکن جب سے ان کا انتقال ہوگیا اب کوئی میری اتنی ناز برداری کرنے والا نہیں رہا، مجھے اپنی کتابوں کا نقصان گوارہ نہیں؛ اس لیے شام کا کھانا ہی ترک کر دیا۔

حضرت اقدس مفتی مہربان علی بڑوتی قدس سرہ کے یہاں حفظِ اوقات کا خوب اہتمام دیکھا، میرے رفیق مولانا محمد اسماعیل صادق صاحب مدظلہ اپنے ایک مضمون میں حضرت کے اس عمل پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں "اگر لوگوں کے اوقات فروخت ہوا کر

تے تو میں اپنی زمین کا کچھ حصہ فروخت کر کے ان کے اوقات خرید لیتا"۔(۱)

کثرت ضحک سے بچنے کا طریقہ

کثرتِ ضحک سے بچنے کے لئے ہمارے اکابر پانچ چیزوں کو بتلاتے ہیں کہ ہر آدمی کو ان پانچ چیزوں کی فکر میں رہنا چاہئے (۱) اپنے گذشتہ گناہوں کی فکر رکھے کہ ان کا کرنا تو یقینی ہے مگر معافی کا پتہ نہیں لہٰذا ان کی ہر وقت فکر لگی رہنی چاہئے (۲) نیکیاں کتنی بھی ہوں مگر ان کے مقبول ہونے کا یقین نہیں (۳) اپنی گذشتہ زندگی کا تو علم ہے کہ کیسے گذری مگر باقی کا کچھ پتہ نہیں (۴) یہ تو یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جنت و دوزخ دوٹھکانے بنائے ہیں مگر کیا معلوم ہمارا ٹھکانہ کونسا ہے (۵) یہ پتہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ آدمی سے راضی ہیں یا ناراض، پس جس شخص کو عمر بھر یہ پانچ فکریں لگی ہوں وہ اسے ہنسنے سے روک دیں گے۔(۲)

ہر مسلمان کو اس بات کی ضرورت ہے کہ وہ ان چیزوں کو سامنے رکھ کر یہ سوچے کہ ہمارے ساتھ آخرت میں کیا معاملہ ہوگا اور ہم میں سے کوئی یہ بھی نہیں جانتا کہ ہمارا نامۂ اعمال اللہ تعالیٰ کس ہاتھ میں دیں گے اگر ہر مسلمان اپنی موت کو اور آخرت کو یاد کرے گا تو وہ زیادہ ہنسنے سے خود بخود بچ جائے گا یہ بھی کثرت ضحک سے بچنے کے لئے ایک بہترین علاج ہے۔

حضرت ثابت بنانیؒ فرماتے ہیں کہ یہ بات تو زبان زد عام تھی کہ مومن کی ہنسی اس کی غفلت کی وجہ سے ہے یعنی اگر اسے آخرت سے غفلت نہ ہوتی تو کبھی نہ ہنستا (تنبیہ الغافلین ص ۲۱۹)

یحییٰ بن معاذ رازیؒ فرماتے ہیں کہ تین چیزیں دل کو سخت کرتی ہیں بلا وجہ ہنسنا، بلا

---

(۱) ماہنامہ دارالعلوم ،شمارہ 11، جلد 97 : محرم الحرام 1435 ہجری مطابق نومبر 2013ء۔
(۲) تنبیہ الغافلین: ۲۱۶۔

بھوک کے کھانا، بلا ضرورت کے کلام کرنا۔(۱)

حضرت امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ میں ایک دفعہ ہنسا تھا اور آج تک اس پر نادم ہوں، میں نے عمرو ن القدری سے مناظرہ کیا اپنی کامیابی کے آثار دیکھ مجھے ہنسی آگئی وہ شخص کہنے لگا عجیب بات ہے کہ علمی گفتگو اور ہنسی بھی میں ایسے شخص سے کلام پسند نہیں کرتا، امام صاحب فرماتے ہیں کہ اس پر مجھے بہت ندامت ہوئی کہ اگر مجھے ہنسی نہ آتی تو میں اسے اپنی بات پر مجبور کر لیتا اور اس میں بڑی بھلائی ہوتی۔(تنبیہ الغافلین :۲۱۸)

حضرت ابراہیم نخعیؒ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی اپنے اہلِ مجلس کو خوش کرنے کے لئے کوئی بات کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس پر ناراض ہوتے ہیں اس کی وجہ سے ان آس پاس والوں کو بھی اللہ تعالیٰ کی ناراضگی پہنچتی ہے اور کبھی کوئی بات آدمی اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے بولتا ہے جس کی وجہ سے اس پر رحمت نازل ہوتی ہے اور اس کے آس پاس والوں کو بھی رحمت پہنچتی ہے۔(۲)

ان واقعات سے سبق لینے کی ضرورت ہے کہ اکابر معمولی سی بات پر بھی کتنا ڈرتے تھے اور اس بات کا کتنا خیال رکھتے تھے کہ کہیں ہماری اس معمولی سی غلطی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ ہم کو نعمتِ ایمان سے محروم نہ کریں، فکر آخرت ہو تو چھوٹی غلطی بھی ہمیں بڑی نظر آتی ہے، اگر اپنی کوتاہیوں کو اور گناہوں کو یاد کر کے روئیں گے تو آخرت میں ہنستے ہوئے جنت میں جائیں گے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اسلاف کے آنسو

سیدنا عبداللہ بن شخیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز پڑھ رہے تھے (میں نے دیکھا کہ) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سینے سے

(۱) تنبیہ الغافلین :۲۱۹۔

(۲) تنبیہ الغافلین :۲۱۹۔

رونے کی وجہ اس طرح کی آواز نکل رہی تھی جیسے چولہے پر رکھی ہوئی ہانڈی سے نکلتی ہے۔ ابوداؤد۔حدیث صحیح ہے۔(۱)

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کے خوف سے رونے والا انسان دوزخ میں داخل نہیں ہوگا جب تک کہ دودھ تھن میں واپس نہ چلا جائے۔(اس کا جہنم میں جانا ایسے ہی ناممکن ہے جیسے تھن سے نکلے ہوئے دودھ کا تھن میں واپس جانا ناممکن ہے)۔ لَا يَلِجُ النَّارَ رَجُلٌ بَكَى مِنْ خَشْيَةِ اللهِ حَتَّى يَعُودَ اللَّبَنُ فِي الضَّرْعِ"(۲)

سیدنا ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں وہ کچھ دیکھتا ہوں جو تم نہیں دیکھتے اور میں وہ باتیں سنتا ہوں جو تم نہیں سنتے آسمان چرچراتا ہے اور اس کا چرچرانا حق ہے اس میں چار انگلی کے برابر بھی ایسی جگہ نہیں ہے کہ وہاں کوئی فرشتہ اللہ رب العزت کی بارگاہ میں پیشانی رکھ کر سجدہ ریز نہ ہو اللہ کی قسم اگر تم لوگ وہ کچھ جاننے لگو جو میں جانتا ہوں تو کم ہنستے اور زیادہ روتے اور بستروں پر عورتوں سے لذت نہ حاصل کرتے جنگلوں کی طرف نکل جاتے اور اللہ تعالیٰ کے حضور گڑگڑاتے سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے تمنا کی کہ کاش میں ایک درخت ہوتا جو کاٹ دیا جاتا۔(۳)

حضرت عطاءؒ فرماتے ہیں کہ میں اور حضرت عبید بن عمیرؓ حضرت عائشہؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو حضرت عبید بن عمیر نے عرض کیا آپ ہمیں کوئی ایسی عجیب بات سنائیں جو آپ رسول اکرم ﷺ میں دیکھی ہو تو وہ رو پڑیں پھر فرمایا آپ راتوں میں سے ایک رات اٹھے اور فرمایا اے عائشہ! مجھے چھوڑ دو میں اپنے رب کی عبادت کرنا چاہتا ہوں، میں نے عرض کیا

---

(۱) سنن ترمذی، باب البکاء فی الصلاۃ، یہ حدیث صحیح ہے۔

(۲) سنن ترمذی، حدیث: ۱۷۰۱، یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

(۳) سنن ترمذی، حدیث: ۱۹۸۔

اللہ کی قسم! میں آپ کے قرب کو پسند کرتی ہوں اور اس کو بھی جو آپ کو خوشی پہنچائے۔
چنانچہ آپ اٹھے وضو کیا اور نماز کے لئے کھڑے ہوگئے پھر آپ روتے ہی رہے حتیٰ کہ آپ کا دامن تر ہوگیا پھر اتنا روئے کہ روتے روتے زمین بھیگ گئی، حضرت بلال رضی اللہ عنہ نماز کے لئے اذان دینے آئے تو آپ کو روتے ہوئے دیکھا عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ رو رہے ہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ نے آپکے سابقہ اور آئندہ کی لغزشیں معاف فرمادی ہیں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کیا میں اپنے رب کا شکر گزار بندہ نہ بنوں(۱)
حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا" اگر تم وہ جانتے جو میں جانتا ہوں تو تھوڑا ہنستے اور بہت روتے۔(۲)
حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، میں نے رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ اے لوگو! روؤ، اگر تمہیں رونا نہ آئے تو رونے کی کوشش کرو کیونکہ جہنمی جہنم میں روئیں گے حتّٰی کہ ان کے آنسو ان کے چہروں پر اس طرح بہیں گے گویا کہ وہ نہریں ہیں یہاں تک کہ ان کے آنسو ختم ہوجائیں گے، پھر ان کا خون بہنے لگے گا اور وہ خون اتنا زیادہ بہہ رہا ہوگا کہ اگر اس میں کشتی چلائی جائے تو چل پڑے۔(۳)
حضرت داؤد علیہ السلام کے سامنے جو ذکر موت اور قیامت کا ہوتا تو اتنا روتے کہ آپ کے بند اکھڑ جاتے جب رحمت کا ذکر ہوتا تو سانس اپنی حالت اصلی پر آتی (قصص الاولیاء :۶۶۱)
حضرت عبداللہ بن شداد رضی اللہ عنہ بن الہاد رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں صبح کی نماز میں آخری صف میں تھا میں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے رونے کی آواز سنی وہ سورۂ یوسف پڑھ رہے تھے، پڑھتے پڑھتے اس

---

(۱) بخاری باب قیام النبی ﷺ اللیل حدیث ۱۱۳۰، مسلم باب اکثار الأعمال والاجتهاد في الخ حدیث: ۲۸۱۹

(۲) بخاری، کتاب التفسیر، باب لاتسالوا عن اشیائ۔۔۔الخ، الحدیث ۴۶۲۱ :۔

(۳) شرح السنہ، کتاب الفتن، باب صفۃ النار واہلہا، الحدیث ۴۳۱۴ :۔

آیت تک پہنچے "انما اشکوا بثی و حزنی الی اللہ"(۱) میں تو اپنے رنج وغم کی صرف اللہ سے شکایت کرتا ہوں، ابن عمرؓ فرماتے ہیں میں نے حضرت عمرؓ کے پیچھے نماز پڑھی تو میں نے تین صف پیچھے سے ان کے رونے کی آواز سنی۔(۲)

اپنی زندگی کے آخر میں اپنے چہرہ کو زمین پر رگڑتے اور کہتے کہ اگر اللہ نے مجھے معاف نہیں کیا تو پھر ذلت ورسوائی کے سوا کوئی چارہ نہیں۔(۳)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: جس مومن بندے کی آنکھوں سے خوف خدا سے آنسو بہ پڑیں چاہے وہ مکھی کے سر کے برابر بھی ہوں پھر وہ رخسار تک جا پہنچیں تو اللہ تعالی اسے دوزخ پر حرام فرمادیتا ہے۔ "مَا مِنْ عَبْدٍ مُؤْمِنٍ يَخْرُجُ مِنْ عَيْنَيْهِ دُمُوعٌ وَإِنْ كَانَ مِثْلَ رَأْسِ الذُّبَابِ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ثُمَّ تُصِيبُ شَيْئًا مِنْ حُرِّ وَجْهِهِ إِلَّا حَرَّمَهُ اللّٰهُ عَلَى النَّارِ"(۴)

آپ ﷺ فرماتے ہیں: میں نے امت کے ایک مرد کو جہنم کے کنارے پر دیکھا جس کے پاس خوف خدا آیا اور اس کو جہنم سے بچالے گیا، اسی طرح اپنی امت کے دوسرے مرد کو دیکھا جو جہنم میں گرنے لگا تھا تو اس کے پاس اس کے وہ آنسو آئے جو خوف خدا سے بہے تھے انہوں نے (بھی) اسے آگ سے نکال لیا۔(۵)

حضرت محمد بن سیرینؒ جو بڑے درجے کے تابعین میں سے ہیں اور حضرت ابو ہریرہؓ کے شاگرد ہیں ان کے بارے میں لکھا ہے یہ بڑے ظریف المزاج اور شگفتہ آدمی تھے ان کے ایک شاگرد کہتے ہیں کہ دن کے وقت تو ہم ان کے ہنسنے کی آواز سنتے تھے لیکن رات

---

(۱) سورۃ یوسف آیت: ۸۶

(۲) حیاۃ الصحابہ: ۳/ ۱۵۸۔

(۳) حیاۃ الصحابہ: ۳/ ۱۵۸۔

(۴) سنن ابن ماجہ، باب الحزن والبکاء، حدیث نمبر ۴۱۸۷:۔

(۵) العلل المتناھیۃ فی الاحادیث، کتاب النوم ۲: / ۲۱۰۔

کے وقت ان کے رونے کی آواز سنتے تھے۔(۱)

ابوشریح چلتے چلتے راستہ میں بیٹھ گئے اوراپنی چادر منھ پرلیکر رونے لگے لوگوں نے ان سے رونے کا سبب پوچھا تو انہوں نے فرمایا کہ اپنی عمر کے چلے جانے اور عمل کے نہ ہونے اور موت کے قریب آجانے کی فکر ہوئی تھی۔(۲)

امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں لکھا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رات کو بیدار رہتے تھے اور روتے تھے حتی کہ آپ کے پڑوسی آپ پرترس کھانے لگتے تھے۔(۳)

ایک مرتبہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ تمام رات ''وامتازوا الیوم ایھا المجرمون''(۴) پڑھ رہے اور روتے رہے، جسکا مطلب یہ ہے کہ ''قیامت کے دن مجرموں کو حکم ہوگا کہ دنیا میں سب ملے جلے رہے مگر اب مجرم لوگ الگ ہوجائیں''، نہ معلوم اپنا شمار مجرموں میں ہوگا یا فرما نبرداروں میں۔

حضرت محمد بن منکدر رحمہ اللہ جب روتے تو اپنے چہرے اور ریش پر آنسوں مل لیتے اور فرماتے کہ مجھ کو خبر پہنچی ہے کہ جس جگہ آنسو لگ جائیں گے وہاں آتش دوزخ نہ پہنچے گی۔(۵)

بعض اللہ کے ولی اپنی گزشتہ زندگی کو یاد کرکے اتنا روتے تھے کہ جس کی وجہ سے ان کی آنکھوں کی بینائی جاتی رہتی۔

یادکن وقتِ زادنِ تو کہ ہمہ خنداں وتو گریاں
وچناں زی کہ وقتِ مردنِ تو ہمہ گریاں وتو خنداں

یاد کرو اس وقت کو جب دنیا میں آئے تو سب خوش تھے اور تم رو رہے تھے، زندگی اس

(۱) اسلام اور ہماری زندگی: ۲/ ۱۰۳۔
(۲) قصص الاولیاء: ۶۶۱۔
(۳) اکابر کا مقام عبادت: ۲۲۷۔
(۴) سورۂ یٰس آیت: ۵۹
(۵) قصص الاولیاء: ۶۰۱۔

طرح بسر کرنا کہ جب رخصت ہو تو سب رو رہے ہوں اور تم خوش ہو۔

اللہ تعالیٰ امت مسلمہ کی تمام فتنوں سے تمام نقصانات سے حفاظت فرمائے۔ آمین

اس ملک کی سرحد کو کوئی چھو نہیں سکتا   جس ملک کی سرحد کی نگہبان ہیں آنکھیں

۱۵ جنوری انڈین آرمی ڈے
Indian army Day

فوجی کی فضیلت، فوج کا احسان، قابل اصلاح پہلو (ظلم تعصب پرستی، رشوت خوری) احساسِ ذمہ داری، مسلم جوانوں سے گذارشات۔

انڈین آرمی ڈے کا پس منظر

۱۵/ جنوری ۱۹۳۹ء سے K.M.KARIAPPA کی یاد میں منایا جاتا ہے جو ہندوستان کے سب سے پہلے سپہ سالار کی حیثیت سے FRANCISBUTECHER کے بعد عہدے پر فائز ہوئے۔

۱۹۳۸ء میں ہندوستان کو برطانوی راج سے چھٹکارا ملا اور قوم بٹ گئی، آزادی کے وقت دس گورکھا (نیپال) کے باشندے جو ہندوستانی فوج میں شامل ہوئے ہوں دستوں کے چار گروپوں کی طرف بھیجد یا گیا، برطانوی انڈین آرمی کی پناہ گاہ کو ہندوستان اور پاکستان کے نئے بنائے ہوئے حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔

انڈین آرمی ڈے کو لفٹننٹ جنرل K.M KARIAPPA کے اس دن کی یاد کو تازہ کرنے کے لئے منایا جاتا ہے جب انہوں نے ۱۵/ جنوری ۱۹۳۹ء کو کمانڈر انچیف کا عہدہ حاصل کیا، اور ساتھ ہی ساتھ اسے منایا جاتا ہے انڈین آرمی کے بہادر سپاہیوں کے احترام میں جو اب زندہ ہیں وہ اپنے عیش وآرام کو قربان کر کے اس ملک کی نگہداشت میں لگے ہوئے ہیں، اور جو گذر چکے ہیں تو انہوں نے اپنی جانوں کو قربان کر کے اس ملک کو محفوظ چھوڑا ہے۔

آرمی ڈے کا جشن انڈیا کے ان تمام ریاستوں کے کمانڈ ہیڈ کوارٹرس میں منایا جاتا ہے جہاں ہیڈ کوارٹرس موجود ہے اور جشن کی ابتدا ہوتی ہے دہلی کے امر جوان جیوتی انڈیا گیٹ سے جہاں شہید سپاہیوں کو خراج عقیدت پیش کیا جاتا ہے، اس خراج کو FOLLOW کیا جاتا ہے ملٹری شو کے ذریعے جو خاصیت ہے آرمی کے کارناموں اور ٹکنالوجی کی اور اس دن سپاہیوں کو (BRAVERY AWARDS) اور (SENEMEDALS) سے بھی نوازا جاتا ہے۔

تاریخِ ابتداء

ملایااور برمادوسری جنگ عظیم کے دوران جاپانیوں کے قبضے میں چلے گئے اور برٹش آرمی میں بھرتی متحدہ ہندوستان بشمول موجودہ پاکستانی علاقوں سے بھرتی ہونے والے فوجی اور کئی سویلین جاپانی فوجوں کے قبضے میں گئے تو وہاں پہ ان قیدی فوجیوں اور سویلین نے جاپانی فوج سے ملکرایک فوج تیار کی جس کا مقصد متحدہ ہندوستان کو برٹش غلامی سے آزاد کرانا تھا اوراس فوج کو" آزاد ہندفوج "یاانڈین نیشنل آرمی، آئی این اے کانام دیا گیا، پہلی مرتبہ آئی این اے انڈین فوج میں کیپٹن کے عہدے پہ فائز سیالکوٹ کے سکھ گھرانے کے فرزند موہن سنگھ نے بنائی تھی، اور ۱۹۴۳ء میں یہ دوبارہ بنگال سے تعلق رکھنے والے آل انڈیا نیشنل کانگریس کے سابق مرکزی صدر سبھاش چندر بوس المعروف نیتا جی کی سربراہی میں منظم ہوئی، اس میں لاہور سے تعلق رکھنے والے کیپٹن شاہنواز، ملایا سے تعلق رکھنے والی لکشمی سہگل پدماورما، حبیب خان اور کئی اور معروف کردار تھے جو آزاد ہندفوج کا حصّہ بنے، اس میں ہندو، سکھ، مسلمان اور یہاں تک کہ ملایا سے تعلق رکھنے والے کئی ایک مقامی کرسچن بھی شامل تھے۔اور آزاد ہندفوج کی جڑیں آج کے پاکستانی علاقوں خاص طور پہ پنجاب سے لیکر کنیا کماری (آج کے ہندوستان) تک پھیلی ہوئی تھیں۔

یوم آرمی منانے کا مقصد

یوم آرمی ہر سال منایا جاتا ہے یوم آرمی منانے کا ایک مقصد ہے، یہ دن عام دنوں کی طرح نہیں، اِس دن کا صرف یہی مقصد نہیں کہ تقریریں کیں، شہداء کی قبروں پر پھول چڑھائے، سلامی دی اور بس! نہیں! دفاع وطن کے لئے فوج کی قربانیاں لازوال ہیں اِسی لئے یہ دن پاک وطن کو درپیش خطرات سے نمٹنے کے لئے دی گئی قربانیوں کو یاد رکھنے کے لئے منایا جاتا ہے، ہماری آزادی آرمی کے خون کی مرہون منت ہے اور یہی شہداء ہمارا

سب سے بڑا اثاثہ ہیں، فوج کے جوانوں کی کونسی کونسی قربانیوں بھلا پائیں گے،کیا ایسے جوانوں کی مائیں قابل احترام نہیں جنہوں نے اپنے بیٹے اُس قوم پر قربان کر دیئے، کیا ساری دنیا کا مال و دولت بھی ایک ماں کو اس کا بیٹا واپس دلا سکتا ہے، آج ہم آپ جو اپنے اپنے گھروں میں سکون کی نیند سوتے ہیں کیونکہ ہمیں معلوم ہے کہ ہماری فوج ہماری حفاظت کیلئے سرحدوں پر پہرہ دے رہی ہے، ہماری بہادر اور قابل فخر فوج کے جوانوں نے نہ تو یہ قربانیاں عزت کے لئے دیں اور نہ ہی پیسے کے لئے، نہ کسی ذاتی دشمنی میں، نہ مسلکی جنگ میں بلکہ ملک کو بچانے کے لئے دی ہیں، زلزلہ ہو یا سیلاب، گرمی ہو یا سردی، زمانہ امن ہو یا جنگ، فوج ہر حال میں ملک کی حفاظت کے لیے برسر پیکار عزم وحوصلے کے ساتھ اپنی جان ہتھیلی پر لئے گھر بار سے دور ملک کی دفاعی سالمیت میں مگن ہیں، زندہ قومیں اپنے شہیدوں کو یاد رکھتی ہیں اور ان کی قربانی کو اپنے لئے فخر کا تاج بناتی ہیں۔ (آواز انٹرنیشنل لندن)

فوج سے سچی محبت کی مثال

۲۲ مئی ۲۰۱۳ء دوپہر کا واقعہ ہے جب لندن کے علاقے وولیچ میں ۲۵ سالہ ایک فوجی، لی رگبی (جو فوج میں ڈرم بجاتا تھا) کو چند وحشیوں نے چاقو سے قتل کر دیا، اُس کے قتل کی خبر جنگل میں آگ کی طرح پھیل گئی اور نہ صرف برطانیہ، بلکہ غیر ملکی میڈیا نے بھی اُسے اپنے الیکٹرنک Electronics اور پرنٹ میڈیا میں نمایاں کوریج دی، حالانکہ دیکھا جائے تو لی رگبی نے کبھی بھی کسی جنگ میں کوئی نمایاں کارنامہ انجام نہیں دیا تھا لیکن جب اُس کا قتل ہوا تو میڈیا نے صرف دو یا تین کالم خبر لگا اپنا فرض پورا کرنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ تواتر سے قتل سے لے کر معاملہ عدالت تک جانے اور پھر سزا ملنے تک روزانہ کی بنیاد پر خبریں شائع کرتا رہا اور فوج میں ایک عام سے ڈرمر کو ایک قومی ہیرو بنا دیا، یہ تو میڈیا کا کردار تھا ادھر نہ صرف اہل علاقہ بلکہ برطانیہ بھر کے عوام نے وہ جگہ جہاں قتل ہوا تھا، پھولوں اور کارڈوں سے بھر دی اور روزانہ وہاں جا کر لی رگبی کو خراج تحسین پیش کرتے رہے، خواہ بچے

ہوں یا جوان، بوڑھے حتیٰ کہ عورتوں تک نے وہاں جا کر آنسو بہائے اور اپنی فوج کے ساتھ یکجہتی کا اظہار کیا، کیونکہ دنیا بھر میں لوگ اپنی فوج سے بے حد محبت کرتے ہیں، اگر اِسے عشق کہا جا تو بے جا نہ ہوگا، زندہ قوموں کا یہی شیوہ ہوتا ہے اپنے فوج کی قربانیوں کو نہیں بھولتی ہیں، ہمیں بھی اپنے فوج کی قربانیوں کو نہیں بھولنا چاہیے جو ''اپنا آج، ہمارے کل کے لئے قربان کر گئے'' ہیں، کوئی قوم بھی اس وقت تک زندہ نہیں رہ سکتی جب تک وہ اپنے ملک اور نظریئے کی جان سے بڑھ کر حفاظت نہیں کرتی، قومیں جب تک اپنی تاریخ کو یاد رکھتی ہیں کوئی بھی جارح انہیں شکست سے دو چار نہیں کرسکتا، دنیا کی ہر قوم پر کٹھن وقت آیا ہوگا لیکن زندہ قومیں اتحاد، یکجہتی اور بے مثال جذبے سے تاریخ میں لازوال نقوش قائم کرتی ہیں جنہیں صدیاں بھی ختم کرنے سے قاصر ہوتی ہیں۔

فوج کی نوکری ایک پیشہ نہیں ایک زندگی ہے

بلند حوصلہ اور جواں عزم رکھنے والے نوجوانوں کے لیے فوج ایک پر کشش پیشہ ہے، حقیقت یہ ہے کہ ''فوج'' محض پیشہ نہیں ہے بلکہ ایک طرزِ زندگی ہے، یہ زندگی کا وہ راستہ ہے جو آدمی کو ایک بالکل مختلف سانچے میں ڈھال دیتا ہے، فوج کی تربیت ایک خام نوجوان کو ایسا کندن بنا دیتی ہے جو شہیدانِ وطن کے لہو کی طرح عروس وطن کے ماتھے کی افشاں بن کر دمکتی ہے اور مستقبل کے نوجوانوں کو جراءت وشجاعت کی داستانیں سنا کر ان کے شوق کو تیز کرتی ہے، جنگ ہو یا امن، فوج ہمیشہ مصروفِ عمل رہتی ہے، اس کے کام کی نوعیت سطح اور افرادی قوت کی گنجائش حکومت کی پالیسی کے مطابق کم یا زیادہ ہوسکتی ہے، لیکن ملک کی جغرافیائی سرحدوں کا دفاع، فوج کا بنیادی اور اوّلین فریضہ ہوتا ہے، روزگار کی صورتِ حال کی وجہ سے فوج میں آنے کے خواہش مند نوجوانوں کی تعداد میں سال بہ سال اضافہ ہورہا ہے کیوں کہ یہاں انھیں صرف محفوظ ملازمت ہی دستیاب نہیں ہے بلکہ بغیر کسی خرچ کے کئی ہنر سیکھنے اور اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے مواقع بھی میسر آتے ہیں، فوج کے کسی بھی شعبے سے

تعلق رکھنے والے فرد کا بنیادی کام ملک کا دفاع ہے، جو لوگ فوج میں آنے کی خواہش رکھتے ہیں، انھیں یاد رکھنا چاہیے کہ فوجی زندگی پھولوں کی سیج نہیں، یہ عزت، عظمت اور وقار عطا کرتی ہے تو جاں فشانی اور محنت بھی مانگتی ہے، وقت پڑنے پر اس کے افسر اور جوان چٹان بن کر سرحدوں پر ڈٹ جاتے ہیں اور دشمن کو تہس نہس کر دینا ان کا مقصدِ اوّلیں قرار پاتا ہے، یہ راستہ کامیابی کا راستہ ہے، سرخ روئی تو ہر حال میں مقدر ہے، زندہ رہے تو غازی اور شہید ہو جائیں تو ہمیشہ رہنے والوں کی صفوں میں شامل۔

فوج میں شامل ہونے والوں کی قسمیں

بیش تر نوجوان جذبہ حب الوطنی سے سرشار ہو کر وطن کی خدمت کے لیے آتے ہیں، مہم جو نوجوانوں کو خطرات سے کھیلنے کا شوق اس راستے پر لے آتا ہے، سیّاحت کے شوقین ہواؤں میں اڑنے اور سمندروں میں سفر کی لگن لے کر آتے ہیں اور کچھ لوگ ہوتے ہیں جو سخت کوشی کو ایک چیلنج سمجھ کر یہ راستہ اختیار کرتے ہیں، نظم وضبط فوج کی زبردست تنظیم کی بنیادی طاقت ہے، جو لوگ فوج میں شامل ہوتے ہیں، انھیں اپنی زندگی کو نظم وضبط کا عادی بنانا پڑتا ہے، نظم وضبط قبول کرنا ہوتا ہے اور احکامات کی تعمیل کرنا ہوتی ہے، دوسروں کے ساتھ مل جل کر ایک ٹیم کی صورت کام کرنے اور ہم کار ساتھیوں سے مانوس ہونے کی صلاحیت بھی لازمی ہے فوج سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ صاف ستھری، خوش لباس اور سلیقہ مند ہو، لڑاکا فوج کے افراد کو خصوصاً سخت جان اور مضبوط جسم کا ہونا چاہیے، اپنے پیشے کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے جوش، ولولہ، جذباتی حوصلہ، اطاعت اور رفاقت کی خصوصیات بھی ضروری ہیں، فوج کے افسر بالعموم پیشہ ورانہ قابلیت کے حامل ہوتے ہیں اور انھیں انتظامی اور تنظیمی امور انجام دینے ہوتے ہیں، انھیں اپنے محدود حلقہء اختیار میں، قائدانہ ذمہ داریاں پوری کرنا ہوتی ہیں، فوج کے جوان اپنے افسران کے کردار اور عمل سے تحریک پاتے ہیں، مسلح افواج کا پیشہ اختیار کرتے ہوئے یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ ملک اور بیرونِ ملک کسی بھی جگہ کسی

بھی موسم میں کام کرنا ہوگا، جو ملازم گھروں سے باہر نوکری کرتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ چھٹی کیا ہوتی ہے اور کیوں اس چھٹی کے لیے باہر کام کرنے والے ملازمین تڑپتے رہتے ہیں اپنوں سے اتنا دور کہ گھر والوں کو یاد کر کے آنسو بھی بہائیں تو وہ آنکھوں سے بمشکل نکل پاتے ہیں اور باہر آتے ہی خشک ہو جاتے ہیں، جو گھر کی یاد میں کھل کر رو بھی نہ سکتے چھپ کر رونا پڑتا ہے کہ کوئی خشک آنسوؤں کو دیکھ نہ لے، فوج کی نوکری جذبات کو بھی قابو میں کر لیتی ہے اور رونا دھونا بھی ملازمت کے زمرے میں آجاتا ہے، کیا مجال کہ کوئی فوجی عام سویلین ملازم کی طرح چھٹی ہی منا سکے۔

فوجی اکثر و بیشتر اپنی ملازمت کو اگرچہ نوکری ہی سمجھتے ہیں اور چھٹی کے انتظار میں دن گنتے رہتے ہیں لیکن یہ نارمل حالات میں ہی ہو سکتا ہے غیر معمولی حالات میں یہ نوکری ایک قومی فرض بن جاتی ہے، فوجیوں کے لیے چھٹیاں حالات یعنی امن اور جنگ کے ماتحت ہوتی ہیں، امن ہے تو چھٹیاں ہیں ورنہ جنگ ہے جس کے لیے اس نے جان لڑانے کا عہد کر رکھا ہے۔

سچے فوجی کی تمنا

فوج میں بھرتی کا عہد نامہ جنگ میں جان دینے کا عہد ہوتا ہے، ہر فوجی کو بخوبی علم ہے کہ اس کا اصل دشمن کون ہے چنانچہ اس کی پوری نوکری اس دشمن سے ملاقات کی آرزو میں گزر جاتی ہے اور جب وہ صحیح وسلامت گھر واپس آتا ہے تو وہ اندر سے ایک عجیب کیفیت میں مبتلا ہوتا ہے وہ اپنے آپ سے چھپتا پھرتا ہے کہ وہ جس مشن پر گیا تھا اس سے پہلے ہی وہ واپس لوٹ آیا، جس فوجی کو میدان جنگ میں جانے کا اتفاق نہ ہو وہ دکھی ہو جاتا ہے اور فوج سے واپسی پر وہ چپ چپ رہتا ہے کہ اس کے پاس جنگ کی کوئی کہانی نہیں ہوتی وہ کسی کہانی کا کردار نہیں ہوتا، وہ فوجی ہی کیا جو جنگ کا مزا چکھے بغیر واپس آجائے، کسی جنگ میں شمولیت کے بغیر فوجی اپنے آپ کو فوجی نہیں کہلا سکتا اور پنشن پر گزر بسر ایک شرمندگی ہوتی

ہے، پنشن وہ ہے جو کسی معرکے میں شمولیت کے بعد ملتی ہے اور جس کی ماہ بعد وصولی پر فخر ہوتا ہے، ایسے فوجی پنشن لینے کے لیے ڈاک خانے جاتے ہوئے فخر محسوس کرتے ہیں کہ ملک کے لیے جان کی بازی لگانے کے بعد انھیں اس کی یہ نشانی ملی ہے جو اس کے لیے ایک فخر ہے۔

فوجی جو اپنی جوانیاں ملک کی خاطر فوج کی نذر کر چکے ہیں ان کے ساتھ جب فوجی زندگی کی بات کریں تو ان کے چہرے کا رنگ بدل جاتا ہے وہ اپنے آپ کو پھر کسی میدان جنگ میں سرگرم سمجھتے ہیں اور فخر کرتے ہیں کہ ملک کی خاطر کوئی قربانی دینے کا موقع ملا تو انھوں نے اسے جانے نہیں دیا اور اب وہ اپنی اس قومی عزت کو اپنے اولاد کو منتقل کرنا چاہتے ہیں مگر اب وہ نسل رفتہ رفتہ گم ہوتی جا رہی ہے جو بھرتی کے وقت سینہ پھلا کر معائنہ کراتی تھی کہ بھرتی ہو جائیں اور فوج کی وردی زیب تن کر سکیں، کہاں کسی دفتر میں کلرکی اور کہاں قومی دفاع کے لیے فوج میں شمولیت جس میں زندگی کسی بھی حادثے سے دوچار ہو سکتی ہے لیکن کوئی حادثہ ایسا بھی پیش آسکتا ہے جو کسی کو زندہ جاوید کر دیتا ہے، دنیا اور آخرت دونوں میں ذریعہ نجات، نوکری بہر حال نوکری ہی ہوتی ہے جس میں کوئی اپنے آپ کو کسی خدمت کے لیے پیش کرتا ہے لیکن ملازم تو وہ ہے جو کسی ایسے محکمے میں جگہ پالے جو قومی خدمت کا ذریعہ ہے لیکن ملک کی خدمت کسی بھی نوکری میں کی جا سکتی ہے، وطن عزیز اس لحاظ سے خوش قسمت ہے کہ اس کے پاس دنیا کی بہادر، محنتی اور جفاکش فوج موجود ہے۔ (آواز انٹرنیشنل لندن)

ملٹری کا احسان

ہم بلاشبہ یہ اقرار کرتے ہیں کہ فوج کا ہم پر بڑا احسان ہے کیونکہ کی سرحد پر تعینات فوج کے جوانوں کا جب ذکر چھڑ جاتا ہے تو بلاشبہ ان کی جوانمردی، جاں نثاری، جانبازی اور دشمنوں کے چھکے چھڑا دینے کا ان کا لاثانی حوصلہ سب کی نگاہوں کے سامنے پھر جاتا ہے اور

پھر ہر ہندوستانی کا سینہ بھی بلاشبہ ۵۶ انچ کا ہوجاتا ہے جیسا کہ ہم سب واقف ہیں کہ جوانوں کے ذریعہ کی جانے والی ملک کی سرحدوں کی حفاظت سے ہی دنیا میں وطن عزیز کی شان وشوکت دوبالا ہوتی ہے، اور بلاشبہ یہی وجہ ہوتی ہے کہ جب وطن عزیز کے جوانوں کا ذکر آتا ہے تو خود بخود ہمارا ہاتھ اوپر اٹھ جاتا ہے یہی وہ جوان ہوتے ہیں جو اپنی ذاتی خوشیوں اور گھر کے عیش وآرام سب کو قربان کردیتے ہیں، موسم کی ہر طرح کی سنگینی کو برداشت کرلیتے ہیں، اور وطن کی حفاظت کے لئے ہر لمحہ سنگینیوں کے سائے میں بڑی مستعدی اور حوصلہ مندی کے ساتھ اپنی زندگی بسر کرتے ہیں۔ جس کا براہِ راست اثر تو یہ ہوتا ہے کہ ہمیں سکھ وچین اور اطمینان کی زندگی نصیب ہوپاتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ جب کبھی وطن عزیز میں دشمن ممالک کی جارحیت کو روکنے اور ان کے دانت کھٹے کردینے کی ضرورت پڑجاتی ہے تو یہی وہ جوان ہوتے ہیں جو یکلخت آگے بڑھتے ہیں اور ملک کی سرزمین کی حفاظت کرنے میں، جہاں کہیں بھی ضرورت پڑتی ہے، وہاں بخوشی اپنی جان کی قربانی تک پیش کردیتے ہیں، اور اس میں کوئی دریغ نہیں کرتے ہیں۔

لیکن جب کبھی کسی قوم کو طاؤس ورباب کا دور دورہ ہوجاتا ہے تو پھر اس کے راہ راست سے ہٹنے میں وقت درکار نہیں ہوتا اسی طرح پولیس اور فوج کا مسئلہ ہے کہ ان کے ظلم وجبر پر قانون کا سکوت انہیں اور زیادہ عیش کوشی اور شراب نوشی کا عادی بنادیتا ہے۔

فوجیوں کے محکمہ کی تربیت کے ساتھ ان کی غذا اور ان کے ناروا سلوک کا مسئلہ حل کیا جانا چاہئے ۲۰۱۷ء کو جب بی ایس ایف کے جوان تیج بہادر نے سوشل میڈیا پر اپنی ویڈیو وائرل کی تو ہنگامہ کھڑا ہوگیا جس میں اس نے یہ واضح کیا کہ ہمیں یہاں معیاری غذا نہیں ملتی اور اس نے بتایا کہ روٹی اور دال ایسی جو ہلدی اور نمک کا پانی معلوم ہو اس کے بعد بھی چند بیانات سامنے آئے جس میں یہاں تک الزامات عائد کئے گئے کہ بڑے عہدیدار فوجیوں کی غذا کو بازار میں آدھی قیمت پر بیچ ڈالتے ہیں اور اپنے گھر کے کام ان سے لیتے ہیں حتی کہ

جوتے پالش کرواتے ہیں بچوں کو اسکول چھوڑنے کا حکم کرتے ہیں اور ان سے اضافی خدمات لیتے ہیں۔

فوجی کے ساتھ حکومت کی مکاری

بھارتی میڈیا رپورٹس کے مطابق شہر کام روپ ضلع کے بوکو پولیس اسٹیشن کی حدود میں واقع گاؤں کولوہیکاش کے رہائشی تیس سالوں تک بھارتی فوج کے لیے خدمات انجام دینے والے محمد ثناء اللہ کو غیر ملکی قرار دیے جانے کے بعد انہیں اہل خانہ سمیت حراستی مرکز منتقل کر کے نظر بند کر دیا گیا، ٹریبونل کی جانب سے جاری ہونے والے فیصلے میں کہا گیا تھا کہ ثناء اللہ ۲۵ مارچ ۱۹۷۱ء سے قبل اپنے ہندوستانی ہونے کا ثبوت دیں اور یہ بھی شواہد فراہم کریں کہ وہ بھارت کے کس علاقے میں پیدا ہوئے؟

ثناء اللہ ۵۲ سال کی عمر میں اگست ۲۰۱۷ میں فوج کے الیکٹرانکس اینڈ میکینکل انجینئر electronic mechanical engineering (ای ایم ای) کورس میں صوبے کے عہدے سے مستعفیٰ ہوئے تھے، انہوں نے ٹریبونل Tribunal کو دیے گئے بیان میں کہا تھا کہ وہ جموں کشمیر اور بھارت کے شمال مشرق حساس علاقوں میں تعینات رہے، رہائش منتقلی کی وجہ سے اُن کے پاس پیدائشی سرٹیفکٹ نہیں ہیں۔

سابق فوجی افسر کے وکلاء اور اہل خانہ کا کہنا ہے کہ ثناء اللہ ہندوستانی شہری ہیں اور اُن کے آباؤ اجداد کی ٹریبونل Tribunal کو پیش کر دی گئیں تھیں جس میں اُن کے بھارتی ہونے کے واضح ثبوت ہیں، وکیل کا کہنا تھا کہ ثناء اللہ نے ٹریبونل میں اپنا حلف نامہ بھی جمع کرایا جس میں بتایا گیا ہے کہ وہ ۱۹۸۷ء میں فوج میں بھرتی ہوئے تھے، زبانی طور پر بھی انہوں نے تفتیش کے دوران فوج میں بھرتی ہونے کا سال ۱۹۷۸ء بتایا لیکن ٹریبونل کے افسروں کے ذریعے وہ غلطی سے ۱۹۷۸ء ریکارڈ ہو گیا، اُن کا کہنا تھا کہ ہم نے اس وقت اس

کی مخالفت نہیں کی کیونکہ کورے کاغذ پر ان کے دستخط لئے گئے تھے، ثناء اللہ نے بتایا کہ انہوں نے ملک کی فوج میں ۳۰ سالوں (۱۹۸۷ء۔ ۲۰۱۷ء) تک انجینئرنگ محکمے کے ایک افسر کے طور پر خدمات انجام دیں اور ۲۰۱۴ء میں صدر جمہوریہ ایوارڈ سے نوازا کیا گیا، جس نے ایمانداری کے ساتھ ملک کی خدمت کی جس کے بدلے میں انہیں غدار کہہ کر گرفتار کیا گیا۔ (ویب ڈیسک ۳۰ مئی ۲۰۱۹ء)

ڈاڑھی اور فوجی ملازمت

اے ئرفورس Force کے مسلم فوجی جناب آفتاب احمد انصاری کو شرعی داڑھی رکھنے کی وجہ سے ۲۰۰۸ء میں فوج سے نکال دیا گیا تھا، موصوف نے پہلے کرناٹک ہائی کورٹ میں اپیل داخل کی تھی مگر وہاں کامیابی نہیں ملی تو پھر انہوں نے سپریم کورٹ کا دروازہ کھٹکھٹایا، آفتاب احمد انصاری کی دلیل تھی کہ جب فوج میں سکھوں کو داڑھی رکھنے اور پگڑی پہننے کی اجازت ہے تو مسلمان داڑھی کیوں نہیں رکھ سکتا، آفتاب احمد کی درخواست کے جواب میں ہندوستانی اے ئرفورس نے کہا کہ تمام مسلمان داڑھی نہیں رکھتے ہیں، حالانکہ زمینی حقائق یہ ہیں جس کا کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ جس طرح مسلمانوں کی اچھی خاصی تعداد داڑھی نہیں رکھتی، اسی طرح سکھوں کی بھی قابل ذکر تعداد داڑھی نہیں رکھتی ہے اور سکھوں میں داڑھی نہ رکھنے کا رواج روز بروز بڑھتا ہی جارہا ہے، اس لئے ہندوستانی اے ئرفورس کا یہ کہنا اور پھر سپریم کورٹ کا اس کے مطابق فیصلہ کرنا آزادی مذہب کے خلاف ہے۔ ہندوستانی قوانین کے مطابق ہر شہری کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی مذہبی تعلیمات کے مطابق زندگی گزارے، یقیناً ہم سپریم کورٹ کے فیصلہ کا احترام کرتے ہیں، لیکن سپریم کورٹ کو یہ سوچنا چاہئے کہ جب فوج کے کسی بھی عہدہ پر ایک سکھ مکمل داڑھی اور پگڑی کے ساتھ ملازمت کرسکتا ہے اور اس کی وجہ سے فوج کے نظم وضبط میں کوئی فرق نہیں پڑتا تو پھر ایک مسلمان کا شرعی داڑھی رکھنا اُن کو فوج میں مساوات کے خلاف نظر آتا ہے، آخر ایسا کیوں؟ یاد رہے کہ آفتاب

احمد نے اپنے کمانڈنگ افسر سے داڑھی رکھنے کی اجازت مانگی تھی جو پہلے دے دی گئی تھی، پھر اجازت واپس لے لی گئی اور ان کا متعدد جگہوں پر تبادلہ بھی کیا گیا اور آخر کار شرعی داڑھی رکھنے کی وجہ سے انہیں ۲۰۰۸ء میں سروس سے ہٹادیا گیا، ویسے ہی ہندوستانی فوج میں مسلمانوں کا تناسب آٹے میں نمک کے برابر ہے، ظاہر ہے کہ عام مسلمانوں کی طرح مسلم فوجی بھی داڑھی نہیں رکھتے، اگر کوئی مسلم فوجی اپنے مذہب کی تعلیمات کی روشنی میں شرعی داڑھی رکھنا چاہتا ہے اور فوج میں سکھوں کی اچھی خاصی تعداد داڑھی اور پگڑی کے ساتھ موجود ہے، جب سکھوں کے داڑھی رکھنے اور پگڑی باندھنے سے فوج کے نظام میں کوئی فرق نہیں پڑتا تو ایک مسلمان کے شرعی داڑھی رکھنے سے فوج کا نظام کیوں درہم برہم ہو رہا ہے؟

غرضیکہ آفتاب احمد انصاری کو اس لئے فوج کی خدمات سے نہیں ہٹایا گیا کہ وہ ڈیوٹی کو صحیح طور پورا انجام نہیں دیتا تھا یا رشوت لیتا تھا یا شراب پیتا تھا یا چوری کرتا تھا، بلکہ صرف اور صرف اس لئے کہ وہ اسلامی شعار پر عمل کرتا تھا یعنی شرعی داڑھی رکھتا تھا۔

ڈاکٹر نجیب احمد قاسمی صاحب کو ایک نوجوان نے اپنا حال سنایا جو پڑوس ملک کا ہے کہ ’’میں نے ایئر فورس میں پائلٹ کے لیے امتحان دیا تھا، میڈیکل ٹیسٹ اور انٹرویو کے بعد بحمد للہ امتحان اور کھیلوں میں بھی کامیاب ہوا، مگر بغیر وجہ بتائے ہوئے مجھے مسترد کر دیا گیا۔ اب کئی لوگوں نے مجھے بتایا کہ تم صرف ڈاڑھی نہ منڈوانے کی وجہ سے رہ گئے تھے مگر مجھے یقین نہ آیا۔

اب دسمبر میں میں نے پی ایم اے کے لیے امتحان دیا پہلے انٹرویو میں کمیٹی کے ایک بریگیڈیئر Brigadier صاحب نے مجھے بتایا کہ تم پہلی دفعہ کوہاٹ میں صرف ڈاڑھی کی وجہ سے رہ گئے تھے، اور یہ بھی کہا کہ پاکستانی فوج کے افسر ڈاڑھی والے کیڈٹ کو پسند نہیں کرتے اور کوشش یہ ہوتی ہے کہ ایسا کوئی آدمی نہ لیا جائے، ہاں بعد میں اجازت لے کر ڈاڑھی رکھی جاسکتی ہے، اس کے بعد میں نے تحریری امتحان دیا اور اس میں کامیاب ہوا،

اب اس کے بعد میڈیکل ہوگا اور اس کے بعد کوہاٹ جانا پڑے گا، اس وجہ سے میرے پانچ بھائی اور اب والد صاحب پیچھے پڑے ہوئے ہیں کہ ڈاڑھی کو صاف کراؤ، مگر میں عزت، عہدے اور روپیہ کے لیے ایسا کام کرنے کو تیار نہیں ہوں، میں اپنی حالت میں رہ کر تجارت کروں گا اور یا مزید تعلیم حاصل کر کے اسلام کی خدمت کرنا چاہتا ہوں، کیونکہ ان ملازمتوں سے میرے مذہبی احساسات مجروح ہوں گے، میں زیادہ دیر تک صبر نہیں کر سکتا مگر قبل اس کے کہ آخری فیصلہ کروں، میں آپ سے مشورہ لینا ضروری سمجھتا ہوں، آپ کتاب وسنت کی روشنی میں میری رہنمائی کریں، میں آپ کا بہت ممنون ہوں گا''۔

ڈاکٹر نجیب صاحب کا جواب تھا کہ ''آپ نے جو حالات لکھے ہیں انہیں پڑھ کر انتہائی افسوس ہوا، پاکستان کی فوج اور فضائیہ میں آج بھی بکثرت ایسے لوگ موجود ہیں جو تقسیم سے قبل متحدہ ہندوستان کی فوج یا فضائیہ میں سکھوں کے ساتھ، بلکہ بعض تو ان کے ماتحت کام کر چکے ہیں، ان کو خوب معلوم ہے کہ رعب، خوبصورتی، چستی اور دوسرے جن جن پر فریب الفاظ کو استعمال کر کے آج یہ لوگ ڈاڑھی کو فوج اور فضائیہ میں حرام کیے ہوئے ہیں ان میں سے کوئی حیلہ اور بہانہ نہ تو سکھوں سے ڈاڑھی منڈوا سکا اور نہ کسی بڑے سے بڑے عہدے تک ان کے پہنچنے میں مانع ہو سکا، آج بھی متحدہ ہندوستان کی فوج اور بحریہ اور فضائیہ میں سکھ بڑے سے بڑے عہدوں پر فائز ہیں اور کسی کی یہ جرأت نہیں ہے کہ ان سے یہ کہہ سکے کہ تمہیں ملازمت کرنی ہے تو ڈاڑھی منڈوا کر آؤ، یا اگر تم ڈاڑھی رکھو گے تو تمہیں ملازمت میں نہ لیا جائے گا۔

اس سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ ہمارے مسلمان افسر صاحبان ڈاڑھی والوں کو ملازمت میں نہ لینے، یا ڈاڑھی منڈوانے کو ملازمت کے لیے شرط قرار دینے کے لیے جتنے بہانے بناتے ہیں وہ سب بالکل لغو اور بے ہودہ ہیں، اصل بات یہ نہیں ہے کہ ڈاڑھی رکھنے سے فوجی ملازمت کے لیے آدمی کی اہلیت یا موزونیت میں کوئی فرق آجاتا ہے۔ بلکہ

اصل بات یہ ہے کہ انگریز کی بندگی نے ان لوگوں کو سکھوں کی بہ نسبت بہت زیادہ گھٹیا درجے کی غلامانہ ذہنیت میں مبتلا کر دیا ہے۔ سکھوں نے بھی وہی مغربی تعلیم پائی ہے جو انہوں نے پائی ہے اور اسی انگریز کی وہ بھی نوکریاں کرتے رہے ہیں جس کی یہ کرتے رہے ہیں۔ کسی میدان میں وہ ان سے پیچھے نہیں رہے۔ لیکن وہ آج تک بھی مغرب زدگی کی اس ذلیل انتہا کو نہیں پہنچے کہ گورنانک اور گوروگوبند سنگھ اور اپنے مذہب کے دوسرے اکابر کی پیروی کو نفرت کی نگاہ سے دیکھیں اور اسے نالائقی کا نشان سمجھیں۔ یہ شرف صرف ہمارے فرنگیت زدہ حضرات ہی کو نصیب ہوا کہ انہوں نے جب انگریز کی بندگی اختیار کی تو اپنا سب کچھ لا کر خداوند انگریز کے قدموں میں ڈال دیا۔ صرف اتنا ہی نہیں کہ یہ لوگ انگریز کی نوکری حاصل کرنے کے لیے بخوشی ڈاڑھیاں مونڈنے پر راضی ہو گئے، بلکہ رفتہ رفتہ یہ اتنے بگڑے کہ انہوں نے خود ڈاڑھی کو نالائقی کا نشان تسلیم کرلیا۔ حالانکہ ڈاڑھی جس طرح سکھوں کے اکابر مذہب کی سنت تھی اسی طرح وہ مسلمانوں کے اکابرِ دین کی سنت بھی تھی، اور جس طرح سکھوں کو ان کے پیشوائے دین نے اس کے رکھنے کا حکم دیا تھا اسی طرح مسلمانوں کو بھی نبی ﷺ نے اس کے رکھنے کی تاکید اور مونڈنے کی ممانعت فرمائی تھی۔ اس صورتحال کو جب میں دیکھتا ہوں تو مجھے بڑی شدت کے ساتھ یہ احساس ہوتا ہے کہ مسلمان خود اپنے ہی ہم سر اور ہم عصر غیر مسلمانوں کی بہ نسبت سیرت و کردار کے اعتبار سے کتنے فروتر ثابت ہوئے ہیں۔ (ترجمان القرآن۔ جلد ۵۹، عدد ۶۔ مارچ ۱۹۶۳ء)

نوجوان ہمت نہ ہاریں

جن نوجوانوں کے اندر دینی غیرت وحمیت موجود ہے وہ ان حالات میں پست ہمت نہ ہوں اور کوئی کمزوری نہ دکھائیں، ان کو چاہیے کہ ہر مقابلے کے امتحان میں شریک ہو کر اپنی قابلیت و اہلیت ثابت کر دیں اور اس کے بعد جب صرف ڈاڑھی کے سبب سے ان کو ملازمت میں لینے سے انکار کیا جائے تو ملازمت سے محرومی کو قبول کرلیں اور ڈاڑھی ہرگز نہ

مونڈیں، اس طرح اگر غیرت مند مسلمان نوجوان پے در پے عمل کرتے رہیں گے تو انشاء اللہ یہ بات بالکل ثابت ہو جائے گی کہ ڈاڑھی رکھنے والے نااہل نہیں ہیں بلکہ ان پر ملازمتوں کے دروازے بند کرنے والے نام نہاد روشن خیال افسر انتہائی تنگ نظر ہیں اور وہ اپنی اسی تنگ نظری کے باعث اپنے ملک کی ملازمتوں کو مضبوط سیرت و کردار رکھنے والے نوجوانوں سے محروم کر رہے ہیں، ہماری حکومت اگر یہی پسند کرتی ہے کہ صرف پیٹ اور ضمیر و ایمان کی قربانی دینے والے ہی ملازمتوں میں رہ جائیں اور تمام ایماندار و بلند کردار لوگوں پر ملازمتوں کے دروازے بند رہیں تو وہ جب تک چاہے اپنی اس تباہ کن پالیسی پر چلتی رہے، آخر اس کو معلوم ہو جائے گا کہ اس نے اس حماقت سے اپنا اور ملک کا کس قدر نقصان کیا ہے۔

جنگِ عظیم اول میں مسلمان فوجیوں کی قربانیاں

فرانس کا قومی جنگی قبرستان نوٹرے ڈیم ڈی لورٹ Notre dame de• Lourdes یل کے رقبے پر پھیلا ہوا ہے، اس قبرستان میں زیادہ تر ان لوگوں کے مقبرے ہیں جنہوں نے اتحادیوں کی جانب سے پہلی جنگِ عظیم کے دوران مغربی فرنٹ پر جنگ لڑی تھی، ارآس کے قصبے کے قریب شمالی فرانس کے اس حصے میں 1.5 بلین آرٹلری شیل داغے گئے تھے جس کی وجہ سے فوجیوں نے اس علاقے کو ''شمال کا جہنم'' یا ''قبرستان'' کا نام دے دیا گیا تھا لیکن اس جنگ کے دوران جن سپاہیوں نے سب سے زیادہ مقبولیت حاصل کی وہ مسلمان فوجی تھے جو اتحادیوں کی جانب سے جنگ لڑ رہے تھے۔ دنیا کے شدید گرم اور گرم مرطوب خطوں سے جانے والے ان مسلمان فوجیوں کے ساتھ ایک پیش امام بھی تعینات کیا جاتا تھا جس کے فرائض میں مسلمان فوجیوں کو باجماعت نماز ادا کروانا اور کسی مرتے ہوئے فوجی کے کان میں اذان دینا بھی شامل تھا مسلمان فوجیوں کے نماز ادا کرنے کے لئے بھی فرنچ ہائی کمانڈ French High comand کی جانب سے خصوصی

احکامات جاری کئے گئے تھے جن کے مطابق اگر لڑائی کی شدت زیادہ ہو تو مسلمان فوجی اپنے سر اور جسم کی جنبش سے نماز ادا کر سکتے تھے اور امن کے وقفے میں مکمل نماز ادا کرنے کی اجازت تھی، ان فوجیوں کے ساتھ آئے ہوئے باورچیوں کے ہاتھوں کے بنے ہوئے حلال کھانے بھی مسلمان فوجیوں کو روزانہ کی بنیاد پر فراہم کئے جاتے تھے جب لڑائی کے دوران دوائیاں اور میڈیکل کا دوسرا سامان ختم ہو جاتا تھا تو یہ لوگ اپنے علاقوں سے لائی ہوئی جڑی بوٹیوں سے اپنے عقائد کے مطابق زخمیوں اور بیماروں کا علاج خود کرتے تھے، ایک دوسرے کا حوصلہ بلند رکھنے کے لئے یہ سپاہی اپنی مقامی زبانوں میں ایک دوسرے کو مقامی نغمے بھی سناتے رہتے تھے، نوٹرے ڈیم ڈی لورٹ میں جہاں مغربی فرنٹ پر ہلاک ہونے والے ۴۰،۰۰۰ فرانسیسی سپاہیوں کی قبریں موجود ہیں وہیں پر ایک کونے میں ان مسلمان سپاہیوں کو بھی خراجِ عقیدت پیش کیا گیا ہے، اس قبرستان میں مسلمان سپاہیوں کی قبروں کو ان کے کتبوں کی وجہ سے پہچانا جا سکتا ہے جن پر قرآنی آیات لکھی ہونے کے ساتھ ساتھ ان کتبوں کا رخ بھی مکہ مکرمہ کی جانب ہے، ان کتبوں کا ڈیزائن فرانسیسی پینٹر ایٹائن ڈینٹ France paint royd dent نے بنایا تھا جو کہ ۱۹۰۸ء میں مشرف بہ اسلام ہوئے تھے آرمسٹس ڈے کی یادگاری تقریبات کے دوران برطانوی مسلمانوں کی طرف سے شمالی افریقہ سے تعلق رکھنے والے مسلمان فوجیوں کی قبروں پر فاتحہ خوانی کی گئی تھی، تحقیق کے مطابق جنگِ عظیم اول کے دوران تقریباً ۲۵ لاکھ مسلمانوں نے الائیڈ فورسز کی جانب سے بطور فوجی یا مزدور حصہ لیا تھا، یہ وہ اعداد و شمار ہیں جو کہ تاریخ میں پہلی دفعہ فار گاٹن ہیروز ۱۹۔۱۴ فاؤنڈیشن کی انتھک کوششوں کی وجہ سے سامنے لائے جا سکے، ان مسلمان فوجیوں کا تعلق افریقہ، انڈیا، مشرقِ وسطیٰ، روس اور حتیٰ کہ امریکہ سے بھی تھا جنہوں نے عیسائی اور یہودی فوجیوں کے ساتھ مل کر نا صرف بہادری سے دشمن کا مقابلہ کیا بلکہ اپنی جانوں کا نذرانہ بھی پیش کیا۔ فریئر اور ان کی ٹیم کے مطابق تاریخ کے اس باب کو دنیا کے سامنے لانے سے اس

حوالے سے یورپ میں موجود مسائل کا خاتمہ کیا جاسکتا ہے اور بین المذاہب ہم آہنگی کو فروغ دیا جاسکتا ہے، ان دستاویزات میں ایسے واقعات بھی درج ہیں جن میں مسلم اماموں، عیسائی راہبوں اور یہودی ربیوں نے ایک دوسرے کی آخری رسومات سیکھیں تاکہ ایک دوسرے کے فوجیوں کو دفن کرنے میں آسانی رہے، ایسے بھی بہت سے واقعات موجود ہیں جب مسلمان فوجیوں نے بھوکے سویلینز Swindler کو اپنا کھانا دے دیا اور دیگر ممالک سے تعلق رکھنے والے فوجی جرمن قیدیوں کے ساتھ مسلمانوں کے ہمدردانہ رویئے سے بھی بے حد متاثر ہوئے تھے، فریئر، جو کہ خود مسلمان نہیں ہیں، کا کہنا ہے کہ پورے یورپ میں اس وقت اسلاموفوبیا پھیل رہا ہے جس پر قابو پانے کے لئے ہمارا پراجیکٹ انتہائی اہم ہے جس سے لوگوں کو مشترکہ تاریخ کے بارے میں بتاتے ہوئے ہم آہنگی فروغ دینے میں مدد ملے گی دائیں بازو کی جماعتوں کی وجہ سے ایسا ظاہر کیا جاتا ہے کہ مسلمان یورپ میں ابھی داخل ہوئے ہیں اور انہوں نے یورپ کی ترقی میں کوئی کردار ادا نہیں کیا لیکن ہم اس پراجیکٹ کے ذریعے ان کو یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ مسلمانوں نے یورپ کو آزاد کروانے کے لئے اپنی جانوں کے نذرانے پیش کئے ہیں، اس پراجیکٹ کے بڑے مقاصد میں آج کی نوجوان نسل کو ان کے درمیان رہنے والی مسلمان کمیونٹیز کو بہتر انداز میں سمجھنے میں مدد دینا ہے، اس پراجیکٹ کے تحت نہ صرف سکول School کے بچوں کو جنگ عظیم اول کے ہیروز Heroes اور مسلمانوں کی قربانیوں کے بارے میں بتایا جاتا ہے بلکہ غیر مسلموں کو بھی مساجد میں آکر اس تحقیق کے بارے میں جاننے اور مسلمانوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانے کی ترغیب دی جاتی ہے۔ ’فارگاٹن ہیروز ۱۴۔۱۹ فاؤنڈیشن‘ کی تحقیق کو پوری دنیا میں سراہا گیا ہے اور پچھلے مہینے فریئر نے اس حوالے سے ہارورڈ یونیورسٹی کے تاریخ دانوں کو اس موضوع پر لیکچر دیا ہے اس کے علاوہ فاؤنڈیشن کی جانب سے اس موضوع پر اقوام متحدہ میں مقالہ بھی پیش کیا گیا ہے۔ لیوک فریئر اور ان کی فاؤنڈیشن جنگِ عظیم اول میں مسلمان فوجیوں

اور مزدوروں کی قربانیوں کو دنیا کے سامنے لا کر یورپ سمیت پوری دنیا میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان بڑھتی ہوئی خلیج کو پاٹنے میں مصروف ہے تا کہ آنے والی نسلیں ایک پُر امن دنیا میں سانس لے سکیں۔(دی گارڈین، ترجمہ :اکرام الاحد، ۱۵ نومبر 2017)

فوج کی قسمیں

بھارتی مسلح افواج (Indian Armed Forces) بھارت کی رسمی فوج ہے جو تین پروفیشنل professional خدمات پر مشتمل ہے: بریہ (آرمی)، بحریہ (نیوی) اور فضائیہ (ایئرفورس) مسلّح افواج کے تین شعبے ہیں۔ ہر شعبے کا بنیادی کام ملک کی جغرافیائی سرحدوں کی حفاظت کرنا ہے، لیکن اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ان تینوں افواج کا ہر شعبہ متعدد ذیلی شعبوں میں تقسیم ہوتا ہے، فوج کو صرف لڑاکا جوانوں اور افسروں ہی کی ضرورت نہیں ہوتی، اسے ڈاکٹر، انجینئر، اساتذہ اور دیگر متعدد ہنر مندوں اور تکنیکی مہارت رکھنے والے افراد کی بھی ضرورت ہوتی ہے، جیسے جیسے دفاعی سائنس میں تکنیکی مہارت بڑھتی جارہی ہے، ویسے ویسے تکنیکی صلاحیتیں رکھنے والوں کی طلب واہمیت میں اضافہ ہو رہا ہے۔

بھارتی بری فوج :۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو بھارت کی آزادی کے بعد قائم کی گئی، اس کی افرادی قوت میں ۱۱ لاکھ حاضر سروس فوجی جبکہ ۹ / لاکھ ۶۰ / ہزار ریزرو Racers فوجی شامل ہیں اس کا ہیڈ کوارٹر نئی دہلی بھارت میں واقع ہے۔سنہری، سرخ اور سیاہ رنگ بھارتی فوج کے رنگ ہیں۔

بھارتی بحریہ : بھارتی مسلح افواج کی بحری برانچ ہے، اس کا قیام ۱۹۴۷ء میں عمل میں آیا اس کے پاس ۶۷،۰۰۰ سپاہی ہیں اور ۱۷۰ جہاز جبکہ ۲۵۰ ہوائی جہاز ہیں نیوی بلو اور سفید رنگ اس کے رنگ ہیں، بھارتی بحریہ پاکستان کے ساتھ ۳ جنگوں میں حصہ لے چکی ہے۔

بھارتی فضائیہ : بھارتی مسلح افواج کا ہوائی بازو ہے، اس کا مقصد بھارت کی فضائی

حدود کی حفاظت یقینی بنانا ہے، اسے برطانیہ نے اپنی نوآبادی برصغیر میں ۸ اکتوبر ۱۹۳۲ء کو قائم کیا، ۱۹۴۷ء میں آزادی کے بعد یہ بھارت کے کنٹرول میں آگئی، بھارتی فضائیہ کا جھنڈا بھارتی فضائیہ کی پاس ۱۷۰،۰۰۰ حاضر سروس فوجی موجود ہیں جبکہ ۱۶۰۰ مختلف قسم کے طیارے ہیں، بھارتی فضائیہ پاکستان کے ساتھ ۴ جنگوں میں حصہ لے چکی ہے۔

بھارت کی عسکری قوت

دنیا کی جدید افواج اور فوجی طاقت کا تجزیہ کرنے والے عالمی تحقیقی ادارے ''گلوبل فائر پاور'' نے ۲۰۱۷ میں فوجی طاقت کے اعتبار سے ۱۳۳ ملکوں کی جو فہرست جاری کی ہے اس میں امریکہ ماضی کی طرح اس بار بھی سب سے بڑی جنگی طاقت ہے اس درجہ بندی میں صرف روایتی جنگی ہتھیاروں اور ساز وسامان کی بنیاد پر تجزیہ کیا گیا ہے، اس میں جوہری ہتھیاروں کو شامل نہیں کیا گیا ہے۔

امریکہ کا دفاعی بجٹ ۵۸۷ ارب ڈالر تھا جبکہ چین نے ۱۶۱/ ارب ڈالر دفاع کے لیے مختص کیے ہیں، چین میں سرگرم فوجیوں کی تعداد ۲۲ لاکھ ہے اور اس کے پاس تین ہزار جنگی طیارے اور ساڑھے چھ ہزار ٹینک ہیں، انڈیا سب سے طاقتور ترین افواج کی فہرست میں ۱۳۶ ملکوں میں چوتھے نمبر پر ہے اور پاکستان کا نمبر ۱۷واں ہے، اور ۸۱ لاکھ کی آبادی والا ملک اسرائیل نویں مقام پر ہے جس کے پاس ساڑھے چھ سو جنگی طیارے اور ڈھائی ہزار سے زیادہ ٹینک ہیں۔ گلوبل فائر پاور کے مطابق پہلی تین سب سے زیادہ طاقتور عسکری قوتوں میں امریکہ، روس اور چین کے بعد انڈیا آتا ہے، یہ فہرست ۵۵ ختلف عناصر کو دیکھتے ہوئے مرتب کی گئی ہے، اس میں جغرافیائی، معاشی، مقامی صنعت، قدرتی وسائل، کارکردگی، اور ملک کے پہلی، دوسری اور تیسری دنیا کے ملکوں سے تعلق کو بھی مدِنظر رکھا جاتا ہے انڈیا آبادی کے لحاظ سے پاکستان سے آگے ہے، اس کی آبادی ارب ہے جبکہ پاکستان کی آبادی ۲۰ کروڑ ہے۔

۱۔پاکستانی فوج کی تعداد نولاکھ ۱۹ہزار ہے جبکہ انڈیا کی فوج کی تعداد ۴۲ لاکھ ہے۔
۲۔انڈیا کا دفاعی بجٹ ۱۵۱ارب ڈالر جبکہ پاکستان کے دفاعی اخراجات ۷ارب ہے۔
۳۔فضائی طیاروں کی تعداد انڈیا کے پاس ۲۱۸۵فضائی طیارے ہیں اور اس کے مقابلے میں پاکستان کے پاس ۱۲۸۱ طیارے ہیں،ان میں سے پاکستان کے پاس ۳۲۰ اور انڈیا کہ پاس ۵۹۰ لڑاکا طیارے ہیں جبکہ ۸۰۴انڈین اور ۴۱۰ پاکستانی طیارے بمبار ہیں،انڈیا کے پاس ۷۰۸ اور پاکستان کے پاس نقل وحمل کے ۲۹۵ فضائی طیارے ہیں،پاکستانی فوج کے پاس ۳۲۸ ہیلی کاپٹر ہیں اور انڈیا کے پاس ۷۲۰ ہیں،ان میں سے پاکستان کے پاس ۴۹لڑاکا ہیلی کاپٹر ہیں جبکہ انڈیا کے پاس فقط ۱۵ہیں۔
انڈیا کے آپریشنل ہوائی اڈوں کی تعداد ۳۴۶جبکہ پاکستان میں یہ تعداد ۱۵۱ ہے۔
۴۔پاکستان کے پاس کُل ۲۱۸۲ ٹینک اور انڈیا کے پاس اس سے دوگنا زائد یعنی ۴۴۲۶ ٹینک موجود ہیں۔
۵۔بکتر بند گاڑیاں انڈیا کے پاس ۳۱۴۷ بکتر بند لڑاکا گاڑیاں جبکہ پاکستان کے پاس ۲۶۰۴ ہیں۔
۶۔پاکستان کے پاس انڈیا کے مقابلے میں زیادہ خودکار توپیں ہیں،انڈیا کے پاس ۱۹۰ہیں اور پاکستان کے پاس ۳۰۷ ہیں،لیکن انڈیا کے پاس ۴۱۵۸ عام توپیں ہیں اور پاکستان کے پاس صرف ۱۲۴۰ہیں۔
۷۔انڈیا کی بحری افواج کے پاس ۲۹۵ اور پاکستان کے پاس ۱۹۷ بحری اثاثے ہیں،انڈیا کے پاس ایک بحری بیڑا ہے جبکہ پاکستان کے پاس ایسی کوئی چیز نہیں۔
۸۔پاکستان کے پاس پانچ آبدوزیں ہیں اور انڈیا کے پاس ۱۶ہیں،انڈیا کے پاس ۱۴فریگیٹ ہیں اور پاکستان کے پاس ۱۰۔
۹۔انڈیا کے پاس ۱۱بحری جنگی جہاز (ڈیسٹرائرز)Destroyers ہیں لیکن پاکستان

کے پاس ایسا کچھ نہیں، ویسے ہی انڈیا کے پاس ۲۲ چھوٹی بحری جنگی جہاز (کورویٹ) ہیں اور پاکستان کے پاس یہ نہیں ہیں، انڈیا کے پاس ۱۳۹ گشت کرنے والی کشتیاں ہیں جبکہ پاکستان کے پاس ۱۱/ ایسی کشتیاں ہیں۔

انڈیا اور پاکستان دونوں کے پاس جوہری ہتھیار ہیں لیکن گلوبل فائر پاور نے اپنی رپورٹ میں جوہری ہتھیاروں کا ذکر نہیں کیا ہے۔

تقریباً، ۱.۳ ملین سرگرم فوجیوں کے ساتھ، بھارتی فوج دنیا میں تیسری سب سے بڑی فوجی طاقت ہے، بھارت کے صدر بھارتی مسلح افواج کے سپریم کمانڈر ہیں، سال ۲۰۱۱ء میں بھارتی دفاعی بجٹ ۔ ۳۰ارب امریکی ڈالر رہا (یا خام ملکی پیداوار کا ۱.۸۳٪) ۲۰۰۸ء کی ایک رپورٹ کے مطابق، بھارت خریدنے کی طاقت کے معاملے میں بھارتی فوج کے فوجی اخراجات ۷۔ ۲۷۔ ارب امریکی ڈالر رہے، سال ۲۰۱۱ء میں بھارتی وزارت دفاع کے سالانہ دفاعی بجٹ میں ۱۱.۶ فیصد اضافہ ہوا، تاہم یہ رقم حکومت کی دیگر شاخوں کے ذریعے فوجی اخراجات کے بجٹ میں شامل نہیں ہوتی، حالیہ سالوں میں، بھارت دنیا کا سب سے بڑا ہتھیار درآمد کنندہ بن گیا ہے۔ (منقول بتغییر یسیر)

فوج کا اخلاقی رویہ

جنگی تاریخ کی یہ ایک حقیقت ہے کہ شکست و فتح کا فیصلہ ہمیشہ میدان جنگ میں نہیں بلکہ اکثر اوقات جنگ لڑنے والی فوجوں کے ذہنوں میں جنگ شروع ہونے سے بھی پہلے ہو جاتا ہے، جو فوج اعلیٰ اخلاقی اقدار سے لیس ہو کر میدان جنگ میں داخل ہوتی ہے اپنے آپ کو حق بجانب سمجھتی ہے وہ نہ صرف اپنی بہت سی جنگی خامیوں پر قابو پا لیتی ہے بلکہ اکثر و بیشتر اپنے سے بڑی فوجوں کو شکست دیکر فتح سے ہمکنار ہوتی ہے، اعلیٰ اخلاقی اقدار جنگی سپاہیوں کے دل و دماغ کو ''جذبہ حق'' کی روشنی سے منوّر کرتی ہیں اور یہ روشنی اعلیٰ ''مورال'' کی بنیاد بنتی ہے، فوجی اصطلاح میں ''مورال'' فتح کیلئے سب سے بڑا ہتھیار ہے، اسی لئے موجودہ دور کی

جنگوں میں سب سے پہلا حملہ مخالف فوجوں کے ''مورال'' پر کیا جاتا ہے، بالفاظ دیگر انکی اخلاقی اقدار کو مجروح کر کے دشمن کے سپاہیوں سے ''فتح کا جذبہ'' چھین لیا جاتا ہے اور بغیر اس جذبے کے فوج میدان جنگ میں تو جا سکتی ہے لیکن کامیابی مشکل ہو جاتی ہے، یاد رہے کہ زندگی میں بھی اور جنگ میں بھی سپاہی کا ذاتی کردار بہت اہمیت کا حامل ہوتا ہے، اخلاقی اقدار کسی بھی شخص، کسی بھی قوم یا کسی بھی فوج کا سب سے بڑا سرمایہ ہوتی ہیں اور یہ سرمایہ فوج اور قوم کی اصل طاقت ہوتا ہے، اخلاقی اقدار کا انحطاط کئی انداز میں ظاہر ہوتا ہے اور دیمک کی طرح خاموشی سے قوموں کو یا اداروں کو اندر ہی اندر سے کھوکھلا کر دیتا ہے۔

ا۔ اخلاقی انحطاط کا سب سے بڑا مظہر ''کرپشن'' ہے جو بھارتی فوج میں ایک معمول بن چکا ہے جس میں سویلین بزنس مین، سیاستدان اور جرنیل سب ایک ہیں اور سب مل کر کھاتے ہیں، کسی نے اس کرپشن پر بحث کرتے ہوئے لکھا کہ ہمارے جرنیلوں کے ہاتھ ہمارے سولجرز کے خون سے رنگے ہیں، بھارتی فوج کی کرپشن کے قصے ۱۹۵۰ء سے ہی شروع ہو گئے تھے لیکن وقت کیساتھ ساتھ یہ ناسور ختم ہونے کی بجائے بڑھتا رہا، اس کرپشن کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ آہستہ آہستہ سیاستدان بھی اس میں ملوث ہو گئے، کچھ اطلاعات کے مطابق اس وقت کے وزیر اعظم نے ۶۴ کروڑ ڈالر کمیشن وصول کیئے تھے، اب ظاہر ہے جب وزیر اعظم اتنا کمیشن لے گا تو اس ڈیل کے باقی متعلقہ لوگ کیسے پیچھے رہیں گے؟ یاد رہے کہ جہاں ڈیل میں کمیشن اور کِک بیکس kick backs ہوتی ہیں وہاں ''مطلوبہ معیار'' کبھی نہیں ملتا، ۲۰۱۹ء فروری میں بھارت نے اسرائیل سے ۱۱۰ ارب روپے کے میزائل اور دیگر جدید فوجی سامان کا سودا کیا، میڈیا کے مطابق اس میں ۱۰ فیصد کمیشن حاصل کیا گیا۔

۲۔ درجنوں بے قصوروں کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر گھر سے باہر گھسیٹا جانا، برہنہ کر کے تشدد کیا جانا، نازک اعضاء اور زخموں پر بجلی کے جھٹکے لگانا، ناقابل بیان ظلم کمزوروں پر کرنا۔

۳۔ فوجیوں کے موبائل فون کے استعمال پر پابندی کی وجہ سے خودکشی کی شرح میں

خطرناک حد تک اضافہ ہوا، کہ اس طرح فوجی مستقل اپنے گھر والوں سے رابطے میں رہتے ہیں اس لئے ذہنی دباؤ کا شکار ہو جاتے ہیں، جس کی وجہ سے فوجی نہ صرف اپنے آپ کو تکلیف پہنچاتے ہیں بلکہ اپنے ساتھیوں کو بھی قتل کر دیتے ہیں، جنھیں اپنی بدنامی کے خوف سے چھپانا پڑتا ہے۔

فوج کی بے حیائی اور جنسی ہوس

فوج کی بے حیائی بھی تاریخ میں ڈھکی چھپی نہیں ہے، اب ذرا فوج کی بھی بے حیائی اور سرحد کے محافظوں کی جنسی ہوس کا بھی طائرانہ جائزہ لیں گے تاکہ یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ آج یہ جماعتیں اپنے عظیم اور اہم مقصد سے کس قدر منحرف ہیں دنیا میں سب سے زیادہ طاقتور اور سپر پاور ملک امریکہ کی جانب نظریں دوڑائیں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ امریکی فوجی میں دو لاکھ سے زیادہ عورتیں شامل ہیں، فوجی خدمات تو ان کا سرکاری اور ملکی فریضہ ہے، مگر اس سے کہیں زیادہ وہ فوجی مردوں اور آفیسروں کی جنسی خدمات بجالانے پر مجبور ہیں اس مجبوری نے ان کو جن نفسیاتی الجھنوں میں مبتلا کر دیا ہے اس کا اندازہ ایک سابقہ امریکی فوجی خاتون ماریاں بڈا (Maria Baba) کی داستان زندگی کے اس اظہار سے لگایا جاسکتا ہے۔

پہلے جب میں امریکی جھنڈے پر نظر ڈالتی تھی تو یہ سرخ، سفید اور نیلا دکھائی دیتا تھا، مگر اب میں اس پر صرف خون کے دھبے دیکھتی ہوں، سرخ رنگ اس خون کی علامت ہے جو میرے بدن سے بہا، نیلا رنگ ان چوٹوں کی نمائندگی کرتا ہے جو میرے جسم نے سہے اور سفید رنگ میرے خوفزدہ چہرے کا ہے، میں اپنے ملک کے لئے ماری پیٹی گئی، اور میری عزت لوٹی گئی، اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتا ہے“

ماریان بڈا کی دردناک کہانی امریکی فوج پر بدنما داغ ہے مگر یہ انوکھا واقعہ نہیں ہے، امریکہ کے لوواسٹی میں سابق فوجیوں کے میڈیکل سینٹر کی ایک انکوائری ۲۰۰۳ء سے پتہ چلتا ہے کہ جن ۵۵۸ عورتوں کا انٹرویو لیا گیا ان میں سے ۲۸ فیصد نے بتایا کہ فوجی

ملازمت کے دوران ان کی عصمت دری کی گئی یا اس کی کوشش کی گئی اور ہندوستان کی حالت بھی کچھ بہتر نہیں ہے کہ یہاں بھی کشمیر اور سرحدی علاقوں کی معصوم عورتیں فوجیوں کی درندگیوں سے محفوظ نہیں ہے، انہیں ان کے گھروں سے اٹھا کر ان کا استحصال کیا جاتا ہے اور پھر انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے، جب کنہیا کمار نے اس پر تبصرہ کیا تو اہلِ حکومت اس پر برس پڑے اور بڑے بڑے فوجی افسر اس ردِعمل کا اظہار کرنے لگے ہاں بے شک ہم تسلیم کرتے ہیں ان ذمہ داروں کے ردعمل کو مگر ہم اپنی فوج پر ہرگز تنقید نہیں کر رہے ہیں بلکہ ان شیطان صفت اور ہوس پرست بھیڑیوں پر طعنہ زنی کر رہے ہیں جو فوج کے روپ میں ہمارے ملک کی ساکھ اور عزت کے ساتھ کھلواڑ کر رہے ہیں اور لوگوں کا اعتماد ختم کر رہے ہیں۔

امریکی فوج میں عورتوں کا حال

امریکی فوج میں خواتین اہلکاروں پر جنسی حملوں میں بڑے پیمانے پر اضافہ دیکھا گیا ہے اس کے باوجود کہ برسوں سے اس مسئلے کے حل کے لیے کوششیں جاری ہیں، اعداد و شمار کے مطابق ۲۰۱۸ء کے دوران ۲۰۵۰۰ واقعات رپورٹ ہوئے جبکہ ۲۰۱۶ء میں ایسے جنسی حملوں کی تعداد ۱۴۹۰۰ تھی ان واقعات میں سے ایک تہائی کے دوران الکوہل کا استعمال کیا تھا اور ان حملوں کا زیادہ تر شکار ۱۷ سے ۲۴ سال کی نئی بھرتی ہونے والی خواتین اہلکار تھیں۔

جبکہ جنسی حملہ غیر قانونی اور غیر اخلاقی ہے اور یہ فوج کے اصولوں کے بھی خلاف ہے اور اسے کسی صورت برداشت نہیں کیا جانا چاہئے، امریکہ میں شہری قوانین کے تحت جنسی ہراس غیر قانونی ہے اور رنگ ونسل، مذہب یا قومیت کی بنیاد پر تفریق بھی اسی قانون کے تحت آتی ہے، امریکی فوج، نیوی، ایئر فورس اور میرین کے ایک سروے کی رپورٹ کے مطابق ۲۰۱۸ء میں کل ۲۰۵۰۰ کیسز (Cases) ہوئے، یہ تعداد رپورٹ کیے گئے حملوں اور ایک

لاکھ اہلکاروں کے سروے سے اخذ کی گئی۔ محققین کا کہنا ہے کہ یہ سروے ۹۵ فیصد تک قابل بھروسہ ہے، جبری جنسی تعلق کے ان کیسز میں دست درازی سے لے کر ریپ تک کے واقعات شامل ہیں اور یہ ۲۰۱۶ء کے مقابلے میں ۳۸ فیصد بڑھے ہیں، تاہم ان معاملات میں سے ہر تین میں سے صرف ایک کیس اعلیٰ حکام تک پہنچایا گیا، پینٹاگان کا کہنا ہے کہ ۲۰۰۶ء میں ہر ۱۴ میں سے صرف ایک متاثرہ خاتون سے جنسی حراست کے جرائم کی شکایت کی، جبکہ جنسی حملوں کے ۸۵ فیصد سے زائد معاملات میں متاثرین حملہ آوروں کو جانتی تھی، اور اکثر معاملات میں نوجوان اہلکاروں پر حملہ کرنے والے ان کے اعلیٰ افسران ہوتے ہیں۔

ہندوستانی فوج میں عورتوں کا حال

فوجیوں کے ذہنی انتشار کی اور بھی بہت سی وجوہات ہیں جن میں بنیادی سہولیات کی کمی، طویل عرصے تک سرحدی متنازع علاقوں میں تعیناتی، کم تنخواہ اور اعلیٰ قیادت سے رابطے میں فقدان شامل ہے، لیکن اس سب کا آسان حل بھارتی فوجی قیادت نے عورت کی تذلیل کی صورت میں نکالا اور نوکری کی آڑ میں خواتین فوجیوں کے استحصال کا منصوبہ عمل میں لایا گیا، ستمبر ۲۰۰۹ء میں جب بھارتی فوجیوں میں خودکشی کرنے والوں کی تعداد میں خطرناک اضافہ ہوا تو ایک پلان کے تحت بھارتی فوج میں خاتون فوجیوں کو بڑی تعداد میں بھرتی کیا گیا، جنھیں سرحدی گارڈوں کے طور پر نوکری دی گئی، افسوس کا مقام یہ ہے کہ ان خواتین کو بھارت سرکار کی فوجی ضرورتوں کے تحت نہیں بلکہ سیکس ورکر کے طور پر بھرتی کیا گیا تھا، جس کا مقصد فوجیوں کو تفریح فراہم تھا، بطور گارڈ تعینات کی جانے والی ان خواتین کو خاص طور پر پسماندہ علاقوں سے لا کر بھرتی گیا تھا، تاکہ وہ اپنے حق کے لئے آواز نہ اٹھا سکیں، سوچنے کا مقام یہ ہے کہ ملک کو اچانک ایک بڑی تعداد میں خاتون فوجیوں کی کیا ضرورت پڑ گئی، صورتحال اس وقت ابتر ہوگئی جب ایک خاتون فوجی جنسی زیادتی کے بعد حاملہ ہوگئی اور حمل ضائع کرنے کی سہولیات سے محروم ہونے کے باعث اسے اسی حالت میں ڈیوٹی انجام

دیتے ہوئے پایا گیا، جس کے بعد معاملے کی تحقیقات کا حکم دیا گیا اور اس کے نتیجے میں یہ دل دہلانے والی حقیقت سامنے آئی کہ بارڈر پر اپنے فرائض انجام دیتی ۱۷۸ خاتون فوجیوں میں سے ۶۳ غیر محفوظ جنسی سرگرمیوں کی وجہ سے سنگین طبی مسائل کا شکار ہیں، جب خواتین سپاہیوں کے مختلف ٹیسٹ کیے گئے تو یہ حیرت انگیز صورتحال سامنے آئی کہ زیادہ تر فوجی خواتین حاملہ تھیں اور اکثر غیر محفوظ جنسی تعلق کی وجہ سے مختلف بیماریوں کا شکار ہو چکی تھیں انڈین آرمی میڈیکل کور کی ایک ڈاکٹر نے انکشاف کیا کہ ۶۳ خواتین فوجی، جنھیں آرمی بیس ہسپتال سے مختلف فیلڈ یونٹس (Field units) میں بھیجا گیا تھا، وہ سب حاملہ تھیں۔

۲۰۰۹ء میں خاتون آفیسر پونم کپور کو صرف اس لئے ملازمت سے برطرف کر دیا گیا کہ اس نے فوجی عدالت میں اپنے ساتھی فوجی اہلکاروں کے خلاف جنسی تشدد اور زیادتی کا مقدمہ دائر کیا تھا، لیکن اس مقدمہ کو جان بوجھ کر بوگس قرار دے دیا گیا اور ان فوجی اہلکاروں کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی گئی، جبکہ خاتون فوجی افسر کو بھاری جُرمانہ بھی ادا کرنا پڑا، خواتین کے حقوق کی پاسداری کرتے ہوئے فوری طور پر خواتین فوجی اہلکاروں کی پوسٹنگ اور ان کے لئے انصاف کی فراہمی کو بہتر بنانے کی بجائے بھارت کی وزارت داخلہ نے بڑے پیمانے پر کنڈوم بنانے کی مشینیں بنانے اور انہیں سرحدی علاقوں میں بٹالین ہیڈکوارٹر میں نصب کرنے کی منصوبہ بندی کی، تاکہ فوجی مرد اپنی جنسی خواہشات کی تکمیل باآسانی کر سکیں اور خواتین فوجی اہلکاروں کو حاملہ ہونے سے بچایا جاسکے، بھارت کی سرکاری نیوز ایجنسی پریس ٹرسٹ آف انڈیا (پی ٹی آئی) کے مطابق سرحدی دور دراز علاقوں میں ۱۰۰۰ سے زائد کنڈوم مشینیں خرید کر نصب کیے جانے کا انکشاف ہوا ہے، جہاں کنڈوم فوجیوں میں ہر ماہ کی بنیاد پر مفت فراہم کیے جاتے ہیں، فوجیوں کی طرف سے خواتین کی عصمت دری کے واقعات سامنے آتے رہے ہیں جن میں گینگ ریپ بھی شامل ہے، اس ظالمانہ کارروائی کے نتیجے میں کتنی ہی خواتین کو موت کے گھاٹ کا اتارا جا چکا ہے، کشمیر، میانمار، بنگلہ دیش اور

نیپال سے ملحق سرحدیں اوران علاقوں کے دیہی باشندے بھارتی فوج کی بربریت سے بری طرح پریشان ہیں اوراپنی خواتین کومحفوظ نہیں سمجھتے،فوجی اپنی ہوس کی آگ کوٹھنڈا کرنے کے لئے ان علاقوں میں طوائفوں کوبھی بلاتے ہیں لیکن شدید جنسی بیماریوں میں مبتلا ہونے کے انکشاف کے بعدان طوائفوں کاسرحدی بارڈرفوجی چھاؤنیوں میں داخلہ ممنوع قرار دے دیا گیا۔(۱)

فوجی قانون(martial law)

ایسے قانون اورضابطےکو کہتے ہیں جوکسی ملک یاعلاقے کانظم ونسق چلانے کے لیے، ایک عسکریہ یافوج کی جانب سے نافذالعمل کیاگیاہو،اجنبی حکومت یاسویلین حکام مؤثرطریقے سے کام کرنے میں ناکام رہے جب مارشل لا عام طورپرایک عارضی بنیاد پرعائدکیاجاتاہے مثال کےطورپر،حکم اورسلامتی کو برقراررکھنے کے یاضروری خدمات فراہم کرنے مارشل لا عوام پران کی حکمرانی کو نافذکرنے کی حکومتوں کی طرف سے استعمال کیاجاسکتا،اس طرح کے واقعات میں ایک بغاوت کے بعد؛مقبول احتجاج طرف سے دھمکی دی جائے؛ سیاسی مخالفت کو دبانے کے لیے؛ یافتنہ پسندی کومستحکم کرنے کےلیےوغیرہ،مارشل لابڑی قدرتی آفات کی صورت میں قراردیاجاسکتاہے۔

فوجی کیمپ میں جمعہ کی نماز

فوجی چھاؤنی حدودشہرمیں داخل ہے،لہذا پندرہ بیس آدمی کاجمع ہوکر جمعہ کی نماز ادا کرنادرست ہے، اگر جماعت کثیرہ کے ساتھ جمعہ کی نماز اداکی جائے تو بہترہے ،البتہ

(۱) اردوصفحہ،۶رنومبر۲۰۱۸ءیہ اخباری تفصیل تھی،باقی حقیقت حال کتنی سچ ہے وہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے،یہاں ذکرکامقصد صرف معلومات حاصل کرنااوراپنے انداز سے قاری اصلاح کے پہلوسوچے،فوج یابھرے مجمع تذکرہ نقصاندہ ثابت ہوسکتا ہے،بس اصلاح کے مثبت طریقے اختیارکئے جائیں۔

چھاؤنی میں نماز کے لیے دوسرے احباب کو آنے سے روکا نہ جائے۔

فوجی نماز میں قصر کرے یا اتمام؟

فوجی حضرات نماز قصر ادا کریں گے یا پوری نماز پڑھیں گے؟ اور امامت کر سکتے ہیں یا نہیں؟ فوجی حضرات آرمی ہیڈ کوارٹر کے احکامات کے تابع ہوتے ہیں، ان کو رات کے آدھے حصے میں بھی اگر ہیڈ کوارٹر سے بلاوا آجائے تو وہ اپنی جگہوں کو چھوڑ کر آئے ہوئے حکموں کو بجالاتے ہیں۔

فوجی حضرات کو اگر حالات کے تناظر میں کسی بستی میں پندرہ دن یا اس سے زیادہ قیام کا یقین یا غالب گمان ہو تو وہ وہاں مسافر نہ ہوں گے، مقیم ہوں گے اور چار رکعت والی نمازیں مکمل چار پڑھیں گے اور چار رکعت کی نماز میں چار رکعتیں پڑھا کر مقیم اور مسافر ہر طرح کے مقتدیوں کی امامت بھی کر سکتے ہیں اور اس صورت میں ہیڈ کوارٹر کے حکم کے مطابق پندرہ دن کے اندر ہنگامی طور پر دوسری جگہ منتقل ہونے کا محض امکان کچھ بھی مضر نہ ہوگا اور اگر انھیں حالات کے تناظر میں کسی جگہ پندرہ دن قیام کا یقین یا غالب گمان نہ ہو تو وہ وہاں مسافت شرعی سے پہنچ کر مسافر ہی رہیں گے، مقیم نہ ہوں گے اور چار رکعت والی نمازوں میں قصر کریں گے، اور اگر وہ امام بنیں تو چار رکعت والی نمازیں صرف دو پڑھیں اور اگر انہوں نے چار پڑھی تو ان کے پیچھے مقیم مقتدیوں کی نماز نہ ہوگی (۱)

فوج کی نوکری کے لیے جسمانی معائنہ کرنا

کیا فوج کی نوکری جائز ہے؟ نوکری کے لئے ٹیسٹ لیتے ہوئے امیدوار کا جسمانی معائنہ کیا جاتا ہے، جس کے لئے امیدوار کے کپڑے اتروا کر شرمگاہ کا معائنہ بھی کیا جاتا ہے، ایسی صورت میں کیا فوج کی نوکری کے لئے اپلائی (Apply) کرنا درست ہے؟

---

(۱) مستفاد: احسن الفتاوی ۷۸: ۴-۸۰

فوج کی نوکری کرنا یا نوکری کے لیے درخواست دینا جائز ہے البتہ اس کے لیے امیدوار کے کپڑے اتروا کر شرمگاہ کا معائنہ کرنا اور کروانا ناجائز ہے اور باعث گناہ ہے اس سے محکمہ اور اپلائر دونوں کو احتیاط کی ضرورت ہے۔فقط واللہ اعلم۔(۱)

سرحد کی حفاظت اور اس کی فضیلت

پڑاؤ کرنا : حضرت عثمانؓ سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے آنحضرت ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں ایک دن کا پڑاؤ کرنا ہزار دن کے روزہ اور ہزار راتوں کے قیام سے افضل ہے(۲) مکحولؒ فرماتے ہیں کہ حضرت سلمان فارسیؓ حضرت شرحبیل کے پاس سے گذرے جب کہ وہ فارس کے ایک بڑے قلعہ میں پڑاؤ کئے ہوئے تھے، حضرت سلمانؓ فرمانے لگے کہ تمہیں ایک حدیث سناتا ہوں جو میں نے حضور ﷺ سے سنی تھی کہ اللہ کی راہ میں ایک دن پڑاؤ کرنا ایک مہینہ روزہ اور قیام سے افضل ہے اور اس حالت میں مرجانے والا قبر کے فتنہ سے محفوظ رہتا ہے اور اس کا عمل قیامت تک بہتر سے بہتر شکل میں بڑھا دیا جاتا ہے۔(۳)

رضوان اکبر: حضرت عبداللہ بن عمرؓ حضور ﷺ کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں کہ جو کوئی اللہ کی راہ میں ایک دفعہ تکبیر بلند کرتا ہے قیامت کے دن وہ اس کے ترازو میں ایسے پتھر کی طرح بن جائے گی جو تمام زمین وآسمان اور ان کو آباد کرنے والی مخلوق سے بھی وزنی ہو اور

---

(۱) دارالافتاء : جامعہ علوم اسلامیہ علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن،فتوی نمبر 143101200668 :۔

(۲) بخاری کتاب الادب باب الحذر من الغضب رقم الحدیث:۵۷۶۱، مسلم کتاب البر والصلۃ والآداب باب فضل لک یملک نفسہ عند الغضب رقم ۲۶۰۹:

(۳) مسلم باب فضل الرباط کتاب الامارۃ حدیث ۴۹۳۸: ،ترمذی ابواب فضائل الجہاد عن رسول اللہ باب ماجاء فی فضل المرابط حدیث ۱۶۶۵:

جوشخص اللہ کی راہ میں لا الہ الا اللہ و اللہ اکبر بلند آواز سے کہتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لئے اپنی رضوان اکبر لکھ دیتے ہیں اور جس کے لئے رضوان اکبر لکھ دیا جائے اللہ تعالیٰ اس کو حضرت محمد ﷺ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام اور دیگر انبیاءؑ کے ساتھ جمع فرمائیں گے۔(۱) فقیہ ابو اللیثؒ فرماتے ہیں کہ رضوان اکبر کے متعلق مختلف اقوال ہیں بعض کہتے ہیں اس سے اللہ تعالیٰ کا دیدار مراد ہے اور بعض کا یہ قول ہے کہ رضوان اکبر وہ رضامندی ہے جس کے بعد کبھی ناراضگی نہ ہو۔

پڑاؤ میں موت کی فضیلت: فضالہ بن عبید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”ہر میت کے عمل کا سلسلہ بند کر دیا جاتا ہے سوائے اس شخص کے جو اللہ کے راستے میں سرحد کی پاسبانی کرتے ہوئے مرے، تو اس کا عمل قیامت کے دن تک بڑھایا جاتا رہے گا اور وہ قبر کے فتنہ سے مامون رہے گا، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بھی فرماتے ہوئے سنا: مجاہد وہ ہے جو اپنے نفس سے جہاد کرے۔“ **كل ميت يختم على عمله إلا الذي مات مرابطا في سبيل الله، فإنه ينمى له عمله إلى يوم القيامة، ويامن من فتنة القبر“ قال ابو عيسى: حديث فضالة حديث حسن صحيح“**۔(۲)

مرنے کے بعد اجر ملنا: حضرت ابوامامہ باہلیؓ حضور اقدس ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ چار قسم کے لوگ ہیں جن کے اجر مرنے کے بعد بدستور جاری رہتے ہیں جو شخص جہاد فی سبیل اللہ کی چھاؤنی میں مرا، دوسرا وہ شخص جس نے علم سکھایا جتنے لوگ اس پر عمل کریں گے اسے اجر ملتا رہے گا، تیسرا وہ آدمی جس نے اپنے مال سے کوئی صدقہ جاریہ کیا جب تک یہ صدقہ موجود رہے گا اجر ملتا رہے گا، چوتھا وہ آدمی جو نیک اولاد چھوڑ جائے جو اسکے لئے دعا کرتی رہے۔ **”سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: ”رباط يوم في سبيل**

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ رقم: ۸۹۷

(۲) سنن ترمذی، حدیث: ۱۶۲۸

الله افضل، وربما قال :خير، من صيام شهر وقيامه، ومن مات فيه وقي فتنة القبر، ونمي له عمله إلى يوم القيامة" قال ابو عيسى :هذا حديث حسن"(۱)

نوٹ: فقیہ ابواللیثؒ فرماتے ہیں کہ ابومطیعؒ نے فرمایا کہ جس رباط اور چھاؤنی ڈالنے کی یہ فضیلت ہے اس سے وہ سرحدی مقام ہے جس کے آگے اسلام کی حدود نہیں۔

آج کل سرحدوں کی حفاظت کرنے والی پولیس جن کو رینجرز (Rangers) کہتے ہے، ان میں سے بہت سے آدمی اس کو محض ایک نوکری سمجھ کر انجام دیتے ہیں، اگر وہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کو سامنے رکھیں اور یہ خدمت اس عظیم ثواب کی نیّت سے انجام دیں تو نوکری کے ساتھ یہ عظیم الشان دولت بھی ان کو حاصل ہوگی، ان کو اپنی اور خانگی ضرورتوں کے لیے ان کو جو تنخواہ ملتی ہے وہ اس ثواب سے ان کو محروم نہ کرے گی، شرط یہی ہے کہ اس خدمت کی انجام دہی میں اصل نیت "رباط" یعنی اسلامی سرحد کو دشمنانِ دین سے محفوظ رکھنے کی ہو۔

کیا جمہوری سرحد پر مرنے والا شہید ہے؟

اس سلسلے میں اہل علم کے دو نظریے ہیں (۱) فی سبیل اللہ اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے جو جان دیدے وہ شہید ہے اس کے علاوہ کسی اور کے لیے یہ "اصطلاح" استعمال کرنا ہے۔

(۲) وطن کی خاطر جان دینے والے کے لیے اس لفظ کا استعمال عرفی معنی کے اعتبار سے درست ہے۔(۲)

---

(۱) سنن ترمذی، حدیث: ۱۶۶۵، یہ حدیث حسن درجہ کی ہے۔

(۲) شہید شرعی اعتبار سے دو قسمیں ہیں، حقیقی اور حکمی : حقیقی شہید تو وہ ہے جو مقتول فی سبیل اللہ ہو، اسے غسل نہیں دیا جائے گا اور اسی خون آلود کپڑوں میں جنازے کی نماز پڑھی جائے گی، حکمی شہید وہ سب ہیں جو حادثات میں جان دیدیں مثلاً پیٹ کے درد کی وجہ سے، ڈوبنے کی وجہ سے، اپنے مال وجان کی حفاظت میں مرنے والا شخص، انہیں عام مسلمانوں کی طرح غسل دیا جائے گا اور کفن پہنایا جائے گا۔

جوحضرات ملک کی خاطر جان دینے والے کے لیے عرفاً اس لفظ کے استعمال کو درست کہتے ہیں ان کے دلائل:

ا۔ہندوستان کے عرف میں بابری مسجد کے انہدام یا کسی بھی مسجد کے انہدام کے لئے لفظِ شہادت استعمال کیا جاتا ہے۔

۲۔ ہندوستان کے عرف میں لفظِ جہاد اور مجاہد کا لفظ جنگِ آزادی اور اصحابِ تحریکِ آزادی کے لئے استعمال کیا جاتا ہے، مولانا آزاد و دیگر علماء کے ساتھ گاندھی جی اور نہرو کو بھی مجاہدین آزادی کہا جاتا ہے۔

۳۔ایمان دار کا لفظ بہت سارے غیر مسلم بھائیوں کے لئے honest کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے جبکہ ایمان ایک اصطلاحی لفظ ہے جو ''ماجاء بہ الرسول'' کو ماننے کا نام ہے۔

۴۔ہندوستان میں شہید martyr کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے جس کا مطلب ہوتا ہے وہ شخص جس نے اپنے مذہب یا اپنے وطن کے لئے جان قربان کردی ہو۔

۵۔ملک ووطن کی حفاظت کرتے ہوئے مارے جانے والے بہادروں کے لئے تکریماً عرفی معنی کے لحاظ سے کیا جاتا ہے اصطلاحاً استعمال نہیں کیا جاتا ہے

جوحضرات منع کرتے ہیں ان کے دلائل ہیں کہ:

ا ۔فی سبیل اللہ بھی ایک شرعی اصطلاح ہے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس اصطلاح کا مفہوم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ ایک شخص اپنی بہادری ثابت کرنے کے لیے لڑتا ہے، دوسرا شخص (اپنے قبیلے یا وطن کی) محبت وحمیت میں لڑتا ہے، کیا یہ اللہ کے راستے میں لڑنے والے ہیں؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ : فی سبیل اللہ کا مصداق وہ شخص ہے جو اس لیے لڑے تا کہ اللہ کا کلمہ بلند ہو۔(متفق علیہ) اس حدیث میں فی سبیل اللہ کا مفہوم متعین ہوگیا، خود شارع ہی اس کو کسی دوسرے مفہوم میں استعمال کرے تو

ٹھیک ہے، لیکن عام لوگوں کے لیے کسی دوسرے مفہوم میں اس کا استعمال جائز نہیں ہوگا۔

۲۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں بنو تغلب کے عیسائیوں نے جزیہ دینے سے انکار کر دیا تھا، ان کا کہنا تھا کہ ہم سے ڈبل صدقہ لے لو لیکن ہم عجمیوں کی طرح جزیہ نہیں دے سکتے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا کہ تم اس کو چاہے جو کہو، ہمارے نزدیک یہ جزیہ ہی ہے (اعلاء السنن ۱۲/ ۵۸۴) اس سے ثابت ہوا کہ اگر غیر مسلم آپس میں کسی شرعی اصطلاح کو دوسرے معنی میں استعمال کرتے ہوں تو ان سے تعرض کرنے کی یا ان کی مخالفت کی ضرورت نہیں ہے، لیکن مسلمانوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس اصطلاح کو اپنے اصل معنی میں باقی رکھیں۔

۳۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: ”شرعی اصطلاحات کو نبی کریم ﷺ نے واضح انداز میں بیان فرما دیا ہے، ان سے وہی معنیٰ مراد ہوں گے جو رسول سے ثابت ہیں، ان کے علاوہ دوسرے معانی نے ان اصطلاحات کا استعمال کرنا رسول کی مخالفت ہے“۔ (مجموع الفتاوی: ۷/ ۲۸۶)

۴۔ الاشباہ والنظائر میں ایک قاعدہ مذکور ہے: ”العرف غیر معتبر في المنصوص علیه“، یعنی کسی لفظ کے معنیٰ متعین کرنے کے تعلق سے اگر کوئی نص وارد ہوگئی، تو اس کے خلاف عرف کا اعتبار نہیں ہوگا، علامہ آمدی فرماتے ہیں کے شارع کی طرف سے جب کسی لفظ کے معنیٰ متعین ہو گئے، تو اس کا اپنے لغوی معنی میں استعمال کرنا جائز نہیں ہے، بلکہ شرعی معنی میں ہی استعمال کرنا واجب ہے۔ (الاحکام: ۴/ ۲۵۲)

۵۔ ۱۵/ دسمبر ۲۰۱۷ء کی ٹائمز آف انڈیا کی اشاعت کے مطابق، وزارت داخلہ اور وزارت دفاع نے ایک آرٹی آئی کے جواب میں یہ کہا تھا کہ فوج یا پولیس کے لیے ”شہید“ یا انگریزی میں martyr جیسے الفاظ کا استعمال نہیں کیا جاتا، بلکہ battle casualty یا operation casualty جیسے الفاظ کا استعمال کیا جاتا ہے یعنی ملک کی خاطر جان

دینے والوں کے لیے ''شہید'' کا استعمال نہ کرنا ان کی توہین نہیں ہے، نیز سرکاری طور پر اس کا عرف بھی نہیں ہے، عوام میں کچھ لوگوں کے نزدیک عرف ہے اور کچھ کے نزدیک نہیں، لیکن ایسا عرف شریعت کی نظر میں عرف بننے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتا۔

۶۔انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا (Encyclopedia of botanica) کے مطابق شہید کا لفظ غیر مسلموں میں سب سے پہلے اٹھارہ سوستاون کی جنگ آزادی میں اپنی جان نچھاور کرنے والے منگل پانڈے کے لیے استعمال کیا گیا، اس وقت میڈیا اور سوشل میڈیا کا دور نہ ہونے کی وجہ سے، ہوسکتا ہے کہ اس لفظ کو شہرت نہ ملی ہو، ورنہ اس دور کے علماء یقیناً اس پر نکیر کرتے۔

یہ لفظ ایک اسلامی اصطلاح ہے جس کا ذکر قرآن وحدیث اور فقہ کی تقریباً ہر کتاب میں موجود ہے، کسی لفظ کو اصطلاح بنانے کے پیچھے ایک خاص فلسفہ ہوتا ہے، اصطلاح کا استعمال دوسرے معنی میں استعمال کرنا اس فلسفے اور نظریے کے ساتھ ناانصافی ہوگی، اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ جو لوگ وطن کے نام پر جان قربان کرنے والوں کے لیے شہید کا استعمال نہیں کرتے وہ محب وطن نہیں ہیں، اپنے آپ کو محب وطن ثابت کرنے کے لیے شریعت کی اصطلاحات کا بے جا استعمال نہیں کیا جاسکتا، البتہ جنہوں نے وطن کے تحفظ کے لیے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرنے والوں کی قربانی یقیناً بہت بڑی ہے، ایسے افراد کے لیے ہندوستان کے تناظر میں ''ویرگتی'' کا لفظ موجود ہے، ہمیں چاہیے کہ ہم ایسے فوجیوں کی قربانی کے تئیں اپنے افسوس کے اظہار کے لیے اسی لفظ کا استعمال کریں۔

نوٹ: اسلامی ممالک کے فوجی کے علاوہ دوسرے ملک کے فوجی کو سرحد وملک کی حفاظت کرتے ہوئے مرنے والے کے لیے وہ فضائل نہیں ہیں جو احادیث میں وارد ہوئی ہیں، چونکہ ملک بذات خود مقصود نہیں ہے بلکہ اسلام کی حفاظت کے لیے ملک کی حفاظت ہے، اگر ہندوستانی مسلمان فوجی دوسرے ملک کے مسلمان فوجی سے لڑکر مارا جائے تو شرعا

شہید نہیں کہلائے گا، دونوں طرف مسلمان اسلام کی خاطر نہیں بلکہ ظالم حکمرانوں کی حکومت بچانے کی خاطر مارے گئے ہوتے ہیں۔

فوجی شہید کو سلامی پیش کرنا

جب مسلمان فوجی جواں (جو اسلامی ملک کی حفاظت میں) شہید ہو جاتا ہے تو اس کو سلامی دی جاتی ہے، شرعی اعتبار سے یہ عمل کیسا ہے؟ شہید کو سلامی دینا رسم محض ہے، جس کا شریعت سے کوئی ثبوت نہیں ہے، تاہم اگر سلامی دینے میں کسی خلاف شرع امر کا ارتکاب لازم نہ آئے، تو ملکی رسم کے تحت اس کی گنجائش ہے۔(۱)

خلاصۂ کلام

۱۔مسلمانوں کا آرمی میں حصہ لینا بے حد ضروری ہے، اس وقت مسلمان فوج میں آٹے میں نمک کے برابر ہیں۔

۲۔فوج کے بے حیائی اور ظلم کو روکنے کے لیے وقتاً فوقتاً ان میں اصلاحی و تربیتی پروگرام منعقد کئے جائیں، ان کو عدل و انصاف کی اہمیت اور دستورِ ہند کی عظمت سے آگاہ کیا جائے۔

۳۔فوج میں مسلمان عورت کا حصہ لینا ناجائز ہونے کی بناء پر کوئی مسلمان عورت ہرگز حصہ نہ لے۔

۴۔فوجیوں میں سے مذہبی تعصب ختم کرنے کی ممکنہ کوششیں کی جائیں، ایئر فورس کی مساجد میں خدمت کو ائمہ کرام ضرور قبول کریں۔

محفل بھی روئے گی ہر دل بھی روئے گا ڈوبی جو میری کشتی تو ساحل بھی روئے گا
اتنا پیار بکھیر دیں گے ہم زمانہ میں

---

(۱) دارالافتاء، دارالعلوم دیوبند، Fatwa: 983-939/sd=10/1438

کہ میری موت پر میرا یار تو کیا میرا قاتل بھی روئے گا

پتنگ بازی حقائق ونقصانات

kite day

۱۵ ار جنوری کو ہندوانہ تہوار سنکراتی کا دن منایا جاتا ہے، پتنگ بازی کا ایک مذہبی تہوار ہونا، پتنگ بازی کے نقصانات اور شرعی احکام کی تفصیل۔

بسنت کیا ہے؟

انسان نے اپنی تفریح طبع کے لئے مختلف کھیل ایجاد کئے اور اپنی خوشی کے اظہار کے لئے مختلف دن مقرر کئے، ہر قوم میں ایسے تہوار موجود ہیں، اللہ عزوجل نے بھی مسلمانوں کو دو مواقع ایسے دیئے ہیں جس میں وہ شریعت کے دائرہ میں رہ کر اپنی خوشی کا اظہار کر سکتے ہیں، وہ عید الفطر اور عید الاضحی کا موقع ہے، برادران وطن کے مرکزی تہواروں میں جہاں دیوالی اور ہولی وغیرہ قابل ذکر ہیں، وہیں ''بسنت'' جسے ''مکرسنکرانتی'' بھی کہا جاتا ہے، جنوری کے درمیانی حصے میں چودہ تاریخ کو منایا جانے والا یہ تہوار، جس کو منانے کی تیاری بہت پہلے سے شروع کر دی جاتی ہے اور برصغیر سمیت مختلف خطوں میں نت نئے انداز سے لوگ اس کا اہتمام کرتے ہیں۔

(فرہنگ آصفیہ میں بسنت کے لفظ کے تحت لکھا ہے) ''یہ سنسکرت کا لفظ ہے، گل عصفر، کل کا جیر، نعمات شہوت افزاء، تعشق انگیز کے آنے کا موسم، موسم بہار، ہندی چھ رتوں میں پہلی رُت کا نام جو چیت سے بیساکھ تک رہتی ہے(۱) وہ گیت جو بسنت میلہ میں گاتے ہیں''(فرہنگِ آصفیہ:۳۹۵)

اور ''بسنت پنچمی'' کے معنی لکھیں ہیں کہ ''ہندوؤں کے تہوار کا نام، بسنتی پوش، زرہ پوش بسنتی، زرد، پیلا، بست کے میلے میں جانے والے وغیرہ وغیرہ''(فرہنگِ آصفیہ:۳۹۶)

اس کتاب میں بسنت کے لفظ کے نیچے اس کے مطالب دیئے گئے ہیں اور اس کی تاریخی حیثیت کی وضاحت بھی کی گئی ہے، وہ بسنت کا ایک مطلب یوں بیان کرتے ہیں :'وہ میلہ جو موسم بہار میں بزرگوں کے مزار اور دیوی دیوتاؤں کے استھانوں پر سرسوں کے پھول چڑھا کر کرتے ہیں' اس کے بعد اس کی مزید تفصیل یوں درج ہے:

''اگرچہ اصل رت بیساکھ کے مہینے میں آئی ہے، مگر اس کا میلہ سرسوں کے پھولتے ہی

(۱) چیت اور بیساکھ مہنوں کے نام ہیں۔

ماگھ کے مہینے میں شروع ہوجاتا ہے۔چونکہ موسم سرما میں سردی کے باعث طبیعت کو انقباض ہوتا ہے اور آمد بہار میں سیلان خون کے باعث طبیعت میں شگفتگی، امنگ اور ولولہ اور ایک قسم کی خاص خوشی اور صفراتی پیدائش پائی جاتی ہے، اس سبب سے اہل ہند اس موسم کو مبارک اور اچھا سمجھ کر نیک شگون کے واسطے اپنے اپنے دیوی دیوتاؤں اور اوتاروں کے استھانوں میں مندروں پر ان کے رجھانے کے لئے یہ مقتضائے موسم سرسوں کے پھول کے گڑوے بنا کر گاتے بجاتے لے جاتے ہیں اور اس میلے کو بسنت کہتے ہیں، بلکہ یہی وجہ ہے کہ وہ رنگ کو اس سے مناسبت دینے لگے... پہلے اس میلہ کا مسلمانوں میں دستور نہ تھا... ہندو کالی دیوی یا کالکا دیوی کے مندر پر گڑوے بنا بنا کر خوشی خوشی گاتے بجاتے چلے جاتے ہیں"۔(فرہنگِ آصفیہ: ۳۹۵)

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کا اس تہوار سے کوئی تعلق نہیں، یہ خالصتاً ایک ہندوانہ تہوار ہے، زرد رنگ ہندوؤں کا خاص شعار ہے، اور ان کے یہاں بسنت کے موقع پر خاص رنگ کے کپڑے پہنے جاتے ہیں، معروف سیاح ابو ریحان البیرونی اپنے سفر نامے میں لکھتے ہیں :اس مہینے میں استواء ربیعی ہوتا ہے، جس کا نام بسنت ہے، ہندو لوگ حساب سے اس وقت کا پتہ لگا کر اس دن عید کرتے ہیں اور برہمنوں کو کھانا کھلاتے ہیں اور نیا غلہ تبرکاً پانی میں ڈالتے ہیں (کتاب الہند البیرونی: ۳۶۸ بحوالہ غیر اسلامی تہوار: ۹)

"بسنت پنچمی درحقیقت ایک ہندو تہوار ہے جو کہ ہندو بڑے جوش وخروش سے مناتے ہیں، جب کھیت میں چاروں طرف پیلے پھول لہرانے لگتے ہیں تو سمجھ لیجئے کہ تہوار کا وقت آگیا ہے، موسم بہار کا تہوار صحیح معنوں میں ہندو اپنی دیوی سرسوتی کی تعظیم میں مناتے ہیں، جب بیر پک کر پیلے ہوجاتے ہیں، ڈھاک اور اشوکا اپنے عروج پر ہوتے ہیں، پھر خاص طور پر طالب علم ان کے علم کی دیوی سرسوتی کو اور دوسری دیویوں یعنی ذہن کی دیوی، آزادی کی دیوی اور تمام دیوتاؤں کو خراج تحسین پیش کرتے ہیں"

بسنت مذہبی تہوار کیسے بنا؟

اورنگ زیب عالمگیرؒ کے دور میں ایک عجیب واقعہ پیش آیا، اس واقعے نے بسنت کو تاریخ میں پہلی بار ثقافتی سے مذہبی تہوار میں تبدیل کر دیا اورنگ زیب کے دور میں ''حقیقت رائے'' نام کے ایک لڑکے نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے سلسلے میں ایک رکیک حملہ کیا، مسلمانوں نے اسے مغلظات بکتے ہوئے پکڑ لیا، ملزم کو عدالت میں پیش کیا گیا، قاضی نے جرم ثابت ہونے پر ''حقیقت رائے'' کو سزائے موت سنادی گئی، پھانسی لاہور میں علاقہ گھوڑے شاہ میں سکھ نیشنل کالج کے گراؤنڈ میں دی گئی۔ قیام پاکستان سے پہلے ہندوؤں نے اس جگہ یادگار کے طور پر ایک مندر بھی تعمیر کیا؛ لیکن یہ مندر آباد نہ ہوسکا اور قیامِ پاکستان کے چند برس بعد سکھ نیشنل کالج کے آثار بھی مٹ گئے۔ اب یہ جگہ انجینئرنگ یونیورسٹی کا حصہ بن چکی ہے۔ (روزنامہ نوائے وقت، ۴ فروری ۱۹۹۴ء) حقیقت رائے پھانسی کی سزا پا کر ہندوؤں کا مذہبی ہیرو بن گیا، جس دن حقیقت رائے کو سزائے موت دی گئی وہ ''بسنت پنچمی'' کا دن تھا ہندوؤں نے پیلے رنگ کے کپڑے پہنے، ''حقیقت رائے'' کی لاش اٹھائی اور گاتے بجاتے اسے شمشان گھاٹ تک لے گئے، مسلمانوں نے اسے توہین آمیز قرار دیا، لیکن ہندوؤں نے پیلے کپڑے اور رقص وسرور کو بسنت کہہ کر جان بچائی، اگلے سال ہندوؤں نے ''حقیقت رائے'' کی برسی منائی اور اس برسی پر پیلے کپڑے پہن کر اور ناچ گا کر ''حقیقت رائے'' سے اپنی وابستگی اور عقیدت کا اظہار کیا، بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ بسنت کے تہوار پر پہلی پتنگ بھی ''حقیقت رائے'' کی سمادھی پر ہی اڑائی گئی، مؤرخین کے مطابق ایک ہندو رئیس ''کالورام'' نے اس جگہ ''حقیقت رائے'' کی یاد میں مندر تعمیر کرائی،

باقاعدہ بسنت میلے کا آغاز کیا اور پتنگ بازی کو رواج دیا۔(۱)

اسلامی تاریخ کے قابل فخر محقق اور سائنسدان علامہ ابوریحان البیرونی تقریباً ایک ہزار سال قبل ہندوستان تشریف لائے تھے، انہوں نے کلرکہار (ضلع چکوال) کے نزدیک ہندوؤں کی معروف یونیورسٹی میں عرصۂ دراز تک قیام کیا، وہیں انہوں نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف ''کتاب الہند'' تحریر کی۔ یہ کتاب آج بھی ہندوستان کی تاریخ کے ضمن میں ایک مستند حوالہ سمجھی جاتی ہے۔ اس کتاب کے باب ۷۶ میں انہوں نے ''عیدین اور خوشی کے دن'' کے عنوان کے تحت ہندوستان میں منائے جانے والے مختلف مذہبی تہواروں کا ذکر کیا ہے۔ اس باب میں عید ''بسنت'' کا ذکر کرتے ہوئے علامہ البیرونی لکھتے ہیں:

''اسی مہینہ میں استوائے ربیعی ہوتا ہے، جس کا نام بسنت ہے، اس کے حساب سے اس وقت کا پتہ لگا کر اس دن عید کرتے ہیں اور برہمنوں کو کھلاتے ہیں، دیوتاؤں کی نذر چڑھاتے ہیں''(۲)

مشتاق پھلروان، جو پتنگ بازی کے حامی ہیں، لکھتے ہیں:

---

(۱) ''پنجاب آخری مغل دورِحکومت میں'' از ڈاکٹر بی ایس نجار : ص ۲۷۹۔ اس کے علاوہ مندرجہ ذیل مآخذ میں کچھ سے پتہ چلتا ہیکہ یہ میلہ ہندوانہ ہے، اور ان میں کچھ سے معلوم ہوتا ہیکہ پتنگ بازی تو ایسی شرمناک حرکت ہے، جو گستاخِ رسول کی یاد میں شروع کی گئی تھی، تاریخ لاہور از عبد اللطیف ص : ۲۶۰ نیز البیرونی کی تاریخ الہند اور فرہنگ آصفیہ میں مادہ بسنت۔

(۲) البیرونی نے آج سے تقریبا ہزار برس پہلے ہندوستان کا سفر کیا تھا، یہاں کے باشندگان کی تہذیب وتمدن، رسم ورواج علوم وفنون اور مذہب وفلسفہ کے متعلق معلومات کو ہندوؤں کے مشہور پنڈتوں کی صحبت میں رہ کر حاصل کیا تھا، اس عہد کے برصغیر کے بارے میں آپ کی تحقیقات مؤرخین کے ہاں منفرد ممتاز اور مستند درجہ رکھتی ہیں، مولانا ابوالکلام آزاد نے ہندوستان کے بارے میں آپکی تحقیقات کو ''بے داغ'' قرار دیتے ہوئے فرمایا تھا کہ پوری عربی زبان عربی کی علمی تاریخ میں البیرونی کا مقام ایسا منفرد ھیکہ وہ بجا طور پر الفارابی اور ابن رشد کی صف میں جگہ پانے کا مستحق ہے؛ اسلئے البیرونی کی یہ شہادت مستند، بے غبار اور ناقابل تردید ہے کہ بسنت کا تہوار ہندوؤں کا مخصوص تہوار ہے جو ہزاروں سال سے ان کی عید کے طور پر معروف چلا آرہا ہے اور اس دن وہ طرح طرح کے کھانے پکا کر برہمنوں کو کھلاتے ہیں۔

”بعض قبائل میں پتنگ کے بھجن گائے گئے۔ پتنگ کو دیوتا مانا گیا۔اس سے دعائیں اور مرادیں مانگی جاتی تھیں۔ یہ اعتقاد بھی دیکھا گیا کہ پتنگ سے بھوت پریت نہیں آتے“۔ (کتابچہ: بسنت و پتنگ)

غیر مسلم سکھ مؤرخ ڈاکٹر بی، ایس، نجار(Dr. B.S. Nijjar) نے اپنی کتاب ”پنجاب آخری مغل دور میں“(Punjab under the later Mughals) میں اس کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے ”حقیقت رائے“ باگھ مل پوری، سیالکوٹ کے کھتری کا پندرہ سالہ لڑکا تھا، جس کی شادی پٹیالہ کے کشن سنگھ بھٹہ نامی سکھ کی لڑکی کے ساتھ ہوئی تھی، ”حقیقت رائے“ کو مسلمانوں کے اسکول میں داخل کیا گیا تھا، جہاں ایک مسلمان ٹیچر نے ہندو دیوتاؤں کے بارے میں کچھ توہین آمیز باتیں کیں، ”حقیقت رائے“ نے اس کے خلاف احتجاج کیا اور اس نے بھی انتقاماً پیغمبر اسلام ﷺ اور سیدہ فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کی شان میں نازیبا الفاظ استعمال کیے، اس جرم پر ”حقیقت رائے“ کو گرفتار کرکے عدالتی کارروائی کے لیے لاہور بھیجا گیا، اس واقعہ سے پنجاب کی ساری غیر مسلم آبادی کو شدید دھچکا لگا (۱) کچھ ہندو افسر زکریا خان (جو اس وقت لاہور کا گورنر تھا) کے پاس پہنچے، تاکہ ”حقیقت رائے“ کو معاف کردیا جائے، لیکن زکریا خان نے کوئی سفارش نہ سنی اور سزائے موت کے حکم پر نظر ثانی سے

(۱) ہندو مؤرخ ڈاکٹر نجار کی یہ بات تو محل نظر ہے کہ مذکورہ بالا واقعہ سے” پنجاب کی ساری غیر مسلم آبادی کو شدید دھچکا لگا“ کیونکہ آج سے دو سو سال قبل ذرائع اِبلاغ اس قدر تیز نہیں تھے کہ ایسے واقعہ کی اطلاع صدر مقام سے دور کے علاقوں تک بھی پہنچ سکے، البتہ اس سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ لاہور کے ہندوؤں کے ایک گروہ نے اس واقعہ کے خلاف شدید جذباتی ردّعمل کا اظہار کیا۔ کیونکہ اس وقت پنجاب میں مسلمانوں کی حکومت تھی، طبعاً بزدل مزاج ہندوؤں کے لئے یہ تو ممکن نہ تھا کہ وہ بھرپور تحریک چلاتے، البتہ انہوں نے حقیقت رائے کی یاد میں میلہ منانا شروع کردیا جو احتجاج کی ایک نرم مگر مؤثر صورت تھی۔ اس واقعہ کے تقریباً پچاس سال بعد پنجاب میں سکھوں نے مسلمانوں کو شکست دے کر تخت لاہور پر قبضہ کرلیا۔ سکھ تو پہلے ہی بہت جذباتی ردّعمل کا اظہار کرتے ہوئے اس واقعہ کے' ذمہ دار مسلمانوں کو قتل کرچکے تھے۔ جب وہ پنجاب میں برسر اقتدار آئے تو انہوں نے اس واقعہ کے حوالے سے بسنت کا تہوار جوش وخروش سے منانا شروع کردیا۔

انکار کر دیا۔جس کے اجرا میں پہلے مجرم کو ایک ستون سے باندھ کر اسے کوڑوں کی سزادی گئی، اس کے بعد اس کی گردن اڑادی گئی۔ یہ سال 1734ء کا واقعہ ہے،جس پر پنجاب کی تمام غیر مسلم آبادی نوحہ کناں رہی،لیکن خالصہ کمیونٹی نے آخر کار اس کا انتقام مسلمانوں سے لیا اور سکھوں نے ان تمام لوگوں کو جو اس واقعہ سے متعلق تھے،انتہائی بے دردی سے قتل کر دیا، ڈاکٹر صاحب آگے چل کر صفحہ :۲۷۹ پر تحریر کرتے ہیں کہ"پنجاب میں بسنت کا میلہ اسی حقیقت رائے کی یاد میں منایا جاتا ہے"۔

کیا ہمارے مسلمان بھائی ان حقائق و واقعات کے سامنے آنے کے بعد بھی گستاخ رسول اور گستاخ جگر گوشہ رسول کو خراج عقیدت پیش کرنے والوں کے شانہ بشانہ پتنگیں اڑا کر گناہ عظیم کے مرتکب ہوتے رہیں گے، ہماری بربادی وتباہی پہلے ہی کیا کم تھی؟ ہم نے غیر قوموں کی تہذیب وثقافت اپنا کر دینی و دنیاوی ہلاکت کو اپنا مقدر بنالیا ہے،اب ہندو قوم تو بسنت پر پتنگ اڑانے کی بنیاد بھی بھول چکی،مگر مسلمان بسنت منا کر اسلام کی رسوائی کا اہتمام کرتے رہتے ہیں۔(۱)

منشی رام پرشاد کی تحریر

منشی رام پرشاد ماتھر بی۔اے۔کی کتاب کا عنوان"ہندو تیوہاروں کی اصلیت اور ان کی جغرافیائی کیفیت" ہے،اس کتاب کے سرورق پر یہ الفاظ تحریر ہیں :اس میں منطقہ حارہ، ریگستان کی صورت، بکری فصل، ہجری، اور عیسوی سنوں کی ضرورت، دعا کی قوت، اور خدا کی عجیب حکمت کا اظہار کر کے ہندوؤں کا زبردست اخلاقی اور تمدنی انتظام بیان کیا گیا ہے اور ہندو تیوہاروں کی ضرورت کو ثابت کیا گیا ہے" یہ کتاب علامہ اقبال کی زندگی میں شائع ہوئی کیونکہ اس کے متعلق تعارف میں یہ لکھا گیا ہے کہ مصنف نے اس کتاب کا ایک نسخہ علامہ اقبال

(۱) پنجاب،تمدن ومعاشرتی جائزہ،ڈاکٹر انجم رحمانی: ص ۴۲۶،الفیصل ناشران وتاجران کتب لاہور

کو بھی بھجوایا تھا جو انہوں نے پسند فرمایا، اس کتاب پر مصنف کو بھارت مہامنڈل خطاب بھی عطا کیا گیا اور یہ کتاب ہندوستان کے پرائمری سکولوں کے نصاب میں بھی شامل رہی ہے۔

اس کتاب میں رام پرشاد لکھتے ہیں:

بسنت پنچمی : اب فصل کے بارآور ہونے کا اطمینان ہو چلا۔ اور کچھ عرصہ میں کلیاں کھل کر تمام کھیت کی سبزی زردی میں تبدیل ہونے لگی، اس لئے کاشتکار کے دل میں قدرتی امنگ اور خوشی پیدا ہوئی ہے۔ وہ زرد پھولوں کو خوش خوش لا کر بیوی بچوں کو دکھاتا ہے اور پھر سب مل کر بسنت کا تیوہار مناتے ہیں اور زرد پھول اپنے اپنے کانوں میں بطور زیور لگاتے ہیں اور خدا سے دعا کرتے ہیں کہ اے پرتما! ہماری محنت کا پھل عطا کر اور پھولے ہوئے درختوں میں پھل پیدا کر۔(۱)

منشی رام پرشاد ماتھر کی ایک دوسری کتاب کا عنوان ہے ''ہندو تیوہاروں کی دلچسپ اصلیت''اس کتاب میں بھی بسنت پنچمی کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں :'بسنت پنچمی کو وشنو بھگوان کا پوجن ہوتا ہے۔(ہندو تیوہاروں کی اصلیت اور ان کی جغرافیائی کیفیت:۱۲۶)

مغل شہنشاہ اکبر کے نورتن ابوالفضل نے لکھا ہے کہ : ''ہندو ماگھ کے مہینے میں تیسری، چوتھی، پانچویں اور ساتویں تاریخ کو چار تہوار مناتے ہیں، پانچویں تاریخ کو بسنت کا بڑا جشن ہوتا ہے اس روز رنگ اور عنبر ایک دوسرے پر چھڑکے جاتے ہیں، نغمہ وسرود کی مجلس منعقد کرتے ہیں''۔(۲)

بسنت کا سفر

بابر اور بسنت: بابر ہندوستان پہنچا تو اس نے مقامی لوگوں کو عجیب تہوار مناتے دیکھا اس نے دیکھا لوگ موسم بہار کے پہلے ہفتہ پیلے رنگ کے کپڑے پہنتے، ڈھول بجاتے

---

(۱) ہندو تیوہاروں کی اصلیت اور ان کی جغرافیائی کیفیت: ۱۰۲

(۲) مغل شہنشاہوں کے شب و روز: ۳۴۷، سید صباح الدین عبدالرحمن

ہیں اور ناچتے ہیں، بابر یہ تہوار دیکھ کر حیران رہ گیا، اس نے تحقیق کرائی تو معلوم ہوا کہ مقامی لوگ اسے استقبال کا تہوار کہتے ہیں، مقامی زبان میں اس تہوار کا نام ''بسنت'' تھا، بابر نے اس تہوار کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا آنے والے دنوں میں مغل شہزادیاں بھی یہ تہوار مناتی رہیں۔

بسنت اور حضرت امیر خسرو: بسنت کی تاریخ میں ایک مسلم شخصیت کا نام بھی آتا ہے وہ تھے ''حضرت امیر خسروؒ'' وہ تیرہویں صدی میں موسم بہار کے پہلے ہفتے پیلا چوغا پہنتے اور نظم گنگناتے تھے، وہ ایسا کیوں کرتے تھے؟ اس کے بارے میں کوئی ٹھوس دلیل نہیں ملتی، بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ یہ بھی ان کی ایک مجذوبانہ ادا تھی، وہ اس ادا کے ذریعے اپنے شیخ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا مزید قرب حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے، لیکن یہ بسنت وہ بسنت نہیں تھی جو ہندو مناتے تھے، اور نہ ہی اس بسنت میں پتنگ بازی شامل تھی، اگر بالفرض ہو بھی تو شریعت کے خلاف عمل میں کوئی ولی قابل تقلید نہیں ہوں گے، ان کے عمل کو مجذوبیت پر محمول کیا جائے گا۔

جشنِ بہاراں اور انگریز: ہندوستان میں جب ناپاک انگریز آئے تو انہوں نے مقامی ثقافت کی ترویج کا فیصلہ کیا، انگریزوں کا خیال تھا کہ ہر وہ تہوار جو مقامی لوگوں کی اخلاقیات پر برا اثر ڈال سکتا ہے اسے سرکاری سرپرستی فراہم کی جائے۔ جان لارنس لاہور میں انگریز گورنر جنرل کا سیاسی نمائندہ تھا اسے بسنت کا تہوار مناسب دکھائی دیا؛ لہٰذا اس نے ۱۸۴۸ء میں پہلی بار ''جشن بہاراں'' منانے کا اعلان کیا، یہ بسنت ہفتہ بھی کہلایا، اس ہفتہ لاہور میں ناچ گانے، پتنگ بازی اور شراب کا عام استعمال ہوا۔ یہ وہ ہفتہ تھا جس میں اخلاقی جرائم کو ناقابل دست اندازی پولیس قرار دے دیا گیا۔ مؤرخین لکھتے ہیں اس ہفتہ شرفاء نے گلی کوچوں میں قدم تک نہ رکھا؛ کیونکہ ان کا خیال تھا کہ گلی کوچوں میں غنڈے ان کے ساتھ بدتمیزی کریں گے، جس سے ان کی عزت پر حرف آئے۔

قومی تہوار کی ترقی : ایک انگریز مؤرخ الیگزینڈر بریز (Alexander Breeze) جو مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زمانہ میں لاہور آئے تھے، انہوں نے یہاں بسنت منانے کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے : ”بسنت کا تہوار جو موسم بہار کا تہوار تھا، ۶ فروری کو بڑی شان وشوکت سے منایا گیا۔ رنجیت سنگھ نے ہمیں اس تقریب میں مدعو کیا اور ہم اس کے ہمراہ ہاتھیوں پر سوار ہو کر اس میلہ کی بہار دیکھنے چلے جو بہار کا خیر مقدم کرنے کے لئے منایا جاتا ہے۔ لاہور سے میلہ تک مہاراجہ کی فوج دورویہ کھڑی ہوتی ہے۔ مہاراجہ گذرتے وقت اپنی فوج کی سلامی لیتا ہے۔ میلہ میں مہاراجہ کا شاہی خیمہ نصب تھا، جس پر زرد رنگ کی ریشمی دھاریاں تھیں، خیمہ کے درمیان میں ایک شامیانہ تھا جس کی مالیت ایک لاکھ روپے تھی اور اس پر موتیوں اور جواہرات کی لڑیاں آویزاں تھیں، اس شامیانہ سے شاندار چیز کوئی نہیں ہوسکتی، مہاراجہ نے بیٹھ کر پہلے گرنتھ صاحب کا پاٹھ سنا، پھر گرنتھی کو تحائف دیئے اور مقدس کتاب کو دس جزدانوں میں بند کر دیا، سب سے اوپر والا جزدان بسنتی مخمل کا تھا، اس کے بعد مہاراجہ کی خدمت میں پھل اور پھول پیش کئے گئے، جن کا رنگ زرد تھا۔ بعد ازیں اُمراء، وزراء افسران آئے جنہوں نے زرد لباس پہن رکھے تھے، انہوں نے نذریں پیش کیں، اس کے بعد طوائفوں کے مجرے ہوئے، مہاراجہ نے دل کھول کر اِنعامات دیئے“۔ (نقوش، لاہور نمبر : ۷۶۳)

الیگزینڈر نے راجہ رنجیت سنگھ کے دور میں جس بسنت میلہ میں شرکت کی، وہ ۶ فروری کو منعقد کیا گیا۔ ہندو مؤرخین نے حقیقت رائے دھرمی کی سزائے موت پر عملدرآمد کی تاریخ بسنت پنچمی بتائی ہے، عین ممکن ہے اس سال بسنت پنچمی اور ۶ ؍فروری کی تاریخیں ایک ہی دن میں واقع ہوئی ہوں، لاہور میں ماضی قریب میں بسنت ۶ ؍ یا ۷ ؍فروری کو منایا جاتا رہا ہے۔ ان تاریخوں کی مشابہت بھی حقیقت رائے کے میلہ کی بسنت میلے سے نسبت کو ظاہر کرتی ہے۔

اس ہندوانہ رسم کا مقصد

بسنت پنچمی درحقیقت ایک ہندوانہ تہوار ہے جوکہ ہندو بڑے جوش وخروش سے مناتے ہیں جب کھیت میں چاروں طرف پیلے پھول لہرانے لگتے ہیں تو سمجھ لیجئے کہ تہوار کا وقت آ گیا ہے، موسمِ بہار کا تہوار صحیح معنوں میں ہندو اپنی دیوی سرسوتی کی تعظیم میں مناتے ہیں جب بیر پک کر پیلے ہو جاتے ہیں، ڈھاک اور اشو کا اپنے عروج پر ہوتے ہیں تو پھر خاص طور پر طالب علم ان کے علم کی دعوی سرسوتی کو اور دوسری دیویوں یعنی دھن کی دیوی، آزادی کی دیوی، اور تمام دیوتاؤں کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں۔

ہندؤں کے لئے یہ موسم اس لئے بھی بہت اہم ہے کہ ان کے دیوتا کرشانے خود کہا کہ یہ پھولوں کا موسم ہے۔ بسنت پنچمی چاند کی پانچویں تاریک رات ہے، ہندؤں کے مطابق دیوی سرسوتی کی مہربانی سے انسان خود کو پہچاننے لگا ہے؛ بلکہ انسان تو انسان دوسرے دیوتا بھی اپنے آپ کو پہچاننے لگے ہیں اس کی وجہ سے اچھی اور بری چیزوں میں پہچان ہو رہی ہے، اسی طرح سے ہندوؤں کا ایک مذہبی تہوار بن گیا ہے، جس میں چاروں طرف پھولوں کی خوشبو مہکتی ہے، اور صندل کی تیز خوشبو پھیلی ہوتی ہے، اس مبارک موقع پر ہندو برہمن اپنے بچوں کو مذہبی تعلیم کے لئے اسکول میں داخل کراتے ہیں اور ان کا جو دیوتا کرشا ہے وہ بھی دیوی سرسوتی کی پوجای کرتا ہے، کیونکہ ان کے مطابق اس کی وجہ سے وہ سولہ فنون اور دوسری باتوں کا ماہر ہوا تھا حتی کہ آج کل کے جدید دور میں بھی غالباً بنگال میں بچوں کی تعلیم اسی دن سے شروع کرتے ہیں؛ کیونکہ ان کا خیال ہے کہ اس دن سے تعلیم شروع کرنے سے دیوی سرسوتی کی مہربانیاں ان کے ساتھ ہوتی ہیں، پچھلے عہدوں میں اس وقت کے بادشاہوں نے اس دیوی کے سلسلے میں ادبی مباحثے ترتیب دیئے۔ اس میں شاعروں، ادیبوں، تمثیل نگاروں کو مبارک باد اور انعامات دیئے گئے اور اسی تہوار میں کالی داس کو (بطورِ تمثیل) لوگوں کے سامنے پیش کیا گیا۔

ہندؤں کے ہاں بسنت تہوار کا ایک تکنیکی مقصد یہ بھی ہے کہ یہ غذا اور کپڑوں کی تبدیلی کی اطلاع ہے؛ کیونکہ جیسے جیسے بسنت کا وقت قریب آتا ہے تو جسم میں قوت بڑھتی ہے اور خون بڑھتا ہے، اس میں جنسی رجحان بڑھتا ہے؛ اس لئے اس وقت کھانوں میں بہت زیادہ مصالحہ جات کا استعمال نہیں ہوتا، کیونکہ اس مناسبت سے صحت پر بہت برا اثر پڑتا ہے۔

ہندؤں کے دھرم کے مطابق بسنت تہوار ان کے لئے بہت اہم ترین دن ہے اور اس کا منانا ان کے لئے مذہبی اہمیت رکھتا ہے، یہ تہوار زیادہ تر پنجاب اور شمالی علاقوں میں فصل کٹ جانے پر منایا جاتا ہے، اس روز لوگ زرد کپڑے پہنتے ہیں اور پہلے چاول کھاتے ہیں، بھنگڑا ناچ اس تہوار کا خاص حصہ ہے۔

کیا بسنت صرف ایک موسمی تہوار ہے

بعض مہربانِ بسنت کہتے ہیں کہ بسنت ایک موسمی تہوار ہے اس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں'' یہ کوئی مذہبی تہوار نہیں ؛ بل کہ محض ایک تفریح و دل چسپی کا سامان ہے، چوں کہ سردیوں کا موسم ختم ہو رہا ہوتا ہے، جو لوگ موسم کی شدت کی وجہ سے گھروں میں بند تھے، درجہ حرارت مناسب ہونے پر گھروں سے باہر آتے ہیں اور خزاں اور سرما کی بے رنگی اور بدمزگی جو ان کے مزاج اور آنکھوں پر چھائی ہوئی تھی، پتنگ بازی کے ذریعہ اس کو دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اس طرح بسنت کو موسمی تہوار سمجھ کر وہ مسلمان بھی شریک ہو جاتے ہیں جنہیں حقیقت سے مکمل واقفیت نہیں اور سوائے سرسوتی پوجا کے اس میں وہ تمام کام انجام دیتے ہیں جو اہلِ ہنود میں رائج ہیں۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ مسلمانوں کی زندگی میں بھی ایسے لمحات بھی آنے شروع ہو گئے ہیں جن کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ کیا اسلام منسوخ اور مسخ شدہ ادیان کی طرح کوئی جزوقتی مذہب ہے، جو ہفتے کے مخصوص دن یا سال کے چند تہواروں کے ساتھ مخصوص ہے؟ کیا ہم اب اس مرحلے کو پہنچ گئے ہیں کہ اپنے آفاقی مذہب کو جامع نظریہ حیات سمجھنے سے بھی

دستبردار ہو جائیں محض اس لئے کہ خوشیوں کو نچا کر رنگ جما سکیں؟ کیا اسلام نے اپنے ماننے والوں کو شاندار اور پروقار تہوار نہیں دیے کہ ہمیں اڑوس پڑوس سے موسمی تہواروں کو مستعار لینے کی ضرورت پڑے پھر اسے موسمی تہوار کہہ کر بات ٹالنے کی ادا بھی خوب ہے، بالفرض بغرض بحث تھوڑی دیر کے لئے تسلیم کر لیتے ہیں کہ یہ موسمی تہوار ہے، لیکن یہ بات مان لینے سے معاملہ اور بھی خطرناک ہو جاتا ہے، اس واسطے کہ پھر تو یہ بات پکی ہو جائے گی کہ غیر مسلموں کا تہوار ہے؛ کیونکہ اسلام نے اپنے ماننے والوں کو جو تہوار منانے کا حکم دیا ہے، ان سب کا تعلق موسمی رُخ کی تبدیلی سے نہیں، کسی نیک اور بامقصد عمل سے ہے، حتی کہ اسلامی سال کی ابتداء بھی ہجرت کے پر مشقت عمل پر رکھی گئی ہے نہ کہ ولادت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جیسے اہم اور مقدس واقعہ پر۔ اسلام عملی مذہب ہے، اس نے ہر لمحے انسانیت کو کسی عمل خیر کی دعوت دی ہے اور تخلیق انسانیت کے اس مقصد کو ہمہ وقت پیش نظر رکھنے کے لئے تمام اہم دنوں کو کسی اہم عمل کے اختتام یا آغاز سے جوڑا ہے۔

سادہ لوح مسلمان

کائنات میں ہونے والی فطری تبدیلیوں، دن رات کے آنے جانے اور موسموں کی تبدیلی کے آثار پر غور وفکر کرنے کی بھی دعوت دی ہے اس لئے کہ اس سے انسان کے دل میں معرفت کی کونپل پھوٹ سکے اور وہ عمل خیر کی طرف راغب ہو جائے۔ بسنت کا میلہ اگر چہ موسمی تہوار ہے؛ مگر اس موسم میں یہ تہوار دیوتاؤں کے پجاری منایا کرتے ہیں اور اس تہوار کا زور پہلے سکھوں کے عیاش حکمران رنجیت سنگھ کے ہاتھوں ہوا، پھر ہندو عوام نے توہین رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مرتکب ایک گستاخ چھوکرے کو ہیرو کا درجہ دینے کے لئے زور وشور سے منانا شروع کیا۔ رفتہ رفتہ سکھ ہٹ گئے، ہندو پیچھے رہ گئے اور رسم پرستی کا یہ جھنڈا سادہ لوح مسلمانوں نے تھام لیا۔

ممکن ہے ماڈرن طبقہ یہ بات تسلیم نہ کرے ہمارے دانشور بھی ہم مولویوں کی کتابی

تحقیق کو اہمیت نہ دیں، ان کے خیال میں یہ انسائیکلو پیڈیا کی سی ڈیز اور انٹرنیٹ کے ذریعے کی جانے والی ''سائنٹیفک ریسرچ''(Certificate Research) کا دور ہے جو بات بھی ''کوڈ''(Code) کی جائے اس کے ساتھ ''ریفرنس''(Reference) ضرور ہونا چاہئے۔

امتِ مسلمہ کی تہذیب

امتِ مسلمہ کی تہذیب وثقافت اور نظامِ زندگی غیر مسلموں سے قطعی مختلف ہے، اسی بنیاد پر بعض ممالک اسلامیہ معرضِ وجود میں آئے تھے، اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر مادی وسائل وذرائع کے باب کھول دیے اور دولت وسرمائے کی اس قدر فراوانی ہوگئی ہے کہ اصحابِ ثروت نے عیش کوشی اور سرمستی کی راہ اختیار کرکے عام لوگوں کو خصوصاً وسائل زندگی سے محروم افراد کے لئے جینا حرام کردیا ہے اور لہو ولعب اور کھیل کود کا وہ طریق کار اختیار کرلیا ہے جو انسانی جان کا دشمن، دولت وسرمائے کی ضیاع کا موجب اور نظامِ زندگی مفلوج کردینے کا باعث ہے، اس سلسلے کی خطرناک چیز پتنگ بازی ہے، جو موسمِ بہار کی آمد پر کھیلا جانے لگا ہے، اسلام نے کھیل کود اور اظہارِ مسرت وخوش طبعی پر کوئی قدغن یا پابندی عائد نہیں کی؛ بلکہ اس کے لئے کچھ حدود وقیود اور ضابطے مقرر کردیے ہیں، عید اور مسرت کے سلسلے میں حضرت محسن انسانیت ﷺ نے مدینہ منورہ میں تشریف آوری کے موقع پر جب یہودیوں اور عیسائیوں کی جانب سے اظہارِ مسرت کا یوم اور ان کی تقریب دیکھی تو آپ ﷺ نے فرمایا:

''ہمارے لئے اللہ تعالیٰ نے مسرت وشادمانی کے دو دن مقرر کئے ہیں، ایک عید الفطر اور دوسرا عید الاضحیٰ''۔(۱)

چنانچہ امت مسلمہ ان دونوں ایام پر اظہارِ مسرت وشادمانی کا خوب خوب مظاہرہ کرتی

([illegible] سنن أبی داود، حدیث: ۱۱۳۴)

ہے اور پوری دنیا کے مسلمان ان دنوں میں کسی قسم کے غل غپاڑے اور بدتہذیبی کا مظاہرہ نہیں کرتے؛ بلکہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکامات کے مطابق نہایت شائستگی کے ساتھ ایامِ عید ومسرت مناتے ہیں، اللہ کے حضور سجدہ ریز ہوتے ہیں اور دعائیں کرتے ہیں۔

تہوار منانے کے طریقے دنیا کی مختلف قوموں میں بے شمار ہیں۔ کچھ میں صرف کھیل کود اور راگ رنگ اور لطف وتفریح تک ہی تہوار محدود رہتا ہے، کہیں تفریحات تہذیب کی حد سے گزر کر فسق وفجور اور ناشائستگی کی حد تک پہنچ جاتی ہیں کہیں مہذب تفریحات کے ساتھ کچھ سنجیدہ مراسم بھی ادا کیے جاتے ہیں، اور کہیں ان اجتماعی تقریبات سے فائدہ اُٹھا کر لوگوں میں اعلیٰ درجہ کی روح پھونکنے اور کسی بلند نصب العین کے ساتھ محبت اور گرویدگی پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، غرض ہر ایک قوم کا تہوار منانے کا طریقہ گویا ایک پیمانہ ہے جس سے آپ اس کے مزاج اور اس کے حوصلوں اور اُمنگوں کو اعلانیہ ناپ کر دیکھ سکتے ہیں، جتنی بلند روح کسی قوم میں ہوگی، اتنے ہی اس کے تہوار اخلاقی اعتبار سے مہذب اور پاکیزہ ہوں گے، اس طرح اخلاقی اعتبار سے قوم جتنی پست ہو گی وہ اپنے تہواروں میں اتنے ہی مکروہ مناظر پیش کرے گی۔

افسوسناک پہلو

لیکن یہ انتہائی افسوس ناک صورت ہے کہ مسلمانوں میں ہندوؤں اور غیر مسلموں کا کھیل ’’پتنگ بازی‘‘ اب حکومتی تائید وحمایت اور اس کے ذریعہ ابلاغ کی ترغیب کے ساتھ تہذیب وشرافت کی حدود وقیود سے تجاوز کی صورت میں منایا جانے لگا ہے اور نوبت بایں جا رسید کے ہر سال سینکڑوں معصوم بچے اور جوان پتنگ بازی کے دوران اور اس کے ثمرات (پتنگ) لوٹتے ہوئے مکانوں کی چھتوں سے گر کر بجلی کے تاروں میں الجھ کر اور تانبے کے تاروں سے پتنگ بازی کرتے ہوئے موت کی وادی میں چلے جاتے ہیں۔ اسپتالوں میں بجلی سپلائی نہ رہنے پر آپریشن تھیٹر میں کئی مریض ادھورے ادھورے آپریشن

کی صورت میں دم توڑ جاتے ہیں، غرض یہ کہ کھیل نہ تو صحت افزائی کا موجب ہے نہ اس کے مادی فوائد ہیں، جس کھیل میں معصوم بچوں اور جوانوں کی اچانک موت کے باعث بے شمار ماؤں کے جگر گوشوں کی میتیں ان کے سامنے آجائیں، جن بوڑھوں کے جوان سہارے آناً فاناً ٹوٹ جائیں ان پر جو گذرتی ہے وہی جانتے ہیں۔

بعض ''اعلیٰ'' حلقوں میں بھی یہ آواز سننے میں آئی ہے کہ موسمِ بہار کی آمد پر اظہارِ مسرت کی آزادی ہونی چاہیئے، اگر موسمِ بہار کی آمد کے موقع پر مسلمانوں کا اپنا کوئی انداز اور کھیل نہیں ہے اور ہندوؤں کا ہی کھیل اپنانا ضروری ہے تو ہولی کا تہوار ہے، اس میں صرف ایک دوسرے پر ''رنگ افشانی'' ہوتی ہے۔ ملبوسات پر رنگ پھینک کر خوشی کا اظہار کیا جاتا ہے۔ اس میں جانوں کا نہیں صرف کپڑوں کا ضیاع اور نقصان ہوتا ہے۔

دشمن طاقتیں اور ان کے مقاصد

ملٹی نیشنل کمپنیوں (Multi National Companies) نے اپنے کاروبار کی توسیع کے لئے تیسری دنیا کا رُخ کیا۔ جب یہ کمپنیاں غریب ممالک میں آئیں تو انہوں نے محسوس کیا، مشرق ومغرب کی تہذیب اور ثقافت میں بہت فرق ہے، اس فرق کے باعث ان کے مشروبات، ان کے لباس، ان کے طرز رہائش، ان کی بیماریاں، ان کی بیماریوں کے علاج اور ان کے تہواروں میں بہت فرق ہے، اب ظاہر ہے جس جگہ شکر کا شربت پیا جاتا ہو، لسی جس علاقے کا مشروب ہو وہاں چائے کی کیا گنجائش نکلے گی؟ جس علاقے کے ۹۰ رفیصد تمباکو نوش حقہ پیتے ہوں وہاں گولڈ فلیک (GoldFlake) یا ویلز (Wills) کی مارکٹ کہاں ہوگی؟ جہاں لوگ شلوار قمیص پہنتے اور دھوتی باندھتے ہوں اس ملک میں جینز (jeans) اور جیکٹ (Jacket) کون خریدے گا؟ اور جس علاقے میں لوگ نزلے کا علاج جوشاندے سے کرتے ہوں وہاں اینٹی بائیٹک (AntiBiotic) کی خرید وفروخت کا کیا امکان ہوگا؟ لہذا ملٹی نیشنل کمپنیوں نے سوچا کہ جب تک وہ تیسری دنیا کی ثقافت نہیں

بدلیں گے ان کے کاروبار کی سرحدیں آگے نہیں پھیلیں گیں، ملٹی نیشنل کمپنیوں نے ۶۰ رکی دہائی کے آخر میں پوری دنیا کی ثقافت میں ''مساوات'' پیدا کرنے کا عمل شروع کر دیا، اس ضمن میں چار شعبے منتخب کیئے گئے۔

ملٹی نیشنل کمپنیوں کے چار ہتھکنڈے

شوبز (Shows)، کھیل تہوار اور بیماری، اس سلسلے میں آپ غور و فکر کریں تو آپ ملٹی نیشنل کمپنیوں کی سرکاری حرکات سمجھ جائیں گے مثلاً۔

شوبز کو لیجئے، اس مکروہ اور شیطانی کاروبار میں جتنی ترقی پچھلے کچھ برسوں میں ہوئی اتنی کسی شعبے میں نہیں ہوئی رنگین ٹیلی ویژن (Colour Television)، انگیریزی فلمیں (English Flims)، فحش کیسٹیں (Cassets)، وی سی آر (VCR)، ڈی وی ڈی (DVD)، ڈش انٹینا (Dish Antenna)، کیبل (Cable)، اور انٹرنیٹ (Internet) کیا ہے؟ یہ وہ بیماری ہے جس نے آرنلڈ (Arnold)، جیز (Jise)، فوانڈا میڈونا (Fonda madonna)، اور مائیکل جیکسن (Michael jackson) کو پوری دنیا کا ہیرو بنا دیا، آج میڈونا (Madonna) پاکستان جیسے پسماندہ ملک میں بھی اتنی ہی مشہور ہے جتنی امریکا اور یورپ میں۔

کھیل ملٹی نیشنل کمپنیوں کا دوسرا ہتھیار ہے، ملٹی نیشنل کمپنیوں نے ایک سازش کے ذریعے کرکٹ، اسکواش اور ٹینس کو پوری دنیا کا کھیل بنا دیا، کرکٹ اس فہرست میں پہلے نمبر پر ہے، اسکی وجہ یہ ھیکہ یہ دنیا کا وہ کھیل ہے، جس میں زیادہ سے زیادہ اشتہارات کی گنجائش موجود ہے، مثلاً آپ باؤلر کو دیکھئے جب باؤلر اسٹارٹ لینے کے لئے لائن کی طرف جاتا ہے، اپنی پتلون پر بال رگڑتا ہے، تو اس دوران ملٹی نیشنل کمپنیاں اسکرین اور ریڈیو پر اپنے اشتہارات چلاتی رہتی ہے، ہر اوور (over) اور ہر نئے کھلاڑی کی آمد کے دوران بھی اشتہارات چلائے جاتے ہیں، کرکٹ کے مقابلے میں ہاکی اور فٹبال جیسے کھیل تیسری دنیا میں

اس لئے نہ پنپ سکے کہ یہ مسلسل کھیل ہوتے ہیں ان میں اگر کوئی کھلاڑی بال لیکر بھاگتا ہے تو ٹیلی ویژن کیمرہ سے مسلسل دکھانے پر مجبور ہے؛ لہذا اس میں سے اشتہار کی گنجائش نکالنا تقریباً ناممکن ہے۔

تہوار ملٹی نیشنل کمپنیوں کا تیسرا بڑا ہتھکنڈا تھا، ان کمپنیوں نے ایک مکمل سازش کے ذریعے نیو ائیر (New year) نائٹ، ویلنٹائن ڈے (Valentine day) اور کرسمس جیسے تہواروں کو پوری دنیا کا تہوار بنا دیا، اب ذرا خود دیکھئے، اس وقت نیو ائیر نائٹ پوری دنیا میں منائی جاتی ہے۔ ۳۱/دسمبر ۱۹۹۹ء کو ملینیم نائٹ (Millenium night) منائی گئی۔ اس رات صرف امریکہ میں ۷۶/ارب ڈالر کی شراب پی گئی، اس شراب کا فائدہ کس نے اٹھایا؟ شراب بنانے والی کمپنیوں نے۔ ان کمپنیوں نے تین سال پہلے ہی سے ملینیم نائٹ کا ڈھنڈورا پیٹنا شروع کر دیا تھا۔ میڈیا کو پیسے کھلا کر پوری دنیا کو ملینیم نائٹ کے بخار میں مبتلا کر دیا گیا، یہاں تک کہ پاکستان کے وہ لوگ جن کے پاس چارپائی تک نہیں تھی، وہ بھی نئی صدی کے استقبال کے لئے ۳۱/دسمبر بارہ بجے سڑکوں پر کھڑے تھے یہی صورت حال ویلنٹائن ڈے کی ہے، اس ملک کی آبادی کا زیادہ تر حصہ "ویلنٹائن ڈے" کے تلفظ سے واقف نہیں لیکن وہ پھول اٹھا کر پھر رہا ہے۔

بسنت یہ ایک مقامی تہوار تھا، جو مقامی سطح پر منایا جاتا تھا، ۸۰ء کے دہائی کے اخیر میں ملٹی نیشنل کمپنیوں نے محسوس کیا کہ اگر اس تہوار کی پشت پناہی کی جائے تو یہ تہوار منافع بخش کاروبار بن سکتا ہے، چنانچہ ایسے لوگ تلاش کئے گئے جو اس سلسلے میں ملٹی نیشنل کمپنیوں کی مدد کر سکتے ہیں، یورپی ممالک نے اپنے سفارت کاروں کو بسنت کے تہوار میں شریک ہونے کی ہدایت کی، وہ سفارت کار جو سفارت خانے سے نکلنے کے لئے حکومت سے حفاظت کی سو سو گارنٹیاں (Guarantee) مانگتے ہیں وہ اندرونِ ملک دو دو دن بسنت مناتے دیکھے گئے، ملٹی نیشنل کمپنیوں نے بسنت کو اسپانسر (Sponsor) کیا، میڈیا نے اسی کو ترویج

دی، کوک جائے اور ٹوتھ پیسٹ بنانے والوں نے اشتہارات دیئے، بسنت کے گانے ریکارڈ ہوئے اور پتنگیں اڑاتے اداکار ٹیلی ویژن پر دکھائے جانے لگے، یوں دو تین برسوں میں بسنت قومی تہوار بن گئی، حکومت نے اس ناجائز بچے کو اپنا نام دیدیا، ''جشن بہار'' کی شکل میں بسنت سرکاری تہوار بن گیا۔

بیماریاں اور ادویات ملٹی نیشنل کمپنیوں کا چوتھا ذریعہ ہیں، آپ ذرا سوچیں! ایڈز، ہیپاٹس اور امراضِ قلب اس خطے کی بیماریاں ہیں یا نہیں؟ یہ یورپی امراض تھے، ملٹی نیشنل کمپنیوں نے خوراک کے ذریعے یہ امراض اس خطے میں پیدا کیئے اور آج تیسری دنیا کے کروڑوں اربوں لوگ جگر اور جنس کے اربوں ڈالر کی دوائیں کھا رہے ہیں۔

اب سوچیں کہ بسنت کا سب سے زیادہ فائدہ کس کو پہنچ رہا ہے؟ یہ ملٹی نیشنل کمپنیاں جو اس تہوار کے ذریعے اپنی مصنوعات کے اشتہارات دیتی ہیں۔

پتنگ بازی کی تاریخ

جہاں تک پتنگ بازی کا تعلق ہے تو ہندوستان میں پتنگ بازی کا فن صدیوں سے موجود تھا، پتنگ کی ایجاد کا سہرا دو قوم لیتی ہیں، چینی اور مصری، چینیوں کا دعوی ہے کہ پہلی پتنگ 400 سال قبل مسیح چین میں بنائی اور اڑائی گئی، اس کے بعد چین کے اشرافیہ اپنے اکثر تہواروں اور تقریبات میں پتنگیں اڑاتی تھی، شاہی خاندان پتنگ سازوں کی باقاعدہ حوصلہ افزائی کرتا تھا، اس دور میں پتنگ سازی کے ماہرین کو دربار میں عہدہ دیا جاتا تھا، چینیوں کے برعکس مصریوں کا دعوی ہے کہ پتنگ سازی فراعین کے دور میں موجود تھی، اس ضمن میں وہ اہراموں سے برآمد ہونے والی تصاویر اور بت بطور ثبوت پیش کرتے ہیں، ان تصاویر میں فرعون کو پتنگیں اڑاتے دکھایا گیا ہم مصریوں کا کہنا ہے کہ یہ فن مصری جہاز رانوں یا تاجروں کے ذریعے چین پہنچا، چینی بادشاہوں نے اسے شرف قبولیت بخشا اور یوں پتنگیں چین میں رائج ہوگئیں، مصر میں چونکہ پتنگ بازی صرف شاہی خاندان تک محدود تھی؛ لہٰذا

اسے شاہی کھیل سمجھا جاتا تھا، اور عام آدمی کو یہ کھیل کھیلنے کی اجازت نہیں تھی، چنانچہ وہاں یہ کھیل کھل کر سامنے نہ آسکا، جبکہ چین میں بادشاہوں نے اسے عام کر دیا، یوں پتنگ چینیوں کی ایجاد محسوس ہونے لگی، اگر ہم مصریوں کے دلائل تسلیم کرلیں تو پھر پتنگ بازی کی تاریخ ۵ ہزار سال قبل مسیح ہے، لیکن یہ بات حقیقت ہے کہ پتنگ چین سے ہو کر برصغیر اور پھر یورپ پہنچی، برصغیر میں پتنگ بازی، پتنگ سازی اور پتنگ کو بطور صنعت قائم کرنے کا اعزاز بودھ مت کے پیروں کو حاصل ہے، بودھ بھکشو پہلی پتنگ ہندوستان لے کر آئے، ہندوستان کے باسیوں کے لئے ایک بالکل نئی اور حیران کن چیز تھی؛ اس لئے یہ بڑی تیزی سے سارے ہندوستان میں پھیل گئی، ہندو راجاؤں اور مہاراجاؤں نے اس کی پذیرائی کی، اپنی نگرانی میں پتنگیں تیار کرائیں، پتنگیں اڑانے کے لئے ٹیمیں بنائیں اور پھر عوام کو یہ ''میچ'' دیکھنے کی دعوت دی۔

اب پتنگ بازی ایک ایسا شغل ہے جو دنیا کے تمام ممالک میں پایا جاتا ہے، ہاں مختلف ملکوں میں اس کے انداز ضرور مختلف ہوں گے، ہندو پاک میں شاید ہی کوئی ایسا علاقہ ہوگا جہاں پتنگ نہ اڑائی جاتی ہو، اب تو پتنگ سازی ایک چھوٹی صنعت کی شکل اختیار کر گئی ہے، یہاں تک کہ گاؤں دیہاتوں میں تو پتنگوں کے میچ رکھے جاتے ہیں، اور ان کی خوب ذوق وشوق سے تیاری کی جاتی ہے، پتنگ کی ڈور کو تیز دھار بنایا جاتا ہے تاکہ پیچ لگتے ہی حریف کی پتنگ کاٹ دی جائے۔

دنیا کی پہلی پتنگ

تاریخِ عالم میں پتنگ اڑانے کا اولین تحریری حوالہ ۲۰۰ء قبل مسیح میں ملتا ہے، جب چین میں سپہ سالار ہان سینگ نے دشمن کے ایک شہر کے باہر پڑاؤ ڈال رکھا تھا لیکن وہ براہِ راست حملے کا خطرہ مول لینے کے بجائے ایک سرنگ کھود کر شہر میں داخل ہونا چاہتا تھا لیکن اسے یہ اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ سرنگ کتنی لمبی کھودنا پڑے گی، اس لیے اس نے پڑاؤ کے

مقام سے شہر کی فصیل تک کا فاصلہ ناپنے کی ٹھانی۔

اس نے دیکھا کہ ہوا اس سمت کی ہی چل رہی ہے جہاں وہ سرنگ کے ذریعے حملہ آور ہونا چاہتا ہے اور وہ یہ دیکھ رہا تھا کہ اس کے پڑاؤ والے علاقے سے اس جانب ہوا کے ساتھ کاغذ اڑتے جاتے ہیں۔بس یہ دیکھ کر اس نے ایک کاغذ لیا، اور اس میں ایک درخت کے چند تنکے باندھ دیے تاکہ اسے ہوا کا دباؤ حاصل ہو سکے جو اس کے اڑنے میں مددگار ثابت ہو، اور پھر ایک لمبے دھاگے کی مدد سے اسے اڑا دیا۔

جب وہ کاغذ مطلوبہ مقام تک پہنچ گیا تو اسے ناپ کر واپس کھینچ لیا، اور ڈور کو ناپ کر فاصلہ معلوم کر لیا۔یہی دنیا کی پہلی پتنگ تھی، جو ایک جنگی مقصد حاصل کرنے کے لیے اڑائی گئی تھی۔ پھر قدیم چین میں پتنگ سازی فوجی استعمال کے لیے کی جانے لگی، جس میں فوج کا جاسوسی کا کام بھی تھا۔اپنے ہی فوجیوں کو ایک پڑاؤ سے دوسرے پڑاؤ تک پیغام رسانی، اور اپنے ساتھیوں کو اپنی پوزیشن بتانے کے لیے پتنگیں اڑائی گئیں، اور حیران کن بات یہ ہے کہ چھوٹے ہتھیار تک ایک جگہ سے دوسری جگہ ان پتنگوں سے پہنچائے گئے۔

پھر اس کے بعد چین سے پتنگ سازی کا یہ فن کوریا پہنچا، وہاں بھی ایک جرنیل کی کہانی ملتی ہے، جس کی فوج نے آسمان پر ایک تارا ٹوٹتے دیکھا، اور اسے برا شگون سمجھ کر میدانِ جنگ سے منہ موڑ لیا۔جرنیل نے اپنی فوج کا وہم دور کرنے کے لیے سپاہیوں کو بہت سمجھایا بجھایا لیکن وہ نہ مانے۔آخر جرنیل نے ایک ترکیب سوچی، اس نے ایک بڑی سی سیاہ پتنگ تیار کی، اور اس کی دم سے ایک شعلہ باندھ کر رات کے اندھیرے میں اسے اڑایا تو فوج کو یقین آگیا کہ آسمان سے جو تارا ٹوٹا تھا وہ واپس آسمان کی طرف لوٹ گیا ہے، اور اس طرح محض ایک پتنگ کے زور پر جرنیل نے اپنی فوج کا حوصلہ اتنا بلند کر دیا کہ وہ لڑائی جیت گئی، فوج کے بعد یہ کارگر نسخہ بدھ راہبوں کے ہاتھ لگا جو بدروحوں کو بھگانے کے لیے عرصہ دراز تک پتنگوں کا استعمال کرتے رہے، چنانچہ ۲۰۱۵ء میں چین کے شہر بیجنگ کے ایکسپو

پارک میں ایک عالمی پتنگ میلہ منعقد کیا گیا، جس میں دنیا بھر سے پتنگ بازی کے شوقین حضرات نے شرکت کرکے اپنے فن کا مظاہرہ کیا، اسی عالمی پتنگ میلے میں چینیوں کا عقیدہ ہے کہ پتنگ جتنی اونچی اڑے گی آپ کی پریشانیاں آپ سے اتنی ہی دور ہوجائیں گی، کسی کی چھت پر کٹی پتنگ گرجائے تو اسے بدشگونی سمجھا جاتا ہے، اوراس پتنگ کو پھاڑ کر جلا دیا جاتا ہے۔

چین اور کوریا سے ہوتا ہوا جب پتنگ بازی کا یہ فن جاپان پہنچا تو عوام میں اتنا مقبول ہوا کہ جاپان میں ایک سخت قانون نافذ کر دیا گیا جس کے تحت صرف شاہی خاندان کے افراد، اعلیٰ سِول اور فوجی افسران، اور چند مراعات یافتہ معزز شہریوں کو پتنگ اڑانے کی اجازت دی گئی۔

مشرقِ بعید سے پتنگ بازی کا مشغلہ کب اور کس طرح برصغیر پاک و ہند پہنچا، اس بارے میں تاریخ کوئی واضح اشارہ نہیں دیتی، البتہ اس ملک میں پتنگ بازی کی اولین دستاویزی شہادتیں مغل دور کی مصوری میں دکھائی دیتی ہیں۔

سولھویں صدی کی ان تصویروں میں اکثر یہ منظر دیکھا جاسکتا ہے کہ عاشق زار اپنے دل کا احوال کاغذ پر لکھ کر ایک پتنگ سے باندھتا ہے، پھر یہ پتنگ ہوا کے دوش پر سوار ہوکر کوچۂ محبوب کی فضاؤں میں پہنچتی ہے اور معشوقۂ دلنواز کی چھت پر منڈلانے لگتی ہے۔

پتنگ بازی کے نقصانات

معاشرہ کی تبدیلی

ساٹھ ستر سال قبل شاید اکا دکا آدمی ہی اس مشغلے سے واقف ہوگا، پچیس تیس سال پہلے کی بات ہے پتنگ اڑانے والوں کو آوارہ اور بدقماش سمجھا جاتا تھا لیکن یہ آوارہ لوگ بھی سورج ڈھلنے سے پہلے پہلے کچھ وقت کے لئے پتنگ بازی کرتے، چھتوں پر دعوتوں اور مہمانوں کا

اہتمام نہ ہوتا صرف گھر کا وہی آدمی یہ شوق پورا کرتا جو بزرگوں کو راضی کرلیتا یا پھر ان کی حکم عدولی پر اتر آتا۔ گھر کے باقی لوگ اور بچے اس کے قریب تک نہ جاتے لیکن ملک میں جوں جوں صنعت کی بجائے ثقافت کو روزگار پیدا کرنے والے شعبے کا درجہ دیا جانے لگا توں توں نوجوان لڑکے لڑکیاں ماڈلنگ کے نام پر جسم فروشی کی منڈی کا مال بننے لگے اور یہ مال بسنت میلوں میں سجایا جاتا ہے، بسنت پارٹیوں کے بھیس میں معاشرے کے امن اور عزت کی بربادی ہونے لگی، حکومت کے پاس بھوک سے بلکتے عوام کو دینے کے لئے کچھ بھی نہیں وہ تو عید کے موقع پر بھی ہر گھر میں چولہا گرم رکھنے کا انتظام نہیں کرسکتی، اسے تو مدد مل گئی کہ شہر کے کچھ ٹیڑھے امراء نے ثقافت کو قابل فروخت بنانے کے گر بتادیے، گڈیاں اڑانے کے لئے اب ماہر پتنگ باز دیہاڑی پر منگوائے جاتے ہیں، ان کی انگلیاں زخمی ہوتی ہیں زور سارا ان پر سرمایہ لگانے والے امراء کے پھیپھڑوں کا خرچ ہوتا ہے، شروع شروع میں رنگدار آنچل بھی ان چھتوں پر لہراتے، یہ پتنگ بازوں کی فوج کے جھنڈے نظر آتے لیکن اب ایسی پارٹیوں میں شریک ہی وہ خواتین ہوتی ہیں جو دوپٹے کو بوجھ سمجھتی ہیں، پتنگ بازی ایک عذاب کی طرح کشادہ چھتوں پر چلتی ہوئی غریب آبادیوں کی دس دس فٹ کی چھتوں کو پھلانگنے لگی ہے، ثقافت بیچنے والوں نے ان غریبوں کے دل و دماغ میں یہ بات بٹھادی ہے کہ زندگی کی جو خوشیاں وہ سارا سال حاصل نہیں کرسکتے وہ بسنت منا کر سمیٹ لیں۔ یوں اندرون شہر اور گنجان آباد غریب علاقوں میں جس طرح نالیوں اور گٹروں سے گندا پانی ابل رہا ہوتا ہے اسی طرح کٹی پھٹی پتنگیں درختوں اور تاروں کے ساتھ چمٹی دکھائی دیتی ہیں، شہر میں ہر برس پتنگ لوٹتے اور اڑاتے ہوئے چھتوں سے گرنے کے واقعات ان ہی علاقوں میں رونما ہوتے ہیں، ٹی وی پر بسنت پروگراموں کا سب سے زیادہ اثر ان ہی علاقوں کے بچوں پر مرتب ہوتا ہے، سال بھر میں زیادہ تر یہی علاقے پتنگ بازی کا مرکز بنے رہتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ان علاقوں کے لئے حکومت نے جو ترقیاتی فنڈ رکھے ہوتے

ہیں وہ برقی تنصیبات کی مرمت وغیرہ پر خرچ ہو جاتے ہیں، یہ تو ایسا ہی ہوا کہ کسی غریب آدمی نے ساری زندگی روپیہ روپیہ جمع کر کے کچھ رقم اکٹھی کی ہو کہ مکان بنا لیا جائے اور جب بسنت آئے تو وہ عمر بھر کی پونجی کو پتنگ بازی میں اڑا دے۔ (ڈیلی ۹۲ روزنامہ، منگل 12 فروری 2019ء)

اس تہوار کا تعلق حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں گستاخی کرنے والے ایک شخص سے ہو اور کوئی مذہبی تہوار نہ ہو؛ بل کہ محض ایک تفریح و دل چسپی کا سامان ہو لوگ خزاں اور سرما کی بدمزگی پتنگ بازی کے ذریعہ اس کو دور کرتے ہوں اس اختلاف سے قطع نظر کہ یہ موسمی رسم ہے یا مذہبی تہوار؟ مگر یاد رہے کہ بسنت کو موسمی تہوار سمجھ کر وہ مسلمان بھی شریک ہو جاتے ہیں جنہیں حقیقت سے مکمل واقفیت نہیں اور سوائے سرسوتی پوجا کے اس میں وہ تمام کام انجام دیتے ہیں جو اہل ہنود میں رائج ہیں اور بہ حیثیت مسلمان ہماری ذمہ داری ہے کہ ذیل کے گناہوں کی بناء غیر مسلموں کے شانہ بشانہ اسے منانے سے مکمل اجتناب کریں!

مجموعی طور پر پتنگ بازی کے نقصانات:

۱۔ فضول خرچی
۲۔ جانی نقصان
۳۔ پتنگ لوٹنا
۴۔ پتنگ کے پیچھے دوڑنا
۵۔ آپسی رنجش
۶۔ یادِ الٰہی سے غفلت
۷۔ مشابہت غیر
۸۔ وقت کا ضائع کرنا

پتنگ بازی اور مالی نقصان

ان سب کھیلوں میں مال مفت ضائع ہوتا ہے، اور فضول خرچی کا حرام ہونا قرآن سے ثابت ہے، اس کھیل میں تفریح کم اور فضول خرچی زیادہ ہوتی ہے، قومی اخبارات کا جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ہر سال ملک میں کرڑوں روپیئے کی پتنگیں تیار کی جاتیں ہیں، جن میں سے نوے فیصد پہلی بار اڑانے سے ہی ناکارہ ہوجاتی ہیں، اگر کچھ صحیح سلامت ہو بھی تو وہ بھی دوسری دفعہ ٹکڑے ٹکڑے ہوجاتی ہیں، یہ تمام پتنگیں ضائع ہوجاتی ہیں، جس سے اسراف اور فضول خرچی کے علاوہ کوئی فائدہ نہیں ہوتا پتنگ ڈور تو مہنگی ہوتی ہی ہے، اب اِس کے ساتھ لائٹنگ، لاؤڈ اسپیکر، دعوت وغیرہ کے التزامات مستزاد ہونے لگے ہیں، اللہ عزوجل کا ارشاد گرامی ہے : اے بنی آدم کھاؤ پیو اور حد سے تجاوز نہ کرو، اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو پسند نہیں فرماتا جو حد سے تجاوز کرتے ہیں۔ ’’یَا بَنِي آدَمَ خُذُوا زِينَتَكُمْ عِندَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَكُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا ۚ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ‘‘ (سورۃ الاعراف: ۳۱)

اس پتنگ بازی کے وجہ سے کئی ایک ٹرانسفارم تباہ ہوجاتے ہیں، جس سے کروڑوں کا نقصان ہوتا ہے، اس وطن کے بہت سے لوگ بھوک اور وسائل زندگی سے محرومی سے تنگ آکر خودکشیوں اور خودسوزیوں کی دہشت ناک ہلاکتوں کی راہ اختیار کرنے پر مجبور ہیں، ہندوستان میں سال 2005ء کی رپورٹ میں ہے کہ 31 کروڑ 17 لاکھ لوگ خطہ افلاس سے نیچے کی زندگی گزارتے ہیں، اب 2019ء کا اندازہ کرلیں، منصوبہ بندی کمیشن نے اپنے تازہ ترین اعداد وشمار میں کہا ہے کہ دو ہزار پانچ سے دو ہزار دس کے درمیان پانچ کروڑ لوگ ’غربت‘ کے زمرے سے باہر نکلنے میں کامیاب ہوئے ہیں، لیکن کمیشن نے صرف ان لوگوں کو غریب مانا ہے، جو روزانہ اٹھائیس روپے سے کم میں گزارا کرتے ہیں۔

سروے میں مذہب کی بنیاد پر بھی معلومات یکجا کی گئی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شہری علاقوں میں آبادی کے تناسب کے لحاظ سے مسلمانوں میں سب سے زیادہ غربت ہے

اور سب سے کم عیسائیوں میں، شہری علاقوں میں تقریباً ۳۴ چونتیس فیصد مسلمان انتہائی غربت کے زمرے میں آتے ہیں، حکومت کے اپنے اعداد شمار کے مطابق ملک کی تقریباً تیس فیصد آبادی انتہائی غربت میں زندگی گزارتی ہے، غیر مسلم ممالک میں فرزندانِ اسلام کو چن چن کر گولیوں کا نشانہ بنایا جارہا ہے، مسلمانوں کی آبادیاں کھنڈروں میں تبدیل کی جارہی ہیں، مسلمان عورتوں کی اجتماعی آبروریزی، فرزندان اسلام کی نسل کشی اور قتل وغارت گری کا بازار گرم ہے، ننھے ننھے معصوم یتیم بچے گلیوں اور سڑکوں پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر موت کی ہچکیاں لے رہے ہیں۔

پتنگ بازی میں کروڑوں روپئے فضا میں بکھر دینے والو! لاکھوں گولیاں فضاء میں ضائع کر کے جشنِ بہاراں منانے والو! یہ برما، فلسطین کے مظلوم مسلمان تمہارے ہی دینی اسلامی بھائی ہیں اس کروڑوں کے سرمائے سے تم اپنے ملک کے غریبوں اور مسکینوں کی مالی مدد کر کے انہیں خودکشیوں اور خودسوزیوں کی ہلاکت خیزیوں سے نجات دلاسکتے ہو، کشمیر اور فلسطین کے مظلوموں کے دکھ کا مداوا کر سکتے ہو، یہ دولت اور سرمایہ اللہ تعالیٰ کی ایک امانت ہے جو اللہ تعالیٰ نے تمہارے خالی ہاتھوں میں دی ہے، تم اگر شیطانی کاموں میں ضائع کرنے سے باز نہ آئے تو رزق اور مادی اسباب کے دروازے کھول کر دولت وسرمائے کی فراوانی دینے والا یہ دروازہ بند بھی کرسکتا ہے۔

ڈرو اس سے جو وقت ہے آنے والا

چند سال پہلے ایک دن میں ایک شہر میں بارہ سو مرتبہ ٹرپنگ ہوئی (Tripping)، ایک بار ٹرپنگ ہونے سے لگ بھگ 5 ہزار کا نقصان صرف برقی نظام کو برداشت کرنا پڑتا ہے جبکہ ایک فیڈر سے پانچ منٹ تک برقی سپلائی بند رہنے سے 2 لاکھ کا نقصان پہنچتا ہے۔

ایک سابق واپڈا (Wapda) اہلکار نے بتایا کہ دھاتی ڈور کے استعمال سے واپڈا کو کروڑوں کا نقصان ہو رہا ہے، بجلی کی ترسیل کے آلات اور تنصیبات جن میں گرڈ سٹیشن

(Grid Station) اور ٹرانسفارمر (Transformer) شامل ہیں وہ تباہ ہو جاتے ہیں، مسلسل ٹرپنگ نے نقصان کا حجم بہت زیادہ کر دیا ہے، اس صورتحال میں لیسکو کا یہ کہنا بجا ہے کہ ''پتنگ بازی جاری رہی تو بجلی کا نظام ختم ہو جائے گا۔''

پتنگ بازی اور جانی نقصان

پتنگ کی ڈور گلے پر پھرنے سے یا ڈور بیک وقت بجلی کی تاروں اور کسی شخص کو چھونے سے جو اموات ہوتی ہیں ان میں عام طور پر ملزم کا پتہ نہیں چلتا کیونکہ یہ جاننا بڑا مشکل ہوتا ہے کہ کٹی ہوئی پتنگ کس نے اڑائی تھی، خاص طور سے شہر میں جہاں ایک وقت میں لاکھوں نہیں تو کم از کم ہزاروں پتنگیں آسمان میں اڑتی رہتی ہیں، اس کی زد سے کوئی راہ گیر، سائیکل والا یا موٹر سائیکل والا محفوظ نہیں رہا۔

افسوسناک امر یہ ہے کہ پتنگ کی دھاتی ڈور سے کٹ کر جاں بحق ہونے والے افراد کی اکثریت ان لوگوں کی ہے جو نہ پتنگ اڑاتے ہیں اور نہ ہی ان کا مقصد پتنگ لوٹنا ہوتا ہے۔

(۱) ایک علاقہ میں ایک شخص اپنے تین سالہ لڑکے کو موٹر سائکل پر لے جارہا تھا کہ اچانک پتنگ کا دھاگہ بچے کی گردن سے آلگا اور گردن سے خون کا فوارہ نکلا اور دیکھتے ہی دیکھتے لڑکے سر تن سے جدا ہو کر والدین کی گود میں آگرا۔

(۲) ۱۸/سالہ فرسٹ ائیر کا طالب علم اپنے امتحانات کی تیاری میں مصروف، ایک دن ہاتھوں میں کتابیں پکڑے اسکول سے واپس آرہا تھا کہ پتنگ کی دھاتی ڈور اس کی گردن پر اس طرح پھری کہ ساری امیدیں اور خوابوں کے چراغ گل ہو گئے۔

(۳) ایک محلہ میں چند لڑکے باتیں کر رہے تھے کہ اچانک ایک کی نظر کٹی ہوئی پتنگ پر پڑی، یہ زور سے پتنگ پتنگ کہتا ہوا پتنگ کے پیچھے دوڑا، باقی لڑکے بھی اس کے پیچھے پیچھے بھاگ نکلے، سامنے سے تیز رفتار آتی ہوئی گاڑی سے ایک دس سالہ لڑکا ٹکرا گیا، جسے فوراً ہسپتال پہنچایا گیا لیکن دوسرے دن ہسپتال سے اس کی لاش گھر آئی، اس کی موت کا

سبب صرف اور صرف دو ٹکے کی پتنگ بنی۔

(۴) ایک چھ سال کی بچی اپنے والد کے ساتھ موٹر سائیکل پر بیٹھ کر جارہی تھی کہ اچانک ایک کٹی ہوئی ڈور کی پتنگ نے اس کی شہ رگ کو کاٹ ڈالا اور اس ننھی جان نے اپنے باپ کی ہاتھوں میں ہی تڑپ تڑپ کر جان دے دی۔

(۵) ایک 7 سالہ بچہ پتنگ کی دھاتی ڈور گلے پر پھرنے سے جاں بحق ہوگیا۔ اس بچے کے والد شفیق الرحمن نے بتایا کہ ''میں اپنے بیٹے جمیل الرحمن کو موٹر سائیکل پر اپنے آگے بٹھائے گھر جارہا تھا کہ اچانک ایک کٹی ہوئی پتنگ کی ڈور میرے بیٹے کی گردن پر گری، میں ایک دم بریک نہ لگا سکا، جس کے باعث وہ ڈور میرے بیٹے کی گردن پر چھری کی طرح تیزی سے پھر گئی اور اس کی گردن سے خون بہنے لگا، میں اسے جلدی سے قریبی ہسپتال لے کر پہنچا لیکن زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے وہ جانبر نہ ہوسکا'' اس معصوم بچے کی ماں اپنے بیٹے کی اس اچانک اور دردناک موت کی خبر سن کر نیم پاگل ہوگئی ہے اور اسے بالکل یقین نہیں آرہا کہ اب اس کا لاڈلا بیٹا اس دنیا میں نہیں ہے۔

(۶) ایک پتنگ باز دھاتی ڈور سے پتنگ اڑا رہا تھا کہ پتنگ کی دھاتی ڈور بجلی کی مین تار سے ٹکرا گئی، جس سے اس لڑکے جواد احمد کو کرنٹ لگا اور اس کی موقع پر موت ہوگئی۔

(۷) نوجوان عدنان جو بسنت کی خوشی میں اپنے پستول سے ہوائی فائرنگ کررہا تھا کہ پستول کی خرابی کے باعث خود ہی اس سے نکلنے والی گولی کا نشانہ بن کر موت کی آغوش میں چلا گیا۔

(۸) نوجوان فہیم احمد موٹر سائیکل پر گھر سے بازار جاتے ہوئے قاتل ڈور گلے پر پھرنے سے دن دیہاڑے تڑپ تڑپ کر سڑک کے اوپر جان کی بازی ہار گیا۔

(۹) مصری شاہ کا صہیب 14 سال کا تھا، کٹی پتنگ لوٹ رہا تھا کہ دھاتی ڈور کے باعث کرنٹ لگ گیا اور موقع پر ہی چل بسا۔ نوجوان بیٹے کی موت کی خبر سنتے ہی گھر میں کہرام

بچ گیا۔

(۱۰) تین اور چار سالہ بچے کو ایک کھلی گاڑی پر سفر کے دوران جبکہ 22 سالہ ایک نوجوان کو موٹر سائیکل چلاتے وقت موت نے آن گھیرا، ان واقعات کے بعد شیشہ لگی ڈور کے استعمال پر پابندی عائد کر دی گئی ہے اور اس کی خلاف ورزی کرنے والے کو پانچ سال کی سزائے قید دی جاسکے گی۔(17.08.2016 t.r.t urdu)

اخبار میں ایک بچے کی تصویر شائع ہوئی جس کے دونوں بازو گذشتہ سال بسنت کے موقع پر کاٹنے پڑے۔

14 سالہ طالب علم شام کو ٹیوشن پڑھ کر موٹر سائیکل پر گھر واپس آرہا تھا، اس کی گردن پر کٹی پتنگ کی ڈور پھر جانے سے اس کی شہ رگ کٹ گئی۔

ایک شخص اپنی اہلیہ اور تین سالہ بیٹے کے ساتھ موٹر سائیکل پر سوار ہو کر سسرال جا رہا تھا کہ اچانک بیٹا خون میں لت پت ہوگیا، دونوں میاں بیوی وحشت سے چیخ و پکار کرنے لگے تو علم ہوا کہ ڈور بچے کی شہ رگ کاٹ چکی ہے، چند لمحوں کے اندر اندر معصوم بچے نے باپ کی گود میں تڑپ تڑپ کر جان دے دی۔

بسنت کے حوالہ سے صرف ایک شہر میں ایک دن کے دوران تین واقعات پیش آچکے ہیں۔

پہلا واقعہ: سول انجینئر محمد اشفاق اپنے تین سالہ بچے کو موٹر سائیکل پر بٹھا کر جا رہا تھا کہ بچے کے گلے پر پتنگ کی ڈور پھر گئی جس سے اس کی شہ رگ کٹ گئی، محمد اشفاق اپنے معصوم بچے عبداللہ یاسر کے گلے پر ہاتھ رکھ کر خون روکنے کی کوشش کرتا رہا؛ مگر اس میں کامیاب نہ ہوا اور بچہ اس کی گود میں دم توڑ گیا۔

دوسرا واقعہ: سولہ سالہ شہزاد آصف دکان کی چھت پر گیا اور اس نے ایک پتنگ کی کٹی ہوئی ڈور کو پکڑ لیا، یہ ڈور دھات کی تھی، جس نے بجلی کی تاروں کو چھوتے ہی کرنٹ پکڑ لیا اور

شہزاد آصف کرنٹ لگنے سے جاں بحق ہوگیا، اس نوجوان کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ وہ اپنے خاندان کا واحد کفیل تھا۔

تیسرا واقعہ: ایک ۱۸ سالہ محنت کش شہزاد حسین چھت پر تھا کہ کسی طرف سے اندھی گولی آئی اور اس کا چراغ حیات گل کر گئی، یہ ایک شہر کے واقعات ہیں اور ایک دن کے ہیں، تیرہ سالہ بچہ محمد صدیق قرآن کریم کے پچیس پارے حفظ کر چکا تھا. بسنت کے موقع پر وہ اپنے مکان کی چھت پر چڑھا تو کسی طرف سے آنے والی اندھی گولی نے اس کی زندگی کی ڈور کاٹ دی، یاد رہے کہ پتنگ بازی میں مرنے والے کو شہادت کا ثواب نہیں بلکہ خودکشی کا گناہ ہوگا۔

بعض اوقات پتنگ چڑھاتے ہوئے پیچھے کو ہٹتے جاتے ہیں اور کوٹھے سے نیچے گر پڑتے ہیں، پتنگ بازی کے دوران چھت سے گر کر مرنے یا ہاتھ پاؤں ٹوٹنے کی خبریں، اخبارات میں چھپتی ہیں، اس طرح پتنگ یا ڈور لوٹنے کے دروان ٹریفک کے حادثات بھی اب بکثرت ہونے لگے ہیں، بعض کی خبریں اخبارات میں چھپتی ہیں مثلاً : ایک درخت پر اَٹکی ہوئی پتنگ کو اُتارتے ہوئے ایک دس سالہ بچہ شاخ ٹوٹنے کی وجہ سے زمین پر گر پڑا۔

بیس روز میں پتنگ بازی کی وجہ سے مرنے والے لوگوں کی تعداد نو اور پندرہ سے زیادہ افراد شدید زخمی ہوئے ہیں جن میں بڑی تعداد کم سن بچوں کی ہے، ہمیں ان کیفیات کا ادراک بھی نہیں جو ٹرپنگ سے جلنے والی برقی اشیاء کے مالکوں پر گزرتی ہیں بلکہ یہ حقیقت ہے کہ ہم پر گھر سے رزق کی تلاش میں نکلنے والے جوانوں کی گردنیں کٹی دیکھ کر بھی کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اس بے حسی کو لوگوں نے زندہ دلی کا اعزاز بنا کر سینے سے لگا رکھا ہے، نہ جانے وہ کون بدبخت تھا جس نے ہماری زندہ دلی کو موت کی ڈور کے ساتھ باندھ دیا۔

مرتب کِتاب کے بھائی ڈاکٹر عبدالصمد اپنے دوستوں کے ساتھ ہسپتال سے آرہے تھے، پتنگ کی ڈور چلانے والے کے گلے پر آرہی تھی، بھائی نے ہٹانے کے لیے ہاتھ آگے کیا جس سے انگلیوں کے بیچ میں پس کر اس طرح کٹی کہ انگلیوں کے درمیان لمبی شق پیدا ہوگئی

جس سے چار پانچ ٹانکے لگانے پڑے، علاج کے دوران ہسپتال میں ایک شخص کا گال لمبائی کٹا ہوا تھا، جو ڈور ہی کی دین تھا۔

اور بہت سے واقعات نامہ نگاروں تک نہیں پہنچ پاتے، جس کھیل میں انسان کی جان ضائع ہونے لگے، اسے کھیل کہنا عقل کے خلاف ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس قدر مہربان ہیں کہ جس چھت پر منڈیر نہ ہو اس چھت پر سونے سے منع فرمایا کہ مبادا اچانک اٹھ کر چلنے سے نیچے گر پڑے، اور جانی نقصان ہو جائے تو اس کھیل کی کیوں ممانعت نہ ہوگی، جس میں اب آئے دن جانی نقصان ہوتا رہتا ہے۔ پورے ملک میں بسنت کے موقع پر چھتوں سے گر کر گاڑیوں سے ٹکرا کر اور دیگر وجوہات سے زخمی ہونے والوں کی تعداد بے شمار ہوتی ہے۔

بعض نادانوں کا اعتراض

بعض افراد کہتے ہیں کہ: اس سے کہیں زیادہ ہلاکتیں، ڈکیتیوں، ٹریفک حادثات اور خود کشیوں میں ہوتی ہیں، اس پر کوئی نہیں بولتا''۔ (نوائے وقت)

اگر غور کیا جائے تو ڈکیتیوں، ٹریفک حادثات اور خود کشیوں کے نتیجے میں ہونے والی ہلاکتوں اور پتنگ کی ڈور سے شہ رگ کٹ کر مرنے والوں میں ایک اُصولی فرق ہے۔ ٹریفک حادثات ہوں یا ڈکیتیاں، ان میں ذمہ دار افراد کو اسی وقت یا بعد میں گرفتار کیا جاسکتا ہے اور ان پر مقدمہ دائر ہوسکتا ہے، مگر لاہور جیسے گنجان آباد شہر میں گذشتہ تین سالوں میں 42 / افراد پتنگ بازی کی وجہ سے لقمہ اجل بن چکے ہیں مگر آج تک کسی بھی قاتل ڈور کے پس پشت ہاتھ پر ہاتھ نہیں ڈالا جاسکا، اور نہ ہی اس کا مستقبل میں کوئی امکان ہے۔

پھر ٹریفک اور پتنگ بازی ایک جیسے اہم نہیں ہیں، شہر میں ٹریفک تو ناگزیر ہے، مگر پتنگ بازی کے بغیر گذارا ہوسکتا ہے۔

پھر یہ بھی ذہن میں رکھنا چاہئے کہ ٹریفک کے حادثات میں ہونے والی ہلاکتیں گنجان

آبادی کے شہر میں نہیں ہوا کرتیں، یہ ہائی ویز پر تیز رفتاری سے ہوتی ہیں۔ شہر میں تیز رفتار ٹریفک کی اجازت نہیں ہے کیونکہ اس سے ہلاکتوں کا خدشہ رہتا ہے، اسی طرح اگر شہری آبادی میں پتنگ بازی سے ہلاکتوں کا خدشہ ہو تو اس پر پابندی ضرور لگنی چاہئے، ٹریفک حادثات اور بسنتی حادثات کو ایک ہی میزان میں تولنا غیر منطقی اور غیر عقلی استدلال ہے!!

بلا شبہ اگر لوگ خوشیوں کے چند لمحے سمیٹنا چاہیں تو ان کے خلاف تلوار لے کر کھڑے نہیں ہونا چاہئے، مگر محترم یہ تو بتائیں کہ جب ایک طبقے کی خوشیاں منانے کا انداز دوسرے طبقہ کے لئے عذاب بن جائے تو پھر کیا کیا جائے، جب بسنت کے نام پر لہو ولعب اور شاہی قلعہ جیسے پروگرام ہونے لگ جائیں تو کیا پھر بھی چشم پوشی کی جائے؟ بسنت کے مخالف صرف علما ہی تو نہیں ہیں، اخبارات، سماجی تنظیمیں اور ہر مکتبہ فکر سے تعلق رکھنے والے لوگ ہیں۔ خوشیاں سمیٹنے کے اور بھی تو بہت طریقے ہیں، آخر ہندوانہ تہوار پر ہی اصرار کیوں کیا جائے!!

پتنگ سے موت کیسے ہو گی؟

پتنگ بازی سے انسانی جان کو کیسے نقصان پہنچتا ہے اس بارے میں مختلف آرا ہیں بعض لوگوں کا خیال ہے کہ کٹی ہوئی پتنگ کے ساتھ لگی ہوئی شیشہ کے مانجھے سے لگی ہوئی ڈور اس لیئے خطرناک ہو جاتی ہے کہ پتنگ میں ہوا بھرنے کے باعث اس کا وزن اور طاقت بڑھ جاتی ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ عام ڈور خطرناک نہیں ہوتی بلکہ مسئلہ دھاتی تار کا ہے جس کا چند گز کا ٹکڑا پتنگ کی تناوں کے ساتھ لگا کر اسے ڈور سے منسلک کر دیا جاتا ہے، اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ دھاتی تار سے کٹی ہوئی پتنگ کو اپنی پتنگ سے چمٹانا آسان ہو جاتا ہے۔

دھاتی تار والی پتنگ اگر ٹوٹ جائے اور کسی کے گلے پر لگ جائے تو زخمی کر دیتی ہے۔ یہ پتنگ اگر بجلی کی تاروں پر گر جائے تو شارٹ سرکٹ بننے سے بجلی بند ہو جاتی ہے، تاہم جسے عام ڈور سمجھا جاتا ہے وہ بھی عام نہیں رہی اور اس میں چند برسوں میں جو تبدیلیاں آئی ہیں وہ

نقصان کا باعث ہیں۔

پہلے جو ڈور بنتی تھی اس میں صرف کاٹن کا دھاگہ استعمال ہوتا تھا جو آسانی سے ٹوٹ جاتا تھا لیکن اب لوگوں نے کاٹن کے ساتھ نائلون (Nylon) اور پولی ایسٹر (Polyester) ملے ہوئے دھاگہ سے ڈور بنانا شروع کر دی جو آسانی سے نہیں ٹوٹتی اور اس سے گلا کٹ سکتا ہے، یہ نئی ڈور اس لیے ایجاد کی گئی تا کہ پتنگ بازوں کی پتنگیں پیچوں یا مقابلوں میں آسانی سے نہ کٹیں۔

قاتل پتنگ کی مظلوم جانیں

مفتی ابولبابہ منصور صاحب دامت برکاتہم لکھتے ہیں اپنے ملک پاکستان کے متعلق لکھتے ہیں کہ سنہ ۱۹۹۵ء سے سنہ ۲۰۰۶ء تک ۱۱ سالوں میں ۲۲۱ افراد ہلاک اور ۲۵۲۵ شدید زخمی ہوئے، میں دہراتا ہوں، ۲ سو ۲۱ ہلاک اور چھ ہزار ۵ سو ۶۵ شدید زخمی ہوئے۔

اب آپ ذرا ذیل میں دیئے گئے اعداد وشمار پر ایک نظر ڈالئے کہ صرف گیارہ سال کے مختصر عرصے میں کتنی قیمتی جانیں اسکی بھینٹ چڑھی ہیں اسکے اعداد وشمار کچھ اسطرح ہیں،

۱۹۹۵ء میں بسنت کے دن ۶ افراد ہلاک اور ۲۰۰ زخمی ہوئے۔

۱۹۹۶ء میں ۷ افراد ہلاک اور ۲۵۰ زخمی ہوئے۔

۱۹۹۷ء میں ۳۰ افراد ہلاک اور تقریباً ۸۰۹ زخمی ہوئے۔

۱۹۹۸ء میں ۱۱۶ افراد ہلاک اور تقریباً ۵۰۰ زخمی ہوئے۔

۱۹۹۹ء میں ۹ ہلاک اور ۶۷۵ زخمی ہوئے۔

۲۰۰۰ء میں ۱۸ ہلاک اور ۷۱۸ زخمی ہوئے۔

۲۰۰۱ء میں ۱۲ ہلاک اور ۳۶۶ زخمی ہوئے۔

۲۰۰۶ء میں ۱۹ ہلاک اور ۷۹۰ زخمی ہوئے۔

۲۰۰۳ء ۱۴ ہلاک اور ۴۵۰ زخمی ہوئے۔

۲۰۰۴ءمیں ۳۴ ہلاک اور ۶۵۷ زخمی ہوئے۔

۲۰۰۵ءمیں ۲۹ ہلاک اور ۹۱۵ زخمی ہوئے۔

۲۰۰۶ میں ۱۳ ہلاک ۱۹۵ زخمی ہوئے۔

۲۰۰۷ میں صرف ایک دن ۱۹ ہلاک اور ۴۰۰ شدید زخمی ہوئے جبکہ سال کے ختم ہونے تک نہ جانے کتنے معصوم بچوں کی گردنیں کٹیں ہوں گی؟ ان گیارہ سالوں میں مجموعی طور پر ۳۲۱ جاں بحق ہوئے اور ۲۵۲۵ شدید زخمی ہوئے ہیں، یہ ۳۲۱ تعداد صرف انکی ہے جو میڈیا کے ذریعے منظر عام پر آئی ہیں، ورنہ گمنام اموات نہ جانے کتنی ہوں گی جو اس خونی اور قاتل کھیل کی بھینٹ چڑھ گئے ہیں۔

ان ہلاک ہونے والوں میں کوئی فائرنگ سے، کوئی چھتوں سے گرنے سے، کوئی پتنگ لوٹتے ہوئے گاڑی سے حادثہ کا شکار ہوگیا، کوئی موٹر سائیکل پر سوار تھا کہ دھاتی تار اسکی گردن سے پار ہوگئی، کوئی بجلی کی تار سے کرنٹ لگنے سے، کوئی لڑائی جھگڑے سے، کوئی پتنگ لڑانے کے دوران، ان مرنے والوں میں مرد بھی شامل ہیں اور عورتیں بھی شامل ہیں، ان میں بڑے بھی ہیں اور جوان بھی، ان میں نوجوان بھی ہیں اور معصوم ننھے منے بچے بھی جن کی گردنیں دھاتی تاروں سے تن سے جدا ہوئیں اور ان کی دکھی مائیں پتنگ بازوں کو بددعائیں دیتی رہ گئی لیکن ان کی ہائی کون سنتا ہے؟ ہاں آخرت میں ان کو ضرور بدلہ ملے گا، قرآن پاک میں آتا ہے: ”من قتل نفسا بغير نفس او فساد فى الارض فكأنما قتل الناس جميعا، ومن احياها فكأنما احيا الناس جميعا“(۱) جس نے ایک شخص کو قتل کیا تو گویا ایسا ہے اس نے اس کی پوری نسل کو ختم کر دیا اور اسی طرح جس نے ایک شخص کی جان بچائی وہ ایسے ہے جیسے اس نے اسکی پوری نسل بچائی ہے،

اسوقت دنیا بھر کے مسلمانوں پر یہود ونصاری ودیگر کفریہ طاقتیں نظریاتی، تہذیبی،

(۱) سورۃ المائدہ آیت: ۳۲

وثقافتی اور معاشرتی لحاظ سے گھیرا تنگ کر رہی ہیں لیکن ہماری قوم جان لیوا کھیل میں مگن ہے، ان کے نوجوان جدید ٹیکنالوجی کے حصول میں مصروف ہیں، جبکہ ہماری جوان نسل کو "بوکاٹا" (۱) نعروں سے ہی فرصت نہیں، آج کے دور میں ہم بیرونی اور اندرونی گھمبیر مسائل کا شکار ہیں۔

پتنگ بازی اور اخلاقی بگاڑ

پتنگ بازی سے صرف دو ماہ میں ہونے والے جانی و مالی نقصانات کی رپورٹ بھی دل دہلا دینے والی ہے، اگر اس سے ہٹ کر پتنگ بازی کی وجہ سے ہونے والے معاشرتی بگاڑ، اخلاقی تنزلی، ثقافتی اور تہذیبی پامالی کا جائزہ لیا جائے تو یہ نقصان شائد نا قابل تلافی ہے۔

جس طرح نیو ائیر نائٹ وغیرہ منانے کے لئے غیر اخلاقی تقاریب کا اہتمام کیا جاتا ہے اسی طرح بسنت پر بھی ایسی ہی غیر اخلاقی اور غیر مہذب تقریبات کا انعقاد شہری آبادیوں میں کیا جاتا ہے۔

ان تقریبات میں سر عام شراب نوشی اور ہوائی فائرنگ کی جاتی ہے۔ساؤنڈ سسٹم، ایمپلی فائر، ڈیک اور اسپیکر لگا کر بلند ترین آوازوں میں لچر اور فحش قسم کا میوزک لگا کر نہ صرف شہریوں کو آواز سے پیدا ہونے والی تکلیف پہنچائی جاتی ہے، بلکہ یہ گھٹیا گانے زبردستی ان کے گھروں تک پہنچائے جاتے ہیں، جس سے عام شہریوں کو جسمانی کے ساتھ ایمانی اذیت بھی دی جاتی ہے۔

ایسے پروگراموں میں نہ صرف بڑے پیمانے پر آتش بازی کی جاتی ہے، بلکہ مخنثوں کے علاوہ دھندہ کرنے والی لڑکیوں کو بھی سر عام نچایا جاتا ہے اور ان کے ساتھ بر سر محفل نازیبا حرکات کی جاتی ہیں۔

---

(۱) triumphant cry on cutting off a kite

ایسے متعدد واقعات بھی رپورٹ ہو چکے ہیں کہ اس طرح کی حرکتوں کو روکنے کے لئے اگر اہل محلہ باہر نکلے اور ایسی پارٹیوں کا انعقاد کرنے والوں کے ساتھ جھگڑا مول لے لیا۔

ایسے متعدد تصادموں میں صرف دو ماہ کے اندر 370 افراد شدید زخمی ہو چکے ہیں جن میں سے کئی اسپتالوں کے اندر زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہیں۔(۱)

دھاتی ڈور کا استعمال

بسنت یا عام دنوں میں سب سے زیادہ اموات دھاتی تار کے استعمال کے باعث ہوتی ہیں یہ وہ تار ہوتی ہے جو کہ عام طور پر موٹر سائیکل کے کلچ ایکسیلیٹر (accelerator) اور فرنٹ بریک (Front brake) لگانے کے لیے استعمال ہوتی ہے اس تار کے ساتھ پتنگ بازی کا مقصد دوسرے کے ساتھ پیچ لڑانا نہیں ہوتا بلکہ اس سے صرف کٹی ہوئی پتنگوں کو پکڑنا یا دوسرے کی اڑائی ہوئی پتنگ کو اس میں الجھا کر کھینچ لینا ہوتا ہے جس کا روایتی پتنگ بازی سے دور کا بھی تعلق نہیں ۲۰۰۰ء تک اس کا کوئی وجود نہ تھا اس لئے اگر اعداد و شمار اٹھا کر دیکھیں تو ۲۰۰۰ء سے پہلے بسنت یا پتنگ بازی سے ہونے والی اموات بہت کم تھیں لیکن پھر کسی شیطانی ذہن کے لوگوں نے صرف پتنگیں لوٹنے کیلئے اسے استعمال کرنا شروع کر دیا اس کی ساخت کچھ اس طرح کی ہوتی ہے کلچ کی تار جو سولہ باریک تاروں سے مل کر بنی ہوتی ہے اسے کی ہر ایک باریک تار الگ کر کے آگے پیچھے جوڑی جاتی ہے اور تقریبا ایک ایک فٹ کے فاصلے پر تار کی گرہیں باندھی جاتی ہیں۔

کیمیکل ڈور کا استعمال

کیمیکل لگی نائیلون کی مضبوط ڈوری انسانی اموات کی دوسری بڑی وجہ ہے یہ انتہائی مضبوط ہوتی ہے جو کہ مچھلی پکڑنے کے لیے استعمال ہونے والی ڈوری ہوتی ہے جو کہ بیگ

---

(۱) روزنامہ پاکستان، ضیاالرحمن کشمیری، Mar 21, 2018۔

جوتے وغیرہ بنانے میں استعمال ہوتی ہے اس پر کیمیکل لگایا جاتا ہے جو کہ رگڑ کھانے پر انتہائی گرم ہوجاتا ہے اور یہ ڈور ساتھ لگنے والی ڈور کو کاٹ ڈالتی ہے اور جب یہ کٹ جائے، تو کئی کلومیٹر تک پتنگ کے ساتھ لٹکتی چلی جاتی ہے ایسے میں اگر کوئی بدقسمت موٹر سائیکل سوار اس کی زد میں آجائے تو پھر یہ خود تو نہیں کٹتی لیکن انسانی جسم کے جس حصے پر پڑتی ہے اسے کاٹتی چلی جاتی ہے۔

ایک خطرناک ڈور اب مارکیٹ میں کھلے عام دستیاب ہے، جس کی پالش ایلفی اور دیگر خطرناک کیمیکلز سے کی جاتی ہے، اس پالش سے ڈور کی دھار نہایت تیز ہوجاتی ہے اور مد مقابل کی پتنگ زیادہ دیر اس دھار کے سامنے ٹھہر نہیں پاتی، لیکن یہی ڈور جب کسی راہ چلتے انسان کی گردن سے ٹکراتی ہے تو کسی تیز دھار چاقو سے بھی شدید ثابت ہوتی ہے اور نشانہ بننے والے کی گردن سے خون کے فوارے پھوٹ پڑتے ہیں اور چند ہی لمحوں میں اس کی دنیا اندھیر ہوجاتی ہے۔

عام مانجھا لگی ڈور

اکثر بسنت کی حمایت میں بولنے والے یہ دلیل دیتے ہیں کہ اگر عام ڈور سے پتنگ اڑائی جائے تو وہ اتنا نقصان نہیں کرتی اس میں دو باتیں غور طلب ہیں ایک تو یہ کہ یہ اس دور کی بات ہے جب پاکستان یا انڈیا کا بنا ہوا ایک عام دھاگہ اس مقصد کیلئے استعمال کیا جاتا تھا اور دوسرا یہ کہ یہ پندرہ بیس سال پہلے کی بات ہے جب چائنیہ کا مال نہیں آتا تھا پھر اس زمانے میں موٹر سائیکل بھی اتنے نہیں تھے جس کی وجہ سے حادثے بہت کم ہوتے تھے اور اگر کہیں ہوتے بھی تو زیادہ ہائی لائٹ (high light) نہیں ہوتے تھے تاہم آج جب موٹر سائیکل کی تعداد کئی ہزار بلکہ لاکھ گنا بڑھ چکی ہے تو پھر حادثے کے امکانات بھی بڑھ چکے ہیں اور ایک غیر محفوظ بسنت پہلے سے بھی زیادہ خطرناک اور جان لیوا ہوسکتی ہے اس کا اندازہ مشکل نہیں کہ یہ عام مانجھا لگی ڈور بھی مضبوط اور کاٹ دار ڈور کی طرح اگر تیز چلتی موٹر سائیکل سوار کی

گردن کے گرد لپٹ جا تو گردن کا کیا حشر کرے گی جبکہ آج کے دور میں ماضی کی نسبت ہر دوسرے شخص کے پاس موٹر سائیکل ہے۔

مانجھا، ڈور اور پتنگیں تیار کر کے شہر بھر میں فروخت کی جارہی ہیں اور یہ کاروبار پولیس کی سرپرستی میں کیا جارہا ہے، پولیس افسران کا کہنا ہے کہ پتنگ اڑانے اور خرید و فروخت پر پابندی نہیں ہے، لہذا کارروائی کیسے کریں، جبکہ گلے کٹنے کے واقعات کے بعد ورثالاش یا زخمی فرد کو بغیر قانونی کارروائی کے اسپتال سے لے جاتے ہیں، ایسے میں یہ کس طرح معلوم ہو سکتا ہے کہ واقعہ کہاں رونما ہوا اور پتنگ یا مانجھا کس دکان کا تھا، اس کا قاتل کون ہے، اس کی موت کا ذمہ دار کون ہے؟۔

ہوائی فائرنگ

افغان وار نے جہاں اس خطہ کو بے شمار مسائل سے دو چار کیا وہیں ایک اصطلاح کلاشنکوف کلچر کی بھی دی۔ 80 سے پہلے بسنت پر ایک آدھ نعرہ یا بوکاٹا کی آواز بلند کر کے خوشی کا اظہار کیا جاتا تھا لیکن ۸۰ کی دھائی میں خوشی کا اظہار ہوائی فائرنگ کی شکل میں کیا جانے لگا۔گولی اوپر کی جانب ہوا میں چلائی جاتی ہے تو پھر ایک خاص بلندی پر جا کر واپس زمین کی کشش ثقل کی وجہ نیچے کی جانب آتی ہے اور اس کی ولاسٹی اتنی ہی خطرناک ہوتی ہے جوکہ فائر کرتے ہوئے ہوتی ہے۔

بے حجابی و بے پردگی

پتنگ بازی کے لئے چھتوں پر چڑھ جاتے ہیں، گھروں میں رہنے والی عورتیں کس حال میں ہوں گی ان پر نگاہیں ڈالی جاتیں ہیں، اب فون کا زمانہ ہے بعض منچلے ناقابل ذکر حالت دیکھیں تو اس کا ویڈیو لینے میں دریغ نہ کریں گے اور اسے یوٹیوب پر اپلوڈ کر کے دوسروں کی زندگی کو اجیرن بنادیں گے، پتنگ بازی کے موقع سے چھتوں پر چڑھنے

والوں کی وجہ سے عورتیں کافی پریشان رہتی ہیں، جس میں ایذائے مسلم، بے پردگی ،ویڈیوگرافی، عیب جوئی، عیب کی تشہیر وغیرہ جیسے کئی گناہ جمع ہیں۔

ڈیجے (DJ) کا استعمال

آج کل پتنگ بازی کے موقع پر ڈی جے، لاؤڈ اسپیکر پر نعرہ بازی، گانا بجانا، مردوں عورتوں کا مخلوط اجتماع بھی بکثرت ہونے لگا ہے، کھلے عام اذان ونماز کے موقع پر خود مسلمان ڈیجے لگاکر پتنگ پلانے میں لگا رہتا ہے، مذہبی تقریبات کے لئے پولیس کی اجازت ضروری ہوتی ہے، اور رات جلد ختم کر دینے کا حکم ہوتا ہے، جبکہ پتنگ بازی کی کوئی حد نہیں ہے، ان میں ہر کام بذات خود ناجائز ہے اور جو کھیل ان سب گناہوں پر مشتمل ہو اُس کے جائز ہونے کا کیا سوال ہے؟

پتنگ اڑانا اور لوٹنا شریعت کی نظر میں

بسنت غیر مہذب، بے دین، بد دین، لامذہب قوم کا شیوا ہے، ہمیں کب زیب دیتا ہے کہ مردود وملعون، بے ضمیر قوم کے طرز عمل کو اپنا مشغلہ بنائیں، ہمیں تو نعمتِ عظمیٰ ”ہدایت نامہ انسانیت“ عطا ہوا، تاکہ ہدایت کے روشن چراغ سے دوسری قوم وملل کے گھرانوں کو روشن کردیں، نہ کہ اپنے گھروں کی ایمانی شمع کو گل کر کے ظلمت کدۂ کفر بنالیں۔

پتنگ بازی بہت سے مفاسد اور گناہوں کا ذریعہ ہے، مثلاً فضول خرچی، دوسروں کو اذیت پہنچانا، جان ومال کا تلف اور ضائع کرنا، ضیاع وقت، آلۂ علم (کاغذ) کی بے حرمتی، شیطانی کام؟ ناگفتی باتوں کا استعمال، جماعت کا چھوٹنا اور بعض مرتبہ تو نماز بھی جاتی رہتی ہے وغیرہ۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اصلاح الرسوم میں پتنگ بازی کی جو خرابیاں اور مفسدے بیان فرمائے ہیں وہ قدرے تغیر کے ساتھ پیش خدمت ہے۔

پتنگ کے پیچھے دوڑنا

پتنگ کے پیچھے دوڑنے والے کا وہی حکم ہے جو کبوتر کے پیچھے دوڑنے والے کا ہے، جس کی مذمت کے لئے یہی کافی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اس کے پیچھے دوڑنے والے کو شیطان قرار دیا ہے۔(۱)

دوسروں کی پتنگ لوٹنا

ہر شخص اس خواہش میں رہتا ہے کہ پتنگ کٹنے بعد میں، میرے ہاتھ میں پہلے آجائے، حالانکہ نبی کریم ﷺ کا ارشادِ مبارک ہے، نہیں لوٹتا کوئی شخص اس طرح کہ لوگ اس کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھتے ہوں اور وہ پھر بھی مومن رہے۔(۲)

دوسروں کی ڈور لوٹنا

پتنگ کو لوٹ لینا جس کی ممانعت حدیث شریف میں صراحۃ وارد ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا : نہیں لوٹتا کوئی شخص ایسا لوٹنا جس کی طرف لوگ نگاہ اٹھا کر دیکھتے ہوں اور پھر بھی وہ مومن رہے (بخاری ومسلم) یعنی یہ خصلت ایمان کے خلاف ہے، اس حدیث کی تاویلی معنی خواہ کچھ ہوں ؛ لیکن ظاہراً تو اس شخص کو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے

---

(۱) رَأَى رَجُلًا يَتْبَعُ حَمَامَةً، فَقَالَ:''شَيْطَانٌ يَتْبَعُ شَيْطَانَةً''مسند احمد، مسند ابی هريرة : ۸۵۳۴، شعیب الارنوط نے فرمایا: کہ اس کی سند حسن ہے اور اس کے رجال ثقہ ہیں۔ سنن ابی داؤد باب فی اللعب بالحمام حدیث:۴۹۴۰،ابن ماجه باب اللعب بالحمام حديث :۳۷۶۵،علامہ بوصیریؒ کہتے ہیں کہ اس سند کے رجال ثقہ ہیں (مصباح الزجاجۃ ۴/ ۱۲۴ دارالعربیۃ بیروت)

(۲) بخاری باب النهبى بغير اذن صاحبها حديث:۲۴۷۵،مسلم باب بيان نقصان الايمان بالمعاصى حديث:۱۰۰

خارج از ایمان قرار دیا ہے، اگر کوئی یہ کہے کہ لوٹنے میں تو مالک کی اجازت ہوتی ہے، اس لئے اس کو لوٹنا جائز ہے تو یہ بالکل غلط ہے، مالک کی اجازت ہرگز نہیں ہوتی؛ چونکہ عام رواج بن گیا ہے، اس لئے مالک خاموش رہتا ہے؛ حالانکہ وہ اس سے خوش نہیں ہوتا، اگر اس کا بس چلے تو خود دوڑے اور کسی کو بھی پتنگ نہ لینے دے۔

دوسروں کو نقصان پہنچانا

ہر پتنگ اڑانے والے اس تگ ودو اور کوشش میں رہتا ہے کہ دوسرے کی پتنگ کاٹ دوں، جس سے اس کا نقصان اور تکلیف ہوتی ہے، شریعت کی رو سے یہ دونوں باتیں حرام ہیں۔ اس صورت میں دونوں گناہ گار ہوں گے۔(۱)

آپسی رنجش

جب کوئی کسی دوسرے کی پتنگ یا ڈور لوٹتا ہے تو آپس میں دشمنی یا بغض وعداوت پیدا ہوتی ہے اور شیطان یہی چاہتا ہے کہ آپس میں کڑواہٹ پیدا کردے، جس کی طرف قرآن مجید میں اشارہ موجود ہے۔(۲)

لڑائی جھگڑے و دیگر حادثات

اگر ہم ۷۰ کے عشرے کو مدنظر رکھیں تو معاشرے میں برداشت رواداری جیسی خوبیاں کسی ایک محلہ کو ایک خاندان سی شکل دے دیتی تھیں پتنگ بازی بچوں ٹین ایجر (teenager) یا کالج کی عمر تک کے لڑکوں کا شوق سمجھا جاتا، جیسے ہی کسی بڑے نے گھر میں قدم رکھا چھت پر اڑاتے ہولڑ کے بالے پتنگ کو ہاتھ سے کاٹ کر اور ڈور کو ادھر ادھر چھپا

---

(۱) الاحزاب: ۵۸

(۲) انمایرید الشیطان ان یوقع بینکم العداوة والبغضاء (المائدہ: ۹۱)

بھاگ نکلتے تھے کسی کی ڈور کٹ جانے پر یا یہ کہ دوسرے نے کھینچا کیوں مارا تھوڑی بہت تو تکرار تو ضرور ہو جاتی تھی لیکن کیا مجال کوئی بڑا بزرگ اس کام میں شامل ہو بلکہ محلہ کے بڑے بوڑھے نظر رکھا کرتے کہ کس کا بچہ گھر کی چھت پر پتنگ اڑا رہا ہے اور جیسے ہی اس گھر کا کوئی بڑا نظر آتا اسے بتایا دیا جاتا بس پھر کیا ہوتا کہ لڑکے کی شامت آجاتی۔لیکن پھر زمانے نے کروٹ بدلی اور ایک ایک پتنگ پر جس کی قیمت ایک سے پانچ روپے تک کی ہوتی تھی عزت وانا کا مسئلہ بن جاتی کسی نے ذرا اونچی آواز میں بوکاٹا کیا کہہ دیا گویا مرنے جینے کا مقام بن گیا گولی چلنے تک کی نوبت آگئی ایسے کئی واقعات موجود ہیں کہ ایسی لڑائیوں میں جانیں گئی اور دشمنیاں کئی کئی سال چلتی رہیں جہاں تک حادثات کا تعلق ہے تو بسنت کے دنوں میں ہسپتالوں کے ایمرجینسی (Emergency) وارڈ زمین خصوصی انتظامات کئے جاتے تھے زیادہ تر حادثات کٹی ہوئی پتنگ لوٹتے ہوئے کسی چلتی گاڑی بس یا موٹر سائیکل کے سامنے آجانے سے آتے تھے کچھ حادثات چھتوں یا دیواروں سے گرنے سے آتے تھے لیکن ان حادثات میں جانی نقصان بہت کم دیکھنے مین آتا تھا۔

بطور ایک انسان اور اس معاشرے کے رکن ہونے کے یہ سوال کرنے کا حق ہے کہ کیا یہ بسنت کسی انسانی جان سے بھی زیادہ اہمیت رکھتی ہے اور اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ ہوا میں اڑتی ہوئی یہ موت کی ڈور کسی بے قصور کے لئے موت کا پھندہ ثابت نہیں ہوگی؟۔(۱)

نماز اور یادِ الٰہی سے غفلت

جب آدمی پتنگ اڑاتا ہے تو نہ اس کو جماعت یاد رہتی ہے اور نہ نماز، ہر چیز سے بے پرواہ وہ تو ٹکٹکی باندھے آسمان پر پتنگوں کو دیکھتے رہتا ہے اور یہی وہ بات ہے جو حق تعالیٰ شانہ نے قرآن کریم میں شراب اور جوے کے حرام ہونے کی علت میں بیان کی ہے۔(۲)

---

(۱) http://urdu.arynews.tv/blogs/سردار ریاض الحق،جنوری 10, 2019

(۲) المائدہ:۹۱

وقت کا ضائع کرنا

پتنگ اڑانے میں بے حساب وقت برباد ہوتا ہے اور لاحاصل ہوتا ہے، حالانکہ قرآن کریم اور احادیث نبویہ میں متعدد جگہ وقت کی قدر وقیمت پر متنبہ فرمایا ہے اور اسکی حفاظت کرنے کی تلقین کی ہے۔

مشابہت غیر

پتنگ بازی ایک غیر اسلامی رسم ہے؛ جسے مسلمان کسی بھی صورت میں قبول نہیں کرسکتے، اگر مان بھی لیا جائے کہ یہ کوئی تفریح اور دل لگی کا سامان ہے تب بھی کفار کے ساتھ مشابہت کی بناء پر اس کی ناجائز ہونے میں کوئی شبہ نہیں رہ جاتا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جس نے کسی قوم کی مشابہت اختیار کی اُس کا حشر اُسی قوم کے ساتھ ہوگا۔ "مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ" (۱)

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے مواعظ میں کسی جگہ ایک واقعہ منقول ہے کہ ایک پیر صاحب غیر مسلموں کے تہوار "ہولی" کے دن پان کھاتے ہوئے اپنے مریدین کے ساتھ جارہے تھے، پورا راستہ ہولی کے رنگ سے رنگا ہوا تھا۔ رنگی ہوئی سڑک پر ایک گدھا کھڑا ہوا عجیب سا معلوم ہو رہا تھا، پیر صاحب نے از راہِ مذاق پان کی پیک یہ کہتے ہوئے گدھے پر تھوک دی کہ "تجھ کو کسی نے نہیں رنگا، میں ہی رنگ دیتا ہوں" القصہ پیر صاحب کی وفات کے بعد کسی مرید نے ان کو خواب میں دیکھا کہ عذاب میں مبتلا ہیں، پوچھنے

---

(۱) سنن ابی داؤد باب فی لبس الشهرة حدیث: ۴۰۳۱، المعجم الاوسط حدیث: ۸۳۲۷۔ علامہ ہیثمیؒ فرماتے ہیں کہ اس کو طبرانی نے اوسط میں روایت کیا ہے اس کی سند میں علی بن غراب ہیں بعض محدثین نے انہیں ضعیف کہا ہے اور اس کے بقیہ رجال ثقہ ہیں۔ (مجمع الزوائد ۱۰/۲۱۷ مکتبہ القدسی قاہرہ)

پر فرمایا کہ ہولی کے دن کے واقعہ کی پکڑ ہوگئی۔ خدا کی پناہ!

آج ہماری پستی، زبوں حالی اورکس مپرسی کی واحد وجہ اغیار کی مشابہت ہے، اس کوری نقالی پر علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ شکوہ سنج ہوتے ہوئے کہا تھا:

شور ہے، ہوگئے دنیا سے مسلماں نابود ہم یہ کہتے ہیں کہ تھے بھی کہیں مسلم موجود

وضع میں تم ہو نصاریٰ تو تمدن میں ہنود یہ مسلماں ہیں جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود

یوں تو سید بھی ہو، مرزا بھی ہو، افغان بھی ہو تم سبھی کچھ ہو، بتاؤ تو مسلمان بھی ہو!

پتنگ پلانا محض تفریح نہیں ہے

بعض افراد یوں استدلال کرتے ہیں کہ بسنت ہندوؤں کا مذہبی تہوار ہوگا، مگر ہم تو اسے محض موسمی اور ثقافتی تہوار سمجھ کر مناتے ہیں، یہ تو ان کا محض تجاہل عارفانہ ہے۔ ایک شخص دعوت ناؤ نوش میں شریک ہوتا ہے، وہاں حلال اور حرام مشروبات کثیر تعداد میں موجود ہیں، اس نے شراب کو آج تک دیکھا ہے، نہ چکھا ہے، وہ شراب کی بوتل کھول کر کچھ نوشِ جاں کرلیتا ہے، اتنے میں مجلس میں موجود اسے ایک شخص بتاتا ہے کہ قبلہ آپ شراب سے لطف اندوز ہو رہے ہیں؟ اس اطلاع کے بعد بھی اگر وہ یہ عذر پیش کریں کہ میں تو اس کو محض ایک شربت سمجھ کر پی رہا ہوں تو کیا اس کا یہ عذر معقول سمجھا جائے گا؟ برادرانِ وطن کی طرح مندر میں جا کر تفریحاً گھنٹہ بجانے لگے اور منع کرنے پر کہنے لگے کہ : میں تو بس تفریحاً گھنٹہ بجارہا تھا میرا مقصد پوجا کرنا نہیں تھا'' تو کیا یہ عذر معقول سمجھا جائے گا؟ بعض افراد کہتے ہیں کہ ہندو بھائی ۱۴ جنوری کو پتنگ پلاتے ہیں، ہم اس سے پہلے ۱۲ر جنوری میں کرلیتے ہیں تو مشابہت نہیں ہوگی''، تو مطلب یہ ہوا کہ ہندو بھائی اگر ۶ر بجے پوجا کرتے ہیں اور گھنٹہ بجاتے ہیں اور آپ ۴ بجے گھنٹہ بجالیں کہ میں ان کے وقت میں نہیں بجارہا ہوں تو کیا یہ عذر معقول سمجھا جائے گا؟ مزید برآں بسنت کے تاریخی پس منظر سے لاعلمی کا اظہار بھی کوئی معقول وجہ نہیں ہے۔ ایک جاہل آدمی تو شاید معذور ہو؛ مگر وہ لوگ جو یونیورسٹیوں سے

فارغ التحصیل ہیں اور غرورِ علم میں مبتلا ہیں، وہ لاعلمی کا عذر پیش کر کے اس ذمہ داری سے پہلو کیسے بچا سکتے ہیں؟ قانون سے لاعلمی کو سزا سے برأت کا جواز تسلیم نہیں کیا جاتا تو ان عالم فاضل اَفراد کی طرف سے بسنت کے بارے میں اس تجاہل عارفانہ کو کیسے قبول کیا جاسکتا ہے۔

تاریخ اسلام کا امتیاز

تاریخی طور پر یہ بات درست نہیں ہے کہ اسلام نے اپنی پندرہ سو سالہ تاریخ میں مختلف مقامات پر مختلف مقامی تہواروں کو مشرف بہ اسلام کیا، انہیں اخلاق کا جامہ پہنانے کی بات تو دور کی ہے۔ مسلمانوں نے آٹھ سو برس تک اسپین پر حکومت کی، انہوں نے کبھی عیسائیوں کے تہوار کرسمس کو مشرف بہ اسلام کرنے کی کوشش نہ کی۔ انہوں نے فارس پر قبضہ کیا جو آج تک چلا آتا ہے، مگر کبھی انہوں نے پارسیوں کے کسی تہوار کو اخلاقی جامہ پہنا کر نہیں منایا۔ مسلمان بادشاہوں نے نوروز جیسے سالِ نو کے معروف تہوار کو بھی کبھی نہیں منایا۔ ہندوستان میں بھی مسلمانوں نے ہندوؤں کے کسی تہوار کو اپنانے کی کوشش نہ کی۔ دو قومیتوں کی متصادم فطرت کے عنوان سے انگریز مؤرخ مرے ٹائٹیس (Mare Titus) کہتا ہے:

''بارہ طویل صدیوں تک اسلام ہندوستان میں ہندومت کے ساتھ ساتھ رہا، بارہ صدیوں تک دونوں قومیں ایک جانب قومی اولوالعزمیاں اور دوسری جانب قومی تحفظ کے فطری جذبے کی آویزش، اکثر و بیشتر چپقلشوں اور تنازعوں کا باعث بنی رہی اور آج تک جاری ہے''۔ (انڈین اسلام: ۱۷۶، طبع ۱۹۳۰ء)

جرمن فلاسفر اوسوالڈ اسپینگلر (Oswald spengler) کے بقول : ''ایک مذہبی ثقافتی قوت کے لحاظ سے اسلام بیشتر حیثیتوں میں ہندومت کی عین ضد ہے''۔ (زوالِ مغرب)

پروفیسر عزیز احمد جو اسلامی کلچر پر اتھارٹی مانے جاتے ہیں، اپنی معرکہ آرا تصنیف برصغیر میں اسلامی کلچر میں لکھتے ہیں:

’’ثانوی ہندوستانی ماحول اور نسلی اثرات سے گھرے رہنے کے باوجود ہندوستان میں اسلام نے ان تمام صدیوں میں اپنا غیر ملکی انداز برقرار رکھا۔ بقول جادوناتھ سرکار: ہندوستانی مسلمان بحیثیتِ کل بدیسی ذہن رہا۔ وہ محسوس کرتا تھا کہ وہ تھا تو ہندوستان میں؛ لیکن اس کا جز نہیں تھا‘‘۔(برصغیر میں اسلامی کلچر:۱۱۰)

اجتماعی سطح پر ہم غور کریں کہ اگر خوشی کے لمحات بھی ہمارے اپنے نہیں؛ بلکہ غیروں کے عطا کردہ ہیں۔عیدیں ہمیں وہ مسرت نہیں دیتیں جو بسنت اور ویلنٹائن ڈے جیسے بیہودہ دنوں میں نوجوانوں میں نظر آتی ہے،عیدوں میں گرم جوش شرکت کو بیک ورڈ اور رجعت پسندی سمجھا جاتا ہے اور غیروں کے تہواروں میں پر جوش شرکت کو جدت پسندی اور ماڈرن ہونے کی ضمانت اور علامت بتایا جاتا ہے تو پھر ہمیں سمجھ لینا چاہئے کہ ہمارے جسدِ قومی کو خطرناک سرطان لاحق ہے،جس سے پیچھا چھڑانے کی ہمیں جلد از جلد تدبیر کرنی ہوگی!!

ان بہت سارے مفاسد اور نقصانات کے ہوتے ہوئے خالص غیروں کی تہذیب اپناتے ہوئے ہمیں ذرا بھی خیال نہیں آتا کہ ہم خیر البشر ﷺ کی امت خیر الامم ہیں؟ قرآن کریم نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہمارا شیوہ بتایا ہے،ہمیں حالات وزمانے کی گمراہیاں ختم کرنا ہے اور عظیم الشان کارنامے انجام دینے ہیں، جو خوشنودی الٰہی کا سبب بنیں۔

انسانی تاریخ اس پر گواہ ہے کہ عظیم کارنامے ہمیشہ انہی لوگوں نے انجام دیے ہیں جو حالات کی رو پر بہنے کے بجائے ان کے مقابلے کے لیے اٹھے ہیں، زندگی پر ان مٹ نقوش انہوں نے نہیں چھوڑے، جو مرغ بادنما کی طرح ہوا کے رخ پر مڑتے اور دوسروں کی نقالی کرتے رہے، بلکہ ان لوگوں نے چھوڑے جو ہوا کے رخ سے لڑتے ہیں اور زندگی کے دھارے کو موڑ کر رکھ دیا، قابل تقلید وہ نہیں جو گرگٹ کی طرح صبح وشام بدلتا ہے، بلکہ وہ ہے جو خود کوئی اپنا رنگ رکھتا اور دنیا کو اپنے رنگ میں رنگتا ہے،مسلمان دنیا میں زمانہ کی پیروی

کے لیے پیدا نہیں کیے گئے، بلکہ وہ پوری انسانیت کی فلاح واصلاح کا ذریعہ بنائے گئے ہیں، ایک مسلمان کے لیے اس سے بڑی ذلت اور کوئی نہیں ہوسکتی کہ وہ خدا کا نائب، سنت نبوی کا مدعی اور دینی روایات کا امین ہونے کے باوجود جدیدیت کو اپنے دین کے مطابق بدلنے کے بجائے اپنے ہی دین کو مسخ کرنا شروع کردے، یہ بزدل اور کم نظر لوگوں کا طریقہ ہے، جنہیں ہوائیں خس وخاشاک کی طرح اڑائے پھرتی ہیں اور جن کی اپنی بنیاد نہیں کہ وہ اس پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہ سکیں۔ مسلمان کا یہ شیوہ نہیں ہے کہ ؏ ''زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز!'' بلکہ اصل مسلمانی تو یہ ہے کہ

؏ ''زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ ستیز!''(۱)

روزی پر بند نہ لگائیں

پتنگ بازی پر پابندی اُٹھانے کے حق میں سب سے بڑی دلیل یہ دی جاتی ہے کہ پتنگ سازی ایک صنعت کا درجہ اختیار کر چکی ہے اور اس سے سینکڑوں خاندانوں کے روزگار وابستہ ہیں، اس میں کوئی شک نہیں کہ پتنگ اور ڈور کے کاروبار میں ہزاروں لوگوں کے لئے روزگار کے مواقع ہیں، مگر دیکھنا یہ ہے کہ شہروں میں کیا ایسے کاروبار کو جاری رکھنے کی اجازت دی جاسکتی ہے جس کے نقصانات بھی بہت ہیں۔

جب بھی کوئی ریاست کسی نفع بخش کاروبار یا پیشے کو معاشرے کے اجتماعی مفادات سے متصادم محسوس کرتی ہے، تو اس پر قانونی پابندیاں عائد کر دیتی ہے، اس وقت یہ نہیں دیکھا جاتا کہ اس پابندی سے کتنے خاندانوں کا روزگار متاثر ہوگا۔ صوبہ سرحد کے سنگلاخ پہاڑوں کے درمیان رہنے والے ہزاروں خاندان ایسے ہیں جو پوست (Poppy) کی کاشت سے ہزاروں روپے کی ماہانہ آمدنی حاصل کر رہے تھے اور ان کا بظاہر کوئی متبادل ذریعہ معاش

---

(۱) جامعہ فاروقیہ کراچی۔

بھی نہیں تھا؛ مگر چونکہ اس سے ہیروئن پیدا ہوتی ہے، اس لئے اسے معاشرے کے لئے خطرناک سمجھ کراس پر پابندی عائد کر دی گئی۔

آخراس استدلال کا اطلاق نام نہاد پتنگ سازی کی صنعت پر کیوں نہیں کیا جاتا۔مزید برآں پتنگ اور ڈور کا کاروبار چند ہفتوں پر محیط ہوتا ہے، بہت کم لوگ ہیں جو سارا سال اسی کاروبار سے وابستہ رہتے ہوں۔

اس تہوار میں تعمیری کام کیا ہے

بسنت کے موقع پر اربوں روپے کا کاروبار ہوتا ہے۔نجانے کس طرح اَعداد وشمار جمع کئے جاتے ہیں، مگر کہا جاتا ہے کہ ہر سال تقریباً دو ارب روپے کا کاروبار ہوتا ہے۔ اس کاروبار کی نوعیت کیا ہے؟ ہر سال کروڑوں روپے پتنگ اور ڈور پر خرچ کر دیئے جاتے ہیں، کروڑوں روپے کھاپی کر اُڑانے میں ضائع کر دیئے جاتے ہیں، شراب وسیع پیمانے پر فروخت ہوتی ہے، ہوٹلوں کا کاروبار خوب چمکتا ہے، لاکھوں روپے لاہور کی شاہراہوں کو سجانے پر خرچ ہو جاتے ہیں، عمارتوں کی آرائش کے لئے لاکھوں کا خرچہ ہوتا ہے، موسیقی، راگ رنگ، اور مغنیات پر کروڑوں کا خرچ اُٹھتا ہے، بسنتی لباس تیار کرانے میں عورتیں بے دریغ خرچ کرتی ہیں، یہ لباس شاید ایک دن ہی پہنا جاتا ہے، گھر گھر ضیافتیں اُڑائی جاتی ہیں۔کیا ان میں سے کوئی ایک خرچ بھی ایسا ہے جسے تعمیری کہا جاسکے، یہ سب اسراف وتبذیر، فضول خرچی اور عیاشی کے زمرے میں آتے ہیں، عیاش اور متمول طبقہ بسنت کے موقع پر گوشت اور دیگر اشیاء ضرورت کا اس قدر زیادہ استعمال کرتا ہے کہ اس سے مارکیٹ کئی ہفتے متاثر رہتی ہے۔طبقہ امرا کی انہی بے جا عیاشیوں کی وجہ سے گوشت جیسی اہم چیز غریب آدمی کی قوتِ خرید میں نہیں رہی۔(پتنگ بازی پر پابندی کیوں؟ از میاں عامر محمود، روزنامہ پاکستان: یکم جولائی 2003ء)

بجلی کی بار بار ٹرپنگ سے گھریلو اشیاء اور صنعتوں کی پیداوار کو پہنچنے والے نقصان کا تو

اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔ دو ارب کے کاروبار کی بات کرنے والوں کو ان نقصانات کو سامنے رکھ کر معاشی میزانیہ مرتب کرنا چاہیے۔

بربادی کا نام زندہ دلی

مسلمان آبادیوں کے اوپر تنا آسمان جو کبھی ایمان کی روشنی سے منور اور ذکر و عبادت کے انوار سے سجا ہوتا تھا، اخلاقیات سے گرے ہوئے نعروں اور رنگ برنگے گڈے گڈیوں سے بھرا ہوا ہے، نوجوان لڑکے لڑکیوں کا آزادانہ اختلاط ہے، رنگین روشنیوں کا سیلاب اور شور وغوغا کا طوفان ہے، غضب یہ ھیکہ ان اخلاق سوز حرکات کو زندہ دلی کا نام دیدیا گیا ہے۔ کاش ! کوئی صاحبِ حال مغرب کی یلغار کا شکار ہماری قوم کو بتائے کہ زندہ دلی کس چیز کا نام ہے؟ ہم لوگ نہ تو زندگی کا مطلب سمجھتے ہیں اور نہ قلب اور لطیفۂ قلب کی حقیقت، دل چونکہ اعضاء باطنہ میں سے ہے اسلئے اسکی زندگی اور مروتی کے بارے میں کوئی صاحب باطن ہی کچھ کہہ سکتا ہے ہنسی تفریح میں حد سے گزرنے کے شائقین تو خود نفس پرستی کی سیاہی سے آلودہ ہوتے ہیں ان کو کیا خبر کہ ”دل کی دنیا“ کے احوال و کیفیات اور ارادات و مقامات کیا ہوتے ہیں، صاحب دلوں کے بادشاہ جناب رحمۃ اللعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت ہے، جو شخص عید الفطر اور عید الاضحی کی رات کو زندہ کرے گا اس دن اس کا دل مردہ نہ ہوگا جس دن وہ مردہ ہو جائیں گے“ (۱)

دل کی زندگی یہ ہے کہ اسے خیر کی توفیق ملتی رہے اور اس میں شر سے اجتناب کا حوصلہ اور ہمت رہے اور اس کی موت یہ ہے کہ ہمیشہ کی زندگی میں کام آنے والے اعمال میں دل نہ لگتا ہو اور جو کام قبر کی اندھیری کھائی اور میدانِ حشر کے وحشت ناک صحراء میں حسرت وندامت کا باعث بنیں گے ان میں بے تحاشا مشغول رہنے کے باوجود جی نہ بھرے، موج

---

(۱) ابن ماجه حديث: ۱۷۸۶ علامہ نوویؒ نے ”الاذکار“ میں فرمایا کہ یہ حدیث ضعیف ہے اور حافظ عراقیؒ نے ”تخریج احادیث احیاء علوم الدین“ میں فرمایا کہ اس کی سند ضعیف ہے، اور ابن حجرؒ نے فرمایا کہ یہ حدیث غریب اور مضطرب الاسناد ہے۔ (الفتوحات الربانيه: ۴،۲۳۵)

میلے کے شوقین دھوم دھڑاکوں میں مست رہنے والے اور فحاشیوں سے تسکین پانے والے تو نفس کے غلام ہوتے ہیں، وہ کیا جانیں دل پر کن چیزوں سے مردنی چھاتی ہے اور کون سی چیز اسے حیاتِ جاوداں بخشتی ہے، بوریت سے پیچھا چھڑانے کے لئے بلاگلا کے موقع تلاش کرنے والوں کو سوچنا چاہئے کہ اگر وہ تفریح کے لئے ان چیزوں کا انتخاب کریں گے جو گناہوں سے آلودہ ہوتو پھر کسی مشکل گھڑی میں ان کا رفیق وغم گسار کون ہوگا؟ اور وہ اس وحشت ناک بوریت سے کیونکر پیچھا چھڑا سکیں گے جو قبر کی تنہائیوں میں ان پر مسلط ہوگی؟

پتنگ بازی کی تباہ کاریوں سے بچنے کی تجاویز

پتنگ بازی کی تباہ کاریوں کو روکنے کے لئے اگر مندرجہ ذیل چند تجاویز پر عمل کرلیا جائے تو کافی حد تک نقصانات پر قابو پایا جاسکتا ہے۔

سب سے بنیادی تجویز یہ ہے کہ پتنگ بازوں پر سارا زور صرف کرنے کی بجائے پتنگ اور قاتل ڈور بنانے اور فروخت کرنے والوں کے خلاف کریک ڈاؤن کیا جائے۔

ظاہر ہے جب یہ سامان کہیں سے دستیاب ہی نہیں ہوگا تو پتنگ بازی پر بھی قابو پالیا جائے گا۔اس ضمن میں پولیس کی کارروائیاں نہ ہونے کے برابر ہیں۔

ایسے بہت سے واقعات بھی رپورٹ ہو چکے ہیں کہ پولیس بھاری رشوت لے کر خطرناک ڈور اور آتش بازی کا سامان بنانے اور فروخت کرنے والوں کی ڈھال بن جاتی ہے۔اس طرز عمل کا سد باب ہونا چاہئے، جو مٹھی گرم کر دیتا ہے، اسے فوراً چھوڑ دیا جاتا ہے او رجس کے پاس رشوت دینے کی رقم نہیں ہوتی، اسے لاک اپ (Lock up) میں بند کر کے مقدمہ درج کرلیا جاتا ہے، پولیس کا یہ طرز عمل بھی قابل گرفت ہے۔

ایک تجویز یہ ہے کہ پتنگ کے ساتھ چند گز کا دھاتی ٹکڑا لگانے، نائلون اور پولیسٹر سے ڈور کا دھاگہ بنانے اور ایلفی (Elfi) و دیگر کیمیکلز (Chemical) سے ڈور کو پالش کرنے والوں پر اقدام قتل کی دفعات کے تحت مقدمات درج کئے جائیں اور اسے ناقابل ضمانت

جرم قرار دیا جائے۔

یہ تجویز بھی حادثات کی روک تھام میں مؤثر ہو سکتی ہے کہ ایک خاص حد سے زیادہ بڑے سائز کی پتنگ بنانے، بیچنے اور اڑانے پر بھی پابندی عائد کی جائے، کیونکہ بڑے سائز کی پتنگ زیادہ ہوا کے دباؤ اور طاقت کا شکار ہوتی ہے اور کٹ جانے کی صورت میں اس کی عام ڈور بھی انسانی جان کو شدید نقصان پہنچانے کا باعث بن جاتی ہے۔

ایک تجویز یہ بھی ہے کہ حکومت پتنگ بازی کے لئے شہری آبادیوں سے دور جگہیں مختص کرے، جس سے نہ صرف پتنگ کٹنے کی صورت میں کسی انسانی جان کے ضیاع اور بجلی کی تعطلی جیسے واقعات کا امکان ختم ہو جائے گا، بلکہ گلی محلوں کے اندر بسنت کے نام پر ہونے والے بے ہودہ اور لچر فنکشنوں، آتش بازی، ہنگامہ خیزی، تیز میوزک اور اس ضمن میں ہونے والے لڑائی جھگڑوں سے بھی شہریوں کی جان چھوٹ جائے گی۔

یہ طے ہے کہ والدین کی اجازت اور رقم کی ادائیگی کے بغیر 80 فیصد بچے پتنگ بازی اور غیر اخلاقی حرکات نہیں کر سکتے۔ تو پھر والدین کو بھی اپنے طرز عمل پر نظر ثانی کرنا ہوگی اور اپنی اولاد کو اس خونی کھیل سے دور رکھنا ہوگا، ورنہ آپ کے بچے کی موج مستی سے آج اگر کسی اور کا گھر ویران ہوگا تو کل یہ بربادی خود آپ کے گھر کی دہلیز بھی ضرور پار کرے گی۔۔۔ پس کوئی ہے جو ان باتوں پر غور کرے؟(۱)

اب ہم کیا کریں؟

سب سے اہم اور بنیادی بات یہ ہے کہ عوام کا یہ اجتماعی رویہ بن چکا ہے کہ اپنی انفرادی ذمہ داریوں سے مجرمانہ غفلت برتتے ہیں اور جب کوئی نقصان ہو جاتا ہے تو اس کا سارا ملبہ حکومت پر ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں، یہی رویہ پتنگ بازی کے ضمن میں بھی ہمارے

(۱) روزنامہ پاکستان، ضیاالرحمن کشمیری، Mar 21, 2018

سامنے ہے۔

ہمیں اپنے طور پر یہ کرنا چاہیے کہ پتنگ بازی کو بسنت جیسے موسمی تہوار سے نکالنے کی جدوجہد کریں۔ایسے ٹی وی ڈراموں اور پروگراموں پر احتجاج کریں جن میں پتنگ بازی کی حوصلہ افزائی کی جارہی ہو،ان سرکاری محکموں کے ذمہ داروں کو عوام کی مشکلات کا احساس دلائیں جو اس قسم کی سرگرمیوں کی سرپرستی کرتے ہیں،ایسی پرائیویٹ کمپنیوں کو خطوط لکھیں جو بسنت کے نام پر پتنگ بازی کو سپانسر (Sponsor) کررہی ہیں،محلہ اور علاقے کی سطح پر پتنگ بازی کو روکنے کے لئے مقامی آبادی میں سے ہی کوئی کمیٹی بنا کر لوگوں کا تعاون حاصل کیا جائے۔

حکومت کے کرنے کے کام یہ ہیں کہ ہر علاقے کے معروف پتنگ بازوں کی فہرست تیار کرائی جائے اس علاقے میں برقی تنصیبات کو نقصان پہنچے یا کسی کی گردن کٹے تو پرچہ ان پتنگ بازوں کے خلاف درج کیا جائے۔گڈیاں اور ڈور تیار کرنے والے اڈوں پر چھاپے مارے جائیں اور وہاں مزدوری کرنے والوں کو کسی اور ہنر کی تربیت دی جائے،جو بچے والدین کی حکم عدولی کرتے ہوئے پتنگ بازی کریں ان کو سزا دینے کا انتظام حکومت کرے،ایسے ٹی وی پروگرام کو بند کیا جائے جو پتنگ بازی کو فروغ دینے کا سبب بنتے ہیں۔ حکومت ایسے میلوں کی سرپرستی بند کرے جہاں پتنگ اڑائی جائے،ہم افلاس کے مارے پسماندگی کا شکار، علاج سے محروم، تعلیم سے دور مسائل کے مارے، ہمارا لائف سٹائل (Lifestyle) ایسی سرگرمیوں کو کیوں جذب کرلیتا ہے جو ہماری ترقی کی دشمن ہیں۔ اس پر سوچ وبچار کی ضرورت ہے۔(۱)

پتنگ کی تجارت

(۱) ڈیلی ۹۲ روزنامہ،منگل 12 فروری 2019ء

فتاوی محمودیہ میں ہے کہ" یہ تجارت "اعانت علی المعصیت"یعنی گناہ پر مدد کی وجہ سے ناجائز ہے۔(۱) پتنگ اور اس کا مانجھا آلۂ لہو ولعب میں سے ہے، جس میں ضرر تو ہے لیکن فائدہ کچھ بھی نہیں؛ اس لیے اس کی خرید و فروخت مکروہ ہے:و نظیرہ کراھة بیع المعازف لأن المعصیة تقوم بها عینها (كذا فی الشامی :ط زکریا، 420/6)واللہ تعالیٰ اعلم(۲)

جامعہ اسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی کا فتوی ہے کہ: "پتنگ بازی میں پیسوں اور وقت کا ضیاع ہے اور مختلف مواقع پر کئی انسانی جانوں کے ضیاع کی نوبت بھی آچکی ہے، نیز بسنت ہندوانہ رسم ہے، لہذا پتنگ بازی یا بسنت منانا جائز نہیں ہے اور پتنگ پکڑنا بھی جائز نہیں ہے۔(فتوی نمبر :143101200658) حاصل یہ کہ سابقہ وجوہات کی بناء پر فقہاء کرام رحمہم اللہ پتنگ اُڑانا، پتنگ لُوٹنا، ڈور لُوٹنا، پتنگ بیچنا، خریدنا سب کو ناجائز کہا ہے، اس پیشہ سے تعلق رکھنے والے حضرات کو کوئی دوسرا جائز پیشہ اختیار کرنا ضروری ہے۔

مذہبی تہوار میں شرکت کا حکم

غیر مسلموں (مثلا ہندوؤں اور عیسائیوں وغیرہ) کے مذہبی تہوار یا ان کے مذہبی شعار کی تقریبات میں شرکت تشبہ بالکفار کی وجہ سے سراسر ناجائز ہے۔احادیث صحیحہ میں کفار و مشرکین اور یہود و نصاریٰ سے تشبہ اور ان کے شعائر کو اپنانے سے سختی کے ساتھ منع کیا گیا۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک حدیث میں فرمایا کہ :"من تشبه بقوم فهو منهم" (جس نے کسی قوم سے مشابہت اختیار کی وہ انھیں میں سے ہوگا) نیز جس طرح شرکیہ امور یا ناجائز امور کا ارتکاب خود ناجائز ہے، اسی طرح اپنے کسی عمل سے ان امور کی تائید وتقویت اور ان امور کے مرتکبین کی رونق بڑھانا بھی ناجائز ہے۔لہذا ایسٹر، ہولی، دیوالی اور کرسمس وغیرہ

---

(۱) فتاوی محمودیہ ۱۶ / ۱۳۴

(۲) دارالافتاء، دارالعلوم دیوبند فتوی: ۱۱۰۴۰

مذہبی تہواروں میں شرکت سے ہر مسلمان پر اجتناب لازم ہے، واضح رہے کہ غیر مسلموں کے مذہبی تہوار میں شرکت اگر ان تہواروں کی عظمت یا محبت کی وجہ سے ہو تو اس کی بعض صورتوں کو فقہاء کرام نے کفر لکھا ہے۔

"من کثر سواد قوم فھو منھم ومن رضی علی قوم کان شریک من عمله(۱) قال العلامة المناوی فی شرحه :ای من کثر سواد قوم بان ساکنھم وعاشرھم وناصرھم فھو منھم وان لم یکن من قبیلتھم او بلدھم۔(۲)

فتاوی محمودیہ میں مذکور ہے کہ"یہ سب باتیں ناجائز اور گناہ ہیں، اگر ہندوؤں کے تہوار کی تعظیم کے لیے چندہ دیتا ہے اور شرکت کرتا ہے تو یہ کفر ہے، مسلمان کو ایسے امور سے توبہ ضروری ہے۔(۳)

ہندوانہ تہوار میں مسلمان کی دکان

ہندوؤں کا میلہ اگر مذہبی ہو تو اس میں شرکت کرنا یا دکان لگانا درست نہیں ہے؛ اس لیے کہ معصیت اور منکرات پر مشتمل مجالس میں شرکت کرنا شرعاً ممنوع ہے اور ایسی جگہوں پر کسی بھی وقت اللہ تعالیٰ کا عذاب آسکتا ہے، اور عذاب آنے کی صورت میں سب اس کی لپیٹ میں آجاتے ہیں، اسی طرح حدیث میں یہ بھی آتا ہے کہ جو شخص کسی جماعت یا قوم میں شامل ہو کر ان کا مجمع بڑھائے تو اس کا شمار اسی قوم میں سے ہوگا، لہٰذا ہندوؤں کے مذہبی میلے میں اگر کوئی شخص صرف دکان بھی لگائے تو اس سے بھی ان کی تعداد اور مجمع بڑھے گا، اور دوکان لگانے والا حدیثِ مذکور کی وعید میں داخل ہوگا؛ اس لیے ہندوؤں کے مذہبی میلے میں دوکان لگانے سے پرہیز کرنا چاہیے۔ البتہ اگر ہندوؤں کا میلہ مذہبی نہ ہو، بلکہ تجارتی ہو تو اس

---

(۱) جامع الحدیث:۳۴۵/۲۱

(۲) فیض القدیر:۱۵۶/۶

(۳) فتاوی محمودیہ:۳۵۳/۲۹

یں جانے، دوکان لگانے اور خرید وفروخت کرنے میں مضائقہ نہیں، بشرطیکہ ناچ گانے اور دیگر معاصی (گناہوں) وغیرہ سے دور رہے۔قرآن کریم میں ہے:﴿فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰى مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِينَ﴾[سورۃ الأنعام :٦٨]

امداد الاحکام: ۴/ ۳۸۵ میں ہے:

''ہندوؤں کا میلہ اگر مذہبی ہو تو اس میں شرکت جائز نہیں اور نہ مسلمانوں کو ان کے ایسے میلے میں اپنی دوکان لے جانی چاہیے، باقی سودا خریدنے میں دونوں قول ہیں۔بعض فقہاء نے اس کو بھی منع کیا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ اگر معمول کے مطابق ضروریات خریدی جائیں اور اس میلہ کی وجہ سے خاص کوئی چیز نہ خریدی جائے تو جائز ہے، مگر احتیاط اسی میں ہے کہ ان کے مذہبی میلہ میں سے کچھ بھی نہ خریدے؛ کیوں کہ خریداروں سے بھی میلہ کی رونق بڑھتی ہے اور کفّار کے مذہبی میلہ کی رونق کو بڑھانا مناسب نہیں۔ ہاں اگر تجارتی میلہ ہو جیسے بعض جگہ جانوروں کی تجارت کے لیے میلہ لگتا ہے، اس میں جانے اور خرید وفروخت کرنے میں مضائقہ نہیں بشرطیکہ ناچ رنگ وغیرہ سے دور رہے''۔واللہ اعلم۔

امداد الفتاویٰ: ۴/ ۲۶۹ میں ہے: ''اگر کوئی چیز سوائے اس میلہ کے کہیں نہ بکتی ہو، اس کی خرید وفروخت کے واسطے جانا بضرورت جائز ہے، اور بلا ضرورت جانا بہتر نہیں کہ ایسے مجمعوں میں شان مغضوبیت کی ہوتی ہے، ان میں شریک ہونا غضبِ الٰہی کا حصہ لینا ہے، اگرچہ اس مجمع والوں کے برابر گناہ نہ ہو مگر خالی نہ رہے گا۔فقط واللہ اعلم(۱)

تہوار کا ڈسکاؤنٹ

ان تہواروں کے موقع پر لوگوں کی خریداری کو دیکھتے ہوئے دکاندار مزید ترغیب کے لیے اپنی اشیاء پر ڈسکاؤنٹ آفر کرتے ہیں، تاکہ لوگ دکان سے زیادہ سے زیادہ سامان خریدیں، سوال یہ ہے کہ کیا اپنے تجارتی فوائد کے پیش نظر دکاندار کے لیے ان مواقع پر سیل

(۱) دارالافتاء دارالعلوم کراچی، فتوی نمبر :144001200377

لگانا جائز ہے؟

کسی دکاندار یا تاجر کے لیے اس نیت سے چیزوں میں ڈسکاؤنٹ کرنا تو درست نہیں کہ اس ڈسکاؤنٹ کو دیکھ کر غیر مسلم اپنے مذہبی تہوار میں ان کو خریدے؛ کیونکہ یہ بھی غیر مسلموں کے مذہبی تہوار میں ایک طرح کی شرکت اور تعاون ہے۔ البتہ اگر کوئی تاجر اپنے مفاد کو مدِنظر رکھ کر کسی ناجائز کام کا ارتکاب کیے بغیر ایسے موقع پر جائز چیزوں کی خرید وفروخت بڑھانے کے لیے چیزوں پر رعایت کی پیشکش کرے تو اس کی گنجائش ہے، کمائی حرام نہیں۔

جو چیزیں صرف غیر مسلموں کے تہوار ہی کے لیے خاص ہوں، اور ان کا کوئی دوسرا جائز مصرف نہ ہو، ایسی چیزوں کی خرید وفروخت ممنوع ہوگی۔ ”ففي البحر: قال رحمه الله (والاعطاء باسم النيروز والمهرجان لايجوز) اى الهدايا باسم هذين اليومين حرام بل كفر وقال ابو حفص الكبير رحمه الله لو ان رجلا عبد الله تعالى خمسين سنة ثم جاء النيروز واهدى الى بعض المشركين بيضة يريد تعظيم ذلك اليوم فقد كفر وحبط عمله وقال صاحب جامع الاصغر اذا اهدى يوم النيروز الى مسلم آخر ولم يرد به تعظيم اليوم ولكن على ما اعتاده بعض الناس لا يكفر ولكن ينبغي له ان لا يفعل ذلك اليوم خاصه ويفعله قبله او بعده لكيلا يكون تشبيها باؤلئك القوم وقد قال من تشبه بقوم فهو منهم۔۔۔۔ الجامع الاصغر رجل اشترى يوم النيروز وشيئا يشتريه الكفرة منه وهو لم يكن يشتريه قبل ذلك ان اراد به تعظيم ذلك اليوم كما تعظمه۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ كفر وان اراد الاكل والشرب والتنعم لايكفر۔ (۱) اور مجموعہ فتاوی میں لکھا ہے: ”رجل اشترى يوم النيروز شيئا لم يكن يشتريه قبل ذلك ان اراج به تعظيم النيروز كما يعظمه

---

(۱) البحر الرائق: ۵۵۸/۸

المشرکون کفر"(۱)

نوٹ : غیر اسلامی تہذیب سے متأثر ہو کر دن منانے اور اس میں چیزوں کی فروخت کا حکم اوپر تحریر کر دیا گیا ہے، مسلمان تاجروں کو ایسے دن منانے کے بجائے، امانت، دیانت اور صداقت کا طریقہ اختیار کر کے مثالی مسلمان تاجر بننا چاہیئے، اور رمضان المبارک میں جسے شہر المواساۃ یعنی غمخواری کا مہینہ قرار دیا گیا ہے، اپنی چیزوں کو سستے داموں میں بیچ کر مسلمانوں کی مدد کرنی چاہیئے۔ رمضان المبارک، عید الفطر، عید الاضحی وغیرہ کے دنوں میں اگر رعایتی سیل لگائی جائے تو اچھی نیت سے ثواب ملے گا اور وہ کاروباری فوائد بھی حاصل ہوں گے جو تاجروں کی کاروباری ضرورت ہے۔ واللہ اعلم بالصواب (دارالافتاء جامعہ دارالعلوم کراچی)

تہوار کے گفٹ کا حکم

واضح رہے کہ اگر کفار کے تہواروں کی تعظیم دل میں نہ ہو تو ایسے مواقع پر ان کی طرف سے گفٹ کی گئی چیزیں لینا اگرچہ جائز ہے، لیکن تشبہ کی بنا پر احتیاط بہتر ہے۔

فتاویٰ شامی میں ہے :"ولو أهدى لمسلم ولم يرد تعظيم اليوم بل جرى على عادة الناس لا يكفر وينبغي أن يفعله قبله أو بعده نفيًا للشبهة"۔(۲)

فتاویٰ محمودیہ میں ہے :"سوال :اگر کسی مسلمان کے رشتہ دار ہندو کے گاؤں میں رہتے ہوں اور ہندو کے تہوار ہولی، دیوالی وغیرہ پکوان، پوری، کچوری وغیرہ پکاتے ہیں، ان کا کھانا ہم لوگوں کو جائز ہے یا نہیں؟

جواب: جو کھانا کچوری وغیرہ ہندو کسی اپنے ملنے والے مسلمان کو دیں اس کا نہ لینا بہتر

(۱) مجموعہ فتاوی: ۲/ ۲۱۵

(۲) فتاوی شامی: ۶/ ۷۵۴، ط: سعید

ہے، لیکن اگر کسی مصلحت سے لے لیا تو شرعاً اس کھانے کو حرام نہ کہا جائے گا۔(۱)

غیر مسلم کو ان کے تہوار پر ہدیہ دینے کا حکم

غیر مسلم کو ان کے مذہبی تہوار پر ہدیہ دینا محبت اور تعلق کی علامت ہے، جو شرعاً ناجائز ہے، بلکہ اگر ان کے تہوار کے دن کی تعظیم کرتے ہوئے ہدیہ دیا تو کفر کا اندیشہ ہے؛ اس لیے اس سے پرہیز واجب ہے، البتہ ضرورت کی حد تک رسمی تعلق رکھنا اور اچھے اخلاق کے ساتھ پیش آنا نہ صرف جائز، بلکہ شرعاً مطلوب ہے۔ ''شرح الفقہ الاکبر'' میں ہے: ''ومن أهدى يوم النوروز إلى إنسان شيئاً وأراد تعظيم النوروز كفر''(۲)

(۱) فتاوی محمودیہ: ۱۸/ ۳۴، ط: فاروقیہ

(۲) الفقہ الأکبر: ۳۰۶

وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوز دروں

۲۴ جنوری بچیوں کا قومی دن

National Girl Child Day

اس مضمون میں لڑکیوں کی پیدائش وتربیت پر ماثور فضائل ،لڑکیوں کے ساتھ معاشرہ کا سلوک ،لڑکیوں کی تعلیم کی اہمیت ،کم عمری میں نکاح سے متعلق گفتگو کی گئی ہے۔

لڑکیوں کے قومی دن کا پس منظر

لڑکیوں کے قومی دن کی تقاریب کا آغاز "خواتین اور اطفال کی بہبودگی کی وزارت" کی جانب سے ۲۰۰۸ سے شروع ہوا، اس مہم کے ذریعے بھارت سرکار نے بھارتی سماج میں خواتین کے ساتھ عدم مساوات کے مختلف پہلوؤں کو منظر عام پر لاتی رہی ہے، ان ہی میں سے مادہ طفل کشی (female infanticide) اور مادہ جنین کشی (female foeticide) کے ٹی وی، اخبارات اور ریڈیو کے ذریعے لڑکی بچاؤ (Save the Girl Child) مہم ہے، بھارت میں غیر سرکاری اداروں نے لڑکی کے ماں باپ ہونے پر نام نہاد "داغ" کے خلاف مہم میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

لڑکیوں کا قومی دن منانے کے مقاصد

بھارت میں ہر سال ۲۴ جنوری کو لڑکیوں کا قومی دن (National Girl Child Day) منایا جاتا ہے، اس طرح سے ایک دن مخصوص کرنے کے پیچھے ملک میں لڑکیوں کو نئے مواقع فراہم کرنا ہے، ملک میں لڑکیوں کے ساتھ کئی محاذوں پر عدم مساوات برتا جاتا ہے خصوصاً تعلیم، تغذیہ، قانونی چارہ جوئی، طبی امداد، عزت وآبرو، کم سنی میں شادی، اسے قومی سطح پر منا کر لڑکیوں کے قومی کردار کو اہمیت دینا ہے، عدم مساوات ختم کرنا، خواتین میں انسانی حقوق کا تحفظ، جنسی تناسب کا تحفظ۔

ہم یہاں مذکورہ مقاصد میں سے تین باتوں کو ذکر کریں گے [۱] بیٹی سے متعلق شرعی ہدایات [۲] لڑکیوں کی تعلیم [۳] کم عمری میں شادی۔

بھارت میں لڑکیوں کے حقوق

قبل از پیدائش جنس کا تعین پر قانونی روک نافذ ہے، کم سنی کی شادی قابل سزا جرم

ہے، چودہ سال تک لازمی تعلیم قانوناً لازم ہے، لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے سرکاری ملازمتوں، پارلیمانی اور مقامی نشستوں پر ایک تہائی تحفظ خواتین کے لیے، سبھی سرکاری اسکولوں میں یونیفارم، دوپہر کا کھانا اور تعلیمی مواد مفت مہیا، پسماندہ علاقوں میں لڑکیوں کے لیے سہولت بخش کھلا تعلیمی نظام (Open Learning System) پسماندہ علاقوں میں خود امدادی زمروں (Self Help Groups) کو بطور خاص خواتین کی بھلائی کے کاموں کی حوصلہ افزائی، مادہ طفل کشی (female infanticide) اور مادہ جنین کشی (female foeticide) کے ٹی وی، اخبارات اور ریڈیو کے ذریعہ لڑکی بچاؤ (''Save theGirl Child'') مہم ہے، خواتین کے خلاف تشدد کو روکنے کے لئے ون اسٹاپ شاپ (one Stop shop) مراکز قائم کیے گئے، خواتین اور لڑکیوں کے خلاف تشدد پر سب سے بڑے احتجاج کے نتیجے میں بھارت کی پارلیمنٹ نے تین ماہ کے اندر انڈین پینل کوڈ کی دفعہ ۳۷۵ میں ترمیم کی. اس میں خواتین اور لڑکیوں کے خلاف تشدد کی روک تھام اور جواب دہی پر بڑی حد تک ترقی پسند عناصر شامل ہیں، بیٹی بچاؤ، بیٹی پڑھاؤ حکومت بھارت کا ایک منصوبہ ہے جس کا مقصد بچیوں اور خواتین کے حوالہ سے بیداری اور رفاہی خدمات کی فراہمی میں ترقی لانا ہے۔ ۱۰۰ کروڑ کے سرمایہ سے اس منصوبہ کا آغاز کیا گیا تھا، مردم شماری کے مطابق سنہ ۲۰۰۱ میں بھارت میں جنسی تناسب ایک ہزار لڑکوں پر ۹۲۷ لڑکیاں تھا جو سنہ ۲۰۱۱ آتے آتے گھٹ کر ۹۱۸ تک آگیا، سنہ ۲۰۱۲ کی یونیسف رپورٹ کی مطابق بھارت ۱۹۵ ممالک میں اکتالیسویں نمبر پر ہے، نیز حکومت کی جانب سے یہ تجویز بھی دی گئی ہے کہ اس منصوبہ پر وزارت داخلہ ۱۵۰ کروڑ صرف کرے، تاکہ بڑے شہروں میں خواتین کے تحفظ میں اضافہ کیا جاسکے۔

بھارت میں لڑکیوں کے ساتھ سلوک

بھارت میں ہر معاملے میں لڑکیاں لڑکوں سے پیچھے ہیں، ان کی پیدائش کا امکان کم

ہے، بیمار ہونے پر انہیں ڈاکٹر کے پاس لے جانے کا امکان کم ہے، ان کے پاس نجی اسکول جا کر سیکنڈری اور یونیورسٹی سے گریجویشن کرنے کے مواقع بھی کم ہیں، بھارت کے لڑکوں کے مقابلے میں لڑکیوں میں خون کی کمی زیادہ ہوتی ہے بھارت کی لڑکیوں میں خون کی کمی کا اوسط عالمی اوسط کے مقابلے میں بدترین ہے، اس لئے ۱۰۰۰۰۰ بھارت کی لڑکیوں اور عورتوں میں سے ۱۶۷ بچے کی پیدائش کے وقت مر جاتی ہیں، ترقی پذیر ممالک کے مقابلے میں یہ بہت زیادہ ہے ان کا اوسط ۱۴ ہے، بھارت میں لڑکوں کے مقابلے لڑکیوں کی بچپن میں شادی کرنے کا امکان زیادہ ہے، اسمگلنگ (Smuggling) اور جنسی استحصال کا شکار ہونے کا امکان رہتا ہے

بھارت کی خواتین افرادی قوت کی شرکت کے معاملہ میں دنیا کی پست ترین شرح ۱۱/ویں پر (عالمی سطح پر ۵۰ کے مقابلے میں ۲۷ فی صد) ہیں اور بھارت ۲۰۱۶ء کی ہیومن ڈویلپمنٹ رپورٹ (Human development report) کے مطابق صنفی مساوات کے لئے سب سے کم درجہ بندی والے ممالک کے گروپ میں ہے۔

مادہ کشی کی قانونی سزا

بھارت کے سماج میں عورتوں کی صورت حال سدھارنے اور جنسی تناسب میں توازن قائم کرنے کے مدنظر لوک سبھا میں ایک تاریخی تجویز تعارف کی گئی تھی، اس میں مادہ بچہ کشی کو غیر ضمانتی جرم بنانے کی وکالت کی گئی ہے ۲۰۱۴ء میں پیش کردہ اس تجویز کو جسے "کنیا شِشو ہتھیا نوارن ودھا یک ۲۰۱۴ء، یا مادہ بچہ کشی قانون ۲۰۱۴ء کے مقاصد میں کہا گیا ہے کہ لڑکی کا جنم اب بھی غریب خاندانوں کی جانب سے بوجھ سمجھا جاتا ہے، اس کے نتیجے میں ملک میں یہ تجویز قانونی طور پر مروجہ مادہ بچہ کشی کے معاملوں میں کئی گنا اضافہ ہوا ہے، قانون میں کہا گیا ہے کہ یہ صحیح وقت ہے جب اس بزدلانہ فعل کو ختم کر دیا جانا چاہیے، اور یہ تجویز دی گئی ہے کہ ایک ایسا قانون لایا جائے جس میں ان اشخاص کے لیے سخت سزا کی گنجائش ہو

جو مادہ بچہ کشی میں ملوث پائے جاتے ہیں، اگرلڑکی کی موت کی ابتدائی تحقیق کے بعد کوئی شخص مادہ بچہ کشی کا خاطی پایا جاتا ہے تو اسے فی الفورحراست میں لیا جانا چاہیے، اس جرم کو غیر ضمانتی جرم بنائے جانے کے ساتھ ہی خاطیوں کے لیے دس سال کی قیداور ایک لاکھ روپیے کے جرمانے کی سزا کا امکان رکھا کیا گیا ہے۔اس کے ساتھ ہی کہا گیا ہے کہ ایسے معاملوں میں مادہ بچہ کشی کی جانچ اور عدالت میں رپورٹ فائل کرنے کا کام لڑکی کی موت کی تاریخ سے تین مہینے کی میعاد کے اندر پورا کرلیا جانا چاہیے۔(آزاد دائرۃالمعارف،ویکیپیڈیا)

بھارت میں بچیوں کو رحم مادر ہی میں قتل کی رپورٹ

بھارت میں لڑکوں کے مقابلے میں لڑکیوں کی شرح کم ترین سطح پر پہنچ گئی ہے، نئے حکومتی اعداد وشمار کے مطابق اس وقت بھارت میں چھ برس سے کم عمر کے ایک ہزار لڑکوں کے مقابلے میں لڑکیوں کی تعداد ۹۱۴ ہوگئی ہے ۱۹۴۷ء میں آزادی کے بعد سے بھارت میں لڑکیوں کی یہ تعداد کم ترین بتائی گئی ہے، بھارتی معاشرے میں لڑکوں کو لڑکیوں پر فوقیت دی جاتی ہے اور وہاں کئی مرتبہ والدین یہ پتہ چلانے کے بعد کہ ان کے گھر میں آئندہ پیدا ہونے والا بچہ ایک لڑکی ہوگی ،حمل ضائع بھی کروادیتے ہیں،بچیوں کو قتل کرنے کی یہ روایت کافی پرانی ہے،بہت سے والدین بچیوں کو بوجھ سمجھتے ہیں اورغریب والدین اپنی بچیوں کی شادی کے لیے جہیز کا انتظام بھی نہیں کرسکتے ،اس لیے ان کی کوشش ہوتی ہے کہ ان کے ہاں کوئی لڑکی جنم نہ لے، بھارت میں اکثر شادی شدہ خواتین کو اس بارے میں بہت زیادہ دباؤ کا سامنا بھی ہوتا ہے کہ وہ لڑکوں ہی کو جنم دیں، بھارت میں نہ صرف دیہی علاقوں میں بچیوں کی پیدائش کو برا سمجھا جاتا ہے بلکہ وہاں کئی پڑھے لکھے لوگ بھی اپنے ہاں پیدا ہونے والے بچوں کی جنس کا پتہ کراتے ہیں تاکہ لڑکیاں ہونے کی صورت میں انہیں اس دنیا میں ہی نہ آنے دیا جائے، گزشتہ چالیس برس سے اگرچہ اس حوالے سے کئی اقدامات کیے گئے ہیں تاہم مطلوبہ نتائج حاصل نہیں ہوسکے ہیں۔ایک محتاط اندازے کے

مطابق بھارت میں ہر سال کم از کم پانچ ملین بچیوں کو رحم مادر میں ہی موت کی نیند سلا دیا جاتا ہے، عالمی سطح پر ہر ایک ہزار لڑکوں کے مقابلے میں لڑکیوں کی تعداد ایک ہزار پچاس بنتی ہے۔(DW.COM)

حیرت انگیز رپوٹ

ایک تازہ سروے میں یہ بات بھی سامنے آئی ہے کہ اپنے شوہر کے ہاتھوں مار پیٹ کا شکار ہونے والی عورتوں کے بچے پانچ سال کی عمر تک پہنچنے سے پہلے ہی دیگر بچوں کے مقابلے ۲۱ گنا زیادہ موت کا شکار ہوتے ہیں، گذشتہ دو دہائیوں کے دوران بھارت میں جن ۱۸ لاکھ بچیوں کی موت ہوئی اس کی ایک وجہ ان کی ماؤں کے ساتھ تشدد کے واقعات رہے ہیں، عورتوں پر گھریلو تشدد کی روک تھام کے لئے حکومت نے ۲۰۰۵ء میں ایک قانون بھی بنایا تھا لیکن اس سے عورتوں کی حالت میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آسکی ہے، ظاہر ہے وحی الٰہی سے بڑا قانون بن نہیں سکتا، اسلامی معاشرہ کے بغیر حسن معاشرت قائم نہیں ہوسکتی اگر حکومت یا عوام واقعی عورتوں کو گھریلو تشدد سے بچانا چاہتے ہیں تو اسے اسلامی قوانین کو خلوص اور سختی سے نافذ کرنے ہوں گے۔

بھارت میں عام شہریوں کی جنسی صحت سے متعلق ایک ملکی تنظیم کی سربراہ اور معروف کلینیکل سائیکالوجسٹ (Clinical psychologist) رادھیکا چندرامنی کہتی ہیں کہ گزشتہ برس ملک میں ایسی مانع حمل ادویات یا ECPs کے 8.2 ملین پیکٹ فروخت کئے گئے۔ یہ تعداد ایک سال پہلے کے مقابلے میں ۲۵۰ فیصد زیادہ تھی، بھارتی دارالحکومت نئی دہلی میں قائم طبی بنیادوں پر اسقاط حمل کے لئے قومی اتفاق رائے نامی کنسورشیم کے اعداد وشمار کے مطابق اس ملک میں ہر سال ۱۱ ملین خواتین اپنا حمل ضائع کروا دیتی ہیں اور دوران حمل پیدا ہونے والی پیچیدگیوں کی وجہ سے بھارت میں سالانہ بنیادوں پر قریب ۲۰ ہزار خواتین کی موت بھی واقع ہوجاتی ہے۔

لمحہ بلمحہ ظلم کی گھڑی ہے

بھارتی عورت کا جبر وظلم کے دور میں زندہ رہ جانا ایک معجزے سے کم نہیں، لڑکی کی زندگی کو ماں کے پیٹ ہی میں خطرات لاحق ہوتے ہیں، اسے اسقاط کے ذریعے سے قتل کروا دیا جاتا ہے، لڑکیوں کو بہت چھوٹی عمر ہی سے امتیازی سلوک، جنسی زیادتی اور کم عمری میں جبری شادی جیسے ہولناک مسائل کا سامنا رہتا ہے، یہاں تک کہ شادی کے بعد عورتوں کو جہیز کے مطالبہ پورا نہ کرنے پر قتل کر دیا جاتا ہے، اگر وہ ان تمام زیادتیوں کے باوجود بچ جائے اور اسے بیوگی کی زندگی گزارنا پڑے تو اسے نہ صرف امتیازی سلوک کا شکار بنایا جاتا ہے، بلکہ اسے تمام تر حقوق، بالخصوص وراثت اور جائیداد سے محروم رکھا جاتا ہے، عورتوں کو تحفظ فراہم کرنے حکومت کے تمام دعوے غلط ثابت ہو رہے ہیں اور سماجی ماحول بھی عورتوں کے خلاف ہے، جو عورتیں بلاوجہ گھر سے باہر جا کر کام کرتی ہیں انہیں گھر سنبھالنے اور گھریلو کام کاج کا دوہرا بار بھی اٹھانا پڑتا ہے، اس وجہ سے ان پر اتنا زیادہ بوجھ اور دباو پڑ جاتا ہے کہ حالات بعض اوقات قابو سے باہر ہو جاتے ہیں، عورتوں کا اقتصادی معاملہ خود انحصاری کی طرف قدم بڑھا کر شوہروں کے ساتھ تصادم کی نوبت لا دیتا ہے۔

جنسی تعلقات بنانے کے معاملے میں خواتین کی ہی تنقید زیادہ کی جاتی ہے، ان کی عزت ہمیشہ پر خطر رہتی ہے، اہل خاندان کے وقار کا مسئلہ ہوتی ہے، لوگ مستقبل میں اپنے وقار کو ٹھیس پہنچنے کے اندیشے سے بچنے کے لیے وہ صرف اولاد نرینہ کو ہی جنم دینا چاہتے ہیں، عموماً کوئی بھی خاتون اپنی حمل میں موجود اولاد کو مارنا نہیں چاہتی، بھلے ہی وہ مادہ بچہ ہی کیوں نہ ہو، لیکن مختلف وجوہ کی بنا پر سے اسے ایسا کرنے کے لیے مجبور کیا جاتا ہے مادہ جنین کشی کی ایک بڑی وجہ جہیز کی رسم بھی ہے، لوگ لڑکیوں کو پرایا دھن سمجھتے ہیں، ان کی شادی کے لیے جہیز کا انتظام کرنا پڑتا ہے، جہیز جمع کرنے کے لیے کئی خاندانوں کو قرض بھی لینا پڑتا ہے، اس لیے مستقبل میں اس قسم کے مسائل سے بچنے کے لیے لوگ دوران حمل میں ہی

جنس پتہ لگانے کا امتحان کروا کر مادہ جنین ہونے کی صورت حال میں اس کا قتل (اسقاط حمل) کروادیتے ہیں۔

”لڑکی لکشمی ہے“ کا توہم

توہم پرستی کی بنیاد پر استوار ہندو دھرم میں ایک مشہور ہندی کہاوت ہے کہ لڑکی کی پیدائش گھر میں لکشمی (دولت) لانے کا سبب بنتی ہے، جبکہ بھارت میں صنف نازک کے ساتھ جو سلوک روا رکھا جارہا ہے، وہ اس کی صریحاً نفی کررہا ہے، چار بازوؤں والی لکشمی دیوی ہندو اساطیر نامے کا ایک اہم کردار ہے، توہم پرستی میں مبتلا ہندو دھرم میں لکشمی دیوی کو دولت کی دیوی مانا جاتا ہے، ثروت مندی اور خوش بختی کی علامت لکشمی دیوی کا بت انہی خصوصیات کی عکاسی کرتا ہے، مثال کے طور پر لکشمی دیوی کے زیادہ تر بتوں کے ہاتھ میں کنول کا پھول اور سونا چھلکتا ہوا کاسہ نظر آتا ہے، جھوٹی بنیاد ہی سہی، لیکن اس پس منظر میں ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ بھارتی معاشرے میں عورت کو عزت و افتخار کا باعث سمجھا جاتا، ایک ایسے معاشرے میں جو عالمی سطح پر اثر ورسوخ اور خوش حالی میں آگے سے آگے بڑھتا دکھائی دے رہا ہے، ایسے معاشرے میں جہاں اس دیوی کو اتنا بلند مقام حاصل ہے، وہاں حقیقی معنوں میں خواتین کی صورت حال انتہائی افسوسناک ہے۔

بھارت میں خواتین پر تشدد

بھارت میں عورتوں کے خلاف تشدد کے واقعات بڑی حد تک عام ہیں، بھارت کے تازہ ترین نیشنل فیملی ہیلتھ سروے (National family health survey) کے مطابق ۴۰ فیصد سے زائد عورتوں نے یہ بات تسلیم کی کہ انہیں زندگی میں کبھی نہ کبھی اپنے شوہروں کے ہاتھوں مار کھانی پڑی ہے، یہ سروے ملک کے ۲۸ ریاستوں میں کیا گیا جس میں ۲۵. ۱ لاکھ سے زائد خواتین سے سوالات پوچھے گئے تھے، سروے کے مطابق جن

۵۰۰۰ ۷ ہزار مردوں سے سوالات پوچھے گئے ان میں سے ۵۱ فیصد سے زائد نے کہا کہ انہیں اپنی بیویوں کو مارنے پیٹنے میں کوئی خرابی یا قباحت محسوس نہیں ہوتی ہے J، آل انڈیا ڈیموکریٹک ہیومن ایسوسی ایشن (AIDWA) کے مطابق بھارت میں عورتوں پر تشدد کا صحیح اندازہ لگانا ممکن نہیں ہے۔انہیں نہ صرف گھر کے اندر بلکہ گھر کے باہر اور کام کے مقامات پر بھی تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے، حیرت کی بات یہ ہے کہ مذکورہ سروے میں تقریباً ۵۴ فیصد خواتین کو اپنے شوہر کے ہاتھوں مار کھانے پر کوئی اعتراض نہیں تھا، وہ اس کی کئی طرح کی تاویلات پیش کرتی ہیں۔

عورتوں کی آبروریزی کی شرح

بھارت میں عورتوں کی آبروریزی کے واقعات میں تشویشناک حد تک اضافہ ہوا ہے، بھارت کے نیشنل کرائم بیورو (این سی آر بی) سے جاری کی گئی رپورٹ میں انکشاف کیا ہے کہ بھارت میں ایک گھنٹے میں دو عورتوں کو آبروریزی کا نشانہ بنایا جاتا ہے، سرکاری اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ ۲۰۰۷ء سے ۲۰۱۶ء کے درمیان خواتین کے تئیں بڑھتے جرائم میں ۸۳ فیصدی کا اضافہ ہوا ہے، ساتھ ہی ہر گھنٹے میں ۴ ریپ کے معاملے درج کئے جاتے ہے، بیشتر واقعات میں ملزمان کے خلاف مقدمہ درج نہیں ہوتا اور بیشتر لوگ معاشرتی مسائل کے باعث پولیس کے سامنے مقدمات درج کرانے سے گھبراتے ہیں ''بھارت میں جرائم'' کے موضوع پر تیار کی جانے والی رپورٹ میں نیشنل کرائم بیورو نے کہا ہے کہ درج ہونے والے ۲۰۷۳۷ مقدمات میں سے ۱۹۱۸۸ کیسوں میں ملزمان کی شناخت کے باوجود زیادہ تر کے خلاف کارروائی کو آگے نہیں بڑھایا گیا، رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ زیادتی کا نشانہ بننے والی ۱۱۹۸۴ عورتوں کی عمریں ۱۸ سے ۳۰ برس کے درمیان تھیں، بھارت کے نیشنل کرائم بیورو کا کہنا ہے کہ گذشتہ دہائی کے دوران دلت ذات سے تعلق رکھنے والی خواتین کے ساتھ ریپ کے واقعات میں اضافہ ہوا ہے۔

تھامسن روئٹرز فاونڈیشن نےسن 2018ءمیں اپنےایک سروے میں بھارت کو دنیا بھرمیں خواتین کے لیےسب سے خطرناک ملک قرار دیا تھا۔افغانستان اورسیریا دوسرے اورتیسرے،صومالیہ چوتھےمقام پر ہیں۔یعنی پوری دنیامیں ہندوستان،خواتین کے لئے سب سے خطرناک اورغیر محفوظ ملک مانا گیاہے۔تھامسن رائٹرس فاؤنڈیشن کےسروے میں 193 ملکوں کو شامل کیا گیا تھا،جن میں سےعورتوں کے لئے ٹاپ 10 بدترین ملکوں کاانتخاب کیا گیا۔حکومتی اعداد وشمار کےمطابق 2019ءمیں بھارت میں یومیہ اوسطاً 88 خواتین کے ساتھ جنسی زیادتی کی گئی،اس میں گیارہ فیصدخواتین انتہائی پسماندہ یعنی دلت طبقے سے تعلق رکھتی تھیں۔رپورٹ کے مطابق 2001ءسے 2017ءکے درمیان یعنی 17 برسوں میں جنسی زیادتی کے واقعات میں دوگنا اضافہ ہوا ہے۔سی این این کی رپورٹ کے مطابق 2018 میں یہاں ہرسولہ منٹ پرایک عورت کا ریپ ہوا۔صرف اس ایک سال میں 33000 ریپ کے واقعات رپورٹ ہوئے۔ 2017 میں یہ تعداد 32559 تھی،یعنی ایک دن میں ریپ کے بانوے واقعات،جن میں تیس فی صد شکار بچے تھے۔انڈیا کی عدالتوں میں ان میں سے صرف 18300 کیسز پر کارروائی شروع ہوئی جب کہ باقی اب تک التوا کا شکار ہیں،اترپردیش،مہاراشٹر اورمغربی بنگال ریپ کی شرح کے اعتبار سےعورتوں کے لیے تین خطرناک ترین جگہیں ہیں،ہندوستان ہیومن اسمگلنگ،جنسی تشدد،سماجی اورمذہبی روایتوں کی وجہ سے اورخواتین کوسیکس دھندوں میں دھکیلنے کےلحاظ سے سرفہرست ہے،سیکولرازم اورمساوی حقوق کے نام نہادعلمبردار بھارت میں گزشتہ چند برسوں میں پیش آنے والے والی جنسی زیادتی کے پے درپے واقعات نے بھارت کااصل چہرہ دنیا کےسامنے رکھ دیا ہے۔بھارتی خواتین کوعوامی جگہوں،خاندانوں اور دفتروں میں ہراساں اورجنسی تشدد کا نشانہ بنانا ایک معمول ہے ہرجگہ عدم تحفظ کی فضاء ہے۔ عوامی مقامات ہوں یا پھر پبلک ٹرانسپورٹ،عورتوں کوکہیں بھی جنسی طور پر ہراساں کرلیا جاتا

ہے یا پھر جنسی تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔(۱)

عصمت دری کے بڑھتے ہوئے واقعات کے باوجود بھارت کا نظام عدل اس معاملے میں سُستی کے راستے پر گام زن ہے، سماجی کارکنوں کا تاہم کہنا ہے کہ چونکہ دیہی علاقوں میں ایسے بیشتر جرائم کو پولیس تک پہنچنے ہی نہیں دیا جاتا اس لیے حقیقی صورت حال اس سے کہیں زیادہ بھیانک ہو سکتی ہے، ماہرین سماجیات کا کہنا ہے کہ سخت قوانین بنانے کا فائدہ اس وقت تک نہیں ہوگا، جب تک کہ سیاسی جماعتیں، حکومتیں اور پولیس اسے نافذ کرنے میں مخلص نہ ہوں، اس کے ساتھ ہی سماجی تبدیلی بھی ضروری ہے۔

اسلام کی طرف سفر

بھارتی معاشرے میں خواتین کے ساتھ روا رکھے گئے غیر انسان سلوک کے ردعمل میں بھارت میں سینکڑوں ہندو لڑکیوں نے سماجی اور اخلاقی گراوٹ سے گھبرا کر اسلامی تعلیمات پر عملدرآمد میں عافیت تلاش کرنا شروع کر دی ہے، ہندوؤں میں ذات پات کی تقسیم کی رو سے برہمن اور دلت کے درمیان کھینچی گئی لکیر کے مطابق نیچ (نچلی) ذات قرار پانے والے دلت ہندوؤں سے تعلق رکھنے والی سینکڑوں لڑکیوں نے مسلمان لڑکوں کو اپنا جیون ساتھی چننے کے لیے دینی شخصیات کے ہاتھ پر اسلام قبول کرنا شروع کر دیا ہے، اسی طرح بھارت میں متعصب ہندوؤں کی پیدا کردہ غیر فطری اونچ نیچ کے باعث لڑکے باعزت زندگی گزارنے کے راستے تلاش کر رہے ہیں، جبکہ لڑکیوں نے سماجی ظلم، ناروا سلوک اور اونچ نیچ سے نجات کا راستہ مسلمان ہونے میں تلاش کیا ہے کہ مسلمان ہونے کے بعد وہ ہندوؤں سے تو شادی نہیں کر سکتیں، اس لیے مسلمان ہی کو جیون ساتھی بنانا پڑتا ہے۔

ہندو انتہا پسندوں نے اسے طالبان کے اثرات اور مالی مدد کا نتیجہ قرار دیا ہے ان کا

---

(۱) تفصیل کے لیے دیکھیں ”عصمت دری اسباب وحل“، مفتی احمد اللہ نثار قاسمی

دعویٰ ہے کہ مسلمان ہندولڑکیوں کومسلمان بنانے کے لیے عراقی طالبان پیسہ پھینک رہے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ یہ محبت کی شادی نہیں بلکہ سازش ہے، آرایس ایس کے دباؤ پر بھارتی خفیہ ایجنسی نیشنل انوسٹیگیشن ایجنسی نے جنوبی ریاست کیرالہ میں ہندولڑکیوں کے قبول اسلام اورمسلمانوں کے ساتھ شادیوں کا ڈیٹا اکٹھا کیا ہے، جس میں کم ازکم ۸۶ لڑکیوں کو ان کے گھروں سے اٹھانے کے بعد بند کمرے میں گھنٹوں تک تفتیش کی گئی، مگر مایوسی کے سوا کچھ نہ ملا، انہیں اپنی توقع کے مطابق کسی سوال کا جواب نہیں مل سکا، اس کے باوجود مسلمان لڑکوں کو اٹھانے اور پوچھ گچھ کے جبری واقعات کا سلسلہ جاری ہے۔

کمسن لڑکیوں کے خون سے نہاتی خاتون

اس خاتون کا نام ہے الیزابیتھ باتھری (Elicabeth bathory)، جسے تاریخ کی سب سے خطرناک اور وحشی خاتون سیریل (Serial) کلر کے طور پر جانا جاتا ہے، الیزابیتھ ہنگری ریاست کے رسوخ دار باتھری خاندان سے تعلق رکھتی تھی اس کی شادی فرینک نیڈ یسڈی نام کے شخص سے ہوئی تھی، جوترکی کے خلاف جنگ میں ہنگری کا قومی ہیرو تھا، الیزا بیتھ باتھری نے سال ۱۵۸۵ء سے ۱۶۱۰ء کے بیچ ۶۰۰ سے زیادہ لڑکیوں کو اپنے ہی محل میں قتل کر کے ان کے خون سے نہایا تھا، یہ اپنے شوہر کی حیات ہی سے لڑکیوں کو اپنا شکار بناتی تھی لیکن ۱۶۰۴ء میں اس کی موت کے بعد اس نے جیسے اپنے جرم کا پہاڑ ہی کھڑا کر دیا، اس خوفناک جرم میں اس کے تین نوکر بھی اس کا ساتھ دیتے تھے، چونکہ ایک بارسوخ خاتون تھی، اسلئے وہ آس پاس کے گاوں کی غریب لڑکیوں کو اپنے محل میں اچھے پیسوں پر کام کرنے کا لالچ دے کر بلالیتی تھی، جولڑکیاں محل میں آتی تھی، وہ انہیں اپنا شکار بنالیتی تھی۔

انہیں مارتی پیٹتی یہاں تک کہ ان کے ہاتھوں کو جلا دیتی یا پھر کاٹ دیتی، کئی بار وہ لڑکیوں کے چہرہ یا جسم کے دیگر حصوں کا گوشت دانتوں سے کاٹ کر نکال لیتی تھی اور آخر میں ان کا قتل کر کے ان کا خون ایک ٹب میں جمع کرلیا جاتا، جس میں الیزابیتھ باتھری نہاتی

تھی، اس کا ذکر کئی کتابوں میں بھی کیا گیا ہے، جب علاقہ میں لڑکیوں کی تعداد کافی کم ہوگئی، تب اس نے رسوخ دار خاندانوں کی لڑکیوں کو اپنا شکار بنانا شروع کیا، یہ بات جب ہنگری کے راجہ کو پتہ چلی تو انہوں نے معاملہ کی تحقیقات کروائی، تب اس حیرت انگیز معاملے کا انکشاف ہوا، ۱۶۱۰ء میں الیزابیتھ کو اس کے خوفناک جرم کے لئے گرفتار کرلیا گیا اور اس کے ہی محل کے ایک کمرے میں اسے قید کر دیا گیا، جہاں پر چار سال بعد ۲۱/ اگست ۱۶۱۴ء کو اس کی موت ہوگئی، یہ سب صرف اس لیے کرتی تھی کہ وہ کافی خوبصورت تھی اور وہ اپنی اسی خوبصورتی اور اپنی جوانی قائم رکھنے کے لئے معصوم لڑکیوں کے خون سے نہاتی تھی، حالاں کہ کہا یہ بھی جاتا ہے کہ جس وقت اس کی موت ہوئی وہ کافی بدصورت ہو چکی تھی۔(۱)

عورت اور مختلف نظریات

۞ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آمد سے قبل دنیا میں عورتوں کی مظلومیت کا عالم، ایران میں باپ بیٹی کو اپنے چمن سے جب رخصت کرتا تو (۱۰) دس کوڑے مارتا اور وہی کوڑا داماد کے ہاتھ میں دے دیتا کہ اسے مارتے رہنا کہ یہ میرے گھر میں کیسے پیدا ہوئی، اس دور کے تمامی ملکوں میں خواتین کو قانونی شہریت حاصل نہیں تھی، بلکہ مرد اس کا نگراں ہوتا تھا ہر شکل میں، خواتین براہ راست قانونی کارروائی نہیں کرسکتی تھیں بلکہ یہ معاملات عورت کے مجاز پر مرد کے زیر نگرانی چلتے تھے، خواتین کو جائداد رکھنے کا حق محدود تھا، تاہم خواتین جہیز، تحائف اور اگر مرد چاہے تو بھیک کی شکل میں اسے کچھ دے دے تو وہ رکھ سکتی ہے، عورت کا سرپرست اس جائداد کی خرید و فروخت کا اختیار تھا، قدیم تہذیب میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے قبل کسی عورت کو کبھی بھی مکمل شہریت حاصل نہیں ہوئی۔

۞ اسلام سے قبل معاشرے میں عورت کا کوئی مقام نہ تھا، وہ ایک استعمال کی چیز

---

(۱) روزنامہ پاکستان، Feb 25, 2019

سمجھی جاتی تھی جس طرح دیگر چیزیں ہوتی ہیں، عورت کا اس کے سوا کوئی مصرف نہ تھا کہ اس سے جنسی لذت حاصل کی جائے اور اولاد پیدا کی جائے، طاقتور قبائل، کمزور قبائل پر شب خون مارتے اور جاتے جاتے جوان عورتوں اور کم عمر لڑکیوں کو اٹھا کر لے جاتے، جنگوں میں فاتح قوم مفتوح قوم پر دیگر مظالم کے ساتھ ساتھ یہ ظلم بھی ڈھاتی کہ وہ ان کی عورتوں اور لڑکیوں کو اٹھا کر لے جاتے اور یا تو ان کو اپنی باندی بنا کر ان سے جنسی زیادتی کی جاتی یا پھر انہیں بدکاری کے لیے بیچ دیا جاتا، عورتوں کی معاشرے میں کوئی عزت نہ تھی، آج مغرب زدہ لبرلز اور مذہب بےزار طبقہ جس فلسفے کی بنیاد پر اسلام کو ہدف تنقید بناتا ہے، اسی فلسفے کے گڑھ یونان میں بیویوں یا گھر کی عورتوں کے لیے نہ کوئی تعلیم تھی نہ تہذیب وثقافت اور نہ ہی کوئی عورت کسی قسم کے شہری حقوق کی حق دار تھی، باپ کے مرنے پر اس کی بیویاں، بیٹیاں اور دیگر رشتہ دار خواتین بیٹوں میں ترکہ کے طور پر تقسیم کردی جاتی تھیں، اس معاشرے میں محرمات کا کوئی تصور نہ تھا اور ماں، بہن، پھوپھی، خالہ چچی وغیرہ سے جنسی تعلق قائم کرنے میں کوئی عار نہیں سمجھا جاتا تھا۔

۞ یونانی روایات کے مطابق پینڈورا (Pandora) ایک عورت تھی جس نے ممنوعہ صندوق کو کھول کر انسانیت کو طاعون اور غم کا شکار کر دیا۔ یہودیوں کی کتاب ''کتاب مقدس'' میں لکھا ہے کہ عورت موت سے زیادہ تلخ ہے۔ (تمدن عرب ص: ۳۷۳)

۞ رومی قانون میں بھی عورت کو مرد سے کمتر قرار دیا گیا تھا، مسیحی روایت بھی اسی طرح کے افکار کی حامل تھی، انگلینڈ کے آٹھویں بادشاہ ہینری ۸ نے اپنے دور میں پارلیمنٹ میں یہ قانون پاس کیا تھا کہ عورت مقدس کتاب انجیل کی تلاوت تک نہیں کرسکتی کیونکہ وہ ناپاک تصور کی جاتی تھی، ان کے یہاں نن کا تصور بھی موجود تھا، جو آج بھی جاری ہے، عیسائی مذہب عورت کو معصیت کا دروازہ، گناہوں کا سرچشمہ سمجھتے ہیں، پرانی بائبل کے مطابق سیدنا عیسیٰؑ ایک عورت ہوّا کے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کے لیے سولی پر چڑھے تھیں (معاذ اللہ)

تبّت کے مذہبی پیشوا عورت سے سے تعلق رکھنا روحانی ترقی کی راہ میں رکاوٹ سمجھتے ہیں، یونان میں عورت کو شیطان کی زبان اور دیگر تذلیل الفاظ سے موسوم کیا جاتا تھا۔

۞ اسپارٹا میں اس بدنصیب عورت کو، جس سے کسی قومی سپاہی پیدا ہونے کی امید نہ ہوتی، مار ڈالتے ،جس وقت کسی عورت کے یہاں بچہ پیدا ہو چکا ہوتا تھا تو ملکی فوائد کی غرض سے اس عورت کو دوسرے شخص کی نسل لینے کے لیے اس کے خاوند سے عاریتاً لے لیتے تھے "۔(تمدن عرب: ۳۷۳)

۞ ہندوستان میں اگر عورت بیوا ہو جاتی تھی تو وہ منحوس ہو جاتی تھی، اس کو دیکھنا اس سے ملنا جلنا، اس کو اپنے خوشی میں شامل کرنا، گویا تباہی اور بربادی کو دعوت دینا تھا ہندوستانی تہذیب میں، عورت صغرسنی میں باپ کی مطیع ہوتی ہے، جوانی میں شوہر کی اور شوہر کے بعد اپنے بیٹوں کی اور اگر بیٹے نہ ہوں تو اپنے اقرباء کی، کیوں کہ کوئی عورت ہرگز اس لائق نہیں ہے کہ خود مختار طور پر زندگی بسر کر سکے"(۱)

۞ ہندوستان کا حال عرب سے بھی بدتر تھا، یہاں مرنے والے شوہروں کے ساتھ ان کی زندہ بیویاں جلائی جاتی تھی، اس رسم کو"ستی" کے نام سے پکارا جاتا تھا، فرانس کے مشہور مورخ ڈاکٹر گستاؤلی بان نے لکھا ہے۔"یہ رسم ہندوستان میں عام ہو چلی تھی کیونکہ یونانی مورخوں نے اس کا ذکر کیا ہے"(ڈاکٹر گستاؤلی بان' تمدن ہند)

اِبن بطوطہ (م۔ ۷۷۹ھ...... ۱۳۷۸ئ) جب ہندوستان آیا تو اس نے یہ وحشت ناک منظر خود دیکھے جس کا اپنے سفرنامہ میں ذکر کیا ہے۔(سفرنامہ ابن بطوطہ) ایسا ہی ایک منظر دیکھتے دیکھتے وہ بے ہوش ہو کر گھوڑے سے زمین پر گرنے لگا تو لوگوں نے سنبھالا۔ (سفرنامہ ابن بطوطہ)

۱۸۳۹ء میں لارڈ بنٹنگ (Lord bentinck) نے ستی ہونے یا ستی میں مدد

---

(۱)ستیارتھ پرکاش باب نمبر 4 ص 152 :، 153

دینے کو جرم قرار دیا، پھر بھی ماضی قریب میں ہندوستان میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس میں شوہر کی لاش کے ساتھ اس کی زندہ بیوی کو پھونک دیا گیا، یہ خبر ساری دنیا میں حیرت سے سنی گئی۔

۞ ہندومت میں عورتوں کے لیے ویدوں کی تعلیم سختی سے منع تھی، ہندومت میں اگر کسی عورت کا شوہر مر جائے اور شوہر کی چتا کے ساتھ جل مرنے تیار نہ ہو تو اس بیوہ کی زندگی موت سے بدتر ہوتی تھی، وہ دوسری شادی نہیں کر سکتی تھی (البتہ پورا معاشرہ شادی کے بغیر اس سے تعلق قائم کرنے کے لیے کوشاں رہتا تھا) کوئی کسی خوشی کی تقریب میں نہیں جا سکتی تھی، بیوہ کے لیے چوڑیاں پہننا، رنگین کپڑے پہننا اور خوشی کی تقریبات میں جانا ممنوع تھا۔ کسی تقریب میں اس کی شمولیت براشگون سمجھا جاتا اور اس کو منحوس سمجھا جاتا، اس چیزو کے باعث ہندو عورت شوہر کی چتا کے ساتھ جل مرنے کو ہی ترجیح دیتی تھی۔

۞ بدھ مت کی بات کریں تو اس میں اگر کوئی شخص کسی عورت سے کسی قسم کا تعلق رکھے تو اس کے لیے نجات (نروان) کی کوئی صورت باقی نہیں رہتی اس لیے وہ تارک دنیا بن کر رہتے تھے۔

۞ جرمن فلاسفر نٹشے نے تو یہاں تک لکھا ہے ”عورت کا مقصد حیات صرف یہ ہے کہ وہ مرد کی قید میں رہے اور اس کی خدمت کرتی رہے“

۞ یورپ بھی اس معاملے میں کسی سے پیچھے نہیں رہا، وہاں ۱۴۹۴ئہ اور ۲۲ ۱۵۲۱ئہ میں جادوگری کے الزام میں سینکڑوں عورتوں اور بچوں کو ذبح کر دیا گیا، بقول ڈاکٹر اسپرنگر عیسائی دنیا میں ۹۰ ہزار عورتوں کو مختلف نامعقول الزامات میں زندہ جلا دیا گیا، آج کل بوسنیا میں مسلمان عورتوں کے ساتھ ہونے والے جو سفاکانہ سلوک سے روح انسانیت کانپ اٹھتی ہے۔

۞ امریکہ جس کا شمار ترقی یافتہ براعظم میں کیا جاتا ہے وہاں عورتوں کے ساتھ جو

سلوک کیا جارہا ہے' شاید تاریخ کے کسی دور میں ایسا سلوک نہیں کیا گیا ہوگا، ہر پانچ منٹ کے بعد ایک عورت کا دامن عصمت تار تار کیا جاتا ہے، یعنی چوبیس گھنٹے میں عصمت دری کے ۲۸۸ حادثات رونما ہوتے ہیں، آپ خود اپنے ضمیر سے پوچھیں، یہ جنت ہے یا جہنم؟ مختلف جرائم کی تعداد اس سے بھی زیادہ ہے، چوبیس گھنٹے میں اٹھارہ سو جرائم کا ارتکاب کیا جاتا ہے۔

۞ اسلام ایک ایسا مذہب ہے جس نے عورت کو ذلت و پسماندگی کے گہرے سمندر سے نکالا، اور عزت اور عافیت کی بلندی پر فائز کیا جس کی یہ حقدار تھی۔ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں ارشاد فرماتا ہے، عورتیں تمہارا لباس ہیں اور تم ان کا(۱)

کسی دوسری مذہبی کتاب میں خواتین کو اتنی اہمیت نہیں دی گئی جتنی اہمیت قرآن حکیم نے دی ہے، سورہ مریم' حضرت مریم علیہا السلام کے نام سے معنون کی گئی، سورہ بقرہ' سورہ تحریم' سورہ نور وغیرہ میں خواتین کے لئے بہت سے احکام و مسائل ہیں، پھر اہم خواتین کا قرآن کریم میں ذکر کیا گیا ہے مثلاً حضرت حوا علیہا السلام' حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا' حضرت ذکریا علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ازواج مطہرات' حضرت شعیب علیہ السلام کی صاحبزادیاں' حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ اور ہمشیرہ' حضرت یوسف علیہ السلام کی زوجہ مکرمہ' حضرت مریم علیہا السلام' ملکۂ فرعون' ملکۂ سبا اور صحابیات رضی اللہ تعالیٰ عنہن، اللہ تعالیٰ نے عورت اور مرد کے ازدواجی تعلق کو اتنا مقدس بنایا کہ اس کو اپنی نشانیوں میں سے ایک نشانی قرار دیا اور اس کا مقصد یہ بیان فرمایا کہ انسان سکون وچین حاصل کرے اور اس تعلق کو محبت و مہربانی کا تعلق قرار دیا جس میں ہوس پرستی کا شائبہ تک نہیں اسلام کا یہ تصور کہیں نہیں ملتا۔

عرب میں ایک مرد درجنوں شادیاں کرسکتا تھا، پھر بھی لڑکیوں کی پیدائش باعثِ ننگ سمجھی جاتی تھی اور لڑکیوں کو پیدا ہوتے ہی زندہ درگور کردیا جاتا تھا، جس کے لئے قرآن

---

(۱) سورہ البقرہ۔ آیت۔ 187

کریم میں فرمایا گیا کہ قیامت کے دن دفن ہونے والی لڑکی سے پوچھا جائے گا بتا تجھے کس جرم کی پاداش میں قتل کیا گیا۔ (سورہ تکویر آیت ۸ / ۹) یعنی ایسے سفاک باپ کو قیامت کے دن چھوڑا نہیں جائے گا۔

بیٹیوں کی شان وعظمت

اللہ تعالیٰ کا بیٹیوں کو بیٹوں سے پہلے ذکر کرنا: چنانچہ ارشاد فرمایا: آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اللہ تعالیٰ ہی کی ہے، وہ جو چاہتے ہیں پیدا کرتے ہیں، جسے چاہتے ہیں بیٹیاں عطا کرتے ہیں اور جسے چاہتے ہیں بیٹے عطا کرتے ہیں۔ ”لله ملك السموات والارض يخلق مايشاء يهب لمن يشاء اناثا ويهب لمن يشاء الذكور“ (۱)

اس آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے پہلے بیٹیوں کے دینے کا ذکر فرمایا پھر بیٹوں کے عطا فرمانے کا ذکر فرمایا، امام ابن قیمؒ اس بارے میں دو اقوال نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں: میرے نزدیک اس کی ایک اور حکمت یہ ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے بیٹیوں کو مقدم کیا ہے جن کو اہل جاہلیت مؤخر کرتے تھے، گویا کہ یہ بیان کرنا مقصود تھا کہ تمہاری طرف سے نظر انداز کی ہوئی یہ حقیر قسم میرے نزدیک ذکر میں مقدم ہے۔ ”وعند وجه آخر وهو انه سبحانه قدم ما كانت توخره الجاهلية من امر البنات حتى كأن الغرض بيان ان هذا النوع المؤخر الحقير عندكم مقدم عندي في الذكر“ (۲)

بیٹی کی پیدائش پر افسردگی کفر کا حصہ ہے

اللہ عزوجل نے مشرکوں کی ایک بری عادت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: اور جب ان میں سے کسی کو لڑکی کی خوشخبری دی جاتی ہے تو اس کا چہرہ سیاہ ہو جاتا ہے اور وہ غم سے بھرا ہوا

---

(۱) سورالشوری، ۴۹

(۲) التفسير القيم ص:۱۴۳۳ وتحفة المودود بأحكام المولود ص:۲۸

ہوتا ہے، اسے دی گئی بشارت کی وجہ سے لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے آیا ذلت کے باوجود اس کو اپنے پاس رکھ لے یا اسے مٹی میں ٹھونس دے، آگاہ رہو ان کا فیصلہ بڑا برا ہے۔ "واذا بشر احدھم بالانثی ظل وجھه مسودا وھو کظیم یتواری من القوم من سوء ما بشر به ایمسکه علی ھون ام یدسه فی التراب الا ساء مایحکمون" (۱)

ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا: اور جب ان میں سے کسی کو اس چیز کی خوشخبری دی جاتی ہے جس کی اس نے رحمان کے لئے مثال بیان کی ہے تو اس کا چہرہ سیاہ ہو جاتا ہے اور وہ غم سے بھرا ہوا ہوتا ہے۔ "واذا بشر احدھم بما ضرب للرحمن مثلاً ظل وجھه مسودا وھو کظیم" (۲)

زمانۂ جاہلیت کی ذہنیت ایسی تھی کہ ایک طرف فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں بھی مانتے تھے، یعنی "مقدس دیویوں" کا عقیدہ بھی ان میں پایا جاتا تھا اور دوسری طرف ان میں ہر ایک لڑکیوں کے باپ بننے کی ذلت کو برداشت کرنے کے لیے بھی تیار نہ تھا، اسی "فرضی تضاد" کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن میں پوچھا گیا ہے: کیا تمہارے رب نے تم کو بیٹوں کے ساتھ خاص کیا ہے اور خود فرشتوں کو اپنی بیٹیاں بنائی ہیں، بے شک تم بڑی سخت بات کہتے ہو۔ " افاصفکم ربکم بالبنین واتخذ من الملائکة اناثا انکم لتقولون قولا عظیما" (۳)

کہیں بیان کیا گیا ہے : یہ لوگ اللہ کے لئے بیٹیاں تجویز کرتے ہیں "سبحان اللہ" اللہ تعالی اس عیب سے پاک ہے اور اپنے لئے اپنی پسند کی چیز۔ "یجعلون للّٰہ البنات سبحانه ولھم مایشتھون" (۴)

---

(۱) النحل ۵۹،۵۸:
(۲) الزخرف: ۱۷
(۳) بنی اسرائیل: ۴۰
(۴) النحل: ۵۷

جاہلیت میں بچیوں کا بے رحمانہ قتل

لڑکی سے متعلق ایسی ذہنیت ہو تو کون سا تعجب ہے کہ اگر اکثر لوگ اس ذلت سے بچنے کے لئے بچیوں کو مار ڈالتے ہوں، اس سنگدلی کو قرآن نے یوں بیان کیا: اور جس وقت لڑکی سے جو زندہ درگور کردی گئی تھی پوچھا جائے کہ وہ کس قصور کے بدلے ماری ڈالی گئی۔ "واذا المو ءدۃ سئلت بای ذنب قتلت"(۱)

ذلت ورسوائی کے علاوہ معاشی دشواریوں کے غلط احساس کی وجہ سے بھی "قتل اولاد" کے مجرم بنے ہوئے تھے، جس سے منع کرتے ہوئے فرمایا: اپنی اولاد کو ناداری کی وجہ سے قتل نہ کرو، ہم تم کو بھی رزق دیتے ہیں اور ان کو بھی۔ "لاتقتلواا ولاد کم من املاق نحن نرقکم وایاھم"(۲)

اپنی اولاد کو ناداری کے اندیشہ سے قتل نہ کرو، کیوں کہ ہم ان کو بھی رزق دیتے ہیں اور تم کو بھی، بے شک ان کا قتل کرنا بڑا بھاری گناہ ہے۔ "ولا تقتلوا اولادکم خشیۃ املاق نحن نرزقھم وایاکم ان قتلھم کان خطئاً کبیرا"(۳)

اس غیر فطری حرکت کی وجہ سے عورتوں کی تعداد جاہلیت میں گھٹتے گھٹتے اس حد کو پہنچ گئی تھی جو حال ہندوستان کی بعض قوموں میں "دختر کشی" کی ظالمانہ رسم نے پیدا کردی ہے کہ بھاری بھاری قیمتیں ایک ایک عورت کی ان کو ادا کرنی پڑتی ہے، اور یوں "نسوانی وجود" کو ان میں بھی اہمیت حاصل ہو جاتی ہے، جیسے عرب جاہلیت کی بعض روایتوں سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ "بیوی" کو بڑی قدر کی نگاہ سے وہ دیکھتے تھے، لیکن اس کا مطلب وہی تھا کہ اس کے حاصل کرنے میں کافی قیمت مہر کی شکل صرف کرنی پڑتی ہے۔

---

(۱)التکویر: ۹۔۸

(۲)الانعام: ۱۵۱

(۳)بنی اسرائیل: ۳۱

بیٹی اور بیٹے دونوں کی ولادت پر مبارکباد دینا

امام ابن قیمؒ لکھتے ہیں: ''آدمی کے لئے جائز نہیں کہ بیٹے کی پیدائش پر مبارکباد دے اور بیٹی کی پیدائش پر مبارکباد نہ دے، بلکہ وہ یا تو دونوں کی پیدائش پر مبارکباد دے یا دونوں پر نہ دے، تاکہ وہ طریقۂ جاہلیت سے بچ جائے، کیونکہ ان کی اکثریت بیٹے کی پیدائش پر مبارکباد دیتی تھی اور بیٹی کی ولادت کی بجائے اس کی وفات پر مبارکباد دیتی تھیں۔'' (۱)

بیٹیوں کو ناپسند کرنے کی ممانعت

امام احمد اور امام طبرانیؒ نے حضرت عقبہ بن عامرؓ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بیٹیوں کو ناپسند نہ کرو، کیونکہ یقیناً وہ تو پیار کرنے والیاں اور قیمتی چیزیں ہیں۔ ''لاتکرهوا البنات فانهن المونسات الغاليات'' (۲)

معلوم ہوا کہ بیٹیوں کی پیدائش کو ناپسند نہ سمجھا جائے، بیٹوں کے مقابلہ میں ماں باپ سے بے حد محبت کرنے والی ہوتی ہے، ان سے نفرت کرنے والا ان کی قدر سے ناواقف شخص ہوگا۔

بیٹی کی پیدائش پر اجر و ثواب

رحمت عالم ﷺ نے فرمایا جو شخص دو لڑکیوں کی پرورش کرے یہاں تک کہ وہ سن بلوغ کو پہونچ جائیں تو قیامت میں میرے ساتھ ہوگا اور اتنا قریب ہوگا جتنی آپس میں یہ

---

(۱) علامہ ہیثمیؒ لکھتے ہیں کہ اس کو احمد اور طبرانی نے روایت کیا ہے اور اسمیں ایک راوی ابن لہیعہ ہیں اور ان کی روایت کردہ حدیث ''حسن'' ہوتی ہے اور اسکے بقیہ راویان ثقہ ہیں۔ (مجمع الزوائد کتاب البر والصلۃ باب ماجاء فی الاولاد ۸/۱۵۶)

(۲) المعجم الکبیر، حدیث نمبر: ۸۵۶)

انگلیاں نزدیک ہیں اور آپ نے اپنی انگلیوں کو ملا کر اشارہ فرمایا۔(۱)

امام بخاریؒ اور ابن ماجہؒ نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کوئی شخص ایسا نہیں ہے کہ اس کے ہاں دو بیٹیاں ہوں اور وہ اس کے ساتھ احسان کرتا رہے تو وہ بھی ان شاء اللہ تعالیٰ اسے جنت میں داخل کروادے گی۔ "ما من رجل تدرک له ابنتان فیحسن الیهما، ماصحبتاه او صحبهما الا دخلتاه الجنة"(۲)

امام احمدؒ نے حضرت جابرؓ سے روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس شخص کی تین بیٹیاں ہوں، وہ انہیں جگہ مہیا کردے، ان پر شفقت کرے، اور ان کی کفالت کرے، تو یقینی طور پر اس کے لئے جنت واجب ہوجاتی ہے۔ "من کن له ثلاث بنات یوویهن ویرحمهن ویکفلهن وجبت له الجنة البتة"(۳)

حضرت جابرؓ نے بیان کیا: عرض کیا گیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پس اگر وہ دو ہوں؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا "وان کانت اثنتین" اگرچہ وہ دو ہوں، حضرت جابرؓ کا بیان ہے کہ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا جاتا کہ اگر ایک ہو تو؟ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یقیناً جواب میں فرمادیتے" اگرچہ ایک ہی ہو۔ "فرآی بعض القوم ان لو قالوا له: "واحدة" لقال: "واحدة" (۴)

☆ حضرت انس بن مالکؓ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد مبارک نقل کرتے ہیں کہ جو شخص

---

(۱) مسلم، کتاب البر والصلۃ والآداب، باب فضل الاحسان الی البنات، رقم الحدیث: ۱۴۹

(۲) الادب المفرد باب من عال جاریتین او واحدة رقم الحدیث ۷۷ ص ۴۳، سنن ابن ماجہ ابواب الآداب، باب برالوالد والاحسان الی البنات رقم الحدیث ۳۷۱۴:

(۳) فتح الباری ۱۰/ ۴۲۸

(۴) المسند، رقم الحدیث: ۱۴۲۴۷، علامہ ہیثمیؒ نے اس کی سند کو جید قرار دیا ہے۔(مجمع الزوائد ۸/ ۱۵۷

بازار سے اپنے بچوں کے لئے کوئی چیز لاتا ہے وہ یوں ہے جیسے کوئی صدقہ کے لئے کچھ اٹھالائے حتیٰ کہ انہیں کھلادیتا ہے مناسب ہے کہ تقسیم کرتے وقت بچیوں کو پہلے دے کہ بچیوں پر اللہ تعالیٰ کی خاص شفقت ہے اور جو کوئی بچیوں پر شفقت کرتا ہے وہ اللہ کے خوف سے رونے والے کی مانند ہے اور جو کوئی اللہ کے خوف سے روتا ہے اس کی مغفرت ہوجاتی ہے اور جو کوئی بچیوں کو خوش کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے غم کے دن خوش کریں گے۔

بیٹی کی پیدائش انعامِ خصوصی ہے

(۱) معجم صغیر کی روایت ہے آپ ﷺ نے فرمایا کہ : جس کسی کے یہاں بیٹی پیدا ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے پاس فرشتے بھیجتے ہیں، وہ فرشتے گھر والوں سے کہتے ہیں ''اے گھر والو! تم پر سلامتی ہو پھر اس بچی کو فرشتے اپنے پروں سے ڈھانک لیتے ہیں اور اپنے نورانی ہاتھوں کو اس کے سر پر پھیرتے ہیں اور کہتے ہیں : ایک کمزور جان ہے جو کمزور جان سے نکلی ہے، قیامت تک اس کے کفیل کی مدد کی جائے گی۔(۱)

(۲) مجمع الزوائد کی روایت ہے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ'' جب کسی کے ہاں لڑکی پیدا ہوتی ہے تو اللہ عَزَّ وَجَلَّ اس کے گھر فرشتوں کو بھیجتا ہے جو آ کر کہتے ہیں : ''اے گھر والو! تم پر سلامتی ہو۔'' پھر فرشتے اس بچی کو اپنے پروں کے سائے میں لے لیتے ہیں اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ ایک ناتواں وکمزور جان ہے جو ایک ناتواں سے پیدا ہوئی ہے، جو شخص اس ناتواں جان کی پرورش کی ذمہ داری لے گا تو قیامت تک مددِ خدا اس کے شامل حال رہے گی۔''(۲)

(۳) مسند الفردوس کی روایت ہے آقا ﷺ فرماتے ہیں کہ'' بیٹیوں کو بُرا مت کہو ،میں بھی بیٹیوں والا ہوں ،بے شک بیٹیاں تو بہت محبت کرنے والیاں ،غمگسار اور بہت

---

(۱) المعجم الصغیر للطبرانی : حدیث ۷۰ :

(۲) مجمع الزوائد، کتاب البر والصلۃ، باب ماجاء فی الاولاد، ۸ / ۲۸۵، حدیث ۱۳۴۸۴ :

زیادہ مہربان ہوتی ہیں۔"(۱)

(۴) ایک حدیث میں ہے کہ بیٹی جنت کی ضمانت ہے چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا:

جس کے ہاں بیٹی پیدا ہو اور وہ اسے اِیذاء نہ دے اور نہ ہی بُرا جانے اور نہ بیٹے کو بیٹی پر فضیلت دے تو اس شخص کو جنت میں داخل فرمائے گا۔"(۲)

ایک اور حدیث میں ہے "جس شخص پر بیٹیوں کی پرورش کا بار پڑ جائے اور وہ ان کے ساتھ حسنِ سلوک کرے تو یہ بیٹیاں اس کے لئے جہنّم سے روک بن جائیں گی۔"(۳)

بیٹیوں پر آپ کا یہی کرم تھا کہ جب پہلی مرتبہ مدینہ منورہ میں داخل ہوئے تو خواتین اور بچیاں استقبال کے لئے باہر آ گئیں اور خوشی کے ترانے گانے لگیں، مدینہ منورہ میں حضور انور ﷺ کے مستقل قیام سے ان کو کتنی خوشی تھی، اس کا اندازہ اس شعر سے لگایا جاسکتا ہے۔

نحن جوارین من بنی نجار یا حبذا محمد من جار

لڑکیوں سے محبت کا مدنی واقعہ

حضرت عائشہ صدیقہؓ ایک دفعہ کا واقعہ بیان کرتی ہیں کہ: جمیلہ نامی ایک غریب عورت آئی اس کے ساتھ اس کی دو بچیاں بھی تھیں، اس مرتبہ میں نے اس عورت کو تین کھجوریں دیں، اس ممتا بھری ماں نے ایک ایک کھجور دونوں لڑکیوں کو دی اور تیسری خود کھانے کے لئے اٹھائی، منہ تک لا چکی تھی کہ دونوں لڑکیوں نے پھر مانگا، اس عورت نے خود نہ کھائی اور اس کھجور کے دو ٹکڑے کیے جسے خود کھانا چاہ رہی تھی اور آدھی آدھی کھجور دونوں لڑکیوں کو دے دی، حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ اس کی یہ ادا مجھے بہت بھائی، رحمت عالم ﷺ تشریف لائے تو میں نے ممتا کی ماری ماں کا یہ اثر انگیز قصہ آپ ﷺ سے بیان کیا آپ ﷺ نے

---

(۱) مسند الفردوس للدیلمی، ۲ / ۴۱۵، حدیث: ۷۵۵۶

(۲) المستدرک للحاکم، کتاب البر والصلۃ، ۵ / ۲۴۸، حدیث: ۷۴۲۸

(۳) مسلم، کتاب البر والصلۃ، باب فضل الاحسان الی البنات، ص ۱۴۱۴، حدیث: ۲۶۲۹

فرمایا: ان کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس عورت کے لیے جنت واجب کردی اور ان بچیوں کی وجہ سے اسے دوزخ سے آزاد کردیا۔ ''ان اللّٰہ قد اوجب لھا بھا الجنۃ و اعتقھا بھا من النار''(۱)

آنحضرت ﷺ دنیا سے رخصت ہوتے وقت فرمایا لوگو! خبردار ہوجاؤ، میں تم کو دو کمزوروں کے حقوق کی تاکید کرتا ہوں اور اس میں کوتاہی کرنے سے ڈراتا ہوں، ایک یتیم اور دوسرے عورت۔(۲)

آپ ﷺ کے یہ فرامین عورتوں کی ناموس، ان کی عزت وعفت حفاظت کی خاطر تھے، سماج میں وہی مقام ان کو دلایا جائے جس کی قدرتی طور پر صنف نازک مستحق تھی، جب بیٹی کی عظمت پیدا فرمائی تو رحمت عالم ﷺ سے لوگ آکر اپنا ظلم بیان کرنے لگے کہ ''جاہلیت میں میں نے دس لڑکیاں اپنے ہاتھوں سے زندہ دفن کی ہیں''۔کسی نے کہا میں نے اپنی بچی کو بلایا، وہ ہنستی دوڑتی میرے پاس آئی، اور جب ایک کنویں کے پاس پہنچی تو میں نے ہاتھ پکڑ کر کنویں میں ڈال دیا، وہ میرے ابا میرے ابا پکارتی رہی''۔ یہ سن کر رحمت عالم ﷺ اتنا روئے کہ ریش مبارک تر ہوگئی۔

امام بغویؒ کہتے ہیں عرب میں یہ رواج عام تھا کہ جب کسی کے گھر میں بیٹی پیدا ہوتی اور وہ اسے زندہ باقی رکھنا چاہتا تو اسے اونی جبہ پہنا کر اونٹوں اور بکریوں کو چرانے کیلئے دور دراز بھیج دیتا اور اگر اسے مارنا چاہتا تو وہ جب ۶/سال کی ہوجاتی تو کسی جنگل میں ایک گڑھا کھودتا، پھر گھر آکر اپنی بیوی سے کہتا کہ اسے خوب اچھا لباس پہنا دو تا کہ وہ اسے اس کے ننھیال (یا اس کے دادا دادی) سے ملا لائے، پھر جب اس گڑھے تک پہنچتا تو اسے کہتا:

---

(۱) صحیح بخاری جلد ا حدیث نمبر ۱۳۳۳ :مسلم، کتاب البر والصلۃ والآداب، باب فضل الاحسان الی البنات، رقم الحدیث: ۱۴۸
(۲) ریاض الصالحین: ۱۴۷۔

اس گڑھے کے اندر دیکھو، چنانچہ وہ اسے دیکھنے کیلئے جھکتی تو یہ اسے پیچھے سے دھکا دے دیتا وہ اس میں گر جاتی اور یہ اس کے اوپر مٹی ڈال دیتا۔(۱)

یہی وہ گواہیاں ہیں جو ثابت کرتی ہیں کہ جہاں کے ہادی محمد رسول اللہ ﷺ مردوں ہی کے نہیں بلکہ عورتوں کے بھی پیغمبر اور رسول ہیں، مردوں ہی کے لیے نہیں روتے تھے بلکہ عورتوں کی مظلومیت بھی آپ ﷺ کو رلا دیتی تھی۔

اللہ ہم سب کا خیر خواہ ہے

ارشادِ خداوندی ہے: آسمانوں اور زمین کی سلطنت اللہ تعالیٰ ہی کی ہے، جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے، جس کو چاہتا ہے بیٹیاں عطا کرتا ہے اور جس کو چاہتا ہے بیٹے عنایت کرتا ہے یا بیٹے اور بیٹیاں دونوں قسم کی اولاد دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے بانجھ بنا دیتا ہے، بے شک وہ جاننے والا قدرت والا ہے۔ **"للہ ملک السمٰوٰت و الارض یخلق مایشاء یھب لمن یشاء اناثا و یھب لمن یشاء الذکور اویزوجھم ذکرانا و اناثا و یجعل من یشاء عقیما انہ علیم قدیر"**۔(۲)

بچی کی پیدائش پر ناک بھوں چڑھانے کی ضرورت اور منھ بگاڑنے کا کیا حاصل؟ یہ تو انسان کی خام عقلی ہے کہ رحمت کو اس نے اپنے لئے زحمت خیال کر رکھا ہے، اگر یہ بچیاں بڑھ کر عورت نہ بنیں اور تمہاری شادیاں نہ ہوں تو بتاؤ یہ بچے یہ تنومند لڑنے والے جوان کہاں سے آئیں، حضرت مریم علیہا السلام کی ماں نے جب منت مانی اور ان کے خلافِ توقع لڑکے کی جگہ لڑکی پیدا ہوئی تو حسرت سے کہنے لگیں:

"قالت رب انی وضعتھا انثی"(۳) اے پروردگار میں نے تو وہ حمل کی لڑکی جنی

---

(۱) معالم التنزیل: ۲۵/۵۔

(۲) الشوریٰ: ۴۹، ۵۰

(۳) آل عمران: ۳۶

، پروردگار! یہ تو میری بچی ہوئی، میری مراد نہ برآئی، جس مقدس کام کی منت مانی تھی اس میں تو لڑکے کا کام تھا، لڑکی قبول نہیں کی جاتی، رب العالمین نے ام مریم کی یہ حسرت بھری آواز سنی تو فرمایا: اس کو اللہ تعالیٰ زیادہ جانتے ہیں جو انہوں نے جنی اور لڑکا اس لڑکی کے برابر نہیں ہوسکتا تھا۔ "واللہ اعلم بما وضعت ولیس الذکر کالانثیٰ"(۱)

اللہ تعالیٰ تم سے زیادہ علم رکھتا ہے اور وہ اپنے علم کے مطابق جانتا ہے کہ اس لڑکی کے برابر لڑکا نہیں ہوسکتا ہے، جو خیر و برکت اور خاندانی اعزاز اس لڑکی کو حاصل ہوگا، لڑکے سے نہیں ہوسکتا تھا، تم نے اپنی انسانی روش سے سوچا اور گھبرا گئیں، رب العالمین جو کام اس لڑکی کے ذریعہ لینے والا ہے وہاں تک تمہاری رسائی نہ ہوسکی۔

مستقبل نے بتایا کہ مریم علیہا السلام کا وجود خود ام مریم کے اعزاز کے لئے اور دنیا کی فلاح اور نجات کے لیے کتنا مبارک وجود ثابت ہوا، انہی مریم رضی اللہ عنہا سے عیسیٰ روح اللہ علیہ السلام نے جنم لیا اور بالآخر دنیا کو حق کا پیغام سنایا اور کتنوں کی نجات کا باعث ہوئے حیرت ہوتی ہے کہ مسیح علیہ السلام کو جنم دینے والی عورت مسیح پر ایمان لانے والوں کی نگاہوں میں شیطان کے آنے کا راستہ، ناگزیر برائی وغیرہ وغیرہ کیسے ہوگئی؟

سات بیٹیوں کی برکت : اور جہنم سے خلاصی

تاریخ میں ایک دلچسپ واقعہ ملتا ہے وہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ ایک شخص کے ہاں صرف بیٹیاں تھیں ہر مرتبہ اس کو امید ہوتی کہ اب تو بیٹا پیدا ہوگا مگر ہر بار بیٹی ہی پیدا ہوتی اس طرح اس کے ہاں یکے بعد دیگرے چھ بیٹیاں ہوگئیں اس کی بیوی کے ہاں پھر ولادت متوقع تھی وہ ڈر رہا تھا کہ کہیں پھر لڑکی پیدا نہ ہوجائے شیطان نے اس کو بہکایا چنانچہ اس نے ارداہ کرلیا کہ اب بھی لڑکی پیدا ہوئی تو وہ اپنی بیوی کو طلاق دیدے گا، اس کی کج فہمی

(۱) آل عمران: ۳۶

پرغور کریں بھلا اس میں بیوی کا کیا قصور، رات کو سویا تو اس نے عجیب وغریب خواب دیکھا اس نے دیکھا کہ قیامت برپا ہو چکی ہے اس کے گناہ بہت زیادہ ہیں جن کے سبب اس پر جہنم واجب ہو چکی ہے، مگر ہر دروازے پر اس کی کوئی نہ کوئی بیٹی رکاوٹ بنتی چلی گئی، اب ساتواں دروازہ باقی تھا فرشتے اس کو لے کر اس دروازے کی طرف چل دیئے اس پر گھبراہٹ طاری ہوئی کہ اس دروازے پر میرے لئے رکاوٹ کون بنے گا اسے معلوم ہو گیا کہ جو نیت اس نے کی تھی غلط تھی وہ شیطان کے بہکاوے میں آ گیا تھا، انتہائی پریشانی اور خوف ودہشت کے عالم میں اس کی آنکھ کھل چکی تھی اور اس نے رب العزت کے حضور اپنے ہاتھوں کو بلند کیا اور دعا کی۔ ''اللهم ارزقنا السابعة'' اے اللہ مجھے ساتویں بیٹی عطا فرما(۱) اس لئے جن لوگوں کا قضاوقدر پر ایمان ہے انہیں لڑکیوں کی پیدائش پر رنجیدہ خاطر ہونے کی بجائے خوش ہونا چاہئیے، ایمان کی کمزوری کے سبب جن بدعقیدہ لوگوں کا یہ تصور بن چکا ہے کہ لڑکیوں کی پیدائش کا سبب ان کی بیویاں ہیں، یہ سراسر غلط ہے، اس میں بیویوں کا یا خود ان کا کوئی عمل دخل نہیں بلکہ میاں بیوی تو صرف ایک ذریعہ ہیں پیدا کرنے والی ہستی تو صرف اللہ وحدہ لاشریک لہ ہے، وہی جس کو چاہتا ہے لڑکا دیتا ہے جس کو چاہتا ہے لڑکی دیتا ہے جس کو چاہتا ہے لڑکے اور لڑکیاں ملا کر دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے بانجھ بنا دیتا ہے ایسی صورت میں ہر مسلمان پر واجب ہے اللہ تعالی کی قضاوقدر پر راضی ہو اللہ تعالی نے سورہ شوری میں ارشاد فرمایا ہے؛ ''لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ يَهَبُ لِمَنْ يَشَاءُ إِنَاثًا وَيَهَبُ لِمَنْ يَشَاءُ الذُّكُورَ أَوْ يُزَوِّجُهُمْ ذُكْرَانًا وَإِنَاثًا وَيَجْعَلُ مَنْ يَشَاءُ عَقِيمًا إِنَّهُ عَلِيمٌ قَدِيرٌ''(۲)

زمانہ جاہلیت کا دردناک قصہ

---

(۱) بکھرے موتی

(۲) سورۃ الشوری: ۴۹

آپ ﷺ نے اپنے صحابی کو غمگین دیکھا تو ان سے ان کا حال دریافت کیا، انہوں نے کہا، مجھ سے زمانہ جاہلیت میں گناہ سرزد ہو گیا ہے، اسی خوف سے غمگین رہتا ہوں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : تم اپنا گناہ بتاؤ، انہوں نے پورا واقعہ سنایا کہ میری ایک خوبصورت بچی تھی اور جب وہ بڑی ہوئی تو اس کی شادی کے پیغامات آنے لگے تو میری غیرت نے جوش مارا، لہٰذا میں نے اپنی بیوی سے کہا کہ میں فلاں قبیلہ میں اپنے رشتہ داروں سے ملنے جارہا ہوں، بچی کو بھی میرے ساتھ جانے کے لئے تیار کردو۔ شوہر کی خواہش پر انہوں نے بچی کو اچھے عمدہ لباس پہنا دیے اور اس کو ساتھ لے کر چلا کہ راستے میں ایک کنواں دکھائی دیا، میں اپنی بچی کو اس کنویں میں ڈالنے لگا تو بچی نے مجھے پکار پکار کر کہا کہ میرے بابا مجھے اس کنویں میں اکیلے چھوڑ کر کیوں جارہے ہو؟ کیا میں تمہاری پیاری بیٹی نہیں ہوں؟ یہ میرے کس جرم کی سزا ہے؟ بچی کی ان باتوں سے میرا دل دہل گیا، محبت پدری غالب آگئی، میں نے اسے کنویں سے نکال لیا لیکن پھر مجھ پر شیطان نے غلبہ کیا اور دوبارہ میں نے اسے اسی کنویں میں ڈال کر ہمیشہ کے لئے موت کی نیند سلا دیا۔ جب نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دلخراش انسانیت سوز واقعہ کو سنا تو آپ کو سخت صدمہ ہوا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس قدر روئے کہ آپ کی داڑھی مبارک تر ہوگئی، آپ نے انتہائی غضب کے عالم میں فرمایا : اگر زمانہ جاہلیت کے کاموں پر سزا دیتا تو یقیناً تم کو سزا دیتا، لیکن اسلام سے ماقبل کے تمام گناہ معاف ہیں اس لئے تم اس گناہ سے بری ہو۔

بیٹی کو زندہ دفن کرنے کی کوشش

زمانہ جاہلیت میں بچیوں کو زندہ دفن کردینے کی رسم سن کر اس وقت کے ظالم معاشرے کا عجیب تصور ذہن میں ابھرتا ہے لیکن اس جدید دور میں بھی ایسے واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں اور اسی طرح کا ایک واقعہ بھارت میں سامنے آیا جہاں ظالم باپ نے بچی کو زندہ دفنانے کی کوشش کی، بھارتی ریاست ترپپورہ کے ضلع سپاہیجالہ کے دیہات پوتیا میں

جہاں ایک شخص نے اپنی ۹ سالہ بیٹی کے ہاتھ باندھے اور منہ پر ٹیپ لگا کر کر اسے اپنے گھر کے صحن میں لے گیا جہاں اس نے بچی کو بٹھایا اور اس کو دفنانے کے لیے گڑھا کھودنے لگا، بچی کو دفن کرنے کے لیے گڑھا کھودنے کی آواز سے اس کے پڑوسی کی آنکھ کھل گئی اور اس نے دیہات کے دیگر لوگوں کو جگانے کے لیے الارم بجادیا اور لوگ جمع ہو کر اس شخص کے گھر پہنچ گئے جہاں وہ اپنی بیٹی کو سینے تک دفن کر چکا تھا، لوگوں نے بچی کو زمین سے نکالا اور اسے فوری طور پر اسپتال پہنچایا، تاہم ڈاکٹرز کا کہنا ہے کہ بچی تشویشناک حالت میں ہے۔(۱)

قیس بن عاصم رضی اللہ عنہ کا قصہ

روایت ہے کہ ایک صحابی قیس بن عاصم رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آئے اور عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! میں نے اپنے ایام جاہلیت میں آٹھ بیٹیاں زندہ دفنائی ہے (میرے بارے میں اب کیا حکم ہے؟) فرمایا کہ تم کفارہ کے طور پر ان میں سے ہر ایک کے بدلے ایک اونٹ کی قربانی پیش کرو۔ دوسری روایت میں ہے کہ انہوں نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! میں نے اپنے زمانہ جاہلیت میں بارہ بیٹیاں (اور ایک روایت کے مطابق تیرہ) زندہ دفن کی ہے آپ نے فرمایا اتنی ہی جان آزاد کرو، تو انہوں نے بارہ یا تیرہ غلام آزاد کیئے، اگلے سال وہ سو اونٹ لے کر آئے اور عرض کیا کہ میری قوم کا مسلمانوں کے تئیں جو رویہ تھا اس کے بدلہ انہوں نے یہ سو اونٹ دیئے ہیں (آپ انہیں قبول فرمالیجئے) حضرت علی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ان اونٹوں کی دیکھ ریکھ کی ذمہ داری ہماری تھی ہم انہیں ''قیسیہ'' کہا کرتے تھے۔(اسد الغابۃ ۴ :/ ۴۳۲)

قیس کوئی معمولی آدمی نہ تھے، قبیلہ تمیم کے سردار تھے ۹ ھ میں ایک وفد کے ساتھ آپ

---

(۱) ایکسپریس اردو، ویب ڈیسک، ہفتہ 17 جنوری 2015ء۔

کی خدمت میں حاضر ہو کر مشرف بہ اسلام ہوئے، آپ نے انہیں دیکھتے ہی فرمایا تھا یہ دیہاتیوں کو سردار آرہا ہے بڑے ہی عقلمند، سنجیدہ اور صابر انسان تھے، ایام جاہلیت میں انہوں نے اپنے اوپر شراب حرام کر رکھی تھی۔ احنف بن قیس جن کا صبر وتحمل ضرب المثل ہے، ان سے پوچھا گیا کہ تم نے صبر کس سے سیکھی؟ کہا کہ قیس بن عاصم سے، ایک دن میں نے انہیں اپنے گھر کے صحن میں بیٹھے ہوئے دیکھا اس حال میں کہ تلوار پر تلے سے خود کو لپیٹے ہوئے قوم سے مخاطب تھے، اسی دوران ان کے پاس ایک مقتول اور اس کا قاتل، جس کی مشکیں کسی ہوئی تھیں، لیا گیا انہیں بتایا گیا کہ یہ تیرا بھتیجا ہے جس نے تیرے بیٹے کو قتل کر دیا ہے، احنف کہتے ہیں قسم بخدا نہ تو انہوں نے اپنی نشست کا انداز ہ بدلا نہ ہی سلسلہ کلام توڑا، جب پوری بات کہہ چکے تو بھتیجے کی طرف متوجہ ہوئے اور کہا کہ بیٹے! تم نے بہت برا کیا، پروردگار کی نافرمانی کی، رشتے کا تقدس پامال کیا، اپنے بھائی کو مار کر تو نے گویا اسے ہی تیر سے خود کو ہلاک کیا اور اپنی تعداد میں کمی کی، پھر اپنے ایک بیٹے کو حکم دیا کہ اٹھو اس کی مشکیں کھول دو، اپنے بھائی کو دفنا آؤ، اور اپنی ماں کے پاس سو اونٹ بطور دیت لے جاؤ کیوں کہ وہ پردیسی ہے، قیس نے اپنے پیچھے بتیس نرینہ اولاد چھوڑی، اور موت کے وقت یہ نصیحت کر گئے کہ ان پر نوحہ نہ کیا جائے کیوں کہ رسول ﷺ پہ نوحہ نہیں کیا گیا تھا، ان کے بارے میں بہت ساری روایات ہیں جن سے ان کی فضیلت و عظمت کا پتہ چلتا ہے۔ جب زمانہ جاہلیت کے عقلمند اور دانا سرداروں کی یہ بات ہے تو پھر کم عقل، جاہل اور عام لوگوں کا اپنی بیٹیوں کے ساتھ کیا رویہ رہا ہوگا؟ اسے آپ بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔

ہم اپنی ذمہ داری نہ بھولیں

لڑکیوں کی حفاظت کی فکر صرف حکومت یا اقوام متحدہ یا غیر سرکاری تنظیموں کی نہیں بلکہ یہ ہر اس ہندوستانی کو ہونی چاہئے جو ملک کی ترقی اور بہبود کے لئے کوشاں ہے، ہم اس بات کو یقینی بنانے کے لئے کیا کر رہے ہیں ہم جانتے ہیں کہ ہر لڑکی ہماری بیٹی، کیا ہم ایسی

شادیوں میں حصہ لینے سے انکار کرتے ہیں جہاں جہاں جہیز لیا دیا جارہا ہے؟ جب لڑکے بس اسٹاپ پر ایک لڑکی کو سیٹی مارتے، اس کا پیچھا اور ہراساں کرتے تو کیا ہم مداخلت کرتے ہیں؟ حکومت کا کردار اہم، لازمی ہے مگر کافی نہیں، لڑکوں اور لڑکیوں کے حقوق حاصل کرنے کے لئے، ہم اپنی زندگیوں میں ہر چھوٹے فیصلہ میں جرات مندانہ اقدام کررہے ہیں؟

اسلام میں خواتین کی تعلیم کی اہمیت

[۲] اسلام ایک عالمگیر مذہب ہے، اس کی تہذیب وتمدن، اس کے نظم ونسق، قوانین وضوابط اور طریقہ تعلیم وتربیت سرمدی وآفاقی ہے، یہی وجہ ہے کہ اسلام ہمیشہ سے جہالت وناخواندگی اور آوارگی کا کھلا دشمن اور علم ومعرفت، شائستگی اور آراستگی کا روز ازل سے ایک مخلص ساتھی اور دوست رہا ہے، انسانیت کو بغیر کسی تفریق مرد وزن لفظ ''اقراء'' سے مخاطب کیا اور "فاعلم انه لا اله الا الله" (۱) یعنی ایمان لانے سے پہلے علم ومعرفت کی اہمیت وافادیت کو اجاگر کیا اور "قل هل يستوی الذين يعلمون والذين لا يعلمون" (۲) جیسے پرکشش وپرشکوہ نصوص سے عالم وجاہل کے مابین ہمسری کی نفی کردی، نیز "يرفع الله الذين آمنوا منكم والذين اوتوا العلم درجات" (۳) اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے "نضر الله امرءا سمع مقالتی فوعاها ثم اداها الی من لم يسمعها" (۴) جیسے قیمتی اور بیش بہا فرمودات سے حصول علم کی ترغیب دی ہے، ابن ماجہ کی ایک روایت ہے کہ: تمام

---

(۱) سورۂ محمد آیت: ۱۹

(۲) سورۂ زمر آیت: ۹

(۳) سورۂ مجادلہ آیت: ۱۱

(۴) مسند احمد حدیث جبیر بن مطعم حدیث ۱۶۷۵۴:

مسلمانوں پر علم دین حاصل کرنا فرض ہے "**طلب العلم فریضة علی کل مسلم**"(۱)
اس حدیث میں آپؐ نے "مسلم" کا لفظ استعمال فرمایا ہے، جس سے مراد مسلم انسان ہے خواہ مرد ہو یا عورت، دونوں کے لئے حکم ہے اور اس پر علماء امت کا اجماع ہے۔

عورت انسانی معاشرہ کا وہ اہم عنصر ہے جس کے بغیر معاشرہ وسماج کا تصور ہی ممکن نہیں، عورت انسانی ترقی کا زینہ اور اجتماعی زندگی کی روح ہے، عورت عالم انسانی کی بقا اور اس کے تحفظ کی ضامن ہے، نیز کائنات گل گلزار کی محافظ ہے۔ "یا ایھا الناس انا خلقنا کم من ذکر و انثی و جعلنا کم شعوبا و قبائل لتعارفوا" (۲) عورت افزائش نسل اور اولاد کی تعلیم وتربیت کی اعلی ذمہ دار ہے، اس کی گود جہاں ایک طرف شیر خوار بچوں کی جائے پرورش ہے، وہیں دوسری طرف اس کی آغوش تعلیم وتربیت کا گہوارہ ہے، عورت روئے زمین پر اللہ کی نشانی بن کر آئی اور رہتی دنیا تک اس چمن کی عزت اور آبرو بنی رہے گی، ارشاد باری تعالی ہے :"ومن آیاته ان خلق لکم من انفسکم ازواجا لتسکنوا الیھا و جعل بینکم مودۃ ورحمة" (۳) عورت ناقص العقل تو ہے لیکن تعلیم وتعلم سے کوری نہیں، عورت ناقص الدین تو ہے مگر عبادت سے مرفوع القلم نہیں، عورت پردہ کی پابند ضرور ہے لیکن غزوات جہاد میں شرکت کی مستحق بھی ہے۔

جہاں جہاں علم حاصل کرنے کی ترغیب دی گئی ہے وہاں مذکر کا صیغہ استعمال ہوا ہے جب مذکر صیغہ بولا جاتا ہے تو اس میں دونوں شامل ہوتے ہیں، عربی میں اس کو 'تغلیب' کہا جاتا ہے، یعنی غالب چوں کہ مرد ہیں اس لیے ان کو خطاب کیا جاتا ہے، مگر طبقہ نسواں بھی اس میں شامل ہو جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ جب کبھی کوئی قرآنی آیت نازل ہوتی یا کوئی نیا

---

(۱) ابن ماجہ باب فضل العلماء والحث علی طلب العلم حدیث: ۲۲۴، یہ تلقی بالقبول کی وجہ سے صحیح حدیث ہے

(۲) سورۃ الحجرات آیت: ۱۳

(۳) سورۃ الروم آیت: ۲۱

حکم آتا تو آپ پہلے اسے مردوں کی جماعت میں تلاوت فرماتے اور پھر اسے عورتوں کی محفل میں جا کر سناتے ،بقول ڈاکٹر حمید اللہ: ”اسلامی تاریخ میں یہ ایک اہم واقعہ ہے کہ رسول اللہ کو صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عورتوں کی تعلیم سے اتنی ہی دل چسپی تھی جتنی مردوں کی تعلیم سے ۔(۱)

تعلیم پر کسی کی اجارہ داری نہیں

اسلامی نقطۂ نگاہ سے علم پر کسی کی اجارہ داری نہیں ہے،علم صرف مردوں کی ملکیت نہیں ہے بلکہ خواتین کا بھی حق ہے ، اسلئے کہ قرآن کریم اور حدیث شریف میں علم اور اہل علم کی فضیلت پر دلالت کرنے والی نصوص عام ہیں جو مردوں اور عورتوں سب کو شامل ہیں، اور یہ علماء اسلام کے نزدیک ایک اتفاقی مسئلہ ہے،ابن حزمؒ رقمطراز ہیں : ہر عورت پر ان اسلامی احکام کا علم حاصل کرنا فرض ہے، جو اسکے ساتھ مخصوص ہوں ،جس طرح یہ علم مردوں پر فرض ہے، چنانچہ مالدار خاتون پر زکوۃ کے احکام جاننا فرض ہے،تمام خواتین پر طہارت، نماز اور روزے کے احکام جاننا فرض ہے، مردوں کی طرح ان پر بھی فرض ہے کہ کھانے، پینے اور پوشاک وغیرہ میں حلال اور حرام کو جانیں ، اور اگر کوئی خاتون شرعی علوم میں مہارت پیدا کرلے، اور فقیہ بن جائے تو اس کی خبر کا قبول کرنا ہم پر لازم ہو جائے گا،اور گذشتہ ادوار میں ایسا ہی ہوا ہے، چنانچہ نبی کریمؐ کی شریک حیات خواتین سے دین کے احکام نقل کئے گئے ان کے نقل کرنے کے ذریعے حجت قائم ہوئی ، ازواجِ مطہرات کے علاوہ بھی بہت سی خواتین شرعی علوم کی ماہر تھیں ،مثلاً: ام سلیم، ام حرام، ام عطیہ، ام کرز، ام شریک، ام درداء، ام خالد، اسماء بنت ابی بکر، فاطمہ بنت قیس ارو بسرہ وغیرہن، پھر تابعین میں عمرۃ، ام الحسن ، رباب، فاطمۃ بنت منذر، ہند فراسیہ، حبیبہ بنت بسرہ، حفصہ بنت سیرین، اور ان کے علاوہ دیگر خواتین“۔

---

(۱) خطبات بھاول پور: ۲۸

خواتین کی تعلیم آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نظر میں

انسان کی ترقی کا دارومدار علم پر ہے کوئی بھی شخص یا قوم بغیر علم کے زندگی کی تگ ودو میں پیچھے رہ جاتا ہے، اور اپنی کُند ذہنی کی وجہ سے زندگی کے مراحل میں زیادہ آگے نہیں سوچ سکتا اور نہ ہی مادی ترقی کا کوئی امکان نظر آتا ہے؛ لیکن اس کے باوجود تاریخ کا ایک طویل عرصہ ایسا گزرا ہے جس میں عورت کے لیے علم کی ضرورت واہمیت کو نظرانداز کیا گیا اور اس کی ضرورت صرف مردوں کے لیے سمجھی گئی اور ان میں بھی جو خاص طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں صرف وہی علم حاصل کرتے تھے اور عورت علم سے بہت دور جہالت کی زندگی بسر کرتی تھی۔

لیکن اسلام نے علم کو فرض قرار دیا اور مرد وعورت دونوں کے لیے اس کے دروازے کھولے اور جو بھی اس راہ میں رکاوٹ و پابندیاں تھیں، سب کو ختم کر دیا، اسلام نے لڑکیوں کی تعلیم وتربیت کی طرف خاص توجہ دلائی اور اس کی ترغیب دی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

ثلاثة لهم اجران: رجل من اهل الكتاب أمن بنبيه، وأمن بمحمد، والعبد المملوک اذا ادیٰ حق الله و حق مواليه، ورجل له امة، فادبها فاحسن تاديبها، وعلمها فاحسن تعليمها، ثم اعتقها، فتزوجها فله اجران (۱) اس حدیث کے آخری جز کی شرح میں ملا علی قاری لکھتے ہیں: یہ حکم صرف باندی کے لیے نہیں؛ بلکہ اپنی اولاد اور عام لڑکیوں کے لیے بھی یہی حکم ہے۔ (۲)

(۲) ایک صحابیہ حضرت شفاء بنت عدویہؓ تعلیم یافتہ خاتون تھیں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان سے فرمایا کہ تم نے جس طرح حفصہ کو نملہ (پھوڑے) کا رقیہ سکھایا ہے، اسی طرح لکھنا بھی سکھا دو۔

---

(۱) صحيح بخاري بَابُ تَعْلِيمِ الرَّجُلِ أَمَتَهُ وَأَهْلَهُ حديث: ۹۷

(۲) " بِخِلَافِ التَّأْدِيبِ وَالتَّعْلِيمِ، فَإِنَّهُمَا مُوجِبَانِ لِلْأَجْرِ فِي الْأَجْنَبِيِّ وَالْأَوْلَادِ، وَجَمِيعُ النَّاسِ فَلَا يَكُونُ مُخْتَصًّا بِالْإِمَاءِ (مرقاة المفاتيح كتاب الايمان ج۱ ص۷۸)

(۳) نبی اکرم ﷺ خود بھی عورتوں کی تعلیم کا اہتمام فرماتے تھے اور انکی خواہش پر آپ ﷺ نے باضابطہ ایک دن مقرر فرمادیا تھا، حضرت ابو سعید خدری ؓ کی روایت ہے "قالت النساء للنبی صلی اللہ علیہ وسلم: غلبن علیک الرجال، فاجعل لنا یوماً من نفسک، فوعدھن یوماً فلقیھن فیه فوعظھن، وامرھن" (۱)

چوں کہ اسلام سے قبل عورتوں کی تعلیم کی طرف توجہ نہیں دی جاتی تھی، اس لیے آپ نے لڑکیوں کی تعلیم وتربیت کی طرف خاص توجہ دلائی، آپ ﷺ کا ارشاد ہے: جو شخص اپنی بیٹی کی خوب اچھی طرح تعلیم وتربیت کرے اور اس پر دل کھول کر خرچ کرے تو (بیٹی) اس کے لیے جہنم سے نجات کا ذریعہ ہوگی۔(۲)

لڑکیوں کی شریعت اسلامیہ کے مطابق تعلیم وتربیت اور پھر ان کی شادی کرنے پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے تین فضیلتیں ہیں: جہنم سے چھٹکارا، جنت میں داخلہ، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جنت میں ہمراہی۔

امام بخاریؒ نے تعلیم نسواں کے سلسلہ میں ایک پورا باب ہی قائم کیا ہے: باب عظة الامام النساء وتعلیمھن، (۳) حضور ﷺ جیسے صحابہ کو پند ونصیحت کیا کرتے تھے ویسے ہی صحابیات کے درمیان بھی تبلیغ دین فرمایا کرتے تھے۔

اس باب کے تحت جو حدیث لائے ہیں اس کا مفہوم یہ ہے کہ، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں عورتوں کے اندر علم حدیث کے حاصل کرنے کا شوق و جذبہ اس قدر موجزن تھا کہ تمام عورتوں نے اجتماعی طور پر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے مطالبہ کیا کہ آپ ہماری تعلیم کے لئے کوئی انتظام فرمادیجئے، چنانچہ ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ اللہ کے

---

(۱) بخاری، بَابٌ: هَلْ يُجْعَلُ لِلنِّسَاءِ يَوْمٌ عَلَى حِدَةٍ فِي العِلْمِ؟ حدیث: ۱۰۱

(۲) المعجم الکبیر للطبرانی حدیث: ۱۰۲۲۷

(۳) بخاری جز۱ ص۵۶ الناشر: مكتبة المعارف للنشر والتوزيع، الرياض

رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لئے ایک دن کا وعدہ کیا جس میں ان کو وعظ ونصیحت کرتے اور دینی باتوں کا حکم فرماتے تھے، اس سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ خواتین اسلام میں ارشادات نبویہ کے حصول کا کس قدر شوق و جذبہ تھا۔

اسلام مرد وعورت دونوں کو مخاطب کرتا ہے اور اس نے ہر ایک کو عبادت اخلاق وشریعت کا پابند بنایا ہے جوکہ علم کے بغیر ممکن نہیں ،علم کے بغیر عورت نہ تو اپنے حقوق کی حفاظت کرسکتی ہے اور نہ ہی اپنی ذمہ داریوں کو ادا کرسکتی ہے جوکہ اسلام نے اس پر عائد کی ہے؛اس لیے مرد کے ساتھ ساتھ عورتوں کی تعلیم بھی نہایت ضروری ہے۔

جیسا کہ گزشتہ دور میں جس طرح علم مردوں میں پھیلا ،اسی طرح عورتوں میں بھی عام ہوا۔صحابہ کے درمیان قرآن وحدیث میں علم رکھنے والی خواتین کافی مقدار میں ملتی ہیں، قرآن وحدیث کی روشنی میں مسائل کا استنباط اورفتویٰ دینا بڑا ہی مشکل اور نازک کام ہے؛ لیکن پھر بھی اس میدان میں عورتیں پیچھے نہیں تھیں ؛ بلکہ صحابۂ کرام کے مدِمقابل تھیں ،جن میں کچھ کاذ کرکیاجاتاہے۔مثلاً:

حضرت عائشہ،حضرت ام سلمہ،حضرت ام عطیہ،حضرت صفیہ،حضرت ام حبیبہ،اسماء بنت ابوبکر،ام شریک،فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہن ،وغیرہ نمایاں تھیں۔(۱)

صحابیات سے لیکر بعد کی صدیوں تک عالمات کی تعداد ہزاروں تک پہنچی ہوئی ہے،یہ عورتیں حدیث،تفسیر اورفقہ وغیرہ ہرمیدان میں پیش پیش رہتیں۔صحابیات،تابعیات اور بعد کی صدیوں میں بہت سی عورتیں حدیث وفقہ میں ممتاز تہیں،ان کی ایک بڑی تعداد فتوے بھی دیتی تھی،لوگ ان سے حدیث وفقہ وغیرہ کی تعلیم لیتے تھے، کچھ خواتین اپنے حفظ سے حدیثیں پڑھاتی تھیں، بہت سی حدیثیں صرف عورتوں کی روایت سے محفوظ ہیں،حنفی، مالکی، شافعی،حنبلی اور دوسرے مسلکوں کے کتنے فقہی مسائل ایسے ہیں جوتنہا عورتوں کی روایتوں پر

---

(۱) ماہنامہ دارالعلوم ،شمارہ 10،جلد 98 :،ذی الحجہ 1435 ہجری مطابق اکتوبر 2014ء۔

مبنی ہیں، امام ابوعبداللہ الحاکم النیسابوری فرماتے ہیں کہ اسلام کے ایک چوتھائی احکام کی بنیاد عورتوں کی روایتوں پر ہے، دنیا میں کوئی مذہب نہیں جس کے تشکیلی دور میں خواتین نے یہ عظیم علمی کردار ادا کیا ہو۔

فن حدیث میں عورتوں کی خدمات

ڈاکٹر محمد اکرم ندوی صاحب آکسفوڈ لکھتے ہیں فنا فی الحدیث کے مقام عالی میں عورتوں نے حیرت انگیز مثالیں قائم کی ہیں، فاطمۃ بنت المنجا التنوخیۃ (متوفاۃ ۸۰۳ھ) نے دمشق کی مسجدوں اور مدرسوں میں بخاری شریف اور دیگر کتب حدیث پڑھائیں، بعد میں مصر کے امراء کی دعوت پر وہاں منتقل ہوگئیں، اور بادشاں اور امراء کے محلوں، مسجدوں اور مدرسوں میں درس حدیث دیا، یہاں تک کہ جس دن ان کا انتقال ہوا وہ درس بخاری میں مشغول تھیں اور اس وقت ان کی عمر ۸۹ رسال تھی، ان کا بخاری کا نسخہ ترکی کی ایک لائبریری میں اب تک محفوظ ہے۔

بخاری شریف سے عورتوں کے اشتغال کا حال یہ ہے کہ اس وقت تک بخاری شریف کا سب سے صحیح نسخہ ایک خاتون کا ہے، نسخہ یونینیہ جس کی طباعت کا اہتمام سلطان عبدالحمید ثانی نے قاہرہ سے کیا تھا اور جسے نسخہ سلطانیہ کہا جانے لگا وہ نسخہ ہے حافظہ کریمہ مروزیہ (متوفاۃ ۴۶۳ھ) کا، جن سے حافظ ابو بکر خطیب بغدادی، حافظ سمعانی وغیرہ نے بخاری پڑھی، یہ نسخہ شیخ زہیر ناصر کی تحقیق سے شائع ہو کر متداول ہے۔

اسی طرح بخاری شریف کی عورتوں کی سند سب سے اونچی ہے، عام طور سے دیوبند، ندوہ اور دیگر مدرسون کی سند میں امام بخاری تک بیس یا اس سے زائد واسطے ہوتے ہیں جبکہ عائشہ مقدسیہ (متوفی ۸۱۴ھ) کے واسطہ سے میرے اور امام بخاری کے درمیان صرف چودہ واسطے ہیں، امام بخاری کا انتقال ۲۵۶ھ میں ہوا، اور اس وقت ۱۴۴۰ھ ہے، تقریبا بارہ سوسال کے عرصہ میں صرف چودہ واسطوں کا ہونا غایت علو اسناد ہے۔ شروع سے بڑے

بڑے ائمہ حدیث وفقہ نے کثرت سے عورتوں سے حدیثوں کی روایتیں کی ہیں، امام بخاری کے شیخ مسلم بن ابراہیم فراہیدی اور ابوالولید طیالسی نے صرف ایک شہر بصرہ کی ستر عورتوں سے حدیث کی روایت کی، حافظ سمعانی نے اپنی ۶۸/ شیخات کا ذکر اور ان کے احوال بیان کئے ہیں، ابن عساکر نے اپنی معجم الشیوخ میں ۸۰/ شیخات کے تراجم لکھے ہیں۔

ابن النجار جنہون نے خطیب بغدادی کی تاریخ پر ذیل لکھا ہے انہوں نے چھ سو مردوں اور چار سو عورتوں سے روایت کی، یعنی ان کے عہد میں چالیس فیصد اہل علم کا تعلق خواتین سے ہے، بلکہ شاید خواتین اہل علم کی تعداد اس سے زیادہ ہو، کیونکہ عورتوں کے متعلق لوگوں کے پاس معلومات بہت کم ہوتی تہیں۔

حدیث کی بہت سی کتابیں اور بہت سے اجزاء اس وقت صرف عورتوں کی روایت سے باقی ہیں، مثلاً امام طبرانی کی معجم کبیر جو پچیس جلدوں میں ہے فاطمۃ الجوزدانیۃ (متوفاۃ ۵۲۴ھ) کی روایت سے متداول ہے۔

مسجد حرام میں کئی عورتون نے حطیم میں درس دیا ہے، مسجد نبوی میں متعدد خواتین کے سامنے حدیثون کا سماع ہوا ہے، ان میں ایک خاتون فاطمہ البطائحیہ (متوفاۃ ۷۱۱ھ) ہیں جو امام ذہبی، امام سبکی وغیرہ کی شیخہ ہیں، ان کی مجلس درس قبر اطہر کے پاس لگتی تھی، وہ قبر اطہر کے سرہانے بیٹھتی تھیں، جب تھک جاتی تہیں تو قبر مبارک کی دیوار سے ٹیک لگاتی تھیں، اور مجلس کے آخر میں تمام حاضرین کے لئے اپنے ہاتھ سے اجازت لکھتی تھیں۔

دمشق میں جامع بنی امیہ میں اپنے عہد کا سب سے بڑا محدث قبۃ النسر کے نیچے بیٹھ کر درس حدیث دیتا تھا، عائشہ بنت ابن عبد الہادی (متوفاۃ ۸۱۴ھ) کا بھی تقرر وہاں درس حدیث کے لئے ہوا، اور انہیں باقاعدہ تنخواہ ملتی تھی، ان کے دروس میں شریک ہونے والوں میں اس زمانہ کے دو سب سے بڑے ماہر حدیث تھے، ایک حافظ ابن ناصر الدین الدمشقی، اور دوسرے حافظ ابن حجر العسقلانی، حافظ ابن حجر نے عائشہ مقدسیہ سے حدیث کی

چھوٹی بڑی تقریباً ستر کتابیں اخذ کیں۔

ایک اہم نکتہ : مردوں میں سیکڑوں وہ لوگ ہیں جنہوں نے حدیثیں گڑھی ہیں اور حدیثوں میں جھوٹ بولا ہے، جبکہ امام ذہبی وغیرہ مؤرخین وماہرین رجال کا بیان ہے کہ عورتوں میں کوئی ایسا نہیں جس پر حدیث میں جھوٹ بولنے کا الزام ہو، اور اس میں شک نہیں کہ عام طور سے عورتیں صرف دین کے حرص اور خدا ورسول کی خوشنودی کے لئے حدیثیں پڑھتی پڑھاتی تھیں۔

فقہ میں عورتوں کی خدمات

فقہ میں بھی عورتوں کا بڑا مقام تھا، امام ابوحنیفہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہما نے بہت سے امور میں عورتوں کے فتووں پر عمل کیا، صحابیات کے بعد مشہور فقیہ خواتین میں عمرۃ بنت عبدالرحمن، حفصۃ بنت سیرین، معاذۃ العدویۃ، اُم الدرداء، فاطمۃ بنت المنذر بن الزبیر وغیرہ ہی کے نام نمایاں ہیں، حنفی مذہب کی ایک اہم کتاب علاء الدین سمرقندی کی ''تحفۃ الفقہاء'' ہے، ان کی صاحبزادی نہ یہ کہ اس کتاب کی ماہر تھیں بلکہ ان کو پوری کتاب زبانی یاد تھی، سمرقندی کے شاگردوں میں مشہور فقیہ علامہ کاسانی ہیں، جب کاسانی نے فقہ کی تعلیم مکمل کرلی تو اپنے استاد سے ان کی صاحبزادی فاطمہ کے ساتھ شادی کرنے کی خواہش ظاہر کی، سمرقندی نے کہا کہ میری بیٹی فقہ کی ماہر ہے اور تم اس کے مقام کو ابھی تک نہیں پہنچے، تم میری کتاب کی شرح لکھو، اگر وہ مجھے پسند آگئی تو میں تمہاری شادی اس سے کردوں گا، چنانچہ کاسانی نے ''بدائع الصنائع'' کے نام سے یہ شرح مکمل کی، جو استاد کو پسند آئی اور انہوں نے اپنی بیٹی کی شادی ان سے کردی، مؤرخین کہتے ہیں : شرح تحفتہ وتزوج بنتہ، اس کے بعد حلب کے امیر نے کاسانی کو حلب کے ایک کالج میں پڑھانے کی دعوت دی، کاسانی وہاں پڑھانے گئے، ان کے شاگرد ابن العدیم الحلبی وغیرہ کہتے ہیں کہ کاسانی ہم لوگون کو فقہ پڑھاتے اور ہم ان سے بحث کرتے، کبھی کبھی جب انہیں جواب کا علم نہ ہوتا تو ہم سے کہتے تم لوگ انتظار کرو میں

ابھی آتا ہوں، اور جب آتے تو ہمارے سوال کا جواب لیکر آتے، ہمیں بعد میں معلوم ہوا کہ کاسانی اپنی بیوی فاطمہ سے پوچھکر ہمیں بتاتے ہیں، کاسانی کی بدائع الصنائع کے بارے میں مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے ہے کہ یہ حنفی مذہب کی سب سے بہتر کتاب ہے، حنفی مذہب کی سب سے اچھی کتاب صرف ایک عورت سے شادی کرنے کے لیے لکھی گئی، اور جس شخص نے یہ کتاب لکھی اس کی بیوی فقہ کی اس سے بڑی عالمہ تھی۔(از مضمون: ڈاکٹر محمد اکرم ندوی صاحب، آکسفورڈ)

خواتین اسلام میں حصولِ علم کا شغف

خیر القرون کے بعد بھی مختلف ادوار میں محدّثات کی ایک طویل فہرست ہے جنہوں نے حفاظتِ حدیث کی ذمہ داری اٹھائی، جن خواتین میں کوئی شیخۃ الحدیث تھیں تو کسی نے حدیث کا علم حاصل کرنے کے لے اپنے محرم کے ساتھ اپنے گھر کو خیر باد کہا، کسی نے محدثین کے ایک جم غفیر کو روایت ِحدیث کی اجازت دی تو کسی نے صحیح بخاری وغیرہ کا درس دیا، امام بخاری، امام شافعی، علامہ ابن حجر عسقلانی او ر امام سیوطی رحمہم اللہ جیسے علم وفن کے اساتذہ کی فہرست میں متعدد خواتین اسلام کے نام ملتے ہیں، علمِ حدیث حاصل کرنے اس کی نشر و اشاعت کرنے میں مردوں کی طرح ایک بڑی تعداد ہے اسماء الرجال کی کتابوں میں حدیث نقل کرنے اور اسے محفوظ کرنے والی خواتین کی بھی ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب ”تقریب التہذیب“ میں تقریباً ایک سو اکیس تابعیات اور چھبیس تبع تابعیات کا ذکر کیا ہے، جنہوں نے روایاتِ حدیث میں بہت محنت کی ہے۔تابعیات کے بعد کے ادوار میں بھی حصول علم کا سلسلہ جاری رہا۔

حضرت عمرہ بنت عبدالرحمنؒ کے متعلق علی ابن المدینی فرماتے ہیں: حضرت عائشہؓ کی احادیث میں سب سے زیادہ قابل اعتماد احادیث عمرہ بنت عبدالرحمنؒ، قاسمؒ اور عروہؒ کی ہیں“ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے فرمایا: ”ما بقی أحد اعلم بحدیث عائشۃ“ حضرت عائشہؓ کی

احادیث کا ان سے زیادہ جاننے والا اس وقت کوئی اور نہیں ہے۔

حضرت حفصہ بنت سیرینؒ نے متعدد صحابہ وتابعین سے احادیث روایت کی ہیں، ایاس بن معاویہ فرماتے ہیں: ’’میں نے حفصہ سے زیادہ فضل والا کسی کو نہیں پایا‘‘ ابن حجر عسقلانیؒ ’’تہذیب التہذیب‘‘ میں لکھتے ہیں کہ مشہور تابعی، حدیث اور خوابوں کی تعبیر کے فن کے امام حضرت محمد بن سیرینؒ کی بہن حضرت حفصہؒ نے صرف بارہ سال کی عمر میں قرآنِ کریم معنیٰ ومفہوم کے ساتھ حفظ کر لیا تھا اور ابن جوزیؒ کی ’’صفۃ الصفوۃ‘‘ میں ہے کہ حضرت حفصہ فن تجوید وقرأت میں مقامِ امامت کو پہنچی ہوئی تھیں، امام ابن سیرینؒ کو جب تجوید کے کسی مسئلے میں شبہ ہوتا تو شاگردوں کو اپنی بہن سے رجوع کرنے کا مشورہ دیتے تھے۔

حضرت حسن بن زید بن حسن بن علی بن ابی طالبؓ کی صاحب زادی اور حضرت اسحاق بن جعفرؒ کی اہلیہ حضرت نفیسہؒ جن کے علم سے خواتین کے ساتھ ساتھ مردوں کی بھی معتد بہ تعداد فیض یاب ہوتی تھی، ان کا لقب ’’نفیسۃ العلم والمعرفۃ‘‘ پڑ گیا تھا۔ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ جیسے رفیع القدر اہلِ علم دینی مسائل پر ان سے تبادلۂ خیال کرتے تھے۔

حضرت زینب بنت برہان الدین اردبیلیہ رحمۃ اللہ علیہا مکہ مکرمہ میں پیدا ہوئیں، بڑے ہونے پر علم حدیث کے شوق میں اپنے چچا کے ساتھ مختلف شہروں کا سفر کیا اور بیس سال کے بعد مکہ مکرمہ واپس آئیں۔

حضرت ام محمد زینب بنت احمد بن عمر رحمۃ اللہ علیہا بیت المقدس میں پیدا ہوئیں۔ علمِ حدیث کی اس طالبہ نے دور دراز کا سفر کر کے حدیث کا علم حاصل کیا۔ علم حدیث حاصل کرنے کے شوق میں سفر پر سفر کرنے والی اس خاتون کو امام ذہبی نے ’’المعمرۃ الرحالۃ‘‘ کا لقب دیا ان کی اس مشقت کا ثمر یہ ملا کہ بعد میں دور دراز کے ملکوں سے طلبۂ حدیث ان سے روایت کرنے ان کے پاس حاضر ہوتے تھے۔ ان خواتین کے یہ سفر اپنے محرم کے ساتھ ہوتے تھے اور ان کی درس گاہوں میں شرعی پردے کی پابندی ملحوظ خاطر رہتی تھی۔

حلقۂ درس : حضرت ام محمد زینب بنت مکی حرانیہ رحمۃ اللہ علیہا نے چورانوے سال کی عمر تک حدیث کا درس دیا۔امام ذہبی نے اپنی کتاب العبر میں لکھا ہے "**وازدحم علیھا الطلبة**" ان کی درس گاہ میں طلبہ کا کافی ہجوم رہا کرتا تھا۔

حضرت ام عبداللہ زینب بنت کمال الدین رحمۃ اللہ علیہا کی پوری زندگی احادیث کی روایت اورکتبِ حدیث کی تعلیم میں گزری۔امام ذہبی نے ان کے بارے میں لکھا ہے "تکاثر علیھا وتفردت وروت کتبا کثیرا" ان کی درس گاہ میں طلبہ کی کثرت ہوا کرتی تھی۔

مولانا قاضی اطہر مبارک پوری قرنِ اوّل اوراس کے بعد طالبات کے تعلیمی اسفار اور ان کے طریقۂ تعلیم وتربیت کے بارے میں لکھتے ہیں: "عام طور سے ان تعلیمی اسفار میں طالبات کی صنفی حیثیت کا پورا پورا لحاظ رکھا جاتا تھا اوران کی راحت وحفاظت کا پورا اہتمام ہوتا تھا، خاندان اور رشتہ کے ذمہ داران کے ساتھ ہوتے تھے۔" آگے چل کر لکھتے ہیں: "ان محدثات وطالبات کی درس گاہوں میں مخصوص جگہ ہوتی تھی،جس میں وہ مردوں سے الگ رہ کر سماع کرتی تھیں اور طلبہ وطالبات میں اختلاط نہیں ہوتا تھا۔"

محدّثات کی علمِ حدیث میں تصانیف: محدّثات نے مردوں کی طرح اپنی مرویات کو بھی کتابی شکل میں مدوّن کر کے محفوظ کیا اورفن اسماء الرجال وفن حدیث میں بھی کتابیں تصنیف کیں:

۱۔حضرت ام محمد فاطمہ بنت محمد اسفہانی : ان کی بہت سی تصنیفات تھیں جن میں "الرموز من الکنوز" پانچ جلدوں میں آج بھی موجود ہے۔

۲۔عجیبہ بنت حافظ بغدادیہ : انہوں نے اپنے اساتذہ وشیوخ کے حالات اوران کے مسموعات پر دس جلدوں میں "المشیخة" نامی کتاب لکھی۔

۳۔ام محمد محمد شھدہ بنت کمال : ان کو بہت سی حدثیں زبانی یاد تھیں۔لہٰذا انہوں نے بہت سی احادیث کو کتابی شکل میں یکجا کیا۔

۴۔امۃ اللہ تسنیم : یہ ماضی قریب کے مشہور عالم دین مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی بہن ہیں۔انہوں نے امام نووی کی کتاب ”ریاض الصالحین“ کا اردو ترجمہ ”زادسفر“ کے نام سے کیا ہے۔

مادہ پرستانہ تعلیمی نظام نے عورتوں کو کیا دیا؟

تاریخ میں ایسی بہت سی خواتین ہیں جن کے ذریعہ علم وعمل کے چشمے ابلے اور بڑی تعداد میں لوگوں نے ان سے علم حاصل کیا تھا،ابن عربی رحمتہ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ میں نے کئی عورتوں سے علم حاصل کیا اور میں ان کا شاگرد ہوں،ابن عساکر کہتے ہیں کہ میں نے جو مختلف علوم حاصل کیے ان کے حاصل کرنے میں عورتیں بھی میری اساتذہ رہی ہیں،حضرت رابعہ بصری کے دامن فیض سے نہ معلوم کتنے لوگوں نے سیرابی حاصل کی،انہوں نے زہد وتقوی اور توکل کی جو مثال قائم کی ہیں اس کی نظیر نہیں ملتی امام شافعی کو فقہ میں بڑا اونچا مقام حاصل ہے، انہوں نے بھی عورتوں سے تعلیم حاصل کی تھی ،ہندوستان کے مسلم دور حکومت میں عورتوں نے علمی میدان میں بڑی شہرت حاصل کی اوران کی دل چسپی سے یہاں کئی علمی مراکز قائم ہوے،رضیہ سلطانہ کے عہد میں دو مدرسے عورتوں کی تعلیم کے لیے دہلی میں قائم تھے، مدرسہ خیر المنازل،ماہم بیگم،مدرسہ پیکا بیگم،مدرسہ اکبری بیگم،مدرسہ فتح پور بیگم،مدرسہ جہاں آرا بیگم،مدرسہ حیات النسا،مدرسہ والدہ غازی الدین خان ،مدرسہ راجی بیگم کوکس نے قائم کیا؟عورتوں نے!،مکہ مکرمہ میں جو مدرسہ صولتیہ چل رہا ہے وہ ایک خاتون صولت النسا بیگم کلکتہ کا بنوایا ہوا ہے۔

آج مسلم لڑکیاں بڑی تعداد میں تعلیم سے جڑی ہوئی ہیں مگر ان کی تعلیم سے معاشرہ کو کیا مل رہا ہے؟ ہم نے تعلیم میں افراط وتفریط سے کام لینا شروع کردیا ہے اسلام کے بتائے ہوے طریقے پر ہم انہیں تعلیم نہیں دے رہے ہیں،اس لیے تعلیم کے نام پر بے حیائی دن بہ دن عام ہوتی جارہی ہے اور برائیاں اپنی بنیادیں مستحکم کررہی ہیں،بعض پیشہ

ورانہ علم حاصل کرنے میں کوئی قباحت نہیں اور نہ اسلام اس سے منع کرتا ہے، مگر یہ کام انجام دیتے وقت ان کے پیش نظر اللہ اور اس کے رسول کے احکام بھی ہونے چاہئیں، عصری اداروں میں کلچرل پروگرام کے تحت جو حیاء سوز کردار لڑکیاں پیش کرتی ہیں، کیا یہی تعلیم اور تہذیب اسلام کو مطلوب ومحمود ہے؟ مادہ پرستانہ ذہنیت کا یہ کیسا انصاف ہے کہ عورتوں کو گھروں کی زینت بننے کے بجائے محفلوں کی رونق بنادے اور یہ کیسے درست ہوسکتا ہے کہ بچوں کی پرورش و پرداخت کی عظیم ذمہ داری ادا کرنے کے ساتھ انہیں معاشی تگ ودو کے لیے مجبور کردیں؟ عورت کا اصل دائرہ کار اس کا گھر ہے، اس سے باہر نکالیں گے تو یقیناً اس کے برے نتائج برآمد ہوں گے، ہمارے اندر یہ داعیہ بھی ہونا چاہیے کہ جس طرح ہم ان کے لیے عصری تعلیم میں اعلی سے اعلیٰ ڈگری کے حصول کے خواہاں ہیں، تو اس سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ ہم ان کے لیے دین کی تعلیم کا بھی بہتر نظم کریں۔

واضح رہے کہ اقوام متحدہ کے مطابق دنیا بھر میں ۶۲ رملین لڑکیاں ایسی ہیں جو تعلیم کے بنیادی حق سے محروم ہیں، تعلیم سے محرومی کے باعث انہیں اپنی صحت، اور دیگر حقوق سے متعلق آگہی نہ ہونے کے برابر ہے۔

تعلیم وتربیت کے عمومی ماحول کا اثر

تعلیم وتربیت کے اس عمومی ماحول کا اثر ہے کہ جماعت صحابیات میں بلند پایہ اہل علم خواتین کے ذکر جمیل سے آج تاریخ اسلام کا ورق ورق درخشاں وتاباں ہے؛ چنانچہ یہ امر محقق ہے کہ امہات المؤمنین میں حضرت عائشہؓ وحضرت ام سلمہؓ فقہ وحدیث وتفسیر میں رتبہ بلند رکھنے کے ساتھ ساتھ تحقیق ودرایت کے میدان کے بھی شہ سوار تھیں، حضرت ام سلمہؓ کی صاحب زادی زینب بنت ابوسلمہ جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پروردہ تھیں، ان کے بارے میں تاریخ کا بیان ہے کہ: ”کانت افقہ نساء اہل زماننا“ حضرت ام الدردی الکبریٰ اعلی درجہ کی فقیہ اور عالمہ صحابیہ تھیں، حضرت سمرہ بنت نہیک اسدیہ کے بارے میں لکھا ہے کہ: وہ زبر

دست عالمہ تھیں، عمر دراز پائیں، بازاروں میں جا کر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کیا کرتی تھیں اور لوگوں کو ان کی بے راہ روی پر کوڑوں سے مارتی تھیں، پھر یہ زریں سلسلہ کا دور صحابیات تک ہی محدود نہیں رہا، بلکہ تابعیات اور بعد کی خواتین کے زمانوں میں بھی ہمیں اس طبقہ میں بڑی بڑی عالمہ، زاہدہ اور امت کی محسنہ و باکمال خواتین ملتی ہیں۔

فن تفسیر ہو یا حدیث، فقہ ہو یا اصول، ادب ہو یا بلاغت سارے کے سارے فنون کی عورتوں نے جان توڑ خدمت کی اگر صحابیات و تابعیات تحمل اور روایت حدیث میں پیچھے رہتیں تو آج اسلامی دنیا مسائل نسواں کی علم و معرفت سے محروم رہتی، نکاح و طلاق کے مسائل ہوں یا جماع و مباشرت کے ازدواجی زندگی کا کوئی الجھا ہوا پہلو ہو یا خانگی مشکلات، اگر اس قسم کے الجھے مسائل کا حل ہمیں ملتا ہے تو صحابیات و تابعیات کی مرویات ہیں۔

عصر حاضر اور ہماری کوتاہیاں

آج تعلیم گاہوں اور دینی تعلیمات کے متعدد ذرائع کے موجود ہونے کے باوجود، دینی تعلیم سے بے رغبتی اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی ہے، جس مذہب نے دینی تعلیم کو تمام مردوں اور عورتوں کے لئے فرض قرار دیا ہو اور جس مذہب میں علم و حکمت پر قرآن جیسی عظیم کتاب ہو اور جس مذہب کی شروعات ہی ''اقراء'' یعنی تعلیم سے ہوئی ہو، اسی مذہب کے ماننے والے دینی تعلیم کے میدان میں سب سے پیچھے ہیں اور اگر بات عورتوں کی مذہبی تعلیم کی کی جائے (نہ کہ محض عصری و مغربی تعلیم کی) تو معاملہ حد سے تجاوز ہوتا ہوا نظر آتا ہے، کہتے ہیں کے ماں کی گود بچوں کے لیے پہلا مکتب ہوتا ہے، اب اگر ماں ہی دینی تعلیم سے بیزار ہو تو اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ بچوں پر کیا اثرات پڑیں گے، آج خواتین کو قرآن و حدیث کے مطالعہ کی فرصت نہیں، نتیجتاً وہ اپنے بچوں کے لیے بھی اس حوالے سے متفکر نہیں ہوتیں، عورتوں کا بہت بڑا طبقہ ایسا ملے گا جسے سیرت رسول کی موٹی موٹی باتیں معلوم نہیں، طہارت و عبادات بالخصوص نماز کی بجا آوری تو دور کی بات، انکے مسائل سے

تشویشناک حد تک ناواقفیت ہے ،حقوق والدین ،حقوق زوج اور دیگر چھوٹے بڑے افراد خانہ کے حقوق سے غفلت روز افزوں ہے ،نوبت بایں جارسید کہ ٹھوس اسلامی تعلیمات سے دوری نے مسلم خواتین کو یہ منفی سبق پڑھایا کہ پردہ ،آزادی نسواں کے لیے سدراہ ہے اور نام نہاد ترقی کا دشمن ہے اور اسکا چراغِ خانہ ہونا قدامت پسندی ہے،اسے جدیدیت کا لبادہ اوڑھ کر شمع محفل بن جانا چاہیے، مضبوط دینی تعلیمات سے لاعلمی نے ساس بہو کے جھگڑے پیدا کر دئیے، دینی تعلیمات سے اجتناب نے طلاق کی شرح میں اضافہ کر دیا، دینی تعلیمات سے بیگانگی نے بڑے بوڑھوں کی خدمت کو کارثواب کے بجائے کارزحمت بنادیا، بقدرضرورت دینی تعلیمات سے بعداور مغربی تعلیمات سے قرب نے مسلمان خواتین کو امور خانہ داری انجام دینے کے بجائے آفس ،ہوٹلوں اور ہسپتالوں میں reception ریسپشن کی زینت بنادیا، دینی تعلیمات سے صرف نظری نے پڑوسیوں کے حقوق کی ادائیگی کے بدلے لڑائی جھگڑے کے طور طریقے سکھلا دیئے ،الغرض اسلامی زندگی کے جس موڑ پر آپ اسلامی روح کو تڑپتے ہوے دیکھیں گے ،اس کا نتیجہ دینی تعلیم کا زندگیوں میں نہ ہونا پائیں گے ،علامہ اقبال نے کہا تھا ؛وجود زن سے ہے کائنات میں رنگ ،اس سے کیسا وجود مراد ہے ؟کیا اسلامی اور دینی تعلیمات کی روح سے یکسر خالی مغربی وجود زن؟ آج ہر طرف عصری اور مغربی علوم کا غلغلہ ہے ،اسلام اسکی راہ میں حائل نہیں ہوتا: ہاں !مگر اتنی بات ضرور ہے کہ دینی تعلیم کو فراموش کر کے ،عصری تعلیم میں بالکلیہ لگ جانا اسلام کو پسند نہیں ،اسلام اسے قابل اصلاح سمجھتا ہے۔

آج دینی تعلیم کی ضرورت جتنی مردوں کو ہے ،اس سے کہیں زیادہ عورتوں کو ہے ،عورت کا قلب اگر دینی تعلیمات سے منور ہو ،تو اس چراغ سے کئی چراغ روشن ہو سکتے ہیں ،وہ دیندار بیوی ثابت ہوسکتی ہے ،وہ ہر دل عزیز بہو بن سکتی ہے اور نیک اور شفیق ساس ہوسکتی ہے ،وہ اپنے بچوں کی معلم اول ہوسکتی ہے ،وہ خاندانی نظام کو مربوط رکھ سکتی ہے ،معاشی تنگی کو

خوشحالی سے بدل کر معاشی نظام مضبوط کر سکتی ہے، وہ شوہر کے مرجھائے اور افسردہ چہرے پر گل افشانی کر سکتی ہے، میخانے کو مسجد اور بت خانے کو عبادت خانہ بنا سکتی ہے، اولاد کو جذبہء جہاد سے سرشار کر سکتی ہے؛ الغرض دینی تعلیم یافتہ عورت وہ سب کچھ بہت آسانی سے کر سکتی ہے جو اسلام چاہتا ہے اور اگر معاملہ اسکے برعکس ہو جائے تو منفی نتیجہ کیسا خوفناک ہو گا ؛اندازہ کرنا مشکل نہیں اور دینی تعلیم سے بے انتہا غفلت عورت کو شیطان بنا دیتی ہے۔

چند ضروری ہدایات

(۱) تعلیم دلانے کو ضروری تصور کیا جائے اور اس کے لیے حتی الوسع پوری کوشش کی جائے ؛لیکن جہاں تک ممکن ہو مخلوط نظام تعلیم سے لڑکیوں کو بچایا جائے لڑکیوں کے لیے مخلوط تعلیم سم قاتل ہے، یہیں سے لڑکیوں میں غیر محرم لڑکوں سے بات کرنے کا آغاز ہوتا ہے جس کا انجام بہت بھیانک ہے، اگر مخلوط تعلیم کے علاوہ دوسرا نظام تعلیم ممکن نہ ہو تو ایسی صورت مین سخت نگرانی کی ضرورت ہے، لڑکی کا باپ خود ہی اسکول وکالج پہونچانے جائے اور خود ہی لینے جائے اس معاملے میں خود لڑکی یا ڈرائیور پر بھروسہ کرنا بھی خطرناک ہو سکتا ہے۔

(۲) جہاں تک ہو سکے لڑکیوں کو بورڈنگ کے نظام سے دور رکھا جائے جب تک لڑکیاں اپنے گھر میں رہتی ہیں، اپنے ماں، باپ، بھائی بہن کے ساتھ رہتی ہیں، غیر محرم لڑکوں سے محبت پنپنے کا موقع نہیں ملتا ہے، کلاس کے ختم ہوتے ہی گھر جانے کی فکر ہوتی ہے اور تاخیر کی صورت میں ماں باپ کے باز پرس کا اندیشہ رہتا ہے اس لیے اس حالت میں لڑکیوں کا ذہن مشغول رہتا ہے اور فتنہ میں پڑنے کا اندیشہ کم ہوتا ہے لیکن جب لڑکیاں بورڈنگ میں رہنے لگتی ہیں تو دھیرے دھیرے ماں باپ کی محبت کم ہونے لگتی ہے اور سہیلیوں کی بات چیت میں لڑکوں کا تذکرہ سن کر اور بعض مرتبہ اپنی سہیلیوں کو بوائے (Boy friend) فرینڈ کے ساتھ جاتے اور گھومتے دیکھ کر اس میں بھی بوائے فرینڈ کا جذبہ بیدار ہونے لگتا ہے کبھی کبھی مرعوبیت کے نتیجے میں بوائے فرینڈ نہ ہونے کو لڑکیاں اپنے لیے

عیب اورکم زوری خیال کرنے لگتی ہیں اور بوائے فرینڈ کی تلاش میں لگ جاتی ہیں اس لیے لڑکیوں کے لیے بورڈنگ کانظام بھیانک انجام کاسبب بن سکتا ہے۔

(۳) مسلمانوں کو اپنے عصری ادارے قائم کرنے کی کوشش کرنی چاہیے اور اس میں ایسی اعلیٰ تعلیم اوراعلیٰ معیار قائم کرنا چاہیے کہ وہ شہر کا ماڈل اسکول اور کالج بن جائے اور بچے اس میں تعلیم حاصل کرنا اپنے لیے فخر تصور کریں۔لڑکیوں کوممکنہ حدتک مسلم ادارے میں تعلیم دلانے کی کوشش کریں۔مسلم تعلیمی اداروں میں تعلیم کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ ہم اسلامی تہذیب کی حفاظت کرسکیں گے،اپنے کلچر کو فروغ دیں گے اور بہت اہم بات یہ ہے کہ غیروں کے اداروں میں تعلیم پا کر بعض مرتبہ بچے مرعوب ہوجاتے ہیں اور بعض مرتبہ ذہنی طور پر غلام ہوجاتے ہیں حتیٰ کہ بعض موقع پر بچے اپنی شناخت کو بھی چھپاتے ہیں،اس طرح کے واقعات مشاہدے میں آرہے ہیں۔

(۴) بچوں کو ابتداء سے ہی دینی تعلیم سے آراستہ کرنا چاہیے،اسلامی تعلیم وتربیت کرنی چاہیے اور تعلیم کے ہر ہر مرحلے میں اس کی نگرانی ہونی چاہئے،خاص کر اگر بچے غیر مسلم اداروں میں تعلیم حاصل کرتے ہوں تو بہت زیادہ ہوش مندی سے کام لینے کی ضرورت ہے، اسلامی تعلیمات سے روشناس کرانا،اسلامی عقائد کی طرف توجہ دلانا،اسلام پر عمل کرنے سے دنیا وآخرت کی کامیابی کو ذہن میں بٹھانا،اور ساتھ ساتھ شرک وبت پرستی کی قباحت،اس کے نقصانات اوراس سے نفرت دلوں میں پیدا کرنے کی ضرورت ہے،غیر مسلم اداروں میں تعلیم کے دوران بچوں میں غیر اسلامی عقائد وکلچر فروغ پانے لگتا ہے،اور اسلام کی اچھائیاں نگاہوں سے اوجھل رہتی ہیں اس سے بچے غیر اسلامی ماحول کے عادی ہوجاتے ہیں۔ماں باپ کو بعض مرتبہ اس وقت پتہ چلتا ہے جب کہ بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے،ایک تعلیم یافتہ اور دولت مند کی بیٹی اپنی ماں سے کہتی ہے کہ روزانہ پانچ نمازوں کی کیا ضرورت؟ دن میں ایک مرتبہ پوجا کرلیں تو کافی ہے،لیکن وہ ماں اس کو تنبیہ نہیں کرتی اور نہ ہی سمجھاتی ہے،جب

وہ غیر مسلم لڑکے سے شادی کرلیتی ہے تو پتہ چلتا ہے، کہ بہت دنوں سے ہی مشرکانہ اعمال کے قریب ہو چکی تھی۔

(۵) موبائل فون آج بنیادی ضروریات میں داخل ہے لیکن اس کے بے جا استعمال سے بہت سے مفاسد پیدا ہوتے ہیں، بچے اور بچیوں کو موبائل فون سے دور رکھنا چاہیے، اگر بچوں کو موبایل فون دیں تو اسکی سخت نگرانی کی ضرورت ہے آج کل ماں باپ دوسروں کے بچوں سے تو بدگمان اور بدظن ہوتے ہیں، لیکن اپنے بچوں سے حد درجہ مطمئن ہوتے ہیں حالاں کہ موجودہ دور میں اپنے بچوں سے سب سے زیادہ بدگمان رہنے کی ضرورت ہے، ہر وقت انکے فون کی نگرانی کی ضرورت ہے کہ کس سے بات ہوتی ہے کب تک ہوتی ہے، اگر ہم اپنے بچوں کو کھونا نہیں چاہتے ہیں اور انھیں اپنے سے دور کرنا نہیں چاہتے ہیں اس کی دنیا اور آخرت برباد ہوتا نہیں دیکھ سکتے ہیں تو اس طرح کے اقدامات کرنے ضروری ہے۔

اف یہ اہل کلیسا کا نظام تعلیم

مذکورہ حقائق سے یہ بات تو الم نشرح ہو جاتی ہے کہ اسلام جس طرح صنف لطیف کو دیگر حقوق بخشنے میں بالکل عادلانہ، بلکہ فیاضانہ مزاج رکھتا ہے، ویسے ہی اسکی تعلیمی حقوق کو نہ صرف تسلیم کرتا ہے بلکہ علمی سطح پر انہیں عطا کرنے کا بھی حد سے زیادہ اہتمام کرتا ہے، لیکن جہاں تک بات ہے خواتین کے موجودہ نظام تعلیم کی جسے co'education سے یاد کیا جاتا ہے، جو مغرب سے درآمد (import) کردہ ہے، اور جو دراصل مغرب کی فکرِ گستاخ کا عکاس خاتون مشرق کو لیلائے مغرب کی طرح ہوس پیشہ نگاہوں کی لذت اندوزی کا سامان بنانے کی ہمہ گیر اور گھناؤنی سازش اور اسکی چادر عصمت وعفت کو تار تار کرنے کی شیطانی چال ہے، اس کی مذہب اسلام تو کبھی بھی حوصلہ افزائی نہیں کرسکتا، نیز عقل دانا بھی اس سے پناہ مانگتی ہوئی نظر آتی ہے۔

کم عمری کی شادی

[۳] کم عمری میں شادی سے متعلق دونظریہ قابل ذکر ہیں،ایک کم عمری کی شادی جائزنہیں ہے،دوسرا کم عمری میں شادی جائز ہے مگر مناسب نہیں ہے،یہی دوسرا نظریہ اہل اسلام کا ہے،دونوں نظریہ ملاحظہ فرمائیں:

اسلام نے عمومی طور پر شادی کے لیے بالغ وعاقل عمر ہونے کو ہی راجح اور زن وشو کے لیے معاشرتی اور طبی نقطہ نظر سے بہتر قرار دیا ہے،ابتدائے اسلام سے لیکر آج تک اہل سلام میں یہ رواج انتہائی شاذ تھا، چنانچہ آج تاریخ وسیرت کی کتابوں میں کم عمری کی شادی انگلیوں پر گننے کے برابر ہی دیکھنے کو ملتی ہے۔

اسلام نے کم سنی کی شادی کی اجازت دیتے ہوئے بھی اس بات کا خاص خیال رکھا ہے کہ کم عمری میں شادی ہونے کے باوجود مباشرت یا ہم بستری کا عمل اس وقت تک ٹالا جائے گا جب تک ایک لڑکی عورت نہیں بن جاتی یہاں طبی، معاشرتی اور سماجی اعتبار سے اسلام نے کسی مجبوری کی صورت میں کم عمری میں شادی ہوجانے کے باوجود عمل مجامعت کو کئی شرطوں کے ساتھ باندھ دیا ہے تاکہ لڑکی کی زندگی تباہ نہ ہو۔

اسلام فطری دین ہے،بسا اوقات خاندان اور نابالغ لڑکی کے مصالح کا تقاضا ہوتا ہے کبھی حالات ایسے بن سکتے ہیں کہ شادی کم عمری میں ہی کرنی پڑے، البتہ اس عمل کو صرف جائز کی حد تک باقی رکھا گیا ہے۔مذہب اسلام نے کم سنی کی شادی کی ترغیب نہیں دی ہے، بلکہ مستحسن یہی رکھا ہے کہ لڑکے لڑکیوں کی شادیاں عقل وشعور اور مکمل بلوغ کے بعد ہی کی جائیں جب عورت کا جسم ہر طرح سے پورا ہو چکا ہو اور جن جسمانی حصوں کی نشوونما تولد واز دواج کے ساتھ خاتون کی صحت کے لیے ضروری ہے ان کی نشوونما کا عمل بھی مکمل ہوجائے،تاکہ معاشرتی زندگی میں آئندہ کسی بھی قسم کا نقص باقی نہ رہے۔

اور یہ ایک فرضی من گھڑت بات ہے کہ ”جب لڑکی نو برس سے ماں بننے لگے گی تو بیس

برس کی عمر تک اگر وہ زندہ بھی رہی تو اس کی صحت اس حد تک جواب دے چکی ہوگی کہ وہ پچاس برس کی بڑھیا دکھائی دینے لگے گی جب کہ اس کے تیئس سالہ شوہر کی جوانی ابھی شروع ہی ہوئی ہوگی۔اس صورت میں یا تو وہ دوسری شادی کرلے گا اور موجودہ بیوی بچوں کو (خرچ نہ اٹھا پانے کے سبب) ان کے حال پر چھوڑ دے گا، یا پھر دوسری عورتوں میں دلچسپی لینے لگے گا۔نکاح آسان ہوگا تو طلاق بھی نہایت آسان ہے"۔کیونکہ پورے ملک میں کتنی لڑکیاں ایسی ہیں جن کی نو برس کی عمر میں شادی ہوئی ہو،خصوصا مسلمان معاشرہ میں کوئی دکھا نہیں سکے گا،اور کتنے ایسے ہیں بیس برس ہوتے ہوتے پچاس سال کی دکھائی دے رہی ہو،ہاں سروے رپورٹ سے یہ دکھایا جاسکتا ہے کہ ہزاروں بچیاں ایسی ہیں جو بالغ ہونے سے پہلے ہی جنسی ہوس کا شکار ہو چکی ہیں،اور لاکھوں لڑکیاں ایسی ہیں جو تیس سال کی ہونے کے باوجود مناسب رشتہ نہ ملنے کی وجہ سے بیوگی کی زندگی جی رہی ہیں،اور لاکھوں لڑکیاں تعلیم کے بہانے ۲۵/۲۵ سال ہونے کے باوجود نکاح نہ کی ہیں البتہ شادی کے تجربہ سے بہت پہلے فارغ ہو چکی ہیں۔

جو دیر سے شادی کرنے کے قائل ہیں کیا وہ معاشرہ کی بے حیائی اور جنسی تعلقات پر بند باندھنے کے لئے بھی کچھ کئے ہیں؟مخلوط ماحول ہو،چاروں طرف انٹرنیٹ کے حیاءسوز مناظر ہوں،لڑکا لڑکی کا بے محابا اختلاط ہو،فحش فلمیں دیکھی جارہی ہوں،بوائے فرنڈ بنانا،چار چار گرل فرند رکھنا فیشن بنتا جارہا ہو،تعلیم کی عمر لڑکی کی عمر سے زیادہ ہو اور شادی دیر سے ہو پھر بھی لڑکی کا دامن عصمت وعفت محفوظ رہے خود تاخیر سے شادی کے قائل اسے تسلیم نہیں کریں گے۔

زنا حلال نکاح جرم

۱۵/فروری ۲۰۰۹ءکو برطانیہ سے آنے والی ایک خبر نے پوری دنیا کو چونکا دیا تھا۔اطلاعات کے مطابق ایک بارہ سالہ لڑکی اور تیرہ سالہ لڑکے کے جنسی تعلقات نے کم سنی

میں 'والدین' بننے کا ایک نیا ریکارڈ قائم کر دیا، یہ خبر انٹرنیٹ پر آج بھی موجود ہے اور دنیا بھر کی متعدد سائٹوں (Sites) پر دیکھی اور پڑھی جا سکتی ہے، مگر المیہ یہ ہے کہ اتنی چھوٹی عمر کے بچوں کو مغربی قانون ''شادی'' کی اجازت نہیں دیتا۔ جس کا مطلب ہے کم سنی کا یہ ریکارڈ برطانیہ کی اس 'ہونہار' لڑکی نے اپنے 'بوائے فرینڈ' کے ساتھ ناجائز رشتہ کے ذریعے قائم کیا ہے، مگر یہ وہ 'ناجائز' ہے جس کے لیے برطانیہ کی لغت میں فی الوقت کوئی لفظ نہیں پایا جاتا۔ کیونکہ 'ناجائز' کے لیے آپ وہاں illegal کا لفظ بولیں گے یا Prohibited یا اسی طرح کا کوئی اور لفظ ایسے کسی بھی لفظ سے برطانیہ میں رہنے والے ایک شخص کے ذہن میں اس کا 'قانونی' حوالہ ہی آئے گا، کیونکہ عرصہ ہوا ان الفاظ کا 'مذہبی' حوالہ لوگوں کے سننے اور بولنے میں نہیں آتا، جبکہ اِس رائجِ عام حوالہ کی رو سے اس لڑکے اور لڑکی نے کوئی illegal یا Prohibited کام نہیں کیا تھا، یعنی پیمانے سرتاسر بدل گئے، حقیقت میں یہ واقعہ زیادہ شرمناک ہے، مگر یہ شرمناک اور قابل ملامت برائی اسی وقت تک کسی سماج یا معاشرہ کو تہذیب کے دائرہ تک محدود رکھ سکتی ہے، جب تک اس سماج یا معاشرہ میں اس جنسی آوارگی کو ناجائز اور جرم تصور کیا جاتا ہے، لیکن ایسی توقع بنی نوع انسان سے کی جا سکتی ہے، مگر جب کوئی قوم انسانیت سے رشتہ توڑ لیتی ہے، پھر اسے اس بات کا کوئی احساس نہیں ہوتا کہ وہ جس گناہ کو اپنی جنسی ہوس مٹانے کے لیے جائز بنانے جا رہی ہے، یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ پہلے وہ انسانوں سے اپنا رشتہ توڑ لے، شرم وحیا کی قبا کو تار تار کر دے، حیوانیت کا لبادہ اوڑھ لے، حیوانوں میں شرم اور گناہ کو تلاش کرنا جنگل میں مچھلی تلاش کرنے کے مترادف ہے۔

گناہ کی اسی لت کو ساری دنیا میں عام کرنے کے لیے مغرب اور اس کے پرستاروں نے بسا اوقات ناگزیر ہو جانے والی کم عمری کی شادی کو بھی حرام باور کرا دیا ہے، لہٰذا یہ بارہ سالہ بچی اگر ''شادی'' کے نتیجے میں ماں بنتی تو برطانوی باشندوں کے ہاں یہ ''ناجائز'' ہوتا۔ حمل

کے وقت یہ بچی ظاہر ہے صرف گیارہ برس چند ماہ کی تھی اور اس کا بوائے فرینڈ بارہ برس کا، یہ کمسن مرد اور عورت کسی ''نکاح'' کے نتیجے میں جنسی تعلقات قائم کرتے تو یقینی طور پر قانون اور سماج کی زد میں آتے اور ان کا یہ تعلق قطعی ''ناجائز'' قرار پاتا، جس پر جدید اقدار پر ایمان رکھنے والا برطانوی معاشرہ بلا تاخیر حرکت میں آجاتا اور اس گھر کے بزرگوں کو جیل میں داخل کر دیتا، لبرل میڈیا کی چیخ سے دنیا کیسے لرزتی لیکن برطانیہ میں رونما ہونے والے واقعہ پر ظاہر ہے کوئی ایسا شور نہیں اٹھا چونکہ انہوں نے ''نکاح'' جیسا کوئی گناہ نہیں کیا، اس لیے گیارہ سال کی اِس بچی اور بارہ سال کے اِس بچے کا تعلق جائز ٹھہرا اور اس کے نتیجے میں اولاد کا پیدا ہونا بھی قطعی ناقابل اعتراض، رپورٹ کا کہنا ہے ننھے والدین اپنی اس کارگزاری پر بے حد خوش ہیں اور مل کر اپنی بچی کی پرورش کا ارادہ رکھتے ہیں، لوگوں کو تعجب ہے تو ان کی کمسنی پر نہ کہ کسی ''کمسن جنسی ہوس '' پر۔

مذہب اسلام کے خلاف ہرزہ سرائی کے راستے نکالے جاتے ہیں اور یہ سب اس لیے انجام دیا جاتا ہے کہ مذہب فطرت کے ذریعہ کھولے گئے صرف اور صرف حلال کے دروازے بند کروانا ہی مغرب اور اس کے ذہنی وفکری غلاموں اور حیاسوز طاقتوں کا اصل ہدف اور مقصود ہے۔

حلال کے دروازے بند ہوں گے تو حرام کے دروازے خود بخود کھلیں گے، کیونکہ انسانی خواہش اور ہارمونز (Hormones) کو بڑھنے سے آپ بیڑیاں ڈال کر نہیں روک سکتے، جب آپ ''حلال'' پر قانونی یا 'اخلاقی' بیڑیاں ڈالیں گے تو وہ ہارمونز حرام ذریعے سے خود بخود اپنا راستہ بنالیں گے اور کمسنی کی حرام کاری کے واقعات بکثرت ہوں گے۔ طرفہ یہ کہ خود مغرب پرستوں کا یہ کہنا ہے کہ ہارمونز پر اپنا طبعی عمل کرنے کے معاملے میں پابندی لگانا غلط ہے، مگر وہ یہ اس لیے کہتے ہیں کہ ان کے ہاں حرام کا راستہ کھلا ہے۔ (۱)

---

(۱) کم سنی کی شادی اور اسلام، مولانا سلطان احمد اصلاحی: ۵۔

بے جوڑ شادیاں نہ کریں

ایک ۱۶ سالہ لڑکی کی ۶۵ سالہ عمانی شخص سے شادی کی تحقیقات کا اس وقت آغاز ہوا تھا جب ۵ لاکھ بھارتی روپے (۸۰۰۷ ڈالرز) میں فروخت کی جانے والی لڑکی نے مسقط سے اپنی ماں سے رابطہ کرتے ہوئے مدد طلب کی تھی حیدرآباد پولیس کے مطابق مذکورہ لڑکی کے والد نے اس کی عمر کے حوالے سے جھوٹی دستاویزات تیار کیں کیونکہ بھارت میں لڑکیوں کی شادی کے لیے مقرر قانونی عمر ۱۸ سال ہے، کم عمر لڑکیوں کی فروخت اور عمر رسیدہ غیر ملکیوں سے شادی کے خلاف مہم کا آغاز کرنے والے افراد کا کہنا ہے کہ ہر سال بھارت میں ایسی بہت سی شادیاں ہوتی ہیں جن میں سے اکثر میں لڑکیوں کو جسمانی یا جنسی طور پر بدسلوکی کا نشانہ بنایا جاتا ہے یا گھریلو قید میں دھکیل دیا جاتا ہے۔

کم عمری کی شادی چند غور طلب پہلو

فقیہ العصر حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم : آزادی کے بعد مختلف ریاستوں نے اس طرح کے قانون بنائے ہیں، جن میں لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے نکاح کی کم سے کم ۱۸ / سال مقرر کی گئی ہے، جو لوگ شادی کے لئے ایک مخصوص عمر متعین کرنا چاہیے ہیں ان کا خیال ہے کہ کم عمری کی شادی لڑکیوں کی صحت کے لئے نقصان دہ ہے، کہ جسمانی نشو و نما کی تکمیل اور تولید کی مناسب صلاحیت پیدا ہونے سے پہلے ہی ان کو ماں بننا پڑتا ہے ،جس سے ان کی صحت پر منفی اثر پڑتا ہے، اس سلسلہ میں کئی باتیں قابل غور ہیں،

اول : یہ کہ جسمانی نشو و نما تمام لڑکوں اور لڑکیوں میں یکساں طور پر نہیں ہوتا ، موسمی حالات ، غذا ، ماحول اور موروثی اثرات کے تحت بلوغ کی عمر مختلف ہوتی ہے اور جسمانی قویٰ اور تولید کی صلاحیت میں بھی فرق ہوتا ہے ، نہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ۱۸ / سال کے بعد لڑکیوں میں لامحالہ ایسی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے کہ ماں بننا ان کی صحت کے لئے مضرت رساں نہ

ہو،اس لئے ۱۸/سال ہی کی تعیین قابل فہم نہیں ، قانونِ فطرت کے تحت عورت کی اس صلاحیت کااصل معیار وہی ہے کہ جب وہ بالغ ہو جاتی ہے اسمیں بنیادی طور پر حاملہ ہونے کی صلاحیت بھی پیدہو جاتی ہے۔

دوسرا: قابل غور پہلو یہ ہے کہ اس وقت ٹی وی کے فروغ ،فحش رسائل کی کثرت ، انٹرنیٹ اور بیہودہ فلموں کے ویڈیو اوران فلموں تک کم عمرلڑکوں کی رسائی کی وجہ سے صورتِ حال یہ ہے کہ نابالغ بچے تک جنسی بے راہ روی میں مبتلا ہو رہے ہیں ،شادی سے پہلے ناجائز اسقاط حمل کی کثرت ہوگئی ہے،سوال یہ ہے کم عمری کا نکاح زیادہ نقصان دہ ہے یاکم عمری کے جنسی تجربات؟ یقیناً بے قید جنس پرستی زیادہ مضر ہے،تواگر ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ ماں باپ اپنے لڑکوں اورلڑکیوں کے اخلاق وکردار کی حفاظت کے لئے بلوغ کے بعد جلد سے جلدان کا نکاح کردینا مناسب سمجھتے ہوں تو کیایہ بات مناسب نہیں ہوگی کہ انہیں اس عمر سے پہلے ہی نکاح کی اجازت دی جائے ؛تاکہ وہ اپنے بچوں کوفساد اور بگاڑ کے گڑھے میں جانے سے بچاسکیں ،اصل مسئلہ کم عمری میں شادی کا نہیں ؛ بلکہ کم عمری میں جنس پرستی کا مسئلہ ہے حکومت کواورسماجی تنظیموں کو چاہیے کہ یہ جو بے راہ روی کا طوفان ملک میں آرہا ہے اور ہماری تعلیم گاہوں کو اپنا ہدف بنارہاہے ،پہلے اس کے سد باب کی کوشش کریں ،مثلاً امریکہ میں ۲۱ / سے ۱۷ / سال کے بچوں کی طرف سے دوسرے بچوں کے ساتھ جوجنسی زیادتی ۲۰۰۴ءمیں ریکاڈ کی گئی ہے،وہ لڑکوں کی طرف سے ۵۴۲۱۰ /اورلڑکیوں کی طرف سے ۹۷۶ ہے۔(۱) اگر چہ یہ امریکہ کے اعداد وشمار ہیں، ہندوستان کے اعداد وشمار دستیاب نہیں ہو سکے ؛لیکن اگر صحیح صورت حال سامنے آئے تو شاید ہندوستان کی صورت حال اس سے مختلف نہ ہو۔

---

(۱) source :us department of justice federal bereau of investigation 2004

تیسری بات : یہ ہے کہ کم سنی کے نکاح کے واقعات اب خود ہی کم ہوتے جا رہے ہیں، چودہ پندرہ سال کی عمر میں لڑکے اور لڑکیاں میٹرک کرتے ہیں، اب لڑکوں کے ساتھ ساتھ لڑکیوں میں اعلیٰ تعلیم کا رجحان روز افزوں ہے اور تعلیم کے درمیان عام طور پر شادی نہیں کی جاتی، لڑکوں کے لئے تو تعلیم کے بعد حصولِ روزگار کا بھی مسئلہ ہے، تلاشِ روز میں کئی سال نکل جاتے ہیں اور اس کے بعد ہی لڑکے شادی کی طرف راغب ہوتے ہیں، اس طرح قانون میں جو عمر متعین کی گئی ہے، عام طور پر اس سے کہیں زیادہ عمر میں لڑکوں اور لڑکیوں کی شادیاں ہوتی ہیں، جوں جوں تعلیم عام نہ ہوگی صرف قانون کے ذریعہ اس مقصد کو حاصل نہیں کیا جا سکتا ہے؛ کیوں کہ ایسی شادی کے واقعات شہر میں بہت کم پیش آتے ہیں، زیادہ تر دور دراز دیہاتوں میں اس طرح کا رواج پایا جاتا ہے اور اس کی نوبت بھی بہت کم آتی ہے کہ وہ معاملات عدالت کے سامنے آئیں عموماً وہ قانون کے دائرہ سے باہر ہی رہتے ہیں، اس کا اندازہ درج ذیل اعداد شمار سے لگایا جا سکتا ہے :

1981ء	43;4
1991ء	35;3
2001ء	14;4
2011ء	3;7

چوتھی بات یہ ہے کہ بعض لوگ اس کو مسلمانوں کے ایک سماجی مسئلہ کی نظر سے دیکھتے ہیں؛ حالاں کہ کم سنی کی شادی کے واقعات مسلمانوں میں بہت کم ہیں، خود ہندوؤں میں ان سے کہیں زیادہ ہیں، راجستھان میں اب بھی ''اکھا تیج'' کے موقع پر ہزاروں شیر خوار لڑکیوں کی شادی کر دی جاتی ہیں، راجستھان مدھیہ پردیش، اڑیسہ اور ہریانہ وغیر کے بعض علاقوں میں ہندو سماج میں بہت ہی کم سنی میں نکاح کا رواج پایا جاتا ہے اور اس کا تناسب مسلمانوں سے کہیں زیادہ ہیں، مثلاً ۲۰۱۱ء کے ایک سرکاری سروے رپورٹ کے مطابق ۱۰؍سال سے

کم عمر کے لڑکے اور لڑکیوں کی شادی کا تناسب ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اس طرح ہے :

ہندو لڑکے : 3;56 مسلم لڑکے 0;49

ہندو لڑکیاں : 6;65 مسلمان لڑکیاں 0;88

کم سنی کے نکاح زیادہ تر چونکہ دیہاتوں میں ہوتے ہیں، اس لئے شہر اور دیہاتوں کے اعتبار سے بھی اس کا تناسب ذکر کیا گیا ہے :

دیہی علاقہ

ہندو لڑکیاں 50;34 فی لاکھ

مسلمان لڑکیاں 2;62 فی لاکھ

ہندو لڑکے 23;93 فی لاکھ

مسلمان لڑکے 5;34 فی لاکھ

شہری علاقہ

ہندو لڑکیاں 16;16 فی لاکھ

مسلمان لڑکیاں 3;39 فی لاکھ

ہندو لڑکے 11;67 فی لاکھ

مسلمان لڑکے 2;29 فی لاکھ

(source:census of india spend)

اصل مسئلہ ان رواجات کو روکنا ہے، بالخصوص اس پس منظر میں ہندو معاشرہ میں نکاح کے معاملہ میں لڑکی کی رضامندی اور ناراضگی کو بہت کم اہمیت دی جاتی ہے اور ان پر رشتے تھوپ دیئے جاتے ہیں خاص کر کم عمری میں کئے گئے نکاح میں، ظاہر ہے کہ اصل عاقدین

کا کوئی حصہ نہیں ہوتا ، اسلام میں اکثر حالات میں نابالغی کے نکاح کی صورت میں بالغ ہونے کے بعد لڑکے کو "خیار بلوغ" حاصل ہوتا ہے اور وہ اس نکاح کو رد کر سکتے ہیں ۔

ہندو معاشرہ میں نکاح کے سلسلہ میں اور بھی قابل اصلاح رسوم ہیں آج بھی "ستی" کے واقعات سننے کو ملتے ہیں، آج بھی ہزاروں خواتین بھگوان کی مورتیوں سے بیاہ دی جاتی ہیں اور بھگوان کی آڑ میں سنت اور "مہنت" ان کو اپنی ہوس کا سامان بنائے رہتے ہیں؛ آئے دن کسی نہ کسی مندر کے سوامی جی جنسی ہوس کے جرم میں پکڑے جاتے ہیں، بلکہ بعض قبائل اور علاقوں میں چند شوہری کے واقعات بھی ملتے ہیں ،اصل میں ایسی سماجی برائیوں کی اصلاح کی طرف ذرائع ابلاغ کو متوجہ ہونا چاہیے کہ یہ زیادہ قابل اصلاح ہیں۔

پانچویں بات: یہ ہیکہ اس سلسلہ میں اسلامی نقطۂ نظر کو سمجھنے کی ضرورت ہے، ایسا نہیں ہے کہ اسلام میں کم سنی اور نابالغی کے نکاح کو زیادہ بہتر قرار دیا گیا ہے، مسلم معاشرہ میں ہمیشہ سے یہ معمول رہا ہے کہ لڑکے اور لڑکیوں کے بالغ ہونے کے بعد ہی ان کا نکاح کیا جاتا ہے ،خود قرآن مجید نے بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے، کہ یتیموں کو آزماؤ ، جب وہ نکاح کو پہنچ جائیں اور تم ان سے ہوش مندی محسوس کرو تو ان کا مال ان کے حوالہ کردو : "وابتلوا الیتامی حتی إذا بلغوا النکاح فإن آنستم منھم رشدا فادفعوا إلیھم أموالھم ولا تأکلوھا إسرافا"

آیت سے واضح ہوا کہ بہتر طریقہ یہی ہے کہ بالغ ہونے کے بعد لڑکوں اور لڑکیوں کے نکاح کئے جائیں، پھر اسلام میں رشتہ کے انتخاب کی جو آزادی عاقدین کو دی گئی ہے اور اس سلسلہ میں لڑکوں کی طرح لڑکیوں کو بھی اپنی ذات کے بارے میں فیصلہ کرنے کا جو اختیار دیا گیا ہے، اس کا تقاضا بھی یہی ہے؛ کیوں کہ بالغ ہونے کے بعد ہی وہ قانوناً اس اختیار کو استعمال کرنے کے اہل ہوں گے اور اس عمر کو پہنچنے کے بعد ہی انسان کے اندر بھلے اور برے کی تمیز بھی پیدا ہوتی ہے؛ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسلام نے بالغ ہونے سے

پہلے بھی نکاح کی گنجائش رکھی ہے اور مختلف صحابہ نے کم عمری میں بچوں کے نکاح کئے ہیں، حضرت قدامہ بن مظعون، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عروہ بن زبیر، حضرت علی، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عمر، اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنھم اجمعین وغیرہ نابالغی کی عمر میں بچوں اور بچیوں کا نکاح کرنا یا نابالغی کے نکاح کے جائز ہونے کی صورت منقول ہے، خود رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا تو وہ نابالغہ تھیں اور یہ بھی ثابت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے چچازاد بہن حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی کا نکاح حضرت عمر بن ابی سلمہ رضی اللہ عنہ سے اس وقت کیا جب وہ نابالغہ تھیں؛ چنانچہ ابن شبرمہؒ اور ابن اصمؒ کے علاوہ تمام محدثین اور فقہاء کا نکاحِ نابالغاں کے جواز کے قائل رہے ہیں؛ اس لئے یہ فقہاء اسلام کے درمیان ایک اجماعی مسئلہ ہے، مشہور حنفی فقیہ علامہ سرخسیؒ نے اس سلسلہ میں تفصیل سے صحابہ کے آثار اور فقہاء کے اقوال ذکر کئے ہیں۔(۱)

یہ اجازت اس لئے دی گئی ہے کہ بعض دفعہ مصلحت کا تقاضا یہی ہوتا ہے، دو مصلحتیں تو بہت ہی بنیادی ہیں، ایک یہ کہ بعض اوقات اخلاقی بگاڑ کا اندیشہ ہوتا ہے، نکاح کی وجہ سے ایک جائز راہ کھل جاتی ہے اور یہ بات اسے ناجائز رُخ پر جانے سے بچاتی ہے، اگر ایسے حالات سامنے ہوں اور ۱۸ سال تک نکاح کو روکے رکھا جائے تو اس سے بہت سے اخلاقی مفاسد پیدا ہو سکتے ہیں اور یہ اخلاقی بگاڑ بیک وقت صحتِ جسمانی کے لئے بھی مضر ہے، اور ساتھ ہی سماج کے دوسرے لوگ بھی اس سے متاثر ہوتے ہیں؛ کیوں کہ کوئی شخص جب اخلاقی مفاسد کا مرتکب ہوتا ہے تو وہ اس کے لئے سماج ہی میں اپنی غذا تلاش کرتا ہے، اسلام میں حفاظت اخلاق کی بڑی اہمیت ہے والدین بھی اس سلسلہ میں جوابدہ ہیں، چنانچہ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جس کو بچہ ہو، تو اسے چاہیے کہ اس کا اچھا نام رکھے اور اس کی

(۱) تفصیل کیلئے دیکھئے : مبسوط ۱۴ : / ۱۴۔ ۱۲

تربیت کرے پھر جب وہ بالغ ہو جائے تو اس کا نکاح کردے، اگر بالغ ہونے کے باوجود اس کا نکاح نہیں کیا، اور وہ گناہ میں مبتلا ہو گیا تو اس کے باپ پر بھی اس کا گناہ ہوگا: ”فانما اثمه علی ابیه“(۱)

دوسری اہم مصلحت یہ ہے کہ بعض دفعہ باپ لب گور ہوتا ہے، ظاہری حالات کے تحت اندیشہ ہے کہ اس کے بچوں کو یتیمی کا داغ لگنے والا ہے، اور اس کے موت کے بعد خاندان میں ایسے ذمہ دار اور دیانت دار لوگ نہیں ہیں، جن سے امید رکھی جاسکے کہ وہ صحیح طور پر بچوں کی تربیت کرسکیں گے اور مناسب رشتہ دار تلاش کر کے اس کے سہارا بچوں کی شادی کریں گے، ابھی بچے نابالغ ہیں؛ لیکن ایک موزوں اور مناسب رشتہ ہاتھ آرہا ہے، تو ایسی صورت میں یقینا مصلحت یہی ہے کہ اس وقت اس کا نکاح کردیا جائے کہ اس میں اس کے لب گور سرپرست کے لئے سکون قلب بھی ہے، اور اس کے بچوں کے مستقبل کے محفوظ ہونے کی امید بھی۔

یقیناً یہ مصلحتیں ایسی نہیں ہیں، جنہیں نظر انداز کردیا جائے، اس لئے قانون ایسا بنانا چاہیے جس میں مفادات کو حاصل بھی کیا جائے اور نقصانات سے حفاظت بھی ہو، یہ کہا جاسکتا ہے کہ جہاں تک ممکن ہو، نابالغی کے نکاح سے بچا جائے، اگر باپ اور دادا کے علاوہ دوسرے اولیاء نکاح کریں یا باپ یا دادا ہی نکاح کریں، لیکن وہ اپنے اختیارات کا صحیح استعمال کرنے کے اہل نہ ہوں تو بالغ ہونے کے بعد لڑکوں اور لڑکیوں کو اس نکاح کے باقی رکھنے یا ختم کردینے کا اختیار دیا جائے، یہ حدود و قیود جن کی اسلام میں رعایت کی گئی ہے، اگر ملحوظ ہوں تو کم سنی کے نکاح کی مضرتوں سے بچا بھی جاسکتا ہے، اور اس کی مصلحتیں حاصل بھی کی جاسکتی ہیں۔(۲)

---

(۱) شعب الایمان، حقوق الاولاد والاھلین، حدیث: ۹۹۲۳

(۲) ماخوذ: مسلم پرسنل لا اور بعض غلط فہمیاں: ۱۹۔

کم عمری کی شادی کا نقصان دہ پہلو

اسلام میں شادی ایک مذہبی ، معاشرتی اور اخلاقی فریضہ ہے جو خاندانی بقا کا بھی ضامن ہے اور معاشرتی اقدار کی پاسداری کا ذریعہ بھی،لیکن کیا کم سنی کی شادی اچھی اور کامیاب ثابت ہوسکتی ہے؟ کیونکہ شادی بذات خود ایک ذمہ داری کا نام بھی ہے، بچوں کی جلد شادی کردینا ان کے مسائل کا حل نہیں ہے بلکہ اس سے ان کے مسائل میں مزید اضافہ ہے جسے وہ نسل درنسل بھگتتے رہتے ہیں،کم عُمری میں وہ ماں بن جاتی ہے تو اس کا کیا مطلب ہے؟ ایک بچہ دوسرے کی پرورش کررہا ہوتا ہے،کم عُمر لڑکیاں جو ذہنی ،جسمانی و جذباتی لحاظ سے ابھی اس قابل نہیں ہوتیں کہ انہیں خود کو کیسے سنبھالنا ہے ہم انہیں بیاہ کے بعد بچے پیدا کرنے اوران کی پرورش جیسے مشکل کام میں دھکیل دیتے ہیں،ان بچیوں کے لئے سب سے بڑی محرومی یہ ہے کہ ان کی بچپن کی شادیوں نے ان سے ان کا بچپن ہی چھین لیا ہے، وہ سارے سپنے جو وہ اپنی آنکھوں میں چھپائے پھرتی تھیں ان کو مسخ کردیا ہے۔

اقوامِ متحدہ کی رپورٹ

۱۲ ستمبر ۲۰۱۴ء کو عالمی ادارہ یونیسف کی جانب سے ایک رپورٹ منظر عام پر آئی جو ہندوستان کے لیے بے حد چونکا دینے والی ہے، اقوام متحدہ کا کہنا ہے کہ جنوبی ایشیا میں لڑکیوں کی کل آبادی میں سے تقریباً نصف کی شادیاں ۱۸/ سال سے کم عمری میں کردی جاتی ہے، خطے میں اب بھی دس لاکھ سے زائد نومولود صحت کی ناقص صورتحال کے باعث ہلاک ہو جاتے ہیں۔

اقوام متحدہ کے مطابق ہر پانچ میں سے ایک لڑکی کی ۱۵/ سال کی عمر تک پہنچنے سے قبل ہی بیاہ کردی جاتی ہے جو دنیا بھر میں بچوں کی شادی (چائلڈ میرج) کی سب سے بڑی شرح ہے۔

یونیسیف ساؤتھ ایشیا کے ریجنل (Regional) ڈائریکٹر ’’کرین ہلشوف‘‘ نے کہا ہے کہ دنیا بھر میں زچگی یا بچوں کی پیدائش کے حوالے سے جنوبی ایشیا خطرناک ترین خطہ ہے جہاں دوسرے نمبر پر سب سے زیادہ نومولود کی اموات ہوتی ہیں، یونیسیف کے مطابق بہت سی بچیوں کو جنس معلوم ہونے پر پیدائش سے قبل ہی قتل بھی کر دیا جاتا ہے۔

ملک بنگلہ دیش میں ہر تین میں سے دو لڑکیوں کی بلوغت سے قبل ہی شادی کر دی جاتی ہے جس کے باعث خواتین کا جنسی استحصال اور ان پر گھریلو تشدد کیا جاتا ہے، جنوبی ایشیا میں بچوں میں غذائی قلت کے باعث پانچ سال سے کم عمر تقریباً ۴۰/ فیصد بچوں کی صحیح نشوونما نہیں ہو پاتی۔

یاد رہے کہ دنیا بھر میں صحیح نشوونما نہ ہونے کے باعث ہر سال تقریباً دس لاکھ بچے ہلاک ہو جاتے ہیں یا اس سے ان کی صحت پر انتہائی منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں ۱۹۹۰ء میں یہ شرح ۶۰ فیصد کے قریب تھی لیکن اب اس میں کمی آئی ہے اور اب یہ شرح ۴۰ فیصد سے کم ہے، تاہم خطے میں شدید عدم مساوات ہے اور پانچ سال سے کم عمر تقریباً آدھے ہندوستانی بچے نشوونما کی شدید کمی کا شکار ہیں جن کی تعداد چھ کروڑ سے زائد بنتی ہے۔

یہ رپورٹ بچوں کے حقوق کے حوالے سے کنونشن کی ۲۵ ویں سالگرہ کے موقع پر جاری کی گئی، جس میں مزید کہا گیا ہے کہ گزشتہ کچھ سالوں میں جنوبی ایشیا کے تمام آٹھ ملکوں ہندوستان، پاکستان، افغانستان، نیپال، بھوٹان، مالدیپ، سری لنکا اور بنگلہ دیش میں بچوں کی زندگیوں میں واضح بہتری دیکھی گئی ہے۔

اسی نوعیت کا دوسرا انکشاف بچوں کے لیے کام کرنے والے بین الاقوامی امدادی ادارے ’سیو دا چلڈرن‘ (Save the children) کی حالیہ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ ہر ۷ لڑکیوں میں ۱۵ سال سے کم عمر ایک بچی کی شادی ہو جاتی ہے، یہ رپورٹ ۲۰۱۵ء/۱۱/ اکتوبر کو ’لڑکیوں کے بین اقوامی دن‘ کے موقع پر جاری کی گئی، دنیا کی ایک ارب سے زائد

لڑکیوں کے حقوق اور ان کو درپیش چیلنجز کو تسلیم کرنے کے لیے اقوام متحدہ کی جانب سے ۲۰۱۱ءمیں اس دن کو منانے کا اعلان کیا گیا تھا، خبر رساں ایجنسی ’رائٹرز‘ کے مطابق رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ افغانستان، یمن، ہندوستان، پاکستان اور صومالیہ سمیت کئی ممالک میں ۱۰سال تک کی عمر کی لڑکیوں کی اکثر ان کی عمر سے کئی سال بڑے عمر کے مردوں سے شادیاں ہو جاتی ہیں، رپورٹ میں لڑکیوں کی شادی کے حوالے سے دنیا کے مختلف ممالک کی درجہ بندی کی گئی ہے، یہ درجہ بندی لڑکیوں کی کم عمری میں شادی، اسکول جانے، کم عمری میں حمل، زچگی میں اموات اور پارلیمنٹ میں خواتین کی تعداد کے مطابق کی گئی ہے۔

اس درجہ بندی میں نائیجریا، چاڈ، جمہوریہ وسطی افریقہ، مالی اور صومالیہ سب سے نیچے ہیں، جبکہ ۱۴۴میں سے ہندوستان، پاکستان اور افغانستان بالترتیب ۸۸، ۹۰اور ۱۲۱ویں نمبر پر ہیں، محققین کا کہنا ہے کہ تنازعات، غربت اور انسانی بحران لڑکیوں کی کم عمری کی شادی کے اہم عوامل ہیں۔

رپورٹ کے مطابق سیرالیون میں ایبولا کی وبا سے اسکول بند ہونے کے نتیجے میں تقریباً ۱۴ہزار کم عمر لڑکیاں حاملہ ہوگئیں، اقوام متحدہ کے ادارے یونیسف نے خبر دار کرتے ہوئے کہا ہے کہ کم عمری میں شادی کے واقعات، جو آج تقریباً ۷۰ کروڑ ہیں، ان کی ۲۰۳۰ تک بڑھ کر تقریباً ۹۵ کروڑ ہو جائے گی، یونائیٹڈ نیشنز (United Nations) پاپولیشن فنڈ کے مطابق ۲۰۱۱سنہ سے ۲۰۲۰سنہ کے درمیان دنیا بھر میں تقریباً ۱۴۰ ملین لڑکیاں کم عُمری کی شادی کر دی گئی، کم سنی کی شادیاں دنیا بھر میں ہو رہی ہیں اور براعظم افریقہ میں ان کا تناسب سب سے زیادہ ہے، اقوام متحدہ کے ادارے یونیسف کے مطابق یہاں سالانہ ۱۲۵ ملین ایسی شادیاں ہوتی ہیں اور اگر ایسا ہی ہوتا رہا تو انکی تعداد ۲۰۵۰سنہ میں ۳۱۰ ملین سالانہ تک پہنچ جائے گی۔

سعودی عرب کی رپورٹ

یہ سماجی خرابی مختلف حوالوں سے عربوں میں بھی پائی جاتی ہے، چنانچہ گزشتہ چند برسوں سے عرب ممالک میں کم سنی کی شادی کے خلاف سیمینار اور محاضرات کے ذریعہ اسے روکنے کی کوشش کی جارہی ہے، ۸ نومبر ۲۰۱۲ء کو سعودی عرب میں کم سنی کی شادی روکنے سمیت شادی کی عمر متعین کرنے کے موضوع پر ایک سمینار منعقد کیا گیا جس میں سعودی عرب کے سینئر علماء پر مشتمل کونسل کے سابق رکن شیخ عبداللہ آل رکبان شریک تھے، عرب مملکت کے دیہی علاقوں میں بدّو کمیونٹیز (Baddu community) میں آج بھی کم سن بچیوں کو مال دار افراد کے ہاں شادی کے نام پر فروخت کرنے کا سلسلہ جاری ہے، یہ بات اہمیت کی حامل ہے کہ شوہر اور بیوی کے درمیان عمر کا تفاوت مناسب ہو تاکہ وہ صحت مندانہ ازدواجی تعلقات استوار کرسکیں

امام محمد بن سعود یونیورسٹی کے کلیہ سماجی علوم میں سماجیات کے پروفیسر ڈاکٹر علی بن عبدالرحمان الرومی نے سمینار سے خطاب کرتے ہوئے بتایا کہ سعودی عرب میں پانچ ہزار چھ سو بائیس لڑکیوں کی چودہ سال سے کم عمر میں شادی ہوئی تھی اور یہ تعداد ملک کی کل آبادی کا ایک فی صد سے زیادہ نہیں ہے، تاہم عرب علماء کا یہ رخ اب واضح ہو چکا ہے کہ وہاں بھی شادی کے لیے عمر متعین کرنے کی ضرورت کو محسوس کیا جانے لگا ہے۔

مذکورہ بالا رپورٹوں اور تفصیلات سے یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ کم عمری کی شادی بالخصوص لڑکیوں کے لیے قاتل اور ان کی زندگیوں کو تباہ کر دینے والی ہے، مولانا سلطان احمد مرحوم کم عمری کی شادی کا جائزہ لیتے ہوئے اس کے طبی مفاسد پر روشنی ڈالتے ہیں۔

کم عمری کی شادی کا طبی نقصان

جدید طبی تحقیقات سے ثابت ہے کہ لڑکی کے بدن کا نشوونما اٹھارہ برس کی عمر تک ہوتا

رہتا ہے۔ وہ پندرہ سولہ سال کی عمر میں جوان ضرور دکھائی دیتی ہے، لیکن رحم اور بیضہ دانی کی نشوونما اٹھارہ برس تک ہوتی رہتی ہے۔ اس کے نتیجے میں لڑکی اگر اٹھارہ برس سے کم عمر میں ماں بن جائے تو اس کو درج ذیل نقصان پہنچتے ہیں۔

(۱) لڑکی کے بدن کی نشونما رک جاتی ہے۔

(۲) چونکہ اٹھارہ برس کی عمر میں رحم اور بچہ دانی جیسے بچہ جننے کے کچھ اعضاء کی نشو ونما مکمل نہیں ہوتی اس سے حمل اکثر گر جاتا ہے، ماں بننے میں دقتیں پیش آتی ہیں۔

(۳) پیڑو کی نشوونما اٹھارہ سال سے پہلے مکمل نہیں ہو پاتی، اس لیے بچہ کا سر بڑا ہو سکتا ہے، بچہ جننے میں رکاوٹ سے اندرونی اعضاء کو نقصان پہنچ سکتا ہے، جس سے مثانے اور اوجھڑی میں کمزوری آجاتی ہے۔

(۴) کم عمری میں مجامعت سے رحم کے دہانے میں کینسر کے امکان بہت زیادہ بڑھ جاتے ہیں۔ ہندوستانی عورتوں میں یہ کینسر کی بڑی وجہ ہے۔

(۶) اس طرح کی شادی کی صورت میں عام طور پر حمل بہت جلد ٹھہر جاتا ہے، جس سے عورت کی صحت برباد ہوجاتی ہے اور وقت سے پہلے اس پر بڑھاپا طاری ہو جاتا ہے۔(۱)

اسلامی مزاج یہی ہے کہ ایک ماں کو بچوں کی تربیت بھی کرنی ہوتی ہے، اس کے لیے وقت درکار ہوتا ہے، پیسے کی ضرورت پڑتی ہے، اچھا ہمدرد شوہر چاہیے ہوتا ہے جسے بحیثیت شوہر اپنی ذمے داریوں کا احساس ہو، اگر آپ کا شوہر اس قابل نہیں تو اپنے وجود اور بچوں کے مستقبل پر رحم فرمائیے، شادی سزا نہیں ہوتی اور شوہر حاکم اور آپ ملازم نہیں ہوتیں، ہمارے ہاں بس یہی رجحان پایا جاتا ہے کہ بس جلدی جلدی بچے ہوں گے تو ایک ساتھ بڑے ہو جائیں گے، ماں کو زیادہ محنت نہیں کرنا پڑے گی۔ یہ نہیں سوچتے کہ ہر بچہ الگ توجہ مانگتا ہے، ایسا نہیں ہوتا کہ سب بچوں کو ایک ساتھ بھوک لگے، نیند آئے، سارے ایک ساتھ

---

(۱) کم سنی کی شادی اور اسلام: ۳۰۔

کھیلیں اور ایک ساتھ نیند لیں۔(مضامین ڈاٹ کام) اس تفصیل سے پتہ چلا کہ اسلام کم عمری کی شادی پسند نہیں کرتا ہے اور نہ حکم کرتا ہے حالات پر احکام کا مدار ہوتا ہے۔

بلوغ کے بعد نکاح میں عجلت

جب لڑکے لڑکیاں بالغ ہو جائیں تو ان کا نکاح جلد کر دینا چاہیے؛ تا کہ وہ گناہ میں مبتلا نہ ہو؛ چنانچہ قرآن مجید میں بھی غیر شادی شدہ بالغ لڑکوں اور لڑکیوں کے نکاح کا حکم دیا گیا ہے ارشاد ہے "وَأَنْكِحُوا الْأَيَامَى مِنْكُمْ"(۱) اس کے علاوہ متعدد حدیثوں میں بھی اس کا ذکر موجود ہے؛ چنانچہ بعض احادیث یہاں نقل کی جاتی ہیں: رسول اللہ ﷺ نے ہم لوگوں سے فرمایا: اے نوجوان کا گروہ! تم میں سے جو بیوی کے مالی حقوق ادا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو، اسے نکاح کر لینا چاہیے؛ اس لئے یہ نگاہوں کو پست رکھنے والا اور عصمت وعفت کا حافظ ہے۔" لقد قال لنا رسول الله صلى الله عليه وسلم: يا معشر الشباب، من استطاع منكم الباءة فليتزوج، فإنه أغض للبصر، وأحصن للفرج"(۲)

عمر بن خطاب اور انس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول ﷺ نے فرمایا: تورات میں لکھا ہوا ہے کہ جس کی بیٹی بارہ سال کی عمر کو پہنچ گئی۔ اس نے اس کا نکاح نہیں کیا اور وہ گناہ کی مرتکب ہوئی تو اس کا گناہ اس کے باپ پر ہوگا۔" من بلغت ابنته اثنتي عشرة سنة فلم يزوجها فأصابت إثما فإثم ذلك عليه"۔(۳)

جس کی کوئی اولاد ہو تو اسے چاہئے کہ اس کا نام اچھا رکھے اسے ادب سکھائے، جب بالغ ہو جائے تو اس کا نکاح کر دے، اگر نکاح نہ کرے تو اور اس سے گناہ ہو جائے تو گناہ میں یہ بھی شریک ہوگا۔" من ولد له ولد فليحسن، اسمه وأدبه، فإذا بلغ فليزوجه فإن بلغ

---

(۱) سورۃ نور: ۳۲۔

(۲) صحیح مسلم کتاب النکاح نمبر ۳۴۲۳ ۸۔

(۳) بیہقی فی شعب الایمان باب فی حقوق الاولاد، حدیث نمبر ۹۶۶۸

ولم يزوجه فأصاب إثما، فإنما إثمه على أبيه"(۱)

تاریخ اسلام کی کم عمر دلہنیں

۱۔ام المؤمنین سیدہ عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں: نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے جب نکاح کیا تو وہ چھ سال کی تھیں اور جب انکی رخصتی ہوئی تو وہ نو سال کی تھیں۔اور وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس نو سال تک رہیں۔أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَزَوَّجَهَا وَهِيَ بِنْتُ سِتِّ سِنِينَ، وَأُدْخِلَتْ عَلَيْهِ وَهِيَ بِنْتُ تِسْعٍ، وَمَكَثَتْ عِنْدَهُ تِسْعًا"(۲)

۲۔عمرو بن العاص: کا نکاح کمسنی میں ہوا اور اللہ تعالی نے چھوٹی عمر میں ہی "باپ" کے مقام سے نوازا، ابومحمد اور ابوعبدالرحمن القرشی السہمی : یہ ان لوگوں میں سے ایک ہیں جنہوں نے فتح مکہ سے قبل اپنے والد گرامی کے ساتھ ہجرت کی۔اور انکے والد گرامی (عمرو بن العاص) ان سے فقط گیارہ سال بڑے تھے۔"عبد الله بن عمرو بن العاص العالم الرباني رضي الله عنهما أبو محمد وأبو عبد الرحمن القرشي السهمي :أحد من هاجر هو وأبوه قبل الفتح وأبوه أسن منه بأحد عشر عاما فقط. عالم رباني عبد الله بن عمرو بن العاص"(۳) اس سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ گیارہ سال کی عمر میں باپ بننے والے کی شادی کتنی عمر میں ہوسکتی ہے؟۔

۳۔ام کلثوم بنت علی بن ابی طالب: کی شادی کمسنی میں امیر المؤمنین سیدنا عمر بن الخطابؓ سے ہوئی، نکاح کے وقت سیدہ ام کلثوم کی عمر مبارک تقریبا ۱۱ ربرس تھی، سیدنا عمر بن الخطاب نے سیدنا علی کی بیٹی سیدہ ام کلثوم کے لیے انکی طرف نکاح کا پیغام بھیجا تو سیدنا علی نے ام کلثوم کے چھوٹی ہونے کا ذکر کیا۔"أَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ خَطَبَ إِلَى عَلِيٍّ ابْنَتَهُ أُمَّ

---

(۱) مرقاۃ المفاتیح شرح مشکاۃ المصابیح، حدیث ۳۱۳۸۔

(۲) صحیح البخاری، حدیث: ۵۱۳۳۔

(۳) تذکرۃ الحفاظ: ۱/۳۵۔

كُلْثُومٍ، فَذَكَرَ لَهُ صِغَرَهَا"۔(۱)

علامہ ذہبی اپنی کتاب سیر اعلام النبلاء میں رقمطراز ہیں: ام کلثوم بنت علی بن طالب بن عبد المطلب بن ہاشم الہاشمیہ حسن وحسین کی سگی بہن ہجرت کے چھٹے سال پیدا ہوئیں، اورانہوں نے نبی کو دیکھا، مگر آپ سے روایت نہیں کی۔ "أُمُّ كُلْثُوْمٍ بِنْتُ عَلِيِّ بنِ أَبِي طَالِبِ الهَاشِمِيَّةُ ابْنِ عَبْدِ المُطَّلِبِ بنِ هَاشِمٍ الهَاشِمِيَّةُ، شَقِيْقَةُ الحَسَنِ وَالحُسَيْنِ.وُلِدَتْ :فِي حُدُوْدِ سَنَةِ سِتٍّ مِنَ الهِجْرَةِ، وَرَأَتِ النَّبِيَّ -صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ- وَلَمْ تَرْوِ عَنْهُ شَيْئاً"(۲)

امام بغدادی اپنی کتاب الطبقات الکبری میں فرماتے ہیں: ام کلثوم بنت علی سے سیدنا عمر نے جب شادی کی اس وقت وہ ابھی بالغ بھی نہیں ہوئی تھی وہ انکی وفات تک انکے نکاح میں رہی اور انکے بطن سے سیدنا حضرت عمر رضی اللہ عنہ- کی اولاد میں سے زید بن عمر اور رقیہ بنت عمر پیدا ہوئے۔ "تزوجها عمر بن الخطاب وهي جارية لم تبلغ فلم تزل عنده إلى أن قتل وولدت له زيد بن عمر ورقية بنت عمر ان۔(۳)

۴۔فاطمہ بنت المنذر: کی شادی ہشام بن عروہ بن زبیر سے ۹ سال کی عمر میں ہوئی۔ "قد دخلت بها وهي بنت تسع سنين" میں نے فاطمہ بنت منذر کے ساتھ شب زفاف منائی جبکہ وہ ۹ سال کی تھی۔(۴)

۵۔ہند بنت معاویہ بن ابی سفیان: امیر المؤمنین سیدنا معاویہ بن ابی سفیانؓ نے اپنی اس لخت جگر کی شادی عبد اللہ بن عامر سے کی جبکہ اسکی عمر ۹ برس تھی، اور اسکے لیے اپنے محل کی ایک طرف محل تعمیر کیا اور ان دونوں محلوں کے درمیان دروازہ رکھا۔ "زوج معاوية

---

(۱) الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب: ۴/۱۹۵۵۔

(۲) سیر اعلام النبلاء ۳: ۵۰۰/۔

(۳) الطبقات الکبری: ۸/۳۳۸۔

(۴) (تاریخ بغداد: ۲/۷)

بن أبي سفيان ابنته هندا من عبد الله بن عامر بن كريز وبنى له قصرا إلى جانب قصره وجعل بينهما بابا وأدخلت عليه وهي بنت تسع سنين"۔(۱)

۶۔۷۔عباد بن عباد المہلبی فرماتے ہیں: میں نے اپنوں یعنی مہالبہ میں ایک عورت کو پایا جو کہ اٹھارہ سال کی عمر میں نانی بن چکی تھی۔ ۹ سال کی عمر میں اس نے ایک بیٹی کو جنم دیا۔ تو اسکی بیٹی بھی نو سال کی عمر میں ماں بن گئی۔ اس طرح وہ اٹھارہ سال کی عمر میں نانی بن گئی۔ "أَدْرَكْتُ فِينَا يَعْنِي الْمَهَالِبَةَ امْرَأَةً صَارَتْ جَدَّةً وَهِيَ بِنْتُ ثَمَانِ عَشْرَةَ سَنَةً, وَلَدَتْ لِتِسْعِ سِنِينَ ابْنَةً، فَوَلَدَتِ ابْنَتُهَا لِتِسْعِ سِنِينَ، فَصَارَتْ هِيَ جَدَّةً وَهِيَ بِنْتُ ثَمَانِ عَشْرَةَ سَنَةً"(۲) تاریخ اسلام میں اسکے علاوہ اور بھی دلہنوں کے نام شامل ہیں جو کم عمری میں دلہن بنیں اور کم عمری میں مائیں بھی بن گئیں، اس تفصیل سے پتہ چلا کہ جب قوی مضبوط ہوں تو کم عمری کی شادی نقصان دہ ہی نہیں ہے اور جب قوی کمزور تربیت نا مکمل ہو تو پسندیدہ نہیں ہے۔

کم سنی میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کی حکمت

آپ ﷺ کی غمگسار بیوی ام المؤمنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا رمضان ۱۰ء نبوت میں جب انتقال ہوگیا تو ﷺ نے چار سال بعد یہ ضروری سمجھا کہ آپ ﷺ کے حرم میں کوئی ایسی چھوٹی عمر کی خاتون داخل ہوں جنھوں نے اپنی آنکھ اسلامی ماحول میں ہی میں کھولی ہو اور جو نبی ﷺ کے گھرانے میں آکر پروان چڑھیں، تاکہ ان کی تعلیم و تربیت ہر لحاظ سے مکمل اور مثالی طریقہ پر ہو اور وہ مسلمان عورتوں اور مردوں میں اسلامی تعلیمات پھیلانے کا مؤثر ترین ذریعہ بن سکیں، چنانچہ اس مقصد کے لیے مشیت الٰہی نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو منتخب فرمایا اور شوال ۳ء قبل الہجرہ مطابق ۶۲۰/مئی میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے

(۱) تاریخ دمشق: ۷۰/۱۸۸)

(۲) (سنن الدار قطنی ۴: ۵۰۲/، حدیث ۳۸۸۱:)

آپ ﷺ کا نکاح ہوا، اس وقت حضرت عائشہ کی عمر جمہور علماء کے یہاں چھ سال تھی اور تین سال بعد جب وہ ۹ سال کی ہو چکی تھیں اور اُن کی والدۂ محترمہ حضرت ام رومان رضی اللہ عنہا نے آثار وقرائن سے یہ اطمینان حاصل کرلیا تھا کہ وہ اب اس عمر کو پہنچ چکی ہیں کہ رخصتی کی جاسکتی ہے تو نبی اکرم ﷺ کے پاس روانہ فرمایا اور اس طرح رخصتی کا عمل انجام پایا۔(۱)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے والدین کا گھر تو پہلے ہی نور اسلام سے منور تھا، عالم طفولیت ہی میں انہیں کاشانۂ نبوت تک پہنچادیا گیا تاکہ ان کی سادہ لوح دل پر اسلامی تعلیم کا گہرا نقش مرتسم ہو جائے، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنی اس نوعمری میں کتاب وسنت کے علوم میں گہری بصیرت حاصل کی، اسوۂ حسنہ اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمال و ارشادات کا بہت بڑا ذخیرہ اپنے ذہن میں محفوظ رکھا اور درس وتدریس اور نقل و روایت کے ذریعہ سے اُسے پوری امت کے حوالہ کردیا، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے اپنے اقوال وآثار کے علاوہ اُن سے دو ہزار دو سو دس (۲۲۱۰) مرفوع احادیث صحیحہ مروی ہیں، اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کو چھوڑ کر صحابہ وصحابیات میں سے کسی کی بھی تعدادِ حدیث اس سے زائد نہیں۔

حضرت عائشہ کے ماسواء جملہ ازواج مطہرات رضی اللھعنہ بیوہ، مطلقہ یا شوہر دیدہ تھیں، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کم سنی میں ہی اس لئے نکاح کرلیا گیا تاکہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ عرصہ تک اکتسابِ علوم کرسکیں۔ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے توسط سے لوگوں کو دین وشریعت کے زیادہ سے زیادہ علوم حاصل ہوسکیں۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا (۴۸) اڑتالیس سال زندہ رہیں، زرقانی کی روایت کے مطابق ۶۶ھ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا انتقال ہوا۔ ۹/ برس میں رخصتی ہوئی آپ کے ساتھ ۹/ سال رہیں اور آپ کی وفات کے وقت ان کی عمر ۱۸ برس تھی۔ (زرقانی،

---

(۱) صحیح مسلم: ۲/ ۴۵۶، سیر اعلام النساء صفحہ ۱۱، جلد ۳، مطبوعہ بیروت۔

الاستیعاب) اور صحابہ وتابعین ان کی خداداد ذہانت وفراست، ذکاوت وبصیرت اور علم و عرفان سے فیض حاصل کرتے رہے، اور اس طرح ان کے علمی وعرفانی فیوض و برکات ایک لمبے عرصہ تک جاری رہے۔(۱)

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حضرت عائشہؓ سے نکاح پر اعتراض

بعض مریضانہ ذہن وفکر رکھنے والے افراد کے ذہن میں یہ خلش اور الجھن پائی جاتی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اس کم سنی میں نکاح کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ اور یہ کہ اس چھوٹی سی عمر میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کرنا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے موزوں اور مناسب نہیں تھا؟ چنانچہ ایک یہودی مستشرق نے انٹرنیٹ پر اس قسم کا اعتراض بھی اٹھایا ہے اور اس طرح اس نے بعض حقائق و واقعات، سماجی روایات، موسمی حالات اور طبی تحقیقات سے اعراض اور چشم پوشی کا اظہار بھی کیا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے نکاح اور رخصتی اس کم سنی میں کیوں کر ہوئی؟

اسکا جواب دینے کے لئے ان روایات کی صحت پر کلام کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ اسکو تاریخی پس منظر سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔

عیسائیت میں کم عمری میں شادی

۱۴۰۰ سال پہلے اتنی کم عمری میں شادی ہونا ایک عام سی بات تھی، اور یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ یورپ، ایشیاء، افریقہ اور امیریکہ میں 9 سال سے 14 سال کی لڑکیوں کی شادیاں کردی جاتی تھیں، مثال کے طور پر سینٹ آگاسٹین 350 Saint Augustine AD نے جس لڑکی سے شادی کی اسکی عمر 10 سال تھی، راجا ریچرڈ KING 2،

(۱) زرقانی جلد ۳، صفحہ ۲۲۹ – ۲۳۶، از مضمون: مفتی شکیل منصور القاسمی مجمع عین المعارف للدراسات الاسلامیہ، کنور۔ کیرالہ، ماہنامہ دارالعلوم دیوبند۔

RICHARD-II 1400 AD نے جس لڑکی سے شادی کی اس کی عمر سات سال کی تھی۔

ہینری 8، HENRY 8 نے ایک 6سال کی لڑکی سے شادی کی تھی، یہاں تک کہ عیسائیوں کی پڑھی جانے والی آج کی موجودہ بائبل میں ہے In the book of. Numbers, chapter 31 and verse 17" But Save for yourselves every GIRL who has never slept with a man "" " مگر ہر وہ لڑکی جو باکرہ ہے اسکو اپنے لیئے محفوظ کرلو" عیسائیوں کی کیتھولک ینسائکلو پیڈیا کے مطابق حضرت عیسی علیہ السلام کی والدہ حضرت مریم کا نکاح انکی 12 سال کی عمر میں 99 برس کے جوسف سے ہوئی تھی 1929 سے پہلے تک برطانیہ میں، چرچ آف انگلینڈ کے وزراء 12 سال کی لڑکی سے شادی کر سکتے تھے، 1983ء سے پہلے کیتھولک کینان کے قانون نے اپنے پادریوں کو ایسی لڑکیوں سے شادی کر لینے کی اجازت دے رکھی تھی کہ جنکی عمر 12 کو پہنچ چکی ہو، بہت سارے لوگ اس بات سے ناواقف ہیں کہ امریکہ کے اسٹیٹ آف ڈیلیورا میں 1880 میں لڑکی کی شادی کی جو کم سے کم عمر تھی وہ 8 سال تھی اور کیلیفورنیا میں 10 سال تھی، یہاں تک کہ آج تک بھی امریکہ کے کچھ اسٹیٹس میں لڑکیوں کی شادی کی جو عمر ہے، وہ میسیچوسس میں 12 سال، اور نیو ہیمسفر میں 13 سال اور نیویارک میں 24 سال کی عمر ہے، یہاں تک تو عیسائیت اور مغربی ممالک میں لڑکی کی شادی کی مناسب عمر اور وہاں کے معروف شخصیات کے متعلق تھا، جس سے یہ صاف ثابت ہوتا ہے کہ تاریخی نکتہ نظر سے اس عمر کی لڑکی سے نکاح کرنا ایک عام سی بات تھی اور اسکو کوئی معیوب نہیں سمجھتا تھا۔

ہندو مذہب میں شادی کی عمر

مذہب کی کتاب منوسمرتی میں لکھا ہے،" لڑکی بالغ ہونے سے پہلے اسکی شادی کر دینی

چاہیے"(گوتما18- 21)" اس ڈر سے کے کہیں ایام حیض نہ شروع ہو جائیں، باپ کو چاہیئے کہ اپنی لڑکی کی شادی اسی وقت کردے جب کے وہ بے لباس گھوم رہی ہو، کیونکہ اگر وہ بلوغت کے بعد بھی گھر میں رہے تو اسکا گناہ باپ کے سر ہوگا" واشستھا (17:70 www.payer.de/dharmashastra // http:;manu ix, 88)(Age of Marriage in India-(/dharmash083.htm

ہندوستان میں شادی کی عمر کے متعلق کیمبرج کے سنٹ جانس کالج کے Jack Goody نے اپنی کتاب The Oriental, the Ancient and Primitive میں لکھا ہے کہ ہندوستانی گھروں میں لڑکیاں بہت جلدی ہی بیاہ دی جاتیں تھیں، سری نواس ان دنوں کے بارے لکھتے ہیں جب کہ انڈیا میں بلوغت سے قبل شادی کرنے کا رواج چلتا تھا(1984:11) :لڑکی کو اسکی عمر کو پہنچنے سے پہلے اسکی شادی کردینی ہوتی تھی؛ ہندولا کے مطابق اور ملک کے رواج کے موافق لڑکی کے باپ پر یہ ضروری تھا کہ وہ بالغ ہونے سے پہلے اسکی شادی کردے، گرچہ کہ رخصتی میں اکثر تاخیر ہوتی تھی، جو تقریباً 3 سال ہوتی تھی(The Oriental, the Ancient, and the Primitive, p.208.)اور یہ بات سب جانتے ہیں کہ ایسی کم عمری کی شادیوں کا انڈیا میں آج بھی رواج ہے The Encyclopedia of Religion and Ethics میں لکھا ہے کہ، جس کی بیٹی اس حالت میں بلوغت کو پہنچتی تھی کہ وہ غیر شادی شدہ ہوتو اسکے(ہندو) باپ کو گنہگار سمجھا جاتا تھا، اگر ایسا ہوتا تو وہ لڑکی خود بخود "سدرا"(نچلی ذات) کے درجہ میں چلی جاتی تھی، اور ایسی لڑکی سے شادی کرنا شوہر کے لئے باعث رسوائی ہوا کرتا تھا،منو کی سمرتی نے مرد اور عورت کے لئیے شادی کی جو عمریں طے کی ہیں وہ اسطرح کہ،لڑکا 30 سال کا اور لڑکی 12 سال کی یا لڑکا 24 سال کا اور لڑکی 8 سال کی، مگر آگے چل کر بھرا سپتی اور مہا بھارتہ کی تعلیم کے مطابق ایسے موقعوں پر(ہندو) لڑکیوں کی جو شادی

کی عمر بتائی گئی ہے، وہ 10 سال اور 7 سال ہے، جبکہ اسکے بعد کے شلوکاس میں شادی کی کم ازکم عمر 4 سے 6 سال اور زیادہ سے زیادہ 8 سال بتائی گئی ہے، اور اس بات کے بے شمار شواہد ہیں کہ یہ باتیں صرف تحریر میں نہیں تھیں (یعنی ان پر عمل کیا جاتا تھا) (encyclopedia of religion and ethics, p.450) تو ہندو مذہب کے ماننے والوں کی اپنی کتابوں کے مطابق بھی اس عمر میں شادی کرنا کوئی عیب کی بات نہیں ہے، جولوگ اسپر اعتراض کرتے ہیں یا تو وہ جہالت کی بنیاد پر کرتے ہیں یا سیاسی مفاد کی خاطر، انکو چاہیے کہ پہلے تاریخ کا اور اپنی مذہبی کتابوں کا مطالعہ کریں ۔(۱)

جغرافیائی ماحول کا جائزہ لیں

یہ اعتراض درحقیقت اس مفروضہ پر مبنی ہے کہ حضرت عائشہ-رضی اللہ عنہا- میں وہ اہلیت وصلاحیت پیدا نہیں ہوئی تھی جو ایک خاتون کو اپنے شوہر کے پاس جانے کے لئے درکار ہوتی ہے، حالانکہ اگر عرب کے اس وقت کے جغرافیائی ماحول اور آب وہوا کا تاریخی مطالعہ کریں تو یہ واقعات اس مفروضہ کی بنیاد کو کھوکھلی کردیں گے، جس کی بناء پر حضرت عائشہ-رضی اللہ عنہا کے نکاح کے سلسلہ میں ناروا اور بیجا طریقہ پر لب کو حرکت اور قلم کو جنبش دی گئی ہے۔سب سے پہلے یہ ذہن میں رہے کہ اسلامی شریعت میں صحت نکاح کے لیے بلوغ شرط نہیں ہے سورہ "الطلاق" میں نابالغہ کی عدت تین ماہ بتائی گئی ھے. واللّائی لم یحضن (المائدہ ۴:)اور ظاہر ہے کہ عدت کا سوال اسی عورت کے معاملہ میں پیدا ہوتا ہے جس سے شوہر خلوت کر چکا ہو؛ کیوں کہ خلوت سے پہلے طلاق کی صورت میں سرے سے کوئی عدت ہی نہیں ہے ۔(الاحزاب ۴۹:) اس لیے "واللائی لم یحضن" سے ایسی عورت کی عدت بیان کرنا جنھیں ماہواری آنا شروع نہ ہوا ہو صراحت کے ساتھ اس بات پر دلالت کرتا

---

(۱) محمد نعمان مکی، کنگ عبداللہ میڈیکل سٹی مکہ مکرمہ، منظور شدہ : حضرت مولانا الیاس گھمن صاحب حفظہ اللہ، بتاریخ 15: شعبان...11 May 2017.1438۔

ہے کہ اس عمر میں نہ صرف لڑکی کا نکاح کر دینا جائز ہے بلکہ شوہر کا اس کے ساتھ خلوت کرنا بھی جائز ہے۔(۱)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی نسبت قابل وثوق ذرائع سے معلوم ہے کہ ان کے جسمانی قوی بہت بہتر تھے اور ان میں قوت نشو ونما بہت زیادہ تھی۔ ایک تو خود عرب کی گرم آب و ہوا میں عورتوں کے غیر معمولی نشو ونما کی صلاحیت ہے۔ دوسرے عام طور پر یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ جس طرح ممتاز اشخاص کے دماغی اور ذہنی قویٰ میں ترقی کی غیر معمولی استعداد ہوتی ہے، اسی طرح قد وقامت میں بھی بالیدگی کی خاص صلاحیت ہوتی ہے، اس لیے بہت تھوڑی عمر میں وہ قوت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا میں پیدا ہوگئی تھی جو شوہر کے پاس جانے کے لیے ایک عورت میں ضروری ہوتی ہے، داؤدی نے لکھا ہے کہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بہت عمدگی کے ساتھ سن شباب کو پہنچ چکی کی تھی "و کانت عائشہ شبت شبابا حسنا"۔(۲)

حضرت عائشہ کے طبعی حالات تو ایسے تھے ہی، ان کی والدہ محترمہ نے ان کے لیے ایسی باتوں کا بھی خاص اہتمام کیا تھا جو ان کے لیے جسمانی نشو ونما پانے میں ممد ومعاون ثابت ہوئی، چنانچہ ابو داؤد میں خود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان مذکور ہے کہ "میری والدہ نے میری جسمانی ترقی کے لیے بہترے تدبیریں کیں۔ آخر ایک تدبیر سے خاطر خواہ فائدہ ہوا، اور میرے جسمانی حالات میں بہترین انقلاب پیدا ہوگیا"۔

اس کے ساتھ اس نکتہ کو بھی فراموش نہ کرنا چاہیئے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو خود ان کی والدہ نے بدون اس کے کہ آنحضرت ﷺ کی طرف سے رخصتی کا تقاضا کیا گیا ہو، خدمتِ نبوی میں بھیجا تھا اور دنیا جانتی ہے کہ کوئی ماں اپنی بیٹی کی دشمن نہیں ہوتی؛ بلکہ لڑکی سب سے زیادہ اپنی ماں ہی کی عزیز اور محبوب ہوتی ہے، اس لیے ناممکن اور محال ہے کہ انھوں نے

---

(۱) احکام القرآن للجصاص: ۲/ ۶۲، الفقہ الاسلامی وادلتہ: ۷/ ۱۸۔

(۲) شرح مسلم للنووی ۳: / ۴۵۶۔

از دواجی تعلقات قائم کرنے کی صلاحیت واہلیت سے پہلے ان کی رخصتی کر دیا ہو اور اگر تھوڑی دیر کے لیے مان لیا جائے کہ عرب میں عموماً لڑکیاں ۹/ برس میں بالغ نہ ہوتی ہوں تو اس میں حیرت اور تعجب کی کیا بات ہے کہ استثنائی شکل میں طبی اعتبار سے اپنی ٹھوس صحت کے پس منظر میں کوئی لڑکی خلافِ عادت ۹/ برس ہی میں بالغ ہوجائے، جو ذہن و دماغ منفی سوچ کا عادی بن گئے ہوں اور وہ صرف شکوک وشبہات کے جال بننے کے خوگر ہوں انھیں تو یہ واقعہ جہالت یا تجاہل عارفانہ کے طور پر حیرت انگیز بنا کر پیش کرے گا؛ لیکن جو ہر طرح کی ذہنی عصبیت و جانبداری کے خول سے باہر نکل کر عدل وانصاف کے تناظر میں تاریخ کا مطالعہ کرنا چاہتے ہوں وہ جان لیں کہ نہایت مستند طریقہ سے ثابت ہے کہ عرب میں بعض لڑکیاں ۹/ برس میں ماں اور اٹھارہ برس کی عمر میں نانی بن گئی ہیں۔ سنن دارقطنی میں ہے "حدثنی عباد بن عباد المهلبی قال ادركت فينا يعنى المهالبة امرأة صارت جدة وهى بنت ثمان عشرة سنة، ولدت تسع سنين ابنة، فولدت ابنتها لتسع سنين فصارت هى جدة وهى بنت ثمان عشرة سنة" (۱)

خود ہمارے ملک ہندوستان میں یہ خبر کافی تحقیق کے بعد شائع ہوئی ہے کہ وکٹوریہ ہسپتال دہلی میں ایک سات سال سے کم عمر کی لڑکی نے ایک بچہ جنا ہے۔ (۲)

جب ہندوستان جیسے معتدل اور متوسط ماحول وآب وہوا والے ملک میں سات برس کی لڑکی میں یہ استعداد پیدا ہوسکتی ہے تو عرب کے گرم آب وہوا والے ملک میں ۹/ سال کی لڑکی میں اس صلاحیت کا پیدا ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی لڑکی ام کلثوم کا نکاح عروہ بن الزبیر سے اور عروہ بن الزبیر نے اپنی بھتیجی کا نکاح اپنے بھتیجے سے اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی بیوی نے اپنی لڑکی کا نکاح ابن

---

(۱) دارقطنی، جلد ۳، صفحہ ۳۲۳، مطبوعہ: لاہور پاکستان

(۲) دیکھئے اخبار "مدینہ" بجنور، مجریہ یکم جولائی ۱۹۳۴/ بحوالہ نصرت الحدیث صفحہ ۱۷۱

المسیب بن نخبہ سے کم سنی میں کیا۔(۱)

ان حضرات کا کم سنی میں اپنی لڑکیوں کا نکاح کر دینا بھی اس بات کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ اس وقت بہت معمولی عمر میں ہی بعض لڑکیوں میں شادی وخلوت کی صلاحیت پیدا ہوجاتی تھی، تو اگر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا نکاح ٦/ برس کی عمر میں ہوا تو اس میں کیا استبعاد ہے کہ ان میں جنسی صلاحیتیں پیدا نہ ہوئی ہوں، جیسا کہ ابھی ثابت ہو چکا ہے کہ ان کی والدہ نے خصوصیت کے ساتھ اس کا اہتمام کیا تھا الغرض شوہر سے ملنے کے لیے ایک عورت میں جو صلاحیتیں ضروری ہوتی ہیں وہ سب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا میں موجود تھیں، لہٰذا اب یہ خیال انتہائی فاسد ذہن کا غماز ہوگا اور موسمی، ملکی، خاندانی اور طبی حالات سے اعراض اور چشم پوشی اور سورج پر تھوکنے کے مترادف ہوگا۔(۲)

تاریخ اور جدید سائنس

تاریخ اور سائنس اس بات کو واضح کرتے ہیں کہ بلوغت کی عمر مختلف زمانے اور مختلف علاقوں کے حساب سے مختلف ہوتی رہی ہے، موجودہ سائنسی تحقیقات اس بات کو ثابت کرتے ہیں کہ ''لڑکیاں مکمل بلوغت کی عمر کو 9 سے 15 سال کی عمر کے درمیان کسی بھی وقت پہنچ سکتی ہیں''(

truth-early-puberty.html-www.livescience.com/1824//htt

The average temperature of the country is "(considered the chief factor with regard to : An (Women"Menstruation and Sexual Puberty

---

(۱) الفقہ الاسلامی وادلتہ جلد ۷، صفحہ ۱۸۰۔

(۲) زرقانی جلد ۳، صفحہ ۲۲۹–۲۳۶، از مضمون: مفتی شکیل منصور القاسمی، مجمع عین المعارف للدراسات الاسلامیہ، کنور۔ کیرالہ، ماہنامہ دارالعلوم دیوبند۔

Historical, Gynecological and Anthropological , 1998, compendium, Volume I, Lord and Brandsby (p. 563

ترجمہ : کسی بھی علاقے کی بچیوں کے ایام حیض کے شروعات اور ازدواجی بلوغت کی عمر کو پہنچنے میں اس ملک کا اوسط" جو درجہ حرارت ہے، وہ اہم کردار ادا کرتا ہے"۔

ایک اہم نکتہ

۱۴۰۰ سال قبل ملک عرب میں بھی اس عمر میں لڑکی کی شادی کو معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا، حضرت محمد ﷺ کے زمانے میں جن لوگوں نے آپکے پیغام کو جھٹلایا تھا، انہوں نے ہر طریقے سے آپ ﷺ کو بدنام کرنے اور آپکو نیچا دکھانے کی کی کوشش کی وہ ہر اس موقع کی تاک میں رہتے تھے کہ جس سے وہ آپ ﷺ کی شخصیت پر وار کرسکیں زبانی طور پر بھی اور جسمانی طور پر بھی. آپ ﷺ پر جو زبانی حملے کرتے تھے ان میں کبھی آپ ﷺ کو جادوگر کہتے تھے، کبھی آپکو جھوٹا کہتے تو کبھی آپ ﷺ کو مجنون کہتے تھے، نعوذ باللہ من ذالک، مگر کبھی بھی ان لوگوں کے دلوں میں یہ خیال بھی نہیں آیا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ سے آپکے نکاح کو لیکر اعتراض کریں یا طعنہ دیں، ایسا کیوں؟ کیونکہ اسوقت انکے سماج میں یہ عام سی بات تھی اور انکے نزدیک وہ کوئی ایسی عیب کی بات نہیں تھی کہ جس کو بنیاد بنا کر وہ آپ کو طعنہ دیتے۔

کیا آپ جانتے ہیں؟

کیا آپ جانتے ہیں کہ حضرت محمد ﷺ کی حیات طیبہ کے پہلے ۵۴ سال تک صرف ایک ہی زوجہ محترمہ تھیں، وہ ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبری رضی اللہ عنہ تھیں، وہ ایک بیوہ عورت تھیں جن سے حضرت محمد ﷺ نے نکاح کیا تھا، وہ آپ ﷺ سے عمر میں پندرہ سال

بڑی تھیں، حضرت محمد ﷺ نے اپنی زندگی کے عین جوانی کے ایام صرف یہ ایک بیوی حضرت خدیجہؓ کے ساتھ گذارے ہیں جو آپ سے ۱۵ سال بڑی تھیں اور آپ ﷺ نے انکی وفات تک بھی ان سے تعلق رکھا اور یہاں تک کے انکی وفات کے بعد بھی انکے دوستوں اور رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک اور تعلق کو برقرار رکھا۔

آپ ﷺ حصول لذت کے لیے نہیں آئے

حضرت محمد ﷺ دنیا کی آسائش اور اسکی لذتوں سے لطف اندوز ہونے کے لئیے دنیا میں تشریف نہیں لائے بلکہ آپنے ہمیشہ اپنے آپ کو دنیا کی زیب وزینت اور اسکی لذتوں سے دور رکھا، اور اپنی امت کو بھی اسکے دھوکے سے ڈرایا، جتنے بھی نکاح آپ ﷺ نے اپنی حیات طیبہ میں فرمائے وہ مردوں والے شوق کی شادیاں نہیں تھیں، بلکہ وہ حکم الہی اور حکمت خداوندی کی بنیاد پر تھیں، ورنہ ایک ایسا حسین وجمیل، اجمل واکمل، اعلی وانسب، تونا اور خوبصورت نوجوان، آپ ﷺ جیسا کسی کی آنکہ نے نہ دیکھا ہو، وہ اپنی عین بھرپور جوانی کے ایام اپنے سے 15 سال بڑی ایک ہی بیوی کے ساتھ کیسے گزاسکتا تھا؟ وأحسنُ منك لم ترَ قطُّ عيني ,وَأجمَلُ مِنكَ لَمْ تَلِدِ النّسَاءُ. خلقتَ مبرءاًمنْ كلّ عيبٍ , كأنكَ قدْ خلقتَ كما تشاءُ. آپ جیسا حسین میری آنکھ نے نہیں دیکھا. آپ جیسا جمال والا کسی ماں نے نہیں جنا. آپ ہر عیب سے پاک پیدا ہوئے آپ ایسے پیدا ہوئے جیسے خود آپنے اپنے لئے چاہا۔

ان سارے دلائل کی روشنی میں اگر اس واقعہ کو دیکھیں تو یہ اشکال کہ اُمی عائشہ رخصتی کے وقت نابالغ بچی تھیں، بلکل ختم ہو جاتا ہے اور ان سارے واقعات اور تاریخی پس منظر کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو کسی کو بھی اس نکاح پر اعتراض کرنے کا کوئی بھی موقع باقی نہیں رہتا، ہاں! اگر کسی کے دل میں پہلے ہی سے مرض ہو تو اسے کوئی کچھ نہیں کرسکتا، قولہ تعالی: ﴿فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللَّهُ مَرَضًا وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ بِمَا كَانُوا يَكْذِبُونَ

(۱)ان کے دلوں میں مرض تھا۔خدا نے ان کا مرض اور زیادہ کر دیا اور ان کے جھوٹ بولنے کے سبب ان کو دکھ دینے والا عذاب ہوگا۔(۲)

خلاصہ

خلاصہ یہ کہ خاندان کی عزت لڑکیوں کے دم سے ہے،عمر آزادی کی طرف لیجانے سے پہلے ہم اسے شوہر کے حوالے کر دیں تاکہ کہیں وہ خاندان کی بدنامی کا باعث نہ بنیں،نیز والدین معاشی مجبوریاں،کھانے پینے اور گداگری کے مسائل کی وجہ سے لڑکیوں کو بوجھ نہ سمجھیں،نہ ہی بالکل کم عمری میں نکاح کریں اور نہ ہی تعلیم کے بہانے لمبی عمر گذرنے تک بن بیاہی جنسی ہوس کا شکار ہونے کا موقع نہ دیں،مناسب عمر میں مناسب دیندار رشتہ مل جائے تو نکاح میں دیری نہ کریں،عزت سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں دولت کی خاطر عزت کا سودا نہ کریں۔

---

(۱) سورۃ البقرۃ الآیۃ:۱۰۔

(۲) محمد نعمان مکی،کنگ عبداللہ میڈیکل سٹی مکہ مکرمہ،منظور شدہ : حضرت مولانا الیاس گھمن صاحب حفظہ اللہ،بتاریخ 15 : شعبان...1438۔11 May 2017۔

مجھ کو کسی سے کام کیا؟ میرا کہیں قیام کیا؟ میرا سفر ہے در وطن، میرا وطن ہے در سفر
مجھے خبر تھی مرا انتظار گھر میں رہا یہ حادثہ تھا کہ میں عمر بھر سفر میں رہا

۲۵ جنوری قومی یومِ سیاحت
National tourism day

سیر وتفریح کی شرعی حیثیت ،تفریح میں افراط وتفریط،اورتفریح میں ہونے والے گناہوں سے متعلق تفصیلی مؤثر تحریر

عالمی یومِ سیاحت کا پس منظر

سیاحت وتفریح، صحت افزائی، اطمینان بخش قدرتی نظاروں کو دیکھنے کے مقاصد کے لئے سفر کو کہتے ہیں، سیاحت سے مختلف ثقافتوں اور خطوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو ایک دوسرے کو سمجھنے کا موقع ملتا ہے اور مختلف اچھی چیزیں ایک معاشرے سے دوسرے میں رائج ہوتی ہیں، سیاحت کے مختلف اقسام ہیں جیسے قدرتی نظاروں کو دیکھنے کے لئے سیاحت مذہبی سیاحت جس میں لوگ مختلف مذہبی جگہوں کو دیکھنے جاتے ہیں، تاریخی سیاحت جس میں لوگ آثارِ قدیمہ وغیرہ دیکھتے ہیں، دنیا بھر میں ۲۷ رستمبر کو عالمی یوم سیاحت منایا جاتا ہے۔ سیاحت کا یہ عالمی دن ورلڈ ٹورازم آرگنائزیشن کی ایگزیکٹیو کونسل کی سفارشات پر جنرل اسمبلی کی قرارداد کے مطابق منایا جاتا ہے، یہ دن ۲۷ رستمبر ۱۹۷۰ء سے ہر سال بھرپور طریقے سے منایا جاتا ہے، سیاحت کا علم سے گہرا تعلق ہے، اس کے علاوہ یہ مختلف تہذیبوں کو قریب لانے کا باعث بنتی ہے، اس لئے عالمی سطح پر روز بروز سیاحت کے رجحان میں اضافہ ہو رہا ہے، اب سیاحت ایک مقبول عالمی تفریحی سرگرمی بن چکی ہے، منانے کا مقصد دنیا کو یہ باور کرانا ہے کہ سیاحت بین الاقوامی برادری کے لیے ناگزیر ہے اور سیاحت سماجی، ثقافتی اور اقتصادی حالات پر براہ راست اثرانداز ہوتی ہے۔

سیر وسیاحت کی حقیقت

نئے مقامات کی دریافت، فرحت انگیز اور خوش کن مناظر، بلند و بالا عمارات، آثارقدیمہ اور تہذیبوں کے مدفن کھنڈرات کا مشاہدہ اور مقدس مقامات ومذہبی اماکن کی زیارت کا داعیہ فطری ہے، اس سے انسان کے تجربات میں اضافہ ہوتا ہے،. بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملتا ہے، اسی جذبہ کے تحت سیر وسیاحت کا ہر زمانہ میں رواج رہا ہے،. بہت سے علماء و محققین اور دانشوروں نے سیر وسیاحت اور بادیہ پیمائی اور ہفت خوانِ عالم کی اسیری وصحرانوردی سے

حاصل تجربات کو دوسروں تک بھی پہنچانے کا بیڑا اٹھایا، اسی طرح ایک مستقل فن ''سفرناموں'' اور ''رحلات'' کی شکل میں سامنے آیا، دنیا ان سفرناموں اور رحلات کے ذریعہ ان تاریخی اسرار ورموز، تہذیب وتمدن اقوام وملل رسم ورواج، مختلف ممالک کے باشندوں کی زندگی کے حالات اور تجربات وغیرہ سے روشناس ہوئی کہ اگر یہ سفرنامے نہ ہوتے، تو کبھی ان کا پتہ بھی نہ چلتا، نہ اس کا سراغ ملتا، ابن بطوطہ مغربی، ابن جوقل، حکیم ناصر خسرو، شیخ سعدی'' مسلمانوں میں شہرہ آفاق سیاح گذرے ہیں، خود ہندوستان کی تاریخ اور قدیم تمدن کے بیان میں مشہور چینی سیاح ہیان جیونگ کو دستاویزی حیثیت حاصل ہے۔

سیاحت کا شرعی حکم

(الف) شرعی نقطۂ نظر سے سیر وسیاحت جائز مقاصد اور جائز طریقہ پر درست ہے؛ بلکہ قرآن کریم میں متعدد آیات میں ''سیروا فی الارض'' کا حکم دیا گیا ہے، سورۂ نمل میں ارشاد ہے (۱) کہ اے نبی کہہ دیجئے کہ روئے زمین پر سیر کرو اور دیکھو کہ جرم کرنے والوں کا انجام کیا ہوا۔ سورۂ روم میں ارشاد ہے :''قل سیروا فی الارض فانظروا کیف کان عاقبۃ الذین من قبل، کان اکثرھم مشرکین''(۲) اے نبی کہہ دیجئے کہ تم روئے زمین پر گھومتے پھرو اور دیکھو کہ ان لوگوں کا انجام کیا ہوا جو پہلے ہوا کرتے تھے، ان میں اکثر مشرک تھے۔

مذکورہ آیات اور اس مفہوم کی دوسری آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ''سیر فی الارض'' یا سیاحت نہ صرف یہ کہ جائز ہے؛ بلکہ مطلوب ہے؛ لیکن یہ سیر بامقصد ہونا چاہئے، نیک لوگوں کے علاقوں اور ان کے آثار کو دیکھ کر نیکی اور بھلائی کا شوق پیدا ہو، اور نافرمانوں کے مقامات اور ان کے آثار کو دیکھ کر اسبابِ غضب سے بچنے کا داعیہ پیدا ہو، قلب میں

---

(۱) النمل آیت: ۶۹

(۲) الروم آیت: ۴۲

رقت پیدا ہو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب ایک غزوہ کے موقع پر قوم عاد کے علاقہ سے گذر رہے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سواریوں کو تیز ہنکانے کا حکم فرمایا اور چہرے پھیر لیے، اور استغفار کی کثرت کا حکم دیا، مطلق سیر کی کوئی ممانعت نہیں، اس کا جواز مقصد سفر سے وابستہ ہے، اگر مقاصد درست ہوں؛ تو سفر بھی درست ہوگا، اگر مقاصد غلط ہوں تو سفر بھی غلط ہوگا۔

حدیث نبوی: "لاتشد الرحال الاالی ثلاۃ مساجد" (۱) کی تحقیق میں بھی علماء نے یہی موقف اختیار کیا ہے۔علامہ بدالدین عینیؒ نے عمدۃ القاری (۳/ ۶۳) میں اپنے شیخ زین الدین عراقیؒ سے نقل کیا ہے کہ اس حدیث میں مساجد کے حکم کو بیان کرنا مقصود ہے۔ جہاں تک مساجد کے علاوہ دوسرے مقامات کے قصد کا تعلق ہے، جیسے طلب علم کے لئے سفر کرنا، رشتہ داروں سے ملاقات کے لئے سفر کرنا، تفریح یا مبارک آثار اور مقابر کی زیارت کے لئے سفر کرنا اور اس طرح کے دوسرے اسفار اس ممانعت میں داخل نہیں ہیں۔(۲)

(ب) جن علاقوں میں جان مال عزت وآبرو کو خطرہ لاحق ہو، ان علاقوں کا نہ تو خود سفر کرنا درست ہے، نہ اہل وعیال کو لے جانا درست ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے "ولاتلقوا بایدیکم الی التھلکۃ" (۳) اور تم اپنے آپ کو ہلاکت اور تباہی میں مت ڈالو بخاری کی ایک روایت میں رات کے اوقات میں تنہا سفر کرنے سے منع فرمایا گیا ہے (۴) کیوں کہ اس میں خطرہ ہے۔

---

(۱) بخاری :کتاب فضل الصلاۃ فی مسجد مکۃ والمدینۃ حدیث:۱۱۸۹، مسلم کتاب الحج باب لاتشد الرحال الی الی ثلاثۃ مساجد حدیث:۱۳۹۵

(۲) معارف السنن ۳/ ۳۳۶

(۳) بقرہ: ۱۹۵

(۴) بخاری:کتاب الجھاد باب السیر وحدہ حدیث:۲۹۹۸، "لَوْ أَنَّ النَّاسَ يَعْلَمُونَ مَا أَعْلَمُ مِنَ الْوِحْدَةِ مَا سَارَ رَاكِبٌ بِلَيْلٍ يَعْنِي :وَحْدَهُ" ترمذی:باب ماجاء فی کراھیۃ ان یسافر الرجل وحدہ حدیث:۱۶۷۳ امام ترمذیؒ نے فرمایا کہ ابن عمرؓ کی حدیث حسن صحیح ہے۔

(ج) جن مقامات پر مختلف ممالک کے سیاحوں کا ہجوم ہوتا ہے، وہاں بعض غیر شرعی باتیں بھی دیکھنے میں آتی ہیں، ایسے مقامات پر نظر کی حفاظت کرتے ہوئے جانے کی گنجائش ہے؛ لیکن چونکہ ماحول کا اثر مسلم ہے، لہٰذا ایسے مقامات پر جانا درست نہیں ہے، ایسے مقامات پر آداب کی رعایت کے ساتھ جس طرح جانے کی گنجائش ہے فی نفسہٖ وہاں کے لئے سواری کرایہ پر لینے اور وہاں کاروباری نقطۂ نظر سے دکان لگانے کی بھی گنجائش ہے؛ البتہ یہ ضروری ہے کہ حکومتوں اور تنظیموں کی طرف سے بے حیائی کے روک تھام کے لئے اقدامات کئے جائیں۔

(د) ٹور کمپنیاں قائم کرنے کا جواز یا عدم جواز مقاصد سے وابستہ ہے، جائز مقاصد کے لئے ٹور کمپنیاں قائم کرنا اور اسے چلانا درست ہے۔

سیاحت اور اسلام

اسلام اس لئے آیا کہ بشری ناقص عقل کے بہت سارے غلط مفاہیم کو تبدیل کرے اور انھیں اعلیٰ اقدار اور اخلاق فاضلہ اور افضل امور کے ساتھ مربوط کرے، بعض پہلی امتوں میں سیاحت کا مفہوم نفس کو تکلیف دینے اور اسے زمین میں جبراً سفر کرنے سے مربوط اور بطورِ سزا اسے تھکانے، دنیا سے بے رغبتی کرنا سیاحت سمجھا جاتا تھا، تو دین اسلام نے آ کر اس منفی اور سلبی مفہوم کو باطل کیا جو کہ سیاحت کے برعکس ہیں۔

چنانچہ اسلام نے سیاحت کے مفہوم کو عظیم مقاصد اور شریف غرض وغایت کے ساتھ مربوط کیا، جن میں سے چند ایک یہ ہے:

(ا) اسلام نے سیاحت کو عبادت کے ساتھ مربوط کرتے ہوئے ارکانِ اسلام میں سے ایک رکن حج کی ادائیگی کے لئے سفر (یا سیاحت) کرنا واجب کر دیا، حج کا سفر معلوم مہینوں میں کیا جاتا ہے اور عمرہ کی ادائیگی کے لئے سارا سال ہی سفر کرنا مشروع کیا۔

اور جب ایک شخص نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آ کر سیاحت (قدیم مفہوم جس میں

رہبانیت یا صرف نفس کو تکلیف دینے کے لئے سفر کیا جاتا تھا) کی اجازت طلب کرتا ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سیاحت سے بھی اعلیٰ اور قیمتی مقصد کی طرف رہنمائی کرتے ہوئے فرمایا: یقینا میری امت کی سیاحت جہاد فی سبیل اللہ میں ہے۔(۱)

(۲) اسی طرح دین اسلامی کے مفہوم میں سیاحت علم و معرفت کے ساتھ ملی ہوئی ہے اسلام کے ابتدائی دور میں طلب علم اور علم پھیلانے کی غرض سے بڑے عظیم اور قوی قسم کے سیاحتی سفر ہوئے، حتیٰ کہ خطیب بغدادیؒ نے اپنی مشہور کتاب ''الرحلة فی طلب الحدیث'' حدیث کے حصول کے لئے سفیر، جیسی عظیم کتاب لکھی، جس میں ایک حدیث کے لئے سفر کرنے والوں کے سفر جمع کئے ہیں۔

(۳) اسلام میں سیاحت کے مقاصد میں عبرت اور وعظ و نصیحت شامل ہیں قرآن مجید میں کئی ایک مقامات پر زمین میں گھومنے پھرنے کا حکم دیا گیا ہے:

اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا فرمان ہے ''کہہ دیجئے کہ زمین میں چلو پھرو اور سیر کرو، پھر دیکھو کہ جھٹلانے والوں کا انجام کیا ہوا'' قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِينَ (۲)

(۴) اسلام میں سیاحت کا سب سے عظیم مقصد دعوت الی اللہ اور اس نور و روشنی کی تبلیغ ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوئی، اور رسولوں اور انبیاء اور ان کے بعد صحابہ کرامؓ کا بھی یہی عمل تھا، ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ روئے زمین پر پھیل گئے اور لوگوں کو خیر و بھلائی کی تعلیم دی، اور انھیں کلمۂ حق کی دعوت دی، ہم امید کرتے ہیں کہ آج کی سیاحت بھی اس عظیم مقصد کو اپنے اندر سموئے گی۔

---

(۱) سنن ابی داؤد حدیث :۲۴۸۶ علامہ عراقی نے تخریج احیاء علوم الدین (۲۶۴۱) میں اس کی سند کو جید کہا ہے۔
(۲) النمل آیت: ۶۹

(۵) اسلام میں سیاحت کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مخلوقات میں غور وفکر اور تدبر اور اس کی دنیا کی خوبصورتی سے تفریح حاصل کرنے کے لئے سفر کیا جائے تا کہ وہ بشری نفس میں ایمانی قوت کے اضافہ اور اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر ایمان کا باعث ہو اور زندگی کے واجبات کی ادائیگی میں اس کی معاونت بھی کرے، کیونکہ اس کے بعد نفس کی تفریح ضروری ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''کہہ دیجئے کہ زمین میں چل پھر کر دیکھو تو کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوق کی ابتداءً پیدائش کی، پھر اللہ تعالیٰ ہی دوسری نئی پیدائش کرے گا، اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانْظُرُوا كَيْفَ بَدَأَ الْخَلْقَ ثُمَّ اللَّهُ يُنْشِئُ النَّشْأَةَ الْآخِرَةَ إِنَّ اللَّهَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ''(۱)

تفریح کا تصور ہر زمانے اور ہر قوم میں پایا جاتا ہے البتہ ہر قوم اپنی تہذیب وتمدن کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اس کا اہتمام کرتی رہی ہے، مثلاً رقص، ڈرامے، موسیقی، گانے اور مختلف طرح کے کھیل کود وغیرہ۔ اور کچھ اقوام میں تو تفریح کے ان مظاہر کو مذہبی حیثیت بھی حاصل ہے اور کچھ اقوام میں اس کا تعلق صرف ثقافت سے ہے۔

لیکن عصر حاضر میں نت نئی ایجادات نے تفریح کا تصور بالکل ہی تبدیل کر دیا ہے عمومی طور پر زمانہ ماضی میں تفریح کا تصور جسمانی تربیت ونشوونما کے ساتھ وابستہ تھا اور بغور جائزہ لیا جائے تو زمانہ ماضی میں تفریح وکھیل کے جتنے بھی مظاہر تھے ان سب میں یہی پہلو اجاگر تھا، یہاں تک کہ گھریلو خواتین کے کھیل بھی اسی نوعیت سے تعلق رکھتے تھے اس کے بالکل برخلاف جدید ایجادات جیسے ڈش، کیبل، ٹیلی ویژن، کمپیوٹر، انٹرنیٹ اور اسمارٹ موبائل فونز (Mobile phones) جن کو ذرائع ابلاغ بھی کہا جاتا ہے نے تفریح کے تصور کو بہت وسیع بنا دیا ہے اور اس وسعت نے سب سے پہلے سابقہ تصور تفریح میں موجود

---

(۱) العنکبوت آیت: ۲۰

اجتماعیت کوختم کر دیا اور انفرادیت کو رائج کیا۔ اور المیہ تو یہ ہوا کہ ان وسائل کے ذریعہ پیش کیے جانے والے پروگرام جس میں فلمیں، کارٹونز، کھیل، گانے، فیشن اور ٹی وی شو وغیرہ کو بھی تفریح کا نام دے دیا گیا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اس وقت تہذیبی جنگ میدان میں یا اسلحے کے ساتھ نہیں لڑی جارہی بلکہ عقیدہ اور اخلاق کے میدان میں لڑی جارہی ہے اور تفریح کے نام پر غیر اسلامی تہذیب و ثقافت کو فروغ دیا جارہا ہے۔(۱)

سیر وسیاحت کی قسمیں

انسانی زندگی میں سیر وسفر کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا، درحقیقت زندگی اور سفر لازم وملزوم ہیں، سفر کئی مقاصد کے لیے کیا جاتا ہے، سفر عام طور پر درج ذیل مقاصد کے لیے کیا جاتا ہے:

۱۔حصولِ معاش کے لیے۔

۲۔حصولِ علم کے لیے۔

۳۔تجارت کے لیے۔

۴۔فرائضِ منصبی ادا کرنے کے لیے جیسے سفراء دوسرے ملکوں میں سفارت کے لیے جاتے ہیں۔

۵۔معلومات میں اضافہ کے لیے۔

۶۔آیات اللہ یعنی مناظرِ فطرت اور مظاہرِ قدرت کا مشاہدہ کرنے کے لیے۔

۷۔زیارت کے لیے۔

۸۔عبرت کے لیے۔

---

(۱) قلعۃ الاسلام، جمعرات 02, نومبر 2017 17:34۔

۹۔عزیزوں دوستوں سے ملاقات کے لیے۔

۱۰۔سفر کی ایک قسم،ہجرت بھی ہے۔

۱۱۔اصلاح وتربیت کے لیے۔

۱۲۔حج کے لیے سفر۔

۱۳۔دعوتِ دین کے لیے سفر۔

صوفیاء کرام کی سیاحت

شیخ ابراہیم خواص قدس سرہٗ کا تعلق ایسے طبقے سے تھا،آپ کسی شہر میں چالیس دن سے زیادہ قیام نہیں کرتے تھے،ان کا خیال تھا کہ اگر چالیس دن سے زیادہ کسی شہر میں مقیم رہیں گے تو ان کے توکل میں فرق آجائے گا،چونکہ اس عرصے میں لوگ ان کو اچھی طرح جان لیں گے اور لوگوں کا ان کی طرف رجوع شروع ہو جائے گا۔(عوارف المعارف،مترجم حضرت شمس بریلوی)

حضرت بشر حافی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ: اے طالبو،سفر کرو کہ تم خوش رہو اور پاک وصاف رہو،اس لیے کہ پانی زیادہ دیر تک ایک جگہ ٹھہرا رہتا ہے تو وہ متغیر ہو جاتا ہے،اس کا رنگ اور مزہ سب کچھ بدل جاتا ہے۔(تصوف اور تصوراتِ صوفیہ:۴۱۱،ڈاکٹر محمد ظہیر احمد)

حضرت بایزید بسطامی قدس سرہٗ نے حضرت احمد خضرویہ سے پوچھا کہ آپ کب تک دنیا کی سیر وسیاحت میں مشغول رہیں گے؟ انہوں نے جواب دیا،پانی ایک جگہ ٹھہر جانے سے اس میں بدبو پیدا ہو جاتی ہے اور اس کا رنگ تبدیل ہو جاتا ہے،آپؒ نے فرمایا،پھر سمندر کیوں نہیں بن جاتے تاکہ نہ بدبو پیدا ہو اور نہ رنگ تبدیل ہو۔ (۱)

حضرت علی ہجویری قدس سرہٗ العزیز نے اپنے عہد کے قریباً تمام اسلامی ممالک کی

---

(۱) تصوف اور تصوراتِ صوفیہ: ۴۱۳،ڈاکٹر محمد ظہیر احمد۔

سیاحت کی اور وہاں کے مشائخ وصوفیہ سے اکتساب فیض کیا۔اس کا ذکر اُن کی معروف کتاب کشف المحجوب میں کئی مقامات پر ملتا ہے۔(دیباچہ کلام المرغوب ترجمہ کشف المحجوب:۴۷)

آپ کے تذکرہ نگاروں کی تحقیق کے مطابق تمام عالم اسلام کا سفر کیا اور اسی سیر وسیاحت کے دوران آپ نے دو مرتبہ حج کی سعادت بھی حاصل کی۔(دیباچہ کلام المرغوب ترجمہ کشف المحجوب:۴۷)

کشف المحجوب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے پاک و ہند کے اکثر شہروں کی سیاحت کی تھی، اپنے سفر کے واقعات ذکر کرتے ہیں کہ:

۱۔ مشہور ہے کہ ہندوستان میں شکاریوں کا ایک گروہ ایسا ہے کہ یہ لوگ باہر جنگل میں نکل جاتے ہیں اور گانا شروع کر دیتے ہیں اور بڑی سُریلی سُریلی آوازیں نکالتے ہیں۔ ہرن جب انہیں سُن پاتے ہیں تو اُنہی کی طرف بھاگتے چلے آتے ہیں۔انہیں قریب آتا دیکھ کر یہ لوگ ان کے گرد گھیرا ساڈال لیتے ہیں اور مسلسل گاتے چلے جاتے ہیں یہاں تک کہ راگ کی لذت سے ہرن کی آنکھیں بند ہونے لگتی ہیں اور (اسی خمار کی حالت میں) بالآخر وہ سو جاتا ہے اور وہ لوگ اس کو پکڑ لیتے ہیں۔(۱)

۲۔میں نے ہندوستان میں دیکھا کہ زہرِ قاتل کے اندر ایک کیڑا پیدا ہو جاتا ہے اور نہ صرف یہ کہ اس زہر میں زندہ رہ سکتا ہے بلکہ اس کی زندگی موقوف ہی اس زہر میں پڑے رہنے پر ہوتی ہے۔(کشف المحجوب کا مستند ترین اُردو ترجمہ گنج مطلوب:۶۵۰،لاہور،ناشرانِ قرآن لمیٹڈ،۱۹۶۸ء)

اس سے واضح ہوتا ہے کہ صوفیہ کے ہاں سیر وسیاحت کی بڑی اہمیت ہے کیونکہ اس سے لوگوں کی عادات و اطوار اور مزاج شنا کا ملکہ بھی حاصل ہوتا ہے اور مصائب ومشکلات برداشت کرنے کی عادت پڑ جاتی ہے جس سے تبلیغ اسلامی کی راہیں کھلتی چلی جاتی ہیں،سلوک

(۱) کشف المحجوب کا مستند ترین اُردو ترجمہ گنج مطلوب:۶۵۰،لاہور،ناشرانِ قرآن لمیٹڈ،۱۹۶۸ء۔

کے لاینحل عقدے کھلتے ہیں اور سلوک کی منزلیں طے ہونے لگتی ہیں۔

سیر وتفریح کے شرائط

(۱) تین مسجدوں کے علاوہ کسی اور جگہ کی تعظیم کے قصد سے سفر کرنے کی ممانعت۔

چنانچہ حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''تین مسجدوں مسجد حرام، مسجد نبوی اور مسجد اقصیٰ کے علاوہ کسی اور کی جانب سفر نہ کیا جائے''۔(۱)

اس لئے ان تین جگہوں کے علاوہ کسی اور مقدس جگہ کا قصد لے کر سفر کرنا جائز نہیں، اس کا یہ معنیٰ نہیں ہے کہ مسلمانوں کے ممالک میں مسجدوں کی زیارت کرنا ہی حرام ہے بلکہ مسجد کی زیارت کرنا مشروع اور مستحب ہے بلکہ صرف اس غرض سے سفر کرنا ممنوع ہے، اگر سفر سے اس کا کوئی اور مقصد ہو اور یہ زیارت اس کے تابع ہو کر ہوئی ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے بلکہ نماز جمعہ اور نمازِ پنجگانہ کی ادائیگی کے لئے مسجد جانا فرض ہے۔

اور دوسرے ادیان کی مقدس جگہوں کی زیارت کے لئے جانا اور سفر کرنا بالاولیٰ حرام ہوگا، مثلاً کوئی شخص ویٹکن کی زیارت کے لئے جائے یا پھر بدھ مت کے بتوں وغیرہ کی زیارت کے لئے۔

(۲) مسلمان شخص کا کفار کے ممالک کی مطلقاً سیاحت کرنے کی حرمت کے دلائل بھی آئے ہیں کیونکہ جو قومیں ہمارے دین پر عمل نہیں کرتیں اور دین اسلام کا خیال نہیں رکھتی اور نہ ہی ہمارے اخلاق پر عمل کرتی ہیں اس سے میل جول رکھنے سے مسلمان شخص کے دین اور اخلاق میں کئی قسم کی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں، اور خاص کر جب اس سفر کا علاج یا تجارت وغیرہ جیسی کوئی ضرورت بھی نہ ہو، بلکہ صرف سیر وتفریح کے لئے تو اللہ تعالیٰ نے مسلمان ملکوں میں الحمدللہ بہت کچھ رکھا ہے جو کفار کے ممالک کی سیر وتفریح کرنے سے

---

(۱) بخاری باب فضل الصلاۃفی مسجد مكة والمدينة حديث:۱۱۸۹

ہمیں مستغنی کر دیتی ہیں۔

(۳) اس میں کوئی شک نہیں کہ شریعت اسلامیہ ایسی جگہوں کی سیر وسیاحت کرنے سے منع کرتی ہے جہاں فساد وخرابیاں ہوں کہ وہاں شراب نوشی، فحاشی، معصیت اور نافرمانیوں کا ارتکاب ہوتا ہو، مثلاً ساحل سمندر جہاں بے لباس ہو کر نہایا جائے، اور فحاشی کی تقریبات اور فسق وفجور والی جگہیں، یا پھر بدعتی قسم کے تہوار منعقد کرنے کے لئے سفر کرنا، کیونکہ مسلمان کو معاصی ونافرمانیوں سے دور رہنے کا حکم ہے، اس لئے نہ تو وہ خود معاصی اور نافرمانیوں کا مرتکب ہو اور نہ ہی وہ معصیت کا ارتکاب کرنے والی قوم کے ساتھ بیٹھے۔

(۴) بغیر محرم کسی بھی عورت کا سفر کرنا بھی جائز نہیں، علماء کرام نے حج یا عمرہ کا سفر بھی محرم کے بغیر حرام ہونے کا فتویٰ دیا ہے، تو پھر سیر وسیاحت کے سفر میں جس میں بہت سارا تساہل اور حرام کردہ مرد وعورت کا اختلاط پایا جائے اس کی اجازت کیسے ہوگی؟۔

(۵) رہا یہ سوال کہ کفار کے لئے مسلمانوں کے ملک میں سیاحتی سفر کا انتظام کرنا تو اس میں اصل یہی ہے کہ ایسا کرنا جائز ہے جب کافر سیاح کو مسلمان حکومت اپنے ملک میں داخل ہونے کی جازت دے تو وہ کافر وہاں سے جانے تک وہ معاہد بن جائے گا لیکن اس کافر کے لئے مسلمان ملک میں رہتے ہوئے دین اسلام کا احترام کرنا ہوگا اور مسلمانوں کی اخلاقیات اور ثقافت کا بھی احترام کرنا ہوگا، نہ تو وہ اپنے کفریہ دین کی دعوت پیش کرسکتا ہے اور نہ ہی اسلام پر باطل ہونے کا بہتان لگا سکتا ہے، اور مسلمان ملک میں پورا ستر ڈھانپنے والا لباس پہن کر باہر نکلے ایسا نہ ہو کہ آدھا ننگا ہو کر باہر گھومتا پھرے اور نہ ہی وہ اپنی کافر قوم کا جاسوس بن کر جاسوسی کرے، البتہ کافر شخص کو حرمین یعنی مکہ اور مدینہ میں جانا ممکن نہیں بنانا چاہئے۔

یہ کسی پر مخفی نہیں کہ آج کل کی سیاحت میں غالباً معصیت اور فحش کام اور حرام کردہ کاموں مثلاً: معروف جگہوں پر بے پردگی اور مرد وعورت کا اختلاط اور شراب نوشی اور فسق وفساد کی ترویج اور کفار سے مشابہت اور کفار کی عادات واخلاق کو اپنانا حتی کہ ان کی خبیث قسم کی

بیماریاں اپنانے کا بھی ارتکاب کیا جاتا ہے چہ جائے کہ اس پر مال بھی ضائع ہونے کے ساتھ ساتھ وقت اور جہد بھی ضائع ہوتی ہے۔

اور ان سب اشیاء کو ایک ''سیاحت'' کے خوبصورت غلاف میں پیش کیا جاتا ہے، اس لئے ہم ہر دینی، اخلاقی اور امت کی غیرت رکھنے والے شخص کو نصیحت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا خوف رکھتے ہوئے اس سے ڈرے اور فاسق قسم کی اس سیاحت کی ترویج میں معاون ثابت نہ ہو، بلکہ وہ اس کے خلاف اعلانِ جنگ کرے اور جو ثقافت اس کی ترویج کر رہی ہے اس کے مخالف ہو کر لڑے، اور اسے اپنے دین، اپنی اسلامی ثقافت اور اپنے اسلامی اخلاق پر فخر کرنا چاہیئے کہ اس نے ہر قسم کے فساد اور خرابیوں سے محفوظ رکھا ہے اور اس کے بدلے میں اللہ کی مخلوق اور مسلمانوں کے ان ممالک میں جہاں اسلامی تعلیمات کا التزام کیا جاتا ہے ایک وسیع سیاحتی میدان دیا ہے۔ واللہ اعلم

افراط وتفریط سے بچیں

سیر وسیاحت افراط وتفریط نہ ہوں، بعض مسلمان ہر اتوار کہیں نہ کہیں گھومنے کے لیے جانا ضروری سمجھتے ہیں، بلاناغہ بدل بدل کر پورے شہر، صوبہ اور ملک کی چکر ختم ہونے کے بعد بیرون کا پروگرام بناتے ہیں، محض نام وشہرت کی خاطر مہنگے ہوٹلوں کا رخ کیا جاتا ہے، خواہ اس کی وجہ سے حقوق واجبہ میں کوتاہی ہو، فضول خرچی اور گناہ سرزد ہوتے ہوں، معصیت گاہیں ان مسلمانوں سے بھری ہوتی ہیں، زمانے کے دوش بدوش چلنے ہی کو ترقی سمجھتے ہیں، خیر کے کاموں اور اسلامی وانسانی ہمدردی پر ایک پائی ان سے خرچ نہیں ہو پاتی اپنے ٹور وچکر پابندی سے ہوجاتے ہیں، خیر کے امور میں حصہ لینے والوں پر طنز کرنے سے نہیں چوکتے ہیں، ظاہر ہے کہ اس قدر غلو بھی دین و دنیا دونوں اعتبار سے نقصاندہ ہے۔

اس کے برعکس بعض حضرات کبھی تفریحِ اذہان کے طور پر گھر سے باہر کسی مناسب جگہ

جانے کا تصور بھی نہیں کرتے ہیں، بلکہ جائز مقامات پر بطور تفریح جانے کو بھی ناجائز اور خلافِ تقوی سمجھتے ہیں، جبکہ مرد کسی نہ کسی بہانے گھر سے باہر کی آب وہوا دیکھتا ہی ہے، عورتیں گھر میں بند ہونے کی وجہ سے مزاج میں چڑچڑاپن پیدا ہوجاتا ہے، بعض مرتبہ ذہنی مرض لاحق ہوجاتا ہے، جھگڑوں کی نوبت آپہنچتی ہے، اگر بغرض تفریح باہر جانا خلافِ تقوی سمجھتے ہوں تو مذکورہ ۱۳ قسموں میں سے کسی بھی قسم پر عمل کرتے ہوئے وقتاً فوقتاً اپنی خواتین کے ساتھ حدودِ شرع کا لحاظ رکھتے ہوئے سیر کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، بلکہ بعض مرتبہ اس سے زندگی وبندگی دونوں خوشگوار ہوتے ہیں۔

سیاحت کا مقصد۔قدرت الٰہی پر غور

سیر وسیاحت کا مقصد قدرت الٰہی میں غور وفکر کرکے اللہ رب العزت کی کبرایائی کو اپنی روح میں راسخ کرنا، اسکے رب اور اپنے مربوب ہونے کا تصور پیدا کرنا، فرمابرداروں پر انعام ظالموں کی پکڑ کا منظر بصیرت کی آنکھوں سے دیکھنا ہے، کائنات ایک خالق کی نشانی ہے، اس کائنات کو ایک ایسی ہستی نے تخلیق کیا ہے جو نہایت ہی باتدبیر ہے، وہ ہستی صرف اور صرف ایک ہی ہے، یہ مذہب کا بنیادی مقدمہ ہے، یہ ایسی حقیقت جس تک انسان اس کائنات ہی میں غور وفکر کرکے پہنچ سکتا ہے۔

یہ کائنات اتنی بڑی ہے کہ اس کے فاصلوں کی پیمائش نوری سالوں میں کی جاتی ہے، ایک نوری سال وہ فاصلہ ہے جو روشنی ایک سال میں طے کرتی ہے، ایک نوری سال تقریباً 9,460,800,000,000 کلومیٹر کے برابر ہوتا ہے، اس فاصلے کی وسعت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ دنیا کے تیز ترین جیٹ جہاز کو بھی یہ فاصلہ طے کرنے کے لئے تقریباً ساڑھے تیرہ لاکھ سال درکار ہوں گے، اس کائنات میں ایسے ستارے بھی ہیں جو زمین سے لاکھوں نوری سالوں کے فاصلے پر واقع ہیں، لاکھوں بلکہ کروڑوں نوری سالوں کے فاصلوں پر مشتمل اس پوری کائنات کو پھیلا آسمان ہے، انسان تک ابھی پوری ترقی کے

باوجود اتنی ہی کائنات دریافت کرسکا ہے، قرآن مجید یہ بتاتا ہے کہ اس طرح کی چھ کائناتیں اور بھی موجود ہیں۔

یہ ستارے، سیارے اور کہکشائیں حرکت کر رہے ہیں لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ سب کسی ذہین اور جاندار مادے سے بنے ہوئے نہیں ہیں بلکہ یہ سب کے سب بے جان مادے پر مشتمل ہیں، ذرا تصور کیجیے کہ اگر دس پندرہ موٹر کاروں کو بغیر ڈرائیوروں کے حرکت میں لاکر چھوڑ دیا جائے تو کیا ہوگا، تجربے کے طور پر آپ بچوں کی کھلونا کاروں کے ساتھ یہی معاملہ کر کے نتیجہ ملاحظہ فرما سکتے ہیں، یہاں دس پندرہ نہیں بلکہ کروڑوں اربوں بے جان اجسام بے پناہ رفتار سے حرکت کر رہے ہیں، ہونا یہ چاہیے تھا کہ اربوں کی تعداد میں حرکت کرتے ہوئے یہ اجسام ایک دوسرے سے ٹکرا جاتے لیکن ایسا نہیں ہوا، کیوں نہیں ہوا؟ اس کے جواب پر غور فرمائیے۔

یہ زمین اسی کائنات کا ایک حصہ ہے جسے اگر سائز (size) کے اعتبار سے دیکھا جائے تو اس کی بظاہر کوئی حیثیت نظر نہیں آتی مگر ایسی تیرہ لاکھ زمینیں تو محض ایک سورج سے ہی نکل سکتی ہیں۔

اس زمین پر آکسیجن موجود ہے جس کی اتنی بڑی مقدار ابھی تک کسی اور سیارے پر دریافت نہیں ہوئی، اس آکسیجن کے بغیر کوئی جاندار زندہ نہیں رہ سکتا، یہ آکسیجن زمین کے فضائی دائرے میں بیس اکیس فیصد کے تناسب سے موجود ہے۔سائنس دان بتاتے ہیں کہ اگر یہ تھوڑی سی زیادہ ہوجاتی تو ہر چیز جلدی جلدی آگ پکڑنے لگتی۔اگر یہ کم ہوتی تو جاندار اشیا کو پوری طرح میسر ہی نہ آتی اور زندگی کا خاتمہ ہوجاتا۔اگر یہ زمین بغیر کسی خالق کے خود بخود ہی بنی ہوئی ہے تو اتنا ناپ تول کر اس میں آکسیجن رکھنا انسانی سمجھ سے تو باہر ہے۔

اس زمین کا سورج سے فاصلہ بھی ایک عجیب فاصلہ ہے، زمین کو توانائی پہنچانے کا بنیادی ذریعہ سورج ہے جو زمین سے 1,496,000 کلومیٹر کے فاصلے پر ہے، اگر یہ

فاصلہ کچھ کم ہو جاتا تو ہم لوگ شدید گرمی سے جل بھن کر کباب ہو جاتے اور اگر کچھ زیادہ ہو جاتا تو ٹھٹھر کر مر جاتے، بڑی پیمائش سے یہ فاصلہ کیسے رکھ دیا گیا؟ یہ کم یا زیادہ کیوں نہیں ہوتا؟

رات اور دن کی گردش:

یہ زمین اپنے محور کے گرد گردش میں ہے۔ اس کا جو حصہ سورج کے سامنے آجاتا ہے وہاں دن نکل آتا ہے اور جو حصہ سورج سے دور ہوتا ہے وہاں رات ہو جاتی ہے، اگر زمین گیند کی طرح گول ہونے کی بجائے تھالی نما ہوتی تو اس کا ہر حصہ فوراً فوراً سورج کے سامنے آتا رہتا اور مسلسل دن کی سی کیفیت رہتی۔ اسی طرح اگر زمین گردش نہ کر رہی ہوتی تو اس کا ایک حصہ مسلسل روشنی میں اور دوسرا مسلسل تاریکی میں رہتا، اگر ایسا ہوتا تو پھر مسلسل دن رہنے کے باعث زمین کا ایک حصہ حرارت جذب کر کر کے اتنا گرم ہو جاتا کہ وہاں زندگی ممکن نہ ہوتی اور دوسرے حصے میں مسلسل رات رہنے کے باعث اتنی سردی ہو جاتی کہ وہاں بھی کوئی زندہ نہ رہ پاتا دن اور رات کی اس گردش کو کیوں قائم کیا گیا اور یہ کیسے ہوا؟

زمین کی گردش کی رفتار بھی بڑی عجیب ہے، اگر موجودہ رفتار کی بجائے یہ کچھ تیز ہو جاتی تو دن اور رات جلدی جلدی آنے لگتے اور ہمیں اتنی حرارت ہی نہ مل پاتی جتنی ہمیں چاہیے، اگر یہ رفتار کچھ سست ہو جاتی تو دن بہت طویل ہونے کے باعث بہت گرم ہو جاتا اور رات بھی نہایت طویل ہونے کے باعث ضرورت سے زیادہ سرد ہو جاتی، زمین کی رفتار کو اتنا منظم کر دیا گیا ہے کہ کروڑوں سالوں سے یہ اتنی ہی ہے جتنی ضرورت ہے، اتنی پیمائش کے ساتھ اس رفتار کو متعین کرنا کس کے بس کی بات ہے؟

سمندر، دریا اور بحری جہاز

یہ زمین کچھ اس طرح کی بنی ہوئی ہے کہ اس کے ہر حصے پر انسان کی ضرورت کی ہر چیز پیدا نہیں ہوتی۔ ایک جگہ پر ایک چیز پیدا ہوتی ہے اور دوسری جگہ پر دوسری، مختلف اقوام کی صلاحیتیں اور مہارتیں بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوا کرتی ہیں، ایک قوم کسی ایک

چیز میں ماہر ہوتی ہے اور دوسری کسی اور چیز میں، ایک خطے میں ایک چیز یا خدمت کی پیداواری لاگت (Cost of Production) کم ہوتی ہے اور دوسرے حصے میں دوسری چیز کی۔ انسان کو لازماً دنیا کے دوسرے حصوں میں بسنے والے انسانوں سے رابطہ رکھنا پڑتا ہے تاکہ ضرورت کی اشیاء اور خدمات کا تبادلہ کیا جاسکے، اسی کو معاشیات میں Law of Comparative Advantage کہا جاتا ہے۔

انسان نے فضائی راستے تو ابھی ایک صدی پہلے ہی دریافت کئے ہیں، زمینی راستوں کا عالم یہ رہا ہے کہ سارا سال دنیا کے ایک خطے میں بسنے والے انسانوں کو دوسروں سے ملانے میں یہ کبھی کامیاب نہیں ہوسکے۔ دور قدیم سے انسانوں کو ایک دوسرے سے ملانے میں کلیدی کردار بحری راستوں کا ہے۔

انسانی تاریخ گواہ ہے کہ زمین میں یہ مسئلہ رکھ کر اسے ایسے ہی چھوڑ نہیں دیا گیا بلکہ انسان کو یہ سکھا دیا گیا کہ وہ پانی کی مدد سے کیسے نقل وحرکت کر کے دنیا کے ایک خطے سے دوسرے خطے پر جاسکتا ہے، ایسا طبیعات (Physics) کے ایک قانون فطرت کے تحت ممکن ہوسکا ہے۔

اس قانون کے تحت ایسے مادے جن کی کثافت (Density) پانی سے کم ہوتی ہے، پانی پر تیرتے ہیں اور جن کی کثافت پانی سے زیادہ ہوتی ہے وہ اس میں ڈوب جاتے ہیں، نسبتاً لطیف چیزیں اوپر اٹھتی ہیں اور کثیف چیزیں نیچے بیٹھتی ہیں۔ اس کے پیچھے دراصل کشش ثقل کا قانون کارفرما ہے، لکڑی کی کثافت چونکہ پانی سے کم ہے اس لئے یہ نہ صرف پانی پر تیرتی ہے بلکہ اس پر اگر کچھ اور بھی رکھ دیا جائے تو یہ اسے بھی اپنے ساتھ تیرا لیتی ہے، اسی قانون کے تحت انسان نے کشتی اور بحری جہاز بنائے جن کی بدولت دنیا کے ایک حصے سے دوسرے حصے میں اس کی نقل وحرکت دور قدیم ہی میں ممکن ہوسکی تھی۔

اگر غور سے دیکھا جائے تو فزکس کا یہ قانون کثافت اور اکنامکس (economics) کا

لاء آف کمپیریٹو ایڈوانٹج (Law of comparative advantage) ایک دوسرے کے سپلیمنٹ کی حیثیت رکھتے ہیں، ایک قانون کے بغیر دوسرا بے معنی ہے، یہ دونوں مل کر ایک دوسرے کو مکمل کرتے ہیں اور انسانی ضرورت کو پورا کرتے ہیں اور اسی کی بدولت دنیا میں تمدن وجود میں آتا ہے، اقوام وجود پذیر ہوتی ہیں، ہر قوم مخصوص مختلف اشیاء اور خدمات میں اسپیشلسٹ بنتی ہے، قومیں ایک دوسرے سے اشیاء و خدمات کا تبادلہ کرتی ہیں، ان کے درمیان تعلقات قائم ہوتے ہیں اور اس طرح سے تمدن ترقی کرتا چلا جاتا ہے، اگر یہ دنیا ایسے جزیروں پر مشتمل ہوتی جہاں کے رہنے والے کبھی دوسروں سے نہ ملے ہوتے تو تمدن کی یہ ترقی جس پر ہم فخر کرتے ہیں کبھی وجود پذیر نہ ہوتی۔

چیونٹی اپنے وزن سے چالیس گنا زیادہ وزن اٹھا سکتی ہے مکھی ایک سیکنڈ میں 32 مرتبہ اپنے پر ہلاتی ہے، شہد کی مکھی 7 میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اُڑ سکتی ہے، کوّے کی اوسط عمر پانچ سو سال تک ہوتی ہے، پینگوئین ایک ایسا جانور ہے جو نمکین پانی کو میٹھے پانی میں تبدیل کر سکتا ہے، ایک مرغی سال میں اوسطاً 228 انڈے دیتی ہے بلّیاں اپنی زندگی کا 66 فیصد حصہ سو کر گزارتی ہیں، اُلّو وہ واحد پرندہ ہے جو اپنی نچلی پلکیں جھپکتا ہے، باقی سارے پرندے اپنی اوپری پلکیں جھپکاتے ہیں۔

الغرض اس طرح کائنات کی ہر ہر چیز میں خالق یکتا کی قدرت کا نظارہ محسوس کرنا اور مخلوقات سے خالق تک پہنچنا سیر وسیاحت کا مقصد ہے۔

دو مشہور سیاح کا ذکر

ابن بطوطہ: سیاح اور مورخ ابوعبداللہ محمد ابن بطوطہ مراکش کے شہر طنجہ میں پیدا ہوئے، ادب، تاریخ اور جغرافیہ کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد اکیس سال کی عمر میں پہلا حج کیا، اس کے بعد شوق سیاحت نے افریقہ کے علاوہ روس سے ترکی پہنچایا، جزائر شرق الہند اور چین کی سیاحت کی عرب، ایران، شام، فلسطین، افغانستان اور ہندوستان کی سیاحت کی، چار

بارحج بیت اللہ سے مشرف ہوا،محمد بن تغلق کے عہد میں ہندوستان آئے تھے،سلطان نے اُن کی بڑی آؤ بھگت کی اور قاضی کے عہدے پر سرفراز کیا، یہیں سے ایک سفارتی مشن پر چین جانے کا حکم ملا ۲۸ رسال کی مدت میں اس نے ایک کروڑ مربع کلومیٹر علاقے کی خاک چھانی اور تقریباً ایک لاکھ بیس ہزار کلومیٹر کا پیدل سفر طے کیا، آخر میں فارس کے بادشاہ ابوحنان کی دربار میں آئے، اوران کے کہنے پر اپنے سفرنامے کو کتابی شکل دی، اس کتاب کا نام ”عجائب الاسفارنی غرائب الدیار“ ہے، یہ کتاب مختلف مما لک کے تاریخی و جغرافیائی حالات کا مجموعہ ہے۔

شیخ سعدی: مصلح الدین شیخ سعدی آج سے تقریباً ۸۰۰ رس پہلے ایران کے شہر شیراز میں پیدا ہوئے، آپ کی بہت بڑے معلم مانے جاتے ہیں، آپ دو کتابیں گلستان اور بوستان بہت مشہور ہیں، پہلی کتاب گلستان نثر میں ہے جبکہ دوسری کتاب بوستان نظم میں ہے، آپ نے سو برس عمر میں شیراز، ایران میں انتقال فرمایا۔

آپ کے والد کی وفات آپ کے بچپن میں ہی ہوگئی تھی، اپنی جوانی میں، سعدی نے غربت اور سخت مشکلات کا سامنا کیا اور بہتر تعلیم کے لیے آپ نے اپنے آبائی شہر کو خیر باد کہا اور بغداد تشریف لے آئے، آپ نے المدرستہ النظامیہ میں داخلہ لیا، جہاں آپ نے اسلامی سائنس، قانون، حکومت، تاریخ، عربی ادب اور اسلامی الٰہیات کی تعلیم حاصل کی سعدی شیرازی نے جامع نظامیہ سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد متعدد ملکوں کی سیاحت کی۔

ایک بار انھیں بیت المقدس کے صحرا میں کچھ عیسائیوں نے پکڑ لیا اور طرابلس (ترپولی) میں لے جا کر خندق کھودنے پر لگا دیا، وہ ایک مدت تک پریشان رہے اور آخر کار کسی شناسا نے، انھیں اس حال میں دیکھا تو دس دینار میں خرید کر آزاد کیا، وہ اپنے ساتھ حلب لایا اور یہاں سو دینار مہر کے عوض اپنی شوخ اور زبان دراز بیٹی سے نکاح کر دیا جو اکثر اپنے باپ کے اس احسان کا طعنہ دیتی رہتی تھیں، گویا دس دینار کا قرض بڑھ کر، سو دینار

ہوگیا اور ایک قید سے آزادی کے بعد دوسرے قید میں پڑ گئے، یہ تو پتہ نہیں کہ ان بیگم صاحبہ کا کیا رہا مگر ایک اور شادی کا ذکر ملتا ہے جو یمن کے صنعا مقام پر انھوں نے کی تھی، اس نکاح سے اولاد بھی ہوئی جس کا بچپن میں ہی انتقال ہوگیا اور اپنی آزاد مزاجی کے باوجود انھیں بے حد صدمہ پہنچا، گھریلو ذمہ داریاں اپنی جگہ مگر پھر بھی انھوں نے دنیا کے بیشتر حصوں کی سیر وسیاحت کا سلسلہ اس وقت تک جاری رکھا جب تک جسمانی قوت نے اجازت دی۔

خراسان میں ان کی ملاقات ایک ترکی امیر طغرل سے ہوئی، جن سے بہت جلد گہری دوستی ہوگئی، وہ سعدی شیرازی کو ساتھ لیے سندھ گیا، جہاں انہیں پیر پتر سے ملنے کا موقع ملا، جو ایرانی بزرگ شیخ عثمان مروندیؒ کے پیروکار تھے، اس سفر میں وہ برصغیر بھی آئے اور وسطی ایشیا کے ممالک کی بھی سیر کی، جہاں وہ منگول حملوں سے بچے رہنے والے مسلمانوں سے ملے۔ یہی طغرل بعد ازاں سلطنت دہلی کی ملازمت میں داخل ہوگیا، اس نے سعدی شیرازی کو بھی اپنے ہاں مدعو کیا، سعدی شیرازی، جو ثقافتوں کی رنگارنگی کے شائق تھے، اس دعوت پر لبیک کہتے ہوئے چل پڑے اور دہلی اور گجرات میں جا کر رہے، اس دور میں انہیں سومناتھ کے تاریخی مندر کی بھی سیر کی، اپنی کتاب ''بوستان'' میں گجرات کے سومنات مندر میں ایک مدت تک قیام کی داستان بیان کیا ہے۔

شیخ سعدی کے والد گرامی جیسا کہ شیخ کے کلام سے معلوم ہوتا ہے، ایک باخدا اور متورع آدمی تھے، شیخ کے بچپن کا حال اس سے زیادہ نہیں کہ نماز روزے کے مسائل انھیں بہت چھوٹی عمر میں یاد کرائے گئے تھے اور بچپن ہی میں انھیں عبادت، شب بیداری اور تلاوت قرآن مجید کا کمال شوق تھا، شیخ کے بچپن کے حالات خود انھیں کی تحریر میں جا بجا بیان ہوئے ہیں، جن کے مطابق ان کی ابتدائی تعلیم وتربیت خود ان کے والد کی نگرانی میں، باصلاحیت اساتذہ کے ذریعے ہوئی، والد نے جب انھیں پڑھنے کے لئے بٹھایا تو تختی اور کاغذ کے ساتھ ایک طلائی انگوٹھی بھی، انھیں خرید دی، وہ اس قدر چھوٹے تھے کہ انگوٹھی کی قدروقیمت کو نہیں

پہچانتے تھے اور کسی شخص نے انھیں مٹھائی دے کر انگوٹھی ٹھگ لی۔

والد محترم خود ایک نیک اور پرہیزگار انسان تھے اور راتوں کو اٹھ کر عبادت کیا کرتے تھے، وہ سعدیؔ کو بھی اس کی عادت ڈالنے کی کوشش کرتے رہے، وہ ایک واقعہ کا ذکر کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ، والد کے ساتھ رات کو عبادت کر رہے تھے اور گھر کے دیگر افراد سو رہے تھے، باپ سے کہا کہ دیکھو کیسے سو رہے ہیں، یہ توفیق نہیں ہوتی کہ اٹھ کر دو رکعت نماز ہی ادا کرلیں، انھوں نے یہ سنا تو ناراض ہوئے اور بولے اس غیبت سے تو اچھا تھا کہ تم بھی سو رہتے۔

شیخ سعدی فرماتے ہیں: "میں ایک طویل سفر پر تھا، راستے میں ایک تاجر دوست کے ہاں رات گزارنے کے لیے ٹھہرا، اس نے رات بھر مجھے سونے نہ دیا، اپنی تجارت کے قصے کہانیاں سناتا رہا، جب سب ایران توران کی سنا چکا تو آخر میں کہنے لگا:

"میری تجارت پروان چڑھ گئی اور میری سب آرزوئیں پوری ہوگئیں، اب صرف ایک آخری سفر کرنے کا ارادہ ہے"، شیخ سعدی رحمہ اللہ نے پوچھا: "اور وہ کیا؟"

کہنے لگا "میں یہاں سے فارسی گندھک لے کر چین جاؤں گا، پھر چین سے برتن خرید کر روم میں جا فروخت کروں گا، وہاں سے رومی کپڑے لا کر ہندوستان پہنچوں گا اور ہندوستان سے فولاد خرید کر شام آؤں گا، شام سے شیشہ لا کر یمن میں فروخت کروں گا، وہاں سے یمنی چادریں لے کر واپس فارس آجاؤں گا۔"

شیخ سعدی نے اس کے چہرے کو دیکھا جہاں طویل عزائم اور بے حساب لالچ کی کئی ایک لکیریں نمودار ہو چکی تھیں، اس نے ایک ہی سانس میں پوری دنیا کا "بس آخری" سفر کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ شیخ سعدی نے پوچھا "اچھا، پھر کیا کروگے؟" اس نے اطمینان کا ایک لمبا سانس لیا اور کہا: "بس اس ایک سفر کے بعد میں "قناعت" سے اپنی 'دکان' پر بقیہ زندگی گزار دوں گا۔ آپ اس سب کی خیر و خوبی کے لیے دعا کر دیجیے۔"

گلستان سعدی نامی کتاب میں یہ واقعہ نقل کرنے کے بعد شیخ سعدی نے بس اتنا کہا ہے : ”دنیادار کی تنگ نگاہ کو یا تو قناعت پُر کرسکتی ہے یا قبر کی مٹی اس کا علاج ہے، تیسرا راستہ کوئی نہیں۔

ایک اور جگہ شیخ سعدی فرماتے ہیں کہ ایک دن جوانی کے نشے میں، میں نے سفر میں بڑی تیزی دکھائی اور تھک ہار کر رات کے وقت ایک ٹیلے کے دامن میں جالیٹا، ایک بوڑھا ضعیف جو قافلے کے پیچھے پیچھے آرہا تھا، کہنے لگا بیٹھے کاہے کو ہو، میاں یہ بھی کوئی سونے کی جگہ ہے!!! میں نے کہا چلوں تو کیسے، مجھ میں دم نہیں، بوڑھے نے کہا : کیا تم نے داناؤں کا قول نہیں سنا کہ آہستہ چلنا اور کبھی کبھار دم بھر کے لیے ستانا، بھاگنے اور تھک ہار کر بیٹھ جانے سے ہزار درجے بہتر ہے۔

بھارت کو سیاحت سے فائدہ

سیاحت بھارتی اقتصاد کا ایک اہم جز ہے، عالمی تنظیم ورلڈ ٹریول اینڈ ٹورازم (World travel and tourism) کونسل کے مطابق بھارت میں سیاحت سے بھارتی قومی خزانے کو 8.31 لاکھ کروڑ روپیہ (۱۲۰/ارب امریکی ڈالر) کا فائدہ ہوا، سیاحت سے ۳۷/ملین سے بھی زائد لوگوں کو کام کے مواقع فراہم ہوئے، سالانہ سیاحت کا شعبہ متوسط ۷/اعشاریہ ۵/فیصد ترقی کرتا رہا ہے، بھارت کی خالص قومی پیداوار میں اندازہ لگایا گیا ہے کہ ۲۰۲۵ء تک سیاحت کی وجہ سے سرکاری خزانے کو ۰۷ ۲/بلین امریکی ڈالر کا فائدہ پہنچے گا، اس کے علاوہ ۲۰۱۴ء میں ۱۸۴۲۹۸/لوگوں نے علاج کے لیے بھارت کا رخ کیا۔

اپریل ۲۰۱۶ء میں غیر ملکی سیاحوں کی آمد میں سال ۲۰۱۵ء کے مقابلے 10.7 فیصد کا اِضافہ ہوا، غیر ملکی سیاحوں کی آمد کے لحاظ سے، سب سے زیادہ سیاح بنگلہ دیش سے بھارت آئے، اس کے بعد امریکا اور برطانیہ دوسرے اور تیسرے نمبر پر ہیں، اپریل ۲۰۱۶ء میں سیاحت کے شعبے کے ذریعہ ۱۱۶۳۷/کروڑ روپے کی آمدنی غیر ملکی زرمبادلہ سے حاصل

ہوئی، بھارتی ریاستوں میں سب سے زیادہ سیاح تمل ناڈو، مہاراشٹر، اتر پردیش ، دہلی ، راجستھان، مغربی بنگال، کیرالہ، بہار، کرناٹک اور ہریانہ آئے۔

چارمینار کی آمدنی : ہندوستان کی مشہور تاریخی عمارت چارمینار کو دیکھنے والوں کی تعداد ہر دن ۴۰۰۰/ سے زیادہ ہے بشمول ملک و بیرونی ممالک کے سیاح حیدرآباد کے پرانا شہر میں واقع اس تاریخی عمارت کو دیکھنے آتے ہیں جبکہ تعطیلات کے موقع پر چارمینار دیکھنے والوں کی تعداد ۵/ ہزار تک ہوتی ہے ۲۰۱۹ء میں ۵۱۵۲۴۱۲ بھارتیوں نے چارمینار دیکھا ہے، چارمینار کی سیاحت سے محکمہ آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا کو جملہ ۳۳/ لاکھ ۴۲/ ہزار ۸۷۵/ کی آمدنی ہوئی ہے۔ (ادارہ فکر و خبر)

تاریخی، ثقافتی ورثہ کی حفاظت کریں

تاج محل ہو یا لال قلعہ، جامع مسجد دہلی ہو یا فتح پور سکری، قطب مینار ہو یا چارمینار یہ تاریخی عمارتیں جو ہندوستان کی پہچان ہیں، ہر دور میں تعصب پرست سیاسی قائدین اور مؤرخین کا نشانہ رہی ہیں، ہندوستان میں ان تاریخی عمارتوں کے سوا اور رکھا کیا ہے! دنیا کے گوشے گوشے سے چاہے وہ مشرق ہو یا مغرب، سیاحوں کے مختلف ممالک کے سربراہان ہندوستان آتے ہیں اور تاج محل کے نظارہ کے بغیر اپنے دورۂ ہند کو ادھورا سمجھتے ہیں۔ ہندوستان میں سیاحت کے شعبے کو جتنی آمدنی ان تاریخی عمارتوں کے مشاہدے کے لئے ٹکٹس سے ہوتی ہے وہ شاید ہی کسی اور سیاحتی مقام سے ہوتی ہوگی۔ ٹائمز آف انڈیا (Times of India) کی ایک رپورٹ (Report) کے مطابق تاج محل کے ٹکٹس کی فروخت سے سالانہ کم از کم ایک لاکھ پچیس کروڑ روپئے وصول ہوتے ہیں۔ تاج محل چاہے اسے اسلامی فن تعمیر کا ایک بے مثال شاہکار کہا جائے یا شاہجہاں ممتاز محل کی محبت کی یادگار۔ بہرحال یہ ہندوستان کی ناک ہے۔ اور خوبصورتی کا معیار ناک و نقوش ہی ہوا کرتے ہیں۔ یہ بدقسمتی ہے کہ ہندوستان پر مختلف ادوار میں اُن عناصر نے حکومت کی جنہیں تعصب نے بے ذوق

بنا دیا ہے، تاج محل ہو یا کوئی اور تاریخی عمارت یا کسی مسلم نام سے آباد شہر انہیں مٹانے یا کم از کم ان کے نام کی تبدیلی کے ہر دور میں کوشش ہوتی رہی۔ جیسے بھاگ متی جیسے فرضی کردار کو بانی شہر حیدرآباد قلی قطب شاہ کی محبوبہ اور پھر ملکہ قرار دے کر حیدرآباد کو بھاگیہ نگر کے نام سے موسوم کرنے کی بہت کوششیں کی گئیں۔

یہ ہماری بدبختی ہے تعصب پرست عناصر کی مہمات میں ہمارے اپنے بھی کسی نہ کسی طرح سے شامل رہتے ہیں۔ جو تاریخ کو اپنے زاویہ سے اپنے نکتہ نظر سے مرتب کرنا چاہتے ہیں۔ یہ عناصر بھی ہندوستان سے اسلامی ثقافت اور تہذیب کے آثار کو مٹانے کے لئے برابر کے ذمہ دار ہیں، ان کی کوششوں کے خلاف یقیناً کوئی نہ کوئی آواز ہوتی ضرور ہے مگر اس میں جان نہیں ہوتی، اخبارات میں بیانات کچھ ٹی وی مباحث اور پھر خاموشی۔ دوسری طرف تعصب پرست عناصر جو اپنے انفرادی مفادات کے مقابلہ میں اپنی قوم کے مفادات کو ترجیح دیتے ہیں جو اپنے لئے نہیں بلکہ آنے والی نسلوں کے لئے منصوبہ بندی کرتے ہیں، وہ کبھی خاموشی سے کبھی علی الاعلان اپنا کام کر جاتے ہیں، دہلی میں مغل حکمرانوں کے نام سے موسوم بعض سڑکوں کے نام تبدیل کئے جا چکے ہیں، اب شہروں کے نام تبدیل کرنے کے بعد تاریخی عمارتوں کا نمبر آئے گا، عمارتیں تو رہیں گی مگر جب کتابوں میں یا سیاحتی کتابچوں میں یادستاویزی فلموں میں ان کا ذکر نہیں ہوگا تو یہ اپنی اہمیت سے محروم ہوتی جائیں گی، مسلم مجاہدین آزادی کے نام تو پہلے ہی سے نصابی کتابوں سے غائب ہو چکے ہیں، چند برس بعد کسی کو یاد بھی نہیں ہوگا کہ علی برادران بھی ہوا کرتے تھے جن کی والدہ نے گاندھی کو مہاتما بنایا، مولانا آزاد بھی رہیں ہوں گے جو گاندھی اور نہرو کے شانہ بہ شانہ ہوا کرتے تھے۔ اے پی جے عبدالکلام کا نام تو آج لیا جا رہا ہے آنے والے برسوں میں وہ بھی تاریخ کا بھولا ہوا حصہ بن سکتے ہیں، جس طرح سے ۱۸۵۷ء پہلی جنگ آزادی کے شہیدوں، غازیوں اور مجاہدین کے نام سے آج کی غیر تو کیا خود ہماری اپنی نسل واقف نہیں ہے۔ اُسی طرح اس کے بعد کے دور

کے مسلم سورما بھی بھلا دے ئے جائیں گے،سوال یہ ہے کہ وہ تو اپنی مشن کی تکمیل کرتے رہیں گے، ہم نے اب تک کیا کیا اور آگے کیا کر سکتے ہیں، ہم نے سنجیدگی کے ساتھ کوشش ہی نہیں کی کہ اپنے پیشرو اور آنے والی نسلوں کو اپنی شاندار تاریخ سے واقف کروایا جائے، ہم نے بس چند ہی شخصیات کو اپنا نمائندہ بنا کر پیش کیا اور انہیں نظر انداز کر دیا جنہوں نے اس ملک کی آزادی کے لئے اپنے جان ومال کی قربانی دی۔

مسلم حکمرانوں کی تعمیر کردہ تاریخی عمارتوں کے آثار کو مٹانے یا انہیں غیر اہم ثابت کرنے کی یہ سازش اور کوشش ۱۸۴۷ء کے بعد سے انگریزوں نے شروع کی تھی،سرسید احمد خان نے جو نباض زمانہ اور بڑے دوراندیش تھے۔انہوں نے نوشتہ دیوار پڑھ لیا تھا، انہیں اندیشہ تھا کہ مسلم آثار کو مٹا دیا جائے گا چنانچہ انہوں نے اپنی شخصی محنت وجستجو سے دہلی اور اس کے اطراف واکناف کے سینکڑوں مسلم عمارتوں اور تاریخی مقامات کے کتبے پڑھ کر انہیں اپنی ڈائری میں قلمبند کیا اور پھر اس کی تفصیلات آثار الصنادید میں محفوظ کر دی، آج سرسید کی ۲۰۰ر سالہ تقاریب کا اہتمام کیا جا رہا ہے تو ان کی اس بے مثال خدمات کے لئے انہیں خراج عقیدت پیش کئے بغیر رہا نہیں جا سکتا۔آثار الصنادید نہ ہوتی تو جانے دہلی کے کتنی مسلم عمارتوں کی تاریخ مسخ کر دی جاتی جیسا کہ عثمانیہ یونیورسٹی اور کئی اور عمارتوں کے ساتھ کیا جا چکا ہے۔(ادارہ فکر وخبر،19ر اکتوبر 2017ء)

تفریح میں ہونے والے گناہ

گانا سننا: سیر وتفریح میں عموما گانے سنے جاتے ہیں،حضرت ابی مالک اشعری کہتے ہیں: ’’رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، البتہ میری اُمت میں سے لوگ ضرور شراب پئیں گے اور اس کے نام کے علاوہ کوئی اور نام رکھیں گے، ان کے سروں پر باجے گاجے بجائے جائیں گے اور گانے والیاں (گانے گائیں گی) اللہ تعالیٰ انہیں زمین میں دھنسا دے گا ان

میں سے بندر اور سور بنادے گا۔(۱)

ایک حدیث میں رسول اکرم ﷺ کا فرمان کچھ اس طرح ہے" میری امت میں کچھ لوگ ایسے آئینگے جو زنا اور ریشم اور شراب اور گانا بجانا اور آلات موسیقی حلال کرلینگے، اور ایک قوم پہاڑ کے پہلو میں پڑاؤ کریگی تو ان کے چوپائے چرنے کے بعد شام کو واپس آئینگے، اور ان کے پاس ایک ضرورتمند اور حاجتمند شخص آئیگا وہ اسے کہہ ینگے کل آنا، تو اللہ تعالیٰ انہیں رات کو ہی ہلاک کردیگا، اور پہاڑ ان پر گرادے گا، اور دوسروں کو قیامت تک بندر اور خنزیر بنا کر منسوخ کردیگا"

سمع النبي صلى الله عليه وسلم يقول: "ليكونن من أمتي أقوام، يستحلون الحر والحرير، والخمر والمعازف، ولينزلن أقوام إلى جنب علم، يروح عليهم بسارحة لهم، يأتيهم يعني الفقير لحاجة فيقولون :ارجع إلينا غدا، فيبيتهم الله، ويضع العلم، ويمسخ آخرين قردة وخنازير إلى يوم القيامه"(۲)

سیلفی، فوٹو لینا: تصویر کا استعمال اتنا عام ہو چکا ہے کہ شاید ہی کوئی گھر، بلکہ کوئی جیب اس سے خالی ہو، تصویر کے بارے میں احادیث میں مذمت بھی آئی ہے اور جواز کی صورت بھی موجود ہے، کرنسی نوٹ، ٹکٹیں، لفافے، رسالے، دستاویزات، ویزا، پاسپورٹ، شناختی کارڈ، ملازمت، سفر، شادی بیاہ اور لین دین وغیرہ کا جواز عموم بلوٰی ہے۔

آج کل کی سیر و تفریح جس میں گناہ کا عموماً ارتکاب ہوتا ہے اگر frindly toor ہو تو عموماً گناہ کو گناہ سمجھا ہی نہیں جاتا سیلفی لینا اب عام ہو چکا ہے فوٹو لینے کے بغیر سفر مشکل ہو چکا ہے اور تو اور فرینڈلی ٹور پر short flim بنائے جاتے ہیں یا آخری درجہ میں moves تو دیکھ لیتے ہیں، فوٹو سے زیادہ سیلفی میں ہزاروں لوگوں کی جانیں جا چکی ہیں، شیروں کے

---

(۱) ابن ماجہ، کتاب الفتن ۱۳۳۳ / ۲، امام ابن قیم نے اس حدیث کی سند کو صحیح قرار دیا ہے۔
(۲) صحیح بخاری، حدیث: ۵۵۹۰۔

ساتھ سیلفی میں چھترے نکل گئے، جھولے میں سیلفی سے ہڈیاں ڈوٹ گئی، سیڑیوں پر سلفی سے گر کر سر پھوٹ گیا، چھت پر سیلفی لے کر گر کے مر گئے، چلتی گاڑی پر سیلفی نے موت کے منہ پہنچا دیا، جبکہ سیلفی اور تصویر کا گناہ بڑا سخت ہے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالی فرماتا ہے: اس سے بڑا ظالم کون ہوگا جو میری تخلیق جیسی تخلیق کرنے کی کوشش کرتا ہے، ایسے لوگ ایک ذرہ، ایک دانہ یا ایک جو ہی بنا کر دکھلائیں۔ ''وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ ذَهَبَ يَخْلُقُ كَخَلْقِي، فَلْيَخْلُقُوا ذَرَّةً أَوْ لِيَخْلُقُوا حَبَّةً أَوْ لِيَخْلُقُوا شَعِيرَةً''(۱)

عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا: ہر مصور جہنم میں جائے گا، اس کی بنائی ہوئی ہر تصویر کے بدلے میں ایک جان بنائی جائے گی جس کے ذریعہ سے اس (مصور) کو جہنم میں عذاب دیا جائے گا۔ ''كُلُّ مُصَوِّرٍ فِي النَّارِ، يَجْعَلُ لَهُ، بِكُلِّ صُورَةٍ صَوَّرَهَا، نَفْسٌ يُعَذِّبُ بِهَا فِي جَهَنَّمَ''(۲)

نماز ترک کر دینا: سیر وتفریح کے بہانے نمازیں چھوڑ دی جاتی ہیں، جبکہ تفریح کی وجہ نماز کا ترک جائز ہی نہیں ہے، پارکوں میں کافی جگہ رہتی ہے، پانچ منٹ میں اپنی مختصر نماز سے فارغ ہونا ضروری ہے، جگہ پاک اور ناپاک ہونے کے شک میں نماز ترک کرنے کی اجازت نہیں ہے زمین بالفرض ناپاک بھی اگر دھوپ کی وجہ سے سوک گئی ہو تو نماز کے لئے پاک ہو جاتی ہے، پارکوں میں بیٹھتے لیٹتے وقت پاکی کا خیال نہیں ہے آتا، پارکوں میں کھاتے ناچتے وقت دوسروں کے دیکھنے کی وجہ سے شرم نہیں آتی صرف نماز کے وقت پاکی اور شرم آجاتی ہے، یہ بے شرموں کی شرم ہے جس میں حکم الہی ٹوٹا جارہا ہو، شرم تو وہ ہے جو گناہ سے بچالے نہ وہ جو گناہ پر آمدہ کرے، علامہ ابو عبد اللہ محمد القرطبی

---

(۱) صحیح البخاری، حدیث ۵۹۵۳، صحیح مسلم [illegible]، حدیث ۲ [illegible]۔

(۲) صحیح البخاری [illegible] حدیث ۲ [illegible]۔

نے ''الجامع لاحکام القرآن'' میں عمر بن دینار کے حوالہ سے لکھا ہے کہ مدینہ منورہ میں رہنے والے ایک شخص کی بہن کا انتقال ہوگیا۔ اتفاق سے تدفین کے وقت اس شخص کی ایک تھیلی جس میں دینار بھرے ہوئے تھے قبر میں رہ گئی، چنانچہ اس نے قبر کھودی تو کیا دیکھتا ہے کہ پوری قبر آگ کے شعلوں میں بھری ہوئی ہے، اس نے جا کر اپنی والدہ سے پوچھا کہ میری بہن کی عملی زندگی کیسی تھی؟ والدہ نے بتایا کہ ایک تو نماز اپنے وقت سے ٹال دیتی تھی یعنی قضا کر دیتی تھی دوسرے یہ کہ جب رات کو پڑوسی اپنے اپنے کمروں میں چلے جاتے تو یہ اٹھ کر ان کے دروازوں پر کان لگا لیتی اور ان کے رازوں کو حاصل کر لیتی تھی۔ تو اس شخص نے اپنا چشم دید واقعہ ذکر کیا اور کہا کہ اس کی انہی بدعملیوں کا وبال ہے۔(۱)

ترک صلاۃ میں عذر مقبول نہیں: حضرت مجاہدؒ فرماتے ہیں قیامت کے دن ایک بندے کو پیش کیا جائے گا اور اس سے پوچھا جائے گا تجھے میری عبادت کرنے سے کس نے روکا تھا؟ وہ کہے گا آپ نے مجھے آزمائش میں ڈالا میرے کئی مالک تھے انہوں نے مجھے مصروف رکھا تو حضرت یوسف علیہ السلام کو غلامی کی حالت میں بلایا جائے گا، پھر اس شخص سے پوچھا جائے گا تو زیادہ غلامی میں تھا یا یہ؟ وہ عرض کرے گا یہ، تو اس سے کہا جائے گا ان کو تو غلامی نے میری عبادت کرنے سے نہیں روکا، پھر غنی کو پیش کیا جائے گا اس سے پوچھا جائے گا کہ تجھے میری عبادت کرنے سے کس نے روکا؟ وہ عرض کرے گا میرا مال بہت تھا میں اس میں پھنسا ہوا تھا تو حضرت سلیمان علیہ السلام کو ان کی حکومت کی حالت میں میں بلایا جائے گا پھر پوچھا جائے گا کہ تو زیادہ مالدار تھا یا یہ؟ وہ عرض کرے گا بلکہ یہ! اللہ تعالیٰ فرمائیں گے ان کو تو مال و دولت نے میری عبادت سے نہیں روکا۔ پھر مریض کو پیش کیا جائے گا اور پوچھا جائے گا تجھے میری عبادت کرنے سے کس نے روکا؟ وہ عرض کرے گا یا رب آپ نے مجھے بیماری میں مبتلا کیا تھا تو حضرت ایوب علیہ السلام کو ان کے دکھ کی حالت میں بلایا جائے گا،

---

(۱) تفسیر قرطبی ۸: ۳۰۲/۔

پھر پوچھا جائے گا کہ تم زیادہ دکھی تھے یا یہ؟ وہ عرض کرے گا بلکہ یہ تو اس سے پوچھا جائے گا پھر تجھے میری عبادت سے کس چیز نے روکے رکھا؟ تینوں قسم کے لوگ لاجواب شرمندہ اور مستحق سزا ہوں گے(١) تو بتائیے تفریح کی وجہ سے چھوڑی جانے والی نمازوں کا حساب نہیں ہوگا؟

بدنظری: سیر و تفریح میں نگاہوں کی حفاظت نہیں کی جاتی ہیں جو بڑا خطرناک گناہ ہے، بعض مرتبہ ایک نظر ایمان وحیاء کی دامن کو تار تار کردتی ہے، حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ آنکھوں کا زنا دیکھنا ہے، کانوں کا زنا سننا ہے، زبان کا زنا بات کرنا ہے، ہاتھ کا زنا پکڑنا ہے، پاؤں کا زنا چلنا ہے، ،دل آرزو اور تمنا کرتا ہے، شرمگاہ اس کی تصدق یا تکذیب کرتی ہے۔ عن قال: "كتب على ابن آدم نصيبه من الزنا، مدرك ذلك لا محالة، فالعينان زناهما النظر، والأذنان زناهما الاستماع، واللسان زناه الكلام، واليد زناها البطش، والرجل زناها الخطا، والقلب يهوى ويتمنى، ويصدق ذلك الفرج ويكذبه"(٢)

نگاہ ابلیس کے تیرون میں سے زہر کا بجھا ہوا ایک تیر ہے۔"إِنَّ النَّظْرَةَ سَهْمٌ مِنْ سِهَامِ إِبْلِيسَ مَسْمُومٌ۔(٣)

حضرت حسن بصری سے مُرسلاً مَروی ہے کہ نبی کریم ﷺ کا اِرشاد ہے: اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو (یا اللہ تعالیٰ نے لعنت کی ہے) اُس شخص پر جس نے (کسی نامحرم کی طرف) دیکھا اور اُس پر جس کی طرف دیکھا گیا۔ "لَعَنَ اللهُ النَّاظِرَ والْمَنْظُورَ إِلَيْهِ"۔(٤)

حضرت ابوامامہ نبی کریم ﷺ کا یہ اِرشاد نقل فرماتے ہیں: تم لوگ ضرور بالضرور اپنی نگاہوں کی حفاظت کرو اور اپنی ضرور بالضرور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرو اور ضرور

(١) البدور السافرة، حدیث ٧٨٨:، قیامت کے ہولناک مناظر: ٢٨١۔

(٢) صحيح مسلم حديث نمبر : ٢١۔

(٣) طبرانی کبیر، حدیث: ١٠٣٦٨

(٤) شعب الايمان حديث ٧٣٩:۔

بالضرور اپنے چہروں کو سیدھا رکھو ورنہ تمہارے چہروں کو بے نور کر دیا جائے گا۔ لَتَغُضُّنَّ أَبصَارَ [illegible] كُم

علّامہ ابن کثیر نے بعض اَسلاف سے نقل کیا ہے : نظر ایک ایسا تیر ہے جو دل میں زہر ڈال دیتا ہے۔ "النَّظَرُ سِهَامُ سُمٍّ إِلَى الْقَلْبِ۔ (۲)

حضرت داود نے اپنے بیٹے کو نصیحت فرمائی کہ شیر اور اژدہے کے پیچھے جانا روا ہے مگر عورتوں کے پیچھے ہرگز نہ جانا، درندہ کے پیچھے جانے سے جان کا خطرہ عورت کے پیچھے جانے سے ایمان کا خطرہ ہے۔

حافظ ابن قیم علیہ الرحمہ فرماتے ہیں نگاہ کا تیر پھیکا جائے تو پھینکنے والا پہلے قتل ہو جاتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ نگاہ ڈالنے والا دوسری نگاہ کو اپنے زخم کا مداوا سمجھتا ہے، حالانکہ وہ زخم کو زیادہ گہرا کرتا ہے، حافظ ابن قیم فرماتے ہیں آنکھ بند کرنا آسان ہے مگر بعد تکلیف پر صبر کرنا مشکل ہے۔ (۳) بعض اسکول والے اور کالج والے اپنے اسٹوڈنٹس (Students) کو سیر و سیاحت پر لے جاتے ہیں وہ آپس میں اجنبی لڑکا لڑکی کو جمع کر دیتے ہیں پھر آپس میں ناجائز تعلق اور عشق بازی جس کے سبب وہ اپنے ہاتھوں ہی سے اپنی عزت کھو بیٹھتے ہیں، یہ سب سیر و تفریح ممنوعات میں سے ہے۔

ساحل سمندر پر عیاشیوں کے نتائج

کرہ ارض کا ایک چوتھائی حصہ خشکی جبکہ بقیہ ۳ حصے سمندر پر مشتمل ہے، بحیرہ یا سمندر sea کا پانی شدید نمکین ہوتا ہے، بحر سے متصل بڑی نمکین جھیل یا بحیرہ قزوین جیسی قدرتی آبی راہ زمین پر زندگی کو وجود بخشتے ہیں لیکن یہی سمندر آج بپھرے ہوئے ہیں جبکہ اہل علم کو اس کی

---

(۱) طبرانی کبیر، حدیث: ۷۸۴۰۔

(۲) تفسیر ابن کثیر: ۶/ ۳۹۔

(۳) الکافی ۷۷ ۴۔

وجہ معلوم ہے، ایک طرف سمندر کے سینے میں پورے شہر کی گندگی انڈیلی جاتی ہے تو دوسری جانب اس کے کناروں کو عیاشیوں کا اڈہ بنادیا جاتا ہے لیکن وہ خاموش رہتا ہے اور بے حس حکمرانوں کا ہر ظلم وستم سہتا رہتا ہے، برہنہ ہوکر گیت گاتے ہیں، ناچتے ہیں، مصیبت یہ ہے کہ صحت مند طرز زندگی کو فروغ دینے کے نام پر یورپی ساحل سمندر پر عیاشی اور بے حیائی کا سلسلہ دن بدن فروغ پارہا ہے، ہندوستان میں ممبئی اور گوا کے علاوہ دنیا کے بیشتر ساحلی مقامات برہنگی کے مناظر پیش کرتے ہیں۔

ملیشیا میں منعقد کئے جانے والے برہنہ اسپورٹس (Sports) میلہ کی ویڈیو منظر عام پر آنے کے بعد پولیس کو ہوش آیا اور اس میں شامل مرد وخواتین کی گرفتاری عمل میں آئی، یہ بھی اس وقت ہوا جب سنگاپور سے تعلق رکھنے والے کسی البرٹ پام نے انٹرنیٹ پر ایک ویڈیو جاری کردی جس میں ۹ مرد اور ۶ عورتیں مختلف برہنہ کھیلوں میں مشغول دکھائے گئے ان سب میں کھلاڑی مکمل طور پر مادرزاد برہنہ ہوکر شامل تھے۔ ان کھیلوں میں دوڑ، جمناسٹک، چھلانگیں اور رقص کے مقابلہ شامل تھے۔ ملیشیا جیسے اسلامی ملک میں اس قسم کی حیاء سوز حرکات کی ویڈیو سامنے آنے پر عوام میں اشتعال کی لہر دوڑ گئی، برہنہ کھیلوں کا انعقاد کرنے والوں اور ان میں حصہ لینے والوں کی گرفتاری کے لئے چھاپے مارے گئے، آزاد خیال لوگوں نے ایک انٹرویو میں ڈھٹائی سے کہا کہ ننگے رہنا ایک فطری طرز زندگی ہے۔

بے لباسی پر کمر بستہ

اسی طرح کے نظارے چین میں بھی نظر آتے ہیں ساحل پر دھوپ سینکنے اور سمندر میں بغیر کپڑوں کے نہانے کے شوقین لوگ بے حیائی پر کمر بستہ رہے ہیں، تنگ آکر حکومت نے ہینان نامی جزیرہ کے خلاف کمر کسی جو ہمیشہ سے ہی سردی کے مارے ہوئے چینیوں کے لئے پرکشش مقام رہا ہے، دھوپ سے لطف اندوز ہونے والے لوگ بے لباسی پر ذرا نہیں شرماتے، جزیرے کی کمیونسٹ پارٹی کے سربراہ نے اس برہنگی پر غصے کا اظہار کیا اور اس

حرکت کو بدتہذیبی اور چینی روایت کی خلاف ورزی قرار دیا جبکہ کوئی بھی ہوش مند انسان لوگوں کے سامنے برہنہ تیراکی نہیں کرسکتا اور نہ ہی دھوپ سینک سکتا ہے، جزیرے کی پولیس کو حکم دے دیا گیا ہے کہ وہ ایسے لوگوں کو پکڑنے کے لئے ۲۴ گھنٹے گشت کریں، پولیس لاؤڈسپیکروں کے ذریعہ خبردار کیا کہ اگر دھوپ میں لیٹے بے لباسوں نے خود نہ ڈھانپا تو انہیں دس دنوں کے لئے ”ہدایت براستہ قیدو بند“ کے پروگرام میں ڈالا جاسکتا ہے۔

سمندر کا غضب

ایک حدیث میں یوں آیا ہے کہ حضرت عمرؓ ارشاد فرماتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا ہے کہ سمندر ہر رات کو اللہ عزوجل سے درخواست کرتا ہے کہ اللہ آپ اجازت دیدیجئے کہ میں تیری نافرمانی کرنے والوں کو نیست و نابود کردوں، تو اللہ تعالیٰ اپنے حلم و بردباری سے اسے روک دیتے ہیں۔(۱) ماضی گواہ ہے کہ انسانوں کی بداعمالیوں پر قدرتی آفات کا قہر ٹوٹتا ہے۔

لرزہ خیز ماضی

ماضی کے اوراق پلٹیں تو پتہ چلتا ہے کہ ۱۹۹۹ء میں اڑیسہ میں آنے والے ’سپر سائیکلون‘ سے ۱۰ہزار سے زائد افراد ہلاک ہوئے تھے۔

ابھولا سائیکلون (1970ء) یہ طوفان 13 نومبر کی رات کو مشرقی پاکستان (موجودہ بنگلہ دیش) پر موت کی چادر لے کر بڑھا اور تقریباً دس لاکھ افراد کی زندگی کا چراغ گُل کرگیا۔ صرف بھولا نامی ایک علاقے میں ایک لاکھ سے زیادہ افراد جاں بحق ہوئے، اِسی لیے طوفان کو بھولا سائیکلون کہا جاتا ہے، یہ اب تک آنے والے طوفانوں میں سب سے ہولناک

(۱) مسند احمد مسند عمر بن الخطاب حدیث ۳۰۳: محقق شعیب الارنوط نے کہا کہ اس حدیث کی سند ضعیف ہے اس شیخ کے مجہول ہونے کی وجہ سے جس سے عوام بن حوشب اور ابو صالح نے روایت کیا ہے۔

طوفان ہے۔

۲۔ہیزل سائیکلون (1954ء) قریباً 1200 افراد ہلاک ہوئے۔

۳۔گیلوسٹون Galvaston(1900)اس ہریکین میں آٹھ سے بارہ ہزار افراد لقمہ اجل بن گئے۔

۴ میکسیکو ہریکین (1909ء) پندرہ سو افراد موت کی نیند سو گئے۔ Lake 1 Okeechobee Hurricane 1932ء) ڈھائی ہزار سے 3107 اموات ہوئیں۔

۵ ۔ڈومینکن ری پبلک ہریکین (1930ء) دو سے آٹھ ہزار افراد ہلاک ہوئے۔

۶۔فی فی Fifi ہریکین (1974ء) آٹھ سے دس ہزار افراد جاں بحق ہو گئے۔

۷ ۔فلورا ہریکین (1963ء) 7200 :افراد طوفان کی نذر ہوئے۔

۸ ۔کیوبا ہریکین (1932ء) 2500 سے 3107 افراد جان کی بازی ہار گئے۔

اس کے علاوہ اور بہت سے طوفانوں نے بے حیائی کی سزا دی ہے۔

ہندوؤں کے میلے میں شرکت

تفریح کے نام پر غیر مسلموں کے ان تہواروں میں شرکت جو مذہبی نہ ہوں بلکہ صرف معاشرتی ہوں، مگر بنیادی طور پر غیر مسلموں کی تہذیب و معاشرت سے لیے گئے ہوں تو ان میں بھی مسلمانوں کو شرکت سے بچنا لازم ہے؛ کیونکہ جس چیز کی شریعت میں کوئی بنیاد نہ ہو بلکہ غیر مسلم معاشرے کا طریقہ ہو یا انہی کا چلایا ہوا ہو، ان کی تہذیب کا حصہ ہو تو مسلمانوں کو ایسے تہوار منانے، ان میں شرکت کرنے اور اپنے قول وعمل سے ان کی رونق بڑھانے سے اجتناب کرنا بھی غیرتِ ایمانی کا تقاضہ ہے، لہذا غیر مسلموں کی طرح محض رسم پوری کرنے کی غرض سے مدر ڈے (Mother day)، فادر ڈے (Father day) یا بلیک فرائیڈے (Black friday) وغیرہ منانے سے بھی مسلمانوں کو حتیٰ الامکان اجتناب کرنا

چاہئیے۔ نیز مدرڈے، فادرڈے منانے میں ایک خرابی یہ بھی ہے کہ اس سے یہ اَثر ملتا ہے کہ ماں باپ (والدین) سے سال میں ایک مرتبہ اظہارِ محبت یا ان کی عزت واحترام کا سال میں ایک مرتبہ خیال کرلینا کافی ہے، اوراس سے ان کا حق ادا ہوجائیگا، حالانکہ اسلامی تعلیمات کی رو سے ماں باپ کی عزت وادب کو ملحوظ رکھنا اولاد پر ہر وقت اور ہر دن لازم ہے، اس کا سال کے کسی خاص دن یا کسی خاص وقت سے تعلق نہیں۔

فتاویٰ محمودیہ میں خلافِ شرع میلوں میں شرکت کے متعلق ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے حضرت مفتی صاحب لکھتے ہیں: "جس طرح خلافِ شرع اور شرکیہ امور کا ارتکاب ممنوع ہے ایسی جگہ جا کر ان کی رونق میں اضافہ کرنا بھی ممنوع ہے"(۱)

خلاصہ یہ کہ سیر وتفریح میں نہ افراط سے کام لے نہ تفریط سے، کبھی کبھار گھومنے چلے جایا کریں، معمول نہ بنائیں، تفریح میں خصوصا گناہوں سے بچنا کا اہتمام کریں، معصیت گاہ کو تفریح گاہ نہ بنائیں، ایسے دن یا ایسے وقت یا ایسی جگہ تفریح کے لیے نہ جائیں جہاں گناہ ہونا طے ہے، یا جو پارک وغیرہ بدنامِ زمانہ ہے معصیت کی جگہ جانے کے بعد معصیت نہ بھی کریں تو بھی اسکے ناپاک اثرات سے بچنا مشکل ہے اور متہم ہونا طے ہے۔

(۱) فتاوی محمودیہ: ۲۹/ ۳۵۲

جمہوریت اک طرز حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

۲۶ جنوری یوم جمہوریہ

Republic Day

یوم جمہوریہ بھارت

آزاد ہندوستان کی تاریخ میں دو دن انتہائی اہمیت کے حامل ہیں ایک ۱۵/ اگست، جس میں ملک انگریزوں کے چنگل سے آزاد ہوا، دوسرا یوم جمہوریہ ۲۶/جنوری جس میں ہندوستان جمہوری ملک قرار دیا گیا، بھارت میں عوامی تعطیلات کی اہم اور لازمی تین تعطیلات میں سے ایک یومِ جمہوریہ ہے، دیگر دو تعطیلات یوم آزادی اور ۲/اکتوبر گاندھی جینتی ہیں۔

اہم اور خاص یومِ جمہوریہ تقریبات نئی دہلی میں منعقد کی جاتی ہیں، اس دن بھارتی صدر جمہوریہ کی زیر صدارت اجلاس بڑے ہی دھوم دھام سے منائے جاتے ہیں، اس کا اہم مقصد بھارت کو خراج پیش کرنا ہوتا ہے۔

ملک بھر میں ہر ریاست، ضلع یہاں تک کہ اسکول اور مدارس میں بھی یہ تقریبات منائی جاتی ہیں، ملک کے باہر بھی، وہ ممالک اور مقامات جہاں بھارتی عوام رہتی ہے، یہ تقریبات منائی جاتی ہیں۔

یوم جمہوریہ کی کچھ خاص باتیں

۲۶/جنوری کو ہی آئین کیوں نافذ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ۲۶/جنوری ۱۹۳۰ء میں اسی دن انڈین نیشنل کانگریس نے ہندوستان کی مکمل خود مختاریت کا اعلان کیا تھا، اسی مناسبت سے ۲۶/جنوری کو یوم جمہوریہ کی تقریب پر صدر جمہوریہ کے ذریعے ترنگا لہرایا جاتا ہے، اس موقع پر ہر سال ایک عظیم الشان پریڈ بھی انڈیا گیٹ سے راشٹرپتی بھون تک راج پتھ پر منعقد کی جاتی ہے، اس پریڈ میں ہندوستانی فوج کے مختلف ریجمنٹ، فضائیہ، بحریہ وغیرہ حصہ لیتے ہیں پی آئی بی (پریس انفارمیشن بیورو(Press information bureau)، حکومت ہند) کے مطابق ملک میں ۲۶/جنوری ۱۹۵۰ء کو صبح ۱۰:۱۸ بجے ہندوستان ایک جمہوریہ بنا، اس کے ۶/منٹ بعد ۱۰:۲۴ بجے راجیندر پرساد نے ہندوستان کے پہلے صدر کے طور پر حلف لیا تھا، اس دن پہلی بار بطور صدر ڈاکٹر راجیندر پرساد بگھی پر بیٹھ کر راشٹرپتی

بھون سے نکلے تھے اس دن پہلی بار انہوں نے ہندوستانی فوج کی سلامی لی تھی، پہلی بار ان کو گارڈ آف آنر (Guard of honour) دیا گیا تھا۔

۲۶؍جنوری کو یوم جمہوریہ پریڈ کی شروعات ۱۹۵۰ءمیں آزاد ہندوستان کے آئین نافذ ہونے کے ساتھ ہوئی تھی، سال ۱۹۵۰ءسے ۱۹۵۴ءتک یوم جمہوریہ کی پریڈ راج پتھ پر نہ ہوکر، چار الگ الگ جگہوں پر ہوئی تھیں، ۱۹۵۰ءسے ۱۹۵۴ءتک یوم جمہوریہ پریڈ کا انعقاد بالترتیب ایرون اسٹیڈیم (نیشنل اسٹیڈیم) کنگس وے، لال قلعہ اور رام لیلا میدان میں ہوا تھا ۱۹۵۵ءسے یوم جمہوریہ پریڈ کا انعقاد راج پتھ پر شروع کیا گیا، تب راج پتھ کو 'کنگس وے' کے نام سے جانا جاتا تھا۔ تبھی سے راج پتھ پر اس کا انعقاد ہوتا ہے۔ یوم جمہوریہ کی تقریب میں ہر سال کسی نہ کسی ملک کے وزیر اعظم یا صدر یا حکمراں کو مہمان خصوصی کے طور پر حکومت کے ذریعے مدعو کیا جاتا ہے ۲۶؍جنوری ۱۹۵۰ءکو پہلے یوم جمہوریہ کی تقریب میں انڈونیشیا کے صدر ڈاکٹر Sukarno مہمان خصوصی تھے، ۲۶؍جنوری ۱۹۵۵ء میں راج پتھ پر منعقد پہلی یوم جمہوریہ تقریب میں پاکستان کے گورنر جنرل ملک غلام محمد مہمان خصوصی تھے، قومی ترانے کے دوران ۲۱؍توپوں کی سلامی دی جاتی ہے ۲۱؍توپوں کی یہ سلامی ترانے کی شروعات سے شروع ہوتی ہے اور ۵۲؍سیکنڈ کے ترانے کے ختم ہونے کے ساتھ پوری ہو جاتی ہے، ۲۱؍توپوں کی سلامی اصل میں ہندوستانی فوج کے ۷؍توپوں کے ذریعے دی جاتی ہے، جن کو پونڈرس کہا جاتا ہے، ہر ایک توپ سے تین راؤنڈ فائرنگ ہوتی ہے، یہ توپیں ۱۹۴۱ءمیں بنی تھیں اور فوج کے تمام رسمی پروگراموں میں ان کو شامل کرنے کی روایت ہے بہترین پریڈ کی ٹرافی دینے کے لئے پورے راستے میں کئی جگہوں پر ججوں کو بٹھایا جاتا ہے، یہ جج ہر ایک جماعت کو ۲۰۰؍عیارات پر نمبر دیتے ہیں، اس کی بنیاد پر بہترین مارچنگ جماعت کا انتخاب ہوتا ہے، کسی بھی جماعت کے لئے اس ٹرافی کو جیتنا بڑے فخر کی بات ہوتی ہے، پریڈ میں شامل تمام جھانکیاں ۵؍لومیٹر فی گھنٹہ کی متعینہ رفتار

سے چلتی ہیں، تاکہ ان کے درمیان مناسب دوری بنی رہے اورلوگ آسانی سے ان کو دیکھ سکیں، ان جھانکیوں کے ڈرائیور ایک چھوٹی سی کھڑکی سے ہی آگے کا راستہ دیکھتے ہیں، کیونکہ سامنے کا تقریباً پورا شیشہ سجاوٹ سے ڈھکا رہتا ہے، یوم جمہوریہ کے انعقاد کی ذمہ داری وزارت دفاع کی ہوتی ہے، انعقاد میں تقریباً ۷۰/دیگر محکمہ اور تنظیم وزارت دفاع کی مدد کرتے ہیں، پریڈ کے منظم مارچ کے لئے فوج کے ہزاروں جوان سمیت الگ الگ محکمہ جات کےلوگ کافی تعداد میں لگائے جاتے ہیں۔

جمہوریت کی تعریف

جمہوریت کا لفظ درحقیقت انگریزی لفظ’’democracy‘‘ کا ترجمہ ہے، انگریزی میں یہ لفظ یونانی زبان سے منتقل ہوکر آیا ہے، یونانی زبان میں’’demo‘‘ عوام کو، اور ’’cracy‘‘ حاکمیت کو کہتے ہیں، عربی میں اس کا ترجمہ دیمقراطیہ کیا گیا ہے، جمہوریت کی اصطلاحی تعریف (آزاد دائرۃ المعارف، ویکی پیڈیا کے مطابق حکومت کی ایک ایسی حالت جس میں لوگ یالوگوں کا منتخب شدہ نمائندہ حکومت چلانے کا اہل ہوتا ہے) سے کی گئی ہے۔
یونانی مفکر ہیروڈوٹس’’hearodotus‘‘ نے جمہوریت کا مفہوم اس طرح بیان کیا ہے کہ ’’جمہوریت ایک ایسی حکومت ہوتی ہے، جس میں ریاست کے حاکمانہ اختیارات قانونی طور پر پورے معاشرے کو حاصل ہوتے ہیں‘‘۔
چنانچہ سابق امریکی صدر’’ابراہم لنکن‘‘ کا یہ قول جوکہ جمہوریت کا نعرہ ہے، اسی حقیقت کی عکاسی کرتا ہے:

Goverment of the poeple, by the people for the people

''عوام کی حاکمیت، عوام کے ذریعے، عوام پر''(۱)

آمریت کے برخلاف اس طرزِ حکمرانی میں تمام فیصلے عوامی نمائندے کرتے ہیں، خلاصہ یہ کہ جمہوریت وہ طرزِ حکومت ہے جس میں ملک کے ہر باشندے کو سماجی، معاشی، سیاسی انصاف کے حقوق ملے، اظہارِ خیال، یقین، اعتماد، اعتقاد اور مذہب کی آزادی ملے، ہر شخص کو مساوی مقام حاصل ہو، قوم کے اتحاد اور ہر فرد کی عزت وتوقیر کا سامان فراہم ہو، جمہوریت کو لیکر علامہ اقبالؒ نے بہت پیاری بات کہی ہے:

''جمہوریت ایسا نظام ہے جس میں لوگوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے''

یہ بھی سچ ہے کہ جمہوریت کسی مکمل نظام کا نام نہیں ہے بلکہ نظام بنانے اور اس کے نفاذ کے طریقۂ کار کا نام ہے، اسی لئے مختلف ممالک میں جمہوریت کی مختلف شکلیں ہیں، نظام اور طریقۂ کار بھی الگ الگ ہے، شاید اسی لئے ایک مشہور فلسفی سموئل اڈمس نے کہا ہے: جمہوریت اپنے اصولوں پر کبھی بھی زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہ سکتی، یہ بہت جلد تھک ہار کر بیکار اور اپنے راستے سے بھٹک جائے گی، آج جب ہم ہندوستان کے علاوہ بین الاقوامی سطح پر نظر ڈالتے ہیں تو یقین ہو جاتا ہے کہ ان کا قول سچ ہے۔

---

(۱) یہ ایک بہت بڑا جھوٹ ہے، عوام کی حاکمیت کہاں ہے؟ کتنی عوام حکومت کرتی ہے، دستور سازی محدود اقلیت کرتی ہے، عوام کے ذریعہ حکومت صرف اتنی ہے کہ ووٹ دیدیں اور ظلم برداشت کرتے رہیں، قانون سازی میں عوام سے پوچھا تک نہیں جاتا؛ بلکہ مذہبی رہنماؤں کی بھی نہیں سنی جاتی ہے، تو عوام کے ذریعہ حکومت کیسی؟ اور جن کو نمائندہ بنایا جارہا ہے عوام ان میں بھی قانون سازی کی صلاحیت نہیں دیکھی کہ اس صلاحیت کی بنیاد پر ووٹ دیا جائے، اگر مان بھی لیا جائے کہ عوامی نمائندوں میں قانون سازی کی صلاحیت ہے پھر بھی ان کا بنایا قانون عوام کے حق میں مفید نہ ہوگا؛ کیونکہ قانون سازی کی لیے علم محیط، رحمت کاملہ، قدرت تامہ اور غیر جانبداری ضروری ہے اور یہ کسی فرد میں جمع نہیں ہے، اگر علم محیط ہے تو سود کا جواز، زنا ولواطت کی آزادی نہ ہوتی، رحمت ہوتی تو غنڈوں کو نمائندہ نہ بنایا جاتا، قدرت کاملہ ہوتی تو دوسری پارٹی کا خون نہ ہوتا، جس کی طرف سے نمائندہ بنا ہے اس کی طرف داری کے بغیر غیر جانبدارانہ رویہ کیسے کرسکتا ہے؟ درحقیقت یہ چاروں صفات صرف اللہ رب العزت ہی میں پائے جاتے ہیں۔ (احمد اللہ)

کیا جمہوریت میں عوام کی حکومت ہوتی ہے

اب یہ دعویٰ کہ عوام خود اپنے حکام اور نمائندگان منتخب کرتے ہیں یہ بھی خلاف حقیقت اور غلط ہے، اس اجمال کی تفصیل کو ایک مثال سے سمجھنے کی کوشش فرمائیں، ایک جمہوری ملک میں ایک حاکم کی مدت حکومت ختم ہو جاتی ہے اور یہ قوم جمہوری طریقے سے اپنا نیا حاکم منتخب کرنا چاہتی ہے، جمہوریت کے قوانین کی رو سے ہر شخص اپنے کو اس انتخاب کے لیے پیش کرسکتا ہے اب یہ ایک فطری بات ہے کہ جو شخص بھی اپنے اندر حاکم بننے کی قدرت رکھتا ہے، اور فرائض حکومت کے بار دوش سے سبکدوش ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے وہ اپنے آپ کو آگے لاتا ہے، پھر اسے پروپیگنڈہ کرنے کے قانونی طور پر مواقع فراہم کیے جاتے ہیں، اور وہ اس حوالے سے بے پناہ مال و دولت بھی خرچ کر ڈالتا ہے اس کے ساتھ حکومت بھی اپنی ذمہ داری اور خرچ پر امیدواروں کی فہرستیں تیار کرتی ہے انتخاب اور رائے دہی کے لیے جن چیزوں کو ضرورت ہوتی ہے، ان سے بھی عہدہ برا ہوتی ہے، اسی طرح وہ ملک بھر میں پولنگ اسٹیشن قائم کرتی ہے، فرض کریں کہ ایک ملک کی آبادی بیس کروڑ افراد کی ووٹر لسٹیں تیار کی جائیں گی، پھر ان کے بعد کتنے ووٹر ہوں گے جو پولنگ اسٹیشنوں تک نہ پہنچنے کی وجہ سے اپنا حق رائے دہی استعمال نہیں کریں گے، پھر کتنے ہی عمر رسیدہ اور معذور افراد ہوں گے جو ووٹ ڈالنے کے مراکز تک نہیں پہنچ پائیں گے، عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ بہتر سے بہتر حالات اور بہتر سے بہتر جمہوری زندگی کے لیے جوش و جذبہ رکھنے والی اقوام میں بھی زیادہ سے زیادہ اسی ۸۰ رفیصد لوگ اپنا حق رائے دہی استعمال کرتے ہیں، اس طریقے سے ان پانچ کروڑ ووٹرز میں سے صرف چار کروڑ افراد اپنے حق رائے دہی استعمال کریں گے۔

اب اگر صدر کے عہدہ کے لیے چار افراد میں مقابلہ ہو تو ان میں سے جو سب سے زیادہ ووٹ حاصل کرے گا اسے یہ منصب تفویض کر دیا جائے گا، اگر ان میں سے ایک شخص ایک

کروڑ ۱۰لاکھ ووٹ حاصل کرے تو وہ منصب صدارت پر فائز ہو جائے گا اور باقی ۱۰ر لاکھ کم تین کروڑ ووٹ دوسرے تین امیدواروں پر تقسیم ہو جائیں گے، اب ایک کروڑ دس لاکھ ووٹ حاصل کرنے والا کامیاب امیدوار ہیئت تنفیذیہ کا ڈھانچہ تشکیل دے گا جو احکام کو معاشرے پر لاگو کرنے کے لیے اس کی ممدو معاون قرار پائے گی، اب اس مثال کی رو سے وہ شخص صرف ایک کروڑ دس لاکھ افراد کا نمائندہ ہے، اور تین کروڑ افراد نے عملی طور پر اس کا سخت مقابلہ کیا ہے، اور ایک کروڑ افراد نے اپنا ووٹ ہی نہیں دیا اور پندرہ کروڑ افراد کے ووٹ ہی نہیں ہیں لیکن اس کے باوجود اس شخص کو بیس کروڑ افراد پر حاکم مقرر کر دیا گیا ہے، اب ملاحظہ فرمائیں کہ یہ اکثریت کی حکمرانی ہے یا اقلیت کی اکثریت پر حکمرانی ہوا کرتی ہے بلکہ صحیح ترین اور مناسب ترین بات یہ ہے کہ یہ اقلیت کی اکثریت پر حکمرانی ہوا کرتی ہے، خواہ یہ صدر کے انتخاب کا مسئلہ ہو یا ان کی تنفیذ کا مسئلہ ہو۔(۱)

جناب اسرار عالم صاحب جمہوریت کے عملی نقشے کا تجزیہ ان الفاظ میں کرتے ہیں کہ:

''ڈیموکرائزیشن (Democratization) (جمہوریت) سیکولر کرنے کی وہ کوشش ہے، جو بظاہر لوگوں کو اظہار رائے کا حق دے کر جاتی ہے؛ لیکن جس کے پس پردہ دراصل امت کے ذہن اور صالح دماغوں کو بے دخل کرنا ہوتا ہے، چند سیکولر دماغ پوری آبادی کو اس کے ذریعے اغوا کر کے اپنے مقاصد پورے کرتے ہیں، جہاں یہ طریقہ ان کے خلاف جاتا ہے تو اسے آمرانہ طریقے سے کچل دیتے ہیں، اس وقت انہیں جمہوریت کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی''۔(۲)

جمہوریت کی ابتداء

جمہوریت کا سب سے پہلا سراغ ہندوستان میں ملتا ہے ۶ر سو سال قبل از مسیح ''بدھا''

(۱) فتنۂ جمہوریت: ۲۰

(۲) عالم اسلام کی اخلاقی صورت حال: ۲۴۱

کی پیدائش سے قبل ھند میں جمہوری ریاستیں موجود تھی اور ان کو janapadas (جانا پداس) کہا جاتا تھا ان میں سب سے پہلی ریاست ”وشانی“ ریاست تھی جو کہ آج ”بہار“ کے نام سے مشہور ہے، اسی طرح سکندر اعظم کے دور میں ۴۰۰ر قبل از مسیح یونانی دانشوروں کے مطابق sabaracae اور sabastai کی ریاستیں جو موجودہ ہندوستان اور پڑوسی ملک ہیں، یہاں پر بھی جمہوری حکومت تھی نہ کہ شاہی حکومت، اسی طرح ۵ر صدی قبل از مسیح میں Greece میں بھی کونسل اور اسمبلی کا تصور ملتا ہے Talius Cessar اور سینٹ سربراہ ponpe کے درمیان خانہ جنگی کے بعد 49B پہلی دفعہ ”رومن ایمپائر“ وجود میں آئی اس سلسلے میں چند مثالیں درجہ ذیل ہیں :

(۱) ہندوستان میں پنچائیت (۲) جرمن قبائلی نظام (Taciths)

(۳) فرینکش کسٹم آف مارچ (Frankish custom of march field

(۴) آل تھنگ آف پارلیمنٹ آئس آئرلینڈ

(۵) توتھا سسٹم آئرلینڈ (Tutha systim of irelsnd)

(۶) قریش کا دارالندوہ (قصی بن کلاب) (۱)

وہاں جمہوریت کا تصور یہ تھا کہ بادشاہ خاص خاص اور بڑے فیصلوں میں عوام کی رائے معلوم کرنے کے لیے ساری آبادی کو اکٹھا کر لیتا تھا، اور یہ اسی جگہ ممکن ہے جہاں چھوٹا سا ملک اور مختصر سی آبادی ہو، چنانچہ جو بڑے بڑے ملک قائم ہوئے جیسے روم کی سلطنت تو وہاں یہ صورت ممکن نہیں تھی، لہذا وہاں جمہوریت کا تصور اس حد تک محدود ہو گیا کہ بادشاہ اپنے مشورے کے لیے کوئی کونسل یا مجلس شوری بنا لیتا تھا، اس کا نتیجہ رفتہ رفتہ یہ نکلا جمہوریت کا حقیقی تصور (عوام کو پالیسیوں میں حصہ دار بنایا جائے) عملاً مفقود ہوتا گیا، اور اس کی جگہ مطلق العنان بادشاہت وغیرہ نے لے لی، اور چھوٹی چھوٹی بادشاہت کے قیام کے بعد جمہوریت

---

(۱) ماخوذ از : اسلام اور جمہوریت

کا تصور ختم ہو گیا۔

دوبارہ اس تصور کا احیاء ۱۸ ویں صدی کے آغاز میں ہوا، اس وقت جمہوریت نے ایک منضبط شکل اختیار کی اور وہ جمہوریت وجود میں آئی جو آج رو بعمل ہے، جس کا نام لبرل ڈیموکریسی ''liberal democracy'' ہے اردو میں اس کو ''آزاد خیال جمہوریت'' سے تعبیر کیا جاسکتا ہے، جمہوریت کی صورت گری جن مفکرین نے کی اور جن کو آزاد خیال جمہوریت کا بانی سمجھا جاتا ہے وہ تین لوگ ہیں، ایک وولٹائر ''voltire'' دوسرا ''مونٹیسکو'' ''montesquiue'' اور تیسرا روسو ''rousseau'' ہیں، یہ تینوں فرانس کے فلسفی ہیں جن کے افکار ونظریات کے ذریعہ جمہوریت وجود پذیر ہوئی، ۹/ستمبر ۲۰۱۳ Borgen Magazine کے مطابق دنیا بھر میں جمہوری ممالک کی تعداد ۱۲۳ ہے!

ہندوستان میں جمہوریت کی تاریخ

انگریزی حکومت کے تقریباً سو سال کی غلامی کے بعد ۱۵/اگست ۱۹۴۷ء کو جب ہمیں آزادی ملی تھی، تو اس وقت سونے کی چڑیا ہندوستان غربت، بے روزگاری اور مختلف طرح کے انتشار اور پریشانیوں میں مبتلا تھا، اسلئے ملک کی ترقی خوشحالی اور ایک بہترین حکومت کا نظام قائم کرنے کے لئے ملک کے اپنے دستور کی ضرورت محسوس کی گئی تھی، یہ دستور کیبنٹ مشن پلان (Cabinet mission plan) مئی ۱۹۴۶ء کے تحت آئین ساز اسمبلی کے ذریعہ بنایا گیا پہلے غیر منقسم ہندوستان میں الیکشن کے ذریعہ ۲۹۲ نمائندوں کا انتخاب کیا گیا دو سو آٹھ نمائندے کانگریس کے اور تہتر نمائندے مسلم لیگ کے منتخب ہوئے ترانوے نمائندے نوابین اور راجاؤں کی طرف سے نامزد ہوئے اس طرح کل تین سو ترانوے نمائندوں سے اسمبلی وجود میں آئی ۹/دسمبر ۱۹۴۶ء کو اس کا پہلا اجلاس ہوا جس میں سب سے معمر رکن اسمبلی ڈاکٹر سچتانند سنہا کو اس اسمبلی کا عارضی صدر منتخب کیا گیا، ۱۱/ستمبر کو تمام اراکین نے اتفاق رائے سے ڈاکٹر راجندر پرشاد کو اسمبلی کا مستقل چیئرمین بنا دیا اسمبلی نے آئین

سازی کے لیے ۱۳رکمیٹیاں بنائی ان کمیٹیوں نے اپنے اپنے مسودات تیار کیے بعد میں ۲۹راگست ۱۹۴۷ء کو ایک سات رکنی ڈرافٹ کمیٹی نے (۱) جس کی صدارت ڈاکٹر امبیڈکر کر رہے تھے تشکیل دی گئی، ۴رنومبر ۱۹۴۷ء کو یہ مسوّدہ آئین بحث ونظر ترمیم وتنسیخ اور حذف واضافے کے لیے آئین ساز اسمبلی میں پیش ہوا، جنوری ۱۹۴۸ء کو یہ مسوّدہ عام لوگوں کے لیے شائع کر دیا گیا، ترمیم وتنسیخ کے لیے دو ہزار سے زیادہ تجاویز موصول ہوئیں، ۲۶رنومبر ۱۹۵۰ء کو مسوّدۂ آئین دستور ساز اسملبی میں پیش ہوا، اور ایک کے علاوہ تمام اراکین نے ۲۶رجنوری ۱۹۵۰ء کے اجلاس میں اس کی ہندی اور انگریزی کاپیوں پر دستخط کر کے اسے سندِ قبولیت سے سرفراز کیا، صرف مولانا حسرت علی موہانی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا کہ ''یہ آئین برطانوی دستور کی نئی توسیع شدہ شکل ہے، اس سے آزاد ہندوستانیوں کا اور آزاد ہندوستان کا مقصد پورا نہیں ہوتا''۔

الغرض دو سال، گیارہ ماہ ۱۸ردن کی مدت میں تین کروڑ روپئے کے خرچ سے جمہوری قانون بنایا گیا، دستور ساز اسمبلی کے مختلف اجلاس میں دستور کے ہر شق پر طویل بحث کے بعد ۲۶رنومبر ۱۹۴۹ء کو قبول کرلیا گیا، ۲۴رجنوری ۱۹۵۰ء کو تمام اراکین کے دستخط ہوئے، ۲۶رجنوری ۱۹۵۰ء کو ۱۹۳۵ء سے نافذ برطانوی ایکٹ ختم ہو کر اس نئے جمہوری قانون کو ملک میں لاگو کیا گیا، اور یہ دن جمہوریت کے اظہار کا دن قرار دیا گیا۔

۱۹۵۰ء میں منظور ہونے والے دستورِ ہند میں بائیس ابواب ۱۲ اشڈیول اور ۳۹۵ دفعات تھیں، اس وقت سے اب تک اس دستور کی متعدد دفعات ختم کر دی گئی ہیں اور اس میں متعدد دفعات کا اضافہ کر دیا گیا ہے، کوئی بھی برسرِ اقتدار پارٹی پارلمنٹ کے دونوں

---

(۱) آئین ساز اسمبلی میں دوسرے اراکین کے ساتھ آئین سازی کے عمل میں مسلمان اراکین نے بھی حصہ لیا، ان میں مولانا ابوالکلام آزاد، بیرسٹر آصف علی، خان عبد الغفار خاں، محمد سعد اللہ، عبد الرحیم چودھری، بیگم اعزاز رسول اور مولانا حسرت موہانی شامل تھے۔

ایوانوں کی منظوری سے کسی دفعہ کو ختم کرنے اور کسی دفعہ اضافہ کرنے کا حق رکھتی ہے، ہمارا اصل آئین فن کاروں کے ذریعے سجائے گئے اوراق پر ہاتھ سے لکھا ہوا محفوظ ہے، اگر چہ یہ ایک مضبوط دستاویز ہے، لیکن برسر اقتدار پارٹی اپنی دو تہائی اکثریت سے فائدہ اٹھا کر کسی بھی وقت اس دستور میں ترمیم کر سکتی ہے، صدر جمہوریۂ ہند کی منظوری کے بعد یہ ترمیم مستقل قانون کی شکل اختیار کر لیتی ہے، بعض اوقات صدارتی حکم ناموں کے ذریعے بھی آئین میں تبدیلی کر دی جاتی ہے، بعد میں پارلمنٹ کے دنوں ایوان اس کی توثیق کر دیتے ہیں، ہمارے سامنے اس کی مثالیں موجود ہیں، ہمارے آئین میں دفعہ ۳۴۱ موجود ہے، جس میں نفاذِ دستور کے محض آٹھ مہینوں کے بعد صدارتی حکم نامے کے ذریعے یہ ترمیم کی گئی کہ ریزویشن سے صرف ہندو دلت اور ہریجن فائدہ اٹھا پائیں گے، بعد میں اس دفعہ میں ایک اور ترمیم کی گئی اور اس میں بودھ اور سکھ کا اضافہ کر دیا گیا، اس طرح دستور کی تمہید میں معاشی برابری کا جو وعدہ کیا گیا تھا وہ اس ترمیم کے ذریعے ختم ہو گیا، آج بھی ہندوؤں کی بہت سی برادریوں کے لیے ملازمتوں وغیرہ میں تحفظات موجود ہیں، مسلمان عرصے سے اپنے لیے ریزویشن کا مطالبہ کرتے آرہے ہیں؛ مگر ان کو دستور کا حوالہ دے کر خاموش کر دیا جاتا ہے۔

دستور میں ترمیم کی ایک مثال شاہ بانو کیس بھی ہے، جب ملک کی اعلیٰ ترین عدالت کا ایک فیصلہ پارلمنٹ کے ذریعے تبدیل کر دیا گیا تھا، اس وقت راجیو گاندھی ملک کے وزیر اعظم تھے، مگر مسلمانوں کو اس تبدیلی کی بڑی قیمت چکانی پڑی تھی، ایک طرف راجیو گاندھی نے پارلمنٹ کے ذریعے عدالتی فیصلہ کالعدم قرار کروایا، دوسری طرف ناراض ہندوؤں کو خوش کرنے کی خاطر بابری مسجد کا تالہ کھلوا دیا، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس وقت تو کانگریس برسر اقتدار آ گئی؛ مگر بعد میں بی جے پی کو بابری مسجد پر اپنی سیاست چمکانے کا موقع مل گیا، آج بی جے پی جو کچھ بھی ہے وہ بابری مسجد کی شہادت کی وجہ سے ہے۔(۱)

---

(۱) آزادی سے جمہوریت تک: ۶۳

جمہوریت کی قسمیں

جمہوریت کی دو بڑی قسمیں ہیں: بلا واسطہ جمہوریت اور بالواسطہ جمہوریت، بلاواسطہ جمہوریت میں قوم کی مرضی کا اظہار براہ راست افراد کی رائے سے ہوتا ہے، اس قسم کی جمہوریت صرف ایسی جگہ قائم ہوسکتی ہے جہاں ریاست کا رقبہ بہت محدود ہو اور ریاست کے عوام کا یکجا جمع ہو کر غور وفکر کرنا ممکن ہو، اس طرز کی جمہوریت قدیم یونان کی شہری مملکتوں میں موجود تھی اور موجودہ دور میں یہ طرز جمہوریت سوئیزرلینڈ کے چند شہروں اور امریکا میں نیو انگلینڈ کی چند بلدیات تک محدود ہے۔

جدید وسیع مملکتوں میں تمام شہریوں کا ایک جگہ جمع ہونا اور اظہار رائے کرنا طبعاً ناممکنات میں سے ہے، پھر قانون کا کام اتنا طویل اور پیچیدہ ہوتا ہے کہ معمول کے مطابق تجارتی اور صنعتی زندگی قانون سازی کے جھگڑے میں پڑ کر جاری نہیں رہ سکتی، اس لیے جدید جمہوریت کی بنیاد نمائندگی پر رکھی گئی، چنانچہ ہر شخص کے مجلس قانون ساز میں حاضر ہونے کی بجائے رائے دہندگی کے ذریعے چند نمائندے منتخب کر لیے جاتے ہیں جو ووٹروں کی طرف سے ریاست کا کام کرتے ہیں، جمہوری نظام حکومت میں عوام کے دلوں میں نظام ریاست کا احترام پیدا ہوتا ہے، کیونکہ اس میں نظام حکومت خود عوام یا عوام کے نمائندوں کے ذریعہ پایۂ تکمیل تک پہنچتا ہے؛ مگر یہ جذبہ صرف اس وقت کارفرما ہوتا ہے جب عوام کی صحیح نمائندگی ہو اور اراکین مملکت کا انتخاب درست اور شفاف ہو۔

مغربی جمہوریت کی دہشت گردی

آج دنیا میں روپیہ کے دریا بہہ رہے ہیں، اتنے دولت اس سے قبل کبھی نہیں ہوئی تھی، زمین نے اپنے خزانے باہر اگل دیئے ہیں لیکن اس کے باوجود ہر متنفس بے چین اور بے سکون ہے، حرص وہوس دل میں گھر کئے ہوئے ہے، لوٹ مار کا بازار گرم ہے، دنیا

کے ۱۸۳ر ملکوں کے عوام کے خون پسینے کی کمائی سود میں دی جارہی ہے اور قرضہ ہے کہ شیطان کی آنت کی طرح بڑھتا ہی چلا جاتا ہے، یہ ساری بے چینی اس سود کی وجہ سے ہے جو ختم ہونے کا نام نہیں لیتا اور عوام کا خون چوس چوس کر بڑے بڑے سرمایہ داروں کی توندوں کو موٹا کر رہا ہے جو سرمایہ دارانہ نظام کی خصوصیت ہے۔

اس زمانہ میں جس قدر جنگیں ہو رہی ہیں خواہ افغانستان کی جنگ ہو یا عراق کی، یہ صرف معاشی جنگیں ہیں، امریکہ اور برطانیہ تیل کی دولت پر قابض ہونا چاہتا ہے اور اپنا اسلحہ فروخت کر کے دنیا کے امن کو تباہ و برباد کرنا چاہتے ہیں، چنانچہ امریکی مصنفہ سونیا شانے اپنی کتاب تیل کی کہانی (Story of Oil) کے ساتویں باب میں لکھا ہے کہ نائجیریا ہر سال ۳۰ر بلین ڈالر کا تیل امریکہ کو فروخت کرتا ہے، اس میں ۱۰ر بلین ڈالر سیدھے فوجی جنرل کے اس کھاتے میں چلے جاتے ہیں جو مغربی ممالک کے بنکوں میں ہے لیکن اسی نائیجیریا میں جولائی ۱۹۹۲ء تیل کے علاقہ میں ۱۳۲ر نہتے بچوں، مردوں اور عورتوں کو نہایت بے دردی کے ساتھ موت کے گھاٹ اتار دیا گیا کیوں کہ وہ اپنی اس سرزمین میں نکلنے والے تیل کی قیمت سے دو وقت کی روٹی کا مطالبہ کر رہے تھے، اسی طرح اگست میں ۲۴۷ر بچوں کو قتل کر دیا گیا، ستمبر میں ہزاروں کو قتل کر دیا گیا کیوں کہ وہ روٹی کا مطالبہ کر رہے تا کہ وہ اپنی غربت کی زندگی میں کچھ آسانی پیدا کرسکیں۔

ایک برطانوی نوبل انعام یافتہ دانشور مسٹر ہیرالڈ پنٹر نے ۷ر ستمبر ۲۰۰۵ء میں انعام حاصل کرنے والی تقریب میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا: بش اور بلیئر وہ لوگ ہیں جو صرف اور صرف دنیا کے وسائل پر قابض ہونا چاہتے ہیں، اور ان دونوں کو اس بات کی کوئی پروا نہیں کہ ان کے اس مقصد کے حصول میں کتنے بے گناہ لوگ مارے جاتے ہیں“ اس نے یہ مطالبہ کیا کہ ان دونوں پر جنگ میں جھوٹ کا پلندہ پھیلانے کے جرم میں عالمی جرائم کی عدالت میں مقدمہ چلایا جائے۔

اسی طرح ایک اور نوبل انعام یافتہ ادیب اور دانشور نے ۱۹۹۷ء میں کہا تھا کہ امریکہ تیل خریدنے کے بدلے انسانوں کا خون خرید رہا ہے، اصل بات یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کا بنیادی نقطہ یہ ہے کہ پیداوار کے وسائل پر قبضہ کرو خواہ اس کی راہ میں کتنے ہی لوگ کیوں نہ مارے جائیں اور جب وسائل پر قبضہ ہو جائے تو پھر اس کے ذریعہ خوب دولت بناؤ خواہ اس کے لیے کتنے ہی لوگوں کا خون کیوں نہ کرنا پڑے، خواہ غریبوں کے بچے سسک سسک کر کیوں نہ مریں، چنانچہ اس وقت دنیا میں بس ایک ہی خواہش سرمایہ دار افراد اور سرمایہ دار ملکوں کو بے چین کئے ہوئے ہے کہ کس طرح اپنی دولت میں اضافہ کیا جائے ، چنانچہ بھارت میں ایک سرمایہ دار لکشمی میتل نے گذشتہ ۱۲ ماہ میں اپنی دولت میں ۱۸۰۸/ بلین کا اضافہ کیا جو ایک ریکارڈ ہے، سابق امریکی صدر جمی کارٹر نے اپنی کتاب (Over Endangered Value) میں لکھا ہے کہ گذشتہ صدی کے آغاز میں دنیا کے امیر ترین ۱۰/ ممالک غریب ترین ۱۰/ ممالک سے صرف ۳۰/ گنا زیادہ امیر تھے جب کہ ۱۹۶۰ء میں امیر ترین ممالک اپنے مدمقابل غریب ترین ممالک سے ۱۳۱/ گنا زیادہ امیر ہیں۔

موجودہ زمانے میں ترقی پذیر ممالک میں جس وزیر اعظم کو امریکہ کی آشیر باد نہ ہو وہ ووٹوں کی اکثریت کے باوجود بھی وزیر اعظم نہیں رہ سکتا اور جو امریکہ کے چرنوں میں جا کر سجدہ ریز ہو جائے اور اس کی مرضی کے مطابق حکومت کرنے کا وعدہ کرلے وہ ووٹوں کی کمی کے باوجود بھی وزیر اعظم بن جاتا ہے بلکہ دھاندلی سے غیر قانونی طور پر صدر بھی بن جاتا ہے اور اگر سمجھے کہ ملکی سپریم کورٹ اس کے خلاف فیصلہ دینے والی ہے تو ایمرجنسی لگا کر نہ صرف ریٹائرڈ کر دیتا ہے بلکہ نظر بند بھی کر دیتا ہے۔

یہی جمہوریت کا نقص ہے جو تخت شاہی پر کبھی مکار بیٹھے ہیں کبھی غدار بیٹھے ہیں

مغربی جمہوریت اسلامی نقطۂ نظر کے بالکل خلاف

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہمارے ملک اور اکثر ملکوں میں جمہوریت کا جو تصور ہے، وہ

بنیادی طور پر اسلام کے خلاف ہے، جمہوریت میں عوام کو مصدر قانون مانا جاتا ہے، عوام قانون بناتی ہے، حلال وحرام اور خیر وشر کا فیصلہ کرتی ہے، یہ سراسر اسلامی نقطۂ نظر کے خلاف ہے، اسلام میں قانون کا سرچشمہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے "ان الحکم الا للّٰہ"، سورہ یوسف: ۴، اور ارشاد ہوا "الا له الخلق و الامر" سورہ اعراف: ۵۴، اسلامی نقطۂ نظر سے انسان شارح قانون ہے نہ کہ واضع قانون، جن احکام کے بارے میں قرآن وحدیث کی صراحت موجود نہ ہو تو قیاس یا امت کی اتفاق رائے سے اس کے بارے میں کوئی فیصلہ کیا گیا ہو وہ بظاہر انسان کا بنایا ہوا قانون محسوس ہوتا ہے، لیکن درحقیقت وہ بھی خدا اور رسول ہی کی طرف سے ملنے والا قانون ہے، کیوں کہ قیاس اور اجماع کا دین میں حجت ہونا کتاب وسنت ہی سے تو ثابت ہے۔(۱)

لہٰذا مغربی جمہوریت کو اپنے تمام تصورات کے ساتھ برحق سمجھنا عہد حاضر کی بدترین گمراہیوں میں سے ہے، اور ایسے لوگوں کو شرعی طور پر گمراہ کہا جائے گا، اور اگر کوئی شخص اس تفصیل کے ساتھ مغربی جمہوریت کو برحق سمجھے کہ پارلیمنٹ اگر کوئی قانون قرآن کریم کے صریح حکم کے خلاف نافذ کردے تو (معاذ اللہ) پارلیمنٹ کا قانون ہی برحق ہوگا، تو ایسا اعتقاد کفر ہے، لیکن اگر کوئی شخص پارلیمنٹ کے فیصلوں کو قرآن وسنت کے تابع کردے تو اس کو کفر اور گمراہی نہیں کہہ سکتے، مگر اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ مغربی جمہوریت کو جوں کا توں قبول نہیں کرتا۔(۲)

کیا شورائی نظام اور جمہوریت ایک ہی ہے؟

اس بارہ میں ایک شبہ اکثر پیش کیا جاتا ہے اور یہ شبہ مغرب سے درآمد ہوا ہے جب کہ مغرب نے اسے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے ایک ڈھال بھی بنا رکھا ہے اور مغرب

---

(۱) کتاب الفتاویٰ ۶: /۲۷۶ تا ۲۷۸

(۲) فتاویٰ عثمانی: ۳: /۵۰۷

زدہ ذہن اسے بڑے دھڑلے سے پیش کرتا ہے اور سادہ دل لوگ جن میں کچھ علماء بھی شامل ہیں اسے قبول کیے ہوئے ہیں، وہ شبہ یہ ہے کہ اسلام کا نظام حکمرانی ایک شورائی نظام ہے اور جمہوریت بھی دراصل شوریٰ ہی ہے اسی وجہ سے جمہوریت کا نظام حکمرانی اور اسلام کا نظام حکمرانی دونوں ایک ہی ہیں کیوں کہ دونوں کی بنیاد شورائیت پر ہے، یہ بات ایک جھوٹ اور فریب ہے لیکن اس فریب سے امت کا بہت بڑا طبقہ متأثر ہے۔

اس شبہ کا مختصر جواب یہ ہے کہ اسلام میں شوریٰ نہ تو نظام حکومت کا نام ہے اور نہ ہی یہ کسی نظام حیات سے عبارت ہے اور نہ یہ کسی عمل کے لیے معالجہ کی حیثیت رکھتا ہے، بلکہ اس کی حیثیت صرف اور صرف ایک وسیلے اور اسلوب وکیفیت کی سی ہے کہ جس کا تتبع ایک غلط رائے کے مقابلہ میں صحیح رائے کا انتخاب کرنے کے لیے کیا جاتا ہے، کیوں کہ شوریٰ کا معنی صرف رائے لینا ہے، پس کوئی انسان خواہ وہ حاکم ہو یا رعایا، مدیر ہو یا ملازم، کسان ہو یا زمیندار، کارخانہ کا مالک ہو یا مزدور، جب بھی وہ کسی مسئلہ میں صحیح اور صواب رائے تک پہنچنا چاہتا ہے، یا کوئی امر جو اس پر مشتبہ رہا ہے اس کی صحیح حقیقت جاننا چاہتا ہے تو وہ ایسی صورت میں اس شخص کی طرف رجوع کرتا ہے جسے وہ اس معاملہ کے بارہ میں رائے دینے کا اہل سمجھتا ہے یا جس میں حق وباطل یا غلط اور صحیح کو الگ الگ کرنے کی صلاحیت واہلیت ہوتی ہے، چنانچہ حاکم اپنے مشیروں کی طرف جن میں معاملات حکومت کو سمجھنے کی صلاحیت ہوتی ہے رجوع کرتا ہے، اسی طرح قاضی قضاء کے مسائل میں فقہاء اور مجتہدین کی طرف رجوع کرتا ہے، اسی طرح ایک انجنیر اور ایک ڈاکٹر بھی انجنیرنگ اور طبابت میں مہارت رکھنے والے افراد کی طرف رجوع کرتے ہیں، یہ کبھی نہیں دیکھا گیا کہ کوئی شخص کسی ایسے فرد کی طرف مشورے کے لیے رجوع کرے جس میں اس فن کی کوئی مہارت نہ پائی جاتی ہو، آپ خود ہی غور فرمائیں کہ کیا کوئی ڈاکٹر کسی مریض کے لیے انجنیر سے یا کوئی فوجی کمانڈر کسی جہاز کی کارگردگی یا میزائل کی نوعیت کے تعین کے بارہ میں کسی فقیہ کی طرف رجوع کرے گا، اگر وہ ایسا کریں گے تو اس فعل کو احمقانہ قرار دیا جائے گا، اس سے معلوم ہوا کہ شوریٰ دراصل ان

اصحاب سے رائے طلب کرنے سے عبارت ہے جن کے بارہ میں ایک شخص گمان کرتا ہو کہ ان کے پاس صحیح رائے دینے کی اہلیت اور صلاحیت ہے اور یہ ایک ایسا اسلوب ہے جس کے توسط سے صواب یا اقرب الی الصواب نقطے تک پہنچا جاتا ہے، اور رائے دینا صرف اس شخص کا حق ہے جس میں صحیح رائے دینے کی استعداد وصلاحیت پائی جاتی ہو لیکن اس صورت میں رائے لینے کی قطعاً کوئی صورت پیش نہیں آتی جب کہ کوئی معاملہ بالکل واضح اور صاف ہو، معلوم ہوا کہ مشورہ کرنا لزوم کی حیثیت نہیں رکھتا، کیوں کہ مشورے کی ضرورت تو کسی معاملہ میں صحیح ترین رائے حاصل کرنے کے لیے درپیش ہوتی ہے، اور اگر صحیح رائے پہلے ہی سے واضح اور ظاہر ہو تو علت کے نہ پائے جانے کی وجہ سے معلوم (مشورہ حاصل کرنا) بھی نہیں پایا جائے گا۔ لہٰذا یہ کہنا کہ شوریٰ نظام حکمرانی کا نام ہے، یا اس کے اوپر کوئی نظام حکمرانی قائم ہے، بلکل باطل اور کھلا جھوٹ ہے۔ شوریٰ کا مطلب صرف رائے حاصل کرنا ہے، اسکے سوا شوریٰ کے بارے میں جو کچھ کہا جا رہا ہے' وہ صرف پاگل پن ہے کیونکہ وہ نظام حکمرانی تو کسی قیمت پر نہیں ہے اور جمہوریت کے دلدادے اور اسے نظام حکمرانی کے طور پر پیش کر رہے ہیں تا کہ اس طرح جمہوریت کے کافرانہ نظریہ کو شوریٰ کے بہانے مسلمانوں کے قلوب واذہان مین اتارا جاسکے۔ جبکہ اسلام کا نظام حکومت ایسا مخصوص اور ممتاز نظام حکومت ہے جو کسی دوسرے نظام سے مشابہ نہیں ہے کیونکہ اسکا مصدر وحی ہے اور اسکے برعکس دوسرے تمام نظاموں کا مصدر وحی نہیں ہے، اور جن نظاموں کا مصدر وحی نہیں وہ کافرانہ نظام زندگی ہیں، اسلام صرف وہ ہے جسے وہ وحی لے کر آئی ہو جو کتاب وسنت میں موجود ہے۔ اس کے سوا اور کوئی دوسری چیز اسلام نہیں' لہٰذا یہ بات بھی بالکل غلط ہے کہ ہر وہ شئی جو خلاف اسلام نہیں ہے' وہ اسلام ہی ہے۔ اس بارہ میں خود سرور دوعالم ﷺ کا یہ حال تھا کہ آپ سے جب کسی مسئلہ کے بارہ میں سوال کیا جاتا تو آپ بالکل خاموش رہا کرتے اور اس وقت تک جواب نہیں دیا کرتے تھے جب تک کہ اس سلسلہ میں ان کے پاس وحی نہیں

آجاتی۔(۱)

جمہوریت کو ''اسلامی برانڈ'' بنانے کے لئے ہمارے بعض علماء، صحافی حضرات اور سیاست دانوں نے قرآن وحدیث میں مشورہ کے بارے میں جس قدر آیات واحادیث تھیں ان کو مغربی جمہوریت پر چسپاں کرنا شروع کردیا، حالانکہ اسلامی مشورہ کو موجودہ جمہوریت سے دور کا واسطہ بھی نہیں۔

وقت کے اسلوب میں دین کو بیان کرنا جتنا ضروری ہے وقت کے فکر میں دین کو ڈھالنا اتنا ہی غلط ہے پہلی چیز تجدید دین ہے اور دوسری چیز تحریف دین ہے ''اسلامی جمہوریت'' ثانی الذکر چیز ہے لہٰذا جو شخص بھی ''اسلامی جمہوریت'' کی اصطلاح استعمال کرتا ہے وہ تحریف دین کا مرتکب ہو رہا ہے۔(۲)

کیا اسلام جمہوریت کا حامی ہے؟

اس کا صاف جواب یہ ہے کہ جمہوریت کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ اسلام جمہوریت کے سخت مخالف ہے اور اسلامی جمہوریت اسلام کی کوئی اصطلاح نہیں ہے، اور اگر اسلامی جمہوریت کی اصطلاح صحیح ہے تو پھر اسلامی سوشلزم اور اسلامی کمیونزم کی اصطلاحیں بھی صحیح ہیں کیونکہ اگر جمہوریت اپنی بعض خصوصیات کی بنا پر اسلامی ہو سکتی ہے تو سوشلزم اور کمیونزم میں بھی بعض چیزیں اسلام کے ساتھ مشترک ہیں، مثال کے طور پر سوشلزم کے بانی کارل ماکس (Karl Marx) کے نزدیک انسانی سماج کی تین قسمیں ہیں۔

کارل ماکس کے نزدیک کسی سماج اور معاشرہ کے بارہ میں یہ معلوم کرنے کے لئے کہ وہ ترقی کے کس مرتبہ پر ہے، یہ دیکھنا چاہیئے کہ اس سماج مین لین دین کس طرح ہوتا ہے۔ مارکس کے نزدیک اس لین دین کی تین صورتیں ہیں۔

---

(۱) فتاویٰ عثمانی: ۳/ ۵۰۷

(۲) فتنۂ جمہوریت: ۲۸

۱۔قدر تبادلہExchange Value

۲۔قدر اصلIntrinsic Value

۳۔قدر استعمالUse Value

لین دین کی ان تینوں صورتوں کی تشریح یہ ہے کہ جس معاشرہ اور سماج کا لین دین نفع کی غرض سے ہو وہ ''سرمایہ دارانہ سماج'' ہے اور جس سماج میں کوئی شخص کسی سے نفع کا طالب نہ ہو اور ہر شخص کو اس کی محنت کے بقدر پورا معاوضہ ملے وہ ''سوشلسٹ سماج'' ہے۔ اور جہاں آدمی ان دونوں باتوں سے بلند و بالا ہو جائے یعنی جہاں نہ تو ایسا ہو کہ آدمی ایک دوسرے سے نفع حاصل کرنا چاہے اور نہ ہی یہ ضروری ہو کہ کوئی شخص جتنا کرے اتنا ہی وہ اپنے لیے بلکہ ہر شخص کو کسی رکاوٹ کے بغیر اسکی اشیائے ضرورت حسب خواہش اس طرح ملتی رہیں جیسے ہوا اور پانی ملتے ہیں تو یہ ''کمیونسٹ سماج'' کہلاتا ہے۔

اسلام کی خواہش یہ ہے کہ مزدور کو اس کی محنت کے مطابق مزدوری ملے تو کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ سوشلزم اسلام ہوگیا؟ پھر اسلام یہ بھی چاہتا ہے کہ ہر شخص کو اشیائے ضرورت اس کی ضرورت کے مطابق دی جائیں، تو کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ کمیونزم اسلام ہوگیا یا اسلام میں کمیونزم بھی کوئی شی ہے؟ یہی وجہ ہے کہ سوشلزم کی بعض ایسی باتوں کو جو بظاہر اسلام کے مطابق نظر آتی ہیں، بعض احمقوں اور اسلام نا آشنا لوگوں نے یہ سمجھ لیا کہ اسلام اور سوشلزم میں کوئی تضاد نہیں ہے، حالانکہ ان دونوں میں بعد المشرقین ہے۔(۱)

ایک مغالطہ اور اس کا جواب

بعض حضرات عوام کو ایک مغالطہ دیتے ہیں وہ یہ کہ جمہوریت عین اسلام ہے، کیوں کہ قرآن حکیم اور احادیث رسول ﷺ میں مشورہ کی تاکید آئی ہے، اسمبلیاں بھی مجلس شوریٰ کی

(۱)فتنہ جمہوریت:۳۹

حیثیت رکھتی ہیں، لہٰذا جب اسلام میں مشورہ ہے تو گویا جمہوریت بھی ہے، یہ سراسر غلط ہے جو سادہ لوح لوگوں کو جمہوریوں کی طرف سے دھوکہ دیا جاتا ہے، یہ درست ہے کہ اسلام میں مشورہ کی بہت تاکید ہے یہاں تک جناب رسول اللہ ﷺ کو بھی حکم دیا گیا کہ وہ صحابہؓ سے مشورہ کریں، اور ہر خلیفہ راشد کی مجلس شوریٰ ہوتی تھی لیکن اسلام میں مشورہ کے بارہ میں خلیفہ وقت کو پابند نہیں کیا گیا کہ وہ مجلس شوریٰ کے مشورہ پر ضرور عمل کرے، یہاں تک کہ خود نبوت کے مشورہ پر بھی عمل کرنے کا امت کو پابند نہیں کیا گیا، چنانچہ حدیث صحیح میں سیدہ بریرہؓ کا واقعہ مذکور ہے کہ سیدہ بریرہؓ پہلے لونڈی تھیں اور لونڈی ہونے کی حالت میں ان کا نکاح حضرت مغیثؓ سے ہو گیا تھا، آقا نے ان کو آزاد کر دیا لیکن جب وہ آزاد ہوئی تو اسلام کے قانون کے مطابق ان کو یہ اختیار دے دیا گیا کہ جو نکاح حالت غلامی میں ہوا تھا اگر چاہیں تو اس کو فسخ کر دیں، اس اختیار کی وجہ سے سیدہ بریرہؓ نے نکاح سابق کو فسخ کر دیا لیکن ان کے شوہر حضرت مغیثؓ کو ان سے بہت محبت تھی، سیدہ بریرہؓ کے اس فیصلہ سے انہیں بہت صدمہ ہوا، اسی صدمہ فراق میں وہ مدینہ طیبہ کی گلی کوچوں میں روتے پھرتے تھے، رسول اللہ ﷺ کو انکی اس حالت زار پر رحم آیا اور آپ نے بریرہؓ کو بلا کر فرمایا کہ اے بریرہ! کیا ہی اچھا ہو اگر تم اپنے شوہر مغیث سے رجوع کر لو، سیدہ بریرہؓ نے سوال کیا کہ یا رسول اللہ! یہ آپ کا حکم ہے یا مشورہ؟ آپ ﷺ نے فرمایا حکم نہیں صرف مشورہ ہے، سیدہ بریرہؓ نے رسول اللہ ﷺ کے مشورہ پر عمل نہ کیا، آپ ﷺ نہ تو اس سے ناراض ہوئے اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر کوئی عتاب ہوا کہ تو نے ہمارے رسول کے مشورہ پر کیوں عمل نہیں کیا؟ پس بقول مولانا تھانویؒ:

’’اس سے صاف یہ نتیجہ نکلا کہ جب امت اور رعایا اپنے نبی یا بادشاہ کے مشورہ پر عمل کرنے کے لیے اسلام میں مجبور نہیں کیا گیا تو نبی یا خلیفہ رعایا کے مشورہ سے کیوں کر مجبور ہو جائے گا کہ رعایا جو مشورہ دے اسی کے موافق عمل کرے اس کے خلاف کبھی نہ کرے، پس

شاورھم فی الامر سے صرف یہ ثابت ہوا کہ حکام رعایا سے مشورہ لیا کریں، یہ کہاں ثابت ہوا کہ ان کے مشورہ پر عمل بھی ضرور کرلیا کریں۔"(۱)

اسلام قوت دلیل کا قائل ہے

یہاں یہ بات بھی واضح کردینا ضروری ہے کہ اسلام میں کثرت رائے کی کوئی اہمیت نہیں بلکہ اسلام میں صرف اور صرف قوت رائے کی اہمیت ہے خواہ وہ ایک آدمی کی رائے ہو، کیوں کہ اختلاف رائے کی صورت میں کسی رائے کو قابل قبول اور قابل عمل قرار دینے کے لیے صرف دو احتمال ہیں۔

۱۔قوت دلیل ۲۔کثرت آراء

لیکن اگر اس بارہ میں عقل و دانش سے کام لیا جائے تو یہ واضح ہوتا ہے کہ اصل قابل ترجیح قوت دلیل ہے، کثرت آراء کو صحت رائے اور درستگی فیصلہ میں بذاتہ کچھ دخل نہیں، ہاں بعض اوقات کثرت آراء دلیل کی علامت ہوتی ہے اس وجہ سے بعض لوگوں نے اس کو قوت دلیل کا قائم مقام سمجھ کر اس کے مطابق فیصلہ دینا شروع کردیا۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک ایسا جوہر بے بہا عطاء فرمایا ہے جو اس کو طیور و وحوش، ملک وجن اور حیوانات سے ممتاز کرتا ہے، یہ نہ ہو تو انسان اور حیوان میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا، وہ جوہر بے بہا اور گوہر تابدار "عقل" ہے، عقل ہی سے انسان کو دوسری تمام مخلوق پر ایک گونہ فضیلت اور فوقیت حاصل ہے، بعض انسان تو اس درجہ عقل مند ہیں کہ رگ گل سے بلبل کے پر باندھتے ہیں اور بعض اس درجہ جوہر عقل سے عاری ہیں کہ وہ نام کے انسان ہیں معنوی طور پر وہ حیوانات اور غیر ذوی العقول میں داخل ہیں، یہ قضیہ بھی مسلمہ ہے کہ استنباط، استدلال، حقیقت شناسی، قیاس، معلومات سے مجہولات کا علم

(۱) فتنۂ جمہوریت:۸۱

حاصل کرنا، جزئیات سے کلیات تک پہنچنا، چند مقدمات سے دلیل ترتیب دینا اور دلیل سے نتیجہ برآمد کرنا یہ سب اشیاء عقل پر موقوف ہیں، اور یہ بھی مسلمہ امر ہے کہ تجربہ عقل کو جلاء بخشتا ہے، لہٰذا اس نتیجہ کو تسلیم کرنے میں کوئی امر مانع نہیں کہ کسی معاملہ کی حقیقت اور کنہ تک پہنچنا، دلائل اور نتائج کے سقیم اور صحیح میں امتیاز کرنا، ہر دعویٰ کو دلائل قویہ سے مدلل کرنا یہ سب چیزیں وہی شخص کرسکتا ہے جس کو حق تعالیٰ نے عقل وافر عطا فرمائی ہو اور اس کی عقل کی پختہ کاری تجربہ سے ثابت ہو چکی ہو، یہ بھی ذہن میں رہے کہ اہل عقل و دانش کی عقلوں میں جس قدر تفاوت ہوتا جائے گا اتنا ہی ان امور میں بھی فرق نظر آئے گا۔

جب یہ تمام مسلمہ امور آپ کے ذہن میں آگئے تو اب آپ ہی اپنی عقل کو حکم بنا کر اس بات کا فیصلہ دیجئے کہ اگر ایک طرف وہ شخص ہو جس کی عقل کامل اور تجربہ تام ہو اور دوسری طرف دنیا کے دل یا اکثر افراد جو عقل سے مکمل طور پر بے بہرہ یا عقل قلیل کے مالک ہوں، ان دونوں میں کس کا فیصلہ قابل قبول ہوگا؟ یقیناً اسی شخص کا جو عقل میں کامل اور تجربہ میں تام ہو گا نہ کہ بے عقل اور نا تجربہ کار اکثریت کا۔ اسی چیز کو علامہ اقبال نے یوں بیان کیا ہے۔

گریز از طرز جمہوری غلام پختہ کارے شو
کہ از مغز دو صد خر فکر انسانے نمی آید

یہ تو عقلی توجیہ تھی اس بارہ میں کہ بات قوت دلیل سے معتبر ہوتی ہے نہ کہ کثرت آراء سے، چنانچہ مشاہدۃً بھی یہی بات ثابت ہوتی ہے، ابتدائے آفرینش سے لے کر آج تک ہر قوم اور ہر دور کی تاریخ پر نظر ڈالیئے تو آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ ہر ملک اور ہر قوم میں اسی شخص کی اتباع کی گئی جو ان کے ہاں سب سے زیادہ زیرک، دانش منداور عقل و تجربہ کے اعلیٰ مراتب پر فائز تھا، اس کے مشورہ پر سارے لوگ چلتے اور اس کی باتوں پر صرف اس وجہ سے عمل کرتے کہ وہ عقل و تجربہ میں ان سے اکمل اور اتم ہوتا ہے، کسی بے عقل، غیر دانش منداور

غیر تجربہ کار شخص کی آج تک کسی نے اطاعت اور اتباع نہیں کی بلکہ عقل اور تجربہ رکھنے والے شخص ہی کی اطاعت اور تابعداری کو باعث فخر سمجھا جاتا ہے، تاریخ عالم اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ بعض ایسے افراد گذرے ہیں جو عقل و دانش اور تجربہ میں ید طولیٰ رکھتے اور ان کی نہ صرف ان کی زندگی میں اتباع کی گئی بلکہ ان کے مرنے کے بعد بھی بعد میں آنے والی نسلوں نے ان کے طریقہ پر چلنا اور ان کے اصولوں پر کار بند رہنے کو اپنے لیے موجب فخر وفلاح سمجھا اس بات کی ایک دو نہیں ہزاروں مثالیں تاریخ کے سینہ پر نقش ہیں، ارسطو، بقراط، بوعلی سینا، امام غزالیؒ وغیرہم انہیں لوگوں میں سے جن کے اصولوں کو آج تک قابل اتباع سمجھا جاتا ہے۔

پھر ان صاحب فراست لوگوں کے قائم کردہ اصولوں اور طریقوں کے بارہ میں آنے والے کسی صاحب عقل وفراست نے کچھ ترامیم بھی کرنا چاہی یا ان کے اصولوں کے بجائے دوسرے اصول قائم کرنے چاہے تو جب تک وہ اپنی عقل اور اپنے علم کی بدولت دلیل قویٰ ان کے خلاف قائم نہ کرے گا اور اپنے مشاہدات وتجربات سے جن سے استخراج نتائج بھی عقل ہی کا کام ہے، سابق اصول وقواعد کے خلاف نہ دکھلا سکے گا کوئی شخص بھی ان کے قول کو تسلیم نہ کرے گا، ان اصول وقواعد کو تسلیم کر کے سابق اصول وقواعد کو اگر کوئی چھوڑے گا تو صرف اسی بنا پر کہ اس موخر الذکر شخص کے عقل وتجربہ کو پہلے شخص پر فوقیت حاصل ہے، اور اس کی دلیل اس سے قوی اور اس کا مشاہد اور تجربہ اس سے زیادہ اور تام ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ مدار اصابت رائے اور قوت دلیل پر ہمیشہ رہا ہے، شروع سے اخر تک تمام عقلاء اسی پر کار بندرہے ہیں، صرف کثرت رائے کسی زمانے میں بھی ترجیح کا سبب نہیں ہوئی، ہاں کثرت افراد اور قوت دلیل اگر دونوں جمع ہو جائیں تو نور علی نور ہے۔

تجربہ اور مشاہدہ اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ کثرت رائے سے فیصلہ جس کو آج کل جمہوریت پسندوں نے معیار صداقت بنایا ہوا ہے اکثر حماقت اور بے وقوفی کا فیصلہ ہوتا ہے،

کیوں کہ بقول ارسطو اور دیگر عقلائے زمانہ:

’’دنیا میں ہمیشہ بے وقوف، احمقوں اور ناتجربہ کاروں کی کثرت اور بہتات رہی ہے اور عقلاء اور تجربہ کار خال خال رہے ہیں، اس وجہ سے کثرت رائے کا فیصلہ اکثر حماقت کا اور بے وقوفی کا فیصلہ ہوتا ہے۔‘‘

؎ کہ از مغز دو صد خر، فکر انسانی نمی آید

ایک غلط فہمی کا ازالہ

ہماری اس بحث سے کوئی شخص اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو جائے کہ شریعت اسلامیہ میں کثرت رائے کی کوئی حیثیت ہی نہیں، یہ بات غلط ہے، اسلام نے کثرت رائے کو بڑی اہمیت دی ہے، چنانچہ امام نے رکعات کی تعداد میں شک کے وقت نماز کے انتخاب میں نمازیوں کی کثرت رائے کو ترجیح دی، سربراہ مملکت کے انتخاب کا دارومدار بھی کثرت رائے پر رکھا، اجماع کی حجت کی بنیاد بھی کثرت آراء پر استوار کی، احادیث میں بھی کثرت طرق کو وجہ ترجیح بنایا گیا، لیکن کثرت آراء کو اسلام نے نہ تو ہر جگہ حجت و دلیل تسلیم کیا ہے اور نہ ہی ہر موقع پر اس کو نظر انداز کیا ہے، جمہوریت اور اسلامی نظام میں یہ بھی ایک بہت بڑا فرق ہے، یہ درست ہے کہ اکثریت کی تائید بھی ایک قوت اور طاقت ہے لیکن جمہوریت نے اکثریت کی پرستش شروع کر دی اور اس کو حق و باطل کا معیار بنالیا اسلام میں حق و باطل کا معیار دلیل ہے نہ کہ ہاتھ اٹھانے والوں کی کثرت، لیکن جہاں دلیل کی نہیں بلکہ قوت کی احتیاج ہو یا دلائل میں ایسا تعارض ہو کہ عقل انسانی کسی ایک پہلو کو ترجیح دینے سے قاصر ہو جائے وہاں کثرت آراء ایک دلیل کا درجہ رکھتی ہے جو ایک پہلو کو ترجیح دے دیتی ہے۔

اسلامی نظام حکومت کا امتیاز

جمہوریت کا اصول یہی ہے کہ حاکم کا انتخاب کیا جائے گا اس کو کسی خاص نسل اور خاندان سے نہیں چنا جائے گا؛ بلکہ جو بہتر ہو اسے منتخب کیا جائے گا۔

مغربی جمہوریت میں حاکم کو چننے والے تمام خواص وعوام ہوتے ہیں اور اسلام میں صرف خواص تعلیم یافتہ، تربیت یافتہ، اہل علم ہوتے ہیں کیونکہ وہی بہتر جانتے ہیں کہ کون اہل ہے اور کس شخص میں اہلیت اور حکومت چلانے کی صلاحیت زیادہ پائی جاتی ہے، اسلامی جمہوریت کا یہ اصول مغربی جمہوریت کے اصول انتخاب سے اسلئے فائق ہے کہ اگر اس موضوع پر مباحثہ ہو جائے تو تمام اہل عقل کی رائے اسلامی جمہوریت کے اصول کے حق میں جائے گی، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عملی اسوہ یہ تھا کہ آپ نے کسی کو خلیفہ نامزد نہیں کیا تھا، ارباب حل وعقد نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت ابوبکرؓ کو خلیفہ منتخب کیا تھا، امارت کے لئے بیعت ہونی چاہیئے یعنی بالعموم بیعت ہونی چاہیے، چنانچہ حضرت عمرؓ کا ارشاد ہے کہ "من بایع رجلا من غیر مشورۃ من المسلمین فلا یبایع"۔(۱) جس نے مسلمانوں کے مشورے کے بغیر کسی سے بیعت کرلی تو اس کی بیعت نہیں کی جائے گی، حضرت علیؓ کا قول ہے کہ بیعت نہ تو خفیہ ہوسکتی ہے نہ مسلمانوں کی مرضی کے خلاف "ان بیعتی لا تکون خفیۃ ولا تکون إلا عن رضا المسلمین"۔(۲)

اسلامی جمہوریت ایک شورائی نظام کا نام ہے، جو ملوکیت اور استبدادی نظام کے بالکل برعکس ہے، عوامی انقلاب وہ قوت قاہرہ ہے جو اگر حکومت تشکیل دے تو وہ جمہوری حکومت ہوتی ہے، جس کی اسلام حمایت اور تائید کرتا ہے۔

اسلامی جمہوریت میں غیر مسلموں کو بھی شہریت کے حقوق حاصل ہوں گے بشرطیکہ

---

(۱) بخاری: باب رجم الحبلیٰ من الزنا اذا احصنت حدیث: ۶۴۴۲

(۲) السنن الکبری للبیہقی، تتمۃ النفقات-الأشربۃ، حدیث: ۱۵۷۵۵۔

شہریت کے قوانین سے وہ متفق ہوں اور قوانین پر عمل کرنے کے لئے تیار ہوں۔

نظام اسلامی کے بنیادی اصول

نظام اسلامی کے بنیادی اصول کو جو دراصل قرآن و حدیث اور خلافت راشدہ کے طریقے سے ماخوذ ہیں حضرت علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے تتبع و جستجو کے بعد مندرجہ ذیل لفظوں کے ساتھ بیان کیا ہے:

(۱) خلیفہ کے انتخاب میں پوری بصیرت سے کام لیا جائے؛ یعنی جتنی کوشش ممکن ہو کی جائے، پھر انتخاب کے بعد اس کے احکام جو کتاب وسنت اور مصالح مسلمین کے خلاف نہ ہو مان لیے جائیں۔

(۲) امور مہمہ میں جو منصوص نہ ہوں اہل حل وعقد سے مشورہ کیا جائے۔

(۳) بیت المال خلیفہ کی ذاتی ملک نہیں وہ صرف مصالح مسلمین کے لئے ہے۔

(۴) سلطنت کے نظم ونسق میں حد درجہ سادگی اور کفایت شعاری اختیار کی جائے۔

(۵) عہدہ دار اور اہل منصب میں ادائے فرض کے اندر پوری دیانت برتی جائے۔

(۶) عہدہ داران سلطنت کیلئے مقررہ وظیفہ کے علاوہ رعایا سے کسی قسم کا تحفہ، قطعاً ناجائز ہے۔

(۷) رعایا سے شرعی ٹیکس کے علاوہ دوسرے قسم کے غیر شرعی ٹیکس نہیں لیے جاسکتے۔

(۸) حکام پر پورا پورا عدل فرض ہے، عدل وانصاف کی راہ میں رشوت، طرف داری اور بے انصافی ظلم اور گناہ کبیرہ ہے۔

(۹) کاشت کار اور زمین دار کے درمیان اتنا ہی تعلق ہے جتنا ایک مزدور یا اجارہ دار اور مالک کے درمیان۔

(۱۰)اسلامی سلطنت کے اندر ہر مسلمان جو معذور نہ ہو اس کا سپاہی ہے۔(۱)

جمہوریت کی بنیادی غلطی

موجودہ جمہوریت میں اس قدر نقائص ہیں کہ اگر انہیں یکجا کر دیا جائے تو آمریت و ملوکیت کا نمایاں فرق باقی نہیں رہتا، زیادہ سے زیادہ عنوان اور لیبل کا فرق ہوسکتا ہے گویا جمہوریت وملوکیت ایک حقیقت کے دو عنوان ہیں جمہوریت میں عوام کو ہر طرح کی قانون سازی کا حق ہوتا ہے، گویا تحلیل وتحریم کی کلید ان لوگوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے، جن کو عوام نے منتخب کیا ہے، اسلام کی نظر میں اصل سرچشمۂ قانون کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ ہے اور اس کی تشریح کا حق ان لوگوں کو حاصل ہے جو براہِ راست قرآن وحدیث پر نظر رکھتے ہیں البتہ مجلس شوریٰ کو انتظامی مسائل میں قانون سازی اور مشورہ کا حق حاصل ہوتا ہے، یہ نہایت دوررس نظریاتی اختلاف ہے۔

؎ جمہوریت بھی طرفہ تماشہ کا کس قدر   لوح وقلم کی جان یدِ اہرمن (۲) میں ہے

اقتدارِ اعلیٰ کا حق کس کو ہے؟

علم سیاست میں حاکمیت کا لفظ اقتدار اعلیٰ اور اقتدار مطلق کے معنوں میں بولا جاتا ہے، اس لحاظ سے جمہور کے صاحب حاکمیت ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ان کا حکم قانون کی حیثیت رکھتا ہے اور انہیں افراد سیاست پر حکم چلانے کے غیر محدود اختیارات حاصل ہیں اور افراد ان کی غیر مشروط اطاعت پر مجبور ہیں، افراد کو ان کے مقابلہ میں کوئی حق حاصل نہیں ہے، جس کے جو بھی حقوق ہیں وہ انہی کے عطاء کردہ ہیں، وہ ہر حق کو سلب کرنے کے بھی کلی اختیار رکھتے ہیں، اس بات کو دوسرے لفظوں میں اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ قانون صاحب

---

(۱)اسلامی نظریۂ سیاست: ۴۵

(۲)فتنہ انگیز، خبیث شیطان کے ہاتھ میں۔

حاکمیت کے ارادے سے وجود میں آتا ہے اور افراد کو اطاعت کا پابند بناتا ہے۔

انسانی سوسائٹی میں اگر تلاش وجستجو کی جائے تو کوئی قامت ایسا نہیں ملتا جس پر حاکمیت کا یہ جامہ راست آتا ہو، اس کا اطلاق صرف اور صرف **"فعال لمایرید"** پر ہوتا ہے جس کا حکم قانون، جس کی طاقت اور قوت لامحدود، جس کے کام غیر مسئول اور جس کی ذات منزہ عن الخطاء ہے اور وہ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات اقدس ہے، علامہ اقبال مرحوم نے اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کو ایک شعر میں یوں بیان کیا ہے ؎

سروری زیبا فقط اس ذات بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتان آذری

مولانا مودودی لکھتے ہیں: ''ایک حقیقی مسلمان ہونے کی حیثیت سے جب دنیا پر نگاہ ڈالتا ہوں تو مجھے اس امر پر اظہار مسرت کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ ترکی پر ترک، ایران پر ایرانی، افغانستان پر افغانی حکمران ہیں، مسلمان ہونے کی حیثیت سے میں "حکم الناس علی الناس للناس" کے نظریہ کا قائل نہیں ہوں اور اس اعتبار سے میرے نزدیک انگلستان پر انگریزوں کی حاکمیت اور فرانس پر اہل فرانس کی حاکمیت جس قدر غلط ہے اسی قدر ترکی اور دوسرے ملکوں پر ان کے اپنے باشندوں کی حاکمیت بھی غلط ہے بلکہ اس سے زیادہ غلط، اس لیے کہ جو قومیں اپنے باشندوں کو مسلمان کہتی ہیں ان کا خدا کی حاکمیت کے بجائے انسانوں کی حاکمیت اختیار کرنا اور بھی زیادہ افسوس ناک ہے، غیر مسلم اگر ضالین کے حکم میں ہیں تو یہ مغضوب علیھم کی تعریف میں آتے ہیں۔''

پھر اسی کتاب کے صفحہ ۱۲۷ پر مولانا لکھتے ہیں:

مسلمان ہونے کی حیثیت سے میرے نزدیک یہ امر بھی کوئی قدروقیمت نہیں رکھتا کہ ہندوستان کو انگریزی امپیریلزم سے آزاد کرایا جائے، انگریز کی حاکمیت سے نکلنا تو صرف لاالہ کا ہم معنی ہوگا، فیصلہ کا انحصار محض اس نفی پر نہیں اس پر ہے کہ اس کے بعد اثبات کس چیز کا

ہوگا؟اگرآزادی کی یہ ساری لڑائی صرف اس لیے ہےاورمجاہدین حریت میں سےکون صاحب یہ جھوٹ بولنے کی ہمت رکھتے ہیں کہ اس لیےنہیں ہےکہ امپریلزم کےالہ کو ہٹا کر ڈیموکریسی کےالہ کوبت خانہ حکومت میں جلوہ افروزکیاجائے،تومسلمان کےنزدیک درحقیقت اس سےکوئی بھی فرق نہیں ہوتا،،لات گیامنات آ گیا،ایک جھوٹےخدانے دوسرے جھوٹےخداکی جگہ لے لی،باطل کی بندگی جیسی تھی ویسی ہی رہی،کون مسلمان اس کوآزادی کےلفظ سےتعبیرکرسکتاہے؟"ان اللہ لایمحوالسئ ولکن یمحوالسئ بالحسن،ان الخبیث لایمحوالخبیث" (۱)

ہندوستانی جمہوریت پھر بھی گوارا ہے

حضرت مولاناخالدسیف اللہ صاحب دامت برکاتہم لکھتے ہیں کہ: ہندوستان کادستوراسلامی اصول حکومت سے کچھ مختلف نہیں، خاص کر بنیادی حقوق کا حصہ جو دستور کی اصل روح ہے، لیکن اس سے انکارنہیں کیا جاسکتا کہ بہر حال ہمارادستورقانون سازی کی لگام انسانوں کے ہاتھ میں دیتاہےاورآپ کہہ سکتے ہیں کہ انسان کے لیے حاکمیت کااعتراف کرتاہےاس لئے فی نفسہ یہ اشکال بے جانہیں۔

لیکن سوال یہ ہے کہ ہم ایک ایسے ملک میں ہیں جہاں مسلمانوں کی آبادی پندرہ سولہ فیصد ہے، یہ آبادی بھی بکھری ہوئی ہے، مسلمان یقینا اس موقف میں نہیں ہیں کہ وہ بحالت موجودہ اس خطہ میں اسلامی حکومت قائم کریں، اب اس کے بعد دو ہی راستے رہ جاتے ہیں یا تو یہ ملک "ہندوراشٹر" بن جائے اورملک کاسارانظام ہندوتصور کے مطابق چلے۔

دوسری صورت موجودہ جمہوری نظام کی ہے، غیر اللہ کی حاکمیت ان دونوں صورتوں میں سےکوئی بھی خالی نہیں، لیکن کسی سمجھ دارشخص کواس سے انکارنہیں ہوگا کہ پہلی صورت یعنی

---

(۱) فتنۂ جمہوریت: ۵۰

ہندوراشٹر قرار پانا نہایت خطرناک امر ہوگا، اس کی مثال ہمارے پڑوس ملک ''نیپال'' کی صورت موجود ہے، نہ ہمارے عائلی قانون محفوظ رہ سکیں گے، نہ تبلیغ مذہب کی اجازت ہوگی، اور کوئی بھی شرعی قانون جو ہندو نظریہ سے متصادم ہو علانیہ ممنوع ٹھہرے گا، سرکاری سطح پر ہندو تہذیب کا بول بالا ہوگا اور اس پر تنقید واعتراض کا حق بھی حاصل نہ ہوگا، غور کیجئے یہ کتنا مہلک نظام ہوگا اور کیا ایسی صورت میں ہم آنے والے مسلمانوں کو باقی رکھ سکیں گے؟

دوسری صورت موجودہ جمہوری نظام کی ہے، یہ مکمل بہتر نہیں، لیکن نسبتاً کم خراب ہے، کیوں کہ جب حکومت کا اپنا کوئی مذہب نہیں ہوگا، اور عوام کو قانون سازی کا کام دیا جائے گا اور ہم بھی عوام کا ایک حصہ ہوں گے، تو ہم قانون شریعت رکھنے کی کوشش کریں گے، دوسری قومیں اس کو ہمارے قانون کی حیثیت سے تو باقی نہیں رکھیں گی؛ لیکن خود ہم قانون الٰہی کی حیثیت سے اس کو لانے کی سعی کریں گے، ہندوستان میں بحمد اللہ ہمارے عائلی قوانین بڑی حد تک محفوظ ہیں، ہمیں مذہب کی تبلیغ واشاعت کی اجازت ہے اور ہم اپنی تہذیب وتمدن کو باقی رکھنے اور اپنے تشخصات پر قائم رہنے کے لئے کوشاں ہیں، یہ اسی جمہوری نظام کا نتیجہ ہے، رسول اللہ ﷺ نے مکہ کے مسلمانوں کو حبشہ ہجرت کی اجازت کیوں دی تھی؟ کیا حبشہ کوئی اسلامی ملک تھا؟ اسی لئے کہ مسلمانوں کو بہ مقابلہ مکہ کے حبشہ میں زیادہ مذہبی آزادی حاصل تھی۔(۱)

ایک ایسا ملک جہاں مختلف قومیں اور مختلف مذاہب کے ماننے والے برابر کی سطح پر رہتے ہیں، جمہوریت ایک نعمت ہے (بدرجہ مجبوری، ورنہ خلافت ہی نعمت ہے، جس میں ہر قوم اور ہر مذہب کے لوگ پر امن زندگی بسر کرتے ہیں، جمہوریت میں قتل وغارت گری کے علاوہ کچھ نہیں) اور ان حالات میں اس سے بہتر کوئی نظام حکومت نہیں ہوسکتا۔

''رسول اللہ ﷺ جب مدینہ تشریف لے گئے تو وہاں مسلمان یہودی اور مشرکین تینوں

---

(۱) کتاب الفتاویٰ: ۶/ ۲۷۶۔

اقوام تھیں، اور آپ ﷺ نے ان میں یہی معاہدہ کرایا کہ یہ سب بقائے باہم کے اصول پر مدینہ میں رہیں گے، ہر ایک کو اپنے مذہب پر چلنے کی آزادی ہوگی، اور مدینے پر کوئی حملہ آور ہو تو سب مل کر دفاع کریں گے۔(۱)

ہندوستانیوں نے جمہوری نظام کا انتخاب کیوں کیا؟

ہندوستان شروع سے مختلف حکمرانوں کی آماجگاہ رہا ہے۔مختلف سلطنتوں نے اس ملک کے جغرافیہ پر اپنے نقوش چھوڑے ہیں، یہاں کے باشندوں نے موروثی، آمرانہ اور شاہانہ حکومتوں کے خدوخال دیکھے تھے، اور برطانیہ کے قبضے کے بعد سے برطانوی پارلیمانی طرز حکومت کا مشاہدہ کر رہے تھے، دراصل برطانوی سامراجیت کے دور میں ہندوستانی رہنما برطانوی پارلیمانی طرز حکومت سے متاثر تھے، تحریک آزادی کے زمانے میں انھوں نے برطانوی حکومت سے ہندوستان میں بھی اسی طرز حکومت کو رائج کرنے کے مطالبات کیے تھے، اسی لیے حصول آزادی کے بعد آئین سازوں نے ہندوستان میں پارلیمانی نظام حکومت قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔آئین نے ہندوستان میں موروثی حکومت کی جگہ عوامی جمہوریہ قائم کیا ہے، اس کے نتیجہ میں ہندوستان میں مروجہ موروثی طرز حکومت کا خاتمہ ہوگیا اور اب ہندوستان کا صدر عوام کے ذریعہ منتخب شخص ہوتا ہے جس کی مدت کار ۵ رسال ہے، اسی طرح آئین نے وفاقی طرز حکومت کی تیسری شرط پوری کرتے ہوئے عدلیہ کو مکمل طور سے آزادی عطا کی ہے اور اسے آئین کا محافظ قرار دیا ہے اور بنیادی حقوق کی نگہبانی کے فرائض انجام دیتا ہے۔سپریم کورٹ کو عدالتی نظر ثانی کا اختیار حاصل ہے۔

کیا یہ جمہوریت ہے؟

یہ دُرست ہے کہ سیاسی طور پر غیر ملکی حکمرانی کا خاتمہ ہو چکا ہے اور سفید فام حکمرانوں کی

---

(۱) البدایہ والنہایہ: ۳/ ۲۲۴، بحوالہ کتاب الفتاویٰ: ۱/ ۳۱۶۔

بجائے گندمی رنگ کے حکمران برسر اقتدار ہیں جو ہر وہ ناروا کام کر رہے ہیں جس میں دور غلامی میں بڑھ چڑھ کر فرنگی ملوث تھے۔ یہ ملک ابھی تک پسماندگی، ناخواندگی، بیماری، استحصال اور دوسری قوموں کی طرح غلامیوں میں جکڑا ہوا ہے، سماجی طور پر منتشر، سیاسی طور پر استحصال زدہ اور معاشی لحاظ سے اس وقت بھی ملک برابر نیم آبادیاتی ہے، کیونکہ معیشت پر سامراجی طاقتو ں، ان کے مقامی دلالوں اور بڑے بڑے لینڈ لارڈ وں (landlords) زمینداروں کی مشترکہ گرفت مکمل طور پر موجود ہی نہیں بلکہ مضبوط و مستحکم ہے، تمام تر معاشی پالیسیاں ورلڈ بنک، ملٹی نیشنل کمپنیوں، انٹرنیشنل مانیٹری فنڈ (international monetary fund)، ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن (World organisation) اور انٹرنیشنل کنشوڑیم (international) کے کنٹرول میں ہیں، چونکہ ملکی دولت کا زیادہ تر حصہ سامراجیوں، گماشتہ مقامی سرمایہ داروں اور بڑے بڑے لینڈلارڈوں کی تحویل میں چلا جاتا ہے، اس لئے محنت کش عوام کنگال و معاشی طور پر نا آسودہ ہے، اندریں حالات آزادی اور جمہوریت کا جو خواب ہندوستانی عوام نے بڑے ذوق و شوق سے دیکھا تھا وہ ادھورا ہے، تشنۂ تعبیر ہے۔

جس قوم کو خود کفالت اور خود انحصاری کی پالیسی ترک کر کے لبرل معاشی پالیسی کے نام پر ملک کو عالمی سرمایہ دار منڈی کے ساتھ نتھی کر دیا گیا ہو، جس ملک کی معاشی و مالی پالیسیاں ورلڈ بنک، ملٹی نیشنل کمپنیوں، مانیٹری فنڈ، ورلڈ بنک اور ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن جیسے سامراجی ادارے طے کرتے ہوں، جہاں بیرونی سرمایہ داروں کو لوٹ کھسوٹ کی کھلی چھوٹ دے دی گئی ہو، جب مالی و معاشی بحران کا دیوہا کار مچا رہا ہو، جب برآمدات اور درآمدات میں تفاوت کے باعث تجارت میں عدم توازن موجود ہو، جب روپیہ کی قیمت 1960 کے مقابلہ میں چار پیسے رہ گئی ہو، جب آئے دن غیر ملکی سکہ کے مقابلہ میں ہندوستانی روپیہ کی قیمت کم ہوتی جا رہی ہو، جب صنعت وحرفت میں غیر ملکی غلبہ ہو، جب معاشی پالیسیاں طے

کرنے کی آزادی اورخود بینی وخودنگری کا اختیار حاصل نہ ہوتو اس ملک،قوم اورمعیشت کو آزادکیسے قراردیا جاسکتا ہے؟ جب کھلم کھلا غیرملکی سامراجی طاقتیں اس ملک کی معیشت وسیاست پر قبضہ کرنے کے لئے آپس میں برسرپیکار ہوں، تو اسے آزاد معیشت وجمہوری سیاست کانام کیسے دیا جاسکتا ہے؟ یہ سب نیم نوآبادیاتی معاشرہ کی خصوصیات ہیں جو ہم اپنے سروں پرسوار دیکھتے ہیں،اس لئے بلاشبہ ہندوستانی معاشرہ، نیم نوآبادیاتی معاشرہ ہے بھلے ہی حکمران کسی شک وشبہ کے بغیر میڈیا کے زور پر اسے آزاد اور حاکمیت اعلیٰ کا حامل معاشرے کانام دیں۔(مضامین ڈاٹ کام ۲۴/جنوری ۲۰۱۹ء)

مالی نے اس لئے چمن کوخون سے سینچا تھا
کہ اس کی اپنی نگاہیں بہار کوترسیں
ملیں اس لئے ریشم کے ڈھیر بنتی ہیں
کہ دختران وطن تار تار کو ترسیں

جب بھی کوئی فساد ہوا ذمہ دار مسلمانوں کوٹھہرایا گیا، بلاسٹ(blast) اگرمسجد میں بھی ہوا تو تب بھی مسلمان کی گرفتاری عمل میں آئی ،جہاں بھی بم دھماکے ہوئے مسلم قوم نشانہ بنی، مسلمان چلاتے رہے کہ ہم ملک کے وفادار ہیں ہم پر غداری کا الزام مت لگاؤ، جرنل ویر عبدالحمید کی شکل سے ملک سے وفاداری کا ثبوت بھی پیش کیا گیا لیکن آہ! افسوس! مسلمانوں کو تب بھی شک کی نظروں سے دیکھا گیا، آزادی سے لے کرآج تک ۶۰۰۰۰/سے زائد فسادات ہوئے جس میں لاکھوں مسلمان فسادات کی بھینٹ چڑھا دیئے گئے ۲۰۰۲ء میں مسلمانوں کے ماتھے پرگجرات فسادات کا انمٹ کلنک لگا دیا گیا پھر میرٹھ،مظفرنگر،اورآسام میں فسادات نے ہزاروں مسلمانوں کی جان لے لی۔

ایک دوزخم نہیں جسم ہے سارا چھلنی
درد حیران ہے اٹھے توکہاں سے اٹھے

جمہوریت کا جنازہ

ہمارا ملک پوری دنیا کے اندر اس بات کے لیے جانا جاتا ہے کہ یہاں مختلف مذہبوں کے ماننے والے لوگ آپسی اتحاد کے ساتھ رہ کر ملک کو ترقی یافتہ بنانے میں کلیدی رول ادا کر رہے ہیں، متحدہ ہندوستان کے اندر کئی نسلوں، زبانوں، علاقوں، تہذیبوں کے لوگ رہتے ہیں جو دنیا کے کسی دوسرے ملک میں ایسی مثالیں نہیں ملتیں۔

آج کا دن ''یوم جمہوریہ'' یقینی طور پر ہمارے ملک کے لیے انتہائی خوشی کا دن ہے۔ آج کے دن سبھی سرکاری وغیر سرکاری اداروں و دوسرے جگہوں پر پرچم کشائی کر خوشیاں منائی جارہی ہیں، اس کے ساتھ ہی یہ دن ہمارے لیے محاسبہ وغور وفکر کرنے کا دن ہے کہ آزادی کے اتنے لمبے وقت گزرنے کے بعد ہمارا ملک کہاں آ کھڑا ہوا۔

اس جمہوری ملک کے اندر جب مسلمانوں نے اپنے آپ کو مسائل سے ابھارنے کے لیے جدوجہد کیا اس وقت ایک منظم سازش کے تحت فسادات کرا کر کمر کو توڑ دیا گیا، گجرات، جمشید پور، ملیالم، ہاشم پور، بھاگلپور، فاربس گنج، پٹنہ سمیت سینکڑوں جگہوں پر نوجوان مسلم لڑکیوں کی عصمت کو دن کے اجالے اور پولیس کی موجودگی میں تار تار کیا گیا، قانون کی دھجیاں ۶ر دسمبر ۱۹۹۲ سنہ کو اڑائی گئیں اور بابری مسجد کو آئین کا قتل کرتے ہوئے شہید کر دیا گیا، جس کے بعد چھوٹے بھیانک فساد لاکھوں مسلمانوں کو قتل کر دیا گیا۔ وہ کون سا ظلم باقی رہ گیا ہے جو ملک کے مسلمانوں کے اوپر نہ ڈھایا گیا ہو، آج بھی بہت ساری مائیں اور بہنیں اپنی روداد کو لیئے آواز لگا رہی ہیں؛ لیکن اس کا کوئی سننے والا نہیں ہے، جمہوری ملک کے اندر وکیل کو اس طرح سے خوف میں مبتلا کر دیا جاتا ہے کہ وہ کسی کا کیس لینے سے قبل دس بار سوچتا ہے، جب کبھی کہیں پر کوئی بم دھماکہ ہوتا تو بغیر تحقیق کے اسے اسلام سے جوڑ کر دیکھا جانے لگتا ہے۔

۲۰۱۷، ۲۰۱۸ میں ڈیموکریسی (democracy) انڈیکس کی گرتی ہوئی رینکنگ ۱۰ر سے ۴۲ پر آگئی اور economic intelegence group کے مطابق

ہندوستان میں ہندوتوا کی وجہ سے اقلیتوں خاص کر مسلمانوں واختلاف رائے رکھنے والی تمام آوازوں کے خلاف تشدد بڑھا ہے، مذہبی فسادات میں شدت آئی ہے، چاہے وہ لو جہاد کا معاملہ ہو، گھر واپسی مہم یا گائے کے نام پہ موب لنچینگ (mob lynching) کے واقعات، جبکہ ہندوستانی آئین کے مطابق کسی بھی مجرم کو عدالتی کارروائی کے بغیر مجرم قرار نہیں دیا جاسکتا اور جب تک عدالت میں جرم ثابت نہیں ہوجاتا اُس کو سزا نہیں دی جاسکتی، لیکن بارہا قانون کی خلاف ورزی کر کے کھلے عام دستور کی دھجیاں اڑائی جارہی ہیں، بے گناہوں کو جانور کے نام پہ قتل کیا جارہا ہے، عورتوں کی عزتیں پامال کی جارہی ہیں اور ریپسٹ (rapist) عہدے داروں اور انکے چیلوں کو سزا کے طور پہ جیل میں ''وی آئی پی'' سہولیات فراہم کی جاتی ہیں پھر چند روز گذرنے کے بعد انہیں باعزت رہا کر کے اعزاز سے نواز کر اعلی عہدوں پر فائز کر دیا جاتا ہے، دوسری طرف محض شک کی بنا پر مسلم نوجوانوں کو سالوں سال جیل کی سلاخوں کے پیچھے ڈھکیل دیا جاتا ہے، اس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان میں جمہوریت کا جنازہ نکل رہا ہے، جمہوریت کی بنیاد کہلانے والے چار ستون مقننہ، منتظمہ، عدلیہ اور صحافت سبھی خطرے کے زد پر ہیں، پہلے تو چوتھا ستون کہلانے والی عام انسان کی آواز یعنی صحافت کو خرید لیا گیا، ڈرا دھمکا کر انکی آوازیں کچل دی، کئی بے باک صحافیوں پہ جا بجا حملے کروائے گئے، تاکہ پولیس سے ہورہے جھوٹے انکاؤنٹر (encounter)، ریپ کے واقعات وکرتوت عام شہریوں تک نہ پہنچے اور انہیں کی طرح چند مٹھی بھر ایماندار پولس اہلکار بھی تشدد کا شکار بن رہے ہیں، کرپشن اتنا بڑھ چکا ہے کہ چپراسی سے لیکر اعلی عہدیدار سبھی رشوت خور ہو چکے ہیں اور بیچارے عام انسان کی زندگی ان آدم خوروں و رشوت خوروں کے پنجوں میں بُری طرح جکڑی ہوئی ہے، ہندوستان کا ہر عام و خاص شہری پریشان حال ہے۔

آئین میں ہر مذہب کو آزادی حاصل ہے مگر حکومت نام نہاد مسلمان درحقیقت غیر مسلم

چند عورتوں کی وجہ سے ایک طبقہ پر طلاق ثلاثہ مخالف بل جبراً تھوپنے کی کوشش کرتی ہے، جسم فروشی اور ہم جنس پرستی کی آزادی دی جاتی ہے، آر بی آئی گورنر کو حکومت اتنا مجبور کر دیتی ہے کہ اسے استعفیٰ دینا پڑتا ہے؛ سی بی آئی کا تماشہ دیکھ کر ساری دنیا ہنس رہی ہے اور پوچھ رہی ہے کہ کیا یہی سب سے بڑا جمہوری ملک ہے؟ یہاں تو ڈکٹیٹر شپ ہے! یہی وجہ ہے کہ برطانوی رسالہ ''اکونومسٹ'' (economist) کے انٹیلیجنس یونٹ نے درجنوں ممالک میں موجود جمہوریت کے معیار پر مبنی ایک فہرست شائع کی ہے اس میں ہندوستان سنہ ۲۰۱۸ میں ۴۱ ویں مقام پر ہے جبکہ سنہ ۲۰۱۴ میں ۲۷ ویں مقام پر تھا، اس نے لکھا ہے، گزشتہ پانچ سالوں میں ہندوستان کی حالت ابتر ہوئی ہے۔

نام اس کا آمریت ہو کہ ہو جمہوریت
منسلک فرعونیت مسند سے تب بھی اب بھی ہے

یوم جمہوریہ احتساب کا دن

یوم جمہوریہ کے موقع پر یہ سوچنے اور احتساب کرنے کی ضرورت ہے کہ آیا اس عظیم جمہوری ملک میں واقعی جمہوریت زندہ ہے یا جمہوریت کی آڑ میں ڈکٹیٹر شپ، فرقہ پرستی، ذات پات کا بھید بھاؤ، مذہبی منافرت کا لامتناہی سلسلہ تو جاری نہیں؟ کسی خاص مذہب کے ماننے والوں کے ساتھ ناانصافی اور ظلم کا ننگا ناچ تو نہیں چل رہا ہے؟ حق بولنے والی زبانوں کو گنگ تو نہیں کر دیا جا رہا ہے؟ مجرم کو معصوم، معصوم کو مجرم تو قرار نہیں دیا جا رہا ہے؟ آباء واجداد کی قربانیوں کو فراموش تو نہیں کیا جا رہا ہے؟ ملک کے کونے کونے میں منصوبہ بندی کے ساتھ بم دھماکے اور فسادات کرا کے کسی ایک قوم اور مذہب کو نشانہ تو نہیں بنایا جا رہا ہے؟

ہندوستان کا سیکولر دستور جسے آج سے ۷۰ رسال پہلے سنہ ۱۹۵۰ء میں نافذ کیا گیا تھا، اس کی عظمت و وقار کو پامال تو نہیں کیا جا رہا ہے؟ بابائے قوم کے قاتلین کو شرف و اعزاز سے تو

نہیں نوازا جارہا ہے؟ وہ جمہوری ہندوستان جس کا بزرگوں نے خواب دیکھا تھا اور جس کے لئے اپنی جان ومال کا نذرانہ پیش کیا تھا، جسکے لئے اپنی بیویوں کو بیوہ بچوں کو یتیم اور ماؤوں کو بے سہارا کیا تھا، جس کے لئے انہوں نے اپنے تن اور دھن کی بازی لگادی تھی، وہ جمہوری ہندوستان جس کو انگریزی اقتدار کے بعد ایک مرتبہ پھر گنگا جمنی تہذیب کے سانچے میں ڈھالنے کے لئے ہندوؤں اور مسلمانوں نے کندھے سے کندھا ملا کر آزادی کی لڑائی لڑی تھی، وہ ملک جو ہمیشہ سے مختلف اقوام ومذاہب کے لئے امن وآشتی کا گہوارہ سمجھا جاتا تھا، وہ خوابوں کا ہندوستان آج دور دور تک نظر نہیں آرہا ہے، آج اس ملک کے باشندوں میں اتنے سالوں کے بعد حالات بالکل مختلف نظر آرہے ہیں، ملک کا امن وامان غارت ہو چکا ہے، ملک میں جنگل راج قائم ہو چکا ہے، اقلیتوں بطورِ خاص مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کرنے کی کوشش کی جارہی ہے، ملک میں امن وآشتی کی امیدیں ختم یا بہت موہوم سی نظر آنے لگی ہیں، ہندوستان کو جمہوریت سے ڈکٹیٹرشپ کی اور ڈیموکریسی (Democracy) سے ہندوراشٹر بنانے کی سعی مسلسل کی جارہی ہے، اور ملک اپنی جمہوری قدریں کھوتا ہوا نظر آرہا ہے، گاندھی کے قاتل ناتھورام گوڈسے کا لامندر تعمیر کراکے اس ملک کا وفادار ثابت کرنے کی پیہم جہد جاری ہے، مسلمانوں کو ان کے جمہوری حقوق سے یکساں طور پر محروم کرنے کی پوری کوشش کی جارہی ہے۔

چنانچہ آزادی کے اتنے سال گذرنے کے بعد بھی مسلمان زندگی کے تمام میدانوں میں دوسرے درجہ کے شہری مانے جارہے ہیں، ان کے ساتھ ہر جگہ استحصال، تعصب اور جانبداری کا معاملہ کیا جاتا ہے، حکومت میں مسلمانوں کی نمائندگی افسوسناک حد تک کم ہو چکی ہے، وزارت اور اعلیٰ مناصب پر ایک خاص سوچ وفکر کے لوگ قابض ہو چکے ہیں، دفاع اور فوج میں مسلمانوں کا تناسب صفر رہ گیا ہے، سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کی نمائندگی نہایت معمولی رہ گئی ہے۔

دوسری طرف ملک مسلسل خارجی فتنوں سے نبرد آزما اور دہشت گردی کے نشانے پر ہے، پاکستان کشمیر پر نظریں گڑائے ہوئے ہے، اور چین دوسری طرف شمالی ہندوستان میں مسلسل دراندازی کرنے کی کوشش کر رہا ہے، نیز ملک اندرونی خلفشار سے بھی جوجھ رہا ہے، فرقہ پرست طاقتیں ملک کی امن وآشتی کی فضا خراب کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کر رہی ہیں، اور کہیں ملک کے مرکزی وزراء موقع پرستی کے شکار ہو کر نفرت انگیز بیانات اور شر انگیز بیانات کرنے میں لگے ہوئے ہیں، اور کہیں ماؤوادیوں نے ملک کا تانہ بانہ بکھیرنے کا منصوبہ بنایا ہوا ہے، تو کہیں بوڑھوں اور قوم کے معصوموں کے ساتھ خون کی ہولی کھیلی جارہی ہے، غرض ہمارا ملک اس وقت ایسے آہنی پنجوں میں جکڑا ہوا ہے، جس سے چھٹکارا پانا قوم کے لئے اس وقت انتہائی مشکل ترین کام بن گیا ہے۔

جمہوریت اور مظلوم اقلیت

یوں تو ہمارے ملک کے دستور سازوں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ دستور بنایا ہے، اس کو سکیولر ڈیموکریسی (Secular democracy) قرار دیا ہے، کیوں کہ یہاں ہر مذہب کے لوگ رہتے ہیں، ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی، دستور سازوں نے ایک غیر مذہبی اسٹیٹ قرار دیا، مقصد یہ تھا کہ یہاں کی حکومت پر کسی مذہب کا رنگ غالب نہ ہو، مذہب ہر فرد کا نجی معاملہ ہے، اور اس معاملے میں اس کو مکمل آزادی حاصل آزادی حاصل ہو، اس ملک سے پاکستان کے نام پر جو حصہ الگ ہوا اسے اسلامی جمہوریہ پاکستان کے حق میں ووٹ دیا تھا اس سے کہیں زیادہ مسلمانوں نے اس ملک میں رہنے کو ترجیح دی، آج بھی پاکستان کے مقابلے میں ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہے اس لیے اس وقت کے رہ نماؤں نے مسلمانوں کے جذبات اور ہندوستان کی آزادی میں ان کی گراں قدر خدمات اور ملک سے ان کی محبت اور وفاداری کا خیال رکھتے ہوئے اسے ایک ایسا دستوری تحفظ عطا کیا کہ یہ ملک کسی مذہب کے حوالے سے نہ پہچانا جائے۔

یوں تو اس ملک کی حکومتوں نے صرف مسلمانوں کے ساتھ ہی ناانصافی نہیں کی ہے، بلکہ دوسرے طبقے بھی ناانصافیوں اور محرومیوں کا شکار ہوئے ہیں، جیسے ہریجن اور دوسری پس ماندہ اقوام، مہاتما گاندھی نے ان کے لیے بڑی جدو جہد کی، ان کی غربت اور افلاس دور کرنے کے لیے، ان کو تعلیمی دھارے میں لانے کے لیے، ان کو سماجی مساوات اور برابری دلانے کے لیے مہاتما گاندھی کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر امبیڈکر جیسے لوگ بھی میدان عمل میں آئے، یہاں تک کے نفاذ آئین کے آٹھ ماہ کے اندر اندر انہیں سرکاری ملازمتوں میں ریزرویشن کی ضمانت بھی دی گئی، ان کے لیے گاؤں درگاؤں اسکول کھولے گئے، کالجوں اور یونی ورسٹیوں (Universities) میں ان کے لیے سیٹیں محفوظ کی گئیں، گاؤں، قصبات میں افتادہ زمینیں ان کو الاٹ (allot) کی گئیں، یہی وجہ ہے کہ آج دلت اس ملک کی میں اسٹریم (Streem) میں شامل ہیں، سیاست سے لے کر حکومت تک، نجی کمپنیوں Companies سے لے کر سرکاری ملازمتوں تک، اسکولوں سے لے کر یونیورسٹیوں تک، ہر جگہ دلت بھائی اپنا مقام رکھتے ہیں، یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ انہیں ریزرویشن (reservation) حاصل تھا۔

دوسری طرف مسلمان ہیں، سچر کمیٹی کی رپورٹ کے مطابق ان کا حال دلتوں سے بھی بدتر اور اب بھی ان سے بدتر ہے، نہ ان میں تعلیم ہے، نہ ان کے پاس زمینیں ہیں، نہ باعزت روزگار ہے، غربت، افلاس، معاشی بدحالی اور جہالت ان کی شاخت اور پہچان بن گئی ہے، ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ مسلمانوں کو بھی ریزرویشن ملتا ان کو بھی آگے بڑھانے اور اونچا اٹھانے کی کوشش کی جاتی، ان کو بھی ملازمتیں دی جاتیں، ان کو بھی افتادہ زمینیں الاٹ کی (allot) جاتیں، اس کے برعکس یہ ہوا کہ مسلمانوں میں جو لوگ زمینوں کی وجہ سے خوش حال تھے زمین دارہ قانون لا کر ان سے زمینیں چھین لی گئیں، اور ان کو دیدی گئیں جو ان کے ملازم کی حیثیت سے ان زمینوں پر کاشت کر رہے تھے۔

مسلمانوں کی تعلیمی صورت حال بہت زیادہ ناگفتہ بہ ہے،اگرمدارس اورمکاتب نہ ہوتے ہوتو یہ صورت حال اورخراب ہوتی،ان مدرسوں میں بچوں کومفت تعلیم دی جاتی ہے اب رہی دنیاوی تعلیم تومسلمان اپنے بچوں کودنیوی تعلیم میں لگائیں یاروز گارکمانے میں لگائیں؛اس لیے ہم دیکھتے ہے کہ ہر دکان پر،ہرکارخانہ میں،ہرفیکٹری میں مسلمان بچے اور نوجوان کام کرتے نظرآتے ہیں،یہاں کسے،ریڑھے،ٹھیلے بھی مسلمان ہی چلاتے اور کھینچتے نظرآئیں گے،اگرکچھ بچے اسکول کی تعلیم حاصل بھی کرلیتے ہیں توانہیں کالج پڑھنا مشکل ہوجاتاہے،کالج پہنچ گئے تویونیورسٹی کی شکل مشکل ہی سے نصیب ہوتی ہے،اسکی وجہ یہ ہے کہ ہماری حکومتیں نہ مسلمانوں کی تعلیم کے میدان میں آگے بڑھانا چاہتی ہیں اورنہ انہیں معاشی طورپرخودکفیل بنانا چاہتی ہیں،ویسے توہرحکومت میں اقلیتوں کی مخصوص وزارت ہوتی ہیں،اس وزارت کے اقلیتوں کی مالی مدد کے لئے بڑے بڑے منصوبے تیارہوتے ہیں، لیکن اکثرمنصوبے صرف کاغذ پر ہوتے ہیں،اوراگرکسی منصوبے پرعمل بھی ہوجائے تواس کافائدہ مسلمانوں تک ان کی بے خبری اورپست ہمتی کی وجہ سے یامنصوبہ سازوں کی بدنیتی کی وجہ سے کم ہی پہنچتاہے۔

ایسا لگتاہے کہ مسلمانوں کی قسمت میں صرف محرومی ہے،اوراوپر سے فسادات کی مار رہی سہی کسرپوری کردیتی ہے،آزادی سے لے کراب تک اس ملک میں ہزاروں فسادات ہوچکے ہیں،ان میں بعض فسادات کوفساد کہنے کے بجائے منظّم نسل کشی کہاجائے توزیادہ بہترہے،گودھرا،گجرات کی مثال ہمارے سامنے ہے،جہاں نہتے مسلمانوں کا قتل عام کیاگیا،ان کی دکانیں لوٹیں گئیں،کاروبار برباد کئے گئے،مکانوں کوآگ لگائی گئی،مظفرنگرضلع کی تباہی کازخم بھی ابھی تک تازہ ہے،وہاں مسلمانوں کومنصوبہ بندطریقے سے اجاڑنے اورتباہ وبرباد کرنے کی کوشش کی گئی،آج بھی ہزاروں خاندان اپنی زمینیں،دکانیں،مکانات چھوڑکرنوآبادکالونیوں میں بے یارومددگارپڑے ہوئے ہیں،تباہی کی یہ خونچکاں داستان اتنی

المناک ہے کہ یہ چند سطریں اس کی صحیح عکاسی نہیں کر سکتیں۔(۱)

دینی اداروں پر حملہ

یاد کیجئے ! بیسویں صدی کے نصف اول میں جب سماج میں انقلاب برپا ہو رہا تھا، جمہوریت کے قیام کی کوششیں ہو رہی تھیں اس وقت جرمنی میں ہٹلر، اٹلی میں مسولینی، روس میں لینن، ترکی میں اتاترک اور اسپین میں جنرل فرانسیسکو فرانکو جھوٹے نعروں کے ذریعے تالیاں بٹور رہے تھے، طاقت اور اقتدار میں بنے رہنے کے لئے نسلی اور مذہبی منافرت پھیلا رہے تھے، خوش کن بھاشنوں سے عوام کو سبز باغ دکھا رہے تھے؛ آج ہندوستان میں بعینہ وہی صورت حال ہے، بس زمان ومکان اور صاحب اقتدار کا فرق ہے۔

وہی قاتل وہی شاہد وہی منصف ٹھہرے
اقرباء میرے کریں خون کا دعوی کس پر

مسلمانوں کے مدارس جہاں صرف مسلمانوں کا 4 فیصد طبقہ تعلیم حاصل کرتا ہے، ان مدارس اور وہاں کے پڑھنے والوں کے خلاف زہر افشانی کی جارہی ہے، اس سے قبل بھی ان مدارس سے حب الوطنی کا سوال کیا گیا، کبھی انہیں انگریزی اور ہندی پڑھانے کی تلقین کی جاتی ہے تو کبھی ۱۵/اگست اور ۲۶/جنوری کے موقع سے جھنڈا لہرانے اور پروگرام منعقد کرنے کی بات کی جاتی ہے، گویا ان سب کے آڑ میں یہ باور کرانے کی کوشش کی جارہی ہے کہ مدارس حب الوطنی کے مفہوم سے واقف ہی نہیں ہوتے، جس وقت واقعتا حب الوطنی کے ثبوت دینے کا تھا یعنی جنگ آزادی کی تاریخ میں دارالعلوم کی عظیم ہستیاں بنفس نفیس شریک وسہیم رہی ہیں، مولانا قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، حاجی امداد اللہ مہاجر مکی، شیخ الہند مولانا محمود الحسن اور شیخ الاسلام حسین احمد مدنی رحمہم اللہ وغیرہ کی سوانح حیات اٹھا کر

(۱) آزادی سے جمہوریت تک: ٦٥

پڑھئے کہ انہیں انگریزوں سے ملک کو آزاد کرانے میں کس قدر انتھک کوششیں کیں، روپوش ہوئے دوسرے ملکوں کو ہجرت کی، جیل کی صعوبتیں برداشت کیں، پھانسی کے پندھوں کو گلے لگایا کالاپانی کی سزا کو برداشت کیا، جب آزادی کے بعد حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کو ان کے آزادی میں اعتراف خدمت کے طور سرکاری وزارت یا عہدہ یا صلہ دینے کی بات کہی تو مولانا نے اس وقت یوں کہا تھا کہ ہم نے عہدہ یا کرسی کی لالچ میں ملک کے لیے آزادی کی جنگ نہیں لڑی، ہم نے ملک، وطن کی حفاظت کے فریضے کے تحت اس کام کو انجام دیا، ہمیں صلہ کی ضرورت نہیں، اب انہیں مدارس کو حب الوطنی کا سبق سکھایا جارہے۔

اگر کسی دینی مدرسے میں اتفاق سے یا کسی سازش سے کوئی بندوق یا کوئی ہتھیار مل جائے تو نہ جانے کیا ہوا کھڑا کیا جائے گا؟ کس قدر آسمان وزمین کے قلابے ملائیں جائیں گے؟ اور کس قدر دہشت گرد تنظیموں اور دہشت گردوں سے ان مدراس کے ناموں کو وابستہ کیا جائے گا: جیش محمد، لشکر طیبہ، حزب المجاہدین اور القاعدہ وغیرہ نہ جانے کس قدر دہشت گرد تنظیموں سے ان مدارس کو جوڑا جائے گا؛ جب کہ مدارس میں ہتھیار تو کجا بقول ایک مولانا کہ ہمارے مدارس میں ہتھیار تو بہت دور کے رہے، ترکاری اور سبزی کاٹنے کے لئے چھری تک صحیح نہیں رہتی، پھر ہمیں دہشت گرد باور کرانے کی کوشش کی جاتی ہے، ابھی اس کے برعکس حال ہی ایک رپورٹ جسے ٹائمز آف انڈیا(Times of India) نے پیش کیا ہے، ملک کی راجدھانی دہلی کے مضافات سے لے کر اتراکھنڈ کے سرحد تک ہندوسوابھیمان سینا دہشت گردی کے نام پر اور اسلامی شبیہ کو بدصورت شکل میں پیش کرنے کے لئے ہندو نوجوان طبقہ کو اسلامی اسٹیٹ کے خلاف جنگ چھیڑنے کے نام پر تیار کر رہی ہے، ان مندروں دھرم شالاؤں میں ۸ رسال سے لے کر ۲۰، ۳۰ سال کے نوجوان لڑکے لڑکیوں کو تلوار، بلم، بھالا اور بندوق چلانے کی مشق کرائی جارہی ہے، غازی آباد ضلع کے ڈاسنہ میں

واقع ایک مندر میں اس تنظیم کا ہیڈ کواٹر ہے، اس طرح کے ۵۰؍ٹریننگ کیمپ ہیں، جن کی تعداد بڑھتی جارہی ہے، کیا یہ اسلحہ ٹریننگ سارے امور قانونی دائرے میں ہورہے ہیں، ان کا ٹارگیٹ کیا واقعتاً داعش ہیں، یا ہندوستان میں داعش کے شکل میں یہ ایک بھارتیہ خطرناک و مکروہ چہرہ ہے؟

عصری اداروں پر حملہ

ہمارے آزاد ملک میں مسلمانوں کی عصری تعلیم گاہیں بھی ملک کے حکمراں طبقوں کی آنکھوں میں کھٹک رہی ہے، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ جیسے مسلمانوں کے عظیم عصری تعلیمی اداروں سے مسلمانوں کے ۵۰؍ فیصد ریزرویشن کو ختم کرنے کی بات کہی جارہی ہے اور اس کے اقلیتی کردار کے حوالے سے سوالات کھڑے کئے جارہے ہیں، مسلمانوں کو عصری تعلیم سے بھی تہی دست اور نکما اور ادھورا کیا جانے کی تیاری ہورہی ہے، حالانکہ ہندوستان کے آئین کے دفعہ ۳۰؍ کے تحت ملک میں مسلمانوں کو عصری یونیورسٹیاں (universities) اور ادارے قائم کرنے کی گنجائش دی گئی ہے، جس کی امداد حکومت کی طرف سے ملتی رہی گی، لکھا ہے: ”تمام اقلیتوں کو خواہ وہ مذہب کی بناء پر ہوں یا زبان کی اپنی پسند کے تعلیمی ادارے قائم کرنے اور ان کا انتظام کرنے کا حق ہوگا“ اسی دفعہ ۳۰؍ کی شق نمبر ۲؍ میں یہ بھی لکھا ہے کہ ”مملکت تعلیمی اداروں کو امداد عطا کرنے میں کسی تعلیمی ادارے کے خلاف اس بنا پر امتیاز نہ برتے گی کہ وہ کسی اقلیت کے زیر انتظام ہے، خواہ وہ اقلیت مذہب کی بناء پر ہو یا زبان کی“ ان دو عظیم یونیورسٹیوں کے تعلق سے بھی وقتاً فوقتاً اس کے اقلیتی کردار کے حوالے سے سوالات کھڑے کئے جاتے ہیں، حالانکہ سچر کمیٹی نے صاف طور پر مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی اور ان کو تحفظات دیئے جانے کی بات کہی ہے کہ ملک کے ۶ سے ۱۴ سال کے ۲۵ فیصد بچے کبھی اسکول نہیں گئے، انڈر گریجویٹ کورس میں فی ۲۵ طلباء میں صرف ایک طالب علم مسلم، پی جی کورس میں فی ۵۰ طلباء میں صرف ایک

مسلم طالب علم، آئی اے ایس حکام میں صرف ۳ فیصد مسلمان، آئی پی ایس حکام میں صرف ۴ فیصد مسلمان، آئی ایف ایس حکام میں صرف ۱.۸ فیصد مسلمان، آئی آر ایس حکام میں ۵.۴ فیصد مسلمان، یہ مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کی حالت ہے، لیکن یہ جانتے بوجھتے اور سمجھتے ہوئے پھر مسلمانوں سے ان کی اقلیتی یونیورسٹیاں اور تعلیمی اداروں پر کیوں نگاہِ بد ڈالی جارہی ہے، کیا یہ ایک جمہوری ملک میں اقلیتوں کو کمزور کرنے کی سازش نہیں ہے؟ (۱)

یوم جمہوریہ اور جوانوں کی ذمہ داری

جن کی شان میں جئے جوان جئے کسان کا نعرہ بلند ہوا تھا اُن میں کوئی سرحد پر گولی کھارہا ہے اور ان کا داتا کہلانے والا بھوکا پیاسا خودکشی کررہا ہے، ملک کا مستقبل کہلانے والے نوجوان تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود بے روزگار ہیں ''جیو'' (Jio) کے جال میں پھنس کر ویگو (veego)، ٹک ٹاک (Tik tok) جیسی عارضی دنیا میں غرق ہوکر بے مقصد زندگی گذار رہے ہیں، اپنے نوجوانوں کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے انکی راہیں ہموار کرنی ہونگی اور یہ تبھی ممکن ہوگا جب ہم مشاعروں، بے مطلب کے جلسے، تقاریب کی قربانی دیکر وہی مال اور وقت تعلیمی نظام پہ خرچ کریں، تاکہ غربت کی وجہ سے کوئی بھی تعلیم سے محروم نہ رہے اور آنے والے دنوں میں ہمارے یہی نوجوان ڈاکٹر، انجنیئر، وکلاء، آئی اے ایس (IAS) جیسے دیگر شعبوں میں جاکر اپنی قابلیت کے جوہر دکھاسکیں اور اُن کی کامیابی سے آنے والی نسلیں فیض یاب ہوں۔

جب تک ہماری بنیادی سطح مظبوط نہیں ہوگی، ہماری قوم تعلیم یافتہ نہیں ہوگی، سیاست سے لیکر ہر شعبے میں خود کو نہ دیکھے گی اُس وقت تک اونچی عمارت کی تشکیل محض خواب بنا رہیگا اور مزید کئی سالوں تک اسی طرح حقدار ہونے کے باوجود غلام بنکر مظلومیت کی زندگی گزارنی

(۱) مضامین ڈاٹ کام، مفتی رفیع الدین حنیف قاسمی

پڑیگی اور تب تک ہندوستان کھوکھلا ہو چکا ہوگا۔

نقشہ لیکر ہاتھ میں بچہ بھی ہوگا حیران
کہ کیسے دیمک کھا گئی اُس کا ہندوستان

یاد رہے ہمارے اندر غلاموں اور نکموں کا خون نہیں بلکہ بے باک جانباز رہنماؤں کا خون ہے جنہوں نے آزادی کے خاطر انگریزوں کے خلاف پہلا بگل بجایا، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ سے لیکر محمد اشفاق جیسے مجاہدوں نے اپنے خون کا آخری قطرہ تک ملک کے نام نچوڑ دیا اور افسوس کہ بدلے میں ہم نے اُن سبھی کی قربانیوں کو فراموش کر دیا ہے، جانباز قوم کے ماتھے پہ مظلومیت کا بدنما داغ لگا دیا ہے، آزادی سے پہلے انگریزوں کے غلام کہلا رہے تھے اور آج ظالم حکومتوں کے غلام بن کر ہر دن ظلم وتشدت کا شکار ہو رہے ہیں اور اپنی خاموشی کو حکمت کا نام دے رہے ہیں، اسلئے خود سے عہد کرتے ہوئے خود کے ساتھ ملک کے حالات بدلنے کی کوشش کریں اپنی قابلیت وصلاحیت کو ملک کی فلاح و بہبودی اور آنے والی نسلوں کے بہتر مستقبل کے خاطر جھوک دیں؛ کیونکہ سال میں ایک دو دن ترنگا لہرا کر حب الوطنی کے ترانے گنگنانے سے کوئی وطن پرست نہیں بن جاتا، نہ ہی یوم جمہوریہ کو جشن منانے سے جمہوری نظام زندہ ہوگا۔

جمہوری ملک میں مسلمانوں کی ذمہ داری

ایماندارانہ طور سے جو حقوق حکومت کے ہمارے اوپر ہیں، ان کو ہم اپنی ذمہ داری سے ادا کریں، حقوق طلبی کا آدھا راستہ تو اسی سے طے ہو جائے گا، آدمی نے اپنی ذمہ داری خوش اسلوبی سے ادا کی تو اس نے اللہ کا حکم پورا کیا اور اللہ کی رضا اسے حاصل ہوئی، اور اللہ کی رضا ہر خیر کی بنیاد ہے، پھر اس کا فطری اثر یہ ہوتا ہے کہ جس کا ہم حق ادا کر دیتے ہیں وہ منجانب اللہ اپنے دل میں نرمی اور محبت پاتا ہے، پھر اس کے دل میں داعیہ پیدا ہوتا ہے کہ جس نے میرا حق ادا کیا، اس کا حق بھی ادا کرنا چاہئے، یہ آدھا راستہ ہوگیا، باقی آدھے کے لئے اللہ

تعالیٰ سے اپنے حق کی دعا کرے، حق تعالیٰ کی منظوری ہو جائے گی تو کوئی اس کے حق کو روک نہیں سکتا۔

اس تحریر کو پڑھ کر بعض لوگ مسکرائیں گے، کہ لکھنے والا کس زمانہ کی بات اس زمانے میں لکھ رہا ہے، جبکہ حکومتیں بہری اور گونگی ہو رہی ہیں، ان کے سامنے جب تک ہڑ بونگ نہ مچائی جائے گی، چیخا چلایا نہ جائے گا، نہ اس کے کان کھلیں گے اور نہ زبان کھلے گی جب کہ یہی غلط اندیشی ہے اور شریعت کے خلاف ہے، حکومت کی غلطی آپ نے دیکھی، آپ کے اوپر جو حق ہے، وہ آپ نے کتنا ادا کیا، اور حکومت کو کتنا دھوکہ دیا، لوگ حکومت کے حقوق جو ان پر ہیں چھپا اور بچالے جاتے ہیں، اور اسے اپنی فنکاری اور ہنر قرار دیتے ہیں، اور حکومت جب ان پر طاقت استعمال کرتی ہے تو انہیں اپنے وہ سارے حقوق یاد آنے لگتے ہیں، جو حکومت کے اوپر ہیں، یہ لینے اور دینے کے دو پیمانے رعایا نے بنا رکھے ہیں، پھر حکومت سے مہربانی کی توقع رکھتے ہیں، پس سیدھا اور صحیح راستہ وہی ہے، جو لسانِ نبوت نے بیان کیا ہے کہ اپنی ذمہ داری کو ادا کرو، ہر ایک کا حق اسے دو، اور جو تمہارا حق دوسروں پر ہے اس سے لڑ کر مطالبہ کرنے کے بجائے اللہ سے مانگو، اس طریقہ پر عمل سے بہت سے مسائل تو پیدا ہی نہ ہوں گے، اور جو پیدا ہوں گے وہ بآسانی حل ہو جائیں گے۔

آج کا عام مزاج یہ ہو گیا ہے کہ اپنی کوئی خامی، کوئی کمی، اپنا کوئی ظلم، اپنی حق تلفی آدمی کو نظر نہیں آتی ہے، سب عیب دوسروں میں ہی نظر آتے ہیں، یہی حال فریق ثانی کا بھی ہے، وہ اپنا کوئی عیب نہیں دیکھتا، دوسرا ہی اسے سراپا عیب نظر آتا ہے، پس دونوں آپس میں دست و گریباں ہوتے رہتے ہیں اور امن و امان رخصت ہو جاتا ہے۔

حکومت سے اگر ٹکرانا ہے، تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ ہر پانچ سال پر الیکشن ہوتا ہے، الیکشن میں اسے ووٹ نہ دیجئے، مگر کس کو دیں؟ یہ سوال بہت ٹیڑھا ہے، لیکن جو بھی حکومت قائم ہے، اس کے ایماندارانہ حقوق ادا کریں، اور ناانصافیاں اس طرح دور کریں کہ اپنے اندر جو ناانصافیاں ہیں، انہیں ختم کریں، اور اللہ سے دعا کریں، ان شاء اللہ وہ حالات باذن الٰہی پیدا ہو جائیں گے جنہیں گوارا کیا جا سکے، اور یہ بھی دعا کریں۔ ”اللّٰھم لاتسلط علینا

من لا یرحمنا" اے اللہ! ہم پر ایسی حکومت مسلط نہ فرمائیے جو ہم پر رحم نہ کرے، حکومت اللہ کے ہاتھ میں ہے، اسی دربار سے مانگئے جو کچھ مانگنا ہو اور مانگنے کے شرائط پورا کیجئے۔(۱)

ہم جمہوریت کا تحفظ کیسے کریں؟

اس وقت مسلمانوں کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ وہ کسی خاص نصب العین اور ٹارگیٹ (Target) کو سامنے رکھ کر کوشش نہیں کر پا رہے ہیں، الیکشن کا موقع آتا ہے تو اس سے قبل اور بعد خوب بیان بازیاں ہوتی ہیں؛ لیکن سنجیدگی کے ساتھ اس پر غور نہیں کیا جاتا کہ اس جمہوری ملک میں ہماری کامیابی کا راستہ کیا ہے؟ ہم سیکولرزم اور جمہوریت کی بقا کے لیے کیا کچھ کر سکتے ہیں؟ اس سلسلہ میں چند معروضات پیش خدمت ہیں!

۱۔ہم جہاں ایک پکے مسلمان ہیں وہیں سچے محب وطن بھی ہیں، آقائے دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی امت کو وطن سے محبت کی تعلیم دی ہے خود جب آپ اپنا مولد و مسکن مکۃ المکرمۃ چھوڑ کر مدینہ طیبہ ہجرت فرما رہے تھے تو آپ کی آنکھیں بے ساختہ آنسو بہا رہی تھیں اور آپ زبانِ حال و قال سے یہ فرماتے جا رہے تھے: ائے سرزمین مکہ! ائے بطحا کی وادی! ائے وطن عزیز! تیرا فراق مجھے ہرگز گوارا نہ ہوتا، اگر تیرے باشندے مجھے اس پر مجبور نہ کرتے۔اس لیے یہ ہمارا قومی فریضہ ہے (خاص کر ان حالات میں جب کہ وطن سے محبت کی بنیادیہی کچھ رسوم رہ گئے ہیں) کہ ہم جشن آزادی یا جشن جمہوریہ منانے میں دیگر ابنائے وطن سے بالکل پیچھے نہ رہیں اور یاد رکھیں! یہ ہمارا اپنا ملک ہے، ہمارے اسلاف و اکابر نے اس کے لیے بے مثال اور یادگار قربانیاں دے کر اس امانت کو ہمارے سپرد کیا ہے؛ لہٰذا ہم ان زریں مواقع کو ہاتھ سے جانے نہ دیں؛ بل کہ ان سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے غیر مسلم برادران کو بھی ان تقاریب میں مدعو کریں؛ تاکہ انہیں بھی حقائق کو سمجھنے کا موقع مل سکے۔

---

(۱) حدیث دردِ دل: ۲۲۳، مولانا اعجاز صاحب اعظمیؒ

۲۔ہمیں اس بات کی بھرپور جدوجہد کرنی چاہیے کہ مسلمانوں میں موجود انتشار کی کیفیت ختم ہو،کم از کم کلمہ کی بنیاد پر ہم اپنے آپ کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرلیں!اگر ہم متحد ہوں گے تو ہمارا اپنا وجود اپنے آپ میں ایک قوت کی شکل اختیار کرے گا،جس کو ختم کرنا بہر حال ناممکن ہوگا۔اگر اس کے بالمقابل ہم منتشر رہیں گے تو سرے سے ہمارا وجود بے معنی ہوکر رہ جائے گا۔اس وقت مسلمان سیاست کے میدان میں متحد ہوجائیں اور فیصلہ کرلیں کہ انھیں کسی ایک کنڈ ڈیٹ (Candidate) کو ووٹ دینا ہے تو یقین مانیے!ہم اتنے مضبوط ہیں کہ جس کو چاہیں تخت پر بٹھادیں اور جس کو چاہیں تخت سے اتار دیں۔ضرورت ہے کہ ہم سنجیدگی سے مسائل کا جائزہ لیں!غور وفکر سے کام لیں اور ان کے حل کے لیے مضبوط حکمت عملی اختیار کریں۔

۳۔جمہوریت کے تحفظ کے لئے یہ بات بھی نہایت اہم ہے کہ ہم اپنے اندر سیاسی شعور بیدا کریں،یہ اپنی جگہ درست ہے کہ ہر شخص کی اپنی زندگی اور زندگی سے وابستہ اپنی اپنی ضرورتیں ہیں؛مگر ان سب کے ساتھ من حیث القوم اگر ہم اپنا تحفظ چاہتے ہیں تو پھر حالات سے باخبر رہنے،مسائل کا تجزیہ کرنے،سیاسی داؤ پیچ کو سمجھنے اور موثر حکمت عملی اختیار کرنے کے لئے ہمیں خواب گراں سے بیدار ہونے اور متحد ہوکر حالات کا مقابلہ کرنے کی ضرورت ہے۔ اسی موضوع پر حضرت مولانا علی میاں ندویؒ نے فرمایا تھا کہ اگر اس ملک میں مسلمانوں کو پنج وقتہ نمازی تو کیا بلکہ تہجد گذار بنادیا جائے؛مگر انکے سیاسی شعور کو بیدار نہ کیا جائے تو پھر مسجدیں ہی نہیں بلکہ انکے نماز پڑھنے پر بھی پابندی عائد کردی جائے گی۔

یہ بھی امر واقعی ہے کہ سیاسی شعور کا فقدان صرف مسلم عوام میں ہی نہیں بلکہ ہمارے منتخب کردہ نمائندوں میں بھی بہ کثرت پایا جاتا ہے،جس کی وجہ سے اکثر مسلم قیادت جمہوریت کی نزاکتوں،حالات کی پیچیدگیوں اور سیاسی تقاضوں پر کھری نہیں اُتر پاتی اور کچھ ہی عرصے بعد ہمارا سیاسی نمائندہ مختلف ہتکنڈوں کا شکار ہوکر سیاست سے باہر ہوجاتا ہے۔

۴۔کسی بھی ملک اوراجتماعی نظام کو چلانے،نظم ونسق کو برقرار رکھنے اور پرامن بقائے باہمی کوفروغ دینے کے لیے کسی نہ کسی قانون وآئین کی ضرورت ہے اورآئین کسی بھی مملکت کی بنیاد واساس ہوتا ہے؛ جس کا تحفظ پورے نظام کو انتشار سے بچانے اورحق دار تک اس کا حق پہونچانے میں ممدومعاون ہوتا ہے؛اس لیے ہمیں اپنے دستوروآئین سے آگاہی،اس کی باریکیوں سے واقفیت اور جدید ترمیمات سے باخبر رہنے کی بھی کوشش کرنی چاہیے؛ کیونکہ ملک کی پرامن بقا کاسارامدارملک کے دستوروآئین پرہے،اگر ہم نے دستور کو بچانے کی فکر نہیں کی تو بالیقین ہمارا ملک بھی تشدد اور فرقہ واریت کی آگ میں جھلس جائے گا اور ہم کفِ افسوس ملتے رہ جائیں گے۔

۵۔جمہوریت کی حفاظت کے لیے نہایت ضروری ہے کہ ہم اپنے حق رائے دہی کا استعمال کریں اورسیکولر پارٹی کو ووٹ دے کرملک میں امن وسلامتی کی فضا بحال کرنے کی کوشش کریں ؛ کیوں کہ انتخابات بھی جمہوریت کا اہم ستون ہے اگر ہم نے ووٹ دینے کے مسئلہ میں سستی اورغفلت برتی یا پھر انتشار کا شکار ہو گئےتو ہم اپنے ہاتھ سے اپنی تباہی رقم کرنے والے ثابت ہوں گے۔(بصیرت آن لائن،Jan 25, 2019)

مذہبی آزادی کا حق

ہمارا ملک ایک مذہبی ملک ہے،یعنی یہاں کے باشندے اپنی روز مرہ کی زندگی مذہبی قوانین اورتعلیمات دینیہ کے مطابق گذارنے کو ترجیح دیتے ہیں،اس میں کھانا،پینا شادی بیاہ،اورموت کی رسمیں آجاتی ہیں وراثت کے ترکے اورطلاق کے مسئلے مذہبی تعلیمات کے مطابق طئے کیئے جاتے ہیں مختلف مذہبوں کے ماننے والے مذہبی مراسم بجالاتے ہیں مذہبی تقریبات مناتے ہیں، مذہبی جلوس واجتماعات کرواتے ہیں،اس کے علاوہ مختلف مذہبوں کے ماننے والے اس ملک میں آج سے نہیں؛ بلکہ سینکڑوں برسوں سے رہتے چلے آئے ہیں،اوراس ملک میں یہ کبھی نہیں ہوا کہ دوسروں کو مذہبی آزادی حاصل نہ رہی ہو۔

بھارت کا دستور جب مرتب کیا گیا تو بنیادی حقوق (Fundamental Rights) کی دفعات میں دفعہ ۲۵-۲۶-۲۷-۲۸-۲۹-۳۰ میں ہر شہری کو مذہب کی آزادی اپنے مذہبی رسم و رواج پر عمل کی آزادی، اپنے تہوار منانے اور اپنے مذہبی اور تہذیبی خصوصیات کے ساتھ رہنے کی آزادی، اپنے مذہب کی تبلیغ و ترویج کی آزادی، مذہبی تقریبات کی آزادی، اپنے مذہب، زبان اور اپنی تہذیب کے تحفظ اور فروغ کے لیے ادارے قائم کرنے کی آزادی دی گئی ہے۔

انگریزی حکومت میں مسلمانوں نے اپنے مسائل اسلامی طریقے پر حل کرنے کی درخواست دی تو انگریزی حکومت نے مسلمانوں کی درخواست منظور کر لی اور شریعت ایکٹ ۱۹۳۷ء پاس کیا، جب ہمارا ملک آزاد ہوا تو ڈاکٹر امبیڈکر کی رہنمائی میں دستور ساز کمیٹی تشکیل دی گئی اس کمیٹی نے شریعت ایکٹ ۱۹۳۷ء کو جوں کا توں برقرار رکھا، اسی کو مسلم پرسنل لاء کہتے ہیں جو آج بھی ہمارے عدالتی نظام میں رائج ہے۔

چنانچہ دستور امن عامہ، اخلاق عامہ اور صحت عامہ کا لحاظ رکھتے ہوئے ہر شہری کو بے روک ٹوک اور بنا کسی قسم کی پابندی کے کسی بھی مذہب کو ماننے یا اس پر عمل کرنے اور اس کی تبلیغ کرنے کا حق عطا کرتا ہے، سکھوں کو کرپان باندھنے اور اسے لیکر چلنے کا حق دیا گیا ہے اسی طرح مسلمانوں کے مشہور مذہبی مدرسے دارالعلوم دیوبند، مظاہر العلوم، ندوۃ العلماء، بڑی آب و تاب کے ساتھ چل رہے ہیں، جمعیۃ علماء ہند کے دینی تعلیمی بورڈ کے زیر اہتمام ہزارہا ہزار مکاتب ملک میں قائم ہیں۔

بہر کیف دستور کی روشنی میں ہر فرد کو اپنی پسند کا مذہب اختیار کرنے کا حق حاصل ہے، ساتھ ہی ساتھ دیگر مذاہب کو بھی عزت و احترام کی نظروں سے دیکھنے کو ضروری قرار دیا گیا ہے، لیکن آج کل حالات اس کے ٹھیک برعکس دیکھنے کو مل رہے ہیں دوسرے مذاہب کو برا کہنا، ان مذاہب کے ماننے والوں کی دل آزاری کرنا، نفرت انگیز نعرے بازی کرنا

آج فیشن بنتا چلا جارہا ہے اس سے جہالت، منافرت، بد دلی اور فرقہ واریت کو ہوا ملتی ہے وہیں ہماری تہذیبی ویکجہتی کی روایات بھی بہت شدت سے مجروح ہوتی ہیں، تعصبی نظریہ کو مٹانے کے لئے پنڈت جواہرلال نہرو نے کہا تھا: ''ہم کسی مذہب سے تعلق نہیں رکھتے ہم سب مادروطن کے فرزند ہیں ہم عملاً اور قولاً تنگدلی اور مذہبی جنون کو پھلتا پھولتا نہیں دیکھ سکتے''۔

اسلام خدائے واحد کی بندگی کی دعوت دیتا ہے لیکن دوسرے مذاہب کے لوگوں پر اپنے عقائد بدلنے اور اسلام قبول کرنے کے لیے دباؤ نہیں ڈالتا، نہ کسی جبر واکراہ سے کام لیتا ہے، اہلِ نجران کو حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو خط لکھا تھا اس میں یہ جملہ بھی درج تھا: ''نجران اور ان کے حلیفوں کو اللہ اور اُس کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پناہ حاصل ہے، ان کی جانیں، ان کی شریعت، زمین، اموال، حاضر و غائب اشخاص، ان کی عبادت گاہوں اور ان کے گرجا گھروں کی حفاظت کی جائے گی، کسی پادری کو اس کے مذہبی مرتبے، کسی راہب کو اس کی رہبانیت اور کسی صاحب منصب کو اس کے منصب سے ہٹایا نہیں جائے گا اور ان کی زیرِ ملکیت ہر چیز کی حفاظت کی جائے گی۔'' **ولنجران وحاشيتهم جوار الله وذمة محمد النبي رسول الله علي انفسهم وملتهم وارضهم واموالهم وغائبهم وشاهدهم وبيعهم وصلواتهم لا يغيروا اسقفاعن اسقفيته ولا راهبا عن رهبانية ولا وافقاعن وقفانيته وكل ماتحت ايديهم من قليل او كثير''** (۱)

غیر مسلموں کے جو بیرونی وفود حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آتے ان کی حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود میزبانی فرماتے چنانچہ جب مدینہ منورہ میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حبشہ کے عیسائیوں کا ایک وفد آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو مسجد نبوی میں ٹھہرایا اور ان کی مہمان نوازی خود اپنے ذمہ لی اور فرمایا: یہ لوگ

---

(۱) طبقات ابن سعد: ۱/ ۲۲۸، کتاب الخراج لابی یوسف: ۷۸

ہمارے ساتھیوں کے لیے ممتاز ومنفرد حیثیت رکھتے ہیں، اس لیے میں نے پسند کیا کہ میں بذات خود ان کی تعظیم وتکریم اور مہمان نوازی کروں۔ ”انھم کانوا لأصحابنا مکرمین، وانی أحب أن أکافئھم“(۱) ایک دفعہ نجران کے عیسائیوں کا چودہ رکنی وفد مدینہ منورہ آیا، آپ نے اس وفد کو مسجد نبوی میں ٹھہرایا اور اس وفد میں شامل مسیحیوں کو اجازت دی کہ وہ اپنی نماز اپنے طریقہ پر مسجد نبوی میں ادا کریں، چنانچہ یہ مسیحی حضرات مسجد نبوی کی ایک جانب مشرق کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے۔(۲)

جمہوریت اور یکساں سول کوڈ

یہ ملک مختلف مذاہب کا گہوارہ ہے، صدیوں سے یہاں ہندو اور مسلمان مل جل کر رہتے ہیں، مسلمانوں نے اس ملک پر ہزار برس تک حکمرانی کی ہے کبھی نہیں سنا گیا کہ مسلم بادشاہوں نے اقتدار کے نشے میں چور ہو کر دیگر مذاہب کے ماننے والوں کو مذہبی حقوق سے محروم کیا ہو۔

آزادی کے بعد ملک کے رہنماؤں نے ایک بہترین آئین ملک کے عوام کو دیا، اس میں تمام لوگوں کے لیے آزادی، انصاف اور مساوات کی ضمانت دی گئ، بالخصوص اقلیتوں کو یہ یقین دلایا گیا کہ وہ اس ملک میں امن وامان سے رہیں گے، انہیں ہر طرح کا تحفظ حاصل رہے گا، ان کے ساتھ کسی بھی معاملے میں امتیازی سلوک نہیں کیا جائے گا، ان کو ہر طرح کی مذہبی آزادی ملے گی، حکومت ہند نے برطانوی دور کے شریعت ایکٹ کو جوں کا توں برقرار رکھ کر مسلمانوں کو باور کرایا کہ انہیں عائلی معاملات میں اپنے پرسنل لاء پر عمل کرنے کی مکمل آزادی حاصل ہوگی لیکن ہمارے برادران وطن میں ایک طبقہ ایسا بھی ہے، جو قطعاً یہ پسند نہیں کرتا کہ مسلمان اپنے پرسنل لا پر عمل کریں، ان کو مذہبی آزادی حاصل

---

(۱) شعب الایمان للبیہقی: ۶/ ۵۱۸، حدیث نمبر ۹۱۲۵، السیرۃ النبویۃ لابن کثیر: ۲/ ۳۱

(۲) الطبقات الکبریٰ لابن سعد: ۱/ ۳۵۷، الجامع لأحکام القرآن لقرطبی: ۴/ ۴، زاد المعاد لابن قیم: ۳/ ۶۲۹

ہو، آزادی، انصاف اور مساوات جیسے الفاظ کو جو دستورِ ہند کی روح ہین ان کے حقیقی معنی سے محروم کرنا اس طبقے کا دیرینہ خواب ہے، اور اب وہ اس خواب کو تعبیر کا جامہ پہنانے کے یے بڑے بے تاب نظر آرہے ہیں۔

تین طلاق کے مسئلے کو اس قدر اچھالا کہ کچھ دنوں تک میڈیا میں اس مسئلے کے علاوہ کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا، ایسا لگتا تھا کہ ملک کے تمام مسائل حل ہو چکے ہیں، تعلیم صدفی صد عام ہو چکی ہے، کوئی اب بے روزگار نہیں ہے، سرحدوں پر سکون، اندرون ملک کوئی بے چینی اور اضطراب نہیں ہے، ملک معاشی اور اقتصادی ترقی کی بلندیوں کو چھو رہا ہے، اب اگر کوئی مسئلہ ہے تو تین طلاق کا مسئلہ ہے، اس کی وجہ سے مسلمان عورتیں پس ماندہ نظر آرہی ہیں، وہ اپنے حقوق سے محروم ہیں، طلاق کے حوالے سے ان پر ظلم ہو رہا ہے، ان حالات میں ضروری ہے کہ تین طلاق پر پابندی لگادی جائے اور اگر مسلمان اپنی بیوی کو تین طلاق دے دے تو از روئے قانون اسے طلاق ہی تسلیم نہ کیا جائے، یہ سوچ ہے جو ملک کو جمہوریت سے مطلق العنانیت کی طرف لے جارہی ہے۔

جہاں تک طلاق کا معاملہ ہے، تین طلاق ایک بہانہ ہے، اصل میں تو ملک کو یکساں سول کوڈ کی طرف لے جانے کی کوشش ہو رہی ہے، افسوس ہے اس بات کا کہ عدالتیں جو آئین کے محافظ ہیں، وہ خود حکومت کو یکساں سول کوڈ نافذ کرنے کا مشورہ دینے لگیں ہیں۔

یکساں سول کوڈ کی وکالت کرنے والوں کا کہنا ہے کہ ہمارے ملک ایک سیکولر ڈیموکریسی ہے، اس کا تقاضہ یہ ہے کہ ملکی قوانین پر مذہب کا رنگ نہ ہو، بل کہ تمام قوانین بھارتی تہذیب کے تناظر میں وضع کئے گئے ہوں، وہ بھی کہتے ہیں کہ مذہبی قوانین وقت کے ساتھ ساتھ فرسودہ ہو چکے ہیں اور اب ان میں عصری تقاضوں کے ساتھ ہم آہنگ ہونے کی صلاحیت نہیں ہے، ان کے خیال میں قومی یک جہتی کو فروغ دینے اور ملک کے تمام طبقات کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ان کے شخصی اور عائلی

قوانین میں یکسانیت ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ کسی اسٹیٹ کے سیکولر ہونے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اس اسٹیٹ میں مذہب کی کوئی حیثیت نہ ہو اور اس کے ہر شہری کو مذہب سے لاتعلق، ناآشنا اور بیگانہ بنا دیا جائے بلکہ کسی اسٹیٹ یا ریاست کے سیکولر ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ اس حکومت کا کوئی مذہب نہیں ہوگا، اس کی نظر میں تمام مذاہب برابر ہونگے، ان کے درمیان کسی بھی معاملے میں کوئی تفریق نہیں برتی جائے گی، مذہب فرد کا ذاتی اور نجی معاملہ ہوگا، حکومت کسی مذہبی معاملے میں اس وقت تک مداخلت نہیں کرے گی جب تک وہ امن عامّہ کے لیے خطرہ ثابت نہ ہو۔

جہاں تک اسلام کا تعلق ہے اس کی تعلیمات کسی ایک زمانے یا کسی ایک نسل انسانی کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں، بلکہ ان کا دائرہ قیامت تک آنے والی نسلوں تک وسیع ہے، اس لیے ہم یہ تسلیم نہیں کرسکتے کہ اسلام کے شرعی قوانین کی افادیت ختم ہو چکی ہے اور اب وہ زمانے کے تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں ہیں، اسلام چودہ سو سال پرانا مذہب ہے اور اس کے قوانین بھی چودہ سو سال پرانے ہیں۔

شرعی وعصری قانون کا فرق

شرعی قوانیں خالق کائنات کے بنایے ہویے ہیں اور دنیوی قوانین ناقص العلم والعقل انسانوں کے بنایے ہوئے ہیں، دنیوی عدالتیں تمام حقوق واحوال کو دو حصوں میں تقسیم کرتی ہیں، PERSONAL LOW شخصی وذاتی احوال Common Low مشترکہ قانون، جو ملک کے تمام باشندوں پر یکساں نافذ ہوتے ہیں، لیکن شریعت مطہرہ اس تقسیم کو نہیں تسلیم کرتی بلکہ شریعت کے پیغامات ہمہ جہت وعالمگیر اور معاشرت ومعاملات، تہذیب وثقافت، اجتماعی و انفرادی، خانگی وبیرونی، ملکی وملی سیاسی وسماجی الغرض تمام شعبہائے حیات انسانی کو پیش آنے والے احوال ومسائل کو محیط ہوتے ہیں۔

مسلم پرسنل لاء بورڈ کا ہمیشہ سے یہی موقف رہا ہیکہ محمڈن لاء کی بنیاد قرآن وحدیث ہے جس میں تبدیلی کا کوئی جواز نہیں اور شریعت مطہرہ نے تین طلاق کے بعد بیوی کو کلیۃً علیحدہ کرنے کا حکم دیا ہے، لہذا تین طلاق دینے کے بعد بیوی کو روکنا کسی بھی مسلمان کے لئے جائز نہیں، اس قانون شرعی میں ترمیم عدالت عظمی کے اختیار سے باہر ہے، نیز مسلم پرسنل لاء بورڈ نے یونیفارم سول کوڈ کی مخالفت کرتے ہوئے عدالت عظمی سے سوال بھی کیا تھا کہ ۱۹۵۶ء میں ہندو کوڈ کے آنے کے بعد بھی ہندوؤں کے مابین ذات پات کا اتنا اختلاف کیوں ہے؟

یونیفارم سول کوڈ کا مطلب؟

لفظ 'یونیفارم' انگریزی لفظ 'یونیفارم' کا مطلب ہے یکساں، یکساں سول کوڈ سے مراد تمام لوگوں پر ایک ہی سول قانون کا لاگو ہونا ہے۔

ملک میں رائج قوانین کی دو اہم قسمیں، سول کوڈ (CIVIL CODE) اور کریمنل کوڈ (CRIMINAL CODE) کہلاتی ہیں، جس کے لئے اردو میں بالترتیب ضابطہ ''دیوانی'' اور ''فوجداری'' کی اصطلاحیں استعمال کی جاتی ہیں۔

دوسری قسم ضابطہ فوجداری کے اندر جرائم کی سزائیں، اور بعض انتظامی امور سے متعلق قوانین آتے ہیں، مثلاً کسی جرم پر کیا سزا دی جائے گی اور مجرم کے لئے کیا اصول وضوابط ہوں گے اور انتظامی طور پر کس قسم کے اقدامات حکومت کرے گی؟ جیسے کہ تعزیراتِ ہند، پوٹا وغیرہ، یعنی جرائم پر تادیبی قوانین ملک کے ہر ایک باشندے کے لئے برابر ہیں، اس میں نسل ورنگ، مذہب ومسلک، ذات پات کی وجہ سے کوئی تفریق وامتیاز نہیں۔

پہلی قسم سول کوڈ کے دائرہ میں وہ تمام قوانین آتے ہیں جن کا تعلق معاشرتی، تمدنی امور سے ہے جیسے کہ کمپنی کے قوانین، کانٹریکٹ (Contract) (معاہدوں کے قوانین) وغیرہ، سول قوانین کا اکثر حصّہ بھی سب کے لئے ایک ہی ہے، سول کوڈ کا ہی ایک حصہ

personal LOW کہلاتا ہے، ملک کی بعض اقلیتوں کو ان کے مذہب کے لحاظ سے کچھ خصوصی شعبوں میں الگ قوانین پر عمل کرنے کا اختیار دے دیا جاتا ہے، مسلمانوں کو ملک کے دستور میں یہ حق دیا گیا ہے کہ نکاح، طلاق، ایلاء، ظہار، خلع، مبارات (خلع ہی ایک شکل، فسخِ نکاح، عدت، نفقہ، وراثت، وصیت، ہبہ، ولایت، رضاعت، حضانت، وقف (خیراتی اور غیر خیراتی دونوں) سے متعلق مقدمات اگر سرکاری عدالتوں میں لے جائیں اور دونوں فریق مسلمان ہوں تو سرکاری عدالتیں اسلامی شریعت کے مطابق ہی مذکورہ معاملات میں فیصلے کریں گی، ان قوانین کا مجموعہ "MUSLIM PERSONAL LAW" کہلاتا ہے۔ (یونیفارم سول کوڈ مسلم پرسنل لا اور عورت کے حقوق: 14)

ہندوستانی تاریخ میں کبھی یکساں سول کوڈ تھا؟

اس سے قبل ہندو عہد اور مغلیہ عہد میں بھی کوئی مشترکہ سول کوڈ نہیں رہا اور سب نے اس امر کا اعتراف ہمیشہ سے کیا ہے کہ کسی بھی مذہب کے عائلی قوانین میں مداخلت نہیں کرنی چاہئے گویا ایک ہزار سال کی ہندو مسلم مشترکہ تہذیب میں کبھی بھی مشترکہ کوڈ کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی اس کے عدم موجودگی میں کسی عوامی نقض امن کا کوئی معاملہ بھی پیش نہیں آیا۔ اسی طرح آزاد ہندوستانی کی تقریباً 70 سالہ تاریخ میں بھی ہم ایک مشترکہ سول کوڈ کے بغیر بنا کسی تنازع کے پرامن طور پر جی رہے ہیں۔ چنانچہ جب ہزاروں سال سے بنا کسی مشترکہ سول کوڈ کے ملک چل رہا ہے تو اب اس بحث کی کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے یہ مان بھی لیا جائے کہ ۱۹۴۷ء میں آزادی کے وقت ملک کو ایک سیکولر اور بقائے باہم پر مبنی ریاست کے قیام کے لئے نہرو جیسے کچھ جدت پسند افراد نے مشترکہ سول کوڈ کی ضرورت محسوس کی ہوگی مگر آزاد ہندوستان کے گذشتہ ۷۰ رسال کے احوال کے بجائے خود یہ بتانے کے لئے کافی ہیں کہ

ملک کوکسی مشترکہ کوڈ کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔(۱)

مسلم پرسنل لاء کا قیام

مغلیہ دور میں اسلامی قانون ہی ہندوستان کا ملکی قانون تھا، نہ صرف عائلی معاملات میں شریعت اسلامی کے مطابق فیصلے کیے جاتے تھے، بلکہ فوجداری قانون بھی شرعی حدود کے مطابق چلایا جاتا تھا، البتہ غیر مسلموں کو ان کے عائلی مسائل میں اپنے مذہبی قوانین پر عمل کرنے کی مکمل آزادی حاصل تھی، ہندوستان پر انگریزی تسلط کے بعد بھی انگریز جج اسلامی قانون کے مطابق فیصلہ کرتے تھے، بعد میں رفتہ رفتہ انگریزی قانون رائج ہوتا گیا، حتیٰ کہ ۱۸۶۲ء میں اسلام کے فوجداری قانون کو ختم کر کے انڈین پینل کوڈ نافذ کر دیا گیا، اور نکاح، طلاق، وراثت وغیرہ مسائل میں اسلامی قانون باقی رہنے دیا گیا، لیکن مسلمان عائلی مسائل میں دیگر اقوام سے متأثر ہونے لگے، اور اسلامی تہذیب کی جگہ غیر اسلامی تمدن جڑ پکڑنے لگا، جس کی وجہ سے ۱۹۳۷ء میں علماء اور عام مسلمانوں کے مطالبہ پر انگریز دور حکومت میں مسلم پرسنل لاء کا نفاذ عمل میں آیا، ملک کی آزادی کے بعد انگریزوں کے مرتب کردہ مسلم پرسنل لاء کو باقی رہنے دیا گیا، آزادی کے بعد ملک کا سیکولر دستور بنا جس میں تمام مذاہب کے ماننے والوں کو اپنے مذاہب پر عمل کی کھلی چھوٹ دی گئی۔

جب ملک کے وزیر قانون ''ایچ آر گوکھلے'' نے پارلیمنٹ میں لے پالک بل پیش کرتے ہوئے اعلان کیا کہ یہ یکساں سول کوڈ کی تدوین کی سمت پہلا قدم ہے، اس اعلان کے ساتھ ملت اسلامیہ ہند میں تشویش کی لہر دوڑ گئی اور عروس البلاد ممبئی میں ایک نمائندہ کنونشن منعقد کیا گیا، جس میں مسلم پرسنل لاء بورڈ کی تشکیل کا فیصلہ کیا گیا، ۱۹۷۲ء میں منعقد ہونے والے ممبئی اجلاس میں تمام مکاتب فکر کے علماء و دانشوران نے شرکت کی، اور سب کے اتفاق سے حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب علیہ الرحمہ کو مسلم پرسنل لاء بورڈ کا صدر

---

(۱) http://mazameen.com/?p=12469 مہدی حسن عینی قاسمی

منتخب کیا گیا، بورڈ اپنے قیام سے تاحال تحفظ شریعت کے لیے کوشاں ہے، اور ہر اس سازش کا مقابلہ کرتا آرہا ہے، جس کا مقصد شریعت میں تبدیلی یا تنسیخ ہو، اس حوالے سے بورڈ کی خدمات روز روشن کی طرح واضح ہیں، بورڈ نے جہاں سیاسی وقانونی سطح پر شریعت کے تحفظ کا سامان فراہم کیا اور شریعت پر ہونے والے ہر حملے کا دفاع کیا، وہیں داخلی سطح پر اس بات کی کوشش کی کہ خود مسلمان شریعت کی بھرپور پابندی کریں، اس کے لیے اصلاح معاشرہ مہم، تفہیم شریعت مہم اور تحفظ شریعت مہم کے نام سے بورڈ نے مسلسل اصلاحی سرگرمیاں جاری رکھیں۔(۱)

مسلم پرسنل لاء سے بدظنی

فسطائی سنگھ پریوار نے ماحول کچھ ایسا بنایا ہوا ہے کہ عوام کے ذہنوں میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ یکساں سول کوڈ کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرنے والی اگر کوئی چیز ہے تو وہ مسلمان اور ان کا مسلم پرسنل لاء ہے، اس گمراہ کن پروپگنڈے کی وجہ سے پورے ملک میں عوام کی اکثریت یہ باور کر بیٹھی ہے کہ مسئلہ یکساں سول کوڈ بمقابلہ مسلم پرسنل لاء (بورڈ) کا ہے اور چونکہ ایک زمانے سے غیر مسلموں کی رائے عامہ مسلمانوں کے خلاف نفرت کا زہر پھیلا کر ہموار کی گئی ہے تو عوام یکساں سول کوڈ کے منفی اثرات اور مضرات پر سوچنے کے بجائے مسلمانوں کی بالادستی اور ان کے خاص تحفظات یا درجات کو ختم کرکے انہیں عام سماجی دھارے mainstream کا حصہ بنانے والی پُرفریب سوچ کا ساتھ دینے لگ جاتے ہیں، جب کہ اصل حقیقت یہ ہے کہ پرسنل لاء یا نجی عائلی قوانین کی رعایت صرف ایک مسلمانوں تک محدود نہیں ہے بلکہ اس طرح کی رعایتیں تو اس ملک میں درجنوں طبقات اور قوموں کو حاصل ہیں۔

(۱) مضامین ڈاٹ کام، January 21, 2018، مولانا سید احمد ومیض صاحب ندوی نقشبندی

مسلم پرسنل لاء پر حملہ

مسلم پرسنل لاء پر بڑے پیمانے پر حملہ اس وقت ہوا جب ۱۹۸۵ء میں " شاہ بانو" مقدمہ کا سپریم کورٹ نے مسلم پرسنل لاء کے اِس دفعہ کے خلاف کہ مرد پر عورت کے نان نفقہ کی ذمہ داری اس کی عدت کے ختم ہونے تک ہی ہے، یہ فیصلہ دیا کہ اُس کا شوہر عدت کے بعد بھی اُس کے نفقہ وخرچہ کو اُٹھاتا رہے گا، تو اِس فیصلے کے مخالفِ شرع ہونے کی وجہ سے تمام ہندوستانی مسلمانوں نے اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی، جس کے نتیجے میں ۱۹۸۶ء میں پارلیمنٹ نے مسلم خواتین کے لیے ایک نیا قانون پاس کیا، جس سے سپریم کورٹ کا وہ فیصلہ کالعدم قرار پایا، سرکاری عدالتوں کے اِس طرح کے فیصلے جہاں مسلم پرسنل لاء میں مداخلت ہیں، وہیں مسلمانوں کو دستورِ ہند میں حاصل حق سے محروم کرنے اور یکساں سول کوڈ کے نفاذ کی منصوبہ بند سازش کا حصہ ہے۔

مرکزی حکومت کے ذریعہ سپریم کورٹ میں جو حلف نامہ پیش کیا گیا ہے اس میں تین باتوں پر زور دیا گیا ہے۔

(۱) طلاقِ ثلاثہ ضروری اسلامی اصولوں میں سے نہیں ہے ۔۔۔ یعنی اگر ُطلاقِ ثلاثہ پر ُ پابندی، عائد بھی کردی گئی تو اس پابندی سے اسلامی شریعت اور اسلامی اصولوں کی کوئی خلاف ورزی نہیں ہوگی

(۲) ہندوستان کا آئین تمام شہریوں کو ۔۔۔ کیا مرد اور کیا خواتین ۔۔۔ یکساں حقوق فراہم کرتا ہے یعنی ُطلاقِ ثلاثہ، کے ذریعے آئین کے فراہم کردہ یکساں حقوق کی یقین دہانی کی خلاف ورزی ہوتی ہے، کیونکہ مرد ایک طرفہ طور پر تین بار ُطلاق، بول کر عورت کو چھوڑ دیتا ہے، لہٰذا آئین کے فراہم کردہ ُحقوق، کو یقینی بنانے کے لئے ُطلاق ثلاثہ، پر پابندی لگنی ہی چاہیئے۔ (۳) خواتین کی عزتِ نفس سے کھلواڑ کرنے والوں سے کوئی سمجھوتہ نہیں کیا جاسکتا یعنی یہ کہ ُطلاقِ ثلاثہ، کا عمل اس ملک کی مسلم خواتین کی عزتِ نفس سے کھیلنے کا عمل ہے لہٰذا

اس پر پابندی ضروری ہے۔

حلف نامہ میں ’تعدد ازدواج‘ یعنی ایک سے زائد شادیوں اور ’حلالہ‘ کا بھی ذکر ہے حکومت نے سپریم کورٹ سے کہا ہے کہ ’تعدد ازدواج‘ پر اور ’حلالہ‘ پر بھی پابندی عائد ہونی چاہئے اس حلف نامہ کا خلاصہ یہی ہے کہ مسلم پرسنل لاء کا وجود ختم کرکے کامن سول کوڈ کو نافذ کیا جائے۔

ہندوستان کے مختلف پرسنل لاء

ہندوستان میں شادی بیاہ اور طلاق وغیرہ سے متعلق اگرچہ ایک سرکاری قانون اسپیشل میریج ایکٹ (Special marreage act) ۱۹۵۴ء ہے، جس کا اطلاق ملک کے اندر اور ملک سے باہر (سوائے جموں اور کشمیر اور خانہ بدوش قبائیلیوں کے) تمام ہندوستانیوں پر ہوتا ہے لیکن اس سے ہٹ کر مختلف قوموں یا طبقات کے لئے خصوصی قوانین کی شکل میں ایک درجن سے زیادہ دوسرے عائلی قوانین موجود ہیں یا رہے ہیں جیسے:

۱) The Converts' Marriage Dissolution Act, 1866

۲) The Indian Divorce Act, 1869

۳) The Indian Christian Marriage Act, 1872 (۴

The Kazis Act, 1880

۵) The Anand Marriage Act, 1909 (۶ The Indian Succession Act, 1925

۷) The Child Marriage Restraint Act, 1929 (۸ The Foreign Marriage Act, 1969

۹) The Dissolution of Muslim Marriage Act, 1939

۱۰) The Hindu Marriage Act, 1955

۱۱)۱۲)The Parsi Marriage and Divorce Act, 1936)

((1956Hindu Succession Act

۱۳)(1956Hindu Minority and Guardianship Act))

۱۴)(1956Hindu Adoptions and Maintenance Act))

۱۵)(Muslim Personal Laws(Shariat) Application Act 1937

۱۶)(Protection of Rights on The Muslim Women(Divorce) Act, 1986)

ہمارے ملک میں ہر مذہب اور ذات کے لوگوں کے مختلف پرسنل لاء ہیں جو آئین کے خلاف ہے لیکن مذہب کی بنیاد پر خصوصی حقوق کی وجہ سے رائج ہیں مثلاً:

(01) گووا کے ہندو خواتین کو اگر ۲۵ رسال کی عمر تک بچہ نہیں ہوا (یا ۳۰ رسال کی عمر تک بیٹا) تو اس کا شوہر دوسری شادی کر سکتا ہے۔

(یہ بیٹا بیٹی میں قانونی امتیاز کیا گیا ہے.) لیکن گووا کا مسلم دوسری شادی نہیں کر سکتا۔

2) کرناٹکی برہمن اپنی بھانجی سے شادی کر سکتا ہے، لیکن مہاراشٹر کا برہمن نہیں کر سکتا۔

3) بینک میں کوئی ہاتھ میں چیونگم بلیڈ بھی لے جائے تو گرفتار کیا جا سکتا ہے، لیکن سکھ سردار تلوار بھی لے جا سکتے ہیں۔

4) سکھ خاتون بغیر ہیلمٹ کے بائک چلا سکتی ہے، کیونکہ سکھ مذہب میں خواتین کا ٹوپی پہننا غیر قانونی ہے۔

5) جین مرد، نکوباری ہندو مرد و عورتیں اور ہندو ناگا سادھو مرد کو مادرزاد برہنہ رہنے کا حق حاصل ہے، لیکن کوئی دوسرے مذہب کے لوگ اس طرح ننگے رہیں تو پولیس گرفتار کر

لیتی ہے، جین مذہب کے خواتین کو برہنہ رہنے کا حق نہیں ہے۔

6) گوا کے چرچ میں ہوئے کسی کیتھولک کے شادی کے بعد وہ عدالت کی مرضی کے بغیر طلاق دے سکتا ہے، لیکن مسلم ایسا نہیں کرسکتا۔

7) سکھ فوجی داڑھی رکھ سکتا ہے، مسلم نہیں۔

8) سکھ پائلٹ پگڑی پہن سکتا ہے، ہندو نہیں۔

9) آسام کے ایسے چار ضلع ہیں، جہاقبائلی ہی زمین خرید سکتا ہے برہمن نہیں۔

10) کشمیر کی طرح ناگالینڈ اور کچھ شمالی مشرقی ریاستوں کو بھی خصوصی ریاست کا درجہ دیا گیاہے۔

11) صرف ہندو قبائلی بھالا، چاقو اور دیگر کچھ ہتھیار رکھ سکتے ہیں ہے، دوسرے نہیں۔

12) اگیاری (پارسی مزار) میں صرف پارسی جاسکتے ہیں، دوسرے نہیں۔

13) سومناتھ وپشپتی ناتھ مندر میں صرف ہندو جاسکتے ہیں، دوسرے نہیں۔

14) کیرالہ میں صرف کرشچن شراب پی سکتا ہے، بیچ سکتا ہے، ہندو نہیں۔

بھارت میں ہی ایسے قریب ۲۰۰ر ذاتوں، ومذاہب کے مختلف پرسنل لاء ہیں جو انہیں آئین کے برعکس ذات یا مذہب کی بنیاد پر حاصل ہیں، اس لئے ۱۲۵ر کروڑ ہندوستانی شہریوں کو سمجھ لینا چاہیے کہ اگر کوئی کامن سول کوڈ(Common civil code) آیا، یا کسی بھی مذہب یاذات کے لوگوں کے ذاتی حقوق میں حکومت یاعدالت نے دخل اندازی کی تو یہ ڈکٹیٹر شپ ہوگی، اور یہ ملک کو خانہ جنگی کی اور ڈھکیلنا ہوگا۔(۱)

کسی پر بھی نگاہِ شک نہ اٹھی آج محفل میں

ہمیں پر آکے کیوں ساقی کی چشمِ امتحاں ٹھہری

---

(۱) منقول

قبائلی خود کو ہندو نہیں مانتے

پوجاپاٹ اور غیر اسلامی (ہندوانہ) مذہبی طرز عبادات کے باوجود یہ آدی واسی یا قبائلی طبقے اپنے آپ کو ہندو مذہبی قوانین یا پرسنل لاء کے تابع بھی نہیں رکھتے، کیونکہ وہ اپنے آپ کو ہندو مانتے ہی نہیں۔لہٰذا بظاہر یکساں سول کوڈ ملک میں رائج کرنے کا ڈھونگ رچا کر ملک کی فسطائی حکومت نے مسلم پرسنل لاء کو ہی ختم کرنے کی جو سازش رچی ہے، لگتا ہے کہ اس کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ یہی خانہ بدوش قبائل nomadic tribes بننے والے ہیں، کیونکہ وہ بھی یکساں سول کوڈ کو اپنی ثقافت اور سماجی روایات کے لئے بڑا خطرہ مانتے ہیں۔اسی لئے انہوں نے اپنی ثقافت کے تحفظ، برہمن واد کے غلبے کی روک تھام اور یکساں سول کوڈ کی مخالفت اور قانونی مہم جوئی کے لئے با قاعدہ راشٹریہ آدی واسی پریشد تشکیل دے رکھا ہے، جس کے بینر تلے وہ آخری دم تک مخالفانہ جد و جہد جاری رکھنے کا عہد کر رہے ہیں اس پریشد کے نیشنل کنوینر پریم کمار گیدم کا استدلال ہے کہ آدی واسی قبائلی ملک کے دستور کے آرٹیکل ۲۴۴ اور ۳۴۲ کی تشریح کے اعتبار سے ہندو نہیں ہیں، جبکہ مدھیہ پردیش ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے فیصلوں سے بھی یہ ثابت شدہ بات ہے کہ ہندوازم سے آدی واسیوں کا کوئی لینا دینا نہیں ہے، اسی لئے ان پر ہندو میریج ایکٹ، ہندو کوڈ بل وغیرہ جیسے قوانین کا اطلاق نہیں ہوتا، یہاں تک کہ ان پر اسپیشل میریج ایکٹ بھی لاگو نہیں ہوتا۔

مسلم پرسنل لاء کو کسی بھی قانون سے نہیں چھیڑا جائے گا

حضرت مولانا خالد سیف اللہ صاحب رحمانی دامت برکاتہم لکھتے ہیں کہ: ہندوستان میں جس وقت انگریزوں کے خلاف جد و جہد جاری تھی اور ہندوستان کے تمام شہری اس بدیشی دشمن کے خلاف سیسہ کی دیوار بنے ہوئے تھے، اس وقت فکر و نظر، تہذیب، قومی مفادات، زبان، نسل اور جغرافیائی تعلق میں تفاوت کے باوجود جو چیز ان سب کو سیسہ پگھلائی ہوئی

دیوار بنائے ہوئی تھی ، وہ یہی تصور تھا کہ آزادی کے بعد یہ ملک سیکولرزم کی راہ پر چلے گا، ہر مذہب، ہر تہذیب اور ہر جماعت سے تعلق رکھنے والوں کو اپنی انفرادی زندگی میں آزادی حاصل ہوگی، مسلمان جو مذہبی اعتبار سے زیادہ باحمیت واقع ہوئے ہیں، ممکن نہ تھا کہ وہ اس تیقن کے بغیر اس لڑائی میں شریک ہوتے، آزادی سے پہلے ہمیشہ 'قومی لیڈران' مسلم پرسنل لاء کے تحفظ اور اس میں عدم مداخلت کا یقین دلاتے رہے، مہاتما گاندھی جی نے خود بھی گول میز کانفرنس لندن ۱۹۳۱ء میں پوری وضاحت وصراحت کے ساتھ کہا تھا : ''مسلم پرسنل لا کو کسی بھی قانون کے ذریعہ چھیڑا نہیں جائے گا'' جنگ آزادی کے سالار مولانا ابوالکلام آزادؒ نے فرمایا:

''نہ تو کانگریس ہی کا یہ مقصد ہے اور نہ مسلمان ہی اس مقصد سے قیامت تک متفق ہوسکتے ہیں کہ ہندوستان سے مسلم کلچر، مسلم تہذیب اور مسلم خصائص ختم ہوجائیں اور وہ ہندستان کی متحدہ قومیت میں جذب ہو کر جرمن یا انگریز قوم کی طرح ہندوستانی قوم کے سوا کچھ نہ رہیں''۔

۱۹۳۸ء میں ہری پور میں کانگریس نے اعلان کیا : ''اکثریت کی طرف سے مسلم پرسنل لاء میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کی جائے گی'' پھر ۱۹۳۷ء میں ''شریعت اپلی کیشن ایکٹ'' پاس ہوا، جس نے زیادہ صراحت کے ساتھ مسلم پرسنل لاء کو آئین کا حصہ بنادیا۔

پھر آزادی حاصل ہونے کے بعد جب ہندوستان کا دستور بنا، تو قانون کے سب سے اہم حصہ 'بنیادی حقوق' کی فہرست میں ایسی دفعات بھی رکھی گئیں، جن سے ''مسلم پرسنل لاء'' کی حفاظت ہوتی ہے، دستور ہند کی آرٹیکل ۲۵ میں مذہبی قوانین کے تحفظ کی ضمانت دی گئی ہے؛ چنانچہ دفعہ ۲۵ کا ترجمہ حسب ذیل ہے:

۲۵(۱) : پبلک آرڈر، اخلاقیات، صحت عامہ نیز باب ۳: میں دی ہوئی دیگر دفعات کے تابع ہر شہری کو مذہبی عقائد پر قائم رہنے، اس پر عمل کرنے اور اس کی تبلیغ کی اجازت ہوگی۔

دفعہ ۲۵ میں دی گئی مذہبی اُمور کی اس ضمانت سے مذہبی رسوم اور ہندوؤں میں اچھوتوں کے ساتھ امتیازی سلوک کو مستثنیٰ کرنے کی غرض سے دو اور تشریحی دفعات بڑھا دی گئیں، جو حسب ذیل ہیں:

۲۵ (۲) (الف) کسی اقتصادی، مالی، سیاسی یا دیگر سیکولر مسئلہ میں جس کا تعلق مذہبی رسم سے ہو، پابندی عائد کرنا یا اسے ریگولیٹ کرنا۔

۲۵ (۲) (ب) سوشیل ریفارم کی خاطر پبلک ہندو اداروں کے دروازے تمام ہندوؤں کے لئے کھولنے کے سلسلہ میں اقدام کرنا۔

اس سے معلوم ہوا کہ مذہبی اُمور میں حکومت بالکل دخل انداز نہ ہوگی، ہاں اس سے صرف یہ صورت مستثنیٰ ہے کہ کوئی چیز اصلاً مذہبی ہونے کے بجائے کسی مذہب سے تعلق رکھنے والوں کے درمیان ایک رسم کے طور پر مروج ہو، مثلاً: جہیز، تلک وغیرہ، اس میں حکومت مداخلت کر کے ظلم کی روک تھام کر سکے گی، دوسرے: ''اچھوتوں'' کے سلسلے میں جو امتیازی سلوک روا رکھا جاتا ہے، اس کا سد باب کرے گی اور وہ مذہبی حق متصور نہ ہوگا۔

پھر ان ''بنیادی حقوق'' کو ناقابل تنسیخ بنانے کے لئے دستور کی آرٹیکل ۱۳ (۲) میں یہ بات صاف کر دی گئی کہ حکومت کوئی ایسا قانون نہیں بنا سکتی، جو باب ۳: میں دیئے ہوئے بنیادی حقوق کے خلاف ہو، یا اس میں کمی کرے۔۔۔اس طرح مسلم پرسنل لا کا تحفظ (جس کا تعلق مسلمانوں کے رسوم و رواج سے نہیں ہے؛ بلکہ ان کے اعتقادات اور اسلامی تعلیمات کی بنیادوں... قرآن و حدیث ... سے ہے) نہ صرف مسلمانوں کا بنیادی حق قرار پایا؛ بلکہ ناقابل تنسیخ ٹھہرا۔

یکساں سول کوڈ کا فتنہ کہاں سے پھوٹا؟

اس بنیادی حق کے ساتھ ملک کے لئے جو رہنما اُصول وضع کئے گئے، اس کی دفعہ (۴۴) یوں رکھی گئی: ''(۴۴) ریاست کوشش کرے گی کہ پورے ملک میں شہریوں

کے لئے یکساں شہری قانون ہو“ ظاہر ہے یہ دفعہ، دفعہ (۲۵) سے متصادم ہے، دفعہ ۲۵ کا تقاضا ہے کہ ہر مذہب کے ماننے والوں کے لئے ان کے مذہب کے مطابق قوانین ہوں ،جب کہ یہ دفعہ سب کے لئے یکساں قانون وضع کرنے کی متقاضی ہے اور اس کا صاف مطلب ہے کہ حکومت کبھی بھی مسلم پرسنل لا یا کسی دوسرے ”مذہبی پرسنل لا “ پر دست درازی کر سکتی ہے۔

چنانچہ اس دفعہ پر مختلف مسلم ممبرانِ پارلیمنٹ جناب محمد اسماعیل صاحب، جناب بی پوکر صاحب، جناب نظیر الدین احمد صاحب اور جناب محبوب علی بیگ صاحب نے تنقید کی اور اس سے مسلم پرسنل لا کو مستثنیٰ رکھنے کا مطالبہ کیا، جناب نظیر الدین صاحب نے کہا:

انگریز ۱۷۵ برس میں جو نہ کرسکے، یا جس کے کرنے سے گھبراتے رہے، اسی طرح مسلمانوں نے ۵۰۰ سالہ دورِ حکومت میں جو کچھ کرنے کی ہمت نہیں کی، ہمیں ریاستوں کو اتنا اختیار نہ دینا چاہئے کہ وہ سب کچھ بیک وقت کر گزریں۔

مگر ڈاکٹر امبیڈکر (چیرمین دستور ساز اسمبلی) نے ایک نہ سنی؛ البتہ مسلمانوں کو تسلی دینے کے لئے کہا:

کوئی حکومت اپنے اختیارات کو اس طرح استعمال کر کے مسلمانوں کو بغاوت پر آمادہ نہیں کر سکتی، میرے خیال میں اگر کسی نے ایسا کیا تو ایسی حکومت پاگل ہی ہوگی، مگر یہ معاملہ اختیارات کے استعمال کا ہے نہ کہ بذات خود اختیارات کا۔

رہنما اُصول کی یہی دفعہ ہے جس کے بطن سے ”یکساں سول کوڈ“ کا فتنہ پھوٹا ہے اور جس کی صدائے بازگشت سننے میں آتی رہتی ہے۔

آرٹیکل ۲۵

دستور میں fundamental Rights کے قبیل سے آرٹیکل ۲۵ و ۲۶ بھی ہیں جس میں ملک کے تمام شہریوں کو اپنے عقائد اور مذہب پر نہ صرف عمل بلکہ ان کی ترویج و

تبلیغ کا حق بھی حاصل ہے اور مذہبی اداروں کا قیام بھی ہے، یہ حق بنیادی حق ہے جو ناقابل تنسیخ ہے، مگر اسی دستور میں آگے چل کر رہنما اصول کو جہاں متعین کیا گیا ہے وہاں آرٹیکل ۴۴ میں یہ بھی کہہ دیا ہے کہ حکومت ہند کی ذمہ داری ہوگی کہ وہ ایک ایسا ماحول بنانے کی کوشش مسلسل کرتی رہے کہ بالآخر ملک کے تمام طبقات ایک یکساں سول کوڈ کو قبول کرنے پر آمادہ ہو جائیں۔

سپریم کورٹ نے آرٹیکل ۲۵ میں موجود کسی بھی مذہب کو اپنانے کے حق کی تفسیر کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ : ملک کے ہر باشندے کو بے روک ٹوک مذاہب کی وہ رسومات ادا کرنے کی آزادی ہے جن کے بغیر وہ مذہب نامکمل ہے، اس کو Essential Practices Doctrine بھی کہا جاتا ہے، یعنی وہ رسمیں جو کسی بھی مذہب کے لحاظ سے اشد ضروری ہیں ان کی پریکٹس (practice) سے آئینی طور پر حکومت کسی بھی قانون کے ذریعے محروم نہیں کر سکتی، غور کرنے کی بات یہ ہے کہ کیا پارلیمنٹ کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ یہ فیصلہ کرے کہ کسی مذہب کا کون سا عمل اس مذہب کی نظر میں ضروری ہے اور کون سا غیر ضروری؟ کیا مذہب کی تشریح کرنا منتخب سیاسی نمائندوں کا حق ہے یا مذہبی رہنماؤں کا؟ یا پھر ہر شخص کو خود پر یہ اختیار ہے کہ وہ اپنے لئے ضروری اور غیر ضروری مذہبی عقائد کا انتخاب کرے، ایسے میں کسی بھی ایک شہری قانون کی تشکیل کرنا نہایت ہی پیچیدہ اور مشکل عمل ہے۔

دفعہ ۲۵/اور دفعہ ۴۴/کا تصادم

دستور کی ان دونوں دفعات میں تعارض اس لئے پیدا ہو رہا ہے کہ دفعہ (۴۴) کا تعلق مذہبی قوانین سے جوڑا جا رہا ہے؛ حالاں کہ اس کا تعلق دراصل دفعہ (۲۵) کی اس استثنائی دفعہ سے تھا، جس میں کہا گیا ہے کہ مذہبی رسوم جن کی مذہب میں کوئی اصل نہ ہو، حکومت کی مداخلت سے ماورا نہیں ہوں گے، گویا غیر مذہبی اُمور میں ریاستوں کو دفعہ ۴۴ کے ذریعہ''

یکساں قانون سازی'' کا اختیار دیا گیا تھا۔

چنانچہ ممبئی ہائی کوٹ کے بینچ نے جو جناب عبد الکریم چھاگلا اور جناب گجند رگدکر پر مشتمل تھا مقدمہ بنام تاراسوا ماپالی میں دفعہ (۴۴) کے حدود پر مفصل رولنگ دی تھی، اس کا ایک اقتباس حسب ذیل ہے:

مذہبی رسوم، پبلک آرڈر، اخلاقیات، صحت عامہ، نیز سماجی بہبود کے خلاف ہو تو ایسے رسوم کو مفاد عامہ کے پیش نظر پس پشت ڈالا جاسکتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ مفاد عامہ (جس میں یکساں سول کوڈ کو داخل کیا جارہا ہے) کو جس چیز پر ترجیح حاصل ہے، وہ مذہبی رسوم ہیں، نہ کہ مذہبی اعتقاد اور مذہبی اعتقاد کے سرچشمہ سے پھوٹنے والے قوانین۔

اور اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ ''رہنما اُصول'' کی دفعہ (۴۴) کا تعلق مذہبی قوانین سے بھی ہے اور اس کے ذریعہ ریاستوں کو مذہبی معاملات میں بھی یکساں سول کوڈ کے نفاذ کا اختیار دیا گیا ہے تو بھی ''مسلم پرسنل لا '' کا قانونی موقف کافی مضبوط رہتا ہے، اس لئے کہ بنیادی حقوق کی حیثیت دستور کی روح اور بنیاد کی ہے، جب کہ ''رہنما اُصول'' کی حیثیت محض ایک اخلاقی ہدایت کی ہے، بنیادی حقوق کی اس اولیت اور اہمیت کو اکثر ماہرین قانون کے علاوہ ملک کے قائدین نے بھی تسلیم کیا ہے؛ چنانچہ آنجہانی جناب جواہر لال نہرو، سابق وزیر اعظم ہند نے ''بنیادی حقوق'' کی رپورٹ پر بیان دیتے ہوئے کہا:

بنیادی حق کو کسی وقتی دشواری کے تحت نہ دیکھنا چاہئے؛ بلکہ اس نقطۂ نظر سے دیکھنا چاہئے کہ آپ اسے دستور میں مستقل مقام دے رہے ہیں، بنیادی حقوق کے علاوہ دوسرے اُمور کو خواہ وہ کتنے ہی اہم کیوں نہ ہوں، اس نقطۂ نظر سے دیکھنا چاہئے کہ وہ عارضی ہیں۔

اس لئے اگر ان دونوں دفعات کے درمیان تعارض تسلیم کرلیا جائے تو بھی مسلم پرسنل لاء کے تحفظ کا تعلق چوں کہ ''بنیادی حقوق'' سے ہے، اس لئے وہ مقدم ہے اور قابل ترجیح

ہے۔

حکومت اور اقلیت دشمن جذبات

اب اس پس منظر میں لاء کمیشن کے اس سوال نامہ پر غور کیجئے جس کا مقصد یکساں سول کوڈ کے لئے راستہ نکالنا ہے، اس سوال نامہ کا مضمون خود کمیشن کی بد دیانتی کا مظہر ہے اور وہ کہتا ہے کہ یکساں سول کوڈ کے حق میں جواب دیا جائے، اور ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ حکومت کے اشارہ پر ہو رہا ہے، حکومت کے اقلیت دشمن جذبات کا اظہار تو خود اس بیان سے ہو گیا جو اس نے طلقات ثلاثہ اور تعدد ازدواج کے سلسلہ میں پچھلے دنوں سپریم کورٹ میں داخل کیا ہے، جو حکومت اکثریت کے مذہبی تصورات کو اس قدر فروغ دے رہی ہے کہ لوگوں کو گائے کا پیشاب پلانے اور گوبر کھلانے کے لئے بھی بالواسطہ طور پر تیار ہے اور اس پر پوری دنیا وطن عزیز کا مذاق اڑا رہی ہے، لیکن مسلمانوں کے مذہبی تشخصات ان کے آنکھوں میں چبھ رہی ہیں۔

ہمارے ملک کی معزز عدالتوں کا بھی یہ حال ہے کہ وہ اپنے افکار، اپنے جذبات اور سماجی زندگی سے متعلق اپنے تصورات کو قانون پر فوقیت دینے لگی ہیں، اسی کا نتیجہ ہے کہ عدالتیں کبھی از خود طلاق اور تعدد ازواج کے مسئلہ کو اُٹھاتی ہے، کبھی نفقۂ مطلقہ کے مسئلہ کو اور بار بار حکومت کو یکساں سول کوڈ کے سلسلہ میں یاد دلاتی ہیں، کبھی عدالت کو یہ توفیق نہیں ہوئی کہ وہ مسلم خواتین کی بے آبروئی کے قضیہ کو اُٹھائے اور حکومت کو اس کی ذمہ داری یاد دلائے، مطلقہ سے زیادہ دشوار صورت حال بیوہ عورتوں اور یتیم بچوں کی ہوتی ہے، عدلیہ کو خیال نہیں ہوا کہ وہ فسادات میں بیوہ اور یتیم ہو جانے والے سینکڑوں؛ بلکہ ہزاروں عورتوں اور بچوں کے سلسلہ میں حکومت کو ان کی ذمہ داری یاد دلائے اور مجرموں کے خلاف قدم اُٹھائے مسلم عورت کی پسماندگی کا اصل سبب طلاق نہیں ہے؛ بلکہ مسلمانوں کی بے روزگاری ہے، عدلیہ نے کبھی یہ نہیں کہا کہ اس مظلوم طبقہ کو روزگار کے مواقع دیئے جائیں، عورتوں کے لئے

سب سے تکلیف دہ صورت حال ان کے شوہروں اور گھر کے مردوں کی نشہ خوری سے پیدا ہوتی ہے اور رہنما اُصول میں یہ بات بھی موجود ہے کہ ملک میں مکمل نشہ بندی ہونی چاہئے؛ لیکن اس کے بارے میں نہ حکومت سوچتی رہے، نہ عدلیہ ہدایت دیتی ہے، نہ دانشوروں میں کوئی فکر پیدا ہوتی ہے؛ حالاں کہ طلاق کے واقعات کا پیش آنا بہت ہی بُری بات ہے؛ لیکن مسلم معاشرہ میں اس کا تناسب ہندوؤں سے کم ہے اور بہت سی طلاقیں بیوی کے مطالبہ یا اس کی رضامندی سے ہوتی ہیں اور زیادہ تر حالات میں عورت طلاق کے بعد بے سہارا نہیں ہوتی، اس کے والد، بیٹے، بیٹیاں اور بھائی، بہن اس کی کفالت کرتے ہیں؛ لیکن عدالت کی ساری توجہ اسی ایک مسئلہ پر ہے۔

یونیفارم سول کوڈ کیوں درست نہیں؟

حقیقت یہ ہے کہ یونیفارم سول کوڈ، مختلف وجوہ سے ہمارے ملک کے لئے مناسب نہیں ہے، ایک تو اس سے اقلیتوں کے مذہبی حقوق متاثر ہوں گے، جو دستور کی بنیادی روح کے خلاف ہے، دوسرے : یکساں قانون ایسے ملک کے لئے تو مناسب ہوسکتا ہے، جس میں ایک ہی مذہب کے ماننے والے اور ایک ہی تہذیب سے تعلق رکھنے والے لوگ بستے ہوں، ہندوستان ایک تکثیری سماج کا حامل ملک ہے، جس میں مختلف مذاہب کے ماننے والے اور مختلف ثقافتوں سے تعلق رکھنے والے لوگ پائے جاتے ہیں، کثرت میں وحدت ہی اس کا اصل حسن اور اس کی پہچان ہے، ایسے ملک کے لئے یکساں عائلی قوانین قابل عمل نہیں ہیں، تیسرے : مذہب سے انسان کی وابستگی بہت گہری ہوتی ہے، کوئی بھی سچا مذہبی شخص اپنا نقصان تو برداشت کرسکتا ہے؛ لیکن مذہب پر آنچ کو برداشت نہیں کرسکتا؛ اس لئے اگر کسی طبقہ کے مذہبی قوانین پر خط نسخ پھیرنے اور اس پر خود ساختہ قانون مسلط کرنے کی کوشش کی جائے گی تو اس سے مایوسی کے احساسات اور بغاوت کے جذبات پیدا ہوں گے اور یہ ملک کی سالمیت کے لئے نقصان دہ ہے، ہمارے سامنے ناگاؤں اور

میزوؤں کی واضح مثال موجود ہے کہ انھوں نے اس کے بغیر علَم بغاوت کو نہیں جھکایا کہ ان کو کچھ خصوصی رعایتیں دی جائیں، جن میں ان کے لئے اپنے قبائلی قانون پر عمل کرنے کی آزادی بھی شامل ہے؛ اس لئے حقیقت یہ ہے کہ مختلف گروہوں کو اپنے اپنے قوانین پر عمل کی اجازت دینا ملک کے مفاد میں ہے، اس سے قومی یکجہتی پروان چڑھے گی، نہ یہ کہ اس کو نقصان پہنچے گا۔

بقول مولانا عبد الرحیم قریشی صاحب مرحوم (اسٹنٹ جنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ) : ’’پرسنل لاء کے معاملات میں کسی اور قانون پر چلنے کے لئے مسلمانوں کو کہنا یا مجبور کرنا ارتداد کی دعوت نہیں تو کم از کم مذہبی احکامات کی کھلی خلاف ورزی کی دعوت ضرور ہے، بے شک کوئی مسلمان ایسی دعوت قبول نہیں کرسکتا‘‘

ہندوستان میں ’’یونیفارم سول کوڈ‘‘ کا صاف مطلب یہ ہے کہ اس ملک میں مسلمانوں کو اپنی مذہبی ہدایات کے خلاف نکاح وطلاق جیسے معاملات انجام دینے ہوں گے، وصیت اور وراثت کے معاملہ میں بھی انہیں مذہبی قانون کے بجائے دوسرے قوانین پر عمل کرنا ہوگا اسی طرح دوسرے مذہب اور رسم ورواج کے پابند لوگوں کو بھی اپنا مذہب چھوڑنا ہوگا اپنے رواج کو مٹانا ہوگا، اور نئے قانون کا پابند ہونا پڑے گا، اس طرح یونیفارم سول کوڈ واضح طور پر ’’مسلم پرسنل لاء‘‘ سے مختلف ایک قانون ہے، جس کے نفاذ کے بعد ’’مسلم پرسنل لا‘‘ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی، گویا مسلم پرسنل لاء جس کی بنیاد قرآن وسنت ہے اور یونیفارم سول کوڈ کو یکجا نہیں کیا جاسکتا۔ (۱)

یہ صرف مسلمانوں کا مسئلہ نہیں ہے!

راشٹریہ آدی واسی پریشد کے قومی کنوینر پریم کمار گیدم کا کہنا ہے کہ سرکاری سطح پر یکساں

---

(۱) بحوالہ: مسلم پرسنل لا اور بعض غلط فہمیاں

سول کوڈ کی راہ میں قدم بڑھانا کسی مخصوص قوم، طبقے یا پھر صرف مسلمانوں اور ان کے پرسنل لاء کا مسئلہ نہیں ہے، اس کا سب سے بڑا اور اصل شکار تو ملک میں الگ الگ شناخت کے ساتھ بسنے والے ۶.۷۴۳ طبقات اور قبائل ہونگے، جن کے اپنے قبائلی پرسنل لاء بھی ختم ہو جائیں گے جو کہ ان کی شادی بیاہ، پیدائش اور موت کے مسائل پر لاگو ہوتے ہیں اور اگر ایسا ہوا تو پھر ان کا تہذیبی ورثہ بالکل تباہ و برباد ہو جائے گا اور اس کے نتیجے میں ملک کی سالمیت ہی خطرے میں پڑ جائے گی۔

مسلمانوں کو تو یونیفارم سول کوڈ پر اعتراض ہے ہی؛ لیکن اگر غور کیا جائے تو عملی طور پر خود اکثریتی فرقہ بھی اس کو قبول نہیں کرے گا، ہندوؤں کی مختلف ذاتیں ہیں اور نکاح وغیرہ کے سلسلہ میں ان کے الگ الگ طریقے ہیں، ایسا نہیں ہے کہ ملک کے سارے ہندوؤں کا ایک ہی طریقہ ہو، حد تو یہ ہے کہ وہ اپنے بنیادی عقائد اور عبادات کی باتوں میں بھی یکساں نہیں ہیں، کوئی مورتی پوجا کا قائل نہیں ہے، کوئی قائل ہے، کوئی راون کو بُرا بھلا کہتا اور رام کو پوجتا ہے، کوئی رام کو بُرا بھلا کہتا ہے اور راون کی پرستش کرتا ہے، خود نکاح کے سلسلہ میں دیکھیں کہ شمالی ہند میں ماموں اور بھانجی کے درمیان نکاح کا تصور نہیں؛ لیکن جنوبی ہند میں بہن کا اپنے بھائی پر حق سمجھا جاتا ہے کہ وہ اس کی بیٹی سے نکاح کرلے، قبائلیوں کے یہاں خاندانی رسم و رواج بالکل مختلف ہیں، آج بھی بعض قبائل میں ایک مرد ایک درجن سے زائد عورت سے نکاح کرسکتا ہے، یہاں تک کہ ابھی بھی ایسی رسمیں پائی جاتی ہیں کہ ایک عورت ایک سے زیادہ مرد کے نکاح میں ہوتی ہے، جس ملک میں مذاہب اور تہذیبوں کا اس قدر تنوع پایا جاتا ہو، وہاں ایک ہی قانون تمام گروہوں کے لئے کیسے مناسب ہوسکتا ہے؟

یونیفارم سول کوڈ سے قومی یکجہتی قائم ہوگی؟

جو لوگ یکساں سول کوڈ کے وکیل ہیں، وہ بنیادی طور پر دو باتیں کہتے ہیں: ایک یہ کہ اس سے قومی یکجہتی پیدا ہوگی، دوسرے: جب یورپ میں تمام قوموں کے لئے یکساں

قانون ہوسکتا ہے تو ہندوستان میں کیوں نہیں ہوسکتا؛ لیکن اگر غور کیا جائے تو یہ دونوں ہی باتیں غلط ہیں، قانون سے قومی یکجہتی پیدا نہیں ہوتی، قومی یکجہتی، رواداری، تحمل اور ایک دوسرے کے معاملہ میں عدم مداخلت سے پیدا ہوتی ہے، دنیا کی دونوں جنگ عظیم بنیادی طور پر ایسی دو قوموں کے درمیان ہوئی ہے، جن کا مذہب ایک تھا، جن کی تہذیب ایک تھی، جن کا قانون اور طرز زندگی ایک تھا، یہ ساری وحدتیں جنگ کو روکنے اور قومی وحدت پیدا کرنے میں ناکام رہیں، خود مسلم ممالک میں دیکھئے کہ عراق و ایران، شام و افغانستان کے مختلف گروہوں کے درمیان اس کے باوجود جنگیں ہو رہی ہیں کہ وہ بنیادی طور پر ایک ہی مذہب اور ایک ہی قانون کی حامل ہیں، ہندوستان ہی کو دیکھئے کہ یہاں مختلف راجاؤں کے درمیان جنگوں کی ایک طویل تاریخ ہے، یہ سب ایک ہی طریقہ زندگی پر چلنے والے لوگ تھے؛ لیکن یہ وحدت ان کو جوڑ نہیں پائی اور آج بھی فرقہ وارانہ فسادات اس لئے نہیں ہوتے کہ مسلمانوں کا معاشرتی قانون الگ ہے اور ہندوؤں کے خاندانی رسوم و رواجات الگ ہیں؛ بلکہ اس کے برعکس مذہبی قانون سے ہٹ کر جب نوجوان لڑکے اور لڑکیاں دام محبت میں گرفتار ہو کر بین مذہبی شادی رچاتے ہیں تو اس سے فرقہ وارانہ تناؤ پیدا ہوتا ہے اور قومی یکجہتی پارہ پارہ ہو جاتی ہے؛ اس لئے یہ سوچنا قطعاً غلط ہے کہ قانون کی وحدت کی وجہ سے قومی یکجہتی پیدا ہوگی، ویسے بھی عائلی زندگی کے علاوہ تمام قوانین میں پہلے سے یکسانیت موجود ہے؛ لیکن کیا یہ یکسانیت قومی اتحاد کو برقرار رکھنے میں کافی ثابت ہو رہی ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ قومی یکجہتی اس بات سے پیدا ہوگی کہ ہر گروہ کو اپنے مذہب پر عمل کرنے اور اپنی تہذیب کو پروان چڑھانے کا موقع دیا جائے، اس سے ہر گروہ میں اطمینان ہوگا، وہ محسوس کریں گے کہ وہ اس ملک میں برابر کے شہری ہیں، اس سے حب الوطنی میں اضافہ ہوگا، احساس محرومی ختم ہوگا، بھائی چارہ کا ماحول پیدا ہوگا اور یہی قومی یکجہتی ہے۔

کیا یکسانیت ممکن ہے؟

ہمیں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ ہر چیز میں یکسانیت اور وحدت پیدا کرنا ممکن نہیں ہے، اگر آپ قانون ایک کر بھی دیں تو ملک میں جو مختلف تہذیبی اور ثقافتی گروہ ہیں ،جن کے لباس و پوشاک، رہن سہن، خوشی وغم کے اظہار کے طریقے، زندگی گزارنے کے انداز، سماجی رسوم ورواجات الگ الگ ہیں اور اس کی جڑیں ان کے مذہب، موسم جغرافیائی محل وقوع، خاندانی روایات اور نسلی خصوصیات میں پیوست ہیں، کیا ان کو بھی ختم کیا جاسکتا ہے؟ پھر یہ بات قابل غور ہے کہ مذہب، تہذیب اور زبان کا یہ تنوع کوئی عیب ہے یا یہ اس ملک کا حسن ہے؟ گلاب کا ایک پھول بھلا لگتا ہے یا مختلف پھولوں کا گلدستہ؟ پھول کا ایک پودا خوبصورت نظر آتا ہے، یا طرح طرح کے پودوں پر مشتمل پھلواری؟ ظاہر ہے کہ جو خوبصورتی اس تنوع میں ہے، وہ خوبصورتی اس وحدت میں پیدا نہیں ہوسکتی، جس کے پیچھے جبر اور دباؤ کا دخل ہو، ہندوستان کو اس کے معماروں نے گلدستہ بنایا ہے نہ کہ ایک پھول، اس ملک کے سینچنے والوں نے اس کو نوع بہ نوع درختوں کا ایک باغ سدا بہار بنایا ہے نہ کہ صرف ایک ہی طرح کے درختوں کا باغیچہ، اس کے بنانے والوں کے ذہن میں تھا کہ یہ ملک ایک چراغ ہمہ رنگ ہو، یہی ہمہ رنگی اس کا حسن اور یہی تنوع اس کی پہچان ہے۔

یورپی ممالک اور سول کوڈ

یورپ کی جو مثال ہندوستان کے لئے پیش کی جاتی ہے، وہ بالکل بے محل ہے ہندوستان اتنا وسیع ملک ہے کہ پورا یورپ اس کے ایک حصہ میں سما جائے، اور ہندوستان کی آبادی اتنی کثیر ہے کہ شاید پورا یورپ مل کر بھی اس کی ہمسری نہ کرسکے؛ اگر اس معاملہ میں ہم کو دوسرے ملک کو مثال بنانا ہی ہے تو امریکہ کو بنانا چاہئے، جو دنیا کی دوسری سب سے بڑی جمہوریت ہے اور ہندوستان ہی کی طرح ایک ملٹی کلچر (multi culture)

معاشرہ ہے، یہاں پر ریاست میں الگ الگ پرسنل لاء نافذ ہے، یہاں تک اگر ایک ایسی ریاست کا شہری دوسرا نکاح کرنا چاہتا ہے جہاں دوسری شادی کی اجازت نہیں تو وہ دوسری ایسی ریاست میں جا کر دوسری شادی کرتا ہے جہاں اس کی ممانعت نہیں ہے۔

اس لئے ہندوستان جیسے ملک کی سالمیت اور قومی یکجہتی اسی بات میں مضمر ہے کہ اس میں تنوع کو برقرار رکھا جائے اور ایسی وحدت پر زور نہ دیا جائے، جو اتحاد کو پارہ پارہ کر کے رکھ دے۔۔۔مشرقی ملکوں اور مغربی ملکوں میں ایک بنیادی فرق یہ بھی ہے کہ مغرب میں لوگوں کا مذہب سے سنجیدہ اور جذباتی تعلق نہیں ہے؛ ان کے یہاں ایک دو تیوہاروں کے سوا مذہب سے زندگی کا کوئی رشتہ باقی نہیں رہا، مردم شماری کے ریکارڈ میں صرف خاندانی روایت کے طور پر کسی مذہب کا نام لکھا دیا جاتا ہے؛ اس لئے مذہبی قوانین کے ختم کئے جانے پر ان کا کوئی ردعمل نہیں ہوتا اور یہ دراصل چرچوں کے ظالمانہ رویہ کے خلاف عوام کی بغاوت کے نتیجے میں پیدا ہونے والی بے قید آزادی کا نتیجہ ہے، جس کی ایک کڑوی تاریخ ہے، ہندوستان کی یہ صورت حال نہیں ہے، ہندوستان میں بسنے والے لوگ مذہب سے جذباتی تعلق رکھتے ہیں؛ اسی لئے جب ۱۹۵۶ء میں ہندوؤں کے لئے باضابطہ قانون بنا تو خود صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرشاد اس سے دل برداشتہ تھے، اور اسی لئے ہندوؤں سے متعلق قوانین میں ہر جگہ اس بات کو شامل کرنا پڑا کہ اگر کہیں مقامی رسم و رواج اس کے خلاف ہو تو اس کو ترجیح ہوگی۔

سیکولر ملک ہونے کا مطلب کیا ہے؟

یکساں سول کوڈ کے حق میں ایک بات یہ بھی کہی جاتی ہے کہ ہندوستان ایک سیکولر ملک ہے اور سیکولر ملک میں مذہبی قوانین کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے۔۔۔یہ بھی محض غلط فہمی ہے، سیکولرازم کا کوئی ایک مفہوم متعین نہیں ہے؛ بلکہ مختلف ملکوں میں وہاں کے حالات اور مصالح کے لحاظ سے اس کا مفہوم متعین کیا گیا ہے، سیکولرازم کا ایک مفہوم وہ ہے، جو فرانس نے

اختیار کیا ہے، جس کی بنیاد مذہب کی مخالفت پر ہے، جو چاہتا ہے کہ کوئی مذہبی شناخت باقی نہ رہے تو بہتر ہے، جو اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ انسان اپنی زندگی کے کسی بھی شعبہ میں مذہبی ہدایات پر عمل کرے، سیکولرازم کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ حکومت کا کوئی مذہب نہ ہو، سرکاری طور پر کسی خاص مذہب کی پشت پناہی نہ ہو؛ لیکن ملک کے ہر شہری کو اپنی نجی زندگی میں مذہب پر عمل کرنے کی گنجائش ہو، بیشتر مغربی ممالک میں اسی مفہوم کے اعتبار سے سیکولرازم کو اختیار کیا گیا ہے اور ہندوستان میں بھی اسی کو برتا گیا ہے، نیز اسی کے مطابق دستور کی تدوین عمل میں آئی ہے؛ اس لئے یہ بات بالکل بے محل ہے کہ چوں کہ ہندوستان ایک سیکولر ملک ہے؛ اس لئے یہاں عائلی زندگی سے متعلق مذہبی قوانین کی گنجائش نہیں۔

بی، جے، پی کا نا معقول ایجنڈا

یہ بات بھی بہت عجیب لگتی ہے کہ بی، جے، پی نے یونیفارم سول کوڈ کو اپنے ایجنڈے میں رکھا ہے، یہ فرقہ پرست پارٹی بنیادی طور پر برہمنی فکر کی نمائندہ ہے اور آر، ایس، ایس، کا سیاسی بازو ہے، جو ہندوستان میں 'منوواد' کو واپس لانا چاہتی ہے، یہ اپنے آپ کو ہندوؤں کے حقوق کا محافظ قرار دیتی ہے، اگر اس نے ایسے مسائل کو اپنی فہرست میں رکھا ہے، جن میں ہندوؤں اور دوسری اقلیتوں کے مفادات میں ٹکراؤ ہو، یا جن کا مقصد ہندوؤں کی بالا دستی قائم رکھنا ہو تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے؛ لیکن مسلم پرسنل لاء کا مسئلہ مسلمانوں کا آپسی مسئلہ ہے، اگر اس پر مسلمان عمل کریں تو اس سے ہندوؤں کو نہ فائدہ ہے نہ نقصان؛ بلکہ ایک طرح سے فائدہ ہے کہ مسلم پرسنل لاء کے تحت مسلمان اور ہندو کے درمیان رشتۂ نکاح قائم نہیں ہوسکتا، اس طرح وہ بات پیش نہیں آئے گی، جس سے یہ حضرات خوفزدہ ہیں اور جس کو غلط طریقہ سے انھوں نے ''لَو جہاد'' کا نام دے رکھا ہے، حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں سے نفرت اور اقلیتوں کے ساتھ ظلم و ناانصافی کے سوا اس کا کوئی اور محرک نہیں ہوسکتا۔

کیا کوئی ڈرافٹ دستیاب؟

ملک کے سیاسی حلقوں میں اتنی مدت سے زیر بحث رہنے کے باوجود یہ بات حیران کرنے والی ہے کہ آج تک اس قانون کا کوئی خاکہ تجویز نہیں کیا گیا جس پر بحث کی جائے کسی بھی قانون کی افادیت جاننے کے لئے اس کا ایک مسودہ موجود ہونا ضروری ہے تاکہ اس پر کوئی تجزیہ ممکن ہو، اب تک ایسا کوئی ڈرافٹ دستیاب نہیں ہے، کچھ لوگوں کا ماننا یہ بھی ہے کہ ہندو کوڈ بل (مخلف ہندو پرسنل قوانین کا مشترکہ نام) ایک ممکنہ خاکہ ہوسکتا ہے جس پر قانون بنانے کے دوران مناسب ترمیم کی جائے، لیکن یہ خام خیالی ہی ہوگی کیونکہ ایسی کسی ترمیم کا کسی بھی پلیٹ فارم پر ذکر نہیں ہوا ہے جس سے ہندو کوڈ بل کو ہی بدل کر ایک ایسا سول کوڈ بنایا جائے جو کہ تمام طبقات کو قابل قبول ہو۔

اس ضمن میں مرکزی حکومت نے جون ۲۰۱۶ء میں لاء کمیشن کو ایک حوالہ بھیج کر "یونیفارم سول کوڈ سے منسلک معاملات" پر ایک تفصیلی رپورٹ پیش کرنے کی ہدایت دی۔ لیکن ابھی بھی کمیشن اس موضوع پر اپنی رپورٹ تیار کرنے میں ناکام رہا ہے، گزشتہ سال لاء کمیشن نے یہ اشارہ ضرور دیا تھا کہ اس کے مطابق ملک میں یونیفارم سول کوڈ لاگو کرنا بہت مشکل ہے اس لئے مختلف مذاہب کے پرسنل لاء کی اصلاح کرنے پر توجہ دینا بہتر ہوگا۔(۱)

اب اگر ہم حکومت سے مطالبہ کریں کہ پہلے اس کا خاکہ پیش کرو کہ وہ سول کوڈ کیا ہوگا؟

پھر ہم اس پر بحث کریں گے تو یقیناً حکومت ہند دباؤ میں آجائے گی، اس لئے کی ایسا کوئی خاکہ پیش کرنا ممکن ہی نہیں ہے۔ ۱۸۷۰ء میں ہی تاج برطانیہ نے اعلان کر دیا تھا کہ ہندوستانیوں کے مذہبی امور میں کوئی مداخلت نہیں کرے گی۔

کم از کم عدلیہ کو ہی حکومت ہند سے براہ راست یہ سوال کرنا چاہئے کہ اس نے دفعہ ۴۴

(۱) دی وائر، ملک فہد 2018/03/25

کی تنفیذ کے لئے کیا کیا اقدامات کئے ہیں، ملک میں سیکولر اور مشترکہ سول کوڈ کی وکالت کرنے والی تنظیموں کو بھی حکومت ہند سے مطالبہ کرنا چاہئے کہ دفعہ ۴۴ کی تنفیذ کے لئے کئے گئے اقدامات پر قرطاس ابیض جاری کرے، اور اگر اس سمت ابھی تک کچھ نہیں ہوا ہے تو پھر اس کا مطلب سمجھنا چاہیئے کہ حالات نے ثابت کر دیا ہے کہ یکساں سول کوڈ کا نفاذ ایک ملی جلی تہذیب والے ملک میں ناممکن الحصول امر ہے اور حکومتیں خود بھی اس قسم کے کوڈ بنانے اور ان پر عمل پیرائی کرانے سے عاجز ہیں، چنانچہ مسلم تنظیموں سمیت ملک میں قیام امن اور سماجی انصاف کے لئے کام کرنے والی تمام تنظیموں کو مطالبہ کرنا چاہئے دستور کے رہنما اصولوں کی دفعہ ۴۴ کو فی الفور حذف کیا جائے۔

واقعہ یہ ہے کہ جب تک دستور میں دفعہ ۴۴ موجود ہے اور جب تک دفعہ ۱۴ اور ۱۵ میں ترمیم نہیں کی جاتی اور دفعہ ۲۵ اور ۲۶ کو غیر مشروط نہیں کیا جاتا تب تک ہندستان میں مسلمانوں کی عائلی نظام پر تلوار لٹکتی رہے گی، فعال ومتحرک نیز مرکزی تنظیم جمعیۃ علماء ہند ومسلم پرسنل لاء بورڈ کے ذمہ داران کو چاہئے کہ وہ پتوں کو چھوڑ کر جڑوں کی بیخ کنی کی تحریک کا آغاز کریں۔

اور عدالت عظمی سے یہ اپیل کریں اگر کامن سول کوڈ لانا ہو تو ہندوؤں کی شادی کوڈ کو منسوخ کرے، سکھوں سے کرپال رکھنے کو منع کرے، جینیوں کو ننگا رہنے سے روکے، مذہبی مقامات پر نشہ خوری پر پابندی لگائے، کیونکہ یہ سب بھی آئینی دفعات کے مخالف ہیں لیکن ان سبھوں کو مذھبی معاملات بتا کر اجازت دی گئی ہے۔(۱)

ضمیر کے سوداگر

صرف بی، جے، پی کا رونا کیوں کر رویا جائے؟ افسوس تو انگلی پر گنے جانے والے ان چند نام نہاد مسلمانوں پر ہے، جو فرقہ پرست اور اسلام دشمن عناصر کا آلۂ کار بن کر مسلم پرسنل لاء

(۱) http://mazameen.com/?p=12469 مہدی حسن عینی قاسمی

میں تبدیلی کی بات کرتے ہیں، میں ان کی مجبوری سے اچھی طرح واقف ہوں، وہ دراصل اپنی بے روزگاری کا حل نکالنا چاہتے ہیں؛ کیوں کہ جو لوگ صلاحیت کی بنا پر نہیں؛ بلکہ خوشامد کی بنا پر سرکاری مناصب حاصل کرتے ہیں، وہ چاہے عمر کے کسی مرحلہ میں ہوں، اس سے محروم ہو کر بے قرار ہو جاتے ہیں، کیا کہا جائے کہ اس وقت ہر چیز کی قیمت بڑھتی جارہی ہے، انسان اپنی ضروریاتِ زندگی خریدنے سے عاجز ہوتا جارہا ہے؛ لیکن ایک چیز ہے جو سستی ہوتی جارہی ہے، سستی سے سستی اور ارزاں سے ارزاں تر، اور وہ ہے کچھ لوگوں کا ضمیر، یہ ضمیر کے سوداگر ہیں اور کوڑیوں میں اپنا مال بیچتے ہیں، ان کے لئے ہدایت ہی کی دُعا کی جاسکتی ہے۔ وباللہ التوفیق وھو المستعان (۱)

مسلمانوں کا شریعت کے ساتھ سلوک

یہ حقیقت ہے کہ شریعت پر ہونے والے بیرونی حملے اسی وقت کامیاب ہوتے ہیں جب اندرون مسلم معاشروں میں خود مسلمان شریعت پر عمل کرنا چھوڑ دیتے ہیں، سپریم کورٹ یا دیگر فسطائی طاقتوں کو شریعت میں تبدیلی کے مطالبہ کا موقع اسی وقت ملتا ہے جب خود مسلمان اپنے نزاعات کو قرآن وشریعت کی روشنی میں حل کرنے اور قرآن وشریعت کا فیصلہ قبول کرنے کے بجائے عدالتوں میں لے جاتے ہیں، حالیہ طلاق ثلاثہ کا مسئلہ بھی مسلمانوں کے غیر شرعی طرزِ عمل کے سبب پیدا ہوا، سائرہ بانو یا دیگر چند خواتین نے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹا کر طلاق ثلاثہ کو کالعدم قرار دینے کی جو درخواست کی ہے اس کا اصل محرک ان کے شوہروں کا غیر شرعی طرزِ عمل تھا، کیا یہ حقیقت نہیں کہ اس وقت عام مسلمان طلاق کا مطلب تین طلاق ہی سمجھتا ہے، بیشتر مسلمانوں کا خیال ہے کہ جب تک طلاق تین مرتبہ نہ کہا جائے طلاق پڑتی ہی نہیں، کیا یہ واقعہ نہیں کہ عائلی مسائل ونزاعات میں اکثر مسلمان اسلامی

---

(۱) شمع فروزاں ۲۱: ر اکتوبر ۲۰۱۶ء، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم

دارالقضاؤں سے رجوع ہونے کے بجائے عدالتوں کے چکر کاٹتے ہیں، ذرا پولیس اسٹیشنوں (stations) کا جائزہ لیجیے، ہر جگہ برقع پوش خواتین کی بھیڑ نظر آئے گی، جب دو مسلمانوں کے درمیان آپس میں نزاع پیدا ہوجائے یا میاں بیوی میں ناچاقی ہوتو کیا وہ دونوں اسلامی شریعت کے مطابق اپنے مسئلہ کو حل کرنے کے پابند نہیں ہیں؟ کیا مسلمانوں کا ہر معاملہ قرآن وسنت سے جڑا ہوا نہیں ہے؟ کیا ہم نے قرآن مجید کی وہ آیت نہیں پڑھی جس میں صاف الفاظ میں کہا گیا کہ مسلمان اس وقت تک کامل مسلمان نہیں ہوسکتے جب تک وہ اپنے معاملات میں نبی ﷺ کو حکم نہ بنائیں، اور آپ کے فیصلے کو دل سے قبول نہ کریں؟ کیا اللہ تعالیٰ نے یہ بات قسم کھا کر نہیں فرمائی؟ کیا قرآن میں خدا کے فیصلہ کے خلاف فیصلہ کرنے والوں کو کافر، ظالم اور فاسق نہیں کہا گیا؟ کیا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہم نے نہیں سنا کہ تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک کامل مومن نہیں ہوسکتا جب تک کہ اس کی خواہش اس دین وشریعت کے تابع نہ ہوجائے، جسے میں لیکر آیا ہوں۔ ”لا یؤمن أحدکم حتی یکون ھواہ تبعا لما جئت بہ“ (۱)

مسلمانو! اپنی ذمہ داری نہ بھولو

ان سارے حقائق کے باوجود ہماری شریعت سے روگردانی اور دشمنوں کی جانب سے شریعت میں مداخلت پر واویلا مچانا کہیں ہمارے منافقانہ کردار کی نشاندہی تو نہیں کررہا ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ شریعت کو دوسروں سے کہیں زیادہ اپنوں سے خطرہ ہے، خود مسلمانوں نے شریعت کو کنارے لگا دیا ہے، مسلمان خود آمادہ نہیں کہ ان کے نزاعات میں شریعت کا عمل دخل ہو، اس وقت طلاق ثلاثہ کے خلاف لوک سبھا میں جو بل پاس ہوا ہے اس مسئلہ میں حکومت کے خلاف ملت اسلامیہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن کھڑی ہوگئی ہے... مسلم قیادت کو

---

(۱) اس حدیث کے راوی ثقہ ہیں۔ ”قال ابن حجر فی ”الفتح“، رجالہ ثقات“: ۱۳/۲۸۹۔

اس پر نظر رکھنے کے ساتھ ساتھ مسلم معاشرہ کو داخلی سطح پر شریعت کا پابند بنانے کی ضرورت ہے، ہر مسلمان کو اس بات کا عہد کرنا ہے کہ وہ ازدواجی اور عائلی معاملات میں شریعت کی پابندی کرے گا، وہ چھوٹی موٹی باتوں پر طلاق کا خیال تک ذہن میں نہیں لائے گا، اگر طلاق ناگزیر ہو جائے تو طلاق کے شرعی طریقہ کے مطابق طلاق دے گا، تین طلاق دے کر دین وشریعت کا مذاق نہیں اڑائے گا، اس وقت حکومت سے اظہار برہمی کے لیے جس قدر احتجاج کیا جارہا ہے یا ریالیاں نکالی جاری ہیں، اس سے کہیں زیادہ اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم ایک ایک مسلمان کے پاس پہونچ کر اس کی ٹھوڑی پر ہاتھ رکھ کر گذارش کریں کہ بھائی طلاق، نکاح، خلع اور دیگر عائلی مسائل کا ضروری شرعی علم حاصل کرو، اور خدا کے واسطے زندگی کے ہر معاملہ میں شریعت کی پابندی کرو، جب تک مسلمان شریعت پر مضبوطی کے ساتھ عمل کر کے خود کو نہیں بدلیں گے تب تک غیروں کی جانب سے شریعت کو بدلنے کا دروازہ کھلا رہے گا، اور جس وقت مسلمان اپنے ہر مسئلہ کو اسلامی دارالقضاء سے رجوع کر کے شریعت کے مطابق حل کرنے لگیں اس طور پر کہ عدالتوں سے رجوع ہونے والے برائے نام رہ جائیں، اس وقت دشمن شریعت میں تبدیلی کے تعلق سے ہمیشہ کے لیے مایوس ہو جائیں گے، قرآن وسنت میں مسلمانوں کو تاکید کی گئی ہے کہ وہ شریعت کا تحفظ کریں، ارشاد نبوی ہے: بے شک اللہ تعالیٰ نے فرائض مشروع کئے ہیں ان کو ضائع نہ کرو اور بہت ساری چیزوں سے منع فرمایا ہے ان کی پامالی مت کرو اور احکام شرعیہ کے لئے کچھ حدود وشرائط رکھے ہیں ان سے آگے نہ بڑھو، اور بعض چیزوں کو تم پر رحم کر کے معاف کر دیا ہے غلطی سے نہیں، تم اس سلسلے میں بحث نہ کرو۔ ”إن الله فرَض فرائض فلا تضيّعوها ونهى عن أشياء فلا تَنتَهِكوها وحدّ حدودًا فلا تعتدوها وعفا عن أشياء رحمة بكم لا عن نسيان فلا تبحثوا عنها“(۱)

(۱) دارقطنی، حدیث: ۱۶۲

نیز قرآن مجید میں اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑنے کی تاکید کی گئی ہے :"واعتصموا بحبل اللہ جمیعا" کیا ہمیں معلوم ہے کہ اللہ کی رسی کیا ہے؟ اللہ کی رسی اس کی شریعت اور اس کی کتاب ہے۔(۱)

وندے ماترم کا حکم

سامراجی طاقت جو ملک عزیز پر اپنا جابرانہ تسلط قائم کر لینے کے بعد یہ منصوبہ بنا رہی تھی کہ یہاں کے باشندوں کے دین ومذہب اور تہذیب وکلچر کو بدل کر سب کو اپنے مزاج ومذاق کے سانچے میں ڈھال لے چنانچہ لارڈ میکالے نے ۷/ مارچ ۱۸۳۵ء/ کو تعلیمی کمیٹی کی صدارت کرتے ہوئے جو رپورٹ پیش کی تھی اس میں وہ صاف لفظوں میں لکھتا ہے:

"ہمیں ایک ایسی جماعت چاہئے جو ہم میں اور ہماری کروڑوں رعایا کے درمیان ترجمانی کا کام کرے اور یہ ایسی جماعت ہونی چاہئے جو خون ورنگ کے اعتبار سے ہندوستانی ہو مگر مذاق، رائے، الفاظ اور فکر کے اعتبار سے انگریز ہو"(۲)

پرائمری اسکولوں میں جن میں مسلمان بچوں کی کثیر تعداد زیر تعلیم رہتی ہے سرکاری طور پر جو ٹائم ٹیبل بھیجا جا رہا ہے اس میں یہ وضاحت کی گئی ہے کہ بچے تعلیم شروع کرنے سے پہلے "بھارت ماتا" کی تصویر پر پھول چڑھائیں گے اور "وندے ماترم" کا گیت گائیں گے اسی کے ساتھ رامائین، مہابھارت اور اپنشد کی تعلیم دی جائے گی۔ اب موجودہ حکومت کی وزارت تعلیم بھی قریب قریب اسی راستے کو اپنانے جا رہی ہے اگر چہ اس نے چند وجوہ سے اس گیت گانے کو اختیاری قرار دیا ہے لیکن سیکولر نظام کے حامل اس ملک میں اس طرح کے مذہبی گیت کے اجراء میں دراصل وہی برہمنی تہذیب کارفرما ہے جو اپنے علاوہ کسی کو برداشت نہیں کرتی۔

---

(۱) مضامین ڈاٹ کام، January 21, 2018، مولانا سید احمد ومیض ندوی

(۲) علماء حق: ۱/ ۳۹

بھارت ماتا یعنی ہندوستان کی جو فرضی تصویر بنائی گئی ہے وہ دراصل ہندو مذہب "درگا دیوی" کی تصویر ہے اس طرح سرزمین ہند کو درگا دیوی تصور کر کے اس کی عظمت وتعریف کے آگے اسکول کے سارے بچوں کو جھکنے اور اظہار عقیدت ومحبت کے طور پر پھول چڑھانے کا حکم دیا جا رہا ہے، جو مسلمانوں کے عقیدہ توحید کے لحاظ سے کھلا ہوا شرک ہے۔

اسی طرح وندے ماترم کا گیت بھی اسلامی عقائد کے لحاظ سے خالص مشرکانہ گیت ہے اس کے چند بندوں کا ترجمہ ملاحظہ کیجئے۔ ہندوستان کو مخاطب کر کے کہا جا رہا ہے:

"وندے ماترم" میں تری وندنا کرتا ہوں اے میری ماں یہ اس گیت کا مرکزی مصرعہ ہے اس کے چوتھے بند میں کہا گیا ہے : تو ہی مرا علم ہے، تو ہی مرا دھرم ہے، تو ہی میرا باطن ہے، تو ہی میرا مقصد ہے، تو ہی جسم کے اندر کی جان ہے، تو ہی بازوؤں کی قوت ہے، دلوں کے اندر تیری ہی حقیقت ہے ایک ایک مندر میں تیری ہی محبوب مورتی ہے، تو ہی درگا دس مسلح ہاتھوں والی، تو ہی کملا ہے کنول کے پھولوں کی بہار، تو ہی پانی ہے علم سے بہرہ ور کرنے والی، میں تیرا غلام ہوں، غلام کا غلام ہوں، غلام کے غلام کا غلام ہوں، اچھے پانی، اچھے پھلوں والی میری ماں میں تیرا بندہ ہوں۔"

چھٹے بند میں یہ کہا گیا ہے:

"لہلہاتے کھیتوں والی مقدس موہنی آراستہ پیراستہ، قدرت والی قائم ودائم ماں میں تیرا بندہ ہوں۔ اپنے وطن سے ہزار محبت کے باوجود ایک سچا پکا مسلمان اسے معبود اور خدا مان کر اس کی بندگی اور پوجا کبھی نہیں کرسکتا، لیکن موجودہ حکومت کا وزارت تعلیم ہندو احیاء پرستی کے نشہ میں اس قدر سرمست ہے کہ اسے نہ دستور ہند کا پاس ولحاظ ہے، نہ قانون وانصاف کی پرواہ اور نہ ہی ملک کے سیکولر روایات کا خیال وہ تو بس اس دھن میں ہے کہ کسی طرح مسلمانوں کو ہندویت میں جذب کرلے۔

ان حالات میں ہمارے سامنے بھی وہی دو راستے ہیں ایک یہ کہ ہم حالات کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں اور حکومت وقت جس سمت ہمیں لے جانا چاہتی ہے بغیر کسی مزاحمت کے ہم

اسی رخ پر چل پڑیں بالفاظ دیگر اپنے دین وعقیدہ، تہذیب وکلچر کو ترک کر کے ہندویت میں جذب ہوجائیں، ظاہر ہے کہ ایک مسلمان اپنا سب کچھ قربان کرسکتا ہے، لیکن اپنے دین ومذہب کو قربان کردے یہ نہ کبھی ہوا ہے، اور نہ آج ہوسکتا ہے۔

دوسرا راستہ یہ ہے کہ اپنے دین، اپنی تہذیب اور اپنی ملی ایک ایک روایات کی حفاظت و بقاء کے لیے اپنے اکابر واسلاف کے اسوہ کے مطابق استقامت و پامردی اور ہمت وجرأت کے ساتھ حالات کا مقابلہ کریں۔

بطور خاص حضرات علماء اور ملک کے دانشوروں کو فیصلہ کرنا ہے کہ وہ ملت کی کشتی کس سمت لے جائیں گے۔ کیونکہ خود رائی وخود پسندی کے اس دور میں بھی ملت کی زمام قیادت انھیں کے ہاتھوں میں ہے اور انھیں کے سامنے حضرات اکابر کے جہد وعمل کی مکمل تاریخ ہے اس لیے شدید ضرورت ہے کہ وہ سر جوڑ کر بیٹھیں اور وقت کے اس چیلنج کو قبول کرتے ہوئے ایثار وقربانی کی تاریخ کو پھر سے زندہ کریں۔(۱)

یہ مصرع کاش نقشِ ہر در و دیوار ہوجائے٭٭ جسے جینا ہو مرنے کے لیے تیار ہوجائے۔

جھنڈا لہرانا اور جھنڈے کے آگے جھکنا

آخیر میں یوم جمہوریہ پر جو رسومات ہوتے ہیں اس متعلق کچھ ضروری مسائل ذکر کیے جاتے ہیں:

(۱) کسی بھی ملک یا قوم کا جھنڈا نہایت اہم ہوتا ہے؛ جو پورے ملک وقوم کا خاموش نمائندہ بھی ہوتا ہے اور اس ملک کی عزت وعظمت کا نشان بھی سمجھا جاتا ہے؛ اس لئے ملک میں بسنے والے تمام شہریوں کے لئے اس کی عزت وعظمت ضروری ہوتی ہے، لیکن اس کی عظمت اگر دل میں رہے اور آدمی کو اپنے پرچم پر فخر ہو تو خیر مضائقہ ہی نہیں؛ لیکن ادھر کئی سالوں سے اس کے لئے سلامی اور جھکنا اہل اسلام کے لئے اشکال کا باعث بن گیا ہے؛

---

(۱) ماہنامہ دارالعلوم ، شمارہ 12، جلد 90 : ، ذیقعدہ 1427 ہجری مطابق دسمبر 2006ء

چنانچہ بیشتر اہل علم نے بوقت مجبوری یا حکومت کے دباؤ سے کراہت خاطر کے ساتھ اور بعض اہل علم نے بہر صورت جائز قرار دیا ہے، چنانچہ دار العلوم دیوبند کا فتوی ہے کہ: ”شریعت مطہرہ میں سلام اور جوابِ سلام سے متعلق جو کچھ احکام وہدایات ہیں وہ پرچم کی سلامی پر لاگو نہیں ہوتے، بلکہ یہ تو ایک قومی مشترکہ عمل کے قبیل سے ہے“۔(۱)

مفتیٔ اعظم ہند مفتی کفایت اللہ صاحب لکھتے ہیں ”وہ (جھنڈے کی سلامی) ایک قومی عمل ہے، اس میں اصلاح ہو سکتی ہے؛ مگر مطلقا اس کو مشرکانہ فعل قرار دینا صحیح نہیں ہے“۔(۲)

فتاوی رحیمیہ میں ہے : ”یہ محض سیاسی چیز ہے اور حکومتوں کا طریقہ ہے، اسلامی حکومتوں میں بھی ہوتا ہے، بچنا اچھا ہے، اگر فتنہ کا ڈر ہو تو بادل ناخواستہ کرنے میں مواخذہ نہیں ہوگا ان شاء اللہ“۔(۳)

فقیہ العصر مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب لکھتے ہیں : ”شرعا یہ عمل ناجائز ہے، مسلمانوں کو اس سے بچنا چاہئے؛ تاہم جہاں... مشقت کا اندیشہ ہو تو اس کے لئے کراہت خاطر کے ساتھ سلامی جائز ہوگی؛ کہ یہ ایک حاجت ہے“(۴)

جنوبی افریقہ کے مشہور عالم دین اور مفتی مولانا رضاء الحق صاحب تحریر فرماتے ہوئے لکھتے ہیں : ”یہ بات ملحوظ رہے کہ جھنڈے کو شرعی سلام نہیں کیا جاتا؛ یعنی السلام علیکم وغیرہ نہیں کہا جاتا؛ بلکہ اسے سلوٹ کہا جاتا ہے، یہ قیام تعظیمی کی طرح ہے، جو ایک عرفی اکرام اور وطن سے محبت اور وفاداری کی علامت ہے، لہذا اس میں بوقت ضرورت زیادہ قباحت نہیں“۔(۵)

ان فتاوی کی روشنی میں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ بوقت ضرورت جیسا کہ ہمارے ملک

---

(۱) فتاوی دار العلوم دیوبند: ۴/ ۵۶۹

(۲) کفایت المفتی: ۹/ ۳۶۸

(۳) فتاوی رحیمیہ: ۶/ ۲۸۸

(۴) جدید فقہی مسائل: ۱/ ۴۶۷

(۵) فتاوی دار العلوم زکریا: ۷/ ۴۴۵

ہندوستان کی جو سیاسی صورتحال ہے جھنڈے کو سلامی دینا جائز ہے، ہاں جہاں تک ہو سکے بچنے کی ممکنہ کوشش کرے؛ نیز جھنڈے کے سامنے جھکنے میں اور زیادہ قباحت ہے، اس لئے اس سے حد درجہ بچنے کی کوشش کی جائے؛ الا یہ کہ مجبوری مانع ہو۔

مسلم نیتاؤں کا مالا پرساد چڑھانا

(۲) جو مسلم نیتا اور پردھان اس فعل قبیح کو شرک جانتے ہوئے مورتیوں پر مالا وغیرہ چڑھاتے ہیں، ان کے ایمان کے چلے جانے کا خطرہ ہے؛ کیونکہ یہ رضا بالکفر کی صورت ہے، اور رضا بالکفر پر فقہاء نے کفر کا حکم عائد کیا ہے؛ لہٰذا ان کے اوپر سچے دل سے توبہ کرنی لازم ہے اور آئندہ اس قسم کی شرکت سے باز رہنے کا اللہ سے عہد و پیمان کرنا لازم ہے اور جو لوگ غیر مسلموں کے شرکیہ کاموں میں محض شرکت کرتے ہیں ان کا یہ عمل ناجائز و حرام ہے، ان پر بھی توبہ کرنا لازم ہے۔(۱)

یوم جمہوریہ کو مدارس میں چھٹی کرنا

(۳) یوم آزادی ۱۵/اگست اور یوم جمہوریہ ۲۶/جنوری کو قومی یادگار کے طور پر مدارس میں چھٹی کرنے یا مبارک باد دینے میں کوئی حرج نہیں، اس لئے کہ یہ عمل مذہبی طور پر نہیں کیا جاتا؛ بلکہ اس کا تعلق قومی مصالح سے ہے اس طرح کی مصلحت پر عمل کرنا شرعاً منع نہیں ہے!(۲) البتہ چھٹی کرنے کے بجائے طلبہ کو جمہوریت سے واقف کرانے کا مکمل نظم کیا جائے، مؤثر پروگرام کے ذریعہ تقریر مسابقہ یا محترم شخصیات سے استفادہ کیا جائے، یہ وقت کی ضرورت اور اہم کاموں میں سے ہے۔

---

(۱) فتاوی قاسمیہ: فتویٰ نمبر ۳۹/ ۱۰۶۴۳:

(۲) مستفاد کفایت المفتی: ۹/ ۴۱۷۔

۲۷؍جنوری مرگ انبوہ

Holocaust remembrance day

رسالہ کی ترتیب میں جہاں دیگر اہل قلم کی تحریرات سے استفادہ کیا گیا وہیں بیشتر مواد اردو دائرۃ المعارف ویکیپیڈیا سے بھی ماخوذ ہے، جس کے مخلص خادمین کا عاجز تہہ دل سے شکرگذار ہے۔

ہٹلر کون تھا؟

ہٹلر (۱) Adolf Hitler پیشہ سے فوجی، مصور، مصنف، انقلابی ریاست کار، سیاست دان تھا، ایڈولف ہٹلر ۲۰/اپریل ۱۸۸۹ء کو آسٹریا کے ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوا، اس کی تعلیم نہایت کم تھی، آسٹریا کے دارالحکومت ویانا کے کالج آف فائن آرٹس میں محض اس لیے داخلہ نہ مل سکا کہ وہ ان کے مطلوبہ معیار پر نہیں اترتا تھا اس کی والدہ "کلارا ہٹلر الوئس ہٹلر" کی تیسری بیوی تھی، ہٹلر کا چھ بہن بھائیوں میں چوتھا نمبر تھا، جب ہٹلر تین سال کا ہوا تو اسکا کنبہ پساؤ، جرمنی منتقل ہوگیا، آخر عمر میں اسکی والدہ ہیفلڈ (لیمبیک کے نزدیک) ایک زمین کے قطعے پر مکھیوں کی افزائش کرنے لگی، ہٹلر قریب کی ایک سرکاری اسکول میں تعلیم حاصل کی، آٹھ سال کی عمر میں ہٹلر نے موسیقی کی تعلیم میں دلچسپی لی اور چرچ میں کوائر گائے، یہاں تک کے پادری بننے کا بھی سوچا، ۳/جنوری ۱۹۰۳ء میں والد کے انتقال کے بعد ہٹلر کی تعلیمی کارکردگی میں مزید خرابی کے بعد اس کی والدہ نے اسے اپنی مرضی کی تعلیم حاصل کرنے کی اجازت دے دی جس کے بعد ستمبر ۱۹۰۴ء میں ہٹلر نے ریئلشول، اسٹیر (Realshowl, ester) میں داخلہ لے لیا ۱۹۰۵ء میں تعلیمی سفر مکمل کرنے کے بعد کسی مزید تعلیمی یا معاشی سفر کا منصوبہ بنائے بغیر ہٹلر نے اسکول چھوڑ دیا، ۱۹۰۵ء کے بعد ہٹلر نے ویانا میں بوہیمین طرز زندگی اختیار کی، جس میں اس کی مالی معاونت اسکی والدہ نے یتیموں کے امدادی فنڈ سے کی، وہ کبھی کبھار مزدوری کر لیتا تھا مگر بالاخر اس نے مصوری کو اپنا ذریعہ معاش چنا اور آبرنگ بیچنا شروع کیا۔ ۲۱/دسمبر ۱۹۰۷ء اس کی والدہ ۴۷ سال کی عمر میں انتقال کرگئی، ہٹلر کی تمام جمع پونجی ختم ہوگئی اور ۱۹۰۹ء میں وہ بے آسرا لوگوں کی رہائش میں رہنے لگا اور اس کے بعد ۱۹۱۰ء میں مکان برائے غریب محنت کش افراد میں بس گیا، اس دور میں ویانا مذہبی

(۱) پیدائش ۲۰/اپریل ۱۸۸۹ء وفات ۳۰/اپریل ۱۹۴۵ء عمر ۵۶ سال۔

تعصب اور نسل پرستی کا مرکز تھا،ہٹلر کے ذہن میں یہود دشمن سوچ کی ابتدا کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔

۱۹۱۳ء میں ہٹلر جرمنی چلا آیا جہاں پہلی جنگ عظیم میں جرمنی کی طرف سے ایک عام سپاہی کی حیثیت سے لڑا اور فوج میں اس لیے ترقی حاصل نہ کرسکا کہ افسران کے نزدیک اس میں قائدانہ صلاحیتوں کی کمی تھی،۱۹۱۹ء میں ہٹلر جرمنی کی ورکرز پارٹی کا رکن بنا جو ۱۹۲۰ء میں نیشنل سوشلسٹ جرمن ورکرز پارٹی (نازی NAZI) کہلائی۔۱۹۲۱ء میں وہ پارٹی کا چیئرمین منتخب ہوا،۱۹۳۰ء میں منعقد ہونے والے انتخابات میں نازی پارٹی جرمنی کی دوسری بڑی پارٹی بن گئی ۱۹۳۳ء کے انتخابات میں نازی پارٹی اکثریت حاصل نہ کرسکی مگر سب سے بڑی پارٹی کی حیثیت سے پریزیڈنٹ (President) نے ہٹلر کو حکومت بنانے کی دعوت دی اور ہٹلر ملک کے سب سے اعلیٰ عہدے چانسلر تک پہنچ گیا(۱) چانسلر بننے کے بعد ہٹلر نے جو سب سے پہلا کام کیا، وہ نازی پارٹی کا فروغ تھا،اس مقصد کے لیے اس نے اپنے مخالفین کو دبانے کا ہر حربہ آزمایا،ہٹلر نے اس پارٹی کی قیادت سنبھالی تو اس کی بنیاد ۲۷ نکات پر رکھی جن میں سے کچھ یہ ہیں:

یہودیوں کے شہری حقوق کا خاتمہ، جنگ سے منافع کمانے والوں کی جائداد کی ضبطی، معیشت اور ثقافت،ہٹلر اس بات سے واقف تھا کہ اسٹاک مارکیٹ محنت کو سرمایہ کاری سے جدا کرتی ہے،ہٹلر کے پاس دو راستے تھے، جرمنی میں کوئلہ وافر مقدار میں موجود تھا جس سے مصنوعی تیل بنایا جاسکتا تھا، دوسرا طریقہ یہ تھا کہ تیل کے ذخائر رکھنے والے ممالک کو فتح کر لیا جائے جیسا کہ امریکا نے عراق اور لیبیا کو فتح کیا۔ہٹلر ایک عظیم جرمن سلطنت بنانا چاہتا تھا اور اس کے لیے پٹرولیم پر کنٹرول انتہائی ضروری تھا۔ جنگ عظیم دوم کی بیشتر جنگیں اسی کنٹرول کو حاصل کرنے کی خاطر ہوئی تھیں،ہٹلر جرمنی کا مقبول ترین لیڈر تھا،ہٹلر کو جرمنی کے

---

(۱) چانسلر۔جرمنی میں آج بھی وزیر اعظم کے درجہ کے عہدہ کو چانسلر کہا جاتا ہے۔

سب سے بڑے اعزاز سے نوازہ گیا تھا جسکو ’’ایرن کراس‘‘ کہا جاتا ہے، تاریخ انسانی کی یہ شخصیت جمہوری طریقہ سے منتخب ہو کر ڈکٹیٹر کے درجہ پر فائز ہوا۔

مورخین کے مطابق ہٹلر ایک نہایت ذہین شاطر عیار ظالم اذیت پسند خصوصیات کا حامل شخص تھا، اس کی شخصیت کو کرشمائی شخصیت کہا جاتا ہے، جب وہ لاکھوں کے مجمع کے سامنے تقریر کے لیے کھڑا ہوتا تھا تو گویا پورے مجمع پر جادو کر دیتا تھا، الفاظ ہٹلر کے لیے کھلونا تھے اور انداز بیان اتنا دلچسپ کہ مجمع محصور ہو کر رہ جاتا تھا، ہٹلر کی مقبولیت کی بنیاد اس کی پارٹی کے نظریات تھے اور آئندہ چل کر انھیں نظریات کی بنا پر نہ صرف جرمنی کے دو ٹکرے ہوئے بلکہ تاریخ انسانی کی بدترین شخصیتوں میں ہٹلر کا شمار ہوا، آج بھی جس طرح مسلمانوں میں یزید کا نام ایک لعنت سمجھا جاتا ہے مغربی اقوام کے لیے ہٹلر کا نام اسی طرح لعنت تسلیم کیا جاتا ہے، ۱۹۴۵ء میں ہٹلر کے خاتمہ کے بعد شاید کسی ماں نے اپنے بچہ کا نام ہٹلر رکھا ہو، ہٹلر کے ’’نازی‘‘ نظریات جن کے سامنے پوری جرمنی کی قوم آمنا صدقنا زندہ باد کے نعرہ لگاتی تھی ان نظریات کا کفارہ یہ قوم اب تک ادا کر رہی ہے اور آج کی جرمنی نسل اپنے اجداد کی غلطی پر آج تک شرمندہ اور اقوام عالم کے سامنے طلب گار معافی بنی ہوئی ہے، یہودیوں کا ماننا ہے کہ ہٹلر نے جرمن اور پولینڈ میں ساٹھ لاکھ یہودیوں کو قتل کیا اسی نسل کشی کو یہودی Holocaust. کے نام سے یاد کرتے ہیں، ہٹلر ایک ایسا نام ہے جس کو دنیا شاید ہی بھلا پائے، ہٹلر وہ آدمی تھا جس نے دنیا میں دوسری جنگ اعظم کی بنیاد رکھی، دوسری جنگ میں بھی کڑوڑوں افراد ہلاک کرنے کا سہرا بھی ہٹلر کو ہی جاتا ہے، ۱۹۳۹ء میں پولینڈ پر حملہ کر کے اس کی شروعات کی، ہٹلر کو اصول پرست اور سخت انسان بھی کہا جاتا ہے، ہٹلر کا نام ان لوگوں میں شمار کیا جاتا ہے جنہوں نے یہودیوں کی نسل کشی کے لئے مہم چلائی، برلین شہر سے ۴۰ ؍کلو میٹر دور ایک جگہ ہٹلر نے ایک قید خانہ تیار کیا جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہاں تقریباً ۳ ؍لاکھ کے قریب قیدیوں کو سزائے موت دی گئی تھی اور اس قید خانے میں

عجیب عجیب طریقوں سے قیدیوں کو مت کے گھاٹ اتارا جاتا تھا۔ہٹلر نے اپنے آپ کو زمیں پرسب سے طاقت ور انسان سمجھنے لگا تھا، جس وقت ہٹلر کی موت ہوئی اس سے کچھ گھنٹے پہلے ہی اس نے اپنی پریمیکا ایوا براون سے شادی کی تھی اور اس کے ساتھ ایک بنکر میں چھپا ہوا تھا اور اپنی ہار کی وجہ سے اس نے اپنے آپ کو گولی مارلی تھی اور اس کی بیوی نے زہر کھا کر اپنی جان دی۔(آزاد دائرۃ المعارف، ویکیپیڈیا)

ہٹلر اور نوبل انعام

دوسری جنگِ عظیم میں نازی جرمنی کے سربراہ اڈولف ہٹلر کو عموماً ایک سفاک اور جنگی جنون کا حامی حکمران سمجھا جاتا ہے مگر اسی ہٹلر کو نوبل انعام برائے امن کیلئے بھی نامزد کیا گیا تھا، حال ہی میں منظرِ عام پر آنے والے تاریخی حقائق کے مطابق کروڑوں انسانوں کی موت کا ذمہ دار ہٹلر ۱۹۳۹ء تک نوبل انعام کا مضبوط امیدوار تھا،خوش قسمتی سے یہ اعزاز ہٹلر کے بجائے پناہ گزینوں کی بحالی کیلئے کام کرنے والے ایک ادارے کو دے دیا گیا،نوبل انعام برائے امن کیلئے نامزد ہونے کیلئے لازمی ہے کہ مذکورہ فرد یا ادارہ عالمی امن کے فروغ اور مسلح جنگ کے خطرے کو کم کرنے کیلئے اہم کردار ادا کرے سو یہ بات نہایت حیران کن ہے کہ ہٹلر جیسے شخص کو اس اعزاز کیلئے نامزد کیا گیا، جس ہٹلر اور اسٹالن کی احمقانہ خوش آمدی پالیسی کا اختتام ۸ کروڑ انسانی جانوں کے ضیاع،نسل کشی کے کئی خوفناک واقعات اور ایٹمی ہتھیاروں کی آمد پر ہوتا ہے،نوبل انعام کی تاریخ ایسے کئی واقعات سے بھری پڑی ہے جب سیاسی مقاصد کیلئے یہ اعزاز ایسے افراد کو نامزد کیا گیا یا نواز اگیا جو کہ بالکل بھی مستحق نہ تھے۔ایک اور مثال سوویت یونین کے رہنما جوزف اسٹالن کی ہے جو کہ ایک وقت میں نوبل انعام کے مضبوط امیدوار تھا، جو روس کے سویت یونین کا حکمران ۲۰ سے ٦٠ ملین لوگوں کا قاتل ہے،ایک تازہ مثال میانمار کی رہنما آنگ سان سوچی کی ہے جنہیں ۱۹۹۱ء میں نوبل انعام برائے امن دیا گیا مگر روہنگیا مسلمانوں کے قتل عام پر میانمار حکومت کی مجرمانہ خاموشی پر

انسانی حقوق کی تنظیموں کی جانب سے شدید تنقید کی گئی اوران سے اعزاز واپس لینے کا مطالبہ بھی کیا گیا، حتیٰ کہ امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ کو بھی نوبل انعام برائے امن دینے کی بات کی گئی جوکہ نوبل کمیٹی کیلئے شرمناک حرکت ہے۔(روزنامہ جنگ ۲۳ر فروری ۲۰۲۰ء)

یہودی کون ہیں؟

یہودی وہ قوم ہیں جن کے بارے میں دنیا کے کسی کونے میں کوئی اچھی رائے نہیں پائی جاتی، شیکسپئر (Shakespeare) جیسے ڈرامہ نگار نے بھی ''شائلاک'' نامی سود خور اور ننگ انسانیت کردار کو یہودی مذہب کا پیراہن پہنایا ہے، یہود قاتلین انبیاء علیھم السلام ہیں اور حد تو یہ کہ ان یہودیوں نے محسن انسانیت ﷺ کے ارادہ قتل سے بھی دریغ نہ کیا، دنیا پر مسلمانوں کے ایک ہزار سالہ دور اقتدار میں یہودی بہت عافیت میں رہے اور یہ دور ختم ہوتے ہی انہوں نے اپنی سازشوں کا نشانہ مسلمانوں کو ہی بنایا اور فلسطینیوں کی کمر میں چھرا جا گھونپا۔ دنیا کی ہر قوم ان کی پس پردہ ذہنیت سے خائف ہے اور انہیں اپنے سے دور رکھنا چاہتی ہے، اسی لیے مغربی اقوام نے انہیں اپنے ہاں جگہ دینے کے بجائے مسلمانوں کے سر پر لا ٹھونپا ہے۔ ان کی ذہنیت، تاریخ، عقائد اور انجام اس قرآنی آیت کا مصداق ہیں ''وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَاءُوا بِغَضَبٍ مِنَ اللهِ'' کہ ''ہم نے ان پر ذلت اور مسکنت مسلط کر دی ہے''۔

اگر یہ قوم اپنے منصب و مقام کا لحاظ رکھتی تو حق تعالی نے انہیں اقوام کی قیادت و سعادت سونپی تھی، کم وبیش چار ہزار انبیاء علیھم السلام اس قوم میں تشریف لائے، تین مقدس کتب اور کتنے ہی صحائف اس قوم میں نازل ہوئے، اللہ تعالی نے جتنے لاڈ اس قوم بنی اسرائیل سے کیے شاید ہی کسی اور قوم کے مقدر میں آئے ہوں، شرک جیسا گناہ امت مسلمہ کو بھی معاف نہیں لیکن اللہ تعالی نے ان کو شرک بھی معاف کر دیا تھا، امت مسلمہ کو غلامی سے نجات کے لیے لمبی لمبی تحریکیں اور بے شمار قربانیاں دینی پڑیں جبکہ فرعون جیسے ظالم بادشاہ

سے نجات کے لیے انہیں عصائے موسیٰ ہی کافی ہو گیا، من وسلویٰ سمیت بے شمار دیگر احسانات ہیں جن کی لمبی فہرست قرآن مجید اور طالمود میں ذکر کی گئی ہے، لیکن حیرت و استعجاب کا سمندر ہے کہ پھر بھی اس قوم کو انسانوں کے ہاتھوں نفرین و رسوائی اور بارالہ سے ذلت و مسکنت کے مکروہ تحفے ہی میسر ہیں، یورپ میں ہونے والا ہولو کاسٹ خالصتاً حکومتی نوعیت کا تھا اور یورپی حکومتوں نے ان یہودیوں کو جڑ سے کاٹنے کی بھرپور سعی کی تھی، آج کل ریاست ہائے متحدہ امریکہ ان یہودیوں کے زیر عتاب ہے، سینٹ، پنٹا گان، وائٹ ہاؤس، صدر یہ اور دیگر حکومتی ادارے محض دکھانے کے دانت ہیں، اصل میں ''کارپوریٹ امریکہ'' یہاں کا حقیقی حکمران ادارہ ہے، جس پر یہودیوں کا سو فیصد تسلط ہے، یہودیوں نے بڑی چابک دستی سے امریکہ کے تمام بڑے بڑے مقتدر اداروں کے اہم ترین مقامات پر اپنے پنجے گاڑھ رکھے ہیں، امریکیوں میں آگ لگاتے ہوئے یہ حقائق بڑی تیزی سے امریکہ کو ایک اور بہت بڑے ہولو کاسٹ کی طرف دھکیل رہے ہیں، یورپی ہولو کاسٹ سے سوگنا بڑا ہولو کاسٹ مستقبل قریب میں امریکہ کے اندر وقوع پذیر ہے جس میں حکومت کے بجائے امریکی عوام کے گروہ بے قابو ہو کر ان یہودیوں کو گھروں سے گھسیٹ گھسیٹ کر باہر نکالیں گے اور امریکہ سے ان کا صفایا کر دیں گے۔

یہ صرف مسلمانوں کا ظرف ہے کہ ماضی بعید سے تایوم اس قوم کو برداشت کیا ہے، یہودیوں کی چار ہزار سالہ تاریخ کا بہترین دور مسلمانوں کا دورِ عروج ہے، جب انہیں ہر طرح کی مراعات حاصل تھیں، ان کے ماہرین طب اپنے فن کی بنیاد پر مسلمانوں کے شاہی خاندانوں تک رسائی رکھتے تھے اور اس بہانے انہیں وظائف بھی ملتے اور انہوں نے طبی تعلیم و تربیت کے ادارے بھی چلائے، مسلمانوں کے پورے ایک ہزار سالہ دور میں کہیں بھی یہودیوں کی نسل کشی نہیں ہوئی، کہیں بھی مسلمان سپاہ کے ہاتھوں ان کی قتل و غارت گری کا عمل دہرایا نہیں گیا، ان کے زہر خوردہ رویے کے باعث ان کی شہر بدری بھی کہیں پڑھنے

کو نہیں ملتی، گویا تاریخ کا طویل ترین دورانیہ ان یہودیوں پر مسلمانوں کے زیر سایہ بڑے امن و آشتی کے ساتھ گزارا، ان کے مقابلے میں عیسائیوں کے ساتھ مسلمانوں کی صدی بھر مسلسل عسکری کشمکش رہی اور بیت المقدس کے معاملے میں صلیبی جنگیں لڑی گئیں، اگر یہودی قوم ہوش کے ناخن لیتی تو مسلمانوں کے دورِ عروج میں دودھ پینے والا مجنوں نہ بنتی اور دورِ زوال میں مسلمانوں کا ساتھ دیتی، نسلی طور پر اور عقائد کے میدان میں یہودیت اور اسلام بہت قریبی مذاہب ہیں، لیکن ان یہودیوں نے عیسائیوں کی شہ میں آکر خلافت اسلامیہ کی کمر میں چھرا گھونپا اور مسلمانوں کے ساتھ دشمنی مول لی، اس کے بعد سے فلسطین میں آئے روز ایک مشق ستم جاری ہے جو تیسری نسل کے تسلسل میں ختم ہونے کا نام نہیں لیتی، اسلام دشمنی میں یہودیوں نے انسانیت کا دامن بھی تار تار کیا۔

دنیا کی چار قیمتی ترین اوصاف

دنیا کی چار قیمتی ترین اوصاف ان یہودیوں کے پاس ہیں؛ دنیا کے سب سے دولت مند ترین لوگ ہیں، یہودیوں کے مالیاتی اداروں نے ساری دنیا سے زر سنہری سلب کرکے اپنے دوزخ بھر رکھے ہیں، دنیا کے سب سے زیادہ تعلیم یافتہ لوگ اسی قوم کے پاس ہیں، اور باقی اقوام کی اعلیٰ ترین تعلیمی سطح ان کے ہاں معمولی حیثیت کی حامل سمجھی جاتی ہے، دنیا بھر کا حسن اس قبیلہ بنی اسرائیل پر ختم ہے، آخر کو حضرت یوسف علیہ السلام کی نسل سے ہیں اور دنیا بھر کی ذہانت اس قوم کے دماغ میں ایسے سمٹ آئی ہے کہ اس قوم کے دانشوروں نے کل انسانوں کو آگے لگا رکھا ہے، سارے انسان، ان کی قیادت، ان کا علم، حلم، تجربہ اور کل انسانوں کی فکر فردا و غم دوش سب کا سب اس قوم کی صدیوں اور نسلوں پر محیط سازشوں کے سامنے بے بس ہیں، یہ چار قیمتی ترین اوصاف کے باوجود اس قوم کی بدقسمتی اور سیاہ بختی ہے کہ یہ بے فیضی قوم ہے اور ان کے ہاتھوں ہمیشہ انسانوں کا نقصان ہی ہوتا ہے، اس آسمان نے یہودیوں کے ہاتھوں انسانوں کی تباہی ہی دیکھی ہے اور یہاں سے کبھی انسانوں کا بھلا میسر

نہیں آسکا، یہی وجہ ہے کہ کل اقوام عالم خواہ وہ تاریخ کے کسی دورانیے سے تعلق رکھتی ہوں، یہودیوں سے ہمیشہ خائف ہی رہی ہیں اور نوبت یہاں تک پہنچی ہے کہ از شرق تا غرب لفظ ''یہود'' ایک طعنے اور گالی کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔

ہٹلر نے یہود کے قتل کا منصوبہ کیوں بنایا؟

یہودیوں کا قتل عام اس تمام علاقے میں ہوا جو نازی جرمنوں کے زیر قبضہ تھے، جہاں اب کم و بیش ۳۵ یورپی ممالک کی سلطنتیں قائم ہیں، اس سے قبل یہاں یہودیوں کی بستیاں آباد تھیں اور ۱۹۳۹ء میں سات ملین یہودی نفوس یہاں ہنستے بستے گھروں میں آباد تھے، جن میں پانچ ملین کو یہاں قتل کر دیا گیا، پولینڈ اور روس میں قتل ہونے والے یہودیوں کی تعداد اس کے علاوہ ہے۔ دیگر افراد اگر اپنا مذہب یا رائے تبدیل کر لیتے تو انہیں قتل سے بچا لیا جاتا تھا لیکن یہودیوں کے لیے یہ رعایت بھی نہیں تھی، یہودیوں کے قتل میں عورتوں، بوڑھوں اور بچوں کے لیے بھی کوئی تخصیص نہیں تھی، قبائل کے قبائل کو قتل کر دیا جاتا اور ان کے بچوں پر طبی تجربات کر کے انہیں بھی موت کی وادی میں دھکیل دیا جاتا، اس دوران فری میسنریز کو بھی گرفتار کر کر کے ہلاکتی کیمپوں میں بھیجا گیا، ہٹلر کا پختہ نظریہ تھا کہ فری میسنریز بھی یہودیوں میں سے ہیں چنانچہ ان کیمپوں میں انہیں زبردستی سرخ کپڑے پہنائے جاتے اور ایک لاکھ سے دو لاکھ تک کی تعداد میں انہیں ان ہلاکتی کیمپوں میں نازیوں نے قتل کیا۔ نازی جرمن جن جن علاقوں کو فتح کرتے وہاں وہاں سے یہودیوں کو ختم کرتے جاتے یہاں تک کہ جب پولینڈ کو فتح کیا تو اتنی بڑی تعداد کے پول یہودیوں کو قتل کرنا آسان نہ تھا، چنانچہ طویل غور و غوض کے بعد کم وقت اور کم لاگت میں قتل کرنے کے لیے زہریلی گیس استعمال کی گئی، پولینڈ (Poland) کی سرزمین قتل یہود کی بہت بڑی امین ہے۔ چھ ہلاکتی کیمپوں سے شروع ہونے والا ہولو کاسٹ پولینڈ سمیت مقبوضہ ممالک میں پندرہ ہزار سے زیادہ کیمپ بن گئے، ان کیمپوں میں یہود سے بدترین مشقت لی جاتی اور پھر ضرورت ختم

ہونے پر انہیں قتل کر دیا جاتا جبکہ بے شمار یہود دوران مشقت ہی دم توڑ دیتے، شروع میں یہ کیمپس شہروں سے باہر تھے لیکن ٹرانسپورٹ کے وسیع اخراجات کے باعث بعد میں ان کیمپوں کو یہودی آبادیوں کے قریب ہی منتقل کر دیا گیا۔

اس سے شدید تر حالات روس کے مفتوحہ علاقوں میں بھی پیش آئے، یہاں یہودیوں کو زندہ بھی جلایا گیا اور جب گولی مارنے اور زندہ جلانے کا سامان میسر نہ آیا یا اسے مہیا کرنا مہنگا تصور کر لیا گیا تو لاکھوں یہودیوں کو روس کے شدید ترین ٹھنڈے علاقوں میں بے آب وگیاہ تنہا چھوڑ دیا گیا اور یہ لوگ یخ بستہ اور جان لیوا ٹھنڈی ہواؤں سے زندگی کی بازی ہار گئے۔ اس سب کے باوجود ۱۹۴۱ء کے آخر تک روس کے صرف 15٪ یہودی مارے گئے تھے، اس رفتار کو تیز کرنے کے لیے ایک بار پھر وسیع پیمانے پر زہریلی گیسوں کا تجربہ کیا گیا اور ظاہر ہے یہ تجربہ شہری علاقوں میں ممکن نہ تھا، چنانچہ اس کے لیے شہر سے باہر بہت بڑی بڑی جگہیں بنائی گئیں جہاں یہودی نسل کو نیست و نابود کرنے کا عمل سالوں تک دہرایا جاتا رہا۔ یہودیوں نے اس سارے ظلم وستم کے خلاف آواز بھی بلند کی لیکن بے سود، کچھ کیمپوں میں نوجوان یہودیوں نے ہتھیار تک بھی اٹھائے لیکن ظاہر ہے نازی جرمن اس وقت پوری دنیا سے قابو میں نہ آنے والا طاقت کا طوفان تھا تو یہود اس سے کیسے جان چھڑا سکتے تھے، پھر ایک پہلو یہ بھی ہے کہ دنیا کے کسی کونے سے اس وقت اور آج بھی یہودیوں کے حق میں کوئی آواز بلند نہ ہوئی، اس قوم نے جس برتن میں کھایا اسی میں سوراخ کیا، ہر قوم کو ڈسنے کی کوشش کی، ہر گروہ کو بلیک میل (Black mail) کیا، دولت کی خاطر انسانیت کو داؤ پر لگایا، دوسری جنگ عظیم کے اس المناک پہلو کا دوسرا تاریک ترین رخ یہ ہے کہ جنگ عظیم کے دونوں متحارب فریقوں کو سرمایہ فراہم کرنے والی بہت بڑی فرم یہودیوں کی ہی ملکیت تھی، کیا اپنے ہم مذہب بلکہ ہم نسل رشتہ داروں پر اتنا بے پناہ ظلم ہوتے دیکھ کر وہ سرمائے کی فراہمی بند نہیں کر سکتے تھے؟

مرگِ انبوہ کی اصطلاح

مرگِ انبوہ کی اصطلاح دراصل یونانی لفظ (holókauston) سے ماخوذ ہے جس کا مطلب "مکمل جلا دینا" یا راہِ خدا میں جان قربان کر دینا ہے، اسی لفظ کی لاطینی شکل (holocaustum) کو پہلی دفعہ یہودیوں کے قتل عام سے بارہویں صدی کے وقائع نگاروں روجر آف ہاوَڈن اور رچرڈ آف ڈیوس نے ۱۱۹۰ء میں منسوب کیا، اُنیسویں صدی کے اوائل تک یہ لفظ ناگہانی آفتوں اور مصیبتوں کے لیے مستعمل رہا، اٹھارہویں صدی تک لفظ ہولو کاسٹ ایسے واقعات کے لیے استعمال کیا جاتا تھا، جس میں پرُ تشدد طریقوں سے بڑے پیمانے پر انسانی جانوں کا زیاں ہوا ہو، مثال کے طور پر ونسٹن چرچل اور اُن کے ہم عصر ادیب و کالم نگار دوسرے جنگِ عظیم سے قبل یہ لفظ آرمینیوں کے قتل عام اور پہلی جنگ عظیم کے لیے استعمال کرتے تھے ۱۹۵۰ء سے اس لفظ کے استعمال سے اجتناب کا رجحان بڑھا ہے اور اب یہ لفظ مرگِ انبوہ یا ہولو کاسٹ کے نام سے نازی مظالم کی یاد بن کر رہ گیا ہے، جس کو انگریزی میں بڑے H سے لکھا جاتا ہے۔

لفظ مرگِ انبوہ کا استعمال محض یہودیوں کی نسل کشی کے لیے استعمال نہیں کیا جاتا بلکہ اس لفظ کی مدد سے نازیوں کے غیر انسانی مظالم کے وسیع تر معنوں میں وضاحت بھی پیش کی جاتی ہے، جس میں مختلف قوموں اور مذاہب کے لوگوں کی مثالیں دی جاتی ہیں مثلاً رومانیہ سے ہجرت کرنے والے تقریباً پانچ لاکھ رومانیوں، جپسیوں اور سنتیوں کا قتل عام، سوویت یونین کے لاکھوں جنگی قیدیوں کی ہلاکت، جنسی بے راہ روی کے شکاروں، معذوروں اور اس کے علاوہ بے شمار سیاسی و مذہبی حریفوں کو موت، مرگِ انبوہ میں شامل ہے، تاہم کئی یہودی تنظیمیں اس لفظ کو دیگر معنوں استعمال کرنے پر اعتراض کرتی ہیں خصوصاً وہ تنظیمیں جو مرگِ انبوہ کی یاد یا اس کی نسبت سے بنائی گئی ہیں، یہودی تنظیموں کا اصرار ہے کہ لفظ مرگِ انبوہ صرف یہودیوں کی نسل کشی کے اظہار کے لیے استعمال کیا جانا چاہیے کیونکہ اس کا اصل

مقصد محض یہودیوں کا خاتمہ تھا اور یہ جرم اتنا سنگین اور اتنا گھناؤنا تھا جو یورپ میں یہودی مخالف عناصر کی جانب سے کیا گیا تھا کہ اس کو نازیوں کے عام جرائم کا حصہ نہیں بنانا چاہیے۔ اس موضوع پر شدت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس کو جنگِ عظیم دوم کا حصہ نہیں کہا جاتا۔(۱) کچھ محققین کے نزدیک ''ہولوکاسٹ'' سے مراد صرف یہودی مقتولین نہیں ہیں بلکہ وہ تمام مقتولین جنگ عظیم ثانی ہیں جو اتفاقی قتل نہیں ہوئے بلکہ جنہیں نازیوں نے کسی پروگرام کے تحت باقاعدہ سے قتل کیا ہے جن میں دوسری اقوام کے چیدہ چیدہ لوگ، مذہبی رہنما، جنگی قیدی، ہم جنسیت کے دوران معذور ہونے والے مرد اور دیگر عسکری و سیاسی مخالفین بھی شامل ہیں، اس تعریف کے تحت ہولوکاسٹ کے مقتولین کی تعداد ایک کروڑ تک جا پہنچتی ہے، ان دونوں آراء میں کون سی قرین قیاس ہے؟ یہودی سچ بولتے ہیں یا دیگر محققین؟ اور کیا یہودیوں نے دنیا کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لیے اور خود کو مظلوم ثابت کرنے کے لیے دوسرے مقتولین کو بھی اپنا بنالیا؟ یہ اللہ تعالی ہی بہتر جانتا ہے۔

یہودیوں کے قتل سے متعلق بھیجی جانے والی رپورٹ

مشہور امریکی قلمکار مائیکل بیرینبون لکھتے ہیں کہ جرمنی ایک "قتل گاہ" بن چکا تھا، ملک کے تمام افسر شاہی اس قتل عام میں کسی نہ کسی طرح ملوث تھے، بستی کے کلیساؤں اور وزارتِ داخلہ کے ریکارڈ سے یہ پتہ چلایا جاتا تھا کہ کون یہودی ہے، محکمہء ڈاک ملک بدری کے احکامات ارسال کیا کرتا تھا، وزارتِ خزانہ نے یہودیوں کی املاک ضبط کیں، جرمنی کے کاروباری اداروں نے یہودیوں کو ملازمت سے نکال دیا، یہودی سرمایہ داروں کو سرمائے

(۱) یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ دنیا میں 13 ممالک، جن میں فرانس اور جرمنی شامل ہیں، میں قوانین ہیں جو مرگ انبوہ پر نظر ثانی اور اس کے بارے میں تحقیق کو غیر قانونی قرار دیتے ہیں، اس پر تحقیقی بحث سے بھی بعض ممالک میں تین سے دس سال تک قید کی سزا اور جرمانے بھی ہوسکتے ہیں، انکارِ مرگ انبوہ کو نفرت انگیز اظہار مانا جاتا ہے جس کے باعث اُن ممالک میں ایسے اظہار کو قوانین آزادیِ اظہار کے تحت تحفظ حاصل نہیں۔

سے محروم کر دیا گیا، جامعات و تعلیمی اداروں نے یہودیوں کو داخلہ دینے سے منع کر دیا اور جو پہلے سے زیرِ تعلیم یا فارغ التحصیل تھے، اُن کی ڈگری کو منسوخ کر دیا گیا اور یہودی اساتذہ بھی ملازمت سے فارغ کر دیا گیا، حکومتی مال برداری کے اداروں نے یہودیوں کو بذریعہ ریل گاڑی کیمپ میں پہنچانے کے انتظامات کیے، جرمنی کی ادویات بنانے والی فیکٹریوں نے کیمپ میں مقید یہودی قیدیوں تجرباتی دواؤں کو آزمانا شروع کر دیا، مختلف کمپنیوں نے چولھے تیار کرنے کے لیے بولیاں لگائیں، مرگ انبوہ کا شکار ہونے والی کی فہرستیں تیار کرنے کے لیے جرمنی کی ڈیھومیگ کمپنی کی پنچنگ مشینیں استعمال کی گئیں، جنھوں نے تمام تر جزئیات کے ساتھ قتل ہونے والا کا ریکارڈ مرتب کیا، جو قیدی قتل کے لیے بنائے گئے خصوصی کیمپس میں لائے جاتے تھے، اُنہیں اُن کی تمام املاک جرمنی کے حوالے کرنی پڑتی تھیں، جن کو جانچ پڑتال اور باقاعدہ فائل بندی کے بعد الگ سے پرچی لگا کر حکومتِ جرمنی کو بھیج دیا جاتا تھا کہ وہ ان کو قابل استعمال یا دوبارہ سے کارآمد بنا سکے، مائیکل بیرینبون لکھتا ہے کہ "یہودیوں کے سوال کا حتمی حل" جرمنی کی نظر میں یہودیوں کی نسل کشی" جرمنی کا عظیم ترین کارنامہ" تھا، امریکن نژاد یہودی مورخ ساؤل فرائیڈ لینڈر لکھتا ہے کہ: ''کسی ایک سماجی گروہ، مذہبی جماعت، تعلیمی ادارے یا پیشہ ورانہ اتحادیوں نے اس موقع پر یہودیوں سے باہمی تعاون کا اظہار نہیں کیا'' وہ مزید لکھتا ہے کہ'' علاقائی مسیحی کلیساؤں نے یہ اعلان کیا کہ وہ یہودی جو اپنے دین کو چھوڑ چکے ہیں، اُن کو مسیحیوں میں شمار کیا جائے لیکن وہ بھی ایک حد تک''۔

اغلب نظریات اور نسل کشی کا میزان

نسل کشی کے دوسرے واقعات کی بہ نسبت اس نسل کشی میں علاقائی حکومت اور وسائل نسل کشی کا مرکزی کردار تھا، جامعۂ عبرانی، یروشلم کے مشہور مورخ پروفیسر یہوداباویر کہتے ہیں کہ: ''مرگِ انبوہ کا محرک خالصتاً نظریاتی تھا، جس کی بنیاد نازیوں کی تصوراتی دنیا تھی، جہاں

ایک عالمی یہودی سازش دنیا پر حکومت کرنے کے درپے تھی اور نازی اس کے مقابلے میں ایک مقدس جنگ لڑ رہے تھے، نسل کشی کی تاریخ میں آج تک کوئی بھی نسل کشی فرضی حکایات اور فریبِ خیالات کی بنیاد پر نہیں کی گئی، انتہائی بے بنیاد، کبیدہ خاطر نظریہ جس پر بڑے منظم انداز میں نتائج سے بے نیاز ہو کر عمل کیا گیا، نازیوں کے زیرِ نگیں تمام علاقوں میں مذبح خانے تھے، جہاں انسانی ذبیحہ کیا جاتا تھا، اب اُن علاقوں میں ۳۵ مختلف یورپی ممالک موجود ہیں، وہ وسطی اور مشرقی یورپ کے لیے بدترین وقت تھا ۱۹۳۹ء یورپ میں تقریباً ستر لاکھ (۷ ملین) یہودی آباد تھے، جن میں تقریباً پچاس لاکھ (۵ ملین) یہودی مارے گئے، جس میں سے تیس لاکھ (۳ ملین) پولینڈ میں قتل کیے گئے اور دس لاکھ (ایک ملین) سوویت یونین میں قتل کیے گئے، اس کے علاوہ لاکھوں یہودی نیدرلینڈز، فرانس، بلجئیم، یوگوسلاویہ اور یونان میں قتل کیے گئے، وانسی پروٹوکول نے یہ بھی واضح کیا تھا کہ وہ "یہودیوں کے سوال کا حتمی جواب" کا یہ مشن انگلینڈ اور آئرلینڈ میں بھی کرنا چاہتے تھے، ہر اس انسان کو نسل کشی کی بھینٹ چڑھا دیا گیا، جس کی تین یا چار نسل قبل بھی دادا، دادی، نانا یا نانی کوئی بھی یہودی تھا، نسل کشی کے دوسرے واقعات میں لوگوں کو جان بچانے کے لیے مذہب تبدیل کر دینے یا کسی دوسرے مذہب کو قبول کر لینے پر جان بخشی کر دی جاتی تھی لیکن مرگِ انبوہ کے دوران مقبوضہ یورپ کے یہودیوں کے لیے یہ گنجائش بھی نہیں تھی، جرمنی کے زیرِ تسلط علاقوں میں یہودیوں سے نسب کے حامل تمام اشخاص کو نسل کشی کے نام پر قتل کر دیا گیا۔

نازیوں کے انسانوں پر طبی تجربات

ہولوکاسٹ کا ایک اور پہلو انسانی جانوں کا طبی تجربات کے لیے بے دریغ استعمال بھی تھا، انسانوں کو تجربات کے استعمال کے دوران زندہ انسانوں کو پریشر چیمبرز، نئی ادویات کے تجربات، انسانوں کو منجمد کرنا، بچوں کی آنکھ میں کیمیائی محلول ڈال کر اُن کی آنکھ کی پتلی کا رنگ بدلنے کی کوشش کرنا، انسانی جسموں کی چیر پھاڑ اور اسی طرح کی غیر انسانی

تجربات شامل تھے، کثرت سے رومانیہ کے بچوں کو ان تجربات کی بھینٹ چڑھایا گیا، روما جو کہ رومینیا کی ایک خانہ بدوش گروہ ہے اپنی کم سماجی حیثیت کی وجہ سے خاص طور پر ان ظلموں کا شکار ہوئے، روما اور بلقان نسل کے باشندوں کے لیے یہودیوں کی طرح امتیازی قوانین وضع کیے گئے، اس کے علاوہ لاکھوں جرمن ذہنی بیمار اور جسمانی معذور لوگوں کو جرمن لوگوں کی آبادی اور جینیاتی معیار برقرار رکھنے کے منصوبہ کے نام پر صحت کے مراکز میں قتل کردیا گیا۔

جو انسان ان تجربات کے بعد بچ جاتے اُنہیں بھی ختم کردیا جاتا یا پھر تجربے کے بعد انہیں چیر پھاڑ دیا جاتا، ڈاکٹر مینگیلی (Man gilli) کے تجرباتی رجحان کو دیکھ کر یوں لگتا ہے کہ جیسے وہ رومانیہ کے بچوں پر ایسے تجربات کر کے بہت خوش ہوتا تھا، اسی لیے کثرت سے رومانیہ کے بچوں کو ان تجربات کی بھینٹ چڑھایا گیا، وہ ان بچوں کو خود مٹھائی اور کھلونے وغیرہ دیتا تھا اور پھر خود اُن کو گیس چیمبرز میں لے جاتا تھا، بچے اُس کو انکل مینگیلی (Uncle Mangeli) کہہ کر بلاتے تھے۔

وہیں کی مقامی یہودی ''ویرا الگزینڈر'' (Vira Algensor) جس نے آشویتس (Auschwitz) میں تقریباً ۱۰۰ بچوں کو ان تجربات کی بھینٹ چڑھتے ہوئے دیکھا ہے، کہتی ہیں کہ ''مجھے خاص طور پر بچوں کا ایک جوڑا یاد ''گیدو'' اور ''اینا'' جن کی عمر تقریباً چار سال کے قریب ہوگی، ایک دن مینگیلی (Mingili) انہیں اپنے ساتھ لے گیا، جب وہ دونوں واپس آئے تو ان کی حالت نہایت خراب تھی، انہیں ایک دوسرے کے ساتھ پشت کے ساتھ پشت ملا کر سی دیا گیا تھا، جس طرح جڑواں بچے ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہوتے ہیں، اُن کے زخم سڑ گئے تھے اور ان میں سے خون اور پیپ بہہ رہا تھا، وہ رات دن روتے رہتے تھے، مجھے ابھی بھی یاد ہے کہ اُن کی ماں کا نام ''اسٹیلا'' (Stella) تھا، انہوں نے اپنے بچوں کو اس تکلیف سے نجات دلانے کے لیے خود زہر دے کر قتل کردیا۔''

پولینڈ کے باشندوں کے قتل عام کا منظر

جرمنی کے منصوبہ سازوں نے نومبر ۱۹۳۰ء میں نعرہ لگایا کہ ''پولینڈ کے باشندوں کی مکمل تباہی سے کم کچھ بھی منظور نہیں'' ہنرچ ہملر (Heinrich Himmler) نے اس موقع پر قسم کھائی کہ ''پولینڈ کے تمام باشندے اس دنیا سے غائب ہو جائیں گے''، پولینڈ کی ریاست کو جرمنی قبضہ کر کے پولینڈ کے باشندوں سے پاک کر دے گی اور جرمنی کی بستیاں بسانے والوں کو جرمنی کی بستی بنانے کی ایک اور بستی مل جائیگی، منصوبے کے بطابق ۱۹۵۲ء تک صرف تیس سے چالیس لاکھ (۳ سے ۴ ملین) پولینڈ کے باشندوں کو پولینڈ میں رہنے دیا جائیگا اور وہ بھی محض اس لیے کہ وہ جرمنی سے آنے والے باسیوں کے غلام بن کر رہیں، پولینڈ کے باشندوں کے شادی کرنے، کسی بھی قسم کی طبی امداد لینے پر پابندی ہو گی اور اسی طرح کی پابندی پولینڈ کے باشندوں پر جرمنی میں بھی عائد کی جائیگی اور اس طرح رفتہ رفتہ پولینڈ کے باشندوں کو بالکل ختم کر دیا جائیگا، ۲۲ اگست، ۱۹۳۹ء کو جنگ سے تقریباً ایک ہفتہ قبل، ہٹلر نے مشرقی حصے میں ان تیاریوں کو حتمی شکل دیتے ہوئے، ''میرا سر بکف'' نامی خصوصی دستہ بناتے ہوئے احکامات جاری کیے کہ تمام عورتوں، بوڑھوں، پولینڈ نسل کے بچوں اور پولینڈ کی زبان بولنے والوں کو بلا تاسف یا رحم قتل کر دیا جائے، یہی ایک راستہ ہے جرمنی کی نئی بستی کے لیے جگہ حاصل کرنے کا، تاہم پولینڈ نژاد باشندوں کا قتل عام اتنے بڑے پیمانے پر نہیں کیا گیا کہ جتنے بڑے پیمانے پر یہودی یا یہودی نژاد افراد کا کیا گیا، نازی منصوبہ سازوں نے فیصلہ کیا تھا کہ پولینڈ کے باشندوں اور یہودیوں کی نسل کشی بیک وقت نہیں کرنا چاہیے کیونکہ پولینڈ کے باشندوں سے جرمنی کے لوگوں پر مستقبل میں اضافی بوجھ پڑے گا اور کہیں ہماری ہر جگہ حکومت کرنے کی حکمت عملی تصادم کا شکار نہ ہو جائے، پولینڈ کے لوگوں کا بھی حساب کیا جائیگا لیکن مناسب وقت پر، جنگ کے دوران اٹھارہ لاکھ سے اکیس لاکھ غیر یہودی پولینڈ کے شہری قتل کیے گئے، جن میں سے اسی فیصد (80٪) پولینڈ نژاد باشندے تھے اور بقیہ بیس

فیصد (20٪) یوکرائن (Ukraine) اور بیلاروس (Belarus) سے آئے ہوئے اقلیتی افراد تھے اور ان میں سے بیشتر عام شہری تھے، ان میں سے کم از کم دولاکھ ہلاکتیں نسل کشی کے لیے قائم کیے گئے مختلف کیمپوں میں ہوئیں، جن میں سے بھی ایک لاکھ چھیالیس ہزار ہلاکتیں آشوٹس (Auschwitz) کیمپ میں ہوئیں، زیادہ تر ہلاکتیں قتل عام میں ہوئیں جیسا کہ ''وارسا'' (Warsaw) کی بغاوت کے دوران ایک لاکھ بیس ہزار سے دولاکھ عام شہری ہلاک کردیے گئے، پولینڈ میں غذائی اشیاء کی قلت یا خود ساختہ قحط، حفظانِ صحت کے اُصولوں کی خلاف ورزی اور عوام کو طبی سہولیات سے محروم کرنا بھی جرمنی کے منصوبہ سازوں کی ترجیحات میں شامل تھا، جس کی بدولت پولینڈ میں شرحِ اموات تیرہ فیصد سے بڑھ کر اٹھارہ فیصد پر ہزار ہوگئی، کل ملا کر اکیاون لاکھ پولینڈ کے شہری نازیوں کے ہاتھوں ہلاک ہوئے، جن میں یہودی اور غیر یہودی دونوں شامل تھے، یعنی جنگ کے دوران پولینڈ میں ہونے والے نقصان میں جنگ سے پہلے کی مردم شماری کے مطابق پولینڈ اپنی سولہ فیصد آبادی سے محروم کر دیا گیا، چونتیس لاکھ میں سے اکتیس لاکھ پولینڈ نژاد یہودی (90٪) اور بیس لاکھ (6٪) غیر یہودی پولینڈ نژاد باشندے جرمنی کے ہاتھوں ہلاک ہوئے، ہلاک ہونے والوں میں نوے فیصد (90٪) سے زائد عام شہری تھے کیونکہ جرمنی اور سوویت کی افواج نے جان بوجھ کر عام شہریوں کو اپنی کارروائیوں کا نشانہ بنایا تھا، مقبوضہ پولینڈ میں شہر کی سڑکوں پر پولینڈ کے شہریوں کو قطاریں لگا کر کھڑا کرنا، شہر کا چکر لگوانا اور پھر انہیں ریل گاڑی کے ذریعے جرمنی بھیج دینا، نازی افواج کی معمول کی کارروائی تھی، جس کے لیے اُس وقت لپانکا (Lapanka) کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے جو ۱۹۴۲ء تا ۱۹۴۴ء کے درمیان انگریزی بچوں کے ایک کھیل سے ماخوذ تھا، جس کے معنی ''پرچی لگانا'' یا ''امتیازی بنانا'' تھا، صرف ''وارسا'' میں اس مشق کے ذریعے تقریباً روزانہ چار سو افراد مشق کی نظر ہوجاتے تھے، جبکہ کبھی کبھی تو یہ تعداد ہزاروں تک چلی جاتی تھی، جیسا کہ ۱۹ ستمبر، ۱۹۴۲ء کو تین ہزار مرد و خواتین کو اس مشق

کے ذریعے پکڑا، پورے ”وارسا“ میں چکرلگوائے اور پھر ریل گاڑی کے ذریعے جرمنی بھیج دیا، اس کے علاوہ تقریباً بیس ہزار سے دولاکھ نفوس کے ساتھ یہی سلوک کیا گیا، پولینڈ کے بچوں کو زبردستی اُن کے والدین سے جدا کردیا گیااور اچھی طرح جانچ پڑتال کے بعد، اُن میں سے جن بچوں کے جرمن نژاد پایا گیا، اُنہیں پرورش کے لیے جرمنی بھیج دیا گیا، جہاں جرمنی خاندانوں کو اُن کی پرورش کا ذمہ دیا گیا۔

سربیائی باشندوں کے قتل عام کا ایک منظر

بلقان (یوگوسلاویہ، Yugoslavia) میں پانچ لاکھ ”سربیائی“ باشندوں کو قتل کیا گیا، جنوب مشرقی یورپ میں ہٹلر کے انتہائی قریبی عساکر میں سے ایک ”ہرمان نیوباچر“ (Herman Newbacher) لکھتا ہے کہ ”یہاں کی دہشت گرد جماعت اسٹاس نے کہا ہے کہ تقریباً دس لاکھ راسخ العقیدہ سربیائی باشندے (بشمول مرد، بچے، عورتیں اور بوڑھے) تہ تیغ کردیے گئے، مجھے یہ گمان گزرا کہ یہ انتہائی مبالغہ آرائی سے کام لے رہے ہیں، جو اعداد وشمار بعد میں مجھے موصول ہوئے، ان کے مطابق دس لاکھ کا تین چوتھائی حصہ نہتے لوگ ذبح کردیے گئے۔“ جرمنی کی افواج، ہٹلر کی ہدایات کے مطابق اُن سربوں سے انتہائی منتقم انداز اور جذبے سے لڑے، جو یہاں کے نسلی باشندے تھے، اسٹاس کے معاونین نے ایک نہایت منظم و مربوط نظام کے تحت بڑی تعداد میں مذہبی سیاسی اور نسلی تفاوت کو وجہ بناتے ہوئے نسل کشی کی، جس کا بدترین نشانہ سربیائی باشندے بنے، عجائب خانہ برائے مرگِ انبوہ امریکا اور یہودی معنوی لائبریری کے مرتب کردہ اعداد وشمار کے مطابق چھپن ہزار سے ستانوے ہزار کے درمیان سرب باشندوں کو کروشیائی توجیہی کیمپ میں ہلاک کیا گیا، تاہم یاد ویشم کے اعداد وشمار کے مطابق کروشیائی توجیہی کیمپ میں چھ لاکھ ہلاکتیں ہوئی تھیں، بیلاروس میں نازی جرمنیوں نے ظالم نسل پرست حکومت بنائی، جس نے نو ہزار گاؤں جلا دیے، تین لاکھ اسی ہزار (380000) لوگوں کو غلام بنانے کی غرض سے

ملک بدر کر دیا گیا اور لاکھوں شہریوں کو قتل کر دیا گیا۔ختین جیسے چھ سو گاؤں مع آبادی کے جلا دیے گئے، جن کی کم سے کم آبادی بھی پانچ ہزار دو سو پچیانوے تھی، بیلاروسی رہائشی نازیوں کے ہاتھوں تباہ و برباد ہو گئے اور وہاں کے کچھ یا تمام باشندے قتل کر دیے گئے، جرمنی کے تین سالہ قبضے کے دوران بائیس لاکھ تیس لاکھ نفوس (کل آبادی کا ٪ 24 فیصد) قتل کر دیے گئے، جس میں تیس لاکھ ستر ہزار فوجی، اور اینساٹز گروپین کے ہاتھوں دو لاکھ پینتالیس ہزار یہودی بھی شامل ہیں، یوکرائن میں دورانِ جنگ اور جرمنی کے قبضے کے دوران کل انسانی نقصان کا اندازہ تقریباً پچپن لاکھ سے ستر لاکھ (کل آبادی کا ٪17-13) لگایا جاتا ہے، جس میں تیرہ لاکھ چھیاسٹھ ہزار فوجی ہلاکتیں بھی شامل ہیں اور تقریباً چھ لاکھ سے نو لاکھ یہودی جو اینساٹز گروپین (Joe Einsatzgruppen) کے ہاتھوں ہلاک ہوئے۔

سوویت کے جنگی قیدی جرمنی کی قید میں

مائیکل بیرن باؤم (Michael Baron Baum) کے مطابق جون ۱۹۴۱ء سے مئی ۱۹۴۵ء کے درمیان بیس لاکھ سے تیس لاکھ کے قریب جنگی قیدی جو اُس وقت کے جنگی قیدیوں کا ستاون فیصد تھا، فاقہ کشی، غیر انسانی سلوک اور موت کی سزاؤں کی بدولت موت کا شکار ہوئے اور ان میں سے بھی زیادہ تر اموات قید میں لینے کے بعد پہلے سال کے دوران ہوئیں، ڈینیل گولڈ ہیگن (Daniel Gold Hagen) کے مرتب کردہ اندازے کے مطابق ۱۹۴۱ء تا ۱۹۴۲ء کے دوران اٹھائیس لاکھ سوویت جنگی قیدی ہلاک ہوئے جبکہ ۱۹۴۴ء کے وسط تک کل ہلاک ہونے والے جنگی قیدیوں کی تعداد پینتیس لاکھ تک پہنچ گئی، امریکی یادگاری عجائب گھر برائے مرگ انبوہ کے پیش کردہ اندازوں کے مطابق سوویت کے ستاون لاکھ میں سے تینتیس لاکھ قیدی، جرمنی کی قید میں مارے گئے جبکہ امریکہ اور برطانیہ کے دو لاکھ اکتیس ہزار قیدیوں میں سے آٹھ ہزار تین سو قیدی مارے گئے،

بعد میں اموات کا تناسب کم ہونے کی وجہ یہ تھی کہ جرمنی کو جنگی قیدیوں کی ضرورت تھی کہ وہ جنگ کے دوران غلاموں کے طور پر کام کریں، ان میں پانچ لاکھ کو بطور غلام یا مزدور رکھا گیا تھا، اس کے برعکس یہ بھی یقین کیا جاتا ہے کہ اتنے ہی جرمن جنگی قیدی جوزف اسٹالن (Joseph Stalin) کے دورِ حکومت میں قید و بند کی صعوبت برداشت نہ کرتے ہوئے، ہلاک ہو گئے۔

روما میں نازیوں کی ستم رانی کا نقشہ

چونکہ روما اور سنتی بنیادی طور پر ایسے تھے کہ انکی ثقافت و تاریخ زبانی تھی، اس لیے ان کے بارے میں اعداد و شمار اتنے زیادہ یقینی نہیں، جتنا کہ کسی دوسری قوم یا گروہ کے لوگوں کے تھے، یہودا باؤر (Judas Bauer) لکھتا ہے کہ معلومات کی کمی کی وجہ روما کی بد اعتمادی اور شک وشبہ کی خصلت تھی، جس کی وجہ اُن کی سماجی حیثیت میں کمی اور رومانیہ کی ثقافت میں اُن کی مناہی تھی، آشویتش میں اُن کی شخصی وجنسی تاراجی ہوئی، باؤر لکھتا ہے کہ زیادہ تر رومانی ظلم وتشدد وانسانیت سوز واقعات کو منظرِ عام پر نہ لاسکے اور خاموشی سے ہر ظلم و ستم کو سہتے گئے، جس سے ان واقعات کا کرب اور بڑھ گیا کیونکہ جس اذیت کا سامنا اُنہوں نے کیا وہ صیغۂ راز میں ہی رہا، نیوک ڈونلڈ (Newke Donald) اور فرانسیس نیکوسیا (Francis Nicosia) لکھتے ہیں کہ نازیوں کے زیرِ تسلط یورپ میں دس لاکھ میں سے ایک لاکھ تیس ہزار روما اور سنتی موت کا شکار ہوئے، مائیکل بیرن باؤم (Michael Baron Baum) کے مطابق، سنجیدہ محققین کے اندازوں کے مطابق یہ تعداد نوے ہزار سے دو لاکھ بیس ہزار کے درمیان ہے، جبکہ امریکی یادگاری عجائب گھر برائے مرگ انبوہ کے معروف سابقہ تاریخداں سائبیل ملٹن (Sibley Milton) کی تفصیلی تحقیق و مرتب کردہ اعداد و شمار کے مطابق کم از کم دو لاکھ بیس ہزار اموات ہوئیں اور ممکنہ طور پر یہ تعداد پانچ لاکھ سے قریب ترین تک ہے، جامعۂ ٹیکساس (University of Texas) آسٹن میں

مطالعۂ رومانیہ اور مرکز برائے رومانی دستاویزات کے مہتمم آئین ہنکوک استدلالی انداز میں اس تعداد کو انتہائی زیادہ بتاتے ہوئے پانچ لاکھ سے پندرہ لاکھ اموات کا تخمینہ پیش کیا ہے، ہنکوک (Hancock) لکھتا ہے کہ روما اور سنتی اموات کا تناسب تقریباً یہودیوں کے برابر تھا، نسل کشی کے کیمپوں میں بھیجنے سے قبل قیدیوں کو کھیتوں میں بھیج دیا جاتا تھا، اسی طرح سینکڑوں وارسا گھیٹوں میں بھیجے گئے، اینساٹزگروپین کی مشرقی ٹولیوں نے خیمہ زن رومانیوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر اُنہیں موقع پر ہی مار ڈالا اور جاں بحق ہونے والوں کے اعداد و شمار کا کوئی سُراغ نہیں چھوڑا، اس کے علاوہ یہ اُن کٹھ پتلی حکومتوں کا بھی نشانہ بنے جو نازیوں سے تعاون کر رہی تھیں، مثال کے طور پر کروئیشا کی اُستاس حکومت، جہاں روما کے باشندوں کی بڑی تعداد جیسی نوویک (Jaycee novick) کیمپ میں موت کا شکار ہوئی۔

جرمن پولیس اہلکاروں نے ہزاروں سیاسی مخالفین کو بھی نشانہ بنایا جن میں کمیونسٹ، سوشلسٹ اور مزدور یونینوں کے ارکان شامل تھے، اِن کے علاوہ ان میں مذہبی طور پر اختلاف رکھنے والے افراد بھی شامل تھے، اِن میں سے بہت سے افراد جیلوں میں بند کئے گئے اور بدسلوکی کے باعث ہلاک ہو گئے، ہر اس شخص کو ظلم کا نشانہ بنایا گیا جس نے نازی نظریہ سے اختلاف کیا، یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ بیشتر اختلاف رائے رکھنے والوں کو ''یہودی نواز'' کا خطاب دے کر عوام میں نفرت پیدا کی گئی اور ان کے خلاف کارروائی کا جواز پیدا کیا گیا۔

یہود پر زمین کیسے تنگ کی گئی؟

نازی جماعت ہٹلر کی قیادت میں ۳۰، جنوری ۱۹۳۳ء کو جرمنی میں برسرِ اقتدار آئی اور اس کے فوراً بعد پانچ لاکھ پچیس ہزار (525000) یہودیوں کے خلاف سازشیں اور اُن کے انخلا کا آغاز ہو گیا، اپنی خود نوشت ''میری جدو جہد'' میں ہٹلر نے کھل کر یہودیوں کے خلاف

اپنی نفرت کا اظہار کیا اور اُنہیں تنبیہ کی کہ وہ جرمنی کی سیاسی، سماجی اور ثقافتی زندگی سے نکل جائیں، گو کہ اس نے یہ نہیں لکھا تھا کہ وہ اُنہیں قتل عام کر کے نسل کشی کریگا، لیکن ہٹلر کی نجی نشستوں میں اس بارے میں قطعیت کے شواہد پائے جاتے ہیں، ۱۹۲۲ء کے اوائل میں ہٹلر نے مبینہ طور پر اُس وقت کے ایک صحافی کو کہا کہ "ایک بار میں برسرِ اقتدار آجاؤں تو میرا پہلا اور بنیادی مقصد یہودیوں کی تعدیم ہوگا، جیسے ہی میں اقتدار میں آگیا، میں میرین پلاٹس میونخ میں جتنا زیادہ ممکن ہوسکے، پھانسی گھاٹ قطار سے تعمیر کراؤں گا، پھر تمام یہودیوں کو بلا تخصیص پھانسی دے دی جائیگی اور یہ اُس وقت تک پھانسی پر لٹکے رہیں گے کہ جب تک ان کے مردہ جسموں سے بدبو نہ آنے لگ جائے اور اُن کو اُس وقت تک لٹکا رہنے دیا جائیگا کہ جب تک ان کے تعفن سے بیماریاں پھوٹنے کا خطرہ نہ ہو جائے، پھر جیسے ہی اُن کے مردہ جسموں کو پھانسی پر سے اُتارا جائیگا، یہودیوں کا اگلا گروہ پھانسی پر لٹکا دیا جائیگا اور یہ سلسلہ اُس وقت تک چلتا رہے گا کہ جب تک میونخ کا آخری یہودی بھی ختم نہ ہو جائے، دیگر شہروں میں بھی اسی طرح کے منصوبوں پر عمل درآمد کیا جائیگا تاوقتیکہ تمام جرمنی یہودیوں سے پاک نہ ہو جائے۔

یکم اپریل ۱۹۳۳ء مقامی وقت کے مطابق صبح دس بجے حملہ آور دستے کے اراکین سارے جرمنی میں نکل آئے اور یہودیوں کاروباری مراکز کے سامنے کھڑے ہو گئے، ان کے ہاتھوں میں نوشتے تھے، جن پر تحریر تھا کہ "جرمنیو! اپنے آپ کو بچاؤ اور یہودیوں سے لین دین نہ کرو" یہودیوں کا خوردہ فروشی کا سب سے بڑا کاروبار تھا، یہودیوں کے اسٹور ۱۹۳۸ء میں تباہ کر دیے گئے اور غیر یہودی جرمنیوں کو سونپ دیے گئے، ۱۹۳۰ء تک یہودیوں کے قانونی، معاشی اور سماجی حقوق پر مکمل پابندی لگ چکی تھی "یہودی کون" کی قانونی تعریف نازیوں کے نزدیک ہر وہ شخص جس کے آباؤ اجداد میں سے کوئی ایک بھی شخص یہودی ہو، حتٰی کہ وہ یہودی جو ۱۸ جنوری ۱۸۷۱ء (جرمن ریاست کے قیام کی تاریخ) سے قبل یہودیت

چھوڑ کر کوئی دوسرا مذہب اختیار کر چکے ہوں، یہودی تصور کیے جاتے تھے، فرائیڈ لینڈر (Fried Lander) لکھتا ہے کہ نازیوں کے نزدیک جرمن کی اصل طاقت "خالص جرمن خون" تھا، جن کی جڑیں "جرمنی کی مقدس سرزمین" سے جڑی ہوئی ہیں، ۱۹۳۳ء میں متعدد قوانین منظور کیے گئے، جن میں آرین پیرا تحت یہودیوں کو کئی بنیادی پیشوں سے خارج کر دیا گیا، قانون برائے بحالیٔ شہری خدمات کے تحت یہودیوں کو طب، قانون، زراعت اور زرعی زمین کی خریداری سے روک دیا گیا، ڈرسڈین میں یہودی وکلا کی رکنیت منسوخ کر دی گئی، یہودی وکلا اور مصنفین کو عدالتوں اور دفاتر سے باہر نکال کر انہیں زدوکوب کیا گیا اُس کے جرمنی کے صدر ہنڈن برگ کے دباؤ پر ہٹلر نے ایک رعایتی ترمیم یہ کی کہ جن یہودیوں نے پہلی جنگ عظیم کے دوران خدمات سرانجام دی تھیں اور وہ عمر رسیدہ ہو چکے ہیں یا وہ کہ جن کے باپ اور بیٹوں نے پہلی جنگ عظیم میں حصہ لیا تھا، صرف وہ بدستور اپنی موجودہ نوکری کو جاری رکھ سکتے تھے، تاہم ۱۹۳۷ء میں ہٹلر نے یہ ترمیم بھی منسوخ کر دی یہودیوں کو مدارس و جامعات سے نکال دیا گیا اور صحافیوں کی انجمن یا کسی بھی اخبار کی ملکیت یا مدیری کے لیے بھی نااہل قرار دے دیا گیا، چنانچہ زرعی فارموں میں یہودی مزارعین سے لے کر کچہریوں میں یہودی وکلاء اور یہودی ججوں تک کو باہر نکال دیا گیا اور انہیں بری طرح مارا پیٹا گیا، اسکولوں، کالجوں اور اخبارات کے دفاتر اور مختلف انجمنوں سے بھی انہیں قوانین کے تحت یہودیوں کا اخراج عمل میں آیا، اُن کیلئے جرمن یا جرمن نسل کے افراد سے شادی کرنے کی پابندی لگا دی گئی، اِن قوانین کے اضافی آرڈیننس نے یہودیوں کو بیشتر سیاسی حقوق سے بھی محروم کر دیا، یہودیوں سے ووٹ دینے کا حق بھی چھین لیا گیا اور انہیں کوئی بھی سرکاری عہدہ حاصل کرنے کے حق سے محروم کر دیا گیا، جرمن حکام نے یہودیوں کیلئے اپنی املاک و جائیداد کو رجسٹر کرانے کی شرط عائد کر دی اور اِس طرح اُنہیں غربت سے دوچار کرنے اور جرمنی کے معاشی دھارے سے الگ کرنے کے اقدامات شروع کر دیئے،

یہودی ڈاکٹروں کو منع کر دیا کہ وہ غیر یہودی افراد کا علاج نہ کریں اور پھر یہودی وکلاء کی قانونی پریکٹس کے لائسنس بھی منسوخ کر دیئے، یہودیوں کا داخلہ تمام سرکاری اسکولوں اور یونیورسٹیوں کے ساتھ ساتھ سینما گھروں، تھیٹروں اور کھیل کے میدانوں میں بھی بند کر دیا گیا۔ بہت سے شہروں میں مخصوص جرمن علاقوں میں یہودیوں کے داخلے پر پابندی عائد کر دی گئی، اُن یہودی مردوں اور عورتوں کو، جن کے پہلے نام بنیادی طور پر غیر یہودی تھے، اپنے ناموں کے ساتھ بالترتیب اسرائیل اور سارا کا اضافہ کرنے پر مجبور کر دیا جائے، تمام یہودیوں کیلئے ہر وقت ایسے شناختی کارڈ ساتھ رکھنا لازمی قرار دیا گیا جس میں اُن کی یہودی شناخت کی واضح نشاندہی موجود ہو، ۱۹۳۸ء کے موسمِ خزاں میں تمام یہودیوں کے پاسپورٹوں (Pasports) پر شناخت کیلئے حرف ''J'' کا ٹھپہ لگا دیا گیا۔

ڈیٹنشن سینٹر Detention center اور گیس چیمبر

نازیوں نے پہلے یہودیوں کو الگ کر کے اُنہیں کنٹرول میں رکھنے کی خاطر بستیاں قائم کیں، یہ بستیاں پولینڈ کے مرکزی اور مشرقی علاقے جنرل گورنمنٹ میں قائم کی گئیں اور اِن کی مکمل نگرانی جرمن سویلین حکومت کرتی تھی، یہ بستیاں جرمن مقبوضہ پولینڈ کے مغربی علاقے میں بھی قائم کی گئیں، پولینڈ اور مغربی یورپ کے یہودیوں کو اِن بستیوں میں لایا جاتا جہاں بہت کم جگہ پر بہت سے یہودیوں کو انتہائی غلیظ ماحول میں رکھا جاتا اور اُنہیں بہت ہی قلیل مقدار میں خوراک فراہم کی جاتی، جون ۱۹۴۱ء میں سویت یونین پر جرمن حملے کے بعد ایس ایس اور پولیس کے دستوں نے گشتی قاتل دستوں کی صورت میں یہودیوں کا قتلِ عام شروع کر دیا، اُن کا ہدف پوری کی پوری یہودی برادریاں تھیں ۱۹۴۱ء کے موسمِ خزاں تک ایس ایس اور پولیس نے گشتی گیس ویگنیں بھی استعمال کرنی شروع کر دیں، یہ مکمل طور پر سیل کیئے ہوئے ٹرک تھے جن کے ایگزاس (Exhaust) پائپ کے ذریعے زہریلی کاربن مانو آکسائیڈ گیس (Oxide gas) اُس سیل شدہ چیمبر (Sealed

chamber) میں پھینکی جاتی جہاں یہودیوں کو بند کیا جاتا تھا اور یوں وہ سب کے سب ہلاک ہو جاتے، گشتی گیس ویگنیں پہلے سے جاری گولی مار کر ہلاک کرنے کے اقدامات کے ساتھ ساتھ کام کر رہی تھیں، جرمن ایس ایس اور پولیس نے قتل گاہوں میں لگ بھگ ۲۷ لاکھ یہودیوں کو قتل کیا، اِنہیں یا تو گیس کے ذریعے ہلاک کیا گیا یا پھر گولی ماردی گئی، مجموعی طور پر "حتمی حل" کا مقصد تمام تر یورپ کے یہودیوں کو گیس کے ذریعے، گولی سے یا دوسرے ذرائع سے ہلاک کرنا تھا۔

مرگِ انبوہ کے دوران ہونے والی اموات

یہودی: اڑسٹھ لاکھ (٦ سے ٨ ملین)
سوویت یونین کے جنگی قیدی: بیس سے تیس لاکھ (٢ سے ٣ ملین)
پولینڈ نژاد باشند: اٹھارہ لاکھ سے بیس لاکھ (١ سے ٢ ملین)
روما: دو لاکھ بیس ہزار سے پانچ لاکھ
معذور: دو لاکھ سے ڈھائی لاکھ
عام شہری: اسی ہزار سے دو لاکھ
ہم جنس پرست: پانچ ہزار سے پندرہ ہزار
مذہبی اقلیتیں: ڈھائی ہزار سے پانچ ہزار

مرگِ انبوہ کی وسیع تر تعریف کر کے اگر اس میں سوویت یونین کے عام شہریوں کی ہلاکت کو بھی شامل کر لیا جائے تو یہ تعداد ایک کڑور ستر لاکھ (سترہ ملین) تک چلی جاتی ہے، جس میں آٹھ لاکھ سے زائد وہ لوگ بھی شامل ہیں جو ضروریاتِ زندگی سے محرومی اور بدترین غلامانہ زندگی کی تاب نہ لاتے ہوئے موت کا شکار ہوئے، چودہ لاکھ وہ افراد جن کو کھلی فضا میں گولیوں کا نشانہ بنا دیا گیا، انتیس لاکھ وہ بھی شامل ہیں، جن کو کیمپوں میں زندہ جلا دیا گیا، ہلبرگ (Hilberg) کے پیش کردہ اعداد و شمار کے مطابق پولینڈ میں تیس لاکھ یہودی

ہلاک ہوئے، جنگ کے شروع میں ہٹلر کی خواہش تھی کہ سلاوک باشندوں کی نسل کشی، ملک بدری یا غلام بنا لیا جائے تاکہ نئی بستی کے لیے، جرمنی کو جگہ میسر آجائے، نسل کشی کے اس منصوبے، کو نازیوں نے پچیس سے تیس سال میں رفتہ رفتہ عملی جامہ پہنایا۔

ہولوکاسٹ کا خاتمہ

ہولوکاسٹ کے بعد بہت سے بچ جانے والے لوگوں نے اتحادی طاقتوں کے زیر انتظام بے دخل کیمپوں میں پناہ لی، ۱۹۴۸ء اور ۱۹۵۱ء تقریباً سات لاکھ یہودیوں نے اسرائیل ہجرت کرلی جن میں یورپ نے 136,000 بے دخل یہودی بھی شامل تھے دیگر بے دخل ہونے والے یہودیوں نے امریکہ اور دیگر ممالک کا رخ کیا، بے دخل یہودیوں کے آخری کیمپ کو ۱۹۵۷ء میں بند کر دیا گیا، یورپ کے ہولوکاسٹ کے بعد بے پناہ ہلاکتوں اور اموات کے نتیجے میں قریب تھا کہ یہودیوں کی نسل ہی اس دنیا سے اس کرہ ارض سے نابود ہو جاتی لیکن اللہ تعالی نے قتل انبیاء علیھم السلام، ناشکری، ذلت و مسکنت اور عبرت کے اس نشان کو قیامت تک باقی رکھنا ہے، خدائی انتقام کا شکار اس قوم کو شاید اسی حکمت کے تحت مشیت ایزدی نے انہیں فلسطین میں عارضی جگہ دی تاکہ ان کی نسل قیامت تک باقی رہے، اگر ان میں تھوڑی سی عقل ہوتی تو اس جگہ کو غنیمت سمجھ کر امن اور سکون سے رہ لیتے، فلسطینی انہیں کھا تو نہیں جاتے تھے، لیکن تف ہے ان کی دانش معکوس پر کہ اپنے میز بانوں پر آج بھی انہوں نے عرصہ حیات تنگ کر رکھا ہے۔

معروف غیر ملکی جریدے ''ٹائم'' نے اپنی ایک رپورٹ میں کہا ہے کہ برے حالات میں اچھے لوگوں کے کارنامے تاریخ میں ہمیشہ سنہری حروف سے لکھے جائیں گے۔ ''ٹائم'' کی رپورٹ کے مطابق ایک نمائش (exhibition) میں یہودیوں کے ہولوکاسٹ کے زمانے میں مسلمانوں کے کردار پر روشنی ڈالی گئی، نمائش میں دوسری جنگ عظیم کے دوران یہودیوں کے قتل عام پر مسلمانوں کے تاریخی کردار کو سراہا گیا، رپورٹ کے مطابق

دوسری جنگ عظیم میں ایک مسلمان خالد عبد الوہاب نے تیونس میں دو درجن سے زائد یہودیوں کی مدد کرتے ہوئے انہیں نازی فوج سے پناہ دی، ایک اور مسلمان ایرانی سفیر عبد الحسین سرداری نے نازی فوجیوں کی قید سے فرار ہونے والے ہزاروں یہودیوں کی زندگی بچائیں اور انہیں پاسپورٹ جاری کروائے، نمائش میں پیش کی جانے والی کہانیوں میں بتایا گیا کہ زمین پر بسنے والے انسان دوسرے انسانوں کے تحفظ اور باہمی محبت و یگانگت کیلئے کیسے کردار ادا کرتے ہیں، ہولوکاسٹ میں یہودیوں کو نسل کشی سے بچانے کیلئے آج بھی باضمیر یہودی مسلمانوں کے شکر گزار ہیں۔

چند ٹکڑے زمین کے خرید کر مالکان کو باجگزار (Taxpayer) بنا لینا اور سازشوں سے عالمی طاقتوں کو اپنا ہم نوا بنانے والا کھیل زیادہ عرصہ چلنے والا نہیں ہے، صاحبان بصیرت کے مطابق ہم بھی چڑھتے ہوئے سورج کے پیچھے بہت جلد طلوع ہونے والے اس دن کو ان آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ سرزمین فلسطین ایک بار پھر اپنے حقیقی وارثوں، فرزندان امت مسلمہ کے قبضہ قدرت میں ہوگی اور یہود اپنی بداعمالیوں کے باعث ایک بار پھر دنیا و آخرت میں ذلت و مسکنت کا نشان عبرت ہوں گے، ہولوکاسٹ کے نتائج قرآن کی عظیم الشان پیشگوئی مکمل ہوئی، قرآن کریم میں ارشاد ہے: اور اس کے بعد ہم نے بنی اسرائیل سے کہا کہ موعودہ سرزمین میں سکونت اختیار کرو، پس جب آخرت کا وعدہ آئے گا تو ہم تمہیں پھر اکٹھا کر کے لے آئیں گے۔ ”وَقُلْنَا مِن بَعْدِهِ لِبَنِي إِسْرَائِيلَ اسْكُنُوا الْأَرْضَ فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ الْآخِرَةِ جِئْنَا بِكُمْ لَفِيفًا“ (بنی اسرائیل: ۱۰۵)

چنانچہ ہولوکاسٹ کے بعد بننے والے اثرات سے یہ عظیم الشان پیشگوئی پوری ہوئی کہ تمام دنیا سے یہودیوں کو ارض مقدس یعنی فلسطین کے علاقہ میں اکٹھا کیا گیا اور ۱۹۱۷ء اعلان بالفور کی صورت میں صیہونی تنظیم اور حکومت برطانیہ کے درمیان ہونے والے معاہدہ کے نتیجہ میں تیس سال بعد اسرائیل کا قیام ہوا۔

مسلم ہولو کاسٹ جموں

تقسیم ہند کے فوراً بعد جموں میں لاکھوں کشمیری مسلمانوں کا منظم قتل عام تاریخ کے ان واقعات میں سے ہے جس کے تحریری و زندہ ثبوت ہونے کے باوجود اس واقعے کو دبا کر ہندوتوائی ظلم کی اس بھیانک تصویر سے دنیا کو لاعلم رکھنے کی کوشش کی جاتی رہی ہے، نامور امریکی انسانی حقوق وسول رائٹس ایکٹیوسٹ میلکم ایکس کا کہنا ہے کہ ”The Media is the most powerful entity of earth, have power to the guilty look & make the innocent guilty innocent“ کے تحت ایسا ہی مظلوم کشمیریوں کے ساتھ کیا گیا، بھارتی ظلم وجبر کو جائز قرار دینے کے لیے ہمیشہ سے مظلوم کشمیریوں کو دہشتگرد بنا کر دکھانے کی کوشش کی گئی، تقسیم ہند کے بعد ۱۹۴۷ء میں ماہ اکتوبر کے وسط سے نومبر تک منظم طریقے سے جموں کے علاقے میں لاکھوں نہتے مسلمانوں کو بیدردی سے قتل کیا گیا جسے بھارت کیساتھ ساتھ اہلیان مغرب نے بھی دبانے کی کوشش کی جبکہ چند پنڈت خاندانوں کا ذکر اتنا بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا کہ دنیا سمجھتی ہے ظلم ان کے ساتھ ہوا جبکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ظالم مظلوم بنا دیئے گئے اور مظلوم کو ظالم بنا دیا گیا، بلا جواز انسانیت کا قتل کیا گیا جس کا مقصد مسلمانوں کو ختم کرنا تھا، ادریس کانٹھ (Idris Kant) کی تحقیق کے مطابق اکتوبر ۱۹۴۷ء کے وسط میں ڈوگرا مہاراجہ (Dogra Maharaja) نے RSS کی مدد سے جموں میں مسلمانوں کا قتل عام شروع کر دیا جس کے نتیجے میں تقریباً دو لاکھ چالیس ہزار کشمیری مسلمانوں کو قتل کر دیا گیا اور سات سے آٹھ لاکھ افراد کو جان بچا کر بھاگنا پڑا نتیجتاً تین ہفتے بعد مسلم اکثریتی جموں میں مسلمان اقلیت میں رہ گئے، اس وقت کے وائسرائے لارڈ ماونٹ بیٹن (Lord Mountbatten) نے اس واقعے کو دبانے کے لیے میڈیا کو پابند کیا کہ وہ اس کی کوریج (Coverage) نہ کرے۔

ادریس کانٹھ کے مطابق یہ قتل عام قبائلیوں کے حملے سے پانچ روز پہلے شروع کیا گیا جس کا مطلب یہ ہے کہ قبائلی پشتونوں نے ردعمل کے طور پر کشمیر کا رخ کیا، جواہر لعل نہرو نے ڈوگرا مہاراجہ اور RSS کو اس واقعے کا ذمہ دار قرار دیا، انہوں نے ۱۷/۱اپریل ۱۹۴۹ء کو ولبھ بھائی پٹیل کو لکھے گئے خط میں اس کا ذکر کیا جسے فرنٹ لائن میگزین نے شایع کیا اس کے علاوہ Horace Alexander نے اپنے آرٹیکل میں انسانی تاریخ کے اس المناک سانحے کو تفصیلی ڈسکس (Discs) کیا جو کہ ۱۶/جنوری ۱۹۴۸ء کو The Spectator میں شایع ہوا، اس سانحہ سے قبل جموں کی ٪ 16 آبادی مسلمانوں پر مشتمل تھی معروف بھارتی دانشور و قانون دان AG Noorani نے اپنی کتاب Kashmir Dispute Vol-1 میں لکھا ہے کہ جموں کی مسلم اکثریت کو اقلیت میں بدلنے کے لیے ایک منظم پلاننگ مرتب کی گئی، جسکے لیے RSS کی مدد لی گئی جس نے باہر سے ہزاروں کی تعداد میں ہندو تواد ہشتگردوں کو جموں بھیجا اس کے علاوہ سنگھ پریوار کی ایک شاخ جموں پرجا پریشد بھی اس میں پیش پیش رہی جو بعد میں RSS کی سیاسی ونگ بھارتیہ جن سنگھ سے منسلک ہوگئی اور BJP بننے کے بعد اس کی اہم ونگ ہے، آرٹیکل ۳۷۰ ختم کر کے جموں کشمیر کو بھارت میں ضم کرنے کا مطالبہ اسی جماعت کا تھا جو کہ گولکر کی آئیڈیولوجی ”ایک ودھان، ایک نشان، ایک پردھان“ پہ مشتمل تھا۔

RSS اور ڈوگرا مہاراجہ جیسے انسان نما حیوانوں نے وہ سفاکیت دکھائی کہ اگر کتّوں اور بھیڑیوں پر اس کا الزام تھونپا جائے تو وہ بھی اسے اپنی توہین سمجھیں گے یہ محض چند بدمعاشوں کا کام نہیں تھا بلکہ RSS کے ہزاروں بیرونی درندوں، جموں پرجا پریشد کے حیوانوں اور ڈوگرا کی فوج کے ذریعے اسے منظم طریقے سے کیا گیا، اس رپورٹ میں The Times نے شایع کیا کہ ”Over 237000 Muslims were systematically exterminated unless they escaped to

Hindu & Pakistan along the border by Dogra forces extremists, this happened in the mid October, five nine days before & days before the pathan invasion Maharaja's accession to India ''یہ تاریخ کی وہ سفاکیت تھی کہ گاندھی بھی اسے دہشتگردی کہنے پہ مجبور ہو گئے، گاندھی نے ۲۵ر دسمبر ۱۹۴۷ء کو ریمارکس remarks دیئے کہ ''جموں کے ہندو، مہاراجہ ڈوگرا اور وہ ہندو جو باہر سے گئے، جموں میں مسلمانوں کے قتل عام اور مسلمان عورتوں کی عصمت دری کے ذمہ دار ہیں''(Vol-90 of Gandhi's work) یہ محض اتفاقی حادثہ نہیں تھا بلکہ منظم اور سرکاری سرپرستی میں ظلم و جبر کا عظیم واقعہ ہے، امریکہ میں ''ہولوکاسٹ میموریل میوزیم'' میں ایک نقشہ عیاں کیا گیا ہے جس میں دکھایا گیا ہے کہ مختلف علاقوں سے یہودیوں کو مشرق میں نئی آبادکاری کے نام پر اپنے مقبوضہ جات سے یہودیوں کو پولینڈ میں لالا کر قتل کیا، بالکل اسی طرح نومبر میں ہزاروں مسلمانوں کو پاکستان شفٹ کرنے کے بہانے RSS کے دہشتگردوں نے اجتماعی طور پر ایک جگہ جمع کر کر کے شہید کیا، افسوس کہ ہولوکاسٹ کی طرح تاریخ کے اس بڑے قتل عام پر بات نہیں کی گئی، نہ ہی اس پر زیادہ لکھا گیا، جموں کی ۶۱ر فیصد مسلمان آباد محض تین ہفتوں میں اقلیت بلکہ ختم ہو کر رہ گئی، حتمی تعداد تو شاید کہیں زیادہ ہو البتہ اس وقت کے مغربی اخبارات، محققین اور تاریخ دانوں نے شہید ہونے والوں کی تعداد 237000 دو لاکھ سینتیس ہزار جبکہ ہجرت کرنے پہ مجبور ہونے والوں کی تعداد ایک ملین کے قریب لکھی ہے، اگرچہ AG Noorani, Khalid Bashir, Arundhati Roy سمیت دیگر بہت سے رائٹرز نے اس پہ بہت کچھ لکھا مگر میڈیا و دیگر ڈبیٹس (Debates) میں اس واقعہ کو وہ توجہ نہ ملی جو ملنی چاہئے تھی چنانچہ دنیا کی اکثریت اس سے لاعلم ہے۔

انڈین مسلم ہولوکاسٹ

این، پی، آر، کا۴۰/صفحات پر مبنی مینوئل سوشل میڈیا پر وائرل ہوا، راجدھانی دہلی میں کئی مقامات پر شہریت قانون این آرسی-این پی آر مخالف مظاہرے جاری ہیں لوگوں کے ذہن میں یہ سوال ہے کہ آخر این پی آر کے خلاف آواز کیوں نہیں اٹھائی جارہی، این پی آر مینوئل میں صفحہ ۳۲/پر درج ایک فہرست سے واضح ہوجاتا ہے کہ این پی آر بھی مودی سرکار کی ایک سازش ہے، اس فہرست میں بھارت کے تہواروں کی تفصیل بیان کی جاتی ہے لیکن حیران کن بات یہ ہے کہ اس میں مسلمانوں کا ایک بھی تہوار شامل نہیں، مسلمانوں کے حق کی آواز اٹھانے اور ان کی رہنمائی کا دم بھرنے والے رہنما اس حوالے سے پوری طرح خاموش نظر آرہے ہیں، ہے کوئی سوال پوچھنے والا کہ مسلمانوں سے اس قدر نفرت کیوں؟ ایک دم اتنی لاتعلقی کیوں؟ دوسری جانب مظاہروں کے دوران املاک کو نقصان پہنچنے کی قیمت بھی مسلمانوں سے وصول کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے، این آرسی کے ذریعہ بھارت میں وہی یہودی تاریخ دہرانے کی سازش رچی جارہی ہے جو ہٹلر نے کی تھی۔

ہولوکاسٹ حقیقت یا فسانہ؟

ہولوکاسٹ کے متعلق بعض مورخین کی تحقیق یہ ہے کہ ہٹلر کے یہودیوں پر کیے جانے والے مظالم کی داستاں کبھی بھی مستند نہیں ہے، یہودیوں نے اسے ہولوکاسٹ کے نام سے معروف کیا ہوا ہے، خود یورپ میں کئی تاریخی ماہرین اب بھی موجود ہیں جو دلائل سے ثابت کرتے ہیں کہ ہولوکاسٹ ایک مفروضہ ہے جس کی مدد سے یہودیوں نے دنیا بھر میں مظلومیت کی چادر اوڑھی اور اب وہ دنیا پر قابض ہوچکے ہیں، خود یہودیوں کو بھی علم ہے کہ ہولوکاسٹ ایک مفروضہ ہے، یہی وجہ ہے کہ انہوں نے زورزبردستی سے کئی یورپی ممالک اور امریکا وغیرہ میں ہولوکاسٹ کے انکار کو جرم قرار دلوادیا ہے اور جو بھی ہولوکاسٹ سے

انکاری ہو، اسے پابند سلاسل کردیا جاتا ہے، یہاں پر آزادی اظہار رائے کے سارے حامی خاموشی سے ایک دوسرے کو تکنے لگتے ہیں، ہٹلر کے یہودیوں پر کیے جانے والے فرضی مظالم کے مقابلے میں یہودیوں کے فلسطینیوں پر کیے جانے والے مظالم کی ایک ایک داستان ثابت ہے اور اسکے شواہد بھی موجود ہیں، اسی طرح سے بھارت جو کچھ کشمیری حریت پسندوں کے ساتھ کررہا ہے، پورے بھارت میں مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ کیا جارہا ہے، میانمار میں ریاست جو کچھ روہنگیا مسلمانوں کے ساتھ کررہی ہے، سنکیانگ میں چینی حکومت نے جس طرح سے حراستی مراکز میں دس لاکھ سے زاید مسلمانوں کو مقید کیا ہوا ہے، ان سب کے لیے مزید کسی ثبوت کی ضرورت نہیں ہے۔

ہزاروں نظمیں، ڈرامے اور ناول لکھوائے گئے ہولوکاسٹ کے مرنے والوں کو اس قدر مقدس درجہ عطا کیا گیا کہ ان کے خلاف لب کشائی کرنے والا نفرت پھیلانے والا قرار دے کر قابل تعزیر بنا دیا گیا، ہولوکاسٹ کی نہ صرف تردید کرنا جرم ٹھہرا، بلکہ یہودیوں کی جانب سے بیان کردہ مقتولین کی ساٹھ لاکھ تعداد میں چند ایک کی کمی کرنا بھی قابل سزا جرم بنا دیا گیا متعدد یورپین صحافی، مصنف اور کالم نگار ہولوکاسٹ میں یہودیوں کی جانب سے بیان کردہ تعداد کو صرف غلط کہنے کی پاداش میں جیلوں میں بند کردیے گئے، ہولوکاسٹ کے خلاف زبان کھولنے والے دانشوروں کے صرف ملکی ہی نہیں، بلکہ عالمی سطح پر وارنٹ جاری کیے گئے۔ حالانکہ تحقیق کا دروازہ کبھی اور کسی ملک میں بند نہیں ہوتا، لیکن ہولوکاسٹ پر تحقیق کرنا اور آزادی سے اپنی رائے کا اظہار کرنا بھی قابل تعزیر جرم قرار پائے ہیں، بہت سے ممالک میں ہولوکاسٹ پر زبان بندی کے حوالے سے سخت قانون سازی کی گئی، صرف یورپ کے تقریباً تین درجن ممالک میں ہولوکاسٹ کے حوالے سے قوانین موجود ہیں، جن کے تحت اس بارے میں ہر نوعیت کا منفی اظہار رائے جرم ہے، جس پر قید اور جرمانے کی سزا دی جاسکتی ہے برطانیہ کی لبرل پارٹی کے ممبر پارلیمنٹ ڈیوڈ وارڈ نے اپنے بلاگ میں صرف یہ لکھ دیا

تھا کہ ’’میں ہولوکاسٹ کے دور میں یہودیوں کے لیے پیش آئے ناقابل یقین واقعات پڑھ کر غم زدہ ہوجاتا ہوں، لیکن یہودی جنھوں نے یہ مصائب وآلام برداشت کیے ہیں، وہ کیونکر فلسطینیوں کے خلاف مظالم ڈھارہے ہیں‘‘۔

اس بلاگ کے بعد ڈیوڈ وارڈ (David Ward) پر اس قدر دباؤ بڑھا کہ اسے مجبوراً معافی مانگنی پڑی، دوسری جانب ہولوکاسٹ کے حوالے سے اسرائیل کی پارلیمنٹ حکومت کو یہ اختیار دے چکی ہے کہ وہ دنیا میں کہیں بھی، کسی بھی جگہ کوئی شخص اگر ۶۰/لاکھ کی تعداد کو کم بتانے کی کوشش کرے، اس پر مقدمہ چلاسکتی ہے اور اس ملک سے اسے نفرت پھیلانے کے جرم میں Hate Criminal کے طور پر مانگ سکتی ہے، گرفتار کرسکتی ہے، سزا دے سکتی ہے۔

عالمی برادری نے ہولوکاسٹ کے حوالے سے بغیر تحقیق کیے سخت سے سخت تر قوانین بنا دیے، لیکن کسی نے یہ پوچھنے کی زحمت گوارا نہیں کی کہ کیا دوسری جنگ عظیم کے وقت جرمنی میں ساٹھ لاکھ یہودی آباد بھی تھے یا نہیں؟ اور جو آباد بھی تھے ان میں سے بیشتر کو ہٹلر کے حکم پر جنگ عظیم کے شروع ہونے سے پہلے ہی ملک بدر نہیں کردیا گیا تھا؟ عالمی برادری کی ناانصافی اس سے بڑھ کر اور کیا ہوسکتی ہے کہ ایک طرف یہودیوں کے افسانوی واقعہ ہولوکاسٹ کے حوالے سے تقریباً پون صدی بعد بھی سخت قوانین نافذ ہیں، لیکن دوسری جانب اپنی مظلومیت کا ڈھنڈورا پیٹنے والے انھی یہودیوں کے ہاتھوں گزشتہ ۷۰/سالوں سے مظلوم فلسطینیوں کا ہولوکاسٹ جاری ہے، انھیں تہہ وتیغ کیا جارہا ہے، بمباری کرکے بے گناہ فلسطینیوں کا قتل عام کیا جارہا ہے، ان کے گھروں کو مسمار اور ان کی زمینیں ہتھیائی جارہی ہیں، اس سب کچھ کے بعد بھی عالمی برادری کی زبانیں گنگ ہیں، آخر کیوں؟

فلسطینیوں کا ہولوکاسٹ

ایک طویل عرصے سے فلسطین پر قابض اسرائیل نے مظلوم فلسطینیوں پر ظلم وستم کے

پہاڑ توڑنے کا سلسلہ شروع کیا ہوا ہے،لیکن عالمی برادری نے اپنے لب سی لیے ہیں، یہودیوں کے ہولوکاسٹ کے حوالے سے قوانین بنانے والے ممالک کیا اسرائیل سے یہ نہیں پوچھ سکتے کہ فلسطینیوں پرکس جرم کی پاداش میں بربریت کی تاریخ رقم کی جارہی ہے؟ نامعلوم افراد کے ہاتھوں مارے جانے والے صرف تین یہودیوں کے بدلے سیکڑوں فلسطینیوں کو گرفتار کیا گیا، ایک فلسطینی نوجوان کو اغوا کر کے زندہ جلا دیا گیا اور پھر غزہ پر گولا بارود کی بارش کا سلسلہ شروع کر دیا گیا،معصوم بچوں اور خواتین سمیت فلسطینیوں کی ایک بڑی تعداد کو شہید کیا گیا۔

غزہ میں انسانیت سوز اور نسل کش ظلم ڈھاتے ہوئے اسرائیل کو عالمی برادری کا رتی بھر خوف نہیں ہے، بلکہ اسرائیلی وزیراعظم کا کہنا ہے کہ غزہ پر حملوں کو روکنے کے لیے ان پر کوئی عالمی دباؤ نہیں اور اگر کوئی ایسا دباؤ ڈالا گیا تو اس کی مزاحمت کی جائے گی اور غزہ پر پہلے سے زیادہ طاقت کے ساتھ حملے کریں گے،حقیقت یہ ہے کہ روز اول سے ہی فلسطینیوں پر ظلم کرنا اسرائیل کا مقصد ٹھہرا ہے، اسرائیل کے سابق وزیراعظم منانم بیگن کی کتاب ’’انقلاب‘‘ میں یہ الفاظ درج ہیں کہ ’’اے اسرائیلیو! تم پر ضروری ہے کہ اپنے دشمنوں کو قتل کرنے میں کبھی نرم نہ پڑو اور ان پر ترس نہ کھاؤ، تاکہ ہم عربی کلچر نام کی چیز ختم کر دیں اور اس کے کھنڈروں پر اپنی تہذیب کھڑی کریں، فلسطینی محض کیڑے ہیں، جن کو ختم کر دینا چاہیے‘‘۔

انسانیت سوز مظالم پر عالمی برادری کی خاموشی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے وقفے وقفے سے اسرائیل کی جانب سے مظلوم فلسطینیوں پر بربریت کا سلسلہ تیز کر دیا جاتا ہے، جو کہ ایک عرصے سے جاری ہے، اب جہاں اسرائیل ہے، وہاں صدیوں تک فلسطین اور مسلمان تھے، ۱۹۴۸ء سے اسرائیل نے فلسطینیوں کو فلسطین سے بے دخل کرنے کا سلسلہ شروع کر کے اسرائیل کے قیام کے لیے فلسطینیوں کو ان کے گھروں سے بے دخل کیا گیا، ان کی بستیوں کو تاراج کیا گیا اور انھیں دربدری کی زندگی گزارنے پر مجبور کیا گیا، یہاں تک کہ پڑوسی ملکوں

میں ان کے کیمپوں کو وقتاً فوقتاً حملوں کا نشانہ بنایا گیا۔

۲۰۰۲ء میں اسرائیلی فوج نے فلسطینی کیمپ جنین کا ۱۵ دن تک محاصرہ اور اس پر ہوائی جہازوں اور ٹینکوں سے حملہ کر کے ایک ہزار فلسطینی شہید اور نہ جانے کتنے زخمی کیے، اس کے علاوہ اسرائیل نے ۱۹۴۸ء میں ''دیر یاسین'' کا قتل عام، ۱۹۵۶ء میں ''قصر قاسم'' کا قتل عام ۱۹۸۲ء میں ''صابرہ'' اور ''شتیلہ'' کا قتل عام، ۱۹۹۰ء میں ''مسجد اقصیٰ'' کا قتل عام، ۱۹۹۴ء میں ''مسجد اقصیٰ'' کا دوسرا قتل عام اور ۱۹۹۶ء میں ''مسجد ابراہیم'' کا قتل عام کیا، سرزمین انبیاء فلسطین میں اسرائیل گزشتہ ۷۰ برسوں سے خون کی ندیاں بہا رہا ہے، لیکن عالمی طاقتوں نے مجرمانہ خاموشی اختیار کر رکھی ہے۔

عالمی سامراجی طاقتوں کے جہاں کہیں مفادات ہوتے ہیں وہاں تو جنگ سے لے کر مذاکرات اور کانفرنسوں سمیت ہر قسم کے اقدامات عمل میں لائے جاتے ہیں، لیکن یہاں زبانیں گنگ ہیں، یہودیوں کے ہولوکاسٹ پر شور مچانے والی عالمی برادری کی جانب سے فلسطینیوں کے قتل عام پر ہمیشہ اسرائیلیوں کو قانون کے کٹہرے سے آزاد رکھا جاتا ہے۔

فلسطینیوں کے سفاکانہ قتل عام پر اسرائیل کو نہ عالمی برادری کی کسی کارروائی کا خدشہ ہوتا ہے، نہ بڑی طاقتوں کی طرف سے کسی روک ٹوک کا اندیشہ ہوتا ہے، کیونکہ اسرائیل مغرب کا سرکش و مغرور بچہ بنا ہوا ہے، اسرائیل کو ظالمانہ کارروائیوں میں امریکا اور مغرب کی مکمل حمایت حاصل ہوتی ہے، مغرب صہیونیت کے دفاع میں ہمہ وقت تیار رہتا ہے، اسی لیے مظلوم فلسطینیوں پر مظالم ڈھاتے ہوئے اسرائیل کو نہ کسی عالمی برادری کے دباؤ کا خوف ہوتا ہے اور نہ ہی کسی عالمی قانون کا پاس ہوتا ہے، وہ اپنے آپ کا تمام قوانین سے آزاد خیال کرتے ہوئے فلسطینیوں کا قتل عام کرتا ہے۔ (مستفاد: اردو ایکسپریس ۱۸/جولائی، ۲۰۱۴ء آزاد دائرۃ المعارف اردو ویکیپیڈیا)

مرتب کی دیگر کتابیں

۱۔رمضان المبارک معروفات ومنکرات

۲۔اصلاحی واقعات دو جلدیں

۳۔اصلاح الرسوم (تسہیل، تعلیق وتخریج)

۴۔عصری خطبات مجلدات (زیرِطبع)

۵۔جماعت اولی کی اہمیت وجماعت ثانیہ کی حیثیت

۶۔نیاسال مغرب اوراسلام کانقطۂ نظر

۷۔کرسمس کی حقیقت عقل ونقل کی روشنی میں

۸۔ویلنٹائن ڈے تاریخ کے آئینے میں

۹۔اپریل فول کی تاریخی حیثیت

۱۰۔خیرالبیان (مدارس کے طلبہ کے لئے)

۱۱۔ہندوستانی مسلمان آزادیٔ وطن سے تعمیرِ وطن تک (زیرِطبع)

۱۲۔نفع المفتی والسائل (عربی،تحقیق وتخریج،زیرِطبع)

۱۳۔اللمعة اذا جتمع العید والجمعة

۱۴۔کھیل کود کی تاریخی وشرعی حیثیت

۱۵۔احکام اعتکاف

۱۶۔خواتین رمضان کیسے گذاریں؟

۱۷۔یوم جمہوریہ حقیقت کے آئینہ میں

۱۸۔پتنگ بازی حقائق ونقصانات

۱۹۔معراجِ مصطفی کے چالیس سبق

۲۰۔ضیافت فضائل ومسائل